(پروفسر) سید نجیب اشرف ندوی مرحوم

کی

یاد میں

میں موجود ہوں اس کو اعلیٰ یونیورسٹی کہا جا سکتا ہے۔ اور آپ کی اس یونیورسٹی میں یہ ساری خوبیاں پوری طرح موجود ہیں۔

یہ بہت ہی افسوس اور بدقسمتی کی بات ہے کہ اس اعلیٰ تعلیمی ادارہ کے اس جشن زریں کے مبارک موقع پر آج ہمارے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب موجود نہیں ہیں جنھوں نے اس ادارہ کے لئے اپنی قیمتی زندگی کے ۲۲ سال بڑی لگن کے ساتھ گزارے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جو اس ادارہ کے روح رواں تھے وہ صرف اسلامی تہذیب ہی کے نمایندے نہیں تھے بلکہ وہ صحیح معنوں میں ہمارے سیکولرازم کے ایک اعلیٰ نشان بھی تھے۔ وہ ہمارے دیش کے اعلیٰ درجہ کے دیش بھگت محب وطن تھے۔ وہ بڑے ہی انوکھے اور اعلیٰ انسان تھے اور ایک ایسے عالم باعمل تھے جن میں ہر کام کو اعلیٰ پیمانہ پر کرنے کی لگن ہوتی تھی۔ ان کی یہی ساری خوبیاں اور اس ادارہ کی صدمات ایسی تھیں کہ انھیں اس عظیم ملک کے اعلیٰ عہدہ کا حقدار بنا دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سب میری اس بات کو مانیں گے کہ اس تعلیمی ادارہ کے ساتھ جن کا تعلق خواہ استاد کی حیثیت سے ہو یا طالب علم کی حیثیت سے ہو، آج یا آنے والے کل میں، ان سب پر ذاکر صاحب کی انسانیت اور خوبیوں کا اثر ہمیشہ قائم رہے گا اور وہ سب ہمیشہ ذاکر صاحب کے مشکور رہیں گے۔ میں ان تمام حضرات کو مبارکباد دیتا ہوں جنھوں نے اس ادارہ کو قائم کرنے اور ترقی دینے میں اپنا ہاتھ بٹایا۔ ذاکر صاحب کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ جامعہ دھیرے دھیرے ترقی کر رہا ہے اور اس کی ترقی کی حدیں آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔"

طلبائے قدیم کے سمپوزیم کا عنوان تھا: "آج کے ہندوستان میں جامعہ کا رول"۔ جلسہ جامعہ کے ایک قدیم طالب علم جناب معین الدین حارث صاحب (مدیر روزنامہ اجمل، بمبئی) کی صدارت میں شروع ہوا، جن کا خطبۂ صدارت جامعہ کے اسی شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ خطبۂ صدارت

ہیں، نئے طریقے آرہے ہیں۔ ہمارے ملک اور ہماری تعلیم کو اسی وقت ترقی ملے گی جب آپ نئے نئے راستے ڈھونڈیں گے، ہمارے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ایسی ٹریننگ دیں گے کہ وہ ہمیشہ طالب علم بنے رہیں اور ہمیشہ سیکھتے رہیں۔ اداروں کو جب بڑی امداد ملی ہے اور پیسوں کی طرف سے اطمینان ہوا ہے تو اس سے فائدہ بھی ہوا ہے اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ کہ کام آگے بڑھا، سیوا کا میدان وسیع ہوا، نقصان یہ کہ کام کرنے والوں میں اطمینان پیدا ہوگیا اور نئی ذمہ داریاں اٹھانے کی ان میں سکت باقی نہیں رہی۔ ہمارے دیش میں بڑے بڑے لوگ اسی دور میں پیدا ہوئے ہیں جو سب سے زیادہ مشکل اور پریشانی کا دور تھا۔ ان کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پرانے طریقوں کو چھوڑ کر نئے طریقوں کو اختیار کیا، اپنے بزرگوں کی عزت اور احترام کو باقی رکھتے ہوئے ان کے راستے کو چھوڑ کر نئے راستے کو تلاش کیا۔ جامعہ کو اس لیے کامیابی ہوئی کہ وہ تعلیم کے پرانے طریقوں اور نظریوں پر مطمئن نہیں ہوئی اور آیندہ بھی یہ اسی وقت ترقی کرے گی اور کامیاب ہوگی جب اپنی موجودہ ترقی پر قانع ہو کر بیٹھ نہیں رہے گی بلکہ نئی کھوج میں لگی رہے گی۔ اسی کے ساتھ اس کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اپنا بار خود ہی اٹھانا ہے، باہر کی مدد کافی نہیں ہے اگر خود اپنی آپ مدد نہ کی جائے۔

امسال کانووکیشن کے موقع پر خطبہ پڑھنے کے لیے صدر جمہوریہ عالی جناب وی وی گری سے درخواست کی گئی تھی، جسے موصوف نے ازراہ کرم منظور فرمایا اور تشریف لائے۔ موصوف کو خطاب کرتے ہوئے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے فرمایا:

ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس کانووکیشن میں، جس کا اجلاس جامعہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر ہو رہا ہے تشریف لا کر جامعہ کے طالب علموں اور استادوں کو خطاب کرنا منظور فرمایا ہے۔ ہمیں خاص خوشی اس وجہ سے بھی ہے کہ آپ کا ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے بہت قریبی تعلق تھا اور اسی کی بنا پر ہمیں یقین ہے کہ جامعہ کو آپ کی رہنمائی اور خاص سرپرستی حاصل رہے گی۔ جامعہ والوں کو اپنی طرف سے چاہیئے کہ آپ کو اپنے حالات اور اپنی

نوائے ادب بمبئی

ندوی نمبر

تاریخ اشاعت ۱۵ جنوری ۱۹۶۹

جلد ۲۰ جنوری ۱۹۶۹ شمارہ ۱

شذرات

(پروفیسر) سید نجیب اشرف صاحب ندوی کی وفات پر شہر کی چند علمی و تعلیمی انجمنوں کے مشترکہ اہتمام سے ایک تعزیتی جلسہ ہوا تھا جس میں ندوی میموریل فنڈ کی بھی ایک تجویز پاس ہوئی تھی۔ تجویز کے مطابق فنڈ کی رقم سے ایک ماہانہ اسکالرشپ جس کا نام ندوی میموریل اسکالرشپ ہوگا، ایک ایسے طالب علم کو دی جائے گی جو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اردو کے کسی موضوع پر دانشگاہ بمبئی سے پی۔ اچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے تحقیق کرے گا رقم کی فراہمی کا کام شروع ہوچکا تھا۔ لیکن انجمن کی بعض دوسری اہم تر اور فوری مصروفیتوں کی وجہ سے عارضی طور پر رک گیا۔ اب اسے دوبارہ شروع کیاجارہاہے۔ مرحوم کے احباب اور تلامذہ سے خصوصاً درخواست ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں۔ رقم جنرل سکریٹری، انجمن اسلام (دادا بھائی نوروجی روڈ، فورٹ، بمبئی) کے نام خواہ نقد کی صورت میں یا منی آرڈر یا چیک کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔

بمبئی یونیورسٹی الحاقی یونیورسٹی ہے۔ صرف سماجیات اور معاشیات میں پوسٹ گریجوئٹ طلبہ کے لئے اس کا تدریسی شعبہ تھا۔ اس سال (۱۹۶۹ء) سے اس نے چار نئے تدریسی شعبے، ہندی، گجراتی، مراٹھی اور سندھی کے پوسٹ گریجوئٹ طلبہ کے لئے کھولے ہیں۔ بمبئی میں مراٹھی کے بعد سب سے زیادہ بولی اور لکھی اور پڑھی جانے والی زبان اردو ہے۔ بمبئی یونیورسٹی نے اس کی طرف سے بے توجہی برت کر اس کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ اسی طرح یونیورسٹی نے یہ بھی طے کیا ہے کہ جون ۱۹۷۱ء سے اس سے ملحق کالجوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی کے علاوہ مرہٹی، گجراتی اور ہندی بھی ہوگا۔ اس معاملے میں بھی اردو سے بےانصافی کی گئی ہے۔ یونیورسٹی کی پرانی روادارانہ روایات کے پیش نظر اس کی اردو سے

سرد مہری اور اس کے ساتھ بے انصافی پر حیرت ہے ۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ سینٹ کے اردو داں ممبر اور اردو بورڈ کے اساتذہ یونیورسٹی کی اس بے انصافی پر بالکل خاموش رہے ۔ اردو کے حق کے لئے لڑنا تو الگ رہا ان کی «احتیاط» نے ان کی زبان پر حرف شکایت بھی نہ آنے دیا ۔

سعدی از دست خویشتن فریاد

تقریباً ڈیڑھ سال پہلے بمبئی کے چند اردو دوست حضرات کی تحریک پر بمبئی میں اردو کمیٹی کے نام سے ایک مجلس کی تشکیل ہوئی تھی ۔ اس کا مقصد ایک طرف اردو کی تحریک کو منظم اور پُراثر بنانا تھا اور دوسری طرف اردو کی تمام اہم شخصیتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا ۔ مجلس نے یہ بھی طے کیا تھا کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے چوٹی کے ادیبوں، شاعروں وغیرہ کو بھی اس میں شریک کیا جائے گا تا کہ تنگ نظر و تنگ دل لوگ اردو تحریک کو صرف مسلمانوں کی تحریک کہکر فرقہ واریت کا زہر نہ پھیلا سکیں ۔ کمیٹی کو بمبئی کے تقریباً ہر نقطۂ نظر کے ادیبوں ، شاعروں ، صحافیوں وغیرہ کا تعاون حاصل ہوگیا تھا اور اس نے اپنا کام شروع کردیا تھا ۔ لیکن دو ، تین سرگرم ارکان کی شدید علالت کی وجہ سے کام کی رفتار پہلے سُست پڑگئی اور پھر رُک گئی. چند مہینے ہوتے ہیں اسے از سرِ نو شروع کیا گیا ہے اور اب یہ قطعی طے پا گیا ہے کہ دسمبر ۱۹۶۹ء کے آخری ہفتے میں اردو کمیٹی کا آل انڈیا کنونشن ہوگا ۔ کمیٹی نے اس کے افتتاح کے لئے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی رضامندی بھی حاصل کرلی ہے ۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے چوٹی کے ادیبوں ، شاعروں وغیرہ نے کمیٹی کے مقاصد سے اتفاق اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے ۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کنونشن کے انعقاد سے گوناگوں خوشگوار نتائج نکلیں گے اور اردو تحریک میں ایک نئی روح پیدا ہوسکے گی ۔

پچھلے چند مہینوں میں اردو و فارسی دنیا کی تین اچھی شخصیتیں اٹھ گئیں : ڈاکٹر عندلیب شادانی ، ڈاکٹر محمد اسحٰق ، علی عباس حسینی ، ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے صدر تھے اور اردو دنیا

کا یہ وہ چکر ہے جس سے یہ ممالک نکل نہیں سکتے۔ شام کی طرف سے تیل کی سپلائی کے سلسلہ میں مغربی ملکوں کے بائیکاٹ کی باتیں سنکر خیال ہوتا ہے کہ شام کے حکران غیر ذمہ داری کی باتوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سوڈان اور لیبیا میں انقلاب اور جنوبی یمن میں بائیں بازو کی حکومت کے قیام سے عرب ملکوں میں بائیں بازو کے رجحانات کا پلہ بھاری ہوگیا ہے اور رباط کی چوٹی کانفرنس کے مذاکرات اور فیصلوں پر اس کا اثر پڑے گا۔ لیکن مراکش، تیونیشیا، سعودی عرب، کویت اور لبنان کے رجحانات بھی نظرانداز نہیں کئے جاسکتے، خود اردن جس کے سامنے جنگ کے سوا اور کوئی دوسرا لائحہ عمل نہیں، کئی معاملات میں دائیں بازو کی حکومتوں کا ہمنوا ہے، اس لئے مغربی طاقتیں ان ملکوں کے ذریعہ رباط کانفرنس پر اثرانداز ہونے کی ضرور کوشش کریں گی، عین ممکن ہے کہ کانفرنس کے موقع پر ایسا مرحلہ بھی آجائے کہ کانفرنس کے بےنتیجہ ثابت ہونے کے امکان نظر آنے لگیں۔ لیکن ان ملکوں کے سامنے یہ بات بھی رہے گی کہ ان کے یہاں کے عرب قوم پرستوں کے حلقے کسی ایسی صورت کو برداشت نہیں کریں گے جو عام عرب مفاد کے خلاف ہو، اردن، سعودی عرب اور لبنان تو خاص طور پر اپنے عرب نیشنلسٹوں اور فلسطینی عربوں کی تنظیم سے خائف ہیں اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ رباط کانفرنس میں اسرائیل کے خلاف سخت اقدام کے حامی ملکوں کی مخالفت کھل کر نہیں کی جائے گی اور اسی بناپر ہمارا خیال ہے کہ خرطوم کانفرنس کے مقابلہ میں رباط کا یہ اجتماع نتیجہ خیز ہوگا۔ پھر بھی، ان تمام باتوں کے باوجود بائیں بازو کی عرب حکومتوں کا کوئی فیصلہ یا ان حکومتوں کے اثر سے رباط کانفرنس کا فوجی اقدام سے متعلق کوئی فیصلہ اس وقت تک کارگر نہیں ہوگا جب تک سوویٹ یونین کی تائید اسے حاصل نہ ہو، لڑائی اسلحے کے بغیر نہیں لڑی جاتی اور بائیں بازو کی عرب حکومتوں کو فوجی سامان اور اسلحے مل سکتے ہیں تو سوویٹ یونین یا مشرقی یورپ کے ملکوں سے، اشتراکی چین موجودہ حالات میں اس سلسلہ میں کوئی بڑی خدمت نہیں انجام دے سکتا۔

پروفیسر محمد مجیب

شیخ فرید گنج شکرؒ

امام غزالی نے احیاء العلوم میں فرمایا ہے کہ سچا دوست وہ ہے جو سوچتا رہے کہ دوست کے لئے وہ کیا کر سکتا ہے اور جس کا اس طرف خیال ہی نہ جائے کہ دوستی سے خود اس کو کیا حاصل ہوگا۔ یہی بات محبت کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ محبت کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بھول جائے سب کچھ دے اور بدلے میں کچھ نہ مانگے، یہ بھی نہ چاہے کہ محبت کے بدلے اس سے محبت کی جائے۔

ماں باپ، بھائی بہن، بیوی شوہر، دوست سب محبت کے دعویدار ہوتے ہیں مگر یہ محبت جذبات کا فریب بھی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں بے غرضی کی بنیادی شرط پوری نہیں ہوتی، اور جب کبھی محبت کی وجہ سے نقصان یا دکھ پہنچنے لگتا ہے تو سب مجبور ہو کر یہ سوچتے ہیں کہ انھوں نے کیا دیا اور اس کے بدلے میں انھیں کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے اور اس میں کوئی عیب نہیں۔ انسان فائدے کا امیدوار نہ ہو، نقصان اٹھانے پر بھی تیار ہو تب بھی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے جس سے گذرنے کے بعد اس کا صبر اور تحمل جواب دے دیتا ہے۔ تب محبت کے لئے کوئی سہارا نہیں رہتا۔ طبیعت دنیا سے، آدمیوں سے بیزار سی ہو جاتی ہے۔ ایک منزل تک انسان سے انسان کی محبت رہنما کا کام کرتی ہے اور یہ سمجھنا صحیح ہوتا ہے کہ خدا سے محبت اُسی کو ہو سکتی ہے جو انسانوں سے محبت کرتا ہو مگر اس منزل کے آخر تک پہنچنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انسان سے سچی محبت وہی کر سکتا ہے جسے خدا سے اور صرف خدا سے محبت ہو۔ ایک منزل پر انسان محبت کے معاملوں میں اپنے رجحان، اپنی طبیعت کے مطابق چلتا ہے، اپنے اختیار سے کام لیتا ہے، چاہے زبان سے وہ کہے کہ عشق پر زور نہیں۔

اس کے آگے جو منزل ہے وہاں محبت یا تو فنا ہو جاتی ہے یا خدا کا حکم بن جاتی ہے۔

آج کل خدا اور انسان کے درمیان ملت اور شریعت کی دیواریں اس طرح حائل ہیں کہ یہ سمجھنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے کہ خدا کا حکم کیا ہے اور اس حکم کی تعمیل کیسے کی جا سکتی ہے۔ لوگ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ خدا کا حکم کیا ہے، اپنے دل کے سوا ہر جگہ نظر دوڑاتے ہیں سوچتے ہیں کہ وہ بھی قانونی حکم کی طرح کچھ ہوگا۔ اور کہیں لکھا ہوا مل جائے گا، بے شک وہ لکھا ہوا بھی ملتا ہے، مگر اسے وہی سمجھ سکتا ہے جس نے پہلے اپنے ذہن اور اپنے دل کو پاک کر لیا ہو اور رضاجوئی کی مشق کر کے بصیرت حاصل کی ہو۔ اکثریت ہمیشہ یہ چاہتی ہے کہ خدا کا حکم بیان کرنے کی ذمہ داری کسی اور پر ڈال دے۔ لیکن ایک زمانے میں ایسے آزاد بندے بھی ہوا کرتے تھے جنھیں کسی دوسرے کا ایسا توسط گوارا نہ تھا جو ان کے اور خدا کے درمیان غیریت کی دیوار بنا کر کھڑی کر دے۔ وہ ایسے رہنما کو تلاش کرتے جو ان کے دل کی بات کو سمجھ سکتا، توبہ کرتے، یعنی اعلیٰ کی خاطر ادنیٰ سے بالکل منہ پھیر لیتے، فاقے کر کے پیٹ کی کی غلامی سے نجات حاصل کرتے۔ مسلسل عبادت کر کے اپنے الگ وجود کا احساس مٹا دیتے۔ یہ سب تیاری تھی اس منصب کا حق ادا کرنے کے لئے جیسے دلوں کو دریافت کرنا، یعنی خواہش اور غرض کی آلائشوں کو دور کر کے دلوں تک پہنچنا اور "تالیف قلوب" یعنی بگڑے اور بچھڑے اور سہمے اور خود غرضی یا غرور میں ڈوبے ہوئے دلوں کا ملانا، ایک لڑی میں پرونا تھا۔ یہ کام صرف محبت کے ذریعہ ہو سکتا تھا۔ لیکن کوئی محبت کرنا چاہتا تو کیسے کرتا۔ حکومت اور اقتدار کی ہوس ایسی تھی کہ حاکموں کے ہاتھ بے گناہوں کے خون میں ڈوبے رہتے تھے۔

شیخ فرید گنج شکرؒ ۱۱۷۳ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ۱۲۶۵ء میں وفات پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی کی سلطنت نئی نئی قائم ہوئی تھی اور تلوار کے زور پر ہی قائم رہ سکتی تھی۔ شیخ فریدؒ کے ایک ہم عصر شیخ کمال الدین زاہد تھے جن کی دینداری ان کے علم کی طرح ہر طرف مشہور تھی۔ سلطان بلبن نے اُن کو دربار میں بلایا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ جامع مسجد کی امامت قبول کریں۔ انھوں نے انکار کر دیا، اور جب سلطان نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا کہ مسلمانوں کے پاس بس ایک چیز نماز

ہ نماز باقی رہ گئی ہے، کیا بادشاہ چاہتا ہے کہ وہ بھی اُن سے چھین لے؟ دراصل عالموں کا یہ منصب تھا کہ نئی قدروں کو اپنی زندگی میں نمایاں کریں۔ مگر یہ محبت کا پیغام کس کو اور کیسے سناتے جب لوگ حکومت کے دستِ نگر تھے، اور ان کا سارا وقت ایک دوسرے سے جھگڑنے میں گذرتا تھا۔ جون پور کے دو عالموں میں اس بات پر بحث شروع ہوئی کہ بلی کی رال پاک ہوتی ہے یا نجس اور ختم ہوئی ایسی گالی گلوچ پر جس نے ساری بستی کو شرمندہ کر دیا۔ محبت کے آداب سیکھنے کا آرزومند سوداگروں میں جا کر بیٹھتا تو دیکھتا کہ وہ عالموں سے بھی زیادہ حکومت اور حاکموں کے دست نگر ہیں اور دستکاری کرنے والے خود اس کے محتاج تھے کہ کوئی اُن کے دُکھ درد کو سنے۔ وہ لوگ جو دنیا سے الگ ہو کر ایک کونے میں بیٹھتے، عبادت کرتے اور دلوں کی دریافت اور تالیفِ قلوب میں مشغول رہتے ایک بڑا ہی نیک اور مفید کام کرتے جسے کرنے کے لئے بڑی ہمت درکار تھی اور جو کسی اور طریقے سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ انھوں نے دنیا کو چھوڑا تو محبت کا حق ادا کرنے کے لئے چھوڑا۔

شیخ فریدؒ شیخ قطب الدین بختیارؒ کاکی کے مُرید تھے۔ ان کی طبیعت سخت ریاضتیں کرنے کی طرف مائل تھی اور ان کے پیر انھیں ٹوکتے رہتے تھے کہ زیادہ ریاضت کرو گے تو لوگوں کو خیال ہوگا کہ تم انھیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہو۔ شیخ فریدؒ کو جب خلافت نامہ مل گیا تو انھوں نے اجودھن کو اپنا مرکز بنایا اور وہیں توکل کی زندگی گذارتے رہے۔ انھوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی اور ان کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں جن کی تاریخی سند بہت کمزور ہے۔ مگر ہمیں کافی ایسی باتیں معلوم ہیں جن کے سہارے ان کی زندگی کا نقشہ بنایا جا سکتا ہے۔

جب وہ مُرید ہو چکے تھے تو ایک مرتبہ شیخ فریدؒ نے اپنے پیر سے پوچھا کہ بہت سے لوگ تعویذ لینے آتے ہیں، فرمائیے کیا کروں۔ پیر نے جواب دیا کہ معاملہ نہ میرے ہاتھ میں ہے نہ تمہارے۔ بس خدا کا نام ہوتا ہے لکھ دیا کرو۔ آج کل ہم تعویذ لکھوانے کے قائل نہیں ہیں۔ بیمار ڈاکٹر کے یا ہسپتال جاتا ہے، جسے اپنا کوئی کام کرانا ہوتا ہے وہ درخواستیں لکھتا ہے، سفارشیں کراتا ہے۔ ایک طرح سے کام نہیں بنتا تو دوسری طرح سے کوشش کرتا ہے۔ آج کل ایسی آسانیاں

ہیں جو پہلے نہیں تھیں۔ پھر بھی لوگ پریشان رہتے ہیں اور انھیں اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کی بات سننے والا کوئی نہیں۔ اور آج کل اتنی فرصت ہے کس کو کہ بیٹھ کر دُکھ درد کی باتیں سُنے۔ ایسی باتیں سننا اور سنتے رہنا، ہر مصیبت زدہ سے جو اُن کے پاس آتا ہمدردی کرنا شیخ فریدؒ اور اُن جیسے تمام صوفی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اِسی تعویذ لکھنے کے کام کو لیجئے۔ شیخ فریدؒ اسے برسوں کرتے رہے۔ پھر انھوں نے اسے اپنے مرید شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے سپرد کردیا۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس میں کتنا وقت لگتا ہے اور اسے اپنے ذمے لیتے ہوئے گھبرائے۔ شیخ فریدؒ نے فرمایا، تم ابھی سے پریشان ہو کہ تمھیں اتنی دُعائیں لکھنی ہوں گی، اس وقت کیا کرو گے جب بہت سے حاجت مند تمھارے دروازے پر آئیں گے اور تم سے دعاؤں کی درخواست کریں گے؟ ایک موقع پر ایک آدمی شیخ فریدؒ کے پاس آیا۔ اُس کے بیمار بھائی کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے اپنی پریشانی بیان کی۔ شیخ فریدؒ نے فرمایا، تمھاری جو حالت اس وقت ہے ویسی ہی حالت میری تمام عمر رہی ہے، لیکن میں نے کسی کو بتایا نہیں۔ اس پر بھی ایسے لوگ تھے جنھیں شیخ فریدؒ کی توجہ کافی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک بوڑھے فرّاش نے اُن سے کہا، شیخ فریدؒ، تم ملنے والوں سے کچھ بیزار سے لگتے ہو۔ خدا کا شکر ادا کرنے کا بہتر طریقہ اختیار کرو، شیخ فریدؒ نے خاموشی سے سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔

اُن کی ہدایتوں میں سے ایک یہ تھی کہ بھلائی کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہا کرو۔ بھلائی کرنا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، اس لئے کہ سب اپنی فکروں اور پریشانیوں اور خواہشوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ شخص بہت خوش قسمت ہے جسے بھلائی کرنے اور اس طرح محبت کا پیغام دلوں تک پہنچانے کا موقع ملے۔ فرّاش نے ٹھیک کہا تھا کہ اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ لوگ آتے ہیں، اپنا دُکھ درد بیان کرتے ہیں اور دل پر محبت کا اثر لے کر واپس جاتے ہیں۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

کٹر رشید الحق

ملایا میں قانون شریعت

(مضمون کا پہلا حصہ جو ملایا کی سیاسی تاریخ سے متعلق ہے "انسائی کلوپیڈیا برٹانیکا" اور "انسائی کلوپیڈیا امریکانا" میں مندرج اعداد و شمار کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔

جہاں تک ملایا میں قانونِ شریعت سے متعلق معلومات کا تعلق ہے وہ سنگاپور کے اسٹیٹ ایڈووکیٹ جنرل، ڈاکٹر احمد ابراہیم کی کتاب "اسلامک لا اِن ملایا" (مطبوعہ سنگاپور ۱۹۶۵ء) سے حاصل کی گئی ہیں۔ بطور حوالہ حاشیے میں ایک ہی کتاب کا بار بار ذکر کرنے کے بجائے، جہاں ضروری سمجھا گیا ہے، متن مضمون میں مذکورہ بالا کتاب کے صفحات کا حوالہ دے دیا گیا ہے)

جنوب ایشیا کے جس خطے کو آج ہم ملایا کہتے ہیں وہ زیادہ دن نہیں گزرے جب چند چھوٹی چھوٹی خودمختار استوں پر مشتمل صرف ایک جغرافیائی علاقہ تھا۔ ملایا کی ریاستوں میں ملاکا وہ پہلی ریاست تھی جو صدیوں پہلے سلمان عرب تاجروں اور صوفیوں کے ذریعے اسلام سے روشناس ہوئی، اس کے بعد سلطان ملاکا کی کوششوں ے اڑوس پڑوس کی دوسری ریاستوں میں بھی اسلام پھیل گیا۔

پندرھویں صدی میں جب پرتگالیوں کے قدم اس علاقے میں پہنچے تو ملایا کی ریاستوں کے مسلمان لاطین کا سیاسی زوال شروع ہوا۔ تقریباً دو سو سال تک پرتگالی اس علاقے کی تجارت پر بلا شرکت غیرے بعض رہے۔ آخر اٹھارویں صدی میں اس علاقے کے ایک چھوٹے سے جزیرے پینانگ پر انگریزوں تسلط ہوا۔ اس کے بعد سے پرتگالی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے گئے اور انگریز پورے علاقے پر اپنا اثر بڑھاتے گئے۔ اس صدی کی دوسری جنگِ عظیم کے شروع ہونے تک ملایا کی تمام ریاستوں پر انگریزوں کا قتدار مکمل ہو چکا تھا۔ سیاسی طور سے ملایا کی ریاستوں کی حیثیت کم و بیش وہی تھی جو آزادی سے قبل

ہندو پاک کی دیسی ریاستوں کی تھی۔

دوسری جنگِ عظیم میں جب جاپانیوں کے ہاتھوں انگریزوں کو اس علاقے میں شکست ہوئی تو ان کی برسہا برس کی جمی ہوئی سیاسی ساکھ بالکل اکھڑ گئی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد انگریزوں کو اس پر مجبور ہونا پڑا کہ وہ ملایا کی آزادی کے سلسلے میں وہاں کی سیاسی تحریکوں کے لیڈروں سے گفت وشنید کریں۔ تجربے کے طور پر ۱۹۴۸ء میں انگریزوں کی سرپرستی میں ملایا کی چند ریاستوں میں دستوری حکومت قائم ہوئی۔ چند برسوں کے بعد ملایا کو مکمل خود مختاری مل گئی اور ۱۹۵۷ء میں ملایا کی حسب ذیل ۱۱ ریاستوں کو ملا کر فیڈریشن آف ملایا کا قیام عمل میں لایا گیا:

۱۔ جوہور	(آبادی ۹۲۵،۹۱۹)	۷۔ کیلنتان	(آبادی ۵۰۵،۱۷۱)
۲۔ پاہنگ	(″ ۳۱۲،۹۷۸)	۸۔ ترنگانو	(″ ۲۷۸،۱۴۷)
۳۔ نگری سمبلین	(″ ۳۶۵،۰۴۵)	۹۔ پیرک	(″ ۱،۲۲۰،۶۳۳)
۴۔ سالنگور	(″ ۱،۰۱۲،۰۴۷)	۱۰۔ پینانگ	(″ ۲۷۴،۳۲۵)
۵۔ کیدہ	(″ ۷۰۱،۴۸۶)	۱۱۔ ملاکا	(″ ۲۹۱،۲۳۳)
۶۔ پرلس	(″ ۹۰،۸۳۴)		

وفاقی حکومت کا کل رقبہ ۱۹۵۷ء میں ۵۰ ہزار ۶ سو مربع میل اور تمام ریاستوں کی مجموعی آبادی ۶،۲۷۶،۹۱۵ تھی۔[۱]

۱۹۶۳ء میں ۳ اور برطانوی اقتدار والے علاقے (سنگاپور، شمالی بورنیو اور سراواک) اس فیڈریشن میں ملا دیئے گئے اور اس طرح سیاسی طور سے یہ پورا علاقہ فیڈریشن آف ملایا کے بجائے فیڈریشن آف ملیشیا کہلانے لگا۔ جس حصے کو پہلے فیڈریشن آف ملایا کہتے تھے وہ فیڈریشن آف ملیشیا کے قیام کے بعد پھر سے صرف ملایا کہا جانے لگا۔

---

[۱] یہ اعداد و شمار ۱۹۵۷ء کے ہیں، جو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۴، (ایڈیشن ۱۹۶۴)، ص ۷۱۱ مسلسل سے لی گئی ہیں۔

فیڈریشن کا سیاسی اعلیٰ سربراہِ کار وہاں کا وزیرِ اعظم ہوتا ہے جو پارلیمانی انداز سے ملک کا نظم و نسق چلاتا ہے۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی کے علاوہ ہر ریاست میں اندرونی نظم و نسق کے لئے ریاستی قانون ساز اسمبلیاں ہیں۔ موجودہ ۱۴ ریاستوں میں سے پانچ ریاستیں ایسی ہیں جن کا دستوری حاکمِ اعلیٰ مرکز کی طرف سے تقرر کردہ گورنر ہوتا ہے۔ بقیہ ۹ ریاستوں میں دستوری اعلیٰ حکمرانی وہاں کے پُرانے حکمرانوں ہی کے ہاتھ میں باقی رکھی گئی ہے۔ یہ نو حکمران اپنے میں سے کسی ایک کو فیڈریشن کے دستوری حکمران کی حیثیت سے پانچ سال کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ یہ حکمران کاغذی طور پر پورے ملک کے سیاہ و سفید کا مالک ہے لیکن فی الواقعہ اس کی حیثیت برطانیہ کے دستوری حکمران کی سی ہے۔ اصل اختیار پارلیمنٹ کے ہاتھوں میں ہے۔

(۲)

ملایا کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب اتنا زیادہ ہے کہ ہم اُسے ایک طرح سے خالص مسلمانوں کا ملک کہہ سکتے ہیں۔ یہاں کے مسلمان اصولی طور پر دو قسم کے قوانین کے تحت زندگی گزارتے ہیں، ایک تو وہ سیکولر قانون ہے جو ملایا کے ہر شہری پر بلا اختلافِ مذہب و ملت عائد ہوتا ہے، دوسری طرف اسلامی شریعت ہے جس کا دائرہ یہاں کے صرف مسلمان باشندوں تک محدود ہے لیکن درحقیقت ملایا میں شریعت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جو قانونِ شریعت کے تحت نہ آجاتا ہو۔

ملایا کے اصل مسلمان باشندوں کی اکثریت چونکہ شافعی المذہب ہے اس لئے سرکاری طور پر فقہ شافعی کو قوانینِ شریعت کے مرتب کرنے میں ترجیح دی گئی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس بات کی وضاحت دی گئی ہے کہ اگر فقہ شافعی کی "مسلّمہ" (ORTHODOX) روایات مفادِ عامّہ کا ساتھ نہ دیں تو پھر فقہ شافعی کی "دوسرے درجے کی مسلّمہ" (LESS ORTHODOX) روایات کی بنا پر شرعی قانونسازی کی جائے گی۔ لیکن اگر کبھی یہ محسوس ہو کہ نفس مذہب شافعی کے مطابق قانون سازی سے مفادِ عامّہ کو ضرر پہنچ رہا ہے تو پھر دستوری حکمراں کی خصوصی اجازت سے مذاہب حنفی، مالکی یا حنبلی میں سے جو

مذہب بھی اس وقت کے مسلم مفاد کے مطابق ہوگا اُسے اپنایا جائے گا۔(ص - ۱۴۹) ملایا کی مسلمان آبادی ایک زمانے سے شریعت کے ساتھ ساتھ اپنے رواجی قاعدوں کو بھی قانون کا درجہ دیتی آئی ہے۔ یہ رواجی دستور جو ملایا اور انڈونیشیا میں قانون عادت (ADAT LAW) کہلاتے ہیں، اس حد تک وہاں والوں کی زندگی میں گھر کر چکے ہیں کہ ملایا کے عام مسلمانوں کو رواج اور شریعت میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ حد یہ ہے کہ اگر کبھی ایسا موقع آ بھی جائے جب دوسروں کو رواج اور شریعت میں کھلا ہوا تضاد نظر آتا ہو تو ایسے موقع پر ملایا کے مسلمان عوام کی نظروں میں وہ تضاد درحقیقت شریعت اور رواج میں نہیں، بلکہ ملایا کے رواج اور عربوں کے رواج میں ہوتا ہے۔ مثلاً ملایا کے ساحلی علاقوں پر بسے ہوئے مسلمان مچھیرے صدیوں سے سمندر کی غیر مرئی دیوی کے سامنے نذر و نیاز پیش کرتے آئے ہیں۔ کیونکہ اس طرح اُن کے بقول سمندر کی دیوی اپنی اولاد — مچھلیوں — کو اپنے معتقدین کے قدموں میں ڈالتی ہے — ۱۹۵۸ء میں ریاست ترنگانو کے (عربی النسل) سرکاری مفتی نے اس عقیدے کو شریعت کے خلاف قرار دیا۔ اس فتوے سے علاقے کے مچھیروں میں ایک بددلی سی پھیلی اور انھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس موقع پر ایک چشم دید گواہ کے بیان کے مطابق ریاست کیلنتان کے ایک غیر عربی النسل مسلمان سرکاری افسر نے مفتی صاحب کے رویے پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ وہ خود عربی النسل ہیں اس لئے اسلام کے نام پر عرب کے رسم و رواج کو رائج کرنا چاہتے ہیں، ورنہ دراصل ملایا کے مچھیرے جو کچھ کر رہے ہیں وہ اسلام کے خلاف نہیں ہے۔[ك]

رواجی قوانین کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ ملایا کی بعض ریاستوں میں قانون سازی کے سلسلے میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ کسی بھی مسئلے میں قانون بناتے وقت اس ریاست میں رائج رسم و رواج کو بھی خاص طور سے ذہن میں رکھا جائے گا۔(ص - ۱۵۲)

[ك] SHIRLE GORDON IN HIS FREFACE TO ISLAMIC LAW IN MALAYA BY DR. AHMAD IBRAHIM. ED. BY SHIRLE GORDON, SINGAPORE, 1965.

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ملایا کے مسلمان اپنی روزمرہ کی زندگی میں قوانینِ شریعت کے بجائے اپنے رواجی قوانین کے تحت زندگی گزارتے ہیں کسی طور سے بھی درست نہ ہوگا۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے کرۂ ارض پر اس وقت شاید ملایا ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں شریعتِ اسلامیہ کے ایک بہت بڑے حصّے کو ریاستی قانون کی حیثیت حاصل ہے۔ مثلاً ریاستہائے ملایا میں قانونِ عادت کے مطابق وہاں کے مسلمان عام طور سے "یکزوجیت" (MONOGAMY) پر عمل کرتے ہیں۔ اگرچہ قانونِ شریعت کی رُو سے اُنھیں "کثیرالازدواجی" (POLYGAMY) کی اجازت ہے لیکن وہاں کے معاشرے کا ڈھانچہ کچھ اس طرح کا ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے والا شخص اتنے زیادہ گھریلو اور سسرالی "مصائب" کا شکار ہو جاتا ہے کہ اکثر و بیشتر حالات میں اُسے پہلی بیوی سے چھٹکارا ہی حاصل کرنا پڑتا ہے، جو مالی پیچیدگیوں کی وجہ سے شوہر کے لئے نہ تو آسان ہے اور نہ ہی خوش کُن۔ اس طرح صورتِ حال یہ ہے کہ اصولی طور سے ملایا کے مسلمانوں کے لئے تعددِ ازدواج جائز ہے لیکن حقیقتاً وہ یکزوجیت پر عامل ہیں۔

شریعت نے شادی کے لئے کسی عمر کا کوئی تعین نہیں کیا ہے۔ والدین یا قانونی سرپرست اپنے "نابالغ بچوں" کا نکاح کر سکتے ہیں۔ اس قانون کی رُو سے ملایا کے مسلمانوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ جس عمر میں چاہیں شادی کریں۔ لیکن ریاستہائے ملایا میں "مسلم قانونِ ازدواج" کی رو سے ۱۲ سال سے کم عمر کی "بیوی" سے باقاعدہ جنسی تعلق قائم کرنا "ناجائز جنسی تعلق" کی صف میں شمار ہوتا ہے۔ (ص ۱۸۱)

ملایا میں رائج قانونِ شریعت کی رُو سے ریاست کی طرف سے متعینہ قاضی، امام یا نکاح افسر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نکاح پڑھانے کا مجاز نہیں ہے۔ ہر نکاح کو باقاعدہ شادی کے دفتر میں درج کرانا ضروری ہے۔ چونکہ شریعت میں نکاح پڑھانے کا کام کسی ایک خاص شخص کے سپرد نہیں ہے۔ اس لئے ملایا میں اگر کوئی غیر مجاز شخص نکاح پڑھاتا ہے تو وہ نکاح تو جائز ہوگا لیکن چونکہ ایسا نکاح شادی کے دفتر میں درج نہیں ہو سکتا اس لئے متعلقہ لوگوں کو اندراج نہ کرانے کے جرم میں جیل اور جرمانہ کی سزا ملے گی۔ (ص ۲۱۹) شادی کی درخواست میں اس بات کی وضاحت کرنی ہوتی ہے کہ

درخواست کنندہ کے پہلے سے بیوی موجود نہیں ہے۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں شادی کی اجازت فوراً نہیں مل سکتی۔ قاضی کی عدالت تمام معاملات کی اچھی طرح تحقیق کر لینے کے بعد اگر ضروری سمجھے گی تو دوسری شادی کی اجازت دے گی۔ (ص ۱۸۷)

ملایا کی کوئی مسلمان عورت کسی بھی غیر مسلم سے خواہ وہ کتابی ہو یا غیر کتابی شادی نہیں کرسکتی، کیونکہ شریعت میں اس کی ممانعت ہے۔ ہاں قانونِ شریعت کے مطابق ایک مسلمان مرد کسی کتابیہ لڑکی (یہودی، عیسائی) سے شادی کرسکتا ہے مگر اس شادی کا اندراج بھی اُسے قاضی کی عدالت میں "مسلم قانونِ ازدواج" کے تحت کرانا ہوگا۔ میاں بیوی میں سے اگر ایک غیر مسلم ہو تو ایسی شادی مسلم قانونِ ازدواج کے تحت رجسٹرڈ نہیں ہوسکتی اور نہ ہی "سول میرج ایکٹ" کے تحت اُسے نکاح "تسلیم کیا جائے گا کیونکہ "سول میرج ایکٹ" کے تحت صرف وہی شادیاں ہوسکتی ہیں جن میں عورت اور مرد دونوں غیر مسلم ہوں۔ (ص-۱۹۵)

ریاستہائے ملایا نے اگرچہ قانونِ شریعت کی پابندی کرتے ہوئے شوہروں کو طلاق دینے کا حق دیا ہے لیکن اس حق کو مختلف پابندیوں کے ذریعے بہت حد تک محدود بھی کردیا ہے۔ ملایا کے مسلم قانونِ ازدواج کی رُو سے صرف اسی طلاق کو مؤثر تسلیم کیا جاتا ہے جو باقاعدہ نوٹس دینے کے بعد قاضی کی عدالت میں دی جائے اور قاضی دونوں فریقوں کے بیانات کو سُن کر طلاق پر مہرِ تصدیق ثبت کردے۔ (ص-۲۰۱)

منگنی کی رسم شریعت میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن ملایا کے قانون عادت میں اسے خاصی اہمیت حاصل ہے۔ رواج کے مطابق نکاح سے قبل لڑکے اور لڑکی کے اعزا ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے ہیں۔ نیز شادی کے سلسلے میں مہر اور دوسرے لین دین کے معاملات طے کرتے ہیں۔ جب ایک بار نسبت یا منگنی کی رسم پختہ ہوجاتی ہے تو پھر شادی سے انکار کرنا ... رواجی قانون کے تحت بہت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ نسبت پختہ ہوجانے کے بعد اگر لڑکے والے بغیر کسی معقول عذر کے شادی سے انکار کردیں تو نہ صرف یہ کہ منگنی کی رسم کے موقع پر لڑکی والوں نے

کچھ تحفے کے طور پر انھیں دیا ہے، یا اس سلسلے میں جو دوسرے ضروری اخراجات برداشت کئے ہیں وہ سب لڑکے والوں کو واپس کرنے ہوں گے بلکہ مہر کی جو رقم طے ہو چکی ہے وہ بھی انھیں ادا کرنی ہوگی۔ اور اگر لڑکی والے عہد شکنی کرتے ہیں تو انھیں صرف لڑکے والوں کی طرف سے بھیجے گئے تمام تحفے واپس کرنے ہوں گے اور وہ اخراجات ادا کرنے پڑیں گے جو منگنی کے سلسلے میں لڑکی والوں نے کئے تھے (ص۔ ۱۷۵، ۱۷۶)

(۳)

مذکورہ بالا بحث سے ہمیں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ ملایا میں قانونِ شریعت صرف نکاح و طلاق کے مسائل تک محدود ہے۔ اس کے برعکس ملایا کی ریاستیں اپنے دستور کی رُو سے اس بات کی پابند ہیں کہ وہ اپنے حدود میں رہنے والے مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشے پر شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ریاست میں حکومت کی طرف سے ایک انجمن ہوتی ہے جو مختلف ریاستوں میں مختلف ناموں سے مشہور ہے۔ کسی ریاست میں اسے "مجلس برائے مذہب اسلام اور رواج ملایا" کہا جاتا ہے، کسی ریاست میں "مجلس برائے مذہب اسلام" اور کہیں پر صرف "مجلس مذہب" کہا جاتا ہے۔ ریاست کا دستوری حکمراں اس "مجلس" کا نگرانِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس کی منظوری کے بغیر مجلس نہ تو کوئی نیا قانون بنا سکتی ہے اور نہ کسی پرانے قانون کو منسوخ کر سکتی ہے۔ جس طرح مختلف ریاستوں میں اس مجلس کو چند الفاظ کی کمی و بیشی کے ساتھ مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے اسی طرح اس مجلس کی ہیئت ترکیبی بھی ہر ریاست میں یکساں نہیں ہے۔ مثلاً ریاست سیلانگور میں "مجلس" میں صدر کے علاوہ کم از کم سات ممبران ہوں گے۔ ممبران کے لئے یہ شرط ہے کہ ان میں کم از کم ایک ہندوستانی مسلمان ہو اور ایک پاکستانی مسلمان۔ (ص ۔ ۱۵۱) ریاست نگری سمبلین میں "مجلس" حسب ذیل پندرہ افراد پر مشتمل ہوگی: ریاست کی انتظامی کونسل کا ایک ممبر جو "مجلس" کا صدر ہوگا، مذہبی معاملات کے محکمے کا صدر، مفتی ریاست، قاضی ریاست، انسپکٹر مذہبی مدارس، ریاستی قانون ساز اسمبلی کے پانچ ممبران، پانچ غیر سرکاری افراد جن میں سے کم از کم ایک ملایا کے علاوہ کسی دوسرے ملک کا مسلمان شخص ہوگا، مذہبی معاملات کے محکمے کا سکریٹری جو اپنے عہدے کی بنا پر (EX-OFFICIO) اس مجلس کا بھی سکریٹری ہوگا۔ (ص ۔ ۱۴۸)

ریاست کے بیت المال کی دیکھ بھال اور آمد و خرچ کی ذمّہ داری مجلس کے سر ہوتی ہے۔ بیت المال کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ زکوٰۃ اور فطرہ ہے جس کی وصولیابی مجلس کے علاوہ اور کوئی نہیں کرسکتا۔ ملایا میں سرکاری قانون کے مطابق انفرادی طور سے زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم مستحقین کو نہیں دی جاسکتی۔ نہ ہی کوئی شخص یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا سکتا ہے کہ اس پر زکوٰۃ یا فطرہ فرض نہیں ہے۔ جس طرح اس زمانے میں کوئی صاحب حیثیت انکم ٹیکس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا اسی طرح ملایا کے مسلمان ریاست کے دوسرے سیکولر ٹیکسوں کے علاوہ زکوٰۃ اور فطرہ سے بھی نہیں بچ سکتے۔ اگر کوئی شخص مجلس کو زکوٰۃ کی رقم دینے سے انکار کرے یا کسی دوسرے کو زکوٰۃ دینے سے روکے تو قانوناً مجلس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مطالبے کی رقم اس کی جائداد سے وصول کرے اور قانون شکنی کے جرم میں ایسے شخص کو زیادہ سے زیادہ سات روز کے لئے جیل بھیج دے یا اس پر زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم کے علاوہ ۱۰۰ ڈالر تک جرمانہ کردے۔ (ص۔ ۳۴۷) اگر کوئی شخص مجلس کے مقرر کردہ عمال کے علاوہ کسی دوسرے کو زکوٰۃ یا فطرہ کی رقم دے دے گا تو اس پر مجلس کا مطالبہ باقی رہے گا اور اسے دوبارہ متعینہ رقم مجلس کے بیت المال میں جمع کرنی ہوگی۔ (ص۔ ۳۴۸) ہاں اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس پر زکوٰۃ یا فطرہ کی رقم کی تشخیص غلط ہوئی ہے تو وہ باقاعدہ مجلس کے سامنے اپیل کرسکتا ہے مجلس تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد مطالبے کو معاف کرسکتی ہے، یا کم کرسکتی ہے یا بڑھا سکتی ہے۔ (ص ۳۴۷)

ریاست کی تمام مساجد، مذہبی مدارس اور اوقاف کی نگرانی مجلس کے ذمّے ہے۔ اگر کوئی مسلمان لاوارث مرجاتا ہے تو اس کی جائداد کی وارث بھی مجلس ہی ہوتی ہے۔ ہر ریاست کی مجلس کے ماتحت مسلمانوں کے مذہبی امور پر نظر رکھنے کے لئے ایک "محکمہ برائے مذہبی امور" اور ایک "شریعت کمیٹی" (LEGAL COMMITTEE) ہوتی ہے۔ محکمہ برائے مذہبی امور ایک طرح سے مجلس کا انتظامی بازو ہوتا ہے اور شریعت کمیٹی دارالافتاء کی حیثیت رکھتی ہے۔ ریاست کا مفتی اپنے عہدے کی بنا پر مجلس کا ممبر اور شریعت کمیٹی کا صدر ہوتا ہے۔ صدر (مفتی ریاست) کے علاوہ شریعت کمیٹی کے ممبران کی تعداد کم از کم چار اور زیادہ سے زیادہ آٹھ ہوتی ہے جن میں سے دو ممبروں کو "مجلس" کا ممبر بھی ہونا ضروری ہے۔ شریعت کمیٹی کا

بنیادی کام اہم مسائل میں فتووں کا اجراء ہے۔ ملایا میں شریعت کمیٹی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو، کسی بھی شرعی یا رواجی مسئلہ پر فتویٰ دینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں قانون شکنی کرنے والوں کو بعض ریاستوں میں ایک سال تک کی قید یا ۲ ہزار ڈالر تک جرمانے کی سزا مقرر ہے۔ بعض ریاستوں میں ۳ ماہ تک کی قید یا ۲۵۰ ڈالر تک جرمانے کی سزا، اور ایک ریاست میں قید اور جرمانہ دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں۔ (ص - ۳۵۵)

فتویٰ حاصل کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ شریعت کمیٹی کے سکریٹری کے پاس استفتا بھیجا جائے۔ سکریٹری اُسے شریعت کمیٹی کے سامنے پیش کرے گا۔ اگر شریعت کمیٹی کی نظروں میں اس استفتا کا جواب دینا مفادِ عامّہ کے خلاف نہ ہوگا تو وہ اس پر غور کرے گی۔ جب شریعت کمیٹی کے تمام ممبران متفقہ طور سے کوئی فتویٰ دیدیں گے تو اس فتوے کو صدر شریعت کمیٹی (مفتی ریاست) "مجلس" کی طرف سے شائع کریں گے۔ لیکن اگر شریعت کمیٹی کے تمام ممبران فتوے سے متفق نہ ہوں تو شریعت کمیٹی اسے "بکثرت آرا" پاس نہیں کرسکتی، بلکہ تمام کاغذات مجلس کے پاس ہدایت کے لئے بھیج دے گی۔ مجلس میں اگر وہ فتویٰ "بکثرت آرا" پاس ہوجاتا ہے تو پھر اُسے سرکاری طور سے شائع کردیا جائے گا۔ مجلس اگر کسی موقع پر ضرورت سمجھے تو خود بھی اپنے تئیں کسی خاص مسئلے پر استفتا کے بغیر فتویٰ جاری کرسکتی ہے۔ ایسے تمام فتاویٰ حکمران کی منظوری کے بعد سرکاری طور سے گزٹ میں شائع کئے جائیں گے اور وہ ریاست کے مسلمانوں کے لئے "قانون" کا درجہ رکھیں گے۔ (ص - ۱۴۹)

ملایا میں نہ صرف یہ کہ فرد کو فتویٰ دینے کی اجازت نہیں ہے بلکہ انفرادی طور سے کھلم کھلا شریعت کی تبلیغ و تعلیم اور مذہبی بحث و مباحثہ بھی قابلِ مواخذہ جرم ہے، کیونکہ شریعت کے اجراء کی تمام ذمہ داری ریاست نے اپنے سر لے لی ہے۔ اسی وجہ سے ہم ایک طرف تو یہ دیکھتے ہیں کہ اگر مسلم والدین اپنے بچوں کو مجلس کے قرآنی مدرسے میں قرآن و دینیات کی تعلیم کے لئے نہیں بھیجتے یا ایسے مدرسوں میں بچے کی حاضری پچاس فی صدی سے کم ہوتی ہے تو باپ یا سرپرست کو ۵ ڈالر جرمانے تک کی سزا ہوسکتی ہے، تو دوسری طرف ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اگر کوئی شخص پبلک میں مذہبی وعظ و نصیحت کی محفل منعقد کرتا ہے یا خود

اپنے ہی گھر میں اپنے خاندان کے ممبروں کے علاوہ دوسروں کو بُلا کر مذہبی بحث و مباحثہ کرتا ہے تو اُسے ۱۰۰ ڈالر جرمانے تک کی سزا دی جاسکتی ہے۔ (ص - ۳۶۱) اسی طرح اگر کوئی شخص مجلس کی اجازت کے بغیر مسجد تعمیر کرتا ہے یا کسی عمارت کو مسجد قرار دے دیتا ہے تو ایسے شخص پر ایک ہزار ڈالر تک جرمانہ ہوسکتا ہے اور اس قسم کی بنائی ہوئی ہر مسجد کو، بشرطیکہ وہ کسی دوسرے غیر متعلق شخص کی ملکیت نہ ہو مجلس کے حکم سے مسمار کر دیا جاتا ہے۔ (ص - ۳۶۲) دستور کی رو سے مجلس کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ جس مسجد یا مدرسے کو چاہے اُسے عارضی طور سے یا مستقل طور سے بند کر دے۔ (ص - ۳۶۲)

مجلس کے فرائض میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ مسلمانوں میں "بدعقیدگی" یا "بے عملی" کا رجحان نہ پیدا ہونے دے۔ اگر کسی شخص کے بارے میں یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ اپنی تحریر یا تقریر کے ذریعے اہل السنۃ والجماعت کے مسلمہ عقائد، یا چاروں فقہی مذاہب میں سے کسی بھی مذہب یا مجلس کے شائع کردہ فتووں کے خلاف میدان ہموار کر رہا ہے تو پھر ایسے شخص پر باقاعدہ شرعی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ اسی طرح اگر اس قسم کا کوئی لٹریچر کسی شخص کے پاس سے دستیاب ہو تو ایسے لٹریچر کو ضائع کر دینے کے علاوہ عدالت اس شخص کو ۶ ماہ قید یا ۵۰۰ ڈالر جرمانہ تک کی سزا دے سکتی ہے۔

(ص - ۳۵۹)

مذہبی معاملات کی دیکھ بھال کے لئے مجلس کی طرف سے باقاعدہ محتسب (INSPECTOR) مقرر ہیں۔ ان کے فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنے حلقے کے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی حالت پر گہری نظر رکھیں؛ بلا عذر جمعہ کی نماز میں نہ آنے والوں اور زکوٰۃ و فطرہ ادا نہ کرنے والوں کے خلاف کارروائی کریں؛ حلقے کے امام کے پاس رکھے ہوئے شادی، طلاق، خلع و رجعت کے رجسٹر کی خانہ پُری کی وقتاً فوقتاً جانچ کرتے رہیں؛ اپنے علاقے کے معمّر اور با اثر لوگوں سے مل کر عام حالات کا جائزہ لیتے رہیں؛ اور متعینہ وقفے سے مجلس کے سامنے اپنے حلقے کی باقاعدہ رپورٹ پیش کریں جس میں مسلمانوں کی خاندانی واجتماعی زندگی، لوگوں کی مذہبی معلومات، مسجدوں کی حالت وغیرہ کی تفصیل درج ہو۔ (ص ۳۶۷)

اگر کوئی شخص شریعت کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتا ہوا پایا جائے تو پولیس کا کوئی آفیسر یا اس کی

غیر موجودگی میں میر محلہ یا اس علاقے کی مسجد کا امام اُسے بغیر کسی وارنٹ کے گرفتار کر کے شرعی عدالت کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ اس قسم کے معاملات کا تصفیہ بالترتیب حسب ذیل اشخاص کر سکتے ہیں۔

۱۔ ریاست کے حکمران کی طرف سے اس قسم کی سماعت کے لئے باقاعدہ مقرر کردہ شخص، (اس کی غیر موجودگی میں)۔

۲۔ مجلس کا مقرر کردہ کوئی شخص، یا

۳۔ وکیل سرکار (PUBLIC PROSECUTOR) یا اس کا نائب، یا

۴۔ پولیس آفیسر، (یا صرف ریاست سیلانگور میں میر محلہ یا میر دیہات) یا

۵۔ علاقے کی مسجد کا امام (بعض ریاستوں میں علاقے کی جامع مسجد کا امام) یا

۶۔ وہ شخص جس نے شریعت کی خلاف ورزی ہوتے دیکھی ہے۔

اس ترتیب میں ذکر کئے ہوئے پہلے شخص کی موجودگی میں دوسرا شخص اور اس کی موجودگی میں تیسرا شخص (وغیرہ وغیرہ) مقدمے کی سماعت کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ (ص ۔ ۳۷۲)

(۴)

اگر ہم اسلامی تعلیمات کا بنظر غائر مطالعہ کریں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ اس دنیا میں صاف ستھری اور پُر اثر زندگی گزارنے کے لئے جس قسم کا لائحہ عمل ہمیں دیا گیا ہے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک کو شریعت کی اصطلاح میں "عبادات" اور دوسرے کو "معاملات" کہا جاتا ہے۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ عبادات کی ادائگی اور تکمیل کو فرد کے ضمیر پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور "معاملات" چونکہ فرد سے آگے بڑھ کر سماج کے ایک بڑے حصے پر پڑتا ہے اس لئے یہ سمجھا جاتا ہے کہ "معاملات" کی ایماندارانہ پابندی اور تکمیل کے لئے فرد کے اوپر سماج کا دباؤ ہونا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ میں اگرچہ عبادات اور معاملات دونوں کی ادائگی اور تکمیل پر بہت زور دیا گیا ہے لیکن جہاں تک ان دونوں کی عدم پابندی کے بارے میں قانون سازی کا تعلق ہے، صرف "معاملات" کے بارے میں قوانین مرتب کئے گئے ہیں۔ مثلاً قرآن میں نماز جمعہ کے سلسلے میں واضح

حکم موجود ہے کہ "مسلمانو، جب جمعہ کی نماز کے لئے تمہیں پکارا جائے تو لپک کر جاؤ (۶۲ : ۹)" لیکن اس کے بعد قرآن یہ نہیں بتاتا کہ اگر کوئی شخص اس حکم پر عمل نہ کرے تو اس کے ساتھ اس دنیا میں کیا برتاؤ کیا جانا چاہیئے۔ دوسری طرف قرآن چوری کرنے یا ناجائز جنسی تعلقات رکھنے سے نہ صرف یہ کہ منع کرتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان حرکات کا مرتکب ہوتا ہے تو پھر اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے؟[1]

مسائلِ شریعت کی مذکورہ بالا تقسیم بظاہر جتنی سیدھی اور سپاٹ نظر آتی ہے درحقیقت اتنی ہی پیچیدہ ہے۔ اگر ہم ایک صالح معاشرے کی بنیاد ڈالنا چاہیں تو ایک مرحلہ ایسا ضرور آئے گا جہاں سماج یا ریاست اس بات پر مجبور ہوگی کہ معاملات کی طرح عبادات کی ادائگی اور تکمیل پر بھی اپنے افراد کو مجبور کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ قانون کی زبان میں ہم زندگی کے ان دو پہلوؤں کو بھلے ہی "معاملات" اور "عبادات" کے ناموں سے الگ الگ پکاریں لیکن اپنے اثر کے اعتبار سے یہ دونوں ایک دوسرے پر اس حد تک منحصر ہیں کہ ایک کی تکمیل دوسرے کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ زندگی کے ان دونوں گوشوں کو ہم خواہ "حقوق اللہ" کہیں یا "حقوق العباد"؛ یا خواجہ نظام الدین اولیا کی زبان میں عبادات کو "طاعت لازم" اور معاملات کو "طاعت متعدی"[2] کہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ جس طرح ایک شخص "حقوق العباد" یا "طاعتِ متعدی" کو ایمانداری سے ادا کئے بغیر "حقوق اللہ" کی ادائگی نہیں کرسکتا اسی طرح "طاعتِ لازم" یا "حقوق اللہ" کی پابندی کئے بغیر "حقوق العباد" یا "طاعتِ متعدی" کی تکمیل بھی آسان نہیں ہے۔

جب ہم اس معہود ذہنی کے ساتھ ملایا میں رائج اسلامی قوانین کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ نظر

---

[1] مثلاً چوری کے بارے میں قرآنی حکم سورہ نمبر ۵ "المائدۃ" آیت نمبر ۳۸۔ نیز زنا سے متعلق سورہ النور نمبر ۲۴ آیت نمبر ۲ ملاحظہ ہو۔

[2] ملاحظہ ہو سیر الاولیا (ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء)، مرتبہ امیر خورد۔ محب الہند پریس، دہلی، ۱۳۰۹ھ ص ۴۱۱)۔ بحوالہ ایم۔ مجیب، دی انڈین مسلمس، لندن، ۱۹۶۷۔ ص ۱۲۶۔

آتا ہے کہ وہاں کے مسلم قانون سازوں نے شریعتِ اسلامیہ کو بحیثیت مجموعی اپنے سامنے رکھا ہے۔ انھوں نے یہ نہیں کیا ہے کہ "طاعت لازم" کی ادائگی کو بالکلیہ فرد کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ملایا کا مسلمان باشندہ اگر ایک طرف اجتماعی اور خاندانی زندگی کو شریعت کے مطابق گزارنے پر مجبور ہے تو دوسری طرف وہ اپنی انفرادی زندگی میں بھی "حقوق اللہ" (روزہ، نماز، حج وغیرہ) کے لئے اللہ کے علاوہ ریاست کے سامنے بھی جواب دہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ ملایا میں حقوق اللہ کی ادائگی میں کوتاہی کرنے والا شخص بھی اسی طرح ریاست کی نظروں میں مجرم ہے جس طرح حقوق العباد کی تکمیل نہ کرنے والا شخص۔

یہاں یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے کچھ جرم ایسے ہیں جن کے لئے قرآن میں سزائیں بھی متعین کردی گئی ہیں، مثلاً چوری کے لئے قطع ید (قرآن ۳۸ : ۵)، یا زناکاری کے لئے درّے لگانا (قرآن ۲ : ۲۴)۔ انھیں ہم "حدود" کہتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سارے جرم ایسے ہیں جن کی سزائیں قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ ایسے جرموں کی سزا کا تعین شریعت نے ریاست ("اولوالامر") کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ اس قسم کی سزائیں تعزیرات کہلاتی ہیں۔ مسلمانوں کا عام خیال یہ ہے کہ حدود اللہ میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ نہیں کی جا سکتی (اگرچہ اس زمانے میں بعض مسلمان مفکرین اس بات کے قائل ہیں کہ ایک خاص حد میں رہتے ہوئے حدود اللہ میں بھی ترمیم و تبدیلی کی گنجائش موجود ہے[۵۱])۔ یہ خیال کہ مسلمانوں نے اپنے سیاسی اقتدار کے زمانے میں قرآنی سزاؤں کی لفظ بہ لفظ پابندی کی ہے، تاریخی حیثیت سے درست نہیں ہے[۵۲]۔ بہرحال یہ موقع اس بحث میں پڑنے کا نہیں ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا، لیکن اس سلسلے میں اتنی بات ذہن میں ضرور رکھنی چاہیئے کہ ماضی میں جن لوگوں نے

---

۵۱ اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، مصنف کا مقالہ، "پاکستان اور قانونِ شریعت" سہ ماہی رسالہ "اسلام اور عصرِ جدید" نئی دہلی جلد ۱ شمارہ ۱، ۱۹۶۹ء، ص ص ۹۔۷ مسلسل۔

۵۲ مثلاً شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۲)، اپنے زمانے کے عمالِ حکومت کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
"...کیا سبب ہے کہ اس ملک میں گزشتہ ۶ صدیوں سے حدود اللہ پر عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے...."
(تفہیمات الٰہیہ ۱، ۱۰۲، ۲۶۶)

قانونِ شریعت کی تدوین کا اہم کام انجام دیا ہے۔ خود انھوں نے "حدود اللہ" پر عمل درآمد کو مختلف حالات کے پیشِ نظر اس حد تک محدود کر دیا ہے کہ اب ان پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا انسانی استطاعت کے باہر ہے نتیجتاً ایک حساس "جج اپنے ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ ڈالے بغیر ایک چور کو جیل یا جرمانے کی سزا تو دے سکتا ہے لیکن "قطعِ ید" کے فیصلے پر دستخط کرنے کے لئے اس کا ہاتھ شاید ہی اٹھ پائے۔[۱] بہر حال اس بحث سے قطع نظر کہ ماضی میں قرآنی سزاؤں پر کس حد تک عمل درآمد ہوا ہے، یا اس زمانے میں ان سزاؤں پر عمل ممکن ہے یا نہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ ملایا کی کسی بھی ریاست میں شریعت کی خلاف ورزی کرنے والوں کو "قرآنی سزائیں" نہیں دی جاتیں، بلکہ ہر قسم کے جرم پر، خواہ وہ نظری طور پر حدود اللہ کی صف میں آتا ہو یا تعزیرات کی، صرف جیل یا جرمانے کی سزا ہوتی ہے۔ (ص ۲۱۶)

(۵)

اب ہم مثال کے طور پر چند ان حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ذکر کریں گے، جن پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ملایا کا ایک مسلمان باشندہ اپنے کو وہاں کی شرعی عدالت کے سامنے جوابدہ پاتا ہے۔

جمعہ کی نماز

ملایا کے ہر مسلمان عاقل بالغ مرد کے لئے قانوناً یہ ضروری ہے کہ وہ پابندی کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کیا کرے، سوائے اس کے کہ اس کے پاس کوئی ۲
ایسا عذر موجود ہو جو ریاست کے قوانین میں "عذرِ شرعی" کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ مثلاً اس کی غیر حاضری کی وجہ سخت بارش ہو، یا اس کے مکان سے قریب ترین جامع مسجد ۳ میل سے زیادہ کے فاصلے پر ہو، یا کسی خاص وجہ سے امام جامع مسجد نے اُسے غیر حاضری کی اجازت دے دی ہو، یا وہ بیمار ہو، یا سفر میں ہو، یا جس علاقے میں وہ رہتا ہو وہاں مسلمانوں کی تعداد ۴۰ سے کم ہونے کی وجہ سے اس علاقے کے مسلمانوں پر جمعہ کی جماعت ہی فرض نہ ہو۔ عذرِ شرعی کے بغیر جماعتِ جمعہ سے غیر حاضر رہنے والوں پر شرعی عدالت کی طرف سے (مختلف ریاستوں میں) ۱۰ ڈالر سے لے کر ۲۵ ڈالر تک

---

[۱] اس نکتے کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: احمد فتحی بہنسی کی کتاب الجرائم فی الفقہ الاسلامی، طبع ثانی، قاہرہ، ۱۹۶۲ء۔

جرمانہ کیا جاتا ہے۔ ریاست پیرک میں تو جماعت کے علاوہ خطبے میں، اور اگر نماز کے بعد وعظ ہو رہا ہو تو اس میں بھی حاضری ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ان مواقع پر غیر حاضر رہتا ہے تو اس پر ۵ ڈالر تک جرمانہ ہو سکتا ہے۔ (ص ۔ ۳۳۱) مجلس کی ہدایات کے بموجب یہ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے ہی محلے یا قصبے کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرے۔ اگر کسی وجہ سے وہ اپنے علاقے کی مسجد میں حاضر نہیں ہو سکتا تو اُسے اپنے علاقے کے امام کو پہلے سے مطلع کرنا پڑے گا، ورنہ وہ نماز جمعہ سے غیر حاضر سمجھا جائے گا۔

پنج وقتہ نماز کے بارے میں کوئی وضاحت ملایا کے اسلامی قوانین میں موجود نہیں ہے لیکن اگر ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ ہر علاقے اور قصبے میں مجلس کی طرف سے محتسب مقرر ہوتے ہیں جن کے فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنے علاقے کے مسلمانوں کی "مذہبی زندگی" کے بارے میں باقاعدہ رپورٹ مجلس کے پاس بھیجتے رہیں تو پھر یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ سزاؤں کے عدم ذکر کے باوجود لوگ عام طور سے پنج وقتہ جماعت کی پابندی کرتے ہوں گے۔

رمضان کے روزے

ملایا میں اگر کوئی مسلمان رمضان کے دنوں میں کھاتا پیتا یا تمباکو نوشی کرتا ہوا نظر آئے گا تو اس پر اسلامی قوانین کے تحت ۲۵ ڈالر تک جرمانہ کیا جائے گا۔ کسی بھی ہوٹل والے کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کے ہاتھ رمضان کے دنوں میں اشیائے خوردنی فروخت کرے۔ اگر کوئی ہوٹل اس جرم کی خلاف ورزی کرتا ہوا پایا جائے گا تو نہ صرف یہ کہ کھانا کھلانے والے ملازم سے باز پرس ہوگی بلکہ ہوٹل کے مالک پر بھی ۲۵ ڈالر تک جرمانہ کیا جائے گا، اِلّا یہ کہ ہوٹل کا مالک عدالت میں یہ ثابت کر دے کہ اس کی واضح ممانعت کے باوجود ملازم نے یہ حرکت کی ہے۔ (ص ۔ ۳۳۲) بعض ریاستوں کے قوانین میں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ اگر کوئی مسلمان روزہ نہ رکھنے کے جرم میں ایک سے زیادہ عدالت میں پیش کیا جائے گا تو پھر اس پر ۲۵ ڈالر کے بجائے ۵۰ ڈالر تک جرمانہ (ص ۔ ۳۳۵)۔

زکوٰۃ

زکوٰۃ اور فطرے کا ادا نہ کرنا جرم قابلِ سزا ہے جن لوگوں پر یہ رقمیں واجب ہوں گی اور وہ لوگ وقت پر ادائگی نہ کریں گے تو ان پر جرمانہ ہوگا اور ان کی جائداد کو بحقِ سرکار ضبط کرکے اس سے مطالبہ وصول کیا جائے گا۔ (ص ۳۳۵، مسلسل) اگرچہ دوسرے مذاہب فقہیہ کی طرح فقہ شافعی بھی فرد کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے ذمہ کی زکوٰۃ یا فطرہ کو خود ہی مستحقین میں تقسیم کردے لیکن ملایا میں رائج قوانینِ شریعت کی رُو سے زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم صرف ریاستی بیت المال میں جمع کی جاسکتی ہے۔ رقم اگر بیت المال میں جمع نہ کرائی جائے تو حکومت مطالبے کو "ادا شدہ" تسلیم نہیں کرے گی۔

نشہ آور اشیا

ریاستہائے ملایا میں از رُوئے قوانینِ شریعت مسلمانوں کے لئے نشہ آور اشیا کی خرید و فروخت اور اس کا استعمال قطعاً ممنوع ہے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو (مختلف ریاستوں میں) ۲۵ ڈالر سے لے کر ۱۰۰ ڈالر تک جرمانے کی سزا ہو سکتی ہے ایک ریاست میں نہ صرف یہ کہ خرید و فروخت اور اس کا استعمال ممنوع ہے بلکہ اپنے پاس نشہ آور اشیاء کو رکھنا بھی جرم ہے۔ (ص ۳۲۹) ریاست جوہور کے "اکسائز قوانین" میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ لائسنس یافتہ شراب فروخت کرنے والے دکاندار اپنی دکانوں میں کسی بھی مسلمان کو داخل نہ ہونے دیں گے، سوائے ان مسلمانوں کے جو اپنے سرکاری فرائضِ منصبی کو ادا کرنے کے لئے اس دکان میں داخل ہونے کے قانونی طور سے مجاز ہیں۔ اگر کسی شراب خانے میں کوئی غیر مجاز مسلمان نظر آئے گا تو ملزم مسلمان اور دکاندار دونوں قانون شکنی کے مرتکب سمجھے جائیں گے، سوائے اس کے کہ دکاندار یہ ثابت کردے کہ اسے اس شخص کے مسلمان ہونے کا علم نہیں تھا۔ (ص ۳۳۰) چند ریاستوں نے اپنے یہاں کے شراب خانوں پر یہ پابندی بھی عائد کر رکھی ہے کہ وہ مسلم یا غیر مسلم کسی بھی عورت کو ملازم نہیں رکھ سکتے۔ اگر کسی شراب خانے میں کوئی ملازم عورت پائی جائے گی تو اس شراب خانے کا لائسنس ضبط کرلیا جائے گا۔ (ص ۳۳۰)

ناجائز جنسی تعلقات

باستثنائے سنگاپور (ص ۳۲۹)، ریاستہائے ملایا میں مسلمانوں کو اپنی بیویوں کے علاوہ کسی بھی مرد یا عورت سے جنسی تعلقات

قائم کرنا جرم ہے، اور اس کی سزا دُرّے کے بجائے جیل یا جرمانہ ہے۔ بعض ریاستوں میں جیل اور جرمانہ دونوں قسم کی سزائیں دی جاتی ہیں۔ (ص ۳۲۱ مسلسل) نہ صرف یہ کہ باقاعدہ جنسی تعلقات ممنوع ہیں بلکہ ہر وہ ایسی حرکت ممنوع ہے جو نتیجتاً جنسی تعلقات میں ممتد ہوتی ہو۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان مرد یا عورت کسی غیر محرم کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں پکڑا جائے تو اُسے "خلوت" کے جرم میں ۳ ماہ تک جیل یا ۱۰۰ ڈالر تک جرمانے کی سزا دی جاسکتی ہے۔ (ص ۳۲۳) ریاست پیرک میں رائج قانونِ شریعت کی رُو سے، اگر کوئی شخص کسی کنواری لڑکی کو اس کے والدین یا قانونی سرپرست کی نگرانی سے بہلا پھسلا کر بھگالے جائے تو اُسے، خواہ اُس نے اُس لڑکی سے جنسی تعلقات قائم کئے ہوں یا نہ کئے ہوں، ایک سال تک قید کی سزا دی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ جرمانے کے طور پر اس شخص سے لڑکی کے مہرِ مثل کی دُگنی رقم کے بقدر رقم وصول کی جائے گی۔ (ص ۳۲۵)

تبدیلِ مذہب

تبدیلِ مذہب کے سلسلے میں ملایا کی مختلف ریاستوں میں جو قانون رائج ہے اس کی رُو سے کسی مسلمان کو اسلام چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، ہاں دوسرے مذاہب کے لوگ اسلام میں داخل ہو سکتے ہیں۔ جس شخص کے ہاتھ پر کوئی شخص اسلام قبول کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی اطلاع "مجلس" کے دفتر میں کرے۔ اور اسلام لانے والے شخص کے بارے میں پوری تفصیلات درج کرائے۔ کسی بھی مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ ایک نابالغ غیر مسلم کو مسلمان کرے۔ ایک نابالغ شخص (۱۸ سال کی عمر تک) اسی وقت مسلمان ہو سکتا ہے جب اس کے والدین یا قانونی سرپرست اسے مذہب تبدیل کرنے کی اجازت دے دیں۔ ہر نیا مسلمان ہونے والا شخص جس کی عمر ۱۴ ½ سال سے زیادہ ہوگی کم از کم ۳ ماہ تک "مجلس" کی زیرِ نگرانی رہے گا اور اس عرصے کے اس کے تمام اخراجات مجلس برداشت کرے گی۔ ۳ ماہ کی مدت گزر جانے کے بعد بھی اگر وہ شخص اسلام پر باقی رہنا چاہے گا تو اُسے باقاعدہ مسلمان تسلیم کر لیا جائے گا ورنہ "مجلس" اپنے خرچ سے اُسے اُس کے والدین کے پاس واپس پہنچا دے گی۔ اگر کسی نئے مسلمان کی عمر ۱۴ ½ سال سے کم ہے تو پھر قاضی اس کے اسلام کو تسلیم نہیں کرے گا اور اُسے مجلس

کے خرچ سے اس کے والدین کے پاس واپس کر دے گا۔ (ص ۲۵۰-۲۵۳)

(۶)

اس طرح جب ہم ملایا میں رائج قوانینِ شریعت کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ملایا کے مسلم قانون سازوں کی نظر میں قانونِ شریعت کی اہمیت کسی طرح بھی ان کے اپنے "قانونِ عادت" سے کم نہیں ہے۔ ہر اس موقع پر جہاں قوانینِ شریعت اور قوانینِ عادت میں انھیں ٹکراؤ ہوتا نظر آیا ہے انھوں نے ایک ہاتھ میں "جامِ شریعت" اور دوسرے ہاتھ میں "سندانِ عشق" کو پوری طرح سنبھال کر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر ہم تعددِ ازدواج کے مسئلے کو لے سکتے ہیں، جہاں ملایا کے مسلم قانون سازوں نے شریعت کی لفظ بہ لفظ پیروی کرتے ہوئے ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت مردوں کو دے دی ہے وہاں اس سلسلے میں شوہروں پر لگی ہوئی سماجی پابندیوں کی بھی اس طرح ہمت افزائی کی ہے کہ ان کے لئے عملاً دوسری شادی ممکن ہی نہیں رہ گئی ہے۔

اس سلسلے میں اتنی بات اور ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ملایا میں شریعت سے متعلق تمام قوانین صرف مسلمانوں پر نافذ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ملایا کی بعض ریاستوں کے دستور میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم، کسی مسلمان کو، اس علم کے باوجود کہ وہ مسلمان ہے، خلافِ شریعت کام کرنے کی ترغیب دے گا یا اس سلسلے میں کسی طرح سے بھی ممد و معاون ہوگا تو ایسا غیر مسلم بھی قانونِ شریعت کی رُو سے مجرم ہوگا اور اس پر شرعی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ (ص ۴۰۵) اسی کے ساتھ ساتھ ملایا کے دستور میں اس بات کی بھی ضمانت موجود ہے کہ مسلمانوں سے متعلق شرعی قوانین ملک کے دستور کا ناقابلِ تبدیل حصہ ہیں اور ان میں کوئی بھی (سیکولر) عدالت یا حکومت کسی قسم کی بھی تبدیلی یا ترمیم و تنسیخ کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ (ص ۳۲۹)

فریدہ بیگم

اردو زبان کی تمدنی اہمیت*

کسی قوم کا تہذیب و تمدن اس کے مخصوص مزاج، رسوم و عقائد اور طرزِ فکر سے عبارت ہوتا ہے۔ اس طرزِ فکر کو ظاہر کرنے کا ذریعہ ایک مخصوص زبان ہوتی ہے۔ زبان ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم کسی تہذیب کو اس کے فطری روپ میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے کسی بھی قوم کے تمدنی ارتقا اور تہذیبی نشوونما کی جھلکیاں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ زبان ایک ایسے شخص کی مانند ہے جو اپنے تجربات، مشاہدات اور محسوسات سے خود کو بناتا، سنوارتا اور نکھارتا ہے اور جس طرح شخصیت کو بنانے میں لچک ایک لازمی عنصر ہے اسی طرح وہی زبان مقبولِ عام ہو سکے گی جس کی سرشت میں لچک ہو اور جو ضرورت، مقام اور وقت کے پیشِ نظر خود کو بدل سکے۔

زبان اور تہذیب کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی تہذیب کسی نئی زبان کی داغ بیل ڈالتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زبان اور تہذیب ایک دوسرے کو اس طرح متاثر کرتی ہیں کہ دونوں کی ترقی اور وسعت کی نئی راہیں نکل آتی ہیں۔

ان امور کی روشنی میں ہم یہ دیکھیں گے کہ آیا زبانِ اردو بھی کسی قوم یا تہذیب کا آئینہ بنی ہے۔ دوسرے

---

* فریدہ بیگم نے جامعہ میں تین سال تعلیم پائی۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں انھوں نے بی اے کیا۔ اب مسلم یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) سالِ اول کی طالبہ ہیں۔ یہ مقالہ انھوں نے، جب وہ جامعہ کالج میں بی اے فائنل میں تھیں، انجمن اسلام بمبئی کے ایک انعامی مقابلے کے لیے لکھا تھا اور انجمن نے انھیں چھ سو روپے کا پہلا انعام دیا تھا۔ ہم انجمن اسلام بمبئی کی اجازت اور ان کے شکریہ کے ساتھ اسے شائع کرتے ہیں۔

الفاظ میں تہذیبی و تمدنی اعتبار سے اردو زبان کسی اہمیت کی حامل ہے یا نہیں ؟

کچھ لوگوں کے خیال میں ماضی ایک ویران صحرا ہوتا ہے جہاں ہر سُو تاریکی راج کرتی ہے۔ وہاں کوئی دیپ نہیں جھلملاتا جو ان کے حال کو روشنی کی ننھی کرن ہی دے سکے۔ لیکن بعض لوگوں کو بیتے دنوں کی ہر پگڈنڈی پر چراغاں کا سماں نظر آتا ہے۔ ماضی ان کے لئے روشن اور پُر نور ہوتا ہے جس کی ضیا سے وہ حال کو تابناک اور مستقبل کے لئے مزید نور کے امکانات پیدا کر سکتے ہیں۔ اردو زبان کا ماضی بھی اتنا ہی پُر نور ہے۔ گذرے ہوئے دنوں کا ہر واقعہ اردو زبان کی موجودہ صورت کی ایک اہم کڑی ہے۔

مسلمان فاتح کی حیثیت سے ہندوستان آئے لیکن انھوں نے اسے ایک مفتوح ملک کی طرح نہیں دیکھا بلکہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھا اور یہیں کے ہو رہے۔ وہ مقامی لوگوں سے ربط قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ اجنبیت کی دیواریں گر جائیں اور وہ فاتح اور مفتوح کے بندھن میں بندھنے کی بجائے اخوت کے اٹوٹ رشتے میں منسلک ہو جائیں۔ قرائن کہتے ہیں کہ انھوں نے کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ جبراً اپنی زبان یا طرزِ معاشرت کو مقامی لوگوں پر ٹھونسیں اور نہ ہی وہ اس بات کے خواہش مند رہے کہ دیسی تہذیب کو ختم کر دیں مقامی زبان اور ادب کو مٹا دیں، ہندوؤں کے خیالوں پر پہرے بٹھائیں اور ان کے عمل پر نظر رکھیں۔ وہ ہمیشہ باہمی اشتراک کے خواہاں رہے، خواہ وہ عملی اشتراک ہو یا فکری اتحاد۔ وہ ہمیشہ اس جستجو میں رہے کہ دوسری قوموں اور تہذیبوں کی اچھی باتیں اور خوبصورت چیزیں اپنائیں اور دوسری قومیں بھی ان کی خوبیوں کی تقلید میں عار نہ محسوس کریں۔ ہر وہ خیال جس کا کوئی تعمیری پہلو ہوتا ہے، جلد یا بدیر، پورا ضرور ہوتا ہے۔ تخریبی خیال تو بارش کی ان بوندوں کی مانند ہوتے ہیں جو دھوپ میں کچھ دیر برستی تو ہیں لیکن پھر کچھ ہی لمحوں بعد وہی کڑی دھوپ ہوتی ہے۔ مسلمان فاتحین اور مقامی ہندوؤں نے خوشگوار تعلقات استوار کرنے کے لئے پہلا تعمیری قدم یہ اٹھایا کہ معاشرتی ربط و ضبط اور ملکی و کاروباری ضرورتوں کے پیشِ نظر ایک دوسرے کی زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے شروع کئے۔ خلوصِ نیت سے اٹھایا گیا یہ پہلا قدم تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ دو اجنبی ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ خیال کیجئے، دو مختلف تہذیبیں۔ ایک کا دھرم اصنام پرستی، دوسرے کا ایمان توحید پر یقینِ کامل، ایک کی رسوم دوسرے سے قطعاً جدا، ایک کا طرزِ معاشرت دوسرے کے لئے بالکل نیا

لیکن اتنا فرق ہونے کے باوجود اپنے خول میں مگن رہنے کی بجائے خارجی اثرات کو صدق دلی سے قبول کرلینا تعمیری پہلو اور اثباتی نقطۂ نگاہ تھا اور ہر تعمیر میں کوئی نئی شے پوشیدہ ضرور ہوتی ہے۔ اثبات کا کچھ نہ کچھ حاصل ضرور ہوتا ہے اور یہ حاصل وہ بولی تھی جسے آج ہم اردو زبان کے نام سے جانتے ہیں۔

یہ زبان ایک انوکھے طرزِ فکر کا نتیجہ تھی۔ اس سرزمین پر دو مختلف قوموں کے باہمی اشتراک سے ایک مخصوص طرزِ فکر کا پودا لگایا گیا تھا پھر اس پودے میں سے ایک کونپل پھوٹی تھی جس کی آبیاری دو مختلف تمدنوں کے علم بردار کر رہے تھے۔ اس کونپل میں مختلف رنگوں کا ایک حسین امتزاج تھا۔ یہ رنگ عربی، عجمی ہندی تھے۔ مختلف رنگوں کی ہم آہنگی نے ایک مسحور کر دینے والا تاثر بخشا۔ عربی، فارسی اور ملکی زبان کے اختلاط سے پیدا ہونے والی زبانِ اردو کی کونپل ان قوموں کے تہذیبی اور تمدنی اتحاد کا بے نظیر نمونہ بن گئی۔ یہ تمدنی اختلاط کسی جبر کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ ایک فطری عمل تھا اور اس فطری اصول پر زبانِ اردو از خود بنتی، سنورتی اور حالات و ضروریات کے سانچے میں ڈھلتی اور پھیلتی رہی۔ مسلمان اپنے ملک کا طرزِ فکر و احساس لائے تھے۔ وہ شیریں و فرہاد کے دیس کے باسی تھے اور کوہِ بے ستون اور وادیٔ نیل سے ان کو جذباتی لگاؤ تھا۔ وادیٔ گنگ و جمن میں انھوں نے اپنے دیس کی وادیوں اور اس میں بکھرے تہذیب و تمدن کے پھولوں کا پرتو دیکھا اور ایک نئی زبان میں انھوں نے نغمے بکھیرنا شروع کیے۔ اور پھر کالیداس اور سعدیٔ شیراز کی روحیں ایک ہوگئیں۔

سیاہ راتیں روشن صبحیں بنتی گئیں، ماہ و سال گذرتے گئے، سلطنتیں بنتی اور بگڑتی گئیں۔ نئے فاتحین آتے رہے، پرانے نقش ونگار باقی رہ گئے اور پھر . . . . . حالات یوں ہوئے کہ زبانِ اردو کی ادھ کھلی کلی دکن کے حکمرانوں کے ایوانوں کے حسن کو دوبالا کرنے لگی۔ ان حکمرانوں کو ہندوستان سے جذباتی لگاؤ تھا اور ان کی وطن دوستی بے مثال تھی۔ انھوں نے سادگی اور معصومیت کے پانی سے اس پودے کی آبیاری کی۔ دکن نے زبانِ اردو کو حسنِ سادہ و معصوم کی تصویر بنا دیا۔ انھوں نے اپنے تمدن کے ہر پہلو کو سادہ زبان میں ادا کرنے کی سعی کی ـــــ پھر جب اس پُر بہار معاشرے پر خزاں کی زردی چھا گئی اور سیاسی انتشار زیادہ ہوگیا تو یہ حسنِ سادہ بھی کملا گیا۔ انھیں اپنے طرزِ تمدن سے جذباتی لگاؤ تھا وہ جاگیردارانہ نظام کے حامی تھے

انھیں زندگی سے پیار تھا اور حوصلہ و ہمت ان کا ایمان تھا۔ لیکن سیاسی پراگندگی نے ان کی روحوں کو بھی زخمی کر دیا تھا۔ وہ حسرت و یاس کا مجسمہ بن گئے۔ حال ان کے لئے بیزار کن تھا اور مستقبل سے وہ شاکی تھے وہ اب بھی نغمے بکھیر رہے تھے لیکن ان نغموں کی لَے افسردہ ہوگئی تھی۔ زبان وہی تھی لیکن اس میں ایک صحت مند تمدن کی بجائے بیمار تہذیب کی روح کا کرب تھا۔ وہ جذبات جیسے بھی تھے، وہ تہذیب جو بھی تھی، زبانِ اردو اس کے نقوش کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھی۔

دم توڑتی ہوئی تہذیبوں اور سسکتے ہوئے معاشروں کی ترجمان زبانِ اردو تھی لیکن حقیقت کی ترجمانی میں بھی ہزاروں رنگوں کی میناکاری تھی۔ بکھرے اڑے ہوئے تمدنی سرمائے کا ماتم تو تھا لیکن باوقار اور باشعور انداز میں۔

زبانِ اردو کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے بنا رہا اور روزمرہ کی زندگی میں ہی کسی قوم کا تمدن نہاں ہوتا ہے ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ فارسی زبان درباری اور علمی زبان تھی اور اس کی اہمیت اتنی بڑھی تھی کہ اسے تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ دوسری جانب زبانِ اردو بے نمود ذرّے سے مہر منور بنتی رہی۔ اس کی کرنیں عوام کے دلوں کو منور کر رہی تھیں۔ کسی قوم کے تمدن کے بہترین گہوارہ وہ گلی کوچے ہوتے ہیں جہاں عوام بستے ہیں۔ میر کی جامع مسجد کی سیڑھیوں سے زبان کی سند لینے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہاں کی زبان ایک مخصوص تہذیب کی آئینہ دار تھی وہ تہذیب دلی کی تہذیب تھی اور اس تہذیب کی تصویر کشی کرنے والی زبان ایک مخصوص زبان تھی جو دلی کی ٹکسال میں ڈھلی تھی جس میں سادگی بھی تھی اور پرکاری بھی، اور حسنِ سادہ کی دلکشی سے کون مسحور نہ ہوگا۔ یہ اس زبان کے حسن کا جادو ہی تھا جس نے نہ صرف عوام کے دلوں کو مسحور کیا تھا بلکہ خواص کو بھی اپنے حسن کی دلکشی سے پرچا لیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جس میں قلعہ اور بیرونِ قلعہ کا فاصلہ کم سے کم تر ہوتا جاتا تھا اور یہ زبان تیغِ ہندی تھی جس کے بادشاہ سے عوام تک سب یکساں طور پر گھائل ہوتے اس نے دلی کے کاخ و کو، دونوں ہی کو اوراقِ مصوّر بنا دیا تھا۔ ہر شکل تصویر کی مانند نکھری ہوئی اجلی اجلی سی تھی اور ہر تصویر کو الفاظ کی سادگی نے نیا حسن بخش دیا تھا۔ دلی کی تہذیب اردو کے روزمرہ اور محاوروں میں سمٹ آئی تھی۔ ہر لفظ تہذیب و تمدن کے خد و خال واضح کرنے کا ایک پرکار ذریعہ بن گیا تھا۔ سب ہی

بے چین تھے کہ اس کی شیرینی اور رس کو اپنے اندر جذب کرلیں، کہیں شعراء کا ہجوم تھا کہیں ادیبوں کا مجمع اور دربار کے ایوان ہائے رنگین میں بھی اس نوخیز کلی نے بار پایا تھا۔ اسی وجہ سے اردو کے ایک نامور ادیب کے الفاظ میں " اس میں بازار، خانقاہ اور دربار تینوں کی دھوپ چھاؤں دکھائی دیتی ہے "۔

عوام کی یہ زبان بادشاہ، صوفی اور تجارت پیشہ تینوں کا ہی مشترکہ سرمایہ بنی ہوئی تھی۔ تجارت اور عام بول چال میں پابندیاں کم ہوتی ہیں، مذہب و اخلاق کی حد بندیاں بھی زیادہ حائل نہیں ہوتیں۔ یہاں آسانی اور سہولت کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ پابندیوں کی غیر موجودگی میں جو شے ارتقا پذیر ہوتی ہے اس میں خاص دل نشینی ہوتی ہے۔ اردو کی دل نشینی کا باعث بھی یہی ہے کہ بازار اور روزمرہ کی زبان بنی۔ اردو کے ارتقائی دور میں بازار پر دیسی عوام کا غلبہ تھا چنانچہ انھوں نے اردو زبان کی نشو و نما میں نمایاں کردار ادا کیا۔

صوفیوں اور عالموں نے ہمیشہ اس زبان کی سرپرستی کی ہے۔ اس کے خمیر میں جو طرز مٹھاس ہے وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کو مؤثر بنا دیتی ہے۔ صوفیائے کرام نے مذہب اور اخلاق کا درس دینے کے لئے زبان اردو کا سہارا لیا کیونکہ یہ عوام کی زبان تھی۔ انھوں نے اسے ایک نئی لے سے روشناس کیا لیکن یہ لے خالص اسلامی نہ رہی بلکہ اس میں اخلاق کا عنصر غالب رہا اور اس اخلاقی عنصر کی وجہ سے (جو کسی تمدن کی واضح خصوصیت ہوتی ہے) اردو زبان میں صرف اسلامی عقائد و نظریات کی تصویر کشی ہی نہیں کی گئی بلکہ دوسرے مذاہب اور خاص طور سے ہندوستانی مذاہب اور رسوم و عقائد کا احترام باقی رہا اور اس طرح مذہبی واعظوں کے پس پردہ بھی باہمی رواداری اور بالائے مذہب و ملت سوچنے کا انداز باقی رہا۔

اردو نے سادگی و پرکاری کو اپنا شعار بنا لیا اور تکلف و تصنع سے خود کو پاک رکھا۔ بوجھل پن اور ثقالت اس سے برداشت نہ ہو سکی۔ عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ اسی وجہ سے رواج نہ پا سکے کہ وہ عوام کی بولی ٹھولی کی خراد پر کھرے ثابت نہیں ہوئے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ثقیل الفاظ کو اردو نے اپنے قالب میں ڈھال لیا اور پھر ان میں اتنی مٹھاس پیدا ہوگئی کہ وہ عوام کا ذہنی سرمایہ بن گئے۔ یہ تراش خراش اسے مزید حسن بخشتی رہی اور اس حسن کی سادگی کو پرکار بناتی رہی۔ مختلف زبانوں کے الفاظ اردو نے کچھ ایسے مربوط انداز میں اپنائے اور انھیں اپنے مزاج کے مطابق اس طرح ڈھالا کہ پھر ان کی اصل معلوم کرنا مشکل ہوگیا

دوسری تہذیبوں کی خصوصیات کو اپنانا ہی اس کی خوبی نہیں بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر پیکر نو وجود میں لانا اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ زبان صرف خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ جذبات کی مصور بھی ہوتی ہے، قوموں کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور فکر و فن میں جذبات کی دھڑکنیں سنی جا سکتی ہیں۔ اردو زبان نے مختلف تہذیبوں کی دھڑکنوں کو مخصوص جذبوں کے پردوں میں چھپایا ہے اور پھر ان رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان جذبات کی عکاسی تصور اور تخیل کی معاونت سے ہوتی ہے اور اس کے لیے رمزیت سے بھرپور فضا کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن رمز و اشارہ میں ٹھوس حقائق پنہاں ہوتے ہیں اور حقائق کو پیدا کرنے میں تمدن کا خاص مقام ہوتا ہے۔ ذرا غور کیجیے، میر دلی کی بربادی کا ذکر آنے پر اس کے سو بار لوٹے جانے کا تذکرہ کیوں کرتے ہیں۔ ایک سادہ سے شعر کے ہلکے سے رمز میں کتنی گہری سماجی (جو تاریخی بھی ہے) واقعیت پنہاں ہے۔

زبانِ اردو قدم قدم پر نئے رنگوں میں ڈوبتی گئی۔ ہر جگہ نئے نئے روپ بدلتی رہی اور ہر مقام پر اس کی فضا کے موافق ڈھلتی رہی۔ وادیٔ جمن میں یہ ایسی لہروں کی مانند نظر آتی ہے جو بڑی آہستگی، وقار اور متانت کے ساتھ اٹھتی ہیں اور پھر ایسے ہی دھیمے پن سے واپس لوٹ جاتی ہیں۔ کہیں کوئی جھجک نہیں، کوئی رکاوٹ نہیں، صرف صاف و شفاف لہریں ہیں جو مخصوص دھیمی موسیقی کی سی تانوں پر سادہ و پرکارانہ انداز میں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

اودھ کی رنگین فضاؤں میں یہ زبان مختلف رنگوں کو اپنے اندر جذب کیے نظر آتی ہے۔ یہ اس کا بالکل نرالا روپ ہے۔ کہاں وہ دلی کی گلیوں کی سادگی و پرکاری اور کہاں لکھنؤ کے کوچوں کی رنگینی و زیبائی! وہاں روزمرہ کی زبان تھی جس میں کوئی بناوٹ نہ تھی اور یہاں ہر لفظ ایوانِ مرصع پر تاج زرنگار لگائے رونق افروز نظر آتا ہے۔ ہر سو معنی کی منقش محرابیں ہیں جہاں سے قافلۂ خیال گذرتا ہے۔ ہر جگہ تکلف و اہتمام، ہر سو رنگینی و پرکیفی اور بادۂ رنگیں کا خمار ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ زبانِ اردو کا یہ کون سا رخ ہے؟ اس کے پیکر آبی کو قبائے رنگیں کس نے پہنا دی ہے؟ میر نے اس وادیٔ رنگ و بو میں خود کو اجنبی کیوں محسوس کیا تھا؟

یہ سب اس لیے ہے کہ زبانِ اردو اب ایسے آغوش میں ہے جس کا آنچل رنگین ہے۔ یہ آغوش

ایک ایسی تہذیب کا ہے جس کی روح میں رنگینی و پُرکیفی رچ گئی ہے۔ یہ وہ تہذیب ہے جہاں ہر سُو رنگ اٹھتے ہیں اور خوشبوؤں کے طوفان اٹھتے ہیں، تصنع اور بناوٹ کی میناکاری ہر جا نمایاں ہے۔ ظاہری حسن اور حسنِ آداب پر نظریں ہیں، ہر شخص حال سے بے نیاز، حقیقت سے رُخ موڑ کر، خیالوں کی رنگین وادیوں میں اتر کر خیالی بادۂ رنگینی کے سرور میں ڈوب کر خود کو فراموش کر دینے میں ہی خوش نظر آتا ہے، یہی لکھنوی تہذیب کی خصوصیت ہے۔ یہاں کے لوگوں کو صاف گوئی سے گریز اور سہل انداز اپنانے میں عار ہے کہ اس میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ انھیں انفرادیت سے پیار ہے اور تکلف اور آرائش و زیبائش سے محبت، یہاں کے باشندے آزاد منش ہیں انھیں آزادی سے رغبت ہے اور پابندیوں اور بندشوں سے نفرت! اخلاقی قدروں کو وہ پسند کرتے ہیں لیکن ان کے نزدیک اخلاقی قدروں کا تصور کچھ اور ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو اور ہر حسن کی تصویریں بنانا چاہتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں رنگ و بو کی دنیا ہے پھر کیوں نہ ہم اس رنگ و بو کے چمن میں زندگی کے ہر شگوفے کی خوشہ چینی کریں۔ انھوں نے اپنے گرد بکھری ہوئی خوبصورتی کو الفاظ کے سینے میں اتارا اور خارجی حسن کی نقاشی کی۔ خارجی حسن کا سحر پورے معاشرے پر طاری تھا اور لکھنوی تہذیب و تمدن شوق کی مثنویوں، سرور کی پُر تکلف نثری تحریروں اور جرأت کی غزلوں سے عبارت ہے۔

عورتیں پس پردہ رہ کر تہذیب و تمدن کو بہت سی نئی چیزیں عطا کرتی ہیں۔ وہ کسی نئے تمدن کی استقامت کی امین ہوتی ہیں۔ اردو نے جس جس مقام پر رواج پایا وہاں پردے کی رسم رائج رہی اور پردے کے پیچھے ایک نئی تہذیب ایک نیا طرزِ فکر پرورش پاتا رہا۔ عورتوں میں قوتِ مشاہدہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں باریک بینی کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ امورِ خانہ داری کے علاوہ رسم و رواج اور شادی بیاہ کے امور میں بھی ان کو زیادہ دخل رہتا ہے۔ ان کا اپنا اندازِ گفتگو ہوتا ہے جس میں لطافت و نزاکت بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ بہت سی باتوں کے لئے ان کے اپنے الفاظ، رمز و کنایے اور مثالیں ہوتی ہیں۔ مشکل اور ثقیل الفاظ بھی ان کی "سہولت اور آسانی" کی خراد پر چڑھ کر رواں اور سڈول بن جاتے ہیں، اور پھر وہ بگڑے الفاظ اس طرح زبان زد ہوئے ہیں کہ ان کی اصل کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔

عورتوں کا یہ مخصوص انداز اور طرزِ فکر بھی اردو زبان کا ایک جزو بن گیا۔ اب نہ صرف یہ کہ دربار اور بازار کے طرزِ فکر کی تصاویر اردو میں ملتی ہیں بلکہ گھریلو معاشرت کے نقش بھی اس میں موجود ہیں۔ مولوی نذیر احمد مراۃ العروس اور حالی نے اس پس پردہ جنت کی تصویر کشی کر کے عورت کے نازک جذبات واحساسات اور اس کے اندازِ فکر کو لفظوں کا پیرہن دے کر اردو زبان کی تمدنی اہمیت کو واضح خدوخال عطا کردیئے ہیں

کتنی ہی بہاروں نے خزاں کا زرد لبادہ اوڑھا۔ کتنے ہی سورج ڈوبے اور طلوع ہوئے اور پھر——

ہندوستان کے افق پر فرنگیوں کا سورج طلوع ہوا . . . . بے حد روشن! نہایت تابناک!!

ہندوستان کی بساط تجارت پر نووارد فرنگیوں کا زور ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ان کے نام کا ڈنکا بجنے لگا اور ان کے اقبال کا پرچم لہرانے لگا۔ ان کی تجارت نے سیاست کا اور سیاست نے تجارت کا روپ لے لیا اور پھر انھوں نے بساطِ سیاست پر سیاسی تجارت کا کاروبار شروع کیا۔ 'شہ' ان کا مقدر بن گئی اور 'مات' معصوم ہندوستانیوں کی تقدیر!

لیکن جلد ہی انھیں احساس ہوا کہ وہ اس ماحول میں قطعی اجنبی ہیں۔ کوئی ان کا منشا نہیں سمجھتا اور کسی کے خیال کو نہیں پا سکتے تھے۔ انھیں ایک ایسے ذریعے کی ضرورت تھی جو انھیں ہندوستانیوں کا قرب عطا کرسکے۔ ہندوستانیوں میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں شامل تھیں۔ ان کے لئے انگریزی طرزِ تمدن عجیب وغریب تھا۔ انھیں اپنی اسی طرزِ معاشرت سے انس تھا جو ان کا مشترکہ سرمایہ تھا جس میں حد بندیاں اور پابندیاں تھیں لیکن ہر حال میں وہ ان کا قیمتی طرزِ فکر تھا جس پر وہ کسی غیر کا سایہ بھی نہ ڈالنا چاہتے تھے لیکن اب اس کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ہندوستانی جس قدر ان سے دور رہنا چاہتے تھے فرنگی اسی قدر ان کے قرب کے مواقع فراہم کرنے میں مصروف تھے۔ ان کا اولین مقصد ہندوستان کی دولت بہ تدبیر کھینچ لینا اور اپنی حکومت کی بنیاد ڈالنا تھا۔ ہندوستان کی رنگارنگ تہذیب ان کے لئے باعثِ کشش تھی۔ یہاں کے لوگوں کی باہمی رواداری اور ایک ہی طرزِ معاشرت کا اختیار کئے رہنا ان کے لئے موجبِ حیرت تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ ملک جو رنگ برنگی قوموں کا چمن ہے۔ انواع واقسام کے تمدنوں کا خرمن ہے۔ اس خرمن کے تنکوں کو یکجا کئے رکھنے والا ایک اہم بندھن زبانِ اردو ہے۔ ہندوستانیوں کا یہ مشترک سرمایہ ہے اور ان تک پہنچنے کا

سب سے کارآمد ذریعہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں کا ہی خونِ جگر شامل ہے۔ چنانچہ فرنگیوں نے طے کیا کہ وہ ہندوستانی معاشرے اور اس کے طرزِ احساس کو سمجھنے کے لئے اسی ذریعہ کو بروئے کار لائیں گے۔ اسے سیکھیں گے اور پھر اس کے ذریعے اپنے جذبات، خیالات اور اپنا طرزِ فکر ہندوستانیوں تک بہ آسانی پہونچا سکیں گے۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ زبانِ اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے تھوڑی ہی مدت میں ایک طرف تو مقامی بولیوں کو پیچھے ہٹا دیا اور دوسری طرف اس کی قدر و اہمیت اتنی بڑھی کہ اس نے سرکاری و تہذیبی زبان یعنی فارسی کی جگہ حاصل کرلی۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کا اردو شعری سرمایہ اسی دور کے فارسی شعری سرمائے سے کہیں زیادہ پُر وقعت ہے۔ یہ ایک اور واضح مثال تھی اردو کی اہمیت اور روز افزوں ترقی کی۔ اور صرف یہی نہیں کہ اردو شعری سرمائے میں اضافہ ہوا بلکہ اس پر یعنی اردو شعر و ادب پر ہندوستانی فضا کی گہری چھاپ اور ہندوستانی تمدن کے واضح نقوش ملتے ہیں۔

انہی امور کے پیشِ نظر انگریزوں نے ایک درسگاہ "فورٹ ولیم کالج" کے نام سے قائم کی جہاں نو وارد فرنگیوں کو اردو زبان کا درس دیا جاتا۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ایسی کتابوں کا ترجمہ آسان زبان میں ہو سکے جن سے ہندوستان کے تمدن پر کوئی روشنی پڑ سکے۔ کالج کے پرنسپل اور معلمِ اول جان گلکرائسٹ نے اردو زبان کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے :

"ہندوستانی زبان کا علم برٹش انڈیا میں نہ صرف ایک ایسے اجنبی کے لئے لازم و لابد ہے جو عام طور پر اہلِ ملک سے ذاتی تعلقات رکھتا ہے بلکہ اس سے فارسی اور دوسری مشرقی زبانوں کی تحصیل کا رستہ بھی کھل جاتا ہے جہاں وہ ہندوستانی کے ذریعے سے جو ہندوستان کے باشندوں اور خصوصاً منشیوں یا دیسی سوداگروں کی دیسی زبان ہے، ان مقامی قدیم زبانوں کو بہت جلد سیکھ لیتا ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

"علاوہ اس کے یہ ایک مشترک ذریعہ ہے جس کے توسط سے اہلِ ملک عموماً اور متعدد غیر ملکوں کے اکثر باشندے جو اس ملک میں بس گئے ہیں اپنی ضرورتوں اور خیالات کا ایک دوسرے پر اظہار کرتے ہیں اس بیان کی صداقت میں ہم خود ایک شہادت ہیں۔"

انگریزوں کے گہرے مشاہدے سے کون انکار کرسکتا ہے۔ وہ ہر بات کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنے کا فن جانتے ہیں۔ اور اردو زبان کی قدر و قیمت اور ہندوستان میں اس کی اہمیت' زندگی کے ہر میدان میں' وہ ان سے بھی زیادہ واضح طور پر جان چکے تھے جن کا اوڑھنا بچھونا ہی زبانِ اردو تھی۔ گارساں دتاسی ۱۸۶۵ء کے خطبے میں کہتے ہیں :

" ہر شخص لوگوں کا خیال ہندوستانی کی نسبت کچھ ہی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ سارے ہندوستان کی مشترک زبان بن گئی ہے۔ دن بدن جو اس کی ترقی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان بھی جا سکتی ہے۔ اس مسئلے کی نسبت کپتان ایچ، مور نے جو سرکاری حکومت میں ترجمان کی خدمت پر فائز ہیں اپنی رائے سے مجھے ان الفاظ میں مطلع کیا ہے۔ " بلاشبہ کچھ عرصے بعد ہندوستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کرلے گی۔ اس زبان کے توسط سے لاکھوں اہلِ مشرق تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ ریل کی وجہ سے جو اندرونِ ملک میں ہزار ہا میل کی مسافت میں پھیل گئی ہے، ہندوستان اور وسط ایشیا کے لوگوں کو اور بھی ملنے جلنے کا موقعہ ملا ہے، چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ہیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہندوستانی زبان اس مقصد کو بطریقِ احسن پورا کرتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی ساخت میں فارسی، ہندی اور عربی کے عنصر شامل ہیں۔ اس زبان میں بدرجۂ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے مقاصد پورے کرے۔ میرے خیال میں ہندوستان کے قدرتی وسائل کی ترقی کے جس قدر امکانات ہیں اسی قدر ہندوستانی زبان کو فروغ حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں "

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب ملک کا نظم ونسق ایسٹ انڈیا کمپنی سے براہِ راست تاجِ برطانیہ کے تحویل میں آگیا اور مغربی طرزِ تمدن اپنے واضح نقوش کے ساتھ ہمارے سامنے آیا اور ساتھ ہی انگریزی افکار و خیالات بھی یہاں پہونچے تو مشرق و مغرب کے طرزِ فکر اور خیالات و احساسات کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ دونوں کی تہذیبیں جدا تھیں، تمدن مختلف تھے اور سوچ بچار کے دھارے الگ تھے۔ مغربی ادب کے دروازے ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کے لئے وا ہوئے اور غور و فکر طرز و انداز

کی نئی وادیوں کی طرف بڑھنے کی دعوت دینے لگے۔ ایسے میں زبان اردو پھر پیش پیش تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس نے کشادہ دلی کا ثبوت دیا اور افکارِ نو کا نور اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اردو زبان کی ربط آمیزی کی صلاحیت نے یہاں بھی معاونت کی۔ اس سے پہلے بھی اس نے اپنے اندر عربی، عجمی اور علاقائی تمدنوں کے مزاج کو سمو لیا تھا، ان کی زبانوں کے الفاظ، ان کے ادب کی اصطلاحات اپنے اندر اس انداز سے جذب کی تھیں کہ یہ معلوم کرنا مشکل ہوگیا تھا کہ کون سا لفظ، کون سا خیال کس زبان کا ہے ۔ اردو شعراء نے ایک ایسا ہندی چمن کھلایا تھا جس میں ساون کی پھواریں پھولوں کو تازگی بخشتی تھیں اور بلبلِ عجمی ان پھولوں کے حسن میں ڈوب کر عشق و محبت کا ازلی راگ الاپتا تھا۔ فارسی اور عربی فضا میں لالہ زار بنی ہوئی تھیں، اردو زبان نے اس لالہ زار سے خوشہ چینی کر لی تھی اور اردو زبان کا ادبی سرمایہ رنگ برنگی تہذیب کا مہکتا ہوا گلشن بن گیا تھا۔ مرثیہ، غزل اور قصیدہ جو خالص عربی اور عجمی اصنافِ سخن تھے، انھوں نے اردو کا پیرہن پہنا لیکن اس پیرہن پر عربی و عجمی تہذیب و تمدن کے ستارے چمک رہے تھے۔ محفلِ رقص و سرود میں ایک نو عمر خوبصورت لڑکے کا ساقی ہونا اور اہلِ محفل کا اپنی ہی جنس کے حسن میں صنفِ نازک کی خوبصورتی کا تصور کر کے اُس کے حسن کے نغمے گاتا، خمِ کاکل کی تعریفیں، خمیدہ ابرو کے تذکرے اور ساقی کی موجودگی سے محفلِ رنگ و بو کے دوآتشہ ہونے کا تصور اردو شعرا میں بھی باقی رہا۔ ساقی کا یہ تصور عجم کے اس تمدن کی طرف اشارہ ہے جس میں صنفِ نازک دبیز پردوں کے پیچھے رہتی تھی اور ان کے حسن کو شعر کے قالب میں براہِ راست ڈھالنا تہذیب و شرافت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

قصیدے میں جشنِ نوروز اور جشنِ بہاراں کا تصور بھی فارسی زبان کی شاعری نے ہی دیا۔ ہندوستان کا موسمِ بہار ساون کا مہینہ ہوتا ہے جس میں کوئل کی "کو" صبر و سکون کے شیرازے کو منتشر کرتی ہے اور کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو غزل کی بلبل کی نوا سنجیوں نے بھی ایک طرفہ بہار کی کیفیت پیدا کی ۔

مرثیہ پر اولاً ایرانی و عربی تمدن کی چھاپ رہی لیکن رفتہ رفتہ ہندوستانی فضا اس پر اپنا اثر ڈالتی رہی۔ مختلف تہذیبوں کے عناصر کے امتزاج سے اس کا حسن دوبالا ہوگیا تھا۔ ایک جانب اگر دجلہ و فرات کی کشش برقرار رہی تو دوسری طرف آبِ رودِ گنگا کا سحر طاری ہوتا گیا، یہاں تک کہ کرداروں کے نام تو

کربلا ہی کے رہ گئے مگر مرثیہ کی فضا تمام تر ہندوستانی ہی بن گئی ۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد زمانے نے ایک اور کروٹ لی تھی ۔ ایک نیا تمدن، ایک نیا طرزِ فکر ہندی اردو تہذیب کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ انگریزی تہذیب تھی جس میں چہار سو روشنیاں تھیں جنھیں جدید علوم کی روشنی نے مزید رخشندہ کر دیا تھا۔ ہر بات اور ہر خیال کو انھوں نے عقل کی کسوٹی پہ کسا تھا۔ دل و دماغ کی یہ ہم آہنگی زیادہ دیرپا اور پائدار تھی ۔ انھوں نے رسوم و عقائد کی پابندیاں کو ڈھیلا کیا تھا، اپنے احساس کی حدود کو مزید وسعت دی تھی، اور اس وسعت نے انھیں اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اپنی تہذیب کو نئی آب دے سکیں نئی رونق بخش سکیں ۔ انھوں نے جہانِ معنی کے طلسمی ذخیرے میں سے نئی نئی چیزوں کو نکالا اور ایک ایسے تمدن کی بنیادیں کھڑی کیں جو دوسری قوموں اور تہذیبوں کے لئے ایک مثال بن گیا ۔

جب انگریز ہندوستان آئے تو اپنے طرزِ فکر اور خیالات و علوم کا بیش قیمت سرمایہ بھی ساتھ لے آئے تھے۔ ایک جانب وہ ہندوستانی تمدن کے بنیادی عناصر کی جستجو میں رہے اور دوسری جانب ہندوستانی ان کے خیال و افکار سے دلچسپی لیتے رہے ۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ انگریز محض خیال کی طلسمی وادیوں کی جانب ہی پرواز نہیں کرتا بلکہ زمین پر اتر کر حقائق کے رازہائے سربستہ کی تلاش و جستجو میں بھی سرگرداں رہتا ہے ۔ اس کی زبان محض خیال آرائی اور تخئیلی اصنام پرستی کا نام نہیں بلکہ اس میں زندگی کی دھڑکنیں ہیں ۔

ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی حالات نے سبھی کو پژمردہ کیا ہوا تھا۔ سبھی پر یاس طاری تھی۔ اردو شعراء اسی دھن میں ساقی و میکدہ اور گل و بلبل کے نغمے گا رہے تھے لیکن اس میں نشاط کی کیفیت نہ تھی بلکہ قنوطیت کا عنصر غالب تھا۔ پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں اب اردو ادب ایک فارغ البال طبقے کی ذہنی عیاشی یا تفریح ہی نہیں رہا تھا بلکہ متوسط طبقے کی محرومی و سرشاری، دکھ درد، رنج و راحت اور نغمہ و نالہ کی داستان بن گیا تھا ۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے رنج و الم، دکھ درد اور پریشانیوں کے یہ تذکرے تو تھے لیکن

پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کی سچی کوشش نہ تھی ۔ معاشرتی نظم ونسق کے منتشر ہونے اور طرزِ تمدن کے خستہ ہونے کا سب کو احساس تھا لیکن اس کی درستگی کے لئے ٹھوس عملی قدم کسی نے نہیں اٹھایا تھا ایسے حالات میں مغربی طرزِ فکر اندھیرے میں ایک روشن کرن بن کر ابھرا۔ مغرب سے نئے افکار اور نئے انداز آئے ۔ کچھ روشن خیال ہندوستانیوں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی زوال آمادہ تہذیب کو اگر بچایا جاسکتا ہے تو صرف مغربی طرزِ فکر کو بروئے کار لاکر ۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ساغر وبادہ کی دنیا سے باہر نکل کر حقایق کی دنیا میں قدم رکھنا ہوگا اور اس 'ذریعہ' سے جو ابھی تک نشاطِ روح کا سامان بہم پہونچاتا تھا ، خارجی ماحول کی اصلاح کا کام بھی لینا ہوگا ۔ شعر وادب کے متعلق سوچنے سمجھنے کا انداز بدل گیا تھا اور اب اس کو ایسا ذریعہ بنانے کی سعی جاری تھی جو سماجی اصلاح کر سکے ۔ انہی روشن دماغ ہندوستانیوں نے یہاں کی سماجی بدحالی کی وجہ اس حقیقت میں تلاش کی کہ ہندوستانی پرانی قدروں کے دلدادہ ہیں ، انھیں اپنے ماضی سے پیار ہے اور ماضی کو چھوڑ کر حال کی کسی بھی صحت مند قدر یا مفید جذبے کو اپنانے کے لئے وہ قطعی تیار نہ تھے ۔ انھیں اپنے رسوم وعقائد سے جذباتی لگاؤ تھا اور مذہبی اقدار ان کے لئے نور کا مینار تھیں ۔ ایک ایسے معاشرے کو جس کا ذہن دماغ اسی ڈھب کا بن چکا ہو ایک سرے سے بدل دینا ایک لاحاصل کوشش نظر آتی تھی لیکن لوگوں کی ہمتیں بلند اور ارادے پختہ رہے ۔

غزل اب بے وقت کی راگنی تھی ، اور ذکرِ شاہد رعنا فضول بحث ۔ اب اردو زبان کو سماجی اصلاح کا ذریعہ بننا تھا ۔ اردو کے مہوشوں نے پھولوں کے حسن کی بجائے اس کیچڑ کو دیکھا جس میں ایک نو عمر تمدن لت پت تھا ۔ حالی نے نظموں کے سہارے ، سرسید نے اپنے مضامین کے ذریعے اور نذیر احمد نے اصلاحی قصوں کے ذریعے زبانِ اردو کو ایک نیا رنگ بخشا ۔ ان لوگوں نے ان حقائق کو اپنا موضوع بنایا جن سے کسی تہذیب وتمدن کے نقش ونگار بنتے اور سنورتے ہیں ۔

اب تاریخ کا ایک نیا باب کھلتا ہے جس کی ابتدا سماجی شعور کی بیداری تھی اور انتہا خودی کا مکمل اعلان ، جب آزادی کے رجحانات عام ہونے لگے تو اردو نے ہی پیش روی کی اور ملک کو "انقلاب زندہ باد" جیسا نعرہ عطا کیا ۔ اس کے الفاظ میں حبِ وطن کا ایسا درد بھر گیا تھا کہ ہر کس وناکس وطن پرستی کے جذبے میں

ڈوب گیا۔

اردو زبان نے ملک و وطن کی محبت کے ایسے دلکش گیت گائے کہ ہندوستانی مادرِ وطن کی حفظ و بقا کے لئے اپنے خون کی بے دریغ قربانی کے لئے تیار ہو گئے۔ وطن پرستی کی آگ لوگوں کے سینے میں جل اٹھی اور عرصے تک اس کا دھواں سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لئے رہا۔ آخر کار اس دھوئیں کے بادل چھٹے اور ہم نے دیکھا کہ ہندوستان کے افق پر آزادی کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک اٹھا۔ ہر سو بہار رقصاں تھی لیکن اس بہار کے پھولوں کا سینہ داغدار ہو گیا تھا۔ ایک ذہن، ایک تمدن اور ایک معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ہندوستان کی یہ تقسیم کچھ ذہنوں کی جودت خیال کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے ایک مشترکہ قوم اور اس کے سرمائے کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

زبانِ اردو جو ہندوستان کی مکمل داستان ہے — کبھی کیف آگیں کبھی کرب — جس کا ارتقا اسی خمیر میں ہوا جو ہندوستانی کہلاتا ہے ——— لیکن آج کچھ لوگوں کے تعصب اور تنگ نظری نے شاخ کو اس کے پودے سے جدا کرنا چاہا تھا ——— کچھ لوگوں نے پرجوش الفاظ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو کا تعلق ہندوستان یا ہندوستانیوں سے قطعی نہیں ہے۔ اور مباحثے ہوتے رہے، تقریریں جاری رہیں اور یہ اردو کی خوش اقبالی تھی کہ اردو کی مخالفت خود اردو زبان ہی کے ذریعہ کی جارہی تھی۔ اردو زبان کے پھول کو اس کی شاخ سے جدا کیا جارہا تھا لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ اس پھول کی ہر پتی اور ہر پتی کا ہر رنگ ہندوستانیوں کے دلوں میں اتر کر ایک توانا درخت کی صورت اختیار کر چکا تھا اور کسی شاخ سے پھول کو توڑ کر پھینک دینا تو آسان ہے، کسی پودے کو زمین سے اکھاڑ کر پھینک دینے میں بھی کوئی دقت نہیں ہوتی لیکن تناور درخت کو اس کی جڑوں سمیت اکھاڑ پھینکنا دقت طلب مسئلہ ہے ——— اردو ہندوستانیوں کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی ہے وہ ان کا مزاج بن گئی ہے۔ ان کے طرزِ فکر کا ایک جزوِ لاینفک بن چکی ہے ——— اردو زبان کا پھول جب تک ہندوستانی عوام کے زیبِ گلو رہے گا اسے کوئی نہ مٹا سکے گا اور اگر یہ مٹا بھی تو اس کی پتیاں خاک میں مل کر کبھی نہ کبھی دوبارہ خوشبو پھیلا دیں گی، پھر کسی نئے تمدن کا آئینہ بنیں گی۔ کیونکہ زندہ زبانیں کبھی نہیں مرتیں !!

علی عباس اُمید

خوشبوؤں کے رشتے

روز کی طرح اس کے قدم ریلوے اسٹیشن کی طرف مڑ گئے۔

سورج نکلنے سے قبل چہل قدمی کرنے کا وہ شروع سے عادی تھا۔ جب سے اس کا تبادلہ یہاں ہوا تھا وہ ہر روز علی الصباح اٹھتا اور چھ بجے والی پسنجر ٹرین میں بڑی بےچینی سے آشنا چہروں کی تلاش کرتا اور پھر ٹرین کے جانے کے بعد واپس ہو جاتا۔ اب تک اس کے اس معمول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

آج بھی وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پلیٹ فارم پر پہنچا۔ اسٹیشن کی عمارت نے خاموشی سے اس کا خیر مقدم کیا، آشنا لوگوں کا وہی جانا پہچانا تبسم، قلیوں کے نیند سے السائے ہوئے وہی چہرے اور پلیٹ فارم پر بکھرے مسافروں کے ویسے ہی چھوٹ پٹ جھنڈ۔ کرنج کا وہی پیڑ اور اس کے نیچے بکھرے ہوئے پیلے پیلے دلکش پھول ـــــ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان پھولوں میں کھو جائے۔ اس درخت کے نیچے پہنچ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھولوں سے بھر لئے اور ان پر اپنا داہنا گال رکھ دیا۔ ان پھولوں کا مہکتا ہوا ملائم لمس ہمیشہ ہی اسے مسحور کر دیتا تھا، وہ تصورات میں کھو جاتا...... آج بھی اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اس کے تصورات نہ جانے کن گہرائیوں میں اترتے چلے گئے اور وہ بےچین ہو کر اپنی مخصوص بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے چاروں طرف پیلے پیلے پھول بکھرے ہوئے تھے۔

ٹرین کی کرخت سیٹی نے اس کے خیالات کو منتشر کر دیا۔ وہ چونک کر اٹھا اور حسب عادت ایک ایک ڈبہ میں جھانکنے کے بعد اترنے والے مسافروں کا جائزہ لینے لگا.... کوئی نہیں تھا اس کا اپنا۔ ٹرین نے پھر سیٹی دی اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ ایک ایک کر کے سارے ڈبے اس کی آنکھوں کے

سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ وہ جاتی ہوئی ٹرین کو دیکھتا رہا۔۔۔ دیکھتا رہا، جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

اس کا یہ روز کا معمول تھا۔ اسے ٹرین کا اس طرح آنا، کچھ دیر ٹھہرنا اور پھر آہستہ آہستہ سامنے سے گزر جانا بہت پسند تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اسٹیشن بھی ایک دل ہے جس میں کوئی آکر کچھ دیر ٹھہرتا ہے، کچھ بکھیرتا ہے، کچھ سمیٹتا ہے اور چونکہ پابندیاں اسے وہاں رکنے نہیں دیتیں اس لئے بے بسی کے عالم میں آہیں بھرتے ہوئے سینے میں آگ دبائے آگے بڑھ جاتا ہے۔۔۔ شاید حرکت سے ہی زندگی عبارت ہے۔ رکنا ممکن نہیں اور۔۔۔۔ اسٹیشن پر پھر وہی اداسی پھیل جاتی ہے۔ رہ جاتی ہیں یادیں اور امید کی وہ موہوم کرن جو وقت کی تاریک پگڈنڈی کو روشن کرنے کی انتھک سعی کرتی ہے اور بکھرے ہوئے سناٹے میں ملن کے لمحوں کی خمار بھری یاد کے سہارے آنے والے پرکیف لمحوں کے انتظار کا حوصلہ دیتی ہے۔۔۔۔ انتظار۔۔۔۔ ان خوشگوار لمحوں کا جب کہ پھر اسی طرح ہولے سے کوئی آئے گا۔۔۔ آئے گا!

ایسے ہی ایک دن اس کی زندگی میں وہ بھی تو خاموشی سے آئی تھی۔ کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی، کہیں کچھ بھی خلاف معمول نہ تھا۔ سویرے کی وہی خمار آلود ہوا تھی، وہی مسکراتے ہوئے السائے چہرے تھے، وہی پھولوں سے لدا ہوا کرنج کا درخت تھا اور وہی اس کے نیچے بچھے ہوئے ملائم اور خوبصورت پیلے پیلے پھول ـــــ پیلے، جیسے پگھلا ہوا سونا زمین پر بکھیر دیا گیا ہو۔ بس اگر کوئی نیا پن تھا تو اتنا کہ۔۔۔۔ اس کی پرچھائیں دونیلی نیلی جھیلوں میں تیر رہی تھی، اس دن اس کی شبیہ نیلے آسمان کی روحانی وسعتوں میں منعکس ہو رہی تھی۔ پیلی ساڑی میں وہ بھی انھیں پھولوں کا ایک جزو معلوم ہو رہی تھی۔ سورج کی شوخ کرنوں نے پھولوں کے علاوہ اسے بھی سنہرا کر دیا تھا۔ وہ کرنج کے سہارے ٹکی ہوئی ان بھوری بھوری پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہی تھی جن کے پیچھے سے سورج کا گولہ دھیرے دھیرے ابھر رہا تھا۔ پگھلا ہوا چمکدار سونا ساری کائنات میں بکھرنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ سنہرے رنگ سے یوں دمک اٹھا تھا جیسے کسی نے بالائی میں سیندور حل کر دیا۔ اس نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے ہوش و حواس کھو گئے، توتیں جواب دے گئیں۔ وہ دم بخود اسے دیکھتا رہا اور اس وقت چونکا جب وہ واپس جا رہی تھی۔

شیشن کی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے اس نے مڑ کر اسے دیکھا، لمحہ بھر کو ٹھٹکی اور پھر آگے بڑھ گئی۔

اس رات وہ سو نہ سکا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک ایک کر کے کمرے کی دیواریں غائب ہوتی جا رہی ہیں اور کمرہ پلیٹ فارم میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس نے دیکھا بالکل وہی، سب کچھ ویسا ہی... وہی کرنج کا پیڑ اس کے نیچے بچھے ہوئے وہی پیلے پیلے پھول اور اس کے سہارے ٹکا ہوا وہ سائیکل کا مجسمہ! وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کے ذہن میں اس پورے منظر کا عکس اتنا واضح کیوں ہے اور وہ شعوری طور پر اسے بار بار دیکھنے کی کوشش کیوں کرتا ہے!

دوسرے دن پھر وہ حسب معمول چل پڑا۔ سب کچھ وہی تھا جیسے کسی کو کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ اس نے درخت کی طرف دیکھا۔ جانے کیوں اس کی آنکھوں نے ایک سوناپن محسوس کیا۔ اس کا کھویا ہوا ذہن یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ جس منظر، جس ماحول سے وہ ایک عرصہ سے مانوس ہے اس میں آج سونے پن کی آمیزش کہاں سے ہو گئی۔ اس کے خیالات کا تانا بانا جلد ہی بکھر گیا۔ وہ آ رہی تھی فضا میں تیرتی ہوئی، ہلکورے لیتی ہوئی جیسے موجوں کے زیر و بم کے ساتھ کنول کا پھول بہتا جا رہا ہو۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا لیکن آنکھیں ایک جگہ ٹھہر گئیں۔

وہ اسی پیڑ کے نیچے آ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ پھر ویسا ہی سورج طلوع ہو رہا تھا، آسمان کی خاموش بلندیوں میں پھر ایک گونج بھر رہی تھی، ان بھوری پہاڑیوں سے پھر دھواں سا اٹھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہیں پھر اسی کی طرف لوٹ آئیں۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں تک پلکوں کا ساتھ رہا پھر .... پھر کسی کی نظریں جھک گئیں اور کسی کی انوکھے تخیل کی دنیا میں کھو گئیں۔ ایک بار پھر اس نے اسے دیکھا اور کہیں کوئی طوفان سا اٹھنے لگا... کتنا خوبصورت تھا وہ طوفان بھی... اس میں بہہ کر اسے کس قدر مسرت کا احساس ہوا تھا! ذرا بھی تو ہوش نہیں رہا اسے..... جانے کیسے وہ اس کے نزدیک گیا، جانے کیسے اس نے اپنی ہتھیلیوں کے پھول اس کے ہاتھوں میں تھما دیئے... جانے کیسے یہ سب کچھ ہو گیا، وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ فوراً ہی مڑا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا واپس ہو گیا۔ آج اس نے ٹرین کا

انتظار نہ کیا، شناسہ نظروں کو فراموش کر کے آگے بڑھ گیا ـــــ آج اس کے معمول میں فرق آگیا تھا، آج جیسے وہ امنڈ پڑا تھا ..... سمندر کے ساکن سینے میں طلاطم برپا ہو گیا تھا اور آسمان کی وسعتیں اس سے بے نیاز تھیں۔

تیسرے دن کا سورج مغرب کے نیلے کینوس کو چیر کر باہر آیا، پھر وہی سنہرا چشمہ بہا اور وہ پھر اپنے معمول کے مطابق چل پڑا۔ آج اسے جانی پہچانی مسکراہٹیں نہیں دکھائی دیں، نیند سے بوجھل قلیوں کے چہرے اپنی جانب متوجہ کرنے میں ناکام رہے، وہ مسافروں کے چھٹ پٹ جھنڈ بھی نہ دیکھ سکا..... اسے صرف وہ پیلے پیلے پھول دکھائی دئے جنھوں نے اس کی زندگی میں ایک خاص اہمیت اختیار کر لی تھی۔ آج وہ منتظر تھا! انتظار میں ایک تجسس تھا، وہ کون ہے، کہاں ہے، اب تک کیوں نہیں آئی... اس کا ذہن ایسے ہی کتنے سوالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں پیلے پھولوں پر جمی ہوئی تھیں اور تصور میں تھی وہ دودھیا مورت۔ پھول دیتے وقت اس کی آنکھوں کی معصوم حیرانی، نئی کونپلوں جیسا اس کی مخروطی انگلیوں کا ملائم لمس.... وارفتگی میں اس نے پھولوں سے اپنے ہاتھوں کے کشکول بھر لئے اور طمانیت کے احساس سے اس کی روح سرشار ہو اٹھی۔ آنکھیں بند ہونے لگیں ... کہ دفعتاً اس نے دیکھا، وہ چلی آرہی ہے.... لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ آج اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر بزرگ تھے اور ایک چھوٹی بچی بھی تھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ وہ ادھیڑ عمر شخص اس کے باپ ہیں اور بچی اس کی بہن۔ آج وہ درخت کے نیچے نہیں آئی بلکہ ٹہلتی ہوئی پلیٹ فارم کے دوسرے سرے تک چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس ہوئی۔ تینوں ایک ساتھ چل رہے تھے۔ وہ پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے خاموش کھڑا رہا۔ وہ لوگ سامنے سے گزر گئے پپیہا سیواتی کی ایک بوند کے لئے ترستا رہا لیکن چنچل بادلوں کا دل نہ پسیجا۔ وہ ہوا کے دوش پر ڈولتے ہی رہے۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ پھر واپس لوٹے۔ اب کی بار وہ کچھ پیچھے رہ گئی تھی۔ اس کے باپ اس کے پاس سے گزرے، بچی نکل اور آخر میں وہ آئی۔ اس پر وارفتگی کا نشہ سا چھا گیا، آنکھوں کی کوریں بھیگ گئیں اور وہ تھوڑا لڑکھڑا گیا لیکن کچھ فیصلہ نہ کر سکا... اور.... اپنے ہاتھوں کے پھول اس کے راستے میں بکھیر دئے۔ وہ آئی، ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی پھر پلک جھپکنے کے وقفے میں ایسی بات ہو گئی جس کا اس نے تصور

بھی نہیں کیا تھا اور جس نے اس کی شخصیت کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا، اس کی تنہائیوں میں جاگ دیتی ہوئی پرانی شراب گھول دی اور ٹیسو کے سرخ پھولوں سے بھرے جنگلوں کو ایک ایسی وحشیانہ خوشبو سے شرابور کر دیا جس کی تندی ایک تیکھی لکیر بن کر اس کی رگ رگ میں اترتی چلی گئی۔ وہ اس کے پاس رکی اس کے ہاتھوں میں کچھ دیا اور پھر راستے میں بکھرے ہوئے پھولوں کو آنچل میں سمیٹ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ مسحور سا اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں کی حدود سے باہر ہو گئی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی ہتھیلیوں میں کچھ کسمسا رہا ہے۔ اس نے مٹھیاں کھول کر دیکھا ــــ پھول تھے، پیلے پیلے، کچھ تازے کچھ مرجھائے ہوئے۔ وہ بہت دیر تک انھیں دیکھتا رہا پھر بے تحاشہ چومنے لگا۔

اندر اٹھتے ہوئے طوفان کو سنبھال نہ پانے کی وجہ سے وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔ آج وہ بہت غمگین ہو گیا تھا، یادوں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ کسی طرح وہ اپنے کمرے میں پہنچا اور پلنگ پر پڑ گیا۔ تکیہ کو اس نے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اوہ ــــ آخر اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے اپنے دل کی آواز کیوں نہیں سنی؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں...... ! وہ اپنے بالوں کو نوچنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی منظر تھا، ساری پچھلی باتیں اس کے ذہن میں مجسم ہو اٹھی تھیں۔

وہ رات اس دیہی علاقہ پر بڑے پر اسرار انداز میں طلوع ہوئی تھی، ایسی رات جو بیک وقت کئی متضاد کیفیتوں کی حامل ہوتی ہے..... اسے یاد آ رہی تھیں وہ باتیں جو طلعت کے والد طاہر صاحب نے اس سے کی تھیں۔ ہاں! طلعت ہی تو تھا اس کا نام۔ طاہر صاحب سے اس کا تعارف ہو گیا تھا، وہ بہت ملنسار آدمی تھے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ وہ اپنے ایک عزیز سے ملنے وہاں آئے تھے اور چند دن قیام کر کے چلے جائیں گے۔ وہ ان سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔

اس شام بھورے سے آسمان پر نیلا صحرائی چاند چمک رہا تھا۔ نشے میں سرشار ہوا ادھ کھلی گلاب کی کلیوں کو چوم رہی تھی اور وہ حیا سے بار بار پتیوں کی اوٹ میں چھپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ فضا میں گیت بکھرے ہوئے تھے۔ وہ لان میں بیٹھا چنبیلی کے پودوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ پتھریلی پگڈنڈی پر وہ چھوٹا سا قافلہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ خیر مقدم کو بڑھا تو اس نے صندلی ہاتھ سلام کے لئے اٹھا دیا،

زیرلب مسکراہٹ نے اس کے معصوم چہرے کو اور بھی دلکش بنا دیا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ لوگ بیٹھے رہے۔ کافی کا دور چلتا رہا، موضوع بدلتے رہے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ یہ لمحے جاودان ہو جائیں، کبھی نہ ختم ہوں لیکن جب ہولے ہولے ڈھلتا ہوا چاند آموں کے جھنڈ کے اوپر آیا تو طاہر صاحب نے کہا "اچھا بھئی، اب چلنا چاہیئے۔" اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے خوشگوار خواب میں جھنجھوڑ دیا ہو۔ اٹھتے ہوئے طاہر صاحب نے بتایا کہ وہ لوگ دوسرے دن شام کی ٹرین سے دہلی جا رہے ہیں۔ نہ جانے کیسے وہ بول اٹھا کہ اس کی بھی چھٹیاں کل سے منظور ہو گئی ہیں اور وہ بھی کہیں باہر جانے کی سوچ رہا ہے۔

"واہ پھر تو بہت ہی اچھا ہے، آپ چلئے نہ ہمارے ساتھ۔ آگرہ رکتے ہوئے چلیں گے۔ بہت عمدہ رہے گا۔ میں تو خود ہی آپ سے کہنا چاہتا تھا۔ بس تو باندھئے بستر..." طاہر صاحب ایک ہی سانس میں کہہ گئے اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ طلعت نے اپنی بڑی بڑی پلکوں کو اٹھا کر التجا بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی اور گلاب کی پنکھڑیاں جیسے کچھ کہنے کو بے چین تھیں۔ اس نے صاف دیکھا تھا ان ہونٹوں کی کپکپاہٹ، ان کا رہ رہ کر پھڑک اٹھنا۔

شام کو وہ اسٹیشن پہنچ گیا۔

مشینی انداز میں وہ سارے کام کئے جا رہا تھا، جیسے اپنے آپ میں نہ ہو۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کیسے اس نے بستر باندھا، کیسے اسٹیشن تک پہنچا! وہ لوگ پہلے ہی سے موجود تھے۔ طاہر صاحب سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے، طلعت اسی درخت کے نیچے کھڑی تھی اور شبنم اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی۔

"آئیے۔ آئیے احسان صاحب!" وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انھیں بٹھاتے ہوئے اس نے کہا تھا "آپ بیٹھئے نہ، کیوں تکلیف کرتے ہیں!"

"ہم نے آپ کا ٹکٹ لے لیا ہے احسان صاحب، آپ اور نہ لے لیجئے گا۔ یہ دیکھئے۔" انھوں نے جیب سے لال رنگ کے ٹکٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا "یہ دیکھئے میرا ٹکٹ، یہ طلعت کا، یہ آپ کا اور یہ آدھا رہا بی شبنم کا۔" انھوں نے ٹکٹ جیب میں ڈال لئے۔

"آپ نے میرا بھی ٹکٹ خرید لیا!" اس نے پوچھا "یہ کیوں؟"

طاہر صاحب بولے "اس سے آپ کو کیا! اچھا آپ ہمارے پیسے سے سیر نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے.... آپ.... ہم کو تاج محل کے ٹکٹ خرید دیجئے گا" اور وہ ہنس پڑے تھے۔ ہنستے ہی ہنستے انھوں نے طلعت سے کہا تھا "دیکھتی ہو طلعت، احسان صاحب تو یوں دور بھاگ رہے ہیں جیسے کوئی اجنبی ہوں، ہمارا ان سے کوئی تعلق ہی نہ ہو...." اور اس کے بعد کی آواز ٹرین کی گڑگڑاہٹ میں کھو گئی تھی۔

ڈھیر سارا کالا کالا دھواں اگلتا ہوا انجن کھڑا ہو گیا۔ تمام ڈبے بھی ایک دھیمے جھٹکے کے ساتھ رک گئے۔ سیکنڈ کلاس کا ایک ڈبہ پورا خالی تھا۔ وہ سب سوار ہو گئے۔ سامان اوپر کی برتھ پر رکھ دیا گیا۔ طاہر صاحب نے اوپر ہی کی ایک برتھ پر اپنا بستر لگایا اور بولے "بھائی میں تو ہاتھ پاؤں پھیلا کر سفر کرنے کا عادی ہوں" اور وہ آرام سے لیٹ گئے۔ طلعت کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی، اس کے پاس ہی شبنم بھی بیٹھی۔ وہ کھڑا رہا اور باہر دیکھتا رہا۔ طلعت بھی باہر ہی دیکھ رہی تھی—— کریچ کا پیڑ خاموش کھڑا تھا۔ اس کے نیچے پیلے پیلے ملائم پھولوں کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ ایک بار اس کی نگاہیں طلعت کی طرف گھومیں، اس نے پایا کہ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے دونوں کی نگاہیں ملیں اور پھر ملی ہی رہیں، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دونوں کے جذبات کا سنگم ایک ناقابل تشریح، نامعلوم نقطے پر ہو رہا ہے، اس سے اٹھتی ہوئی لاتعداد لہروں کے زیر و بم میں وہ دونوں ڈوب رہے ہوں، ڈوبتے جا رہے ہوں گہرے اور گہرے۔

انجن نے زوروں سے سیٹی دی اور ایک جھٹکے کے ساتھ پلیٹ فارم کی خاموشی بکھر گئی۔ ٹرین دھیرے دھیرے سرکنے لگی۔ طاہر صاحب بستر میں کوئی کتاب ٹٹول رہے تھے۔ طلعت کی نظریں جب باہر سے گھوم کر واپس آئیں تو ایک لمحے کے لئے دوبارہ اس کی نظروں سے الجھ گئیں۔ شبنم کسی کو ہاتھ دکھا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "دیکھو ہم تو گاڑی میں بیٹھے ہیں"۔ وہ بھی بیٹھ ہی رہا تھا کہ نہ جانے کیا ہوا اور یکایک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی ہتھیلیوں میں سے کچھ پھول طلعت کی گود میں ڈال دئے اور لمحہ بھر کو اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبائے رکھا اور پلک جھپکائے بغیر اس کی حیران حیران غزالی آنکھوں

میں جھانکتا رہا اور پھر جھپٹ کر چلتی ٹرین سے نیچے اتر گیا۔

اس کے لاشعور میں طلعت کی جھکی ہوئی لانبی پلکوں پر کتنی ہی صبحوں کی شبنم تھرتھرا رہی تھی۔ رات بہت گہری ہو چکی ہے۔ تکیہ بھیگ کر بے ڈول ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں کی نمی بڑھتی جا رہی ہے، کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ سانس تیزی سے چل رہی ہے اور وہ سوچ رہا ہے آج کی رات گزرنی کتنی مشکل ہے؛ جب وہ زیادہ دیر تک لیٹا نہ رہ سکا تو اٹھا، قلم نکالی اور اپنے ہیڈ آفس کو درخواست لکھی "—— میں اب اور زیادہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ مہربانی کر کے میرا تبادلہ کہیں دور کر دیا جائے ——"

دھیرے دھیرے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ غیر شعوری طور پر اس کے قدم اُس جانب مڑ گئے۔ کچھ ہی دیر میں وہ کرنج کے پیڑ کے نیچے کھڑا تھا۔ پیلے پیلے پھول —— اب بھی بچھے ہوئے تھے۔ چاندنی نے انھیں کچھ عجیب سے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ ان پھولوں کے کینوس پر ایک چہرہ دکھائی دے رہا تھا اور اس چہرے پر طلوع ہو رہی تھی وہی جانی پہچانی غم سے بھرپور مسکراہٹ ..... اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں میں پھول بھر لئے اور دیوانہ وار انھیں چومنے لگا

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

نئے اور پرانے چراغ از ڈاکٹر عابد رضا بیدار

سائز ۳۰×۲۰/۸ ، حجم ۲۶۵ صفحات ، مجلد مع گرد پوش ، سنہ طباعت: ۱۹۶۸ء

قیمت: دس روپلے ۔ ناشر: رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ۱۸۰۶ کلاں محل، دہلی ۶

پیش نظر کتاب میں، میر تقی میر، ربیت قلی خاں حسرت، مصحفی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی کی شخصیت ان کے کلام پر بحث کی گئی ہے، نیز روش صدیقی اور شاد عارفی کی شاعری کی خصوصیات اور انفرادیت روشنی ڈالی گئی ہے، چار عنوان اور ہیں، جدید اردو شاعری کی منفرد آوازیں، شرر کے خطوط، آندھی چراغ اور اداس نسلیں۔

کتاب کے نام اور فہرست مضامین سے کتاب کے مباحث کا صحیح اندازہ ہوجاتا ہے، صرف باتوں کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ پہلی یہ کہ "جدید اردو شاعری کی منفرد آوازیں" کے عنوان تحت فاضل مؤلف نے جذبی، اخترالایمان، خورشید الاسلام، عبدالمجید حیرت، شاد عارفی، ق گورکھپوری، فیض احمد فیض، قدم اور آل احمد سرور کے کلام کا ایسا انتخاب دیا ہے، جس ان کی انفرادیت نمایاں ہے، یہ نام آخر میں دئے ہیں، اس سے پہلے پڑھنے والوں سے فرمائش ہے کہ:

"اب آپ کو مندرجہ بالا چھ الگ الگ انتخابات میں چھ شاعروں کو پہچاننا ہے، جن کے بارے میں میں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ سب کسی نہ کسی سبب سے اپنے عہد کے تمام

شاعروں کی بہ نسبت سب سے زیادہ پہچان میں آجانے والے ہیں، کیا آپ بھی ان سب کو ایسی آسانی سے اور اتنے ہی ممتاز انداز میں پہچان لیتے ہیں، جیسے انھیں میں نے پہچان لیا لیا ہے، یا اس میں میری ذاتی وابستگی کو دخل رہا ہے۔"

دوسری بات یہ عرض کرتی ہے کہ مولانا عبدالحلیم شرر بنیادی طور پر ایک ناول نگار ہیں، مگر اس کتاب میں ان کے خطوط پر بحث کی گئی ہے۔ شاید ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ ان کے خطوط سے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہیں، اس لیے فاضل مؤلف کو ان کے چھ خطوط ملے تو ان کو یہاں درج کر دیا، ورنہ شروع میں ان کی ناول نگاری سے بحث کی گئی ہے۔ ان خطوط کے بارے میں بھی فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ "ان خطوط میں مولوی عبدالحلیم شرر نہیں صرف ناول نگار شرر ملے گا، یہ خط پڑھنے کے بعد "بدرالنسا کی مصیبت" کے مصنف کا ذہنی پس منظر سمجھ میں آجاتا ہے اور اس کے بعد کے ناولوں کے اجزائے ترکیبی کا ایک جز مل جاتا ہے۔" (صفحہ ۲۱۹)

"آندھی میں چراغ" خواجہ غلام السیدین صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے، جسے اس کتاب کا موضوع بحث بنانے کا جواز شاید فاضل مولف کی یہ رائے ہے کہ "اردو میں یہ پہلی کتاب آئی ہے جس پر میں فخر کر سکتا ہوں کہ میری زبان میں آزادی کے بعد ایک ایسی کتاب بھی وجود میں آئی جو دل کے خون سے لکھی گئی ہے۔" (صفحہ ۲۳۷)

"اداس نسلیں" عبداللہ حسین صاحب کا لکھا ہوا ایک پاکستانی ناول ہے، جو ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا، اور جسے پانچ ہزار کا آدم جی انعام ملا ہے۔ اس ناول کا موضوع وہ "نسل ہے" جس نے جلیان والا باغ اور نمک سازی کی تحریک دیکھی، جس نے ہندوستان میں صنعتی دور کو اور پھر اس کی برکتوں اور لعنتوں کو پھیلتے ہوئے دیکھا، کلوخانہ اور کارخانہ دار کو دیکھا۔ اور وہ نسل جو تقسیم ہند کے بعد ہندوستان سے جانے والے قافلوں کے ساتھ ہلکا سا شعور لے کر گئی اور پھر پاکستان جاکر اس کا پورا شعور پروان چڑھا، جوان ہوا اور ادھیڑ ہونے لگا۔" (صفحہ ۲۵۵) فاضل مولف نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ:

"یہ نسلیں جو اداس ہیں، ان کی اداسی اس لئے ہے کہ ان کی محبت کا تصور "پہلی نظر کا تیر" بدل گیا

ہے، اس میں گہرائی اور گیرائی آگئی ہے، جو تیجہ میں اپنے ساتھ احساس لائی ہے، ان کا زندگی کا تصور سب میں تشکیک ہے، کوئی بنیاد نہیں، کوئی عقیدہ نہیں، جو ان کے دلوں کو تقویت دے سکے، مذہب پر عقیدہ یا کم سے کم تہذیب کے جزو کی حیثیت سے مذہبی اقدار و روایات کی تحسین کوئی بنیاد مہیا کر سکتے تھے، سو یہاں یہ بھی نہیں۔" (صفحہ ۱۵۹)

انسانوں کی دنیا میں تو ناموں کی یکسانیت بہت ملتی ہے، مگر کتابوں کی دنیا میں یکسانیت اور مشابہت بہت اتفاقی ہوتی ہے، لیکن بیدار صاحب نے اپنی اس کتاب کا نام جان بوجھ کر وہ رکھا ہے جو ایک مشہور ادیب کی مقبول کتاب کا نام ہے۔ بیدار صاحب اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں جسے آپ چاہیں تو شاعرانہ بھی کہہ سکتے ہیں: "ہمارے یہاں اردو میں یہ کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی کہ دو چار سال میں یا دس بیس برس بعد کسی پیش رو کتاب کا نام چرا لیا جائے، اسی طرح کی یہ چوری میں نے بھی کی ہے، مگر ایک فرق کے ساتھ، یہ دراصل اعتراف ہے اس فیضان کا جو اردو تنقید کی ایک کتاب "نئے اور پرانے چراغ" سے مجھے پہنچا ہے۔ کتاب کو پڑھے اٹھارہ بیس سال کا عرصہ ہو چکا ہے، مگر اس کے مضامین نے ذہن کو اس درجہ سحر زدہ سا کر دیا تھا کہ جب سے یہ نام برابر مجھے ہانٹ کرتا رہا ہے جیسے کوئی دلآویز خوشبو، کوئی خوبصورت یاد، کوئی بے غرض نیکی، کوئی بے میل خلوص۔ اور میں یہ نام اس کتاب پر ثبت کر کے اپنے ذہن کو اس کی مستقل زد میں رہنے سے بچا لے جانا چاہتا ہوں۔" اخباروں اور رسالوں کے ناموں کی یکسانیت اور مشابہت سے بچنے کے لیے حکومت کو قانون بنانا پڑا اور نئے اخبارات اور رسائل نکالتے وقت حکومت سے ناموں کی منظوری لینی پڑتی ہے، جس میں بسا اوقات مہینوں وقت لگ جاتا ہے۔ اگر بیدار صاحب کی طرح دوسرے ادیبوں کو بھی دوسری کتابوں کے نام پسند آ گئے اور انھوں نے مشہور اور مقبول کتابوں کے نام رکھنا شروع کر دئے تو حکومت کو کتابوں کے ناموں کے لیے بھی ممکن ہے کہ قانون بنانا پڑے، اس لیے اچھا ہے اس چوری کو نظیر نہ بنایا جائے۔

نوائے سرور مرتبہ: ڈاکٹر حکم چند نیّر

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$، حجم ۲۴۰ صفحات (مع پیش لفظ)، مجلد مع گرد پوش، سال اشاعت: ۱۹۹۲ء

قیمت: چھ روپے   ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

درگا سہائے سرور جہان آبادی، اردو کے خوش گو اور خوش فکر شاعروں میں سے ہیں، ان کی قومی اور وطنی نظمیں بے لوث اور مخلصانہ جذبات و خیالات کی حامل ہیں اور بقول نیاز فتحپوری "سرور ان شاعروں میں سے تھے جنھوں نے موجودہ دور شاعری کی طرح ڈالنے میں حصہ لیا تھا اور جن کی خدمات کو اردو زبان کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔" افسوس کہ سرور اردو کے ان ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں جن کی زمانے نے کما حقہ قدر نہیں کی اور وہ بڑی حد تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر حکم چند نیر ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سرور کے کلام کا انتخاب کر کے اور ایک طویل اور مبسوط پیش لفظ لکھ کر "نوائے سرور" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ فاضل مرتب نے پیش لفظ میں سرور کی شاعری پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اختصار کے ساتھ ان کے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ حالات زندگی کے سلسلے میں لکھا ہے:

"درگا سہائے سرور دسمبر ۱۸۷۳ء میں جہان آباد کے ایک معزز کائستھ سکسینہ خاندان میں پیدا ہوئے جو شاہجہاں کے عہد میں دلی سے یہاں آکر آباد تھا۔۔۔ ۱۸۹۹ء میں ان کی رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا۔۔۔ اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ (پائے) تھے کہ ۱۹۰۵ء میں ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا اور ۱۹۰۶ء میں ان کا اکلوتا بیٹا بھی انھیں داغ مفارقت دے گیا۔ سرور پر رنج و غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، (اس کی تاب نہ لاکر) ایک عظیم شاعر طبعی عمر کو پہنچنے سے بہت پہلے سینتیس ۳۷ سال کی عمر میں ۲ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔" (صفحہ ۱۰ اور ۱۱)

فاضل مرتب نے سرور کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

سرور کی شخصیت اور شاعری میں غیر معمولی عظمت اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ وہ گنتی کے ان شاعروں میں سے تھے، جنھیں اپنی زندگی میں کبھی معاصرانہ چشمکوں اور رقابتوں سے واسطہ پڑا اور نہ انھیں بدگوئی، فرقہ پرستی اور فسطائیت کے طعنے سننے پڑے۔۔۔ سرور کے کلام کو عوام میں مقبولیت حاصل تھی، خواص ان کے فن کی قدر کرتے تھے، معاصر شعراء ان کی سخن گوئی اور

شیوہ بیانی کے قائل تھے، اگر قبولِ عام کو کسی شاعر کی عظمت کا معیار ٹھہرایا جا سکتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سرورؔ کو اپنی زندگی میں ایسی مقبولیت حاصل تھی جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے"۔ (صفحہ ۷)

سرورؔ نے حالات سے مجبور ہو کر اپنا بہت سا کلام شاکر میرٹھی کو حقیر معاوضہ پر دیدیا تھا، کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ شامل ہے، جس میں تفصیل سے اس مسئلے پر بحث کی گئی ہے اور ان نظموں کا انتخاب دیا گیا ہے جو شاکر میرٹھی کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔

نمونے کے طور پر چند اشعار ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک نظم کا عنوان ہے "عروسِ حبِّ وطن" شاعر کے جذبات ملاحظہ ہوں:

ٹوٹیں وہ پاؤں جن کو نہ تیری تلاش ہو — پھوٹے وہ آنکھ جس کو نہ ہو تیری جستجو
وہ گھر ہو بے چراغ جہاں تیری ضَو نہ ہو — وہ دل ہو داغ جس میں نہ ہو تیری آرزو
دنیا و آخرت میں نہ انجام ہو بخیر — تیرے سوا جو غیر کی ہو مجھ کو جستجو
حوروں پہ میں مروں تو جہنم رسید ہوں — کافر ہوں میں جو مجھکو بتوں کی ہو آرزو
ناقوس اور اذاں میں نہیں قیدِ کفر و دیں — اُس کے لیے کہ جس کا پرستش کدہ ہے تو
گنگا نہائے شیخ اگر تیرا اِذن ہو — تیرا اشارہ ہو تو برہمن کرے وضو

جلوہ نہ ہو کسی بتِ رعنا کے سامنے
وہ دن خدا کرے کہ ہو آنکھوں میں تو ہی تو

"شہر آشوب" کا ایک بند ہے:

ہوائے دہر کی بگڑی ہے کچھ عجب تاثیر — ریاضِ قوم ہے اب انقلاب کی تصویر
وہ طائرانِ چمن زاد تھے جو خوش تقریر — ترانہ سنجی کے باعث ہوئے قفس میں اسیر

غریب قید میں شام و سحر تڑپتے ہیں
قفس میں بند ہیں بے بال و پر تڑپتے ہیں

سرور نے اپنے وطن کے مستقبل کی بڑی شاندار تصویر بنائی تھی۔ کہتے ہیں:

پھولوں کا کُنج دل کش بھارت میں اک بنائیں — حبِ وطن کے اس میں پودے نئے لگائیں
خونِ جگر سے سینچیں ہر نخلِ آرزو کو — اشکوں سے بیل بوٹوں کی آبرو بڑھائیں
ایک ایک گل میں پھونکیں روحِ شمیمِ وحدت — اِک اِک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں
فردوس کا نمونہ ہو اپنا کُنج دل کش — سارے جہاں کی جس میں ہوں جلوہ گر فضائیں

پھولوں کا دل ربا ہو منظر ہر اک روش پر
گلچیں نہ ہو چمن میں کانٹے نہ ہوں خلش پر

(عبداللطیف اعظمی)

(۶۲)

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

شمارہ ۲	بابت ماہ فروری ۱۹۷۰ء	جلد ۶۱

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون: اڈیٹر: ۷۴۲۵۸
منیجر: ۷۷۴۷۰

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی

مطبع: یونین پریس دہلی

ٹائیٹل: جمال پریس دہلی

شذرات

دسمبر کی آخری تاریخوں میں بمبئی میں جو اردو کنونشن ہوا وہ اس لحاظ سے کامیاب کنونشن کہا جا سکتا ہے کہ پہلی بار ہندوستان کی سبھی زبانوں کے ادیبوں اور مصنفوں نے ایک آواز ہو کر اردو زبان کے جائز حقوق کی حمایت کی۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں جو میمورنڈم پیش کیا گیا اس پر سبھی زبانوں کے نمائندوں کے دستخط تھے، میمورنڈم پیش کرنے سے پہلے کنونشن کے صدر اور اردو اور ہندی کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر نے اپنے مخصوص انداز میں اردو کی کہانی اور اردو کی بپتا اردو ہی کی زبان سے سنائی، سامعین پر اس کا اثر ہوا اور محترمہ وزیر اعظم صاحبہ بہت زیادہ متاثر نظر آئیں، لوگوں کا خیال تھا کہ اپنی تقریر میں وہ صاف صاف لفظوں میں اردو زبان کو اس کا جائز حق دلانے اور دینے کا کوئی وعدہ کریں گی لیکن مختلف راستوں سے آئے ہوئے بہت سے مندوبین کو مایوسی ہوئی جب انھوں نے اس طرح کا کوئی وعدہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی یقین دلایا۔ لیکن جو لوگ سمجھ دار تھے انھوں نے ان کی تقریر کو بہت پسند کیا ظاہر ہے کہ مسز اندرا گاندھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ کوئی میمورنڈم پاتے ہی اس سے متعلق کوئی وعدہ کرلیں ہمیں اس کی توقع نہیں کرنی چاہیئے۔

مسز اندرا گاندھی نے پہلے تو افسوس کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ وہ اُردو پڑھ لکھ نہیں سکتیں۔ انھوں نے ایک بار جیل میں اردو سیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن انتظامیہ کی طرف سے جو صاحب انھیں اردو سکھانے پر مقرر ہوئے وہ خود اردو نہیں جانتے تھے، پھر اس کا موقع نہیں ملا۔ انھوں نے اردو زبان کی تعریف کی اور اسے برملا کہا کہ یہ ملک کے کروڑوں انسانوں کی زبان ہے اور اسے اس کا جائز حق

ملنا چاہیئے، لیکن اس کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی، اردو والے اپنی کوشش کریں اور اس جدوجہد کو ایک عوامی تحریک بنا دیں، میں اپنے طور پر پوری کوشش کروں گی۔ مجموعی طور پر ان کی تقریر اچھی اور حقیقت پسندانہ تھی اس لئے سنجیدہ طبقہ میں پسند کی گئی۔

مسز اندرا گاندھی نے اپنی تقریر میں عوامی تحریک کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس بات نے پنڈت آنند نرائن ملا کو حیرت میں ڈال دیا جنھوں نے میمورنڈم کا پہلا مسودہ تیار کیا تھا اور ایک روز قبل مندوبین کے اجلاس میں اس مسودہ کو پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہمیں اردو کے حق کی لڑائی میز پر لڑنی ہے، میدان میں نہیں، مندوبین کی خاصی بڑی تعداد نے ملا صاحب کے اس موقف کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ میز کی لڑائی لڑی جا چکی، اب تو میدان میں اترنا ہوگا، ان لوگوں نے مسز گاندھی کی تقریر کو اپنی جیت تصور کیا اور بعض لوگوں نے تو اپنے جذبات کا اظہار بھی کر دیا۔ لیکن جیسا کہ معلوم ہے اردو والے نہ تو میز کی لڑائی لڑیں گے اور نہ میدان کی، کیونکہ وہ عمل کے بجائے ردعمل کے زیادہ قائل ہیں اور وہ بھی وقتی اور زبانی۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ کنونشن کے بعد کسی ایسے گروپ یا کمیٹی کے قیام کی اطلاع نہیں ملی جو کنونشن کے مقاصد کو آگے بڑھانے اور اردو کا حق دلانے کی مسلسل جدوجہد کرتی رہے۔

اس کنونشن میں شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، جناب عبدالحق خاں صاحب پرنسپل جامعہ ہائر سکنڈری اسکول اور راقم الحروف نے شرکت کی، کنونشن کے بعد ہم لوگ جامعہ کے جشن زریں کے کام کے سلسلہ میں جو انشاء اللہ آئندہ اکتوبر میں منایا جائے گا، بمبئی میں رک گئے، یہ جان کر خوشی ہوئی کہ شہر بمبئی نے جس نے جامعہ کی سلور جوبلی (۱۹۴۶ء) کے موقع پر ذاکر صاحب مرحوم کی بہت مدد کی تھی، جامعہ کو فراموش نہیں کیا ہے، یہاں کے تعلیمی و صنعتی حلقے، مسلم اور غیر مسلم اسے ایک اچھا ادارہ سمجھتے ہیں اور اس کی مدد کے لئے آمادہ ہیں، اب بمبئی میں جامعہ کے قدیم طالب علموں کی تعداد خاصی ہے، سلور جوبلی کے موقع پر اتنی نہیں تھی، پہلے کی طرح اس بار بھی جناب معین الدین حارث کا مکان اور دفتر (دفتر روزنامہ اجمل) ہمارا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ان کی قوت عمل اور شہر بمبئی سے متعلق ان کی

بے پناہ واقفیت اور اہل بمبئی میں اُن کی قابل رشک مقبولیت ـــــ یہ سب ہمارے لئے وقف تھی اور وقف رہے گی، جامعہ کے ایک اور قدیم طالب علم سید معین سیف اللہ اس وقت بمبئی میں ہیں، وہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۲ء تک جامعہ کالج کے طالب علم تھے، انھوں نے اپنی محنت، صلاحیت اور دلکش شخصیت کی بنا پر اپنے لئے ایک نمایاں جگہ بنالی ہے، انشاء اللہ وہ اور ترقی کریں گے۔ انھوں نے ہماری بہت مدد کی اور مادر علمی کی بےلوث خدمت کا حق ادا کردیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔ ان کے علاوہ مدرسۂ ثانوی کے دو قدیم طالب علم مرزا شفیق بیگ اور نواز محمد نے بھی بہت مدد کی، یہ دونوں نوجوان اپنا کاروبار کر رہے ہیں اور کامیاب ہیں۔ بزرگوں میں جناب مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی، صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل جناب شہاب الدین دسنوی صاحب، جناب عبدالرزاق صاحب جامعی اور جناب مبارک حسین صاحب نے جن کے دو بچے اس وقت جامعہ میں زیر تعلیم ہیں، ہمارا ہاتھ بٹایا، ہمت بندھائی اور مفید مشورے دئے، شیخ الجامعہ صاحب تو حارث صاحب کے یہاں مقیم تھے اور ہمارا قیام صابو صدیق میں تھا، وہاں کے عملے نے خاص طور سے لائبریرین خواجہ معین الدین صاحب اور عبدالودود صاحب اور عبدالقیوم صاحب نے ہر لحاظ سے ہمارے آرام کا خیال رکھا، ہم ان کے ممنون ہیں۔ بمبئی کے قیام کے زمانے ہی میں دو تین روز کے لئے میں اور عبدالحق صاحب مالیگاؤں گئے، وہاں بھی جامعہ کے پڑھے ہوئے کئی طالب علم اور جامعہ کے ایک قدیم بہی خواہ اور مددگار جناب مولانا عبدالحمید نعمانی صاحب ہیں۔ جامعہ کے پرانے طالب علموں نے ہمارا خیال رکھا، اُن کے ذریعہ فراہمی چندہ میں کافی مدد ملی، مولانا نعمانی صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ مالیگاؤں سے جامعہ کے لئے بہت کچھ کریں گے۔ مالیگاؤں میں مسلمانوں کی خوشحالی سے بڑا اطمینان ہوا لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ لوگ اس طرح کاروبار میں الجھے ہوئے ہیں کہ تعلیم و تہذیب کے کاموں کی طرف بہت کم توجہ ہے، ایک حلقہ ہے جس میں بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں لیکن یہ بہت چھوٹا حلقہ ہے، پھر بھی امید ہے کہ جلد ہی وہاں تعلیمی کام خاصے پیمانے پر ہوگا۔ مالیگاؤں میں جامعہ کے سبھی طالب علموں اور خاص طور سے محمد عرفان، عبداللطیف اور عبدالقدوس وغیرہ نے ہماری ہر طرح مدد کی، انھوں نے ہمیں ایک بار پھر آنے کی دعوت دی ہے۔

بمبئی میں جامعہ کے قرنِ اول کے ایک استاد، مربی اور ہمدرد رہتے ہیں، اُن سے پورا ہندستان ہی نہیں بلکہ باہر کی دنیا بھی واقف ہے، ذاکر صاحب مرحوم کے اُن چند دوستوں میں ہیں جو باقی ہیں اور ہمارے لئے تقویت اور ہمت کا باعث ہیں ـــــ وہ ہیں ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید (سپلا لیبوریٹریز کے مالک اور رُوحِ رواں)، ہماری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور انھوں نے فراہمی عطیات کے سلسلہ میں بہت مفید مشورے دئے، سپلا کی طرف سے مدد کا وعدہ کیا اور دوسرے ذرائع سے فنڈ جمع کرنے کا یقین دلایا۔
ہماری خوش قسمتی سے وہ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ۱۶ جنوری کو جامعہ تشریف لائے، اُن کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا جس میں جامعہ کے سارے استاد اور کارکن جمع تھے۔ اس موقع پر انھوں نے ایک مختصر لیکن بہت اچھی تقریر کی۔ جامعہ سے اپنے قدیم تعلق کا ذکر کیا اور ہم سب کو زندہ رہنے، جامعہ کے کام کو ترقی دینے اور اس کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے گُر بتائے، ان کی تقریر میں بڑی رجائیت تھی، تعجب ہوتا تھا کہ ستر سال کا ایک بوڑھا شخص کس قدر توانائی رکھتا ہے کہ ملکی حالات کی ناسازگاری اسے مایوس نہیں کر پاتی اور وہ ایک روشن مستقبل کا یقین رکھتا ہے، ایک عرصہ کے بعد وہ جامعہ کے استادوں اور کارکنوں سے اس طرح ملے تھے، بات بات سے خوشی ٹپکی پڑتی تھی جیسے اپنے گھر میں ہوں۔ ہم سب بھی بہت خوش ہیں کہ خواجہ صاحب جامعہ تشریف لائے اور اپنی حکیمانہ باتوں سے ہمارے دامن کو عزم اور ارادہ کی دولت سے مالا مال کر گئے۔

پروفیسر محمد مجیب

گرونانک

بزرگوں کے ذکر میں شریک ہونا بڑی خوش قسمتی، بڑی سعادت ہے، اور میں اس جلسے کے منتظموں کا
ت شکر گذار ہوں کہ ان کی بدولت مجھے اس کا ایک اور موقع ملا۔ مجھے سب سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے
ونانک کے بارے میں پڑھنے کی ہدایت کی، اور پھر میں گروجی کی پانچ سو سالگرہ کی تقریبوں کے دوران میں جو کچھ
لوم کر سکا تھا بیان کرتا رہا۔ اب دیکھتا ہوں کہ اس بیان اور فکر کی وجہ سے دل اور دماغ کو ایک آزادی،
ب فرحت ملی ہے جو پہلے نصیب نہ تھی، اور توحید الٰہی جو گرونانک کی تعلیمات میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے
رجس سے جپوجی کی ابتدا ہوتی ہے دل میں نئی نئی کیفیتیں پیدا کرتی رہی ہے۔

ہمارے یہاں اب دل کا اور دل کی باتوں کا چرچا بہت کم ہو گیا ہے، عاشق بہت ہیں، معشوق بہت
ز عشق اور اس کی لذتوں کے قدر شناس ڈھونڈھے نہیں ملتے، بتوں اور بت پرستوں کے ہجوم ہر طرف نظر
تے ہیں، پرستش اور عبادت کے آداب بھلا دئے گئے ہیں۔ بزرگوں کا ذکر بھی ایک رسم ہے جسے ادا کرنے
ن بہت سے لوگ شریک ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ انھیں رسموں کو ادا کرنے کا شوق ہے یا اس میں
دئی فائدہ ہے، یا ان کے خیال میں اس سے قومی یک جہتی بڑھتی ہے۔ گھروں میں مذہب کی تعلیم نہیں
ی جاتی، بچوں کو صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ ہندو ہیں یا سکھ یا مسلمان یا عیسائی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے
ہ مذہبوں کا فرق تو باقی رہتا ہے مگر کوئی اپنے مذہب کو بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اسکولوں اور کالجوں
ی تعلیم نے یہ خیال پھیلا دیا ہے کہ مذہب صرف مذہبی لوگوں کے لئے ہوتا ہے، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے
لئے نہیں ہوتا۔ اب ہمارے پڑھے لکھے مذہبی رسمیں ادا بھی کرتے ہیں تو اس میں جو خلوص اور سچائی ہونی

چاہیے وہ نہیں ہوتی، اور تعلیم کا ہماری مذہبی زندگی پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا۔ دوسری طرف وہ لوگ جو دل سے مذہبی ہیں آج کل کی دنیا کے حالات اور نئے زمانے کی ضرورتوں سے واقف نہیں ہیں، لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں، اور علم اور مذہب آج کل کی زندگی میں کسی قسم کا ربط یا سمبندھ قائم نہیں کر سکتے۔ مگر شاید یہی زمانہ جب ہر ایک اپنے طور پر گمراہ ہے، گرونانک کی تعلیمات کا پرچار کرنے کے لئے مناسب بھی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے مذہبی لوگ اسے مانیں یا نہ مانیں، کہ اب علم کا، سائنس کا راج ہے، اور کوئی بات جو عقل کے خلاف ہو اب جی پر نہیں پڑتی۔ گرونانک بھی اپنے زمانے میں ان عقیدوں اور رسموں کی تردید کرتے رہے جو عقل کے خلاف تھیں۔ آپ کو یاد ہوگا وہ دورہ کرتے ہوئے ہردوار تشریف لے گئے تھے اور ایک روز صبح کو انھوں نے دیکھا کہ لوگ دریا میں کھڑے منتر پڑھتے ہوئے سورج کی طرف سیدھے ہاتھ سے پانی اچھال کر پھینک رہے ہیں۔ گرونانک نے جا کر بائیں ہاتھ سے پچھم کی طرف پانی پھینکنا شروع کر دیا۔ ایک آدمی نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں وہی کر رہا ہوں جو تم کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ ہم تو اپنے بزرگوں کی روحوں کی پیاس بجھانے کے لئے پانی دے رہے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر ایسا ہے تو میں اپنے کھیت کو سینچ رہا ہوں۔ اس نے ہنس کر کہا کہ یہاں سے پنجاب تک پانی کیسے پہنچ سکتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر یہ پانی میرے کھیت تک نہیں پہنچ سکتا جو کہ اس دھرتی پر ہے تو تمھارا پھینکا ہوا پانی تمھارے بزرگوں تک کیسے پہنچ سکتا ہے جو اس دنیا میں نہیں ہیں اور جنھیں اب بھوک اور پیاس کی تکلیف نہیں ہوتی۔ اور پھر انھوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ خدا کو بھول جانا اور بے فائدہ رسموں میں پڑ جانا گمراہی ہے۔ یہ صرف گرونانک کی زندگی کا ایک واقعہ نہیں ہے، ہر وقت کام آنے والی ہے، چاہے ہم کوئی مذہبی رسم ادا کر رہے ہوں، چاہے دفتر میں بیٹھ کر تعلیم کے اور ترقی کے پلین بنا رہے ہوں، چاہے کتابیں پڑھ کر اپنا علم بڑھانے کی فکر میں ہوں۔ جو بات عقل کے خلاف ہو، قدرت کے قانون کے خلاف ہو، وہ غلط ہے۔

یہی بات ہمیں مذہبوں کی تاریخ پڑھ کر معلوم ہوتی ہے۔ مذہبوں کی ترقی کا مطلب یہ ہے کہ عقل کے خلاف، پیچیدہ اور الجھی ہوئی بات کو چھوڑ کر سادہ، صاف، سلجھی ہوئی بات کہی جائے، جسے عقل فوراً مان لے، صحیح اخلاقی تعلیم دی جائے اور خوف کی فضا پیدا کرنے کے بجائے انسان کے اپنے دل کو اور دل

کی ان کیفیتوں اور حالتوں کو جنھیں واردات قلبی کہا جاتا تھا زندگی کے سدھار کا ذریعہ بنایا جائے۔ گرونانک کی عظمت، ان کی خوبیوں، ان کی شخصیت کے حسن کو بیان کرنے کے لئے کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، لیکن ہمارے زمانے کی مناسبت سے خاص طور پر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ان کی تعلیمات میں مذہب اور صحیح انسانی زندگی دونوں اس طرح مل جاتے ہیں کہ انھیں الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک بدھ سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ وہ اندرونی تبدیلی، وہ سچی شدھی جو ہمارا مقصد ہے کسی جگہ بھی حاصل ہو سکتی ہے، پر زیادہ امکان اس کا ہے کہ یہ تبدیلی سنیاس لینے والے میں نہ ہو بلکہ اس میں جو گرہست ہے، گھربار کی پریشانیوں اور ذمہ داریوں میں مبتلا رہتا ہے اور ہر وقت گھر والوں کی خاطر اپنی خواہشوں کو دباتا اور اپنی ضرورتوں کو نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ آج کل سنیاس لینے والے بہت کم ہیں اور گرہست قریب قریب سب ہی ہیں، آج کل کوئی کہے کہ صحیح مذہبی زندگی گرہست کی ہوتی ہے تو یہ خیال نہ ہوگا کہ کوئی نئی بات کہی گئی ہے۔ مگر دوسری طرح سے دیکھئے تو یہ ہے ایک نئی بات، اور ایسی کہ جسے ہم بہت آسانی سے بھلا سکتے ہیں۔ آج کل آدمی خود بخود گرہست بن جاتا ہے، اس لئے کہ زندگی کا عام قاعدہ یہی ہے، اور سب کے خیال میں مناسب بھی یہی ہے۔ مگر وہ شخص جو سوچ سمجھ کر اسے ایک مذہبی فرض ہی نہیں بلکہ نجات کا صحیح راستہ سمجھ کر گرہست کی زندگی اختیار کرے وہ گرونانک کی پیروی کرتا ہے اور اس کی حیثیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

اسی طرح گرونانک کی تعلیمات میں انسان کی فطرت کو بھی اس کا حق دیا گیا ہے۔ اس میں عیب پیدا ہو سکتے ہیں۔ جیسے ہمارے کپڑے میلے ہوتے رہتے ہیں، بدن پر میل جمتا رہتا ہے، اور ہم دونوں کو صاف کرتے رہتے ہیں، ویسے ہی آدمی کی فطرت میں بھی غرور، لالچ، نفرت اور دوسری طرح کی گندگی جمع ہو جایا کرتی ہے، جس سے اس کو پاک کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر انسان کو اپنی طبیعت پر ظلم نہ کرنا چاہیے، انسان کو ست کرتار نے بنایا ہے، اور اس لئے نہیں بنایا ہے کہ وہ اپنی صورت کو بگاڑتا، اپنی انسانیت سے انکار کرتا رہے۔ بے شک دنیا میں آکر انسان اپنے رب سے دور ہو جاتا ہے، اور جیسے کہ مولانا روم نے فرمایا ہے:

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش

باز جوید روزگار وصل خویش

ہر آدمی جو اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے پھر وصل کے زمانے کو تلاش کرتا ہے۔ لیکن یہ وصل اپنی طبیعت کا، اپنی فطرت کا گلا کاٹ کر نہیں، اس کا توازن قائم رکھ کر، اس کی صحیح تربیت کر کے، اسے عشق کی تہذیب سکھا کر حاصل ہوتا ہے۔ یہی ہے سہج کی تعلیم، کہ آہستہ چلو، چلتے رہو، چلتے رہو، منزل کے جتنے قریب پہنچو گے، راستہ آسان ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ تم کہو گے:

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے

اور چمکا ترا نقش کف پا آخر شب

یہ سہج کی تعلیم سائنس اور تجربے کے مطابق تندرستی کی سلامت روی کی تعلیم ہے، قدرت کے دستور کے اس قدر قریب کہ یہ اس سے الگ نہیں کی جا سکتی اور یہی اس تعلیم کی سچائی کا ثبوت ہے۔ زندگی کے بارے میں گرو نانک کے تین اصول یا تین ہدایتیں ہیں، کرت کرو، نام جپو، وند چھکو۔ ان کی مصلحت پر غور کیجئے۔ زندگی کا دار و مدار اس محنت پر ہے جس سے ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کچھ حاصل ہو۔ اناج کی ضرورت کسان پوری کرتا ہے، کپڑے کی جولاہا، مکان کی راج یا معمار۔ مزدور، صنعت پیشہ لوگ، کارخانے چلانے والے، کاروبار کرنے والے، سب ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ استاد، علمی کام کرنے والے، سائنس داں، انجنیر سب کے لئے کرت کرو کی ہدایت ہے، اور جو اپنا کام مستعدی سے، ایمانداری سے، اور اچھے سے اچھا نہ کرے اس پر الزام آتا ہے کہ اس نے اس ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ مگر انسان کے لئے ضرورتیں پوری کرنا کافی نہیں ہے۔ وہ ضرورتیں پوری کرنے کی فکر میں لگ جائے، اونچے معیار زندگی HIGH STANDARD OF LIVING کے پھیر میں پڑ جائے تو ضرورتوں کی کوئی انتہا نہیں رہتی، وہ اپنی خواہشوں کا غلام بن جاتا ہے، اور خواہشیں اسے ایسے چکر میں ڈال دیتی ہیں کہ وہ اپنے فائدے کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچانے لگتا ہے، قومیں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں، ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرتی ہیں، اپنی صنعت و تجارت کو فروغ دینے کے لئے اپنی اور دوسروں

کی انسانیت کو مٹاتی ہیں۔ اس لئے شروع ہی سے محنت کرنے والے کے دل اور دماغ کو صحیح راہ پر لگا دینا چاہیئے۔ گرونانک کی دوسری ہدایت، نام جپو، کا مقصد یہی ہے۔ محنت کرنے والے کو برابر یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ خدا کا بندہ ہے، اس کی محنت اپنے لئے نہیں، خدا کے لئے ہے، اور اس کی محنت کو بار آور کرنا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بات اس کے دل میں بیٹھ جائے گی تو محنت سے اس کو جو کچھ حاصل ہوگا اسے وہ اپنا ہی نہ سمجھے گا، اس کا ایک حصہ دوسروں کو بھی دے گا۔ اس کا یہ دینا خیرات نہ ہوگا، اس کی وجہ سے فقیر نہ پیدا ہوں گے، سماج دولت مندوں اور ناداروں میں تقسیم نہ ہو جائے گی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ 'ونڈ چھکو' کی ہدایت ہر قسم کے کام کرنے والوں کے لئے ہے، جس کے پاس کھانا بانٹ کر کھانے کو ہے وہ کھانا بانٹ کر کھائے، جس نے کوئی علم حاصل کیا ہے وہ اس علم کو دوسروں تک پہنچائے۔ کسی انسان کو کوئی نعمت جو اسے ملی ہے اپنے پاس ہی نہ رکھنا چاہیئے، یہ سمجھ کر کہ یہ اس کی اپنی محنت کا نتیجہ ہے، اور محنت کرنے کے ساتھ وہ خدا کا نام لینے، نام جپنے کی ہدایت پر عمل کرتا رہا ہے۔ 'ونڈ چھکو' کی ہدایت کا منشا یہ ہے کہ ہر آدمی کا سماج سے رشتہ قائم رہے، اس کی محنت، اس کی عبادت اس کے اپنے لئے نہ ہو، پوری سماج کے لئے، ہر انسان کے لئے ہو۔ پھر بھی یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ یہاں کون سی نرالی، انوکھی بات بتائی گئی ہے۔ گرونانک کی تعلیمات کی خوبی اسی میں ہے کہ ان میں نرالی انوکھی باتیں جو روزمرہ کے تجربے سے دور یا عقل کے خلاف ہوں اور انسان کو قدرت کے مقرر کئے ہوئے صحیح راستے سے ہٹائیں، نہیں ملتی ہیں۔

ان تعلیمات کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کٹر، ضدی، فسادی آدمی مذہبی نہیں ہو سکتا، وہ تعلیم صحیح مذہبی تعلیم نہیں ہے جو محنت کے کاموں کی یا محنت کرنے والے کی قدر گھٹائے، یا انسان کو اپنی نجات کی فکر میں ڈال کر سماج اور سماجی ذمہ داریوں سے الگ کر کے کسی کونے میں بٹھائے۔

در اصل یہ اُن راستوں میں سے جن پر انسان ہزاروں برس تک چلنے کی کوشش کرتا رہا ہے اُس راستے کا انتخاب ہے جس پر وہ سب سے زیادہ آسانی سے سب سے زیادہ دور تک اور دیر تک چل سکتا ہے وہ راستہ جسے ان تمام لوگوں نے اختیار کیا جن کی طبیعتوں میں سماجی حالات نے بگاڑ نہیں پیدا کیا

اور جو اس توفیق سے کام لے سکے جو خدا کی طرف سے سبھی کو عطا ہوئی ہے، یہ مساوات کا، جمہوریت کا، بھائی چارے کا راستہ ہے، اسی راستے پر چلنے والی سماج میں وہ سچے رہنما نمودار ہو سکتے ہیں جن میں کام کی، سماج کی، خدا کی لگن ہو، جو سورج کی کرنوں کی طرح اناج کو پکائیں اور پھولوں میں رنگ بھریں۔

اس کے باوجود اگر کسی کو خیال ہو کہ گرونانک کے ان تین اصولوں میں کوئی نرالی بات نہیں ہے وہ دیکھ لے کہ اس وقت ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں میں، سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں کے ملازموں میں، حکومت کرنے والوں اور حکومت کرنے کے امیدواروں میں کتنے ہیں جو کام کو فرض سمجھتے ہیں اور کام کو سلیقے اور ایمانداری سے نہ کرنے کو ایسا گناہ مانتے ہیں جس کی سزا دی جائے گی۔ اور لطف یہ ہے کہ آج کل سرکار کی طرف سے کام کرنے کا حکم دینے والا بھی کوئی نہیں ہے، کام کا جمع خرچ زبانی ہوتا ہے یا ایسی رپورٹوں میں ملتا ہے جن پر کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ ہمارے لئے تو محنت کرنے کا حکم گرونانک کے زمانے کے مقابلے میں اور بھی زیادہ ضروری ہے، اس لئے کہ ہم ملک کی ترقی کے پلین بناتے رہتے ہیں جن کا مناسب نتیجہ نہ نکلے تو دنیا میں ہماری بڑی بے عزتی ہوتی ہے۔ دوسرے اصول پر، کہ نام جپو، یعنی خدا کا ذکر اس طرح کرو کہ اس کا نام دل پر نقش ہو جائے کون عمل کرتا ہے؟ ہماری حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے، اسکولوں اور کالجوں میں مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی، ڈر یہ ہے کہ ہم خدا کا نام لیں گے تو آپس میں لڑائی ہو جائے گی۔ آپس کی لڑائیاں تو کسی نہ کسی بہانے سے ہوتی رہتی ہیں، ایسی لڑائیاں بھی جن میں بالکل بے قصور لوگ لٹتے اور مارے جاتے ہیں، اور ایسی نفرت بھی بے دھڑک پھیلائی جاتی جس کا سبب مذہبی اختلاف ہوتا ہے، لیکن اچھے اور پڑھے لکھے شہری کے لئے مناسب یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ خدا کا نام نہ لے، خدا کی مرضی کو اپنے کاموں میں دخل انداز نہ ہونے دے۔ جب کوئی اپنے آپ کو خدا کا بندہ نہ مانے تو وہ دوسروں کو خدا کے بندے اور خود اس کی طرح زندگی کی نعمتوں کے حق دار کیسے مانے گا۔ سبھی چاہیں گے کہ جو کچھ جس طرح سے سمیٹ سکیں سمیٹ کر اپنے پاس رکھیں، نہ پڑوسی کو اس کا حصہ ملے نہ سرکار کو انکم ٹیکس۔ اسی وجہ سے آپ نے دیکھا ہوگا

کہ جب بازار میں کسی مال کی کمی کا اندیشہ ہوتا ہے تو سب کوشش کرتے ہیں کہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خرید کر رکھ لیں۔ نرالی اور انوکھی باتیں تلاش کرنا ایسے پڑھے لکھے لوگوں کا چونچلا ہے جو صرف دلچسپی چاہتے ہیں، جی بہلاتے ہیں، بحث کرتے ہیں۔ ان کا خیال نہ کیجئے۔ کرت کرو، نام جپو، ونڈ چھکو" کے اصول کو برت کر دیکھئے۔ ان میں آپ کو ہر قدم پر ایک نئی اور نرالی مصلحت نظر آئے گی۔ یہ کسی عالم کے دعوے نہیں ہیں، ایک ایسے خدا رسیدہ بزرگ کی ہدایتیں ہیں جس کی نگاہ میں صرف اپنا زمانہ نہیں، ہر زمانہ تھا۔

میں نے گرونانک کا ذکر ان باتوں سے اس لئے شروع کیا کہ وہ ہر شخص، ہر سماج، ہر زمانے کے لئے مناسب اور صحیح ہیں، اور ان پر بہتر سے بہتر زندگی کی بنیاد اور بہت مضبوط بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کے بعد ہمیں سادھ سنگت کے تصور پر غور کرنا چاہئے۔ اس کا ایک پہلو تاریخی ہے۔ ہم اس کا ذکر کر سکتے ہیں کہ اس سادھ سنگت میں کون سے لوگ شامل تھے اور ان کی زندگی اور عبادت کا طریقہ کیا تھا۔ لیکن سادھ سنگت کا خیال ایک زمانے کے لئے نہیں تھا، ہر زمانے کے لئے ہے، آج کل کے لئے بھی ہے، اس میں مختلف ملکوں کے، مختلف مذہبوں کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں جو ایک خدا کو مانتے ہیں، کرت کرو، نام جپو، ونڈ چھکو کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں، دوسرے انسانوں سے محبت اور ہمدردی اور ان کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں، اور بغیر کسی خاص تنظیم، کسی خاص سنگھٹن کے ایک دوسرے کا سہارا لینا چاہتے ہیں۔ سادھ سنگت کسی ایک زمانے کے لوگ ہی قائم نہیں کرتے۔ میں سمجھتا ہوں اس کا منشا یہ بھی ہے کہ ہر زمانے کے لوگ ان تمام نیک اور پاک لوگوں سے جو گذر چکے ہیں صحبت کا تعلق پیدا کریں، کہ ان بزرگوں سے فیض حاصل ہو، اور ان کے بارے میں صرف کتابوں میں نہ پڑھا جائے بلکہ انھیں اپنے زمانے میں موجود سمجھا جائے۔ آپ سوچئے کہ اگر ہم بجائے یہ پھیکی سی بات کہنے کے کہ سب مذہب سچے ہیں اور ان کی تعلیمات میں کوئی بنیادی فرق نہیں، صحیح دینی اور اخلاقی زندگی کی مثالوں کو، یعنی دنیا کے تمام دینی رہنماؤں کو ایک سادھ سنگت مانیں، اور خود اس سنگت میں شامل ہونا چاہیں تو اس سے ہمارے خیالات اور ہمارے آپس کے تعلقات پر کتنا اچھا اثر پڑے گا اور ہماری زندگی میں کتنی صفائی اور خوبصورتی پیدا ہو جائے گی۔

مجھے معلوم نہیں کہ سادھ سنگت کے بارے میں میرا جو خیال ہے وہ سکھ عقیدوں کے مطابق ٹھیک ہے یا نہیں، بہر حال میں نے جو بیان کیا ہے وہ بھی اس کا ایک مطلب ہو سکتا ہے جو اصل مطلب کے خلاف نہ ہوگا۔ البتہ یہ میں مانتا ہوں کہ سادھ سنگت میں شریک ہونے اور خدا کے حضور تک پہنچنے کے لئے گرو کی رہنمائی ضروری ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ گرو ایک بہت پرانا شبد ہے، اور عام استعمال میں اس کے کئی معنی ہیں۔ ایک بہت نالائق استاد کو شریف طبیعت کا طالب علم گرو کہہ سکتا ہے، اور ممکن ہے ایک بہت بڑا عالم وودوان اس قابل نہ ہو کہ اسے گرو کہا جائے۔ گرو سے مطلب شیخ یا پیر بھی لیا جاسکتا ہے جو اپنے مرید کی رہنمائی کرتا ہے، اور یہ بھی گرو کے ایک معنی ہیں۔ گرو نانک کی تعلیمات میں یہ لفظ بڑی اہمیت رکھتا ہے، مگر مجھے افسوس ہے کہ جو کتابیں میں نے پڑھیں ان سے یہ صحیح صحیح معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ غالباً اس کے ایک معنی ہیں توفیق الٰہی، یعنی وہ خاص صلاحیت، وہ استعداد، یا کہئے وہ بصیرت، وہ تڑپ، دل کا وہ نور جو خدا کی طرف سے انسان کو ملتا ہے اور اسے اس قابل بنا سکتا ہے کہ خدا کی ذات میں فنا ہو جانے کی آرزو کرے، اور اس آرزو میں بالکل گم ہو جائے۔ یہ توفیق گرو نانک کو بے حساب ملی تھی، مگر خدا کے ہر بندے کو کسی نہ کسی حد تک، کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتی ہے۔ یہ توفیق ہمارے جیسے انسانوں کو اس طرف مائل کرتی ہے کہ اپنے سے بہتر انسان تلاش کریں اور ان کی پیروی کریں، ان کے پیچھے چلیں۔ یہی توفیق ہمیں ایک رہنما سے دوسرے تک پہنچا سکتی ہے، کیا تعجب ہے کہ یہ ہمیں گرو نانک تک پہنچادے، اور ہم شاعر کی طرح کہہ سکیں:

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ہمارے لئے یہ سوچنا کہ خدا کے یہاں گرو نانک کا کیا مرتبہ تھا صرف اپنی عقل کو حیران کرنا ہے، اور اس میں یہ ڈر بھی ہے کہ ہماری زبان کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی اور ہمارا دل اسی دال روٹی کی دنیا میں پڑا رہ جائے گا۔ ہمیں سوچنا تو یہ چاہیئے کہ ہمارے یہاں، ہمارے دلوں میں، ہماری

زندگیوں میں گرو نانک کا کیا مقام ہے، کیا ہم بچپن اور لڑکپن میں ماں باپ کا ویسے ہی ادب کرتے ہیں جیسے کہ انھوں نے کیا تھا، کیا ہم میں نیک کام کرنے کی ویسی ہی ہمت ہے، کیا ہم غریب کی حلال کی کمائی کی ویسی ہی قدر کرتے ہیں جیسے انھوں نے لالو بڑھئی کی کی تھی، کیا ہم امیر کی دعوت قبول کرنے سے اسی طرح انکار کرسکتے ہیں جیسے انھوں نے ملک بھگو کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا تھا، اس لئے کہ امیر کی دولت دوسروں کی محنت سے، دوسروں پر ظلم کر کے حاصل ہوتی ہے، کیا ہم ان کی طرح خلوص سے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ہندو نہیں ہے، کوئی مسلمان نہیں ہے، یعنی سب خدا کے بندے سب میرے بھائی ہیں، کیا ہم انھیں کی طرح خدا کا پیغام ہر جگہ پہنچانے کے لئے تیار ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

یعنی میرے دوست میرے خدا نے میرے گلے میں رسی باندھ دی ہے اور اس کا جہاں جی چاہتا ہے لے جاتا ہے، کیا ہم میں کسی قسم کی سادہ سنگت قائم کرنے کی لگن ہے جس کا مقصد خدا کی عبادت کرتے ہوئے نیک اور مفید زندگی بسر کرنا ہو؟ گرو کا درشن چھوٹا دل اور مٹھی بھر چنے نہیں دلا سکتے، گرو تک ہمیں صرف وہ عشق پہنچا سکتا ہے جو ہمیں ان کے خیال میں محو رکھے، ان کی نیک اور شخصیت میں فنا ہو جانے کی آرزو میں ڈبو دے، شاعر کی طرح ہم بھی کہنے لگیں:

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

گرو اور خدا کا رشتہ بیان کرنے کی طاقت میری زبان میں نہیں۔ شاید یہ ایک ایسے اونچے مقام کی بات ہے جہاں ہم پہنچ نہیں سکتے۔ گرو نانک کی کامل شخصیت کی تصویر کھینچنا بھی ہمارے بس میں نہیں ہے۔ شیخ ابوسلیمان دارانی نے یہ بتانے کے لئے کہ صوفی کس کو کہتے ہیں فرمایا تھا کہ صوفی وہ ہے جس پر ایسی حالتیں گذرتی رہیں جن کا علم صرف خدا کو ہوتا ہو اور خدا ہی جانتا ہو کہ وہ اس کے

حضور میں رہتا ہے تو کیسے رہتا ہے۔ گرونانک نے اپنے آپ کو نہ پیغمبر کہا تھا اور نہ اوتار، ہم انھیں پیغمبر یا اوتار کہیں تو ہم ایسے مذہبوں کی اصطلاحیں قرض لیں گے، یعنی ایسے مذہبوں کی نقل کریں گے جو اُن کے مذہب سے الگ ہیں۔ یا یوں کہئے کہ ایک ملک کے سچے بادشاہ کو دوسرے ملکوں کا شاہی لباس پہنائیں گے۔ گرونانک تو گرونانک تھے اور ان کا ست کرتار سے اپنا جدا معاملہ تھا۔ اس معاملے کی کیفیت کا اندازہ ان کے مقدس کلام سے کیجئے۔ ان کے عشق کی ایسی شدت کو دیکھئے کہ ہم میں، جن کے لئے یہ عشق ایک سنی سنائی بات ہے، وجد کی کیفیت پیدا کرتا ہے، ان کی نظر کو دیکھئے کہ دیہات اور کسان کی زندگی، گرمی کی تپش اور برسات کی بھیگی رات، عورتوں کے سنگھار اور بیوی اور شوہر کی جدائی، روزمرہ کی ان معمولی باتوں میں وہ حسن تلاش کر لیتی ہے جو خدا تک پہنچنے کی تڑپ پیدا کر دیتا ہے، ان کے اس بے پناہ درد کو دیکھئے جو سب کی مصیبتوں کو اپنا لیتا ہے، اور انھیں خدا سے شکایت کرنے پر مجبور کرتا ہے، ان کے اس سکون کا کچھ اندازہ کیجئے جو سب کچھ خدا کی مرضی پر چھوڑ دینے سے ان کو حاصل ہوا تھا، گویا اپنے دل کے آئینے کو اتنا صاف کیجئے اور اتنا صاف کرتے رہئے کہ اس میں گرونانک کی کامل شخصیت کا تھوڑا بہت عکس اتر آیا کرے، اور غالب کا یہ شعر پڑھتے رہئے:

خبر نگہ کو، نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اونہ تو جانے

کیا اچھا ہو اگر ہم اس مبارک موقعے پر گرونانک کی پیروی کا شوق تازہ کریں، محبت اور خدمت کی زندگی گذارنے کا پکا ارادہ کریں۔ اور اپنے دلوں کو سچے معبود، ایک اونکار، ست نام کی عبادت کے سوا ہر خیال سے پاک کرنے کی کوشش میں لگ جائیں۔

معین الدین حارث

جامعہ سے متعلق

ایک قدیم طالب علم کے افکار و تاثرات

اب سے دو سال قبل جامعہ کے یوم تاسیس سے کچھ دن پہلے اکتوبر ۶۷ء میں دہلی حاضر ہوا تھا۔ یوم تاسیس کے جلسے میں اور اس سے متعلق دوسرے مختلف پروگراموں میں شرکت کی سعادت حاصل کی تھی۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی طرح ہر سال حاضری دیا کروں مگر اور مصروفیات زندگی اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ پارسال حاضر نہ ہو سکا۔ اس سال یوم تاسیس سے دو ہفتے قبل چند دنوں کے لئے دہلی میں تھا۔ انجمن جامعہ کے جلسے میں شرکت کی۔ جامعہ نگر میں قیام تو نہ کر سکا مگر کئی بار حاضر ہوا اور وہی مسرت حاصل کی جو ہر بار جامعہ آنے سے حاصل ہوا کرتی ہے۔

یوم تاسیس کے جلسے میں شریک ہو سکتا اور جلسۂ تقسیم اسناد میں کے۔ پی۔ ایس مینن صاحب کا عالمانہ خطبہ براہ راست انہی کی زبان سے سنتا تو دوہری مسرت ہوتی مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ برادر عزیز عبداللطیف اعظمی صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ اس موقع پر جب جامعہ کا جشن زریں (گولڈن جوبلی) قریب آ رہا ہے جامعہ کے طلبائے قدیم سے رابطہ بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور جامعہ کے متعلق خاصکر اس کے مستقبل کے متعلق ان کی رائیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے یہ خواہش بھی کی کہ اگر کسی وجہ سے حاضر نہ ہو سکوں تو اپنے خیالات لکھ کر پیش کروں۔ اسی دعوت پر ان سطور کے تحریر کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

جامعہ کا یوم تاسیس جب ہر سال آتا ہے تو خواہ اس میں شرکت ہو سکے یا نہ ہو سکے اس دن جامعہ اور اس کی زندگی خاصکر اپنی زندگی کے وہ سال جو اب سے چالیس ۴۰ پینتالیس ۴۵ سال قبل جامعہ میں گذر گئے

یاد آتے ہیں اور انہی کے ساتھ اپنے وہ اساتذہ کرام بھی جن کے درس اور فیض صحبت سے کچھ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ مجھے ہر ایسے موقع پر وہ یوم تاسیس جامعہ خاص طور پہ یاد آتا ہے جو میری طالب علمی کے دور میں آیا تھا اور جس کے جلسے میں استاد مرحوم مولانا اسلم جیراجپوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظم پیش کی تھی جس کا پہلا شعر نصف صدی گذر جانے کے بعد بھی یاد رہ گیا ہے:

یومِ تاسیسِ جامعہ ہے آج
نُطقِ مہمانِ سامعہ ہے آج

مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم نہ صرف ایک بے بدل حافظ قرآن تھے بلکہ ان کا قرآن مجید کا مطالعہ وسیع اور اس کے معانی و مطالب پر ان کی نظر گہری تھی۔ اسی کے ساتھ تاریخ اسلام پر بھی انہیں عبور حاصل تھا اور ان کے اس علم وفضل سے اس دور کے (جس دور میں میں جامعہ کا طالب علم تھا) بلکہ اس کے بعد بھی جامعہ کے صدہا طالب علم فیض یاب ہوئے اور اس چیز نے ان طالب علموں میں قرآن کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق اور لگاؤ پیدا کیا۔ یہ بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جنھوں نے علم و فضل کے اس دریا سے تھوڑی بہت بھی سیرابی حاصل کی ان پر قرآن فہمی کی راہیں کھل گئیں۔ میں اپنی اس خوش نصیبی پر رب قدیر کا جس قدر بھی شکر ادا کروں کم ہوگا کہ اپنے اور بہت سے ہم جماعت رفقاء کے ساتھ مجھے بھی یہ موقع ملا۔ خداوند کریم مولانا اسلم مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور اعلیٰ علیین میں بلند ترین مراتب سے نوازے، آمین۔ ان کے اس احسانِ عظیم کو ان کا کوئی شاگرد فراموش نہیں کر سکتا۔

مولانا اسلم مرحوم کو قرآن و تاریخ اسلام پر عبور کے ساتھ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی اور ان کی نظم گوئی تحریک خلافت کے دور میں عروج پر تھی۔ اس سلسلے میں ان پر شبلی مرحوم کا رنگ غالب تھا۔ ان کی کئی نظمیں اس زمانے میں عام جلسوں میں پڑھی جاتی تھیں اور زبان زدِ خاص و عام ہو گئی تھیں۔ ان نظموں میں بھی قرآنی تعلیمات و تاریخ اسلام کی روایات کی طرف بڑے لطیف پیرائے میں اشارات ہوا کرتے تھے اور سامعین کو اسی صراطِ مستقیم کی طرف آنے کی دعوت ہوا کرتی تھی۔ ان کی ایک طویل نظم کا جس میں یہی تعلیم تھی اور صبر و شکر پر زور تھا، آخری شعر اب بھی یاد آتا ہے اور بہت سے

کٹھن وقتوں میں ڈھارس بندھاتا ہے:

آزمائش ہے نشانِ بندگانِ محترم
جانچ ہوتی ہے اسی کی جس پہ ہوتا ہے کرم

یومِ تاسیس کے جلسے میں انھوں نے جو نظم پڑھی تھی وہ بھی اس رنگ میں تھی اور جامعہ کے مقاصد کو واضح کرتی تھی۔ آج کے جلسے میں بھی جو طلبائے قدیم موجود ہوں گے انھیں وہ موقع ضرور یاد آئے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس جلسے میں موجود نہیں ہوں۔

اب کی جامعہ کا جو یوم تاسیس ہو رہا ہے اس میں سب سے بڑا خلا جو شرکائے جلسہ کو محسوس ہوگا وہ ہے جو استاد محترم ذاکر حسین صاحب مرحوم امیر جامعہ کی وفات حسرت آیات سے پیدا ہوا ہے۔ ان کا وجود گرامی نہ صرف جامعہ کے لئے بلکہ پوری ملت اور مادرِ وطن کے لئے بہت بڑی نعمت اور سرمایہ تھا۔ تقریباً پانچ ماہ قبل گذشتہ مئی میں ان کے اچانک انتقال سے جو صدمہ گذرا اس کا احساس ملک و ملت کے لئے کس درجہ شدید تھا اس کا اندازہ ان خراجہائے عقیدت سے ہوتا ہے جو ان کی وفات کے بعد انھیں پیش کئے گئے۔ ذاکر صاحب کی ذات کو جامعہ کے علاوہ ملک کے اور بھی کئی ممتاز علمی اور تعلیمی اداروں سے قریبی تعلق تھا مگر ان سب میں جس ادارے کو ان کے اٹھ جانے کا غم زیادہ سے زیادہ ہو سکتا ہے اور جسے انتہائی شدت کے ساتھ برسوں یاد کیا جائے گا وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے جس کی تقریباً ڈوبتی ہوئی کشتی کو انھوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ ۲۵ء میں سہارا دیا، طوفان حوادث سے بچا کر کنارے لگایا اور اپنی زندگی کے پورے بائیس سال اس کی خدمت میں صرف کر کے شب و روز کی ان تھک محنت سے اس کی ایسی آبیاری کی کہ یہ پودا نہ صرف پروان چڑھا بلکہ ان کی زندگی میں اس نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی۔

گذشتہ بیس سال کی مدت ذاکر صاحب نے جامعہ سے دور رہ کر گذاری اس کا ایک تہائی حصہ اپنی مادرِ علمی علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی خدمت میں صرف کیا اور آخری بارہ سال بڑے اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے جن میں آخری عہدہ آزاد جمہوریۂ ہند کی صدارت تھا اور جس کے فرائض

انھوں نے اس درجہ انہماک اور اس انوکھی شان سے انجام دئے کہ وہ آزاد ہند کی تاریخ کا زریں اور یادگار باب بن گئے ہیں۔ مجھے جامعہ کی طالب علمی کے دور میں اور اس کے بعد بھی جب وہ جامعہ کی تعمیر میں معروف تھے اور پھر اس کے بعد ان کے نیم سرکاری اور سرکاری عہدوں کے دور میں بھی ان سے برابر نیاز حاصل رہا اور مجھے اس بات کا ذاتی علم ہے کہ آخری دور میں جب وہ جامعہ سے دور تھے اور براہ راست جامعہ کے کسی کام میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتے تھے یا پسند نہیں کرتے تھے انھیں جامعہ کا اور اس کی مزید ترقی کا ہر وقت بلکہ ہر لمحہ خیال رہا کرتا تھا۔ ان کی دلی خواہش یہی تھی کہ جامعہ کو اور زیادہ ترقی نصیب ہو مگر اس ترقی کے ساتھ ساتھ جامعہ اپنی ان خصوصیات کو باقی رکھے جو بانیانِ جامعہ کے اور خود ذاکر صاحب کے پیش نظر تھیں اور جنھیں عملی شکل دینے کے لئے ذاکر صاحب مرحوم اور ان کے رفقائے کار نے جن میں سے اکثر تو انہی کی طرح اللہ کو پیارے ہو گئے (جو باقی ہیں انھیں اللہ سلامت رکھے اور ان کا سایہ جامعہ کے سر پر تادیر قائم رہے) اپنی زندگیوں کا بہترین حصہ صرف کیا کیونکہ ان خصوصیات ہی کا نام دراصل جامعہ ملیہ ہے ورنہ تعلیمی اداروں کی ملک میں پہلے کمی تھی نہ اب ہے اور اب تو ان کی تعداد میں اتنا اور اس تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے کہ ملک کی آبادی کی بے پناہ کثرت کی طرح ان اداروں کی کثرت سے بھی بعض اوقات خوف محسوس ہوتا ہے۔

مگر جامعہ کی خصوصیات باقی رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ رفتار زمانہ اور ضروریات وقت کے مطابق جامعہ میں تبدیلیاں نہ ہوں یا وہ بدلتے ہوئے دور کے تقاضوں کو پورا نہ کرے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو وہ ایک ایسے جمود کی کیفیت ہوگی جو اس ادارے کو زندہ تو رکھے گی مگر اس کی نشوونما روک دے گی اور وہ ٹھٹھر کر رہ جائے گا۔ جامعہ کا تخیل اور اس کے مستقبل کی تصویر ذاکر صاحب مرحوم کی نظر میں یہ کبھی بھی نہ تھی جن دوستوں کو مرحوم کی وہ تقریریں یاد ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً جامعہ میں کیں، ان کی ایک موقع پر کہی ہوئی یہ بات ضرور یاد آئے گی کہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اداروں کی شاندار عمارتیں مقبرے بن کر رہ جاتی ہیں اور ان میں دور دور تک

کہیں بھی زندگی کا پتہ نہیں ملتا، خدا نہ کرے کہ جامعہ کی عمارتوں کا کبھی بھی یہ حال ہو جائے۔

اسے اتفاق یا جی چاہے تو حسن اتفاق کہیئے کہ ذاکر صاحب مرحوم کے انتقال سے گنتی کے پانچ دن قبل میں دہلی میں تھا۔ حاضری انہی کی خدمت میں تھی اور ان کی زندگی کا آخری Week-End (سنیچر اور اتوار) میں نے انہی کے ساتھ گزارا۔ اس اتوار کو جو ان کی زندگی میں آخری اتوار تھا شب کے کھانے پر میں تنہا ان کے ساتھ تھا۔ کھانے سے فراغت کے بعد حسب عادت باتیں شروع کیں، اور ان کا سلسلہ معمول سے بہت زیادہ طویل ہو گیا اور کامل ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا۔ ان کی عمر، ان کی صحت اور ان کی تھکن کا خیال کرتے ہوئے اس ڈیڑھ گھنٹے میں میں نے کئی بار کوشش کی کہ اجازت چاہوں اور یہ کہنے کی بھی جرأت کی کہ آپ اب آرام فرمایئے مگر انھوں نے باصرار روکا اور زیادہ تر جامعہ اور اس کے مستقبل کے متعلق ہی باتیں کرتے رہے۔ انھیں جامعہ کے جشن زریں کا بہت خیال تھا اور وہ چاہتے تھے کہ یہ آنے والا جشن بھی اسی طریقے سے منایا جائے جیسا اب سے چوبیس سال قبل جشن سیمیں منایا گیا تھا اور اسے جامعہ کی زندگی کا ایک اور یادگار موقع بنا دیا جائے۔ افسوس کہ اس موقع پر ذاکر صاحب موجود نہ ہوں گے۔

وہ چاہتے تھے کہ جس طرح آزادی سے پہلے جب جامعہ سرکاری امداد سے محروم تھی بلکہ اُسے قبول بھی نہیں کرتی تھی، جامعہ کی ضرورتوں کے لئے عام لوگوں کے پاس جا کر چندہ فراہم کیا جاتا تھا اس موقع پر بھی فراہمیٔ چندہ کی کوشش کی جائے۔ ہر چند کہ جامعہ کے جاری اخراجات اب سرکاری امداد سے جو اب پرانی بدیسی حکومت نہیں بلکہ اپنی قومی حکومت ہے اور جس کے خزانے کا ہر پیسہ قومی سرمائے کا حصہ ہے، پوری ہوتی ہیں مگر متعدد ایسے کام ہیں جو جامعہ کو کرنے ہیں اور کرنے چاہئیں اور جن کے لئے سرکاری خزانے سے امداد نہیں مل سکتی اور نہ اس کی توقع کرنی چاہیئے۔ پھر قوم سے چندے کی فراہمی محض سرمایہ جمع کرنے کی خاطر ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعے ادارے کا قوم سے زندہ رابطہ قائم ہوتا ہے جس کی کسی بھی ادارے اور خاص کر تعلیمی ادارے کی صحیح ترقی کے لئے وہ ضرورت محسوس کرتے تھے۔

اس سلسلے میں قدرتی طور پر انھیں جامعہ کی بطور جوبلی کا وہ چندہ یاد آیا جس کا ایک اچھا خاصا انھوں نے ملک کے اس ممتاز شہر بمبئی میں، جس میں میں نے جامعہ کی طالب علمی کے اپنے دور کے خاتمے کے بعد اپنی پوری زندگی گذاری ہے انھوں نے اپنے رفیقِ محترم شفیق الرحمان قدوائی مرحوم کے ساتھ کئی ماہ کی ان تھک کوشش اور بقول انہی کے جس کا اعلان انھوں نے بمبئی کے ایک سے زائد عام اجتماعات میں بھی کیا تھا، اس وسیع و عریض شہر کی تنگ و تاریک گلیوں کی خاک چھان کر جمع کیا تھا۔ پچیس سال کی مدت گذر جانے کے بعد ذاکر صاحب کو اپنے اور جامعہ کے وہ دوست اور مربی یاد آرہے تھے جن سے وہ اس چندے کے سلسلے میں ملے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کا نام لے لے کر ان کا ذکر کیا جو اب باقی نہ رہے ان کے لئے کلمات خیر کہے، ان کی خوبیوں کو یاد کیا جو ابھی بقید حیات ہیں؛ ان کا ذکر آیا تو ان میں سے بعض سے خصوصی طور پر مل کر سلام پہنچانے کی فرمائش کی۔ ان میں اگر ان کے رفیقِ محترم جناب ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید صاحب مینجنگ ڈائرکٹر سپلا تھے تو بمبئی کے اس دور کے وہ عرب ملک التجار شیخ محمد علی زین العلی رضا بھی تھے جنھوں نے سولہ سال کی عمر میں ہندوستان آکر بمبئی میں سکونت اختیار کی۔ موتیوں کی — سچے موتی آج کل کے نقلی نہیں۔ تجارت میں ملک التجار کا درجہ حاصل کیا اور پوری زندگی بمبئی میں گذار کر اسی مہینے ۸۴ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا — اور ان میں ایک اور عزیز دوست جناب حاجی نور محمد احمد صاحب بھی تھے جو پرانے خلافتی اور کانگریسی مگر ان دنوں مسلم لیگ سے وابستہ تھے اور جنھوں نے اپنی سیاسی جماعت کے ممتاز لیڈروں کے حکم اور سخت تنقید کے باوجود جامعہ کے جوبلی فنڈ میں حسب استطاعت اضافہ کرنے کی جرأت مندانہ کوشش کی اور اس پُر آشوب دور میں بھی یہ بات یاد دلائی کہ تعلیمی کاموں کو سیاسی اختلافات کی ہوا نہ لگنی چاہئے اور اچھے تعلیمی اداروں کی امداد شریف انسان کا، بلالحاظ سیاسی عقائد و خیالات یا وقتی رجحانات فرض ہے — انھوں نے سیف طیب جی مرحوم کو یاد کیا جنھوں نے اپنے دائرہ اثر میں جامعہ کے ہمدردوں کا ایک حلقہ پیدا کیا اور ان کے ذریعے جامعہ کی مدد کی اور ذاکر صاحب مرحوم کے مشوروں سے مستفید ہو کر بمبئی

میں انجمن اسلام کے ذریعے اردو کے تعلیمی اداروں کا قدیم مگر اس وقت کا کچھ بے ترتیب سا نظام درست کیا، اس میں نئی جان ڈالی اور اس کام کو اس طرح بڑھایا اور پھیلایا کہ اب وہ بمبئی والوں کی تعلیمی ضروریات کے ایک اچھے خاصے حصے کا کفیل اور ضامن بن گیا ہے ___ اُن مسلم دوستوں کے ساتھ ذاکر صاحب مرحوم کو وہ غیر مسلم دوست اور ادارے بھی یاد آئے جنھوں نے ان کی اپیل پر جامعہ کی دریادلی سے امداد کی تھی ان میں اگر ہاؤس آف ٹاٹا ز تھا تو پٹیل والکرٹ برادرس کے ڈائرکٹر، گاندھی جی کے رفیق، اور ذاکر صاحب کے عزیز دوست جناب جہانگیر پٹیل بھی تھے۔

ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ انہی اداروں اور ان پرانے دوستوں اور انہی کے ساتھ نئے ہمدردوں سے مل کر انھیں جامعہ کے کام سے جو واقفیت ہے اس میں مزید اضافہ کر کے اور جامعہ کی جن ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے غیر سرکاری ذرائع سے سرمایہ فراہم کرنے کی ضرورت ہے ان پر توجہ دلاکر اس موقع پر بھی ایک معقول رقم فراہم کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ زندہ ہوتے تو باوجود ان کے عہدے کی بعض پابندیوں کے بھی جامعہ سے ان کا تعلق اور ان کی زندگی بھر کی محنت کے اس شجر کو اور زیادہ بارآور بنانے کے لئے سرمایہ کی فراہمی آسان ہوتی۔ مگر اب وہ ہم میں نہیں ہیں پھر بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کا جامعہ سے زندگی بھر کا تعلق اور جیسے اب جامعہ کی سرزمین میں ان کی آخری خواب گاہ بن جانے سے دوام حاصل ہوا ہے اس کی وجہ سے ان دوستوں کے لئے جو اس کام کا بیڑا اٹھائیں گے اب بھی بہت سی سہولتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ جامعہ کو ان سہولتوں کا ٹھیک سے اندازہ کرنا چاہئے اور جوبلی کے سرمایہ کی فراہمی کے موقع پر ان سابقہ روایات و تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

میں نے بہت سا حصہ اپنے محترم استادوں کی یاد اور گذرے ہوئے واقعات کی یاد تازہ کرنے میں صرف کیا، شاید اپنی عادت اور اس تربیت کی وجہ سے جو جامعہ کی گود میں حاصل ہوئی اور جسے ذاکر صاحب کے فیضِ صحبت نے جلا دی، میں اس پر مجبور تھا مگر مجھے یہ بات یاد ہے کہ جامعی احباب یہ بھی معلوم کرنا چاہیں گے کہ ایک ایسے سابق جامعی طالب علم کی حیثیت سے جس نے

تا حدِ امکان اپنی مادرِ علمی کے ساتھ اپنے تعلق کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے، جامعہ کے مستقبل اور اس کے آئندہ کاموں کے متعلق میرے ذہن میں کیا خیالات ہیں اور میری حقیر رائے میں اب جامعہ کو کیا کرنا چاہئے۔ ہر چند کہ میں اس موضوع پر ان دوستوں کی طرح جنھوں نے اپنی زندگیاں جامعہ کے لئے وقف کی ہیں اور جو اب بھی اسی کام میں مصروف ہیں کچھ زیادہ کہنے کا حق نہیں رکھتا پھر بھی یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ میری رائے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مزید ترقی بخشنے اور اس کا کام اور زیادہ پھیلانے کے ساتھ اس کی بنیادی خصوصیات کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ جامعہ اپنے ابتدائی دور میں اور خاصکر ذاکر صاحب کی عملی سرپرستی جب اسے صبح سے شام تک حاصل رہی اس زمانے میں اپنے طرز کا ایک نرالا تعلیمی تجربہ تھا اور اسے اس صدی کی تیسری اور چوتھی دھائی میں جو شہرت و عزت حاصل ہوئی وہ انہی تعلیمی تجربات کی بنا پر تھی۔ یہ سچ ہے کہ جامعہ ابتدا ہی سے ایک جامعہ یعنی یونیورسٹی تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ یونیورسٹی کا یہ تخیل کچھ بہت زیادہ صحیح نہیں ہے کہ اس کے ساتھ بہت سے کالجوں کا الحاق ہو اور اس سے فیض حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہو، پھر بھی جامعہ میں کالج کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ابتدا سے رہا اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا بلکہ بعض شعبوں کے لحاظ سے اس کی توسیع بھی ہوگی۔ مگر ملک کے تعلیمی تجربات میں جامعہ کی اپنی دین یا Contribution اس کا ابتدائی مدرسہ اور اسی کے ساتھ اس میں ثانوی تعلیم کا انتظام تھا۔ یہ شعبے اب بھی موجود ہیں اور میری رائے یہ ہے کہ یہ نہ صرف باقی رہنے چاہئیں بلکہ ان کو مزید ترقی دینے اور مثالی بنانے کی کوشش بھی جاری رہنی چاہئے۔

تعلیم میں اعلیٰ یا کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کو ضرور بلند مقام حاصل ہے اور اب تو ہمارا ملک صحیح طور پر مابعدِ سند یا (پوسٹ گریجویٹ) تعلیم پر بھی متوجہ ہو رہا ہے، پھر سائنس اور ٹکنیکی تعلیم پر بھی زیادہ زور دیا جا رہا ہے کیونکہ ماضی میں ان شعبوں پر ویسی توجہ نہیں ہو پائی تھی جیسی ہونی چاہئے اور موجودہ حالات میں جس کی ضرورت مسلّم ہے، مگر اس سے کون انکار کر سکتا

ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کی بنیاد وہ ابتدائی اور اس کے بعد کی ثانوی تعلیم ہے جس پر سندی یا مابعد سندی تعلیم کا شاندار قصر تعمیر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ؟ اور اس سے بھی کون انکار کرسکتا ہے کہ اگر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی بنیاد خدانخواستہ کمزور ہو تو پھر اس پر کھڑی کی جانے والی سندی اور مابعد سندی تعلیم کی عمارت بھی کمزور ہی رہے گی ؟

اس باب میں اگر کچھ شکوک و شبہات ذہن میں پیدا بھی ہوں تو ابھی پارسال شائع شدہ کوٹھاری کمیشن کی ضخیم رپورٹ موجود ہے جس کا سرسری نظر سے مطالعہ کرنے والا بھی اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرسکتا کہ ہمارے ملک میں اب بھی تعلیم کی یہی ابتدائی اور اصل بنیاد بہت کمزور ہے اور بڑی اور اہم ضرورت اسی بنیاد کو ٹھیک کرنے کی ہے ۔ چونکہ ماضی میں جامعہ نے اس سلسلے میں بہت اچھا اور مثالی کام کر دکھایا ہے جس کا اعتراف ملک کے اور بیرون ملک کے ماہرین تعلیم بھی کرچکے ہیں ، جامعہ کو اپنے کام کے اس حصے کی طرف سے غفلت نہ برتنی چاہئے بلکہ اسے ٹھیک کرنے اور پائداری بخشنے کے ساتھ اس میں نئے نئے تجربات کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کام کے لئے ویسی وافر سرکاری مالی امداد نہ ملے جیسی اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے لئے حکومت ہند دے سکتی ہے (اور پھر جامعہ ایسے علاقے میں ہے جہاں صوبائی حکومت کا نظام اب مضبوط اور ترقی یافتہ نہیں ہے جیسا ملک کے اور صوبوں میں ہے ۔ اس لئے سرکاری سطح پر امداد کی کمی بھی محسوس ہوسکتی ہے) مگر اس کمی کو اور ذرائع سے پورا کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہئے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کام سے اور اس کی اہمیت سے عام لوگوں کو واقف کیا جائے تو اسے امداد حاصل کرنے میں کوئی خاص دشواری ہو یا کامیابی نہ ہو ۔

اس ضمن میں ایک تجویز اور بھی پیش کرنے کی جرأت کروں گا اور وہ جامعہ کی تعلیمی برادری جو تعلیمی کام کرتی ہے اس کا فیض اوروں تک پہنچانے کی کوشش ہے ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جو تعلیمی کام جامعہ میں ہوتا ہے یا جو تجربات یہاں اس سے پہلے ہوئے ان سے اور مقامات کے تعلیمی اداروں نے بھی فائدہ اٹھایا مگر جہاں تک خود جامعہ کی تعلیمی بستی کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ اس بستی کے

باہر بھی اور قرب وجوار کے علاقوں میں اچھے یعنی مثالی ابتدائی اور ہو سکے تو بعض ثانوی مدارس بھی قائم کرنے اور چلانے کی کوشش جامعہ کو کرنی چاہیئے اگر ایسا ہو سکا تو یہ ایک اچھے تعلیمی کام کا دائرہ اور وسیع کرنے کا باعث ہو سکے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مثالی طرز کے ہر کام کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہوگی اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ حکومتیں اور سرکاری ادارے اپنی قانونی اور ضابطوں کی پابندیوں کے ساتھ جو رقوم دیا کرتی ہیں وہ پوری طرح کافی کبھی بھی نہیں ہوتیں نہ ہونی چاہئیں کیونکہ ہر نیا تجربہ خرچ کا طالب ہوا کرتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ خرچ سرکاری قوانین وضوابط کی حدود میں قابل قبول قرار پا سکے اور کچھ تجربات تو ایسے بھی ہونے چاہئیں جو اس آزادی اور اپنی قومی حکومت کے دور میں بھی سرکاری امداد واعانت سے بے نیاز رہ کر ہی کئے جائیں۔ یہ محض ایک خیال ہے اس پر خود جامعہ کے اہل نظر اور وہ اصحاب جو تعلیمی تجربات میں ذاتی طور پر معروف ہیں، سوچ سکتے ہیں اور اس کام کی راہیں نکال سکتے ہیں مگر اس طرح کے چھوٹے موٹے کاموں میں بھی مالی امداد واعانت کی جو ضرورت ہو وہ پوری کرنے میں جامعہ کے طلبائے قدیم اور انجمن طلبائے قدیم کو جامعہ کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔

ایک اور خیال جو بار بار میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور جو کسی حد تک اس ذاتی تجربے پر مبنی ہے جو برسوں تک سیاسی کام اور اس سلسلے میں سیاسی پارٹی کی تنظیم اور شہر بمبئی کے متعدد تعلیمی اور سماجی کام کرنے والے اداروں سے عملی تعلق سے پیدا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جس دور سے ہم لوگوں کی ابتدائی زندگی کا تعلق رہا وہ گاندھی جی کی جاری کردہ قومی تحریکات کا دور تھا جس میں نوجوانوں کو قومی خدمت کی دعوت دی جاتی تھی، سیاسی تحریکات میں حصہ لینے کی بھی اور قومی طرز کے ادارے قائم کرنے اور چلانے کی بھی، اور یہ کام اگر بلا معاوضہ نہیں تو بہت قلیل معاوضے پر جو بسا اوقات معمولی طرز کی زندگی گذارنے کے لئے بھی ناکافی ثابت ہوا کرتا تھا، کام کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ اس دور میں اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تعداد بہت کافی تھی ان میں سے ایک بڑی تعداد نے تو اپنی پوری زندگی نہایت ایمانداری اور خلوص کے ساتھ ان کاموں میں لگادی اور یہ اعتراف ایک بین حقیقت ہی

کا اعتراف ہوگا کہ ہمارے ملک کے بہت سے قومی ادارے جو اس دور کی یادگار ہیں انہی مخلص کارکنوں کی خدمات کا پھل ہیں جن سے قوم آج بھی فائدہ اٹھا رہی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ بذات خود اسی کی ایک زندہ مثال اور بلاشبہ قابل فخر مثال، ہے اور اسی لئے ذاکر صاحب مرحوم اور ان کے رفقائے کار جن کی پرخلوص قربانیوں سے یہ ادارہ قائم رہا اور ترقی کر سکا ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

مگر اب حالات بہت کچھ تبدیل ہو چکے ہیں، اب اس قسم کی دعوت دینے والے بھی نظر نہیں آتے اور اگر دعوت دیں تو انھیں کیا جواب ملے گا یہ کہنا بھی مشکل ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو جواب ملے گا وہ بہت زیادہ حوصلہ افزا نہ ہوگا۔ یہ تو مان لیا جا سکتا ہے کہ اب گوکھلے اور گاندھی اور ذاکر حسین مشکل سے پیدا ہوں گے اور نہ انھیں ایسے ساتھی ملیں گے جو تن من دھن سبھی کچھ قربان کر کے کسی کام یا کسی ادارے کو قائم کرنے یا چلانے کی ذمہ داری قبول کریں، مگر زندگی کے اور بہت سے شعبوں کی طرح اس میدان میں بھی اب درمیانہ راستہ کیوں نہ نکالا جائے کہ فقیرانہ زندگی اختیار کر کے کام کرنے والے نہ سہی مگر سادگی اور قناعت سے کسی دینک کام کے کر اپنی صلاحیتیں تعلیمی اور سماجی کاموں پر لگانے والوں کا ایک گروہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور خاص کر جامعہ جیسے قومی اداروں میں جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا پر نظر رکھی جائے اور ان میں سے اچھے اور باصلاحیت نوجوانوں کو خصوصیت کے ساتھ قومی اور سماجی کاموں کے لئے تیار کیا جائے یا کم از کم ان کی طالب علمی کے دور میں ان کاموں کی انھیں رغبت دلائی جائے۔ یوں تو ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ پورے تعلیمی نظام اور دوسرے مختلف کاموں اور اداروں کے لئے ضروری افراد فراہم کرتا ہی رہے گا مگر ان کا خواہ بہت چھوٹا سا حصہ ہی کیوں نہ ہو ایسا کیوں نہ ہو جسے طالب علمی کے دور ہی سے ان کاموں کی رغبت دلا کر ان کے لئے تیار کیا جائے اور ان سے اتنی قربانی کی توقع رکھی جائے کہ وہ اپنی جائز ضروریات زندگی اور ایک اچھی متوازن قسم کی زندگی کے لئے ضروری معاوضے کی توقع ضرور کریں اور یہ ان کا حق ہے جو انھیں ضرور دیا جائے، مگر وہ محض روپیہ یا بڑی تنخواہ کو اپنا مطمح نظر قرار نہ دے کر ایسے معقول معاوضے پر جو قوم اور اس کے ادارے دے سکتے ہیں قومی اور

سماجی کاموں میں زندگی گذارنے پر آمادہ ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ جامعہ جس دور کی یادگار ہے اسی دور کی ایک اور قومی یادگار گجرات ودیاپیٹھ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے فارغ التحصیل طلبا کو زیادہ تر ایسے ہی تعلیمی اور سماجی کاموں میں کھپایا جائے۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ گجرات کی اپنی کچھ روایات ہیں اور گاندھی جی نے جو ادارے اس علاقے میں چھوڑے ہیں ان کی وجہ سے بھی گجرات والوں کو اس کام میں سہولت حاصل ہے مگر گجرات کے دیہاتوں کے لئے اچھے تربیت یافتہ اور مقصد کی خاطر کام کرنے والے استاد اور کارکن مہیا کرنے کا جو کام گجرات ودیاپیٹھ کر رہا ہے اس کی معلومات حاصل کر کے اس طرز پر سو فی صدی نہ سہی مگر کسی حد تک بھی اپنے قومی تعلیمی اور سماجی اداروں کے لئے اچھے کارکن مہیا کرنے پر جامعہ توجہ کر سکے اور اس کا کوئی ایسا انتظام بنائے جو اس کے تعلیمی نظام کے ساتھ ساتھ چل کر ایسے کارکن مہیا کر سکے تو یہ وقت کی اور اب سے بعد کے دور کی بھی ایک بڑی قومی ضرورت پوری کر سکے گا۔

جہاں تک جامعہ کی عمارات کی تعمیر کا تعلق ہے مجھے جو کام طلبائے قدیم کی توجہ کا زیادہ اور فوری طور پر مستحق نظر آتا ہے وہ جامعہ نگر کی مجوزہ مسجد کی تعمیر ہے۔ اب کی جامعہ جانے پر یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ جس جگہ استاد مرحوم اب آرام فرما ہیں اس کے قریب ہی اس شاندار مسجد کی بنیاد پڑ گئی ہے مگر یہ بھی معلوم ہوا کہ جو سرمایہ پہلے جمع ہو چکا تھا وہ تقریباً صرف ہو چکا ہے اور ایک کافی بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ یہ کام بھی ایسا ہے کہ نہ تو اس کے لئے سرکاری مدد مل سکتی ہے، نہ ملتی ہو تو قبول کرنی چاہئے بلکہ یہ کام قوم کو خود کرنا چاہئے۔ جامعہ کا تعلق، ذاکر صاحب کی آخری آرام گاہ کا قرب اور جامعہ کی پوری تعلیمی بستی کی ایک ضرورت، اس لحاظ سے اس مسجد کی جو اہمیت ہے وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ طلبائے قدیم کو اپنے اپنے حلقے کے اصحاب خیر سے اس کام کے لئے مالی امداد حاصل کر کے اس کمیٹی کا ہاتھ بٹانا چاہئے جو اس خانۂ خدا کی تعمیر میں مصروف ہے۔

سید غلام ربانی

فن اور زندگی

فن ایک طرزِ زندگی ہے، یہ خیال کچھ انوکھا سا معلوم ہوتا ہے، وجہ یہ ہے کہ ہم نے فن کو اپنے روزمرہ کے کاموں سے الگ سمجھ لیا ہے اور اس کی تخلیق فن کاروں کا ہی حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ ماہرینِ فن اور عوام کے درمیان ایک خلیج حائل ہے اور کچھ عرصہ سے یہ خلیج زیادہ وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ جب دنیا کے بڑے بڑے ماہرینِ فن کے شاہکار دیکھنے میں مصروف ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں اور کائنات کے اسرار و رموز اُن پر کھل رہے ہیں۔ اس وقت ان کی گفتگو کا بھی خاص انداز ہوتا ہے۔ فن کار حضرات کو دوسرے لوگ بدمذاق معلوم ہوتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دوسروں میں اچھائی برائی سمجھنے کا مادہ نہیں ہے اور جب وہ یہ جملہ سنتے ہیں کہ فن ایک طرزِ زندگی ہے تو حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ آخر یہ فن ہے کیا بلا اور زندگی سے کیا مُراد ہے؟

فن کی کوئی جامع تعریف کرنی مشکل ہے، ایک مختصر سی تعریف یہ بھی ہو سکتی ہے کہ "آرٹ چیزوں کا بنانا ہے" اسی موضوع پر اس وقت بحث ہوگی۔

کسی متوسط درجہ کے شخص کے مکان پر جائیں تو معلوم ہوگا کہ صاحبِ مکان نے اپنی چیزوں کو اس طرح رکھنے کی کوششیں کی ہیں جن سے وہ زیادہ اچھی دکھائی دیں۔ فرش یا قالین جو بچھا ہوتا ہے اس کے شوخ رنگ گرمائی میں کچھ اضافہ نہیں کرتے مگر اس شخص کے جذبات کو ضرور گرماتے ہیں جو ان پر چلتا ہے۔ دیواروں کو تصویروں سے سجایا جاتا ہے۔ کمرہ کی دیواروں پر کوئی خطِ مستقیم دیوار کو مضبوط نہیں بناتا مگر اس پر حاشیہ ضرور بنا دیتا ہے۔

زندگی گزارنے کے لئے فن کی کس قدر ضرورت ہے اس کی اہمیت کسی نئے جوڑے سے پوچھنی چاہئے جو اپنی نئی دنیا بسانے کی فکر میں ہے۔ اس کے سامنے مسائل کا ایک طوفان اٹھا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے مکان کا مسئلہ آتا ہے، آیا بنایا جائے، خریدا جائے، یا کرایہ پر لیا جائے، بہت کم لوگ ہیں جو مکان کے مسئلے کو خاطر خواہ طور پر حل کرتے ہوں۔ مکان محض گرمی سردی سے بچنے کا ایک ٹھکانا ہی نہیں ہوتا بلکہ کچھ اور بھی ہوتا ہے، اس کی تعمیر ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ زمین کی نوعیت کے لحاظ سے اس کا نقشہ تیار کرنا ایک فن ہے چنانچہ آرکیٹکٹ سکونتی ضروریات کے علاوہ اس بات کا بھی خیال رکھتا ہے کہ مکان دیکھنے میں اچھا معلوم ہو۔

مکان زمین پر ہوتا ہے اور زمین کا کچھ رقبہ ہوتا ہے اس میں نشیب و فراز بھی ہوتے ہیں۔ اس ناہمواری کو پھول پودوں سے چھپا دیا جاتا ہے۔ کوئی کونا بے تکا معلوم ہو تو اس کو انگور یا کسی اور قسم کی بیل سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ غرض کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی بدنمائی نہ بچے۔

ایک نئی نویلی دلہن یا ایک الہڑ نوجوان شروع میں کسی چیز کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ رکابیاں، چھری، چاقو، چادریں، پلنگ، کھانا پکانے کے برتن، کرسیاں، میزیں، لیمپ وغیرہ میں سے ہر چیز ایک فنی مسئلہ پیش کرتی ہے، کیونکہ اس کو یہ سوچنا ہوگا کہ آیا یہ چیزیں وضع قطع، رنگ، مناسبت اور موزونیت کے لحاظ سے اس طرز زندگی کے لئے مناسب ہوں گی جو وہ گزارنا چاہتا ہے یا گزار سکتا ہے۔

کپڑے مکان کی نسبت زیادہ ذاتی ہوتے ہیں۔ انسان اپنے کپڑوں کو اپنا ایک جزو سمجھتا ہے اور یہ کسی قدر درست بھی ہے وہ ایک پرانی یا گھسی پٹی شیروانی کی بجائے نئی شیروانی میں زیادہ خوش رہتا ہے اور یہ احساس بھی رکھتا ہے کہ اس کی دوسری شیروانیاں رنگوں اور خطوں کی ترتیب کے لحاظ سے اچھا اثر پیدا کریں۔ وہ کپڑے محض اس لئے نہیں پہنتا کہ گرمی سردی سے بچا رہے بلکہ اس معیار کو چاہتا ہے جس سے اس کے ساتھیوں میں اس کی سبکی نہ ہو۔ رنگ، بناوٹ، نمونہ، وضع، خطوط غرض ہر وہ چیز جو لباس میں امتیازی شان پیدا کرے اس کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے، چنانچہ فیشن کے دلدادہ حضرات نے اپنی سرگرمیوں سے ایک ہنگامہ بپا کر دیا ہے جس سے کپڑوں کی صنعت کے

عظیم الشان کارخانے قائم ہوگئے ہیں اور ان کی فروخت میں بھی عجیب وغریب طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ بڑی بڑی دکانوں پر لکڑی کے آدمی اعلیٰ قسم کے سوٹ پہنے کھڑے ہیں اور ان ملکوں میں جہاں کپڑوں کی فروخت کا فن زیادہ ترقی کرگیا ہے سچ مچ کی حسین عورتیں جدید ترین لباس زیب تن کئے نظر آتی ہیں، وہ چل پھر کر مختلف انداز سے اپنے آپ کو یا لباس کو دکھاتی ہیں۔

ابھی وہ زمانہ باقی ہے کہ لوگ بہت سی خوبصورت چیزیں اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں۔ بے شمار مرد اور عورتیں فرنیچر، قالین، موزے، سوئیٹر اور بہت سی ایسی چیزیں جو ہاتھ سے بناتے تھے اب کارخانوں میں بننے لگی ہیں اور گھر گھر نظر آتی ہیں۔

کارخانوں کی بنی ہوئی چیزیں اکثر گھٹیا اور سستی ہوتی ہیں، چنانچہ شروع میں جب کارخانوں نے چیزوں کا مینہ برسانا شروع کیا تو ایک شخص نے کہہ دیا تھا کہ کارخانوں کی پیداوار کا طوفان بے تمیزی زمین کو بھونڈی چیزوں سے پاٹ دے گا لیکن اب ایک تبدیلی ہوگئی ہے۔ کارخانوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ دلکش اور خوش وضع چیزیں بنانی شروع کر دی ہیں، ان میں بہتر خطوط ہوتے اور رنگوں میں زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

وضع میں بھی خوبصورتی پیدا کی جاتی ہے چنانچہ فرنیچر یا پارچہ جات اور خانگی ضرورت کی چیزیں مثلاً لیمپ، چولہے، میز کا سامان کھانا پکانے اور کھانے کے برتنوں میں وضع کے لحاظ سے تبدیلی کی گئی، ان کو خوبصورت بنایا گیا۔ باورچی خانہ جو مکان کا سب سے زیادہ کام کا کمرہ ہے اور ایک ناگوار محنت کی جگہ ہے، اب زیادہ بُری جگہ نہیں رہا اور لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ موجودہ فن ہمارے مکانوں میں باورچی خانہ سے داخل ہو رہا ہے۔ آج کل کی ایجادوں اور بجلی کے سامان کے استعمال کی کثرت اور نئی نئی نقلی دھاتوں کے سامان کی بھرمار ہوتی جا رہی ہے۔

مصنوعات کو بہتر بنانے کا شوق انتہا کو پہونچ گیا ہے۔ موٹر کے کارخانوں کے مالکوں کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ موٹر کے لئے محض تیز رفتاری کافی نہیں، لوگوں کو کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ انھوں نے موٹروں کے بدنما خطوط اور رنگوں کی اصلاح کے ساتھ گاڑی کی شکل کو بھی خوبصورت

بنانا شروع کیا، نئی نئی وضع کی موٹریں تیار ہونے لگیں اور ان نمونوں کی کثرت اس قدر ہوگئی کہ موٹروں کا نام ان کے نمونوں سے پکارا جانے لگا، چنانچہ ہر کارخانہ کی پیداوار کے ساتھ موڈل ۶۶ء، ۶۷ء عام ہوگیا اور موٹر نشین حضرات اچھی خاصی موٹروں کو نکال کر ۶۸ء کا موڈل خریدنے لگے۔

چیزوں کے اشتہار اور فروخت، ان کو سلیقے سے رکھنے یا سجانے کے لئے تجارت نے ہمیشہ فن سے مدد لی ہے، خوبصورت بیل بوٹوں کے تھان اور تیار کپڑوں کی نمائش، پھلوں کی ترتیب ان کے رنگ اور شکل کے لحاظ سے، بید کے سامان کو اس طرح آراستہ کرنا کہ خریدار کو ترغیب ہو، چیزوں کو بند کرنے یا رکھنے کے لئے بے شمار خوبصورت وضع کے ڈبے، شیشیاں، ان کی تصویریں اور اس قسم کی بہت سی ترکیبیں ہیں جن سے تاجر کام لیتے ہیں ان تمام چیزوں میں فنی اصول لازم ہوتے ہیں اور تجارت نے فن کا دامن اس طرح پکڑلیا ہے کہ آج کل "کمرشل آرٹ" ایک مستقل فن بن گیا ہے اور اسے بھی فنون لطیفہ کے دربار میں کرسی مل گئی ہے۔

لکھنا دنیا کے نہایت قدیم فنون میں سے ہے۔ چھاپنے اور کتابیں تیار کرنے کا فن اس قدر مشین کے چکر میں آگیا ہے کہ یہ کام اب انفرادی کوششوں کے بس کا نہیں رہا۔ پہلے زمانہ میں جو آدمی کتاب لکھتا تھا وہی قلم بناتا اور سیاہی تیار کرتا تھا۔ اب یہ صورت نہیں رہی۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے دیوانِ غالب چار پانچ آنے کو بازار میں بکتا تھا، وہی دیوانِ غالب برلن کے مطبع شرکتِ کاویانی میں بڑے اہتمام سے چھپا اور اب تو یہ حال ہے کہ مرقع چغتائی اور مصور دیوان الماریوں کی زینت بن گئے ہیں۔

بازاروں میں دکانوں کے نام جو کالی سیاہی کے حروف سے روشن ہوتے ہیں، رات کے وقت بجلی کی رنگین روشنیوں سے جگمگانے لگتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ فضا میں ہوائی جہاز دھوئیں سے حروف بناتے اور اشتہار دیتے ہیں۔

اب تک زندگی کے جن شعبوں کا ذکر ہوا، ان میں انفرادی انتخابات نمایاں ہیں لیکن اجتماعی سرگرمیوں کا بھی یہی حال ہے۔ کسی مقام پر ندی کا پل بنایا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو اس پر سے گزرنے

یں آسانی ہو لیکن پل دیکھنے کی بھی چیز ہے، اس کا منظر خوبصورت بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

دنیا میں بہت سے شہر اور قصبے بے ڈھنگے پن سے بڑھ گئے تھے۔ اب مذاق عامہ ترقی پا گیا ہے تو وہ بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ بھلا ٹیڑھی گلیوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ ان کو توڑ کر سیدھا کیا جا رہا ہے۔

عوام کے کاروبار کے لئے جو سرکاری عمارتیں بنتی ہیں ان میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ وسیع اور کشادہ ہوں اور ساتھ ہی خوش وضع ہوں اس کے لئے شہر حیدر آباد بہت اچھی مثال ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا آرٹس کالج، ہائی کورٹ، دواخانہ عثمانیہ، اسٹیٹ لائبریری، یونانی دواخانہ، صلح سرائے، معظم جاہی مارکیٹ، اسٹیٹ میوزیم، جوبلی ہال، اسمبلی ہال خوبصورت عمارتیں ہیں، ان میں بودھ اور مغل فنِ تعمیر نمایاں ہے۔

زندگی کے اہم شعبوں کی فہرست میں مذہب کو شامل کرنا ناگزیر ہے، مذہب اور فن کچھ انمل اور بے جوڑ سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مذہبی عمارتوں اور عبادت کے طریقوں میں فن آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے۔ مذہب نے ہم کو فن کے بڑے بڑے شاہکار دئے ہیں، دیوی دیوتاؤں کی رنگین تصویریں، دھاتوں اور پتھروں کی مورتیں، شاندار مقبرے، مسجدیں، مندر، کلیسا، گرودوارے صدیوں سے قائم ہیں، ان کے در و دیوار پر فنونِ لطیفہ کی مہریں لگی ہیں۔

اجنتا، ایلورہ، پیتل کھورا، ناسک، کارلی، بھاجا، الی فنٹا اور کھجراؤ میں فنونِ لطیفہ کے تاج محل ہیں۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت اور شاندار عمارتیں مذہب ہی نے بنوائی ہیں۔

مندروں میں بھجن گائے جاتے ہیں تو راگ راگنی کے ساتھ۔ کلیساؤں میں دعائیں پڑھی جاتی ہیں تو ترنم سے خالی نہیں ہوتیں۔ حمد اور نعت بھی تحت اللفظ کی بجائے ترنم میں بھلی معلوم ہوتی ہیں، اور قرأت اور اذان میں لحن دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔

محمد بدیع الزماں

اقبال اور وطنیت

اقبال کے متعلق اکثر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ وہ وطنیت کے قائل نہیں تھے ۔ گرچہ اقبال نے اپنی نظم "وطنیت" میں اس موضوع پر اپنے تصور کی وضاحت خود کی ہے ۔ ایسی ہی ایک تنقید حضرت فراق گورکھپوری کی ہے ۔ جناب محمد طفیل صاحب ایڈیٹر ماہنامہ "نقوش" لاہور کے نام اپنے خط مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۵۳ء میں حضرت فراق نے اقبال کی شاعری کے محرکات و مقاصد پر ان خیالات کا اظہار کیا ہے :

"اردو شاعری میں بہت سے محاسن کے باوصف بہت سی بلند چیزوں اور قدروں کی کمی رہی ہے۔ دو مثالیں لوں گا ۔ حالی اور اقبال کی ۔ حالی کا دل بہت نرم ہے ۔ نیکی اور شرافت اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن گہرا یا بلند تفکر یا فلسفیانہ دماغ ان کے یہاں نہیں ہے ۔ یہ چیزیں اقبال کے یہاں بدرجہ اتم ملتی ہیں ۔ لیکن بدنصیبی سے ایک جنگجوئی کا جذبہ بھی اُن کے یہاں ملتا ہے ۔ اور طاقت یا قوت خواہ کسی طرح کی بھی ہو اس کے لئے ایک اندھی پرستش بھی اقبال کے یہاں ملتی ہے ۔ جنگیں جیتنے ، ملکوں کو فتح اور ان پر اسلامی حکومتیں قائم کر دینے کو اقبال بڑی اہمیت دیتے ہیں ۔ ایک سنگین کرختگی مزاج کا اثر اُن کا کلام پڑھ کر ناگزیر ہو جاتا ہے ۔ اسلامی ملت کے تصور کی زنجیروں میں ان کی شاعری جکڑی ہوئی ہے[1] ۔"

---

۱ ۔ ماہنامہ 'نقوش' لاہور ، ادب عالیہ نمبر ، جولائی ۱۹۶۰ء

حضرت فراق گورکھپوری نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن سے اقبال کے نظریۂ شاعری پر ایک لمبی بحث چھڑ جاتی ہے جو اس مقالہ کا موضوع نہیں۔ مگر ان اقتباسات سے اقبال کے متعلق یہ غلط فہمی ضرور ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ وطنیت کے قائل نہیں تھے بلکہ ایک ایسی بین الاقوامیت کے دلدادہ تھے جس کا تعلق صرف اسلام اور مسلمان سے ہو۔ ادب ہو یا معاشرہ کا کوئی نظام بہت سی غلط فہمیاں ایسی ہوتی ہیں جو زمانہ کے گذرنے کے ساتھ ساتھ خود ایک مستقل عنوان بن جاتی ہیں اور ان غلط فہمیوں کے نتیجے میں معاشرہ میں زبردست ذہنی ردعمل پیدا ہوتا ہے اور اس کی شدید کشمکش قومی یکجہتی میں دیوار کی طرح حائل ہو جاتی ہے۔ ملک کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اقبال کے متعلق اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جائے تاکہ ادب بھی ہماری قومی یکجہتی میں ممد و معاون ہو سکے اور ہم اقبال کی شاعری پر بھی صحیح رائے قائم کر سکیں۔
اقبال کے متعلق ایسی ہی پیش کش کی اہمیت پر جناب آل احمد سرور صاحب نے حال ہی میں فرمایا ہے:

"اقبال اس ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کی پیداوار ہیں جس نے مغرب کے اثر سے ہمارے ملک میں ایک نئی مشرقیت کو جنم دیا... ان کی نئی مشرقیت کو ماضی پرستی کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ یہ عصر حاضر سے ایک نئے مفاہمے کی کوشش ہے... اس نئی مشرقیت میں اول اول قومیت کا ایک رومانی تصور تھا مگر کیا پرجوش اور ولولہ انگیز تصور۔ اقبال سے اس کے ہمالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا گیت، تصویر درد اور نیا شوالہ جیسی نظمیں لکھوائیں۔ ان نظموں میں بڑے خلوص سے باہمی محبت کو سارے فرقہ وارانہ خیالات کا حل بتایا گیا تھا... اقبال کی عظمت کے اعتراف کے لئے یہ قطعی ضروری نہیں کہ ہم ان کے مذہبی نظریے سے اتفاق کریں۔ وہ اس مذہبی نظریے کی وجہ سے بڑے شاعر کے درجے سے خارج بھی نہیں کئے جا سکتے..... دانتے اور ملٹن اور گوئٹے کے مذہبی نظریات سے اتفاق کئے بغیر ہم ان کی عظمت کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ اس طرح اقبال کی عظمت کے اعتراف کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کے یہاں بلند تخئیل، گہرا تجربہ، اپنے اسی گہرے تجربے سے مکمل وفاداری اور اس کے اظہار کے لئے مناسب اور موزوں اظہار.... ملتا ہے....
مسجد قرطبہ کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ سرتیج بہادر نے

اسپین میں لکھے گئے ان کے اشعار کے حوالے سے درست کہا تھا کہ یہ شاعری سب کے لئے ہے۔ اس لئے آج ہمیں مذہبی اور سیاسی نظریات کی بنا پر شاعروں کی عظمت متعین نہیں کرنا چاہئے۔

"...... آزادی کے بائیس سال بعد ہم اقبال کے متعلق زیادہ معروضیت کے ساتھ سوچ سکتے ہیں اور ان کی شاعری کے متعلق بہتر فیصلہ کرسکتے ہیں کیونکہ اب ان کی شخصیت کے اور ہمارے درمیان وقت کا خاصا فاصلہ ہوگیا ہے۔ ادب میں یہ فاصلہ بھی غیر جانبداری برتنے میں اور انصاف کرنے میں مدد دیتا ہے ... اقبال کی شاعری سے آج بھی ہمیں گرمی اور روشنی مل سکتی ہے۔"[۲]

اقبال اس وطنیت کے قائل نہیں تھے جو سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل سے یورپ اور مشرق وسطیٰ میں سامراجی طاقتوں نے "وطنیت" کے جو تصورات قائم کئے اور جن کے مضر اثرات آج بھی ان خطوں میں نظر آرہے ہیں، اقبال کے پیش نظر تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب و رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

اسی لئے اقبال نے وطنیت پر اپنے تصورات کے اظہار کے لئے اپنی نظم "وطنیت" کی سرخی "وطنیت یعنی بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے" رکھی۔ اور اس "وطنیت" کے جسے تہذیب نوی کے آذروں نے تراشا، مضر اثرات کی وضاحت اس طرح کی:

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے | تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے | کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

گرچہ اس نظم میں اقبال کا تخاطب مسلمانوں سے ہے مگر اس کا اطلاق ساری انسانیت پر ہوتا ہے کیونکہ

۲۔ ماہنامہ "صبح نو" پٹنہ، مئی ۱۹۶۹ء: "اقبال ــــ ایک آفاقی شاعر"

اقبال اسلام کا مقصد ملّتِ آدم قرار دیتے ہیں۔ ان کی دردمندی ملّتِ آدم کی متمنی تھی نہ کہ صرف جمعیت اقوام کی خواہ وہ مسلمانوں ہی کی کیوں نہ ہو۔ اس خیال کو "ضرب کلیم" کی نظم "مکہ اور جنیوا" میں بخوبی واضح کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تصورات محدود دائرے میں چکر نہیں لگا رہے تھے بلکہ ان کا اطلاق ساری انسانیت پر تھا۔ کہتے ہیں ؎

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام | پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم!
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود | اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم!
مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام | جمعیّتِ اقوام کہ جمعیّتِ آدم؟

مذکورہ بالا اشعار سے ہمارا ذہن اس امر پر صاف ہو جاتا ہے کہ وہ "جنگیں جیتنے، ملکوں کو فتح کرنے اور ان پر اسلامی حکومتیں قائم کر دینے کو" اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ ایسی بین الاقوامیت کے متمنی تھے جس کا محور "ملّتِ آدم" ہو نہ کہ "جمعیتِ اقوام"۔

اقبال کی بین الاقوامیت سے متعلق اپنا ذہن صاف کرنے کے بعد ہم ان کی حبّ الوطنی کا صحیح طور پر تجزیہ کر سکتے ہیں۔ حبّ الوطنی بہت پاکیزہ اور مقدس جذبہ ہے۔ اس کی اہمیت صرف سیاسی مصلحتوں ہی کی بنا پر نہیں بلکہ ہر شہری میں تعمیری صلاحیتوں کے اجاگر کرنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ اس کا فقدان جسم ہی کو معطل نہیں کرتا بلکہ دل کو مردہ کر دیتا ہے۔

اقبال کی حبّ الوطنی کا تو یہ عالم ہے کہ ان کی شدّتِ احساس نے جب شعر کے پیکر میں ملبوس ہونا چاہا تو سب سے پہلی نظم جو معرضِ وجود میں آئی وہ "ہمالہ" تھی جس کی کوکھ سے ہندوستان کی سب سے متبرک ندی گنگا نے جنم لیا۔ اقبال صرف ملّتِ اسلامیہ کے سوز و ساز سے ہی سروکار نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی حب الوطنی اس کی بھی آرزومند تھی کہ ؎

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا! | مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا | داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

اقبال کے کلام میں ہندوستان کی آزادی کی تڑپ از اول تا آخر پائی جاتی ہے۔ البتہ شروع میں لہجہ اور طرز ادا خطیبانہ اور واعظانہ ہے جو جلد ہی بدل کر فلسفیانہ ہو جاتا ہے۔ نظم "تصویر درد" ہندوستان کی غلامی پر ان کا اضطراب ملاحظہ ہو :

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا — لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
سُن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو — وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنیوالی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونیوالا ہے — دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں؟
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذّتِ فریاد پیدا کر — زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں!
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

دوسری نظم "نیا شوالہ" میں اقبال کس نزاکت اور دردمندی سے اُن تاروں کو چھیڑتے ہیں جو خوابیدہ روحوں پر مضراب کا کام دے سکیں۔ یہ نظم ان تمام تقریروں پر بھاری ہے جو قومی یکجہتی کے موضوع پر کی گئی ہیں اور کی جاتی ہیں :

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی — آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

راقبال کا ترانۂ ہندی" ہے۔ یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ سیاسی پارٹیوں کی نشستوں، جلسے اور جلوسوں
ئی جانے لگی۔ ملک وقوم سے وارفتگی ملاحظہ ہو:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اقبال کی عقیدت مندی ہندوستان کے بام و در تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے ثقافتی، تمدنی
ت بھی ان کے لئے اتنے ہی مقدس ہیں۔ اگر اقبال کو اپنا رمزِ شوق لَا اِلٰہ میں پوشیدہ نظر
ہے تو رام کے پیمانوں سے بھی انھیں وہی شرابِ حقیقت چھلکتی نظر آتی ہے۔ اپنی نظم "رام" میں اس
ہستی کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند — سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر — رفعت میں آسماں سے اونچا ہے بامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز — اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی — روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

رستان مذاہب اور عقائد کا سنگم ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اقبال کا خلوص اور ان کی نیک نیتی
سنگم پر ملنے والی دوسری ندیوں کو فراموش کر دیتی۔ چنانچہ انھوں نے گرونانک اور گوتم بدھ کے
ل پر بھی پھول نچھاور کئے۔ اول الذکر کو "مردِ کامل" اور موخر الذکر کو گوہرِ یکدانہ کے نام سے
رتے ہوئے نظم "نانک" میں کہتے ہیں:

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی — قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی

آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر — غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں — شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں
بتکدہ پھر بعد مدّت کے مگر روشن ہوا — نورِ ابراہیمؑ سے آذر کا گھر روشن ہوا

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

یہ ضرور ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری کے آخری دور میں اسلام کے بنیادی تصوّرات سے زیادہ کام لیا مگر پھر بھی پہلے کی طرح اس دور میں بھی اُن کا جذبۂ حبّ الوطنی اسی طرح جوش میں آتا رہا۔ چنانچہ "ضربِ کلیم" کی نظم "گلہ" میں آزادی کی تڑپ فلسفیانہ استدلال اختیار کر لیتی ہے۔ کہتے ہیں:

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک — بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے!
دہقاں کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ — بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے!
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر — افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے!

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے!

ان کی نامرادی نے اتنی شدّت اختیار کر لی کہ دوسری نظم "شکر و شکایت" میں وہ خدا سے یہ گلہ کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں:

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

مختصر یہ کہ اقبال کے کلام میں حبّ الوطنی اور وطنیت کے جذبوں کی کمی نہیں۔ اس میں اپنے ملک کے پہاڑ، پتھر، ندی، دیوی اور دیوتا سے عقیدت مندی بھی ملتی ہے اور اپنے وطن کی عظمتِ رفتہ کا ذکر بھی۔ اس میں ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے کاٹ پھینکنے کا عزم بھی ہے اور ہندوستان کی آزادی کی تمنا بھی۔ اس بات کی کہ اقبال کا خطاب صرف مسلمانوں

سے ہے کل بنی نوع سے نہیں اردو ادب کے نقادانِ ادب نے وقتاً فوقتاً تردید کی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عابد حسین اس غلط فہمی کا ازالہ یوں کرتے ہیں:

"ایک غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اقبال کا خطاب انسانوں کی صرف ایک جماعت مسلمانوں سے ہے۔ کل بنی نوع انسان سے نہیں۔ ان کے پیشِ نظر ملت کا نصب العین ہے جو انسانیت کے مقابلے میں بہت تنگ اور محدود ہے۔ اس سے زیادہ وسیع مشرب تو ہندوستان اور ایران کے غزل گو شاعروں کا ہے جو عام انسانی زندگی کے جذبات وکیفیات کے مصور ہیں مگر ذرا غور سے دیکھئے تو محض جذبات وکیفیات کی مصوری اور چیز ہے اور زندگی کی ایک مکمل تصویر کی تعمیر اور چیز ہے۔

"دیکھنا اصل یہ ہے کہ جو نصب العین اقبال کے ذہن میں ہے وہ کیا اور کیسا ہے۔ محض یہ بات کہ وہ ملت کے تصورات سے وابستہ ہے اسے تنگ اور محدود رکھنے کو کافی نہیں۔ اقبال کی شاعری اور ان کے نصب العین کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس نقش کو اس کے تاریخی پس منظر کے ساتھ دیکھیں۔

"اس میں شک نہیں کہ اقبال کا سارا فلسفہ اسلامیت کی روح سے لبریز ہے اور ان کے صحیح مخاطب مسلمان ہیں لیکن ایک سچے شاعر کی طرح ان کے دل میں سارے جہاں کا درد ہے۔ ان کی محبت کل بشر کو محیط ہے اور ان کا پیام ایک حد تک سب انسانوں کے لئے عام ہے۔ وہ ہر مذہب وملت کے لوگوں کو اپنی خودی کی تربیت اور اپنی مخصوص ملی روایات کی حفاظت کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ وہ زندگی کے صحیح نصب العین سے قریب تر پہنچ جائیں[1]۔"

---

[1]۔ ڈاکٹر عابد حسین "اقبال کا تصورِ خودی" در کتاب 'اقبال پر ایک نظر' مرتبہ سید محمد شاہ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

مقصد اور موقف

جامعہ ملیہ اسلامیہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو خلافت اور عدم تعاون کی عمومی تحریکوں کے جلو میں قائم ہوئی۔ اس کے بانیوں میں مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابو الکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی عظیم المرتبت ہستیاں تھیں، اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ان الفاظ کے ساتھ اس کا سنگ بنیاد رکھا:

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔"

دینی اور سرکاری تعلیم گاہیں دو علامتیں تھیں، مذہبی تعلیم اور جدید تعلیم کی اور ان دونوں کے قریب آنے کا مطلب یہ تھا کہ ملک کی صحیح خطوط پر تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ نوجوانوں کی شخصیت و تعمیر میں اس تہذیبی ورثے کا جس کا ایک اہم عنصر مذہب ہے اور اس احساس کا کہ عہد حاضر کے علمی و تہذیبی سرمایہ سے بچ کر بادقار، بامقصد اور مفید زندگی نہیں گذاری جاسکتی پورا پورا حصہ ہو۔ اس بات کو یوں بھی کہا گیا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قدیم و جدید اور دینی اور سیاسی قدروں کے ایک خوشگوار اور صحت مند امتزاج کی آرزومند رہی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مقصد تہذیبی اور تعلیمی تھا لیکن وہ قائم ہوئی سیاسی تحریکات کے جلو میں۔

اسی لئے شروع میں اس ادارے میں سیاسی جوش وخروش زیادہ تھا لیکن رفتہ رفتہ جب تحریکوں کا زور کم ہوا اور ہلچل میں کچھ کمی آئی تو ایک تعلیمی وتہذیبی ادارہ کی حیثیت سے اس کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا۔ اس لئے کہ یہ سرکاری ادارہ تھا نہیں کہ اسے حکومت کی امداد حاصل ہوتی۔ حکومت تو اسے بغاوت اور انقلاب کا گہوارہ سمجھتی تھی۔ دوسری طرف قوم ایسے ادارہ کے لئے جس کی ڈگریاں تسلیم نہ کی جائیں اور جو سرکاری ملازمت کا ضامن نہ ہو، کچھ کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھی۔ اس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ طرح طرح کی دشواریوں میں گھر گئی اور ایک مرحلہ میں تو یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ اسے بند کر دیا جائے۔ لیکن جامعہ میں طالب علموں اور کارکنوں کی ایک جماعت تھی جو ہر قسم کی مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار تھی مگر اللہ کے اس کام کو باقی رکھنا اور ترقی دینا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو جو اس وقت جرمنی میں تھے اور جو ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں جامعہ کے قیام کے وقت انقلابی نوجوانوں کے سرخیل تھے، جب اس صورت حال کی اطلاع ملی تو انھوں نے لکھا کہ "میں اور میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہمارے آنے تک جامعہ ملیہ کو بند نہ کیا جائے۔" حکیم اجمل خاں مرحوم پر ان مخلص نوجوانوں کے جذبۂ ایثار کا بہت اثر ہوا۔ انھوں نے مہاتما گاندھی سے مشورہ کیا اور اس کا ذکر بھی کیا کہ حالات مایوس کن ہیں گاندھی جی نے کہا: "جامعہ کو تو چلانا ہی ہوگا۔ آپ کو روپیہ کی دقت ہے تو میں بھیک مانگ لوں گا۔" اس سے حکیم صاحب کی ہمت بندھی اور وہ جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی لے آئے۔ یہ واقعہ جولائی ۱۹۲۵ء کا ہے فروری ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب اپنے دو ساتھیوں ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے ساتھ جرمنی سے واپس آئے اور حقیقت یہ ہے کہ مرحوم نے اپنی وفات (دسمبر ۱۹۲۷ء) تک جس طرح جامعہ کی مسیحائی کی، جامعہ کی تاریخ میں اسے آب زر سے لکھا جائے، تو مبالغہ نہ ہوگا، اور اس فرد خدا نے اس کڑے وقت میں جامعہ کو بچا لیا۔ اس زمانہ میں ایک اور خدا ترس انسان نے جامعہ کی دستگیری کی۔ اور وہ تھے مدراس کے سیٹھ جمال محمد مرحوم۔ ذاکر صاحب کی آنکھیں، جب ان کا ذکر آتا تھا شکر گذاری کے جذبہ سے نم ہو جاتیں اور فرماتے کہ سیٹھ جمال محمد مرحوم کی فیاضانہ اعانت سے

جامعہ کو دوبارہ زندگی ملی، حکیم صاحب کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم نے جامعہ کی سرپرستی کی۔ پ بھی جامعہ کی جو مالی دشواریاں تھیں وہ قائم رہیں۔ قرضہ بڑھتا جاتا تھا۔ اور ٹرسٹیز میں کافی لوگ ایسے تھے جو سمجھتے تھے کہ جامعہ چلنے والی نہیں، اسے بند کردینا چاہئے۔ ایسے سخت وقت میں جب قوم کے بڑے بوڑھے ہمت ہار چکے تھے، نوجوانوں نے آگے بڑھ کر قومی تعلیم کا علم اٹھالیا اور انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی رہنمائی میں جامعہ کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان نوجوان کارکنوں نے جامعہ کو چلانے کے لئے ۱۹۲۸ء میں "انجمن تعلیم ملی" کے نام سے ایک سوسائٹی کی تشکیل کی جس کے اراکین نے یہ عہد کیا کہ وہ کم ازکم بیس سال تک جامعہ کی خدمت کریں گے اور ایک سو پچاس روپے ماہوار سے زیادہ تنخواہ طلب نہ کریں گے۔ عملاً ہوا یہ کہ اس بیس سال کے عرصہ میں کسی کو -/۱۵۰ روپے ماہوار نہیں ملے۔ پہلی دفعہ جن حضرات نے اس عہد نامہ پر دستخط کئے ان کے نام یہ تھیں:

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین (۲) پروفیسر محمد مجیب (۳) مولانا اسلم جیراجپوری
(۴) مولانا خواجہ عبدالحیٔ (۵) حافظ فیاض احمد (۶) ارشادالحق
(۷) برکت علی (۸) سعدالدین انصاری (۹) سعید انصاری
(۱۰) شفیق الرحمان قدوائی (۱۱) حامد علی خاں

تعلیمی مقاصد، تعلیمی تجربے

جامعہ جب قائم ہوئی تھی تو وہ اعلیٰ تعلیم کا ادارہ تھی۔ سوسائٹی کے قیام کے بعد ذاکر صاحب نے یہ نظریہ سامنے رکھا کہ جب تک شروع ہی سے بچوں کی تعلیم وتربیت قومی وملی ضرورتوں کے مطابق نہ ہو ایسے نوجوان پیدا نہیں ہوسکتے جو اچھے مسلمان یا اچھے ہندو اور اچھے ہندوستانی کی حیثیت سے ان ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں جن کا بوجھ ایک اچھا شہری ہی اٹھا سکتا ہے۔ برطانوی سامراج سے لڑنے کے لئے ایسے نوجوانوں کی ضرورت تھی جو اپنے مذہبی اور تہذیبی ورثے کی عظمت کا احساس رکھتے ہوں، جن کے دل جذبۂ حب وطن سے سرشار ہوں اور جن کے ذہنوں کو علوم جدیدہ کی

روشنی میسر آئی ہو۔ ہمارا ملک غریب ملک ہے۔ پچھڑا ہوا ہے۔ طرح طرح کے سماجی اور معاشی روگ اس کی جان کو لگے ہوئے ہیں۔ جہالت کی تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یونیورسٹیاں اور قدیم طرز کے ادارے ملک وقوم کی ضرورتوں سے بے نیاز ایسے ماحول میں کام کر رہے ہیں کہ ملک کے کروڑوں غریب اور پسماندہ انسانوں کے دکھ درد سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ تعصب اور تنگ نظری کے گھور اندھیرے میں سچائی، رواداری اور سماج سیوا کا کام بہت کم ہو رہا ہے اور مسلمانوں کا تو ایک ادارہ بھی ایسا نہیں جو ایسے نوجوان پیدا کرے جن کی ملک وملت کو ضرورت ہے ۔ اس صورت حال کا جائزہ لے کر ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ابتدائی تعلیم پر زیادہ توجہ کی اور خاص طور پر اپنے محدود وسائل کے باوجود ابتدائی مدرسہ کو ایک نمونے کا مدرسہ بنا دیا، جس نظریۂ تعلیم اور جس طرز تعلیم پر جامعہ کے مدرسہ ابتدائی میں کام ہوا، ملک اس سے اس وقت نا آشنا تھا۔ لیکن جامعہ کالج بھی اعلیٰ تعلیم کے شعبہ کی حیثیت سے باقی رہا۔ اور اس سے ایسے گریجویٹ نکلتے رہے جنھوں نے قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔

۱۹۳۷ء میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کی طرف سے دو ماہرین تعلیم ای سالٹر ڈیویز (E. SALTER DAVIES) اور لارن ذلیاکس (LAURIN ZILLIACUS) مختلف ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ وہ جامعہ میں بھی آئے۔ اس کے کام کو دیکھا۔ استادوں اور طالب علموں سے ملے اور جامعہ کے تعلیمی کام کے بارے میں جو رائے قائم کی اسے لکھ کر دے گئے۔ ڈیویز نے لکھا:

> "مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسکولوں کے دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں نے اس سفر میں بہت سے اسکول دیکھے ہیں، اور میں بلا جھجک کہتا ہوں کہ کئی لحاظ سے میں نے آپ کے اسکول کو زیادہ دلچسپ پایا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی مشکلات کے باوجود آپ لوگ تعلیم کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہیں جنھیں عام طور پر تسلیم تو کیا جاتا ہے لیکن ہمارے اسکولوں میں انھیں برتنے میں بڑی سست روی سے کام لیا جاتا ہے، آپ دراصل انھیں اصولوں پر کام کر رہے ہیں جنھیں میں اپنے وطن کینٹ (انگلستان)

میں عمل میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ خدا اس عظیم الشان کام میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو کامیاب کرے۔"

لارن زلیاکس نے اعتراف کیا:

"جامعہ ملیہ میں آ کر اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے مخلص ساتھیوں سے گفتگو کر کے میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی کا یہ بہت ہی فیض بخش اور حوصلہ افزا تجربہ ہے۔ اس ادارہ کے پیچھے جو تصور کارفرما ہے اور وہ جذبہ اور عمل جس میں یہ تصور ڈھل گیا ہے، اس نے اس ادارہ کے کام کو دنیا کی بہترین تعلیمی کوششوں کی صف میں جگہ دی ہے۔"

جامعہ کا تہذیبی موقف

جامعہ میں شروع ہی سے اردو ذریعہ تعلیم تھی۔ ۱۹۲۸ء کے بعد جامعہ نے بچوں کے لئے اور بڑوں کے لئے اردو زبان میں کتابوں کی اشاعت کا کام بڑے پیمانہ پر شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ادبی اور علمی دنیا میں اس کا اعتبار قائم ہو گیا۔ ذاکر صاحب کو اس کا شدید احساس تھا کہ ہندوستان میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر جو ملک کا مستقبل ہیں بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ ان کے پڑھنے کے لئے نہ اچھے رسالے نکلتے ہیں اور نہ اچھی کتابیں چھپتی ہیں۔ جامعہ کے ادارۂ نشر و اشاعت مکتبہ جامعہ نے اس سلسلہ میں سلیقہ سے کام کرنے کی نئی نئی راہیں پیش کیں۔ اس طرح ذاکر صاحب کی قیادت میں جامعہ اور کارکنان جامعہ جلد ہی ملک کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ لیکن پھر بھی اس کی مالی دشواریاں کم نہ ہوئیں، بے سروسامانی کا وہی عالم لیکن ان ہی دنوں کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے یہ بھی کہا ہے:

"مگر کچھ ایسا لگتا ہے کہ تنگی کے دن کچھ اچھے ہی دن تھے۔ سامان نہیں تھا، ارمان تھے۔ دولت نہیں تھی، ہمت تھی، سامنے ایک آدرش تھا دل میں ایک لگن تھی۔ اختیار مانگنے پر کسے دھیان تھا۔ اپنا کام پورا کرنے کی دھن تھی، تنخواہیں بڑھوانے کا موقع کہاں تھا، جان کھپانے میں جی سکھ پاتا تھا۔ ہر بچہ جو اس بے سروسامان بستی میں آجاتا تھا اس کی آنکھوں

میں ہمیں آزادی کی چمک دکھائی دیتی تھی، ہم سے غلامی نے جو کچھ چھین لیا تھا وہ سب ہمیں ان بچوں میں مل جاتا تھا......"

تہذیبی اعتبار سے جامعہ کا ایک خاص موقف رہا ہے۔ ایک موقع پر خود گاندھی جی نے کہا تھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اگر "اسلامیہ" کا لفظ ہٹا دیا جائے تو مجھے اس ادارہ سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ جامعہ ایک ایسا ادارہ ہو جہاں اسلامی تہذیب کے ترجمان ہوں اور ساتھ ہی ایسے دیش بھگت جنھیں مذہبی اختلافات اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکیں، ایسے دیش بھگت مسلمان جو سماج سیوا کا کام کرتے وقت یہ نہ دیکھیں کہ وہ شہروں میں کام کرتے ہیں یا گاؤں میں، ان کی خدمت سے ہندو فیضیاب ہوتے ہیں یا مسلمان، ان کی خدمت کا کام خدا کی رحمت ہو جو سب کے لئے ہوتی ہے، ان کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں، ان کا مذہب سب دلوں کو جوڑے، انھیں ایک دوسرے سے جدا نہ کرے، ایسا ہی مذہب اسلام جامعہ کے تہذیبی موقف کا سرچشمہ رہا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے یہ موقف اختیار کر کے کسی مذہبی یا تہذیبی بے راہ روی کا ارتکاب کیا ہو۔ جامعہ کے تہذیبی موقف کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں کاشی ودیاپیٹھ (بنارس) کے جلسۂ تقسیم اسناد کا خطبہ پڑھتے ہوئے کہا تھا:

"کیا ہندوستان کا قومی نظام تعلیم مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا یا نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں؛ آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لئے کتنا اہم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض نیک نیت مگر انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندوستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں کہ جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لئے مضر ہو۔ مگر ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کرلیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضہ ہے۔ آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ

بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کا دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حالت میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لئے کہ اس سے مسلمان کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہونچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما"

تعلیمی تجربوں کی وسعت

جس زمانہ میں جامعہ اپنی تعلیمی، ادبی اور علمی کاوشوں سے اپنے تہذیبی مقاصد کو آگے بڑھا رہی تھی؛ اسی زمانہ میں وہ تعلیم کے میدان میں نت نئے تجربے بھی کر رہی تھی، ابتدائی تعلیم میں اس نے جدید تعلیمی نظریات کے مطابق تجربے کئے اور ملک کو ان کی افادیت کی طرف متوجہ کیا۔ ساتھ ہی اس نے شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم کے شوق، محنت اور بصیرت کے سہارے تعلیم بالغان کا کام شروع کیا۔ اس وقت اس اہم کام کی طرف ملک کی توجہ نہیں تھی؛ ان پڑھ بالغ عوام کے شعور کی بیداری کا کام کوئی نہیں کرتا تھا۔ تعلیم سے ذہنوں کو روشنی ملتی ہے۔ صحیح رائے عامہ بنتی ہے، اچھے برے میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اسے سب مانتے تھے۔ لیکن اَن پڑھ بالغوں کو بھی ان برکتوں کی ضرورت ہے، اس کا احساس یا تو تھا نہیں، اور اگر تھا تو اس مفید کام کو شروع کرنے کے لئے لوگ تیار نہیں تھے۔ جامعہ نے دہلی کے مختلف محلوں میں شبینہ مدارس اور تعلیم بالغاں کے مراکز قائم کر کے تعلیمی تجربے کی ایک راہ نکالی اور اس سلسلہ میں کافی لٹریچر بھی فراہم کیا۔ خواندہ

بالغوں کے لیے جامعہ نے سلسلہ وار جو کتابیں لکھوائیں اور چھاپیں وہ ملک میں بہت مقبول ہوئیں اور اس لحاظ سے بھی جامعہ اپنی نوعیت کا انوکھا ادارہ قرار پایا۔ ۱۹۳۸ء میں جب وار دھا اسکیم کے مطابق ملک میں بنیادی تعلیم (بیسک ایجوکیشن) کا چرچا ہوا، اور مختلف مقامات پر بنیادی تعلیم کے مدرسے اور استادوں کی تعلیم و تربیت کے لیے نئے نئے ادارے قائم ہونے لگے، تو جامعہ نے اُردو زبان والوں کے لیے استاد تیار کرنے اور بنیادی تعلیمی اسکیم کا تجربہ کرنے کے لیے استادوں کا مدرسہ قائم کیا جس نے جلد ہی تعلیم کے اداروں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔ جیسا کہ معلوم ہے جامعہ ہمیشہ سے ایک تعلیمی تحریک رہی ہے۔ استادوں کے مدرسے سے جو استاد تربیت پاکر نکلے ہیں انھوں نے دوسرے مدرسوں میں جاکر اپنے عمل سے جامعہ کے تعلیمی مشن اور تہذیبی فکر کی اشاعت کی ہے۔ مدرسوں میں آرٹ کی تعلیم رائج تھی، لیکن اس کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی کہ آرٹ کے استادوں کو بھی جدید طرز کے مطابق اصول تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی تعلیم دی جائے۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ آزادی کے بعد جامعہ نے انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ ایجوکیشن قائم کرکے اس تعلیمی تجربہ کی افادیت کو اُجاگر کیا۔ اس طرح مدرسہ ثانوی میں جہاں برسوں سے جدید ترین طریقۂ تعلیم مثلاً مقصدی طریقہ (پروجیکٹ میتھڈ)، تفویضی طریقہ (اسائنمنٹ میتھڈ) اور اس طرح کے دوسرے طریقوں کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی، آزادی کے بعد ملٹی پرپز MULTI PURPOSE نصاب جاری کیا گیا۔ اس کے مطابق آٹھویں جماعت کے بعد طالب علم اپنے شوق اور صلاحیت کا اندازہ کرکے جس میں ان کے استاد بھی ان کی رہنمائی کرتے ہیں میڈیکل، انجینرنگ یا سماجی علوم اور ادبیات کے مضامین پڑھتے ہیں اور تین سال کے ایک وسیع نصاب تعلیم سے گذر کر ہائر سکنڈری کا امتحان دیتے ہیں۔

مذہبی تعلیم

جامعہ کے نصاب تعلیم میں مذہبی تعلیم کو ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے۔ مدرسہ ابتدائی، مدرسہ ثانوی اور کالج جہاں پیشہ ورانہ تعلیم نہیں ہوتی تقریباً سبھی طالب علم مذہبی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مسلمان

طلبا اسلام کا اور ہندو طلبا ہندو دھرم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس طرح جامعہ کے طلبا مذہبی اور اخلاقی تعلیم سے محروم نہیں رہتے۔ آج ملک کے تعلیمی اداروں میں اخلاقی تعلیم کے نصاب کی کمی اور اس کے نتائج کا احساس بہت قوی ہے۔ جامعہ جیسے تعلیمی اداروں نے اس سلسلہ میں جس رہنمائی کی کوشش کی، افسوس ملک نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

جامعہ کی توسیع سلور جوبلی کے بعد

۱۹۴۶ء میں جامعہ کی سلور جوبلی منائی گئی۔ ذاکر صاحب کی شخصیت اور جامعہ کے کام کی برکت نے ہر مکتبۂ خیال کے ممتاز افراد کو جامعہ کے پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ پھر اس کے بعد ایسا مجمع دیکھنے کو نہ ملا۔ اب گویا پوری قوم نے جامعہ کے قومی تعلیم کے کام اور اس کی افادیت کا اعتراف کر لیا تھا۔ مرکزی عارضی حکومت نے مالی امداد کا اعلان کیا اور اس کا یقین ہو گیا کہ آزاد ہندوستان میں جامعہ کی مشکلات بہت کم ہو جائیں گی۔ ۱۹۴۷ء میں ہم آزاد ہوئے لیکن آزادی کا بادل خون بھی برسا گیا۔ ملک تقسیم ہوا۔ بھائی نے بھائی کو قتل کیا۔ لیکن گاندھی جی کی توجہ، پنڈت نہرو کی فکرمندی اور ذاکر صاحب کی شخصیت اور ہمت نے جامعہ کو مٹنے سے بچا لیا۔ ابھی جامعہ ۱۹۴۷ء کے بعد پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت نہرو کے اصرار پر ذاکر صاحب کو وائس چانسلر بن کر علی گڑھ جانا پڑا اور پروفیسر محمد مجیب شیخ الجامعہ ہوئے۔ حکومت ہند نے جامعہ کے کام کو سراہا۔ اور رفتہ رفتہ اس کے کام کے ساتھ ساتھ کی امداد بھی بڑھتی رہی، ۱۹۵۴ء میں حکومت نے جامعہ کا سارا خسارہ پورا کرنے کا ذمہ لے لیا اور ۱۹۶۲ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس کو یونیورسٹی کی حیثیت کا ادارہ تسلیم کیا۔ اس کے بعد جامعہ میں اعلیٰ تعلیم کے اداروں کو فروغ حاصل ہوا ہے لیکن جامعہ نے اپنی توجہ اسکولوں کی طرف سے نہیں ہٹائی ہے، کیونکہ یہی اسکول جامعہ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتے ہیں۔

جامعہ کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے تسلیم کر لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جامعہ اپنے بنیادی موقف سے ہٹ گئی ہے۔ پہلے پوسٹ گریجویٹ اور آنرز کورس نہیں تھے اور اب یہ چل رہے ہیں۔

بی ایس سی تک سائنس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ریسرچ کا کام شروع کرنے کے ساتھ جامعہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دینے کی اجازت مل گئی ہے۔ سول انجینرنگ (ڈپلوما کورس) اور سوشل ورک میں بی اے آنرز تک کی تعلیم کا کام بھی ہو رہا ہے، کئی نئی عمارتیں بھی بن گئی ہیں، الغرض ذاکر صاحب کے علی گڑھ جانے کے بعد سے حکومت ہند کی امداد اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی توجہ سے جامعہ کے کام کی کافی توسیع ہوئی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن توسیع و ترقی کی اس ہماہمی، تنخواہوں میں معتدبہ اضافے اور جامعہ برادری میں استادوں اور طالب علموں کی تعداد بڑھنے سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ جامعہ کے وہ تعلیمی تہذیبی مقاصد جو اس کی تمام سرگرمیوں کا محور رہے ہیں، پس پشت ڈال دیئے گئے ہیں۔

اقلیتی ادارہ کی حیثیت سے جامعہ کا تہذیبی مقصد

جامعہ میں ذریعہ تعلیم اردو ہے اور حکومت نے بھی اس کو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن ہمارے عمل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو، ہندی اور انگریزی میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ایسے طالب علم جو اردو سے واقف نہیں ہیں جامعہ انھیں اردو پڑھاتی ہے اور اس کا باقاعدہ انتظام ہے، اردو ہماری اس تہذیب کی علامت ہے جو صدیوں سے اس دیس کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے سے وجود میں آئی۔ یہ میل جول اور محبت کی زبان ہے، اشتراک و تعاون کی زبان ہے۔ جامعہ اس تہذیب اور اس کی اس زندہ علامت کی خدمت کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہے۔ اور اس کام کو اپنے طریقہ سے کر رہی ہے۔

تعلیمی ادارے قوموں اور جماعتوں کے، چاہے وہ اس منصب کو پسند کریں یا نہ کریں، فکر و نظر، کردار اور کلچر کے ترجمان بن جاتے ہیں، ملک میں ایسے غیر سیاسی، غیر جماعتی کالج اور یونیورسٹیاں ہیں جو اپنے آپ کو کسی مخصوص تہذیب کی نمائندہ درسگاہ نہیں سمجھتیں، اپنے طور طریقے انتظام اور کام کے لحاظ سے وہ اچھی درسگاہیں ہیں، لیکن ان کی کوئی تہذیبی شخصیت نہیں، اور تہذیب کے بارے میں ہمارے یہاں جو ذہنی اور جذباتی الجھاوے ہیں اور جس طرح ہم اس اہم چیز کی طرف سے غافل ہیں، اس طرح کے کالج اور یونیورسٹیاں اس کی علامت بن گئی ہیں، ان حالات میں ایسی تعلیم گاہ جو

میں درس وتدریس کا کام اچھا ہوسکتا ہے اور قوم کو ایسے شہری مل سکتے ہیں جن میں صلاحیت اور محنت سے کام کرنے کا شوق ہو، لیکن اس کا امکان بھی رہتا ہے کہ تہذیبی معاملات میں ان اداروں سے نکلے ہوئے نوجوان یا تو غلط راستے پر پڑ جائیں یا پھر شہری زندگی میں تہذیبی قدروں کی اہمیت کا انھیں کوئی علم یا احساس نہ ہو اور ان کے خیالات اور کردار قوم اور قومی تہذیب کی صحیح تصویر پیش نہ کرسکیں۔ اس وقت نوجوانوں میں جو بے چینی اور سارے ملک میں جو مایوسی نظر آرہی ہے وہ شاید اسی تعلیم کا نتیجہ ہے جو اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے کتراتی رہتی ہے۔

ہمارے دیس میں ایسے تعلیمی ادارے بھی ہیں جن کا ایک مخصوص مذہبی نصب العین ہے اور اس لئے وہ جس تہذیبی مسلک کی اشاعت کرتے ہیں وہ اس خاص مذہب سے منسوب ہوجاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ذہنی اعتبار سے جن کے یہاں کسی اور تہذیب کی گنجائش نہیں رہتی، ایک محدود اور مخصوص حلقے میں ان کا طرز فکر مثبت ہوسکتا ہے۔ لیکن اس سے ہر وقت اس کا خطرہ رہتا ہے، اور اس کا انھیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کے طرز فکر اور طریقۂ کار سے ہندوستان کی ملی جلی تہذیبی زندگی میں انتشار اور خلفشار کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ان دونوں قسم کے اداروں سے مختلف ہے۔ ملک کے اکثریتی طبقے کو اگر اس کی فکر نہ ہو کہ تعلیمی اداروں کا کوئی تہذیبی رول ہونا چاہیئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اس کے لئے تہذیب کا مسئلہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن اقلیتوں کے قائم کئے ہوئے اداروں کے لئے اس کی فکر ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے ملک کی مشترک زندگی میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لے سکتے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی اسی مقصد کے پیش نظر اور اس صورت حال کو اس نے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا۔ اس نے ایک طرف اپنے مخصوص تہذیبی مسلک کا حق ادا کیا ہے اور دوسری طرف قومی زندگی کے ہر شعبہ میں برابر کی شریک رہی ہے۔ اس نے ایک اقلیتی ادارہ ہوتے ہوئے بھی اپنے دروازے دوسرے مذہب والوں کے لئے ہر وقت کھلے رکھے۔ یہاں ہر مذہب کے لوگ معلم اور متعلم کی حیثیت سے مل جل کر رہے ہیں، مذہب کو اس نے مل جل

ندگی اور باہمی ربط کے رجحان کو بڑھانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہاں مذہب کا رول یہ رہا ہے کہ "فصل" کے بجائے "وصل" کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ فکر و عمل سے اس خیال کی اشاعت کی گئی ہے کہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ایک ہندوستانی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور اس ملک میں سب کے برابر کے حقوق اور فرائض ہیں۔

آج ملک و قوم کو جہاں اس کی ضرورت ہے کہ جدید علوم اور ٹیکنولوجی کی دنیا میں اپنا وقار قائم کرے اسی طرح اس کی بھی ضرورت ہے کہ ملک کی ملی جلی تہذیب کی خصوصیات اور اعلیٰ قدروں کے تحفظ کی فکر بھی کی جائے۔ جامعہ نے قدیم اور جدید کے امتزاج کو اپنا مسلک بنایا اور قومیت اور قومی تہذیب کے بارے میں اس نے اپنے نظریہ کو کبھی کسی مصلحت پر قربان نہیں کیا۔ اس وقت تعلیم اور تہذیب، قوم اور قومیت کے بارے میں ملک میں طرح طرح کی باتیں کہی جا رہی ہیں، اور اس سلسلہ میں ذہنی الجھاؤ بڑھتے جا رہے ہیں۔ جامعہ اقلیتی ادارہ کی حیثیت سے اپنا فرض منصبی سمجھتی ہے کہ وہ اس صورت حال کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کرے اور اپنی تعلیمی اور تہذیبی روایات کی روشنی میں، جس حد تک وہ کر سکتی ہے، اس فضا کو صاف کرے جو تمدن و تہذیب کی مبہم اور پیچیدہ تعبیروں سے مکدر ہو رہی ہے۔

عبداللطیف اعظمی

اسلامک اسٹڈیز کانفرنس

چھٹا اجلاس

اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا، جس کا صدر دفتر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہے، پانچواں اجلاس اکتوبر ۶۶ء میں
جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد ہوا تھا، جو اپنے مباحث اور شرکا کی تعداد کے لحاظ سے بہت کامیاب ہوا تھا، اسا
اور تحقیق وادب کے بہت سے اہم مسائل پر مقالے پڑھے گئے تھے اور بہت ہی پرسکون ماحول میں انتہا
نظم وضبط کے ساتھ بعض اختلافی مسائل پر بحث وگفتگو ہوئی تھی۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب کا انگریزی میں خطبۂ استقبا
پروفیسر ہمایوں کبیر کا، جواب مرحوم ہوچکے ہیں، انگریزی میں زبانی خطبۂ افتتاحیہ اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا اردو
خطبۂ صدارت اب تک یاد ہیں اور علمی وتحقیقی حلقوں کو عرصے تک یاد رہیں گے۔ امسال اس کانفرنس کا چھٹا اجلاس
۳۰، ۳۱ دسمبر کو جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی کی صدارت میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں منعقد ہوا۔ اعظم گڑھ تہذیب
وترقی کے مرکزوں سے الگ تھلگ ایک چھوٹا سا ضلع ہے، جہاں دارالمصنفین اور چند مشہور عربی مدارس کے علاوہ دلچسپی
اور کشش کی اور کوئی چیز نہیں ہے، مگر یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ ملک کے مختلف حصوں سے پچپن نمایندوں نے
شرکت کی اور دارالمصنفین کے مدعو مہمان ان کے علاوہ تھے۔

اس کانفرنس کا بنیادی موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اسلامیات ہے، مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ علماء
اسلام اس میں بہت کم دلچسپی لیتے ہیں اور مشہور علماء عام طور پر شرکت سے گریز کرتے ہیں۔ اسی بنا پر پانچویں اجلاس کے
مقامی سکریٹری جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے اجلاس سے قبل رسالہ جامعہ بابت ماہ اکتوبر ۶۷ء میں شکایت کی
کہ "راقم الحروف اب کے تین اجلاسوں میں شرکت کرچکا ہے اور ان سب میں ایک کمی جس کا اسے شدید احساس ہوا
یہ تھی کہ عربی مدارس کے بہت کم لوگ اس میں شریک ہوئے، حالانکہ دعوت ہر اجلاس کے لیے کافی لوگوں کو بھیجی گئی، اس
"عالمانہ بے نیازی" کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی" اجلاس کے بعد اس کی روداد میں یہ شکایت پھر دہرائی جو دسمبر
۶۷ء کے جامعہ میں چھپی تھی۔ لکھتے ہیں:

"یہ کانفرنس یوں بھی مفید ہوسکتی ہے کہ مدارس عربیہ کے ارباب علم ونظر اس طرف توجہ کریں اور فعال
عنصر کی حیثیت سے اس کے اجتماعات میں شریک ہوں، لیکن نہ معلوم کیا وجہ ہے کہ یہ حضرات اپنے

'صنم خانوں' سے باہر نہیں آتے، اگر یہ بات ہے کہ وہ اسے اپنے 'تقویٰ و طہارت' کے شایانِ شان نہیں سمجھتے کہ دنیوی اداروں میں کام کرنے والوں کے ساتھ بیٹھیں تو یہ بڑی غیر اسلامی بات ہے مگر میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے، اصل سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں مدارس عربیہ میں جو علم پڑھایا جاتا ہے، وہ نصاب کی چند کتابوں تک محدود ہے جو بہت پہلے لکھی گئی تھیں۔ حالانکہ ان میں جو مسائل ہیں وہ آج بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ اس وقت تھے، البتہ انھیں نئے ذہن کو نئی زبان، نئی اصطلاحوں اور نئے انداز سے سمجھانا ہوگا... ہمارے علماء اس کے لیے آمادہ نہیں... یہی وہ اندازِ فکر ہے جس نے مسلم سماج کو جمود و تعطل کے شکنجہ میں ایسا مجبور کر دیا ہے کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن..." (صفحہ ۲۹۵)

مگر خوشی کی بات ہے کہ اس مرتبہ علماء کی تعداد اچھی خاصی تھی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، اور مولانا سعید اکبرآبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، مولانا شاہ معین الدین ندوی، میزبان ہونے کی وجہ سے شرکت پر مجبور تھے، مگر ان کی شرکت کی وجہ سے بھی اجلاس میں وزن پیدا ہوا، اس لیے ان کا ذکر بھی مہمانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا قاضی سجاد حسین، مولانا محمد یوسف کوکن عمری (صدر شعبۂ عربی و فارسی مدراس یونیورسٹی)، مولانا مفتی محمد رضا انصاری (شعبۂ دینیات علی گڑھ)، مولوی سید محمد رابع ندوی (ندوۃ)، مولوی ضیاء الدین اصلاحی (دارالمصنفین)، مولوی فضل الرحمٰن گنوری (شعبۂ دینیات علی گڑھ) اور مقامی مدارس کے علماء بھی کافی تعداد میں شریک ہوئے، اسی طرح، حسبِ معمول، اسکالرز اور محققین کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی، مثلاً مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم، جو شروع سے اب تک اس کانفرنس کے جنرل سکریٹری رہ چکے ہیں، ڈاکٹر سید مقبول احمد (جوائنٹ سکریٹری)، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری (خازن)، سید صباح الدین عبدالرحمٰن (مقامی سکریٹری)، پرنسپل عبدالقادر سروری (صدر شعبۂ اردو سری نگر)، پروفیسر سید امیر حسن عابدی (شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر سید حسن (صدر شعبۂ فارسی پٹنہ)، پروفیسر عطاء الرحمٰن (پٹنہ یونیورسٹی)، پروفیسر مسعود حسن (صدر شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ) ڈاکٹر عطا کریم برق (شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ)، ڈاکٹر محمد صابر خاں (پرنسپل گورنمنٹ کالج بنگال)، ڈاکٹر بدر رضا بیدار (انڈین اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز دہلی)، سید اوصاف علی (انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز دہلی) وغیرہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے موجودہ اور سابق اساتذہ اور کارکنوں نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی، مثلاً جناب سعید انصاری، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، جناب عبدالحلیم ندوی، ڈاکٹر مشیر الحق جامعہ کے قدیم طالب علم اور سہ ماہی رسالہ "اسلام اور عصرِ جدید" کے نائب مدیر ڈاکٹر محمود الحسن اور راقم الحروف۔ مولانا عبدالسلام صاحب نے "مجدالدین محمد بن یعقوب الفیروزی" پر مقالہ لکھا تھا، مگر وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھا نہ جا سکا۔ انشاء اللہ جامعہ میں شائع ہوگا، جناب عبدالحلیم ندوی صاحب نے عباسی دورِ اول کی عربی غزل، ڈاکٹر مشیر الحق صاحب نے فتویٰ نویسی میں عصری تقاضوں کا مقام اور ڈاکٹر محمود الحسن نے ابن اثیر کا مورخین میں مرتبہ پر مقالے پڑھے اور راقم نے اپنے مقالے میں عربی مدارس کے نصابِ تعلیم کی اصلاح اور تاریخِ اسلام کو نئے انداز سے

نقطے پر زور دیا۔

اس مرتبہ علماء کا پلّہ بھاری رہا اور اسلامی علوم وفنون کا اچھا چرچا رہا۔ مولانا شاہ معین الدین ندوی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے افتتاحی اور دوسرے مختلف مواقع کی تقریروں میں اور حکیم عبدالحمید دہلوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں ان علمی اور اسلامی خدمات کا ذکر کیا جو ہندوستان کے علماء نے انجام دی ہیں، عام طور پر علماء مستشرقین کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے مگر خطبۂ استقبالیہ اور خطبۂ صدارت میں ان کی اسلامی خدمات کو سراہا گیا، اگرچہ شاہ صاحب نے ان کی تعریف کے ساتھ یہ شکایت بھی کی کہ "بعض مستشرقین نے مختلف تاریخی، سیاسی اور مذہبی اسباب کی بنا پر مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت کی بڑی غلط تصویر پیش کی ہے"۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے اپنی اختتامی تقریر میں کانفرنس کے مقاصد، عربی مدارس کے نصاب تعلیم اور بعض ایسے موضوعات پر جن پر اس اجلاس میں بحث وگفتگو آئی تھی، بہت اچھے انداز میں اظہار خیال کیا، شاہ معین الدین صاحب نے جنوری کے معارف میں اس تقریر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ان کی تقریر خیالات کے اعتدال وتوازن کی بنا پر ہر خیال کے اہل علم نے پسند کی"۔ جدید مطالعہ اور تحقیق میں معروضیت پر بہت زور دیا جاتا ہے مگر مولانا ابوالحسن علی صاحب اس کے خلاف ہیں، وہ اسلام کے مطالعہ کے لیے عقیدت بھی ضروری سمجھتے ہیں، ہمدردی بھی اور جذباتی تعلق بھی، اس لیے انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس کے خلاف تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے بھی اس مسئلے پر اظہار خیال کیا اور فرمایا کہ اگرچہ سو فیصدی کوئی شخص معروضی نہیں ہوسکتا، مگر علمی اور تحقیقی مباحث میں، خصوصاً ایسے مواقع پر جب مخاطب صرف عقیدت مندہی نہ ہوں معروضی انداز زیادہ مفید اور مناسب ہوتا ہے۔

دارالمصنفین نے اس موقع پر اپنے یہاں کے مخطوطات اور مطبوعات کی نمائش بھی کی تھی، مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی کتابوں کے مسودوں اور ہندوستان اور بیرون ہند کے اہم خطوط بھی اس نمائش میں رکھے گئے تھے، جن کو مہمانوں نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے دیکھا اور پسند کیا۔

اعظم گڑھ میں شبلی کی یادگار دارالمصنفین کے علاوہ مولانا حمیدالدین فراہی کی یادگار مدرسۃ الاصلاح بھی اپنی خدمات کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کانفرنس سے ایک روز پہلے نمائندوں کا مدرسہ میں استقبال کیا گیا، جس میں مدرسہ کے ناظم مولانا بدرالدین اصلاحی صاحب نے مدرسہ کا تعارف کرایا اور مولانا فراہی کی تفسیر کی خصوصیات پر روشنی ڈالی، جامعہ کے ایک قدیم طالب علم برادرم مولوی عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مہمانوں کی طرف سے قاضی سجاد حسین صاحب اور مولانا سعید اکبر آبادی صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے مولانا فراہی کو خراج عقیدت پیش کیا، اور مولانا اکبر آبادی صاحب نے ان کی تفسیر کی خصوصیات پر بڑی عالمانہ تقریر کی۔

اگلے اجلاس کے متعلق طے ہوا ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں منعقد ہوگا اور اس کے صدر ڈاکٹر عبدالحلیم صاحب ہوں گے۔ اس طرح علمی سطح پر قدیم وجدید کو قریب سے قریب تر آنے کا ایک اور موقع ملے گا۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۱	بابت ماہ مارچ ۱۹۷۰ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون:

اڈیٹر: ۷۴۲۵۸ — منیجر: ۷۴۴۷۰

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائٹل: ڈیال پریس دہلی

شذرات

فروری کے شذرات میں ہم نے ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا تھا جنھوں نے بمبئی میں جامعہ کی گولڈن جوبلی کے سلسلہ میں ہماری مدد کی تھی، اس فہرست میں تین اہم اشخاص کا ذکر نہیں تھا، یہ ہیں جناب سکندر علی وجدؔ، جناب ناظر لطیف اور جناب شاہد علی خاں، جامعہ میں کون ایسا ہے جو وجدؔ صاحب سے واقف نہیں ہے، استاد اور طالب علم سب اُن کی شخصیت سے متاثر اور ان کی شاعری کے قدردان ہیں، ہم لوگ بہت خوش ہوئے جب امسال صدر جمہوریہ ہند نے انھیں 'پدم شری' کا خطاب دیا، جامعہ والے انھیں مبارکباد دیتے ہیں۔ وجدؔ صاحب نے بمبئی میں ہمیں کئی مفید مشورے دیے، کئی ایسے حضرات سے ملاقات کرائی جن کے وسیلے سے جوبلی کے موقع پر جامعہ کو خاصی امداد مل سکتی ہے، وقت نکال کر اور زحمت کر کے ہمارے ساتھ کئی جگہوں پر گئے اور ایسے کام کے لئے گئے جن سے عام طور پر خوددار طبیعتیں کتراتی ہیں یعنی چندہ مانگنا، اس پر مستزاد ان کی صحبت میں شعر و شاعری اور زبان و ادب کے مسئلوں پر پُر لطف گفتگو، الغرض اس بار انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور دل جو پہلے ہی سے اُن کے فتراک کا نخچیر تھا، اُن کی شخصیت کے دام کا مستقل طور پر اسیر بن گیا۔

ناظر لطیف صاحب ایک برطانوی کمپنی کے جنرل منیجر ہیں اور غالباً پہلے ہندستانی ہیں جن کا تقرر کمپنی کی اس پوسٹ پر ہوا ہے، انھوں نے ہمیں مدعو کیا اور دیر تک ہمارے بمبئی آنے کے مقصد پر گفتگو کرتے رہے، وعدہ کیا کہ وہ پوری مدد کریں گے اور جامعہ کو اچھی خاصی رقم دلوائیں گے، شاہد علی خاں صاحب مکتبۂ جامعہ کی شاخ بمبئی کے انچارج ہیں اور اپنا کام بڑی محنت اور حسن و خوبی سے کر رہے ہیں، بمبئی میں، ایک لحاظ

سے، مکتبہ کی دوکان ہی ہمارا ہیڈ کوارٹر ہوتا ہے۔ اِن بمبئی کے شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں سے ملاقات ہوجاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ بمبئی میں اردو کے کیسی کیسی صلاحیت والے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ شاہد صاحب نے جامعہ کے لئے اپنے حلقے میں کام بھی کیا اور مزید کوشش کا یقین بھی دلایا، امید ہے کہ ان کی کوششیں جاری رہیں گی اور ان کی کاوش سے چندہ کی فراہمی میں بڑی برکت ہوگی۔

تعطیلات سرما میں مدرسۂ ثانوی کے استاد جناب محمد حسین صاحب اور جامعہ کے اسٹیورڈ جناب محمد شبیر ندوی صاحب بھی جوبلی کے کام کے لئے باہر گئے تھے، ان کا سفر کلکتہ اور اس کے مضافات کا تھا۔ چند روز وہ لکھنؤ میں بھی ٹھہرے تھے جہاں مولانا علی میاں صاحب نے جامعہ کی مسجد سے جو زیر تعمیر ہے، بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور ایک اپیل بھی لکھ کر دی، ہم سب ان کے ممنون ہیں۔ لکھنؤ اور کلکتہ میں ہمارے قدیم طالب علموں نے ان لوگوں کی بہت مدد کی، پچاس سال تک تعلیم کا کام کرنے کے بعد جامعہ آج اس پوزیشن میں ہے کہ اس کی معنوی اولاد دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور مادر علمی کی خدمت اپنی سعادت تصور کرتی ہے۔ ہم لوگوں کو اس سے تقویت ملتی ہے اور ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے۔ حسین صاحب اور شبیر صاحب نے پرانے طالب علموں کو زندگی کی تگ و دو میں مصروف پایا، اُن میں کام کرنے اور ترقی کرنے کی لگن پائی اور اس کے ساتھ جامعہ کی خدمت کا جذبہ بھی ان میں محسوس کیا، یہ سب باتیں اس کی دلیل ہیں کہ جامعہ کی تعلیم و تربیت رائیگاں نہیں گئی۔

اس سفر میں ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو ایسے لوگ بھی ملے جنھیں جامعہ سے کچھ شکایتیں ہیں۔ اس پر ہم متعجب نہیں ہوئے، قوم کو تنقید اور شکایت کا حق ہے اور وہ تنقید اور شکایت نہ کرے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ اُسے اب ہم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ جامعہ انسانوں کی بستی ہے، فرشتوں کی نہیں، اور انسانوں سے غلطی ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ اکثر اپنی غلطی نظر نہیں آتی، دوسرے اسے جلد دیکھ لیتے یا محسوس کرلیتے ہیں اور اس میں صاحب استعداد طبیعتوں کی اصلاح کی گنجائش ہوتی ہے، یا کم از کم یہ ہوتا ہے کہ اپنے

آپ کو جانچنے اور پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسرے جسے غلطی سمجھ رہے ہیں وہ سرے سے غلطی ہی نہ ہو لیکن اسے انسان کو اپنے فعل کے جانچنے کا وسیلہ سمجھنا چاہئے اور اس پر ناراض ہونے کے بجائے معترضین کا ممنون ہونا چاہئے۔

جامعہ کے معترضین کئی طرح کے ہیں۔ ان میں ایک قسم اُن لوگوں کی ہے جو جامعہ کے کسی اہم کارکن سے محض ذاتی اسباب کی بنا پر ناراض ہو گئے ہیں، اس کی وجہ سے پورا ادارہ اُن کی زد میں ہے، اس کا کوئی کام ان کو پسند نہیں، اس کی کوئی ادا انھیں نہیں بھاتی۔ ان کے ساتھ وہی معاملہ ہے کہ

تصور ڈھونڈ کے پیدا کئے جفا کے لئے

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اس بات کی شکایت بھی ہے کہ ہمارے اعتراضات کا جواب جامعہ والے نہیں دیتے۔ اب آپ خود بتائیے کہ ایسے اعتراضوں کا بھلا کیا جواب ہو سکتا ہے جن کی بنیاد ذاتی رنجش یا ذاتی پسند اور ناپسند پر ہو، ادارے اجتماعیت کے مظہر ہوتے ہیں ذاتیات کے نہیں۔

دوسری قسم ان معترضین کی ہے جنھیں حقیقت حال کا صحیح علم نہیں، لیکن چونکہ ہمارے قومی مزاج میں معروضیت کے بجائے داخلیت کو زیادہ دخل ہے، اس لئے کسی خبر کو سن کر فوراً متاثر ہو جاتے ہیں اور ایک رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اس طرح کی غلط فہمیوں کے شکار وہ لوگ زیادہ ہوتے ہیں جو ہر چھپی ہوئی چیز کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں، ایک مثال لیجئے۔ برسوں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بعض حضرات یہ خبر چھاپتے رہے کہ جامعہ والے مسجد کی تعمیر کے خلاف ہیں اور جو کچھ روپیہ اس کے لئے جمع ہوا تھا وہ خورد برد ہو گیا ملک میں بہت سے لوگ تھے جنھیں اس کا یقین تھا کیونکہ یہ ہفوات اخباروں میں چھپتے تھے اور بڑے ثقہ لوگوں کے اخبار یہ سب چھاپ دیتے تھے۔ بمبئی میں ایک صاحب نے جو اس طرح کی خبروں سے متاثر معلوم ہوتے تھے مجھ سے بڑے محتاط لفظوں میں سوال کیا: "صاحب! یہ بتائیے جامعہ کو قائم ہوئے پچاس برس ہو گئے، اب تک وہاں مسجد کیوں نہیں بنی؟" میں نے کہا کہ آپ کے پاس وقت ہو اور آپ

سننے کے لئے تیار ہوں تو عرض کروں ۔ وہ اس کے لئے آمادہ تھے، میں نے پوچھا آپ جامعہ کی تاریخ سے واقف ہیں؟ انھوں نے کہا بتایئے ۔ میں نے انھیں مختصراً جامعہ کی کہانی سنائی اور کہا کہ جامعہ کی مسجد علی گڑھ میں بن نہیں سکتی تھی، پھر وہ دہلی میں قرول باغ میں لائی گئی جہاں اس کا قیام عارضی تھا اور کرایہ کے مکانوں میں اپنے دن گزار رہی تھی، ۱۹۳۶ء میں اس کا قافلہ اوکھلا گاؤں کے قریب اترنے لگا تھوڑی تھوڑی کر کے زمینیں خریدی جانے لگیں، پہلے مدرسۂ ابتدائی کی عمارت بنی، پھر مدرسۂ ثانوی کی اور وہ بھی یہ عمارتیں جس طرح برسوں کاسۂ گدائی لے کر پھرنے کے بعد بنی ہیں اس کا حال کچھ جامعہ والے ہی جانتے ہیں، ایسی صورت میں جب مہینوں استادوں کی تنخواہیں نہ ملتی ہوں اور مطبخ قرض پر چلتا ہو کہ پیٹ کا تقاضا ایک دن بھی انتظار نہیں کر سکتا، ٹین کا ایک معمولی سا ہال نماز کے لئے بنایا تو جا سکتا (اور جامعہ نے محمد علی ہال کے نام سے اس کا انتظام کر لیا تھا) ایک اہم تعلیمی ادارے کی مسجد کی تعمیر جو اس کے شایان شان ہو، کیسے ہو سکتی تھی۔ لیکن ذاکر صاحب مرحوم اور جامعہ کے دوسرے کارکنوں کو برابر اس کا خیال رہا کہ جامعہ میں ایک شاندار مسجد ہو اور اسی لئے سلور جوبلی کے موقع پر مسجد کے لئے چندہ کی مہم شروع کی گئی اور کوئی پینتالیس ہزار روپے جمع ہوئے، ذاکر صاحب نے مسجد اور بیت الحکمت کی مشترک عمارت کے لئے جرمن آرکیٹیکٹ ہائینز سے جو نقشہ تیار کرایا تھا اس کے مطابق اس وقت کے لحاظ سے کوئی دس لاکھ کی لاگت آتی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں سلور جوبلی ہوئی اور ۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے اور جامعہ ہی کو بچانا مشکل ہو گیا۔ برسوں یہی انتظار رہا کہ حالات ٹھیک ہوں تو اس کثیر رقم کے لئے قوم سے اپیل کی جائے، اور اب سیکڑوں مایوسیوں کے بعد کم لاگت کی مسجد کا جو تقریباً پانچ لاکھ روپے ہے، نقشہ بنوایا گیا ہے اور خدا کا نام لے کر مسجد کی تعمیر شروع کر دی گئی ہے ــــــــ میں نے یہ بھی کہا کہ ہمارا یہ خیال غلط نکلا کہ جیسے ہی مسجد کی تعمیر شروع ہوئی کم از کم معترضین تو ہر طرح کی امداد کے لئے تیار ہو ہی جائیں گے۔ اب ہمیں اس سلسلہ میں جو دشواری ہو رہی ہے ہمیں جانتے ہیں، پھر بھی خدا کی ذات سے امید ہے کہ اب جبکہ یہ کام شروع ہو گیا ہے، پورا ہو جائے گا، جس کا کام ہے وہ خود ہی مسلمانوں سے یہ کام کرا لے گا، ہمارا کام کوشش کرنا ہے خواہ

اس میں کتنی ہی دشواریاں ہوں ــــــــ مخاطب کی طبیعت چونکہ صالح تھی اس لئے میری بات کا ان پر اثر ہوا اور انھوں نے نہ صرف یہ کہ جامعہ کی مشکلات کو سمجھا بلکہ مسجد کے لئے چندہ بھی دیا۔

معترضین کی یہی وہ قسم ہے جنھیں اگر صحیح صورت حال بتائی جائے تو ہمدرد بن جاتے ہیں۔ لیکن ایک طرح کے لوگ اور ہیں جو چندہ دینا نہیں چاہتے اور اپنی اس نیت کو جامعہ پر اعتراضات کے پردے میں چھپاتے ہیں۔ اِن کی گفتگو کا انداز، لب و لہجہ اور بحث کے بیشتر بڑے دلچسپ ہوتے ہیں، وقت ہو تو ایسے لوگوں کے نفسیاتی مطالعہ سے فکر و عمل کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے تھکی ہاری زندگی بھی حسین نظر آنے لگتی ہے۔ مثلاً ایک شہر میں مجھ سے ایک صاحب نے کہا: 'صاحب! آخر چندے سے مسلمانوں کا کام کب تک چلے گا؟' یہ سوال کتنا فکرانگیز ہے؟ ایک دوسرے صاحب نے فرمایا: 'آپ خود بتایئے، کس کس کو چندہ دیں اور کہاں تک دیں؟' جنوبی ہندوستان کے ایک شہر میں کہا گیا 'جسے دیکھئے، شیروانی پہنے شمالی ہندوستان سے چندے کے لئے چلا آتا ہے، کیا ہم انھیں لوگوں کے لئے کماتے ہیں؟' یہ اور اس طرح کی سبھی باتیں ہنسی میں ٹال دینے والی نہیں ہیں، کچھ ایسی ہیں جن پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے، خواہ چندہ ملے یا نہ ملے۔

غور فرمایئے مسلمانوں کی کتنی جماعتیں اور ادارے محض چندے کے بل بوتے پر چل رہے ہیں، یہاں اس سے بحث نہیں کہ مسلمانوں کو من حیث الجماعت ان جماعتوں اور اداروں سے کتنا فائدہ پہونچ رہا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں چندے پر گذر بسر کرنے والوں کی تعداد چندہ دینے والوں سے زیادہ ہے۔ پھر اس پر آئے دن کے فسادات جن میں مسلمان پٹتا ہے، لٹتا ہے، برباد ہوتا ہے، ان کی امداد اور بحالی کا انتظام بھی مسلمانوں ہی کو کرنا پڑتا ہے، اپنے گذشتہ سفر کے دوران میں نے یہ بھی دیکھا کہ کوئی شہر یا قصبہ ایسا نہیں جہاں مسجدیں اور مدرسے، اسکول اور کالج، شفاخانے اور مسافرخانے نہ بن رہے ہوں یا بنانے کے منصوبے نہ ہوں، آخر اس

کے لئے مسلمانوں ہی نے چندہ دیا ہوگا یا انھیں کو دینا ہوگا، میرا اندازہ تو یہ ہے کہ مسلمان دل کھول کے پیسے دیتا ہے، اگر ان پیسوں کا صحیح مصرف ہو اور کسی نظم و ضبط سے ہو تو ہمارے بہت سے کام ہو جائیں اور سلیقے سے ہو جائیں۔

میں نے جب کبھی یہ بات سنی کہ مسجد کا کام رکتا نہیں، پورا ہو کر رہتا ہے تو ایمان میں ایک تازگی سی محسوس ہوئی، لیکن دوسرے ہی لمحے یہ خیال آیا کہ غریب، شوقین اور ہونہار بچوں اور بچ کے لئے وظائف فنڈ کی فراہمی کا کام شاید اللہ میاں کو پسند نہیں ورنہ کوئی ایک بندۂ خدا تو یہ کہ کہ یہ نیک کام ہے، شروع کر دو، ضرور پورا ہوگا۔ میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا ہے اور میں کس طرح یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ غریبوں اور ناداروں کی تعلیم کے لئے وظائف فنڈ کا انتظام کر دینی کام نہیں ہے، میرے خیال میں تو آج یہ ایک اہم دینی کام ہے جس کی طرف ارباب خیر کو پوری توج دینی چاہیے، قوم کی تعلیمی حالت ٹھیک نہ ہوئی، اور ہمارے باصلاحیت نوجوان ناداری کی وجہ سے اعل تعلیم سے محروم رہے تو قوم کی معاشی حالت ٹھیک نہ ہوگی اور معاشی حالت اچھی نہ ہوئی تو اخلاق حالت کے بہتر ہونے کی توقع نہیں اور پھر جس قوم یا جماعت کی اخلاقی حالت بگڑ جائے تو اس دینی فلاح اور دنیوی بہتری کی امید کیسے کی جا سکتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ بات کسے سمجھائی جا اور کیسے سمجھائی جائے۔

ایسے موقع پر مجھے ہمیشہ مسدس حالی کی یاد آتی ہے، اس پر یقیناً بہت سے لوگ چونکیں گے لیکن کبھی کبھی پیچھے مڑ کے بھی دیکھ لینا چاہئے، مسدس حالی اس لئے نہیں لکھی گئی تھی کہ مسلمانوں کو 'پدرم سلطان بود' کا سبق یاد دلایا جائے، اس کا مقصد اصلاحی تھا، اس میں خاص طور سے و حصہ پڑھنے کے لائق ہے جہاں مسلمانوں کی اخلاقی ابتری کا نقشہ کھینچا گیا ہے، کئی لحاظ سے مسلمانو کی وہی حالت آج بھی ہے جو حالی کے زمانے میں تھی، اس حصہ کو پڑھنے اور بار بار پڑھنے

کی ضرورت ہے کیونکہ ہمارا جہاز گرداب میں پھنس گیا ہے اور ہر چھوٹے بڑے کی جان جوکھوں میں ہے۔

ذیل کے تین بند پڑھیے اور غور وفکر کیجیے :

کسی نے یہ اک مردِ دانا سے پوچھا   کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا "عقل جس سے ملے دین و دنیا"   کہا "گر نہ ہو اس سے انساں کو بہرا"
کہا "پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے
کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے"

کہا "گر نہ ہو اس کو یہ بھی میسر"   کہا "مال و دولت ہیں پھر سب سے بڑھ کر"
کہا "در ہو یہ بھی اگر بند اس پر"   کہا "اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر"
وہ ننگِ بشر تاکہ ذلت سے چھوٹے
خلائق سب اس کی نحوست سے چھوٹے

مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو   مبادا کہ وہ ننگِ عالم تمھیں ہو
گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو   تو جلدی سے اٹھو اور اپنی خبر لو
وگرنہ یہ قول آئے گا راست تم پر
کہ "ہونے سے ان کا نہ ہونا ہے بہتر"

کرشن چندر

اردو کا مقدمہ

دسمبر ۱۹۶۹ء کے آخری دنوں میں جو اردو کنونشن منعقد ہوا تھا اس کے پروگرام کا وہ جلسہ یادگار رہے گا جس میں پردھان منتری اندرا گاندھی تشریف لائی تھیں اور ہندوستان کی تقریباً سبھی زبانوں کے ادیبوں کی طرف سے اُن کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کیا گیا تھا۔ اس موقع پر اردو اور ہندی کے مشہور ادیب کرشن چندر نے کنونشن کے صدر کی حیثیت سے اردو کا مقدمہ جن الفاظ میں پیش کیا تھا، وہ درج ذیل ہیں۔ پچھلے شمارے کے شذرات میں ہم نے اس کنونشن کے متعلق اپنے خیالات وتاثرات بیان کر دئے تھے۔

"مدیر"

پردھان منتری جی، معزز مہمانو اور دوستو،

آج کی عدالت میں اردو کا مقدمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ عدالت کسی ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کی عدالت نہیں ہے بلکہ آپ کے دل، ضمیر اور کانشئیس کی عدالت ہے جس کے سامنے ایک بے بس، مجبور اور مظلوم زبان اپنے لئے، اپنی زندگی اور اس کی حفاظت کا حق مانگنے آئی ہے، اور یہ حق اس کو ملنا چاہئے، کیونکہ اردو کہتی ہے، میں اسی ملک کی ایک زبان ہوں، میں کوئی بدیسی زبان نہیں ہوں کہ مجھے دیس نکالا دیا جائے، میں اسی ملک کی زبان ہوں۔ میں دہلی اور لکھنؤ کے قرب وجوار میں پیدا ہوئی۔ میری دلکشی اور آپ کی محبت نے مجھے بڑھاوا دیا اور میں دھیرے دھیرے سارے شمالی ہند میں پھیل گئی، مجھے یوپی، بہار، دہلی، ہریانہ، راجستھان میں کروڑوں لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہی میرا وطن ہے، یہی میرا گھر

ہے۔ اس مٹی کی بو باس میرے انگ انگ میں رچی ہوئی ہے۔ میں اس دیش کے کروڑوں لوگوں کا مزاج ہوں، ان کی بول چال کی زبان ہوں، ان کے کلچر کا حصہ ہوں۔ مجھے میرا گھر دیجئے۔ مجھے میرا وطن واپس ملنا چاہیئے۔

اردو زبان کہتی ہے کہ میں کسی ایک فرقہ کی زبان نہیں ہوں، کچھ کیرنل لوگ، کچھ تنگ نظر لوگ مجھے صرف مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں۔ حالانکہ اگر ایسا ہی ہوتا تو بھی کوئی بُرا نہ ہوتا۔ کیا اس دیش میں مسلمانوں کو اپنے دھرم، اپنے کلچر، اپنی شخصیت، اپنے مزاج اور اپنی زبان کے ساتھ زندہ رہنے کا حق نہیں ہے؟

لیکن میں تو یہ نہیں کہتی۔ اتہاس کے ورق الٹ جایئے۔ میں اپنی زندگی کے کسی حصے میں کسی ایک فرقے کی زبان نہیں رہی ہوں۔ مجھے اگر کروڑوں مسلمان بولتے ہیں تو کروڑوں ہندو، سکھ اور عیسائی بھی بولتے، سمجھتے ہیں۔ میں نے قرآن کے ساتھ ساتھ وید اور گیتا کو بھی اپنے سینے سے لگایا ہے۔ جپ جی، پوتر پاٹھ اور مقدس بائبل کے اقوال میری روح میں رچ بس گئے ہیں۔ میری زبان میں اور میری لپی میں آریہ سماجیوں کے اخبار نکلتے ہیں، سناتن دھرمیوں کے اخبار نکلتے ہیں، جن سنگھیوں کے اخبار نکلتے ہیں، اکالیوں کے اخبار چھاپے جاتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ میرے ماننے والوں میں اگر میرؔ اور غالبؔ تھے تو چکبستؔ، رتن ناتھ سرشارؔ اور دیا شنکر نسیمؔ بھی تھے۔ آج بھی میرے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں میں سبھی مذہبوں کے لوگ ہیں۔ میں وہ ماں ہوں جس نے اپنی گود میں ہر مذہب اور ہر دھرم کے بچوں کو پناہ دی ہے۔ کیا اس لئے میری گردن ماری جائے گی؟ یا ماں کی محبت کا یہی انعام ہوتا ہے؟

میں ایک ہندوستان گیر اور جہاں گیر زبان ہوں۔ ایک عالم میں میری دلکشی، حلاوت اور حسنِ ادا کے چرچے ہیں، میں صرف دہلی، یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، ہریانہ اور راجستھان ہی میں بولی اور سمجھی نہیں جاتی، مجھے اہل پنجاب اور اہل کشمیر نے بھی اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ ٹیگور کے وطن کی راجدھانی کلکتہ میں میرے درجنوں اخبار نکلتے ہیں۔ شری نائیک جس پرانت کے مکھیہ منتری ہیں اس کے سب سے بڑے شہر بمبئی میں بھی اردو کے بہت سے اخبار نکلتے ہیں اور ہر روز کسی نہ کسی محفل میں اس زبان

کے گیت گنگنائے جاتے ہیں۔ میرے اخبار اور رسالے بنگلور سے بھی شائع ہوتے ہیں اور مدراس اور کیرالہ میں بھی مجھے سمجھا اور بولا جاتا ہے۔ میں وہ زبان ہوں جو اپنے وطن شمالی ہند کے علاوہ دکن کے کروڑوں لوگوں کی جان ہے، میں سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہوں، اور میں نے اپنے دل کا پیار، اپنی نگاہ کی نرمی اور اپنی روح کی حلاوت مختلف صوبوں میں رہنے والے مختلف قومیتوں کے لوگوں کو دی ہے، کیا اس لئے میرا منہ بند کیا جا رہا ہے؟ میں وہ زبان ہوں جس نے اسی دھرتی پر جنم لیا۔ میں بھی ہندی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تامل، ملیالم، اوڑیا، آسامی، سندھی، تلگو، کنڑ اور دوسری بھاشاؤں کی طرح بھارت ماتا ہی کی بیٹی ہوں، یہی میرا دیس ہے، یہیں میں پلی بڑھی اور سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور اب تو مجھے دوسرے دیسوں میں بھی مہان تا ملی ہے، پاکستان والوں نے بنگالی اور پنجابی، سندھی اور بلوچی اور پشتو کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اپنایا ہے، میں ملیشیا میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہوں اور ایسٹ افریقہ میں بھی، لندن میں میرے تین اخبار نکلتے ہیں اور کئی رسالے، میں ہندوستان اور دوسرے دیسوں کے درمیان سمجھنے سمجھانے کے لئے ایک پل کا کام کرتی ہوں، کیا اس لئے مجھے ڈائنا مائٹ سے اڑا دیا جائے گا؟

میں ایک سیکولر زبان ہوں، میں روزی روٹی کے لئے جدوجہد کرنے والی کروڑوں کی تعداد میں کام کرنے والے لوگوں کی زبان ہوں، میں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے ہر موڑ پر حصہ لیا ہے، میں نے ہندوستانی سماج کو بدلنے اور اُسے آگے بڑھانے کے لئے اپنی محنت، اپنا فن اور اپنے شاعروں اور ادیبوں کا لہو پیش کیا ہے اور اگر یہی میرا جُرم ہے تو میں اپنے جُرم پر فخر کرتی ہوں اور مجھے اس بات پر ناز ہے کہ ہر فیصلہ کن لڑائی میں میں نے ہندوستان کی جنتا کو انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا ہے۔

آج پھر ہم ایک انقلابی موڑ پر کھڑے ہیں اور ہمارے دیش کی پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی اس نئے انقلابی موڑ کا نشان بن گئی ہیں اور ہماری آشاؤں اور امیدوں کا مرکز۔ پچھلے سماج نے اردو سے انصاف نہیں کیا کیونکہ اس نے اس دیش کی جنتا سے بھی انصاف نہیں کیا ہے۔ لیکن کیا نیا سماج اور ڈیموکریٹک سوشلزم کے راستے پر چلنے والے اور اس کا نرمان کرنے والے بھی اردو کے ساتھ انصاف نہیں کریں

گے ؟ ــــــ اردو کے ایک ادیب کی پچھترویں سالگرہ پر تقریر کرتے ہوئے اسی سال میں شریمتی اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ لپی بھاشا کی کنجی ہوتی ہے اور ہم اردو والے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے کہ اردو زبان کو اس کی کنجی یعنی لپی کے ساتھ زندہ رکھا جائے، اس کے اپنے وطن میں زندہ رکھا جائے، ان تمام صوبوں میں اسے علاقائی زبان کا سرکاری درجہ دیا جائے جہاں ایک بڑی تعداد میں ہمارے دیش کی جنتا اسے بولتی اور سمجھتی ہے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں چاہتے، ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی اور ان کے وہ ساتھی جو ڈیموکریسی اور سوشلزم میں یقین رکھتے ہیں ان اصولوں کو اردو پر بھی لاگو کریں گے اور اس زبان کی حفاظت کریں گے۔ جو سماج اس زبان کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ سوشلسٹ سماج نہیں ہو سکتا، کوئی دوسرا سماج ہو سکتا ہے۔

انور صدیقی

کچھ انگریزی ادب کے اثرات کے بارے میں

ادبی اثرات پر گفتگو کرنا اور وہ بھی ماہرانہ گفتگو انتہائی مشکل اور نازک کام ہے اس لئے کہ ادبی اثرات کا داخلی اور خارجی شواہد کی مدد سے تعین خاصا محنت طلب ہے۔ بعض شعراء کے یہاں اگر ان اثرات کے داخلی ثبوت مل بھی جاتے ہیں تو یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ واقعی شاعر نے براہ راست مطالعے کے بعد ان اثرات کو قبول کیا ہے اور انھیں اپنے فن پارے میں جگہ دی ہے۔ تقابلی ادب کا طالب علم بالعموم اسی طرح کی دشواریوں سے دوچار ہوتا ہے اور اکثر صورتوں میں جو نتائج نکالے جاتے ہیں وہ گمراہ کن ہوتے ہیں کیونکہ بعض اوقات مماثلت صرف اتفاقی ہوتی ہے واقعی نہیں۔ صرف اتفاقی مماثلت کو بنیاد بنا کر واضح طور پر ادبی اثرات کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی کیونکہ انسانی ردّ عمل کی نہج عام طور پر ہر ملک و قوم میں یکساں ہوتی ہے۔

ہر ملک میں غیر ملکی ادبی اثرات دو مرحلوں سے ہو کر گزرتے ہیں۔ پہلے دور میں صرف ترجمے کئے جاتے ہیں اور یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی رہتی ہے کہ کن غیر ملکی ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے فن پاروں کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ دوسرا مرحلہ اس وقت آتا ہے جب یہ ترجمے تخلیقی ادب کو متاثر کرتے ہیں اور وہ بھی طرح طرح سے۔ کبھی براہ راست اثر کی صورت میں اور کبھی بالواسطہ طرز احساس میں تبدیلی کی شکل میں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ پہلا دور ترجمے کا اور دوسرا دور ترجمانی کا۔ ان سب سے بڑھ کر ایک منزل وہ آتی ہے جو شاید سب سے معتبر منزل ہے اور جس تک پہنچنا سب کے بس کی بات بھی نہیں ہے جب کسی ادب کی تخلیق نو اپنے طور پر غیر ملکی ادبی اثرات سے متاثر ہو کر

بے نیاز ہو کر چلتی ہے اور اعلیٰ درجے کے ادبی اور فنی کارناموں کو جنم دیتی ہے۔ انگریزی ادب کے اثرات اردو میں بھی انھیں منزلوں یا مرحلوں سے ہو کر گزرے ہیں۔

غالباً اس بات سے آج کوئی انکار کی جرأت نہیں کر سکے گا کہ جہاں ہم نے انگریزی شعر و ادب کے ذریعہ اپنے ادبی سرمائے میں توسیع کی ہے وہیں ہم نے ان کے ذریعے اپنے آپ کو بھی پایا ہے۔ اس توسیع، خود آگہی اور اپنی بازیافت سے ہم نے علم، تہذیب، ادب اور سیاست کے شعبوں میں جو کچھ کھویا ہے یا پایا ہے اس کا تفصیلی تذکرہ شاید میں اس موقعہ پر نہ کر سکوں گا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ انگریزی شعر و ادب سے متاثر ہوئے بغیر ہم اپنی ملکی اور قومی تاریخ کی اس منزل میں نہیں پہنچ سکتے تھے جسے ہم ذہنی بیداری یا نشاۃ ثانیہ کی منزل کہتے ہیں۔ انگریزی ادب کے مطالعے اور جدید علوم سے آگہی نے ہماری جامد ذہنی زندگی کی سطح پر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو تموج پیدا کیا تھا اس کی لہریں آج بھی ہمارے فکر و احساس کو طرح طرح سے مرتعش کرتی رہتی ہیں۔ یہ لہریں کبھی کبھی گرداب بھی بنی ہیں مگر زیادہ تر ان کی وسعت سے ہماری فکری، تہذیبی اور ادبی زندگی کے تنگ دائرے ٹوٹے ہیں اور ہمارا ذہنی اُفق اور وسیع ہوا ہے۔ اردو علم و ادب کے شعبے میں فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور سرسید کی علی گڑھ تحریک، انگریزی ادب کے زندہ اثرات کی تابندہ مثالیں ہیں۔ دہلی کالج میں ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے ہی علوم جدیدہ سے متعلق بہت سی تاریخ ساز تصانیف کا انگریزی سے ترجمہ ہو چکا تھا اور اس سلسلے میں منشی ذکاء اللہ اور ماسٹر رام چندر کی خدمات سے کون واقف نہیں ہے۔ فورٹ ولیم کالج نے اردو کو ایک صاف، شائستہ اور سادہ نثر دینے کی کوشش کی۔ علی گڑھ تحریک نے جہاں ایک طرف وکٹورین انگلستان کی عقلیت، سائنسی طرزِ فکر اور حقیقت پسندی پر زور دیا وہیں اس نے ادب کے دوسرے میدانوں میں بھی کئی انقلاب انگیز تبدیلیوں کا مطالبہ کیا۔ قدیم ادب سے، جو بے مقصد اور ہیئت پرست ہو کر رہ گیا تھا اور فن کاری سے زیادہ صناعی پر زور دینے لگا تھا انگریزی ادب کے مطالعے کی وجہ سے ایک طرح کی مقدس بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ یہ بے اطمینانی ہرگز پیدا نہ ہوتی اگر سرسید اور ان کے رفقاء کے ذہن میں وہ مطالبے نہ ہوتے جو آرنلڈ اور دوسرے وکٹورین انگریزی

ناقدین ادب سے کر رہے تھے۔ آرنلڈ اور اس کے معتقدین کا خیال تھا کہ ادب کو تنقید حیات کا فریضہ انجام دینا چاہئے اور اسے ہر حال میں اعلیٰ تہذیبی اور انسانی اقدار کا پابند رہتے ہوئے انسانیت کے لئے قوت شفا فراہم کرنی چاہئے۔ اس دور کے کئی نقاد ادب کو مذہب کا نعم البدل بنانا چاہتے تھے اس لئے کہ ڈارون کے نظریات نے ان کی نظروں میں عیسائیت کا مستقبل خطرے میں ڈال دیا تھا اور اس کے حقیقی احیاء کی کوئی صورت نظر آرہی تھی۔ ادب کو مقصدی یا افادی بنانے کا جو مطالبہ حالی، سرسید، شبلی اور نذیر احمد نے کیا اس کا ماخذ وکٹوریائی انگریزی ادب اور اٹھارویں صدی کے انگریزی ادب میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ علی گڑھ تحریک نے انیسویں صدی کے اوائل کی رومانی تحریک کے شعراء اور ادباء کے فنی کارناموں کی طرف توجہ نہ کی یا اس کی طرف سے بے توجہی برتی۔ غالباً یہ لاتوجہی شعوری تھی اس لئے کہ رومانی تحریک عقل پر جذبے کو ترجیح دیتی تھی اور یہ رجحان علی گڑھ تحریک کی عقلیت پسندی کے منافی تھا۔ ذاتی طور پر سرسید کے لئے شاید وکٹورین عہد بھی کچھ پریشان کن ہی رہا ہوگا اس لئے کہ وہاں بھی شعری ادب رومانی تحریک کی توسیع کی حیثیت رکھتا تھا اگرچہ رومانیت کے خلاف ردِ عمل کی ابتدا بھی ہو چکی تھی انھیں ذہنی سکون اٹھارویں صدی کی ادبی اور ذہنی فضا میں محسوس ہوا جہاں ایک طرح کی سرد عقلیت اور کلاسیکی نظم و ضبط کی حکمرانی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے رسالے تہذیب الاخلاق کو ایڈیسن اور اسٹیل کے رسالوں Spectator اور Tatler کے مذاق و معیار کے مطابق نکالنے کا اعلان و اظہار کیا۔ یاد رہے کہ یہ رسالے تہذیب و اخلاق کے اصولوں کو عام کرنے کی غرض سے اٹھارویں صدی میں نکالے گئے تھے اور ان کا مقصد بھی جذباتیت کو ختم کر کے عقلی رویوں کو فروغ دینا تھا۔ علی گڑھ تحریک کے ہمہ جہت کارنامے فراموش نہیں کئے جاسکتے۔ اس نے اردو شعر و ادب کو کیا کچھ نہیں دیا۔ اس نے انگریزی ادب کے وسیلے اور وساطت سے اردو کو صحافت، ناول نگاری، انشائیہ، سوانح نگاری اور تنقید نگاری کو یہی نہیں کہ معیار دیئے بلکہ نمونے بھی بخشے۔ اسی تحریک کے زیر اثر بیسویں صدی کی ابتدا میں انگریزی شاعری کے بے شمار کارنامے اردو میں ترجمہ ہو کر مقبول ہوئے اور جدید اردو شاعری کا پیش خیمہ بنے۔ غلام محمد طور نے ورڈسورتھ کی نظم کوئل کا، عزیز لکھنوی نے طامس مور کی نظم مئی کے جوان چاند کا، سید علی حیدر نے

والٹر اسکاٹ کی 'حبِ وطن' کا، آصف نے بائرن کی نظم 'نوحے' کا، فضل الٰہی نے شیلی کی نظم 'فلسفۂ محبت' کا اور حبیب کنتوری نے گرے کی مشہور Elegy کا منظوم ترجمہ 'گم نام ناموز' کے عنوان سے کیا۔ یہ وہ چند ترجمے ہیں جو ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۰ء تک صرف مخزن میں شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ اور بھی کتنی نظمیں ہیں جو انگریزی سے اردو کے قالب میں ڈھلیں۔ انگریزی نظموں کے اردو ترجموں کا ایک مجموعہ 'ارمغانِ فرنگ' کے نام سے مولوی محمد ضامن کنتوری صاحب نے حیدرآباد سے شائع کیا تھا جس پر مخزن کے نومبر ۱۹۰۳ء کے شمارے میں ایک تعارفی تبصرہ شائع ہوا تھا۔ ان تمام ابتدائی ترجموں میں انگریزی مزاج سے ناواقفیت کی وجہ سے ناپختگی ضرور ہے مگر ان ترجموں نے تھوڑے سے عرصے میں جس طرح ہمارے شعراء کے طرزِ احساس کو بدلا اور اظہار کے روایتی سانچوں کو توڑا اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ہمارے ادب کے ارتقاء کی تاریخ سے واقف ہیں۔ ان نظموں نے اردو میں مناظرِ قدرت سے متعلق نظموں کی روایت کو آگے بڑھایا ـــــ وہ روایت جو کرنل ہالرائڈ کی ایما پر 'انجمن پنجاب' نے اپنے موضوعاتی مشاعروں سے شروع کی تھی۔ اردو کی رومانی شاعری میں اور بالخصوص اقبال کی بانگِ درا کی ابتدائی نظموں میں ان ترجموں کے تخلیقی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ کہیں ترجمے کی صورت میں کہیں تاثر کی شکل میں۔

سرسید کے افادی نقطۂ نظر کے خلاف ادب برائے ادب یا انشاءِ لطیف کی تحریک کے ظہور میں بھی انگریزی ادبیات نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ سجاد انصاری، مہدی، بجنوری، اور عظمت اللہ بیگ کی نثری اور شعری کاوشوں میں کہیں آسکر وائلڈ کا رنگ نمایاں ہے تو کہیں پیٹر (Pater) کا۔ سجاد انصاری کی فطانت میں آسکر وائلڈ کی ذہانت کی دھار محسوس ہوتی ہے، بجنوری نے پورے مغربی فکر و فلسفہ سے اکتسابِ نور کیا ہے۔ عظمت اللہ بیگ نے شعری ہیئت میں تجربے بھی کئے ہیں اور کئی تخلیقی ترجمے بھی۔

ترقی پسندی نے بھی انگریزی ادب و تنقید کی وساطت سے اپنے انقلاب انگیز تصورات مستعار لئے ہیں۔ ترقی پسند تنقید پر کاڈویل اور طامسن کے نظریے اور اندازِ کار کا غلبہ رہا۔ تخلیقی کاوشوں کو

سمت و رفتار دینے میں آڈن، اسپنڈر اور لوئی میک نیس کا جو حصہ رہا ہے اس کا اعتراف خود ترقی پسندوں کو بھی ہے۔

اردو کی جدید نسل کے شعراء اور تنقید نگاروں نے اگرچہ انگریزی کے علاوہ دوسری مغربی زبانوں کے ادب کے اثرات قبول کرنے کے رجحان کو آگے بڑھایا ہے پھر بھی ان کے طرز احساس، طرز فکر اور طرز بیان پر ایلیٹ، ایذرا پاونڈ، ٹامس گن، فلپ لارکن وغیرہ کے اثر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یوروپی زبانوں کے ادب کے اثرات بھی انگریزی کے ذریعہ سے ہی ہماری نسل تک پہنچ رہے ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی انگریزی شعر و ادب سے تخلیقی طور پر اخذ نور کرنے کا رجحان اردو میں غالب رجحان کی حیثیت رکھتا ہے۔

سید سفارش حسین رضوی

شاد عظیم آبادی کی مرثیہ گوئی

شاد کو اس عہد کا میر کہا گیا ہے، اُن کی غزلوں میں میر کی سی سادگی، خستگی اور برشتگی ملتی ہے۔ لوگ ان کے کلام پر سر دھنتے ہیں مگر مرثیہ گوئی میں ان کے رتبہ شناس بہت کم ہیں۔ بات یہ ہے کہ عام مرثیہ گویوں کی طرح شاد کے مرثیے عموماً نظروں کے سامنے نہ آئے۔ اُن کی غزلوں کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا لیکن مرثیہ گوئی پر لاعلمی کا پردہ پڑا رہا حالاں کہ مرثیہ میں وہ اپنے دور کے مجدد ہیں، انھوں نے مرثیہ گوئی میں اصلاحی قدم اٹھایا اور کامیاب ہوئے۔

۱۸۵۷ء کے بعد اُردو شاعری میں جو موڑ آیا اس کے بعد سے شاد کی شاعری شروع ہوتی ہے۔ اس موڑ کا اثر اُن کی طبیعت اور کلام دونوں پر پڑا۔ شعر کہنا تو اُنھوں نے پندرہ برس کی عمر ہی سے شروع کر دیا تھا مگر مرثیہ پر توجہ دبیر اور انیس کے پٹنہ جانے کے بعد سے کی۔ اس سے پہلے ایک مرثیہ کہا تھا جو شاد کے چچا نے مرزا دبیر کے سامنے اصلاح کے لئے پیش کر دیا۔ دبیر کی اصلاح نے شاد کی طبیعت کو بجھا دیا اور مرثیہ گوئی سے ان کا جی اُچاٹ ہو گیا۔ اپنے ایک خط میں جو رسالہ "ندیم" گیا (صوبہ بہار) کی جلد ۲۲، نمبر ۱، ۲، ۳، بابت جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۴ء میں چھپا ہے، شاد نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

"مرزا دبیر سے اور میرے بزرگوں سے بہت پیشتر سے راہ و رسم تھی، غضب یہ ہوا کہ میرے عم مرحوم نے مرزا صاحب کے سامنے وہ مرثیہ اصلاح کے لئے پیش کر دیا۔ وہ اس کو اپنے ہمراہ لکھنؤ لے گئے اور دو برس بعد اصلاح دے کر ہمراہ لیتے آئے مجھ کو اصلاح ایسی ناپسند

ہوئی کہ پھر مرثیہ کہنے سے ہی چھوٹ گیا اور کبھی کوئی کلام پیش نہ کیا۔"

اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بہار میں دبیرؔ کا رنگ عام طور پر مرغوب تھا۔ دوسرے یہ کہ مرثیے کے بعض مقام شادؔ کے دل میں کھٹکنے لگے اور گو میر انیسؔ نے شادؔ کی تسلی کی مگر وہ اس سے مطمئن نہ ہوئے۔ اسی خط میں لکھا ہے:

"ایک دفعہ میر صاحب کی مجلس میں میرے ہمراہ مولوی محمد یحییٰ وکیل بھی شریک ہوئے۔ انھوں نے میر صاحب پر یہ اعتراض کیا کہ کلام بے شک لاجواب تو ہے مگر اہل بیت کا کیرکٹر قایم نہیں رہتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مؤقر رئیس ہندوستانی کا یہ واقعہ ہے میں نے اگرچہ اس کے جواب کئی طرح سے دیئے مگر خود میرے دل پر مرثیہ کے بعض مقام کھٹکنے لگے مثلاً برخلاف واقعات تاریخ وروایات صحیح، زار و نالی و نوحہ و زاری برخلاف استقلال و صبر وغیرہ۔ چنانچہ یہ اعتراض میں نے خود میر صاحب کے سامنے کیا، انھوں نے بگڑ کر فرمایا کہ جو صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں وہ خود دس بند کہہ کر دیکھیں کہ کلام میں اثر بھی رہتا ہے اور پختگی بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ میر صاحب کا یہ فرمانا میرے لئے کافی نہ ہوا اور سوچا کہ اصل حال میں اثر نہ ہو غیر ممکن ہے۔ اسی دھن میں میں نے اس روز سے یہ عہد کیا کہ ایک مرثیہ ایسا کہوں جس میں اصلیت رہے اور موثر بھی ہو۔ غرض اس روز سے بیماری ہو یا صحت، سفر ہو یا گھر حتّٰی کہ بعض حوادث موت تک میں جہاں تک ممکن ہوا مرثیہ کے بند دس بیس برابر کہتا اور مشق کرتا رہا مگر جب دوسرے وقت پر دیکھا تو لچر و پوچ و مبتذل پاکر پھاڑ دیا اور کسی پر یہ ظاہر نہ کیا، اس درمیان میں میر صاحب، میر مونس اور بہت سے سخن شناس جنت نصیب ہو گئے، آخر ۱۹ برس بعد دو سو بند کا ایک مرثیہ حسب خواہ کہا۔"

انیسؔ برس کی کوشش کے بعد شادؔ نے جو مرثیہ کہا ہوگا وہ کیا کچھ ہوگا، آج یہ پتہ لگانا دشوار ہے کہ شادؔ کا پہلا مرثیہ کونسا ہے لیکن ان کے کلام سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شادؔ کی ان تھک کوششوں نے مرثیہ گوئی میں انھیں کس مقام پر پہنچا دیا ہے۔

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مجھ کو دو مشکلیں سخت پیش آئیں، ایک اُس نقص مذہبی و اخلاقی کو مٹانا جو مرثیوں میں دیکھا جاتا ہے اور سننے والے اس کے عادی اور اُسی سے مانوس و متاثر ہیں۔ دوسرے میر انیس مرحوم نے جو احاطہ کھینچا ہے اور دنیا بھر کے اعلیٰ مضامین کا دریا اس طریقہ سے بہا دیا ہے کہ تازہ مضمون پیدا کرنا محال ہو گیا ہے، اور بالفرض کوئی اقدام بھی کرے تو اس احاطہ سے باہر ہو کر مبتذل ہو جائے۔ غرض جہاں تک ہو سکا ان دونوں مشکلوں کو حل کرنے میں عمر گذر گئی تاکہ اہلِ سخن فقیر کے طرزِ مرثیہ گوئی کو سمجھ لیں۔"

اپنے طرز کو شاؔد نے نظم کر کے ایک مرثیہ کے چہرہ میں داخل کیا۔ اس سے متعلق اُنھوں نے مولف حیاتِ دبیر کو ایک خط لکھا تھا جنھوں نے یہ خط کتاب کے دیباچہ میں صفحہ ۳۹ پر درج کر دیا ہے۔ شاؔد نے اس میں لکھا ہے —— "میں نے ایک مرثیہ میں حدود مرثیہ کو تمہید میں نظم کر کے پڑھا جس کے بعض بند آپ کے سننے اور کتاب میں داخل کرنے کے قابل ہیں۔" بند یہ ہیں :

اے خضرِ شوق، راہِ حقیقت بتا مجھے
منزل پہ جو پہنچ گئے اُن سے ملا مجھے
جی جاؤں جس کی بُو سے وہ ساغر پلا مجھے
جویا ہے جس کی رُوح وہ عالم دکھا مجھے
آئینۂ مرقعِ صدق و صفا کہیں
وہ مرثیہ سُنا جسے سب مرثیا کہیں

باتیں ہوں اس طرح کی تجھے (تری) اے زباں پسند
سُن کر جنھیں کریں حکمائے زماں پسند
برسوں سنا کئے ہیں جسے وہ کہاں پسند
اب اہلِ بزم کو ہے نئی داستاں پسند
ذوقِ سخن میں ذائقۂ طبع کھو نہ جائے
اتنا نمک رہے کہ مزہ تلخ ہو نہ جائے

یہ بھی تو کچھ سمجھ کہ بلاغت ہے کس کا نام
جانے نہ پائے ہاتھ سے اصلیتِ کلام
آساں نہیں ہے لفظ و معنی کا انتظام
نظروں میں ہوں سُلے ہوئے سب موقع و مقام
تصنیفِ شعر کے لئے لازم شعور ہے

تقلیدِ بے محل سے کنارا ضرور ہے

داخل مبالغہ بھی محاسن میں ہے مگر اتنا نہ ہو کہ نقشِ مطالب کا ہو ضرر
باتیں وہ ہوں پسند کریں جن کو ذی تمیز آنکھوں کے آگے عین صداقت ہو جلوہ گر
اظہار مدعا میں کسی جا خلل نہ ہو
مطلب وہ کیا کہ جس کا کوئی ماحصل نہ ہو

مشکل ہے سب سے مرثیہ گوئی ہے جس کا نام آساں سمجھ لیا ہے زمانہ نے اب یہ کام
مذہب کی یہ بھی صنف میں داخل ہوا کلام لازم یہ ہے کہ دل سے کرے اس کا احترام
مدنظر وہ درد و غم جاں گزار ہے
گلدستۂ سخن نہ بنے مرثیا رہے

انیس و دبیر کے بعد بہار اور ساقی نامہ مرثیہ کی جان ہو گئے تھے، ان کے متعلق لکھتے ہیں:

جب دشتِ ماریہ میں خزاں ہو گئی بہار مرجھائے پھول گر گئے شاخوں سے برگ و بار
بے آب خشک ہو گیا زہرا کا لالہ زار بچوں میں العطش کی رہی تین دن پکار
باقی نہ جان تھی نہ لہو جسمِ زار میں
کیسی بہار، آگ لگا دو بہار میں

ہے یہ بیانِ واقعۂ شاہ خاص و عام جانے نہ پائے ہاتھ سے سر رشتۂ کلام
اس ضمن میں شراب ولا کا گر آئے نام بے جا کبھی نہ جام کے اوپر لنڈھائے جام
قطرے جو اس شراب کے ہوں خوب ناب ہوں
ساغر تو آنکھ میں ہو پر آنکھیں پُر آب ہوں

مرثیہ کے متعلق شاد کے خیال کو آپ نے دیکھ لیا جن پر ان کے مرثیوں کو پرکھا جا سکتا ہے۔

اس خیال کو شادؔ نے مجمل صورت میں بیان کیا ہے لیکن اس کی تفصیل ایک طویل نظم میں لکھی ہے یہ نظم اگست ۱۸۹۹ء کے معارف میں شائع ہوئی تھی۔ اجمال کی تفصیل کے لئے نظم کا ضروری اقتباس دیا جاتا ہے تاکہ شادؔ کی مرثیہ گوئی کو سمجھنے میں اور آسانی ہو جائے :

بہت ہیں نظم کے بارے میں مختلف رائیں　　کسی کا قول ہے کچھ اور کسی کا کچھ دعوا
کوئی تو کہنہ روش کو پسند کرتا ہے　　کسی کی طبع ہے طرز جدید کی شیدا
ہماری رائے ہے اس باب میں غرض کچھ　　خلاصہ اس کا ہم اس جا پہ کرتے ہیں املا

کہ سب سے بڑھ کے سخن میں ہے صنعتِ تشبیہ　　کئی اس کی ہیں اقسام منضبط ہر جا
ادیب لازم معنی پہ سب کے غور کرے　　کہ واسطے ہیں کم ان معنیوں میں یا کہ سوا
اگر ہیں لازم و ملزوم میں وسائط کم　　تو ایسی شکل سے تشبیہ میں ہے لطف سوا
وسائط اس میں بڑھیں جس طرح کثیر رماد[1]　　تو اس سے ہوگا پراگندہ فہم سامع کا
خلاصہ یہ کہ بہت دور کی نہ کوڑی لائے　　کہ سننے والوں کو اک انزجار ہو پیدا
یہی ہے رائے کنایات و استعارے میں　　کہ جس میں لطف نہ ہو اس سے اجتناب اولیٰ
اسی طرح جو صنائع خلاف فطرت ہوں　　کبھی لطیف نہیں نظم و نثر میں حاشا
اسی پہ ختم میں کرتا ہوں بحث معنی کو　　کہ ہیں بھی ایسے صنائع میں مختلف حکما
رہی صنائع لفظی تو وہ بھی ظاہر ہے　　کہ لفظ پر ہے مقدم لطافت معنیٰ
خلل صنائع لفظی سے جب ہو معنی میں　　تو اہلِ ذوق پہ لازم ہے ترک تام ان کا
نہ کہ لفظ میں ہو جائیں منہمک ایسے　　کہ اصل حاصلِ مضمون کی بھی نہ ہو پروا

---

[1] کثیر الرماد۔ بہت سی راکھ جمع رکھنے والا۔ جس کا مطلب ہے کہ آگ بہت جلتی ہے اور کھانا زیادہ پکتا ہے یعنی مہمان زیادہ آتے ہیں۔

جہاں تلک ہے مری دست گاہ اس فن میں — مجھے پسند ہے انداز اہلِ یورپ کا
قلم سے لیتے ہیں وہ لوگ مو قلم کا کام — اتار لیتے ہیں گویا ہو بہو نقشا
مبالغہ ہے نہ اغراق ان کے مضموں میں — وہ صنعتیں نہیں جو واقعی ہیں بے سروپا
وہ جانتے نہیں املی کا آم کر دینا — جسے سمجھتے ہیں معراج اِدھر کے سب شیدا
بیاں میں ان کے اثر خیز لفظ سب شیریں — کہ جس کے سنتے ہی سامع کو جوش ہو پیدا
بعینہ مگر اُن کی ضرور کیا تقلید — کہ مقتضیٰ بھی تو ہر ایک ملک کا ہے جدا
رہی یہ بات کہ اردو کی نظم کیسی ہو — کہ خاص و عام کے دل پر اثر کرے پیدا
تو اس میں رائے وہی ہے صاف صاف ظاہر ہے — سیاقِ نظم کو دیکھو میں کہہ رہا ہوں کیا
مذاقِ ملک کو سمجھے ضرورتیں دیکھے — کرے وہ امر جو ہو مقتضیٰ زمانے کا
محاوروں میں دل آویزی و متانت ہو — مفیدِ خلق ہو مضمون حاصلِ معنیٰ
بیاں کرے جو کوئی بات نظم میں اپنی — تو اصل حال کی تصویر کھینچ دے گویا

نظم اور مرثیہ کے متعلق شاؔد کے خیالوں کو جاننے کے بعد ان کے کلام کو ان اصولوں پر پرکھئے۔ شاؔد نے ان ہی پابندیوں کے ساتھ مرثیے کہے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں تصوف کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ تصوف شاؔد کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اُن کا پورا کلام بھی تصوف سے رچا ہوا ہے۔

نمونہ

میں خاکِ آستانۂ اہلِ کمال ہوں — میں دُرد نوش ساغرِ سحرِ حلال ہوں
گزرے ہیں دن ریاض میں دیرینہ سال ہوں — میں سوگوارِ عمرِ سریع الزوال ہوں
سالک کے کام آؤں جو رستے بتا دیں
بجھتا سا اک چراغ ہوں تاریک راہ میں

ہے پردہ دارِ رازِ حقیقت سخن مرا — بوئے بہشت دیتا ہے سارا چمن مرا

کیوں دیکھتی ہے غور سے منہ انجمن مرا — آدم ہوں، باغ خلد بریں ہے وطن مرا
نظارہ اس دیار کا آنکھوں کو بھا گیا
سیاح ہوں ادھر بھی سیاحت کو آ گیا

چپ اے زباں کہ جوشِ جوانی کا جا چکا — شوق اپنے دل سے سحر بیانی کا جا چکا
موسم خزاں میں زمزمہ خوانی کا جا چکا — آخر ہے رات وقت کہانی کا جا چکا
تھا جس کا ڈر پہاڑ سی وہ شب بسر ہوئی
آنکھوں کو کھول، چونک مسافر، سحر ہوئی

مہماں سرائے دہر میں اے دوست کیا نہیں — ایذا نہیں کہ سر پہ ہجوم بلا نہیں
کہہ دو یہ قیس سے کہ شکایت روا نہیں — لیلیٰ کا فعل لائق چون و چرا نہیں
رو رو کے خود کو موردِ خواری بنائے گا
کمل بھگو کے اور بھی بھاری بنائے گا

آوارگانِ کوئے وفا کا نہ پوچھ حال — کانٹے نکالیں پاؤں سے اتنی نہیں مجال
پیش نظر ہے منزلِ محبوب خوش جمال — کس پر ہیں یہ ستم ادھر آتا نہیں خیال
دل چور ہو کے جسم ہو ٹکڑے بجا ہے سب
اس چشم کا اگر ہو اشارہ روا ہے سب

رکھتے ہیں نینوائے محبت میں جب قدم — صدمہ نہ دھوپ کا ہے نہ زخموں کا دل کو غم
پانی ملے نہ راہ میں دو روز یک قلم — دم پیاس سے فنا ہو یہ ہوتا نہیں الم
جز نفع دیکھتے نہیں پہلو ضرر کا وہ
سمجھیں ہیں اس شکست کو مژدہ ظفر کا وہ

اے محو فلسفہ و آئینۂ حق نما حسین   لذت شناس نعمتِ صبر و رضا حسین
اے مرکزِ محیطِ فنا و بقا حسین   صورت نمائے حُسنِ صفاتِ خدا حسین
برتر جو عرش سے ہے ملی ہے وہ جا تجھے
تو نورِ حق ہے عالمِ سفلی سے کیا تجھے

جوں جوں تجھے ستاتے تھے درد و غم و ملال   ووں ووں خوشی سے ہوتا تھا چہرہ ترا بحال
کیا مطمئن تھا دل ترا اے فاطمہ کے لال   غیر از رضائے دوست نہ تھا اور کچھ خیال
صدیوں سے آب تھا جگر و دل جناب کا
اللہ رے صبر نام نہ تھا اضطراب کا

کس طرح اہل جہل سے ہوتے تھے ہم کلام   کیوں کر عدو سے لیتے سادات انتقام
کیا شے رضا ہے، صبر کا ہے کون سا مقام   عزم درست و ضبط و صداقت ہے کس کا نام
کٹوا کے حلق خود تو حضورِ خدا گئے
امت کو سیدھی راہ پہ لیکن لگا گئے

وہ مسکرا کے آنکھ اٹھانا سوئے سپاہ   نرمی کے وہ سخن وہ محبت بھری نگاہ
مقصود مرتے مرتے بھی اس قوم کی رفاہ   وہ دبدبہ، وہ شانِ امامت وہ عز و جاہ
موقع کے ساتھ غیظ بھی تھا اور خصم بھی تھا
الفت کی بھی نظر تھی جلال و حشم بھی تھا

وہ گہرے گہرے زخم وہ اُبلا ہوا لہو   وہ قلبِ مطمئن، وہ شہادت کی آرزو
وہ مشفقانہ پند، وہ دل جوئی عدو   لہجہ وہ جاں فزا، وہ فصیحانہ گفتگو
حیرت سے منہ کو تکتا تھا وہ خود گروہ بھی
وہ بردباریاں کہ ہو شرمندہ کوہ بھی

شاد کے مقررہ اصولوں پر ان کے مرثیہ کے یہ بند پورے اترتے ہیں۔ لفظ و معنی کا حسین امتزاج

شاؔد کے ہاں ملتا ہے وہ سوائے میر انیسؔ کے دوسری جگہ نہیں۔ تصوف کی چاشنی نے شاؔد کے اس مرثیہ کو انیسؔ سے بھی بلند کر دیا ہے۔ اُن کے مرثیہ میں "زار و نالی و نوحہ و زاری برخلاف استقلال و صبر" نہیں ملتا۔ امام حسین کے کردار اور کربلا کے واقعات کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ شہادت عظمیٰ کی حقیقت اجاگر ہو گئی ہے اور لطف یہ ہے کہ اس میں مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ اس بات کو نیچے کے بندوں میں ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جن سے کربلا کے واقعہ اور اس کے اخلاقی پہلو پر روشنی پڑتی ہے:

سلطان شرع و خسرو گیتی ستان دیں — شاہ زماں، خدیو جہاں، قہرمان دیں
مہر مبین دیں، قمر آسمان دیں — مصباح بزم مغفرۂ گمرہان دیں
شک ہو رہا کا وہم تھا وہ وہم بھی گیا
حضرت کے جان دینے سے اسلام جی گیا

پیدا ہوا نہ خلق میں ایسا کوئی شکور — حقا اُن ہی سے صبر نبی کا ہوا ظہور
دیتے نہ کربلا میں اگر امتحاں حضور — کافر یہ جانتے کہ ہے اسلام کا قصور
کہتے ہیں کس کو صبر، یہ سب کو بتا دیا
منکر کے دل سے نقصِ نبوت مٹا دیا

آمادہ اپنی مرگ پہ ہو جو فلک مقام — سن سن کے حرف سخت بہ نرمی کرے کلام
ہرگز نہ ہو عدو سے بھی خواہانِ انتقام — ایسا بجز حضور کے کس سے ہو یا امام!
عالم نہ اس کے حال پہ کیوں کر ہلاک ہو
قاتل کے جو مآل پہ افسوس ناک ہو

مولا کی ذات پاک ہے ایماں کا افتخار — آیا اُن ہی کے صبر سے اسلام میں وقار
اس ظلم پر رضا کو نہ کرتے اگر شعار — ہوتے جہاں میں معترض اس دیں کے بے شمار
تھا سامنا جناب کو سخت امتحان کا
دکھلا دیا جہاں کو شرف خاندان کا

لکھ لکھ کے خط بہ شوق تمنا جسے بلائیں — افسوس اس کے ساتھ عداوت پیش آئیں
سب مل کے اس کے قتل پہ یوں آستیں چڑھائیں — واحسرتا! غریب مسافر کو یوں ستائیں

بدلی ستم کی فوج کی مولا پہ چھا گئی
اے دہر تجھ پہ تف ہے، قیامت نہ آگئی

گرمی کی فصل اور وہ سولہ پہر کی پیاس — حلقے پڑے تھے چشم میں، تھا رنگِ رُخ اداس
خالی کٹورے لے کے بچے کھڑے تھے پاس — اب آئے گا، اب آئے گا، پانی یہی تھی آس

ممکن تھی ایک بوند نہ منہ میں چوانے کو
پانی کہاں تھا آگ لگی تھی زمانے کو

حد بیاں سے بڑھ کے ہیں شاہا ترے صفات — حقا کہ فرد دونوں جہاں میں ہے تیری ذات
ہنگام قتل کیا متزلزل تھے شش جہات — مولا مگر تھا تیرے قدم کو وہی ثبات

رخنہ خضوع میں تو دعا میں خلل نہ تھا
خنجر گلے پہ تھا مگر ابرو پہ بل نہ تھا

تڑپا جو کھا کے ظلم کی برچھی جواں پسر — پھر وہ پسر کہ جس پہ تھا عاشق تمام گھر
یوسف جمال، نورِ نظر، پارۂ جگر — جز شکر منہ سے کچھ نہ کہا آپ نے مگر

روکا نہ آپ کو قلق و اضطراب نے
برچھی کے پھل کو کھینچ لیا خود جناب نے

کھینچا گلے سے اصغر معصوم کے جو تیر — کاری بہت تھا زخم، قضا کر گیا صغیر
اس اپنی کارسازی پہ نازاں تھا وہ شریر — دنیا میں آج تک نہیں اس ظلم کی نظیر

لکھا ہے یوں کہ آپ کا چہرہ اُداس تھا
اپنا نہ تھا، نزول بلا کا ہراس تھا

امت کا دھیان آج تک ایسا کسے ہوا — ہوتے تھے ذبح لب پہ مگر تھی یہی دعا

یارب، بہ حق خونِ شہیدانِ کربلا اُمت پہ رحم کر کہ نہایت ہے پر خطا

قاتل پہ رحم کس نے کیا مشرقین میں

شیرِ خدا میں خلق یہ تھا یا حسین میں

نائے الٰہی اور پروردگار عالم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے حکم کی بجا آوری اور وہ بھی س طرح کہ شکوہ شکایت تو ایک طرف، کہیں ان کا شائبہ بھی نہیں ہوتا، اس دل لگتے اور دل گداز انداز ں پیش کرنا شاد ہی کا کام ہے۔ کربلا کی خونی داستان انسانی شرف اور سربلندی کی کہانی ہے، آخری تین بند ں کہانی کو اور زیادہ حسین بنا دیتے ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ بند جذبات کی صداقت اور سچی ترجمانی کے ظہر ہیں۔ یہ مصرع

واحسرتا! غریب مسافر کو یوں ستائیں

ے بڑے مرثیوں پر بھاری ہے، "یوں" کا لفظ اتنی اچھی اور خوب صورتی کے ساتھ مصرع میں کھپا ہے جو عموماً نہیں ہوتا۔

چھٹے بند کی منظر کشی بہت کامیاب ہے، پیاس کی شدت اور اس کے ساتھ پانی کی نہ پوری ہونے والی س اور وہ بھی بچوں کی، بہت دل گداز ہے۔ زبان کُھلی ہوئی ہے اور محاورے اپنی جگہ پر مصرعوں کے سن کو دوبالا کر رہے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر صداقت کلام اور مبالغہ سے دامن بچائے رکھنا، اور الکلامی کی بہت اچھی مثال ہے۔

شاد کا یہ کمال مرثیہ کے دوسرے موضوعوں میں بھی اسی طرح نظر آتا ہے۔ منظر نگاری، رخصت، تلوار وڑا، ساقی نامہ وغیرہ میں حقیقت کو ہاتھ سے نہ دینا اور پھر اصل حُسن کو باقی رکھنا شاد جیسے قادر الکلام ستاد ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ان نمونوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے:

منظر کشی

وہ شورِ آمد آمدِ سلطانِ کج کلاہ اُٹھ اُٹھ کے زر لٹاتے تھے ذرّے میانِ راہ

نیزے کرن کے لے کے بڑھی نور کی سپاہ مجرا پکارنے لگا بڑھ کر نقیبِ ماہ
پھیلی ہوئی تھی بن کی ضیا کوہِ طور تک
تھی چاندنی بچھی ہوئی میداں میں دور تک

وہ نیل گوں فلک تو وہ نورِ رخِ سحر لکھی ہوئی تھی آیت واللیل والقمر
پے جبۂ شفق نے جو کھینچا فلک پہ سر کھولا گیا خزانۂ لعل و دُر و گہر
کثرت جو مال و زر کی ہوئی تنگ ہو گیا
آخر خزانہ دارِ فلک دنگ ہو گیا

وہ گرمیوں کی صبح وہ جھونکے ہوا کے سرد وہ دشت، وہ درخت سب اپنی جگہ پہ فرد
وہ رنگتیں ببول کے پھولوں کی زرد زرد وہ کربلا کی خاک کہ اکسیر جس سے گرد
تھا گُل وہ کون سا کہ جواہر رقم نہ تھا
سبزہ بھی اپنے رنگ میں پنّے سے کم نہ تھا

تھا خلعتِ بہار سے ہر نخل سبزہ پوش سنبل کی کاکلیں بھی لٹکتی تھیں تا بہ دوش
گل مسکرائے پڑتے تھے تھا کم سنی کا جوش جنباں تھے برگ صورتِ آویزہ ہائے گوش
سبزے پہ اوس تھی کہ گہر شرم سار تھے
گردن میں نوخطوں کی جواہر کے ہار تھے

سیلاب کی طرح جو بڑھی تاب آفتاب بہہ بہہ کے ٹوٹنے لگے انجم کے بھی حباب
گھیرے ہوئے تھے چار طرف نور کا سحاب ہر نخل منہ پہ ڈالے ہوئے تھا تنک نقاب
جلوہ تھا حسن خیز سحر کے ظہور کا
غازہ تھا ہر نہال کے چہرے پہ نور کا

وہ ہر طرف فرات کی موجوں کا پیچ و خم تھا سطحِ آب تختۂ سیماب سے نہ کم

پانی میں تھی لطافت سر چشمۂ ارم — قطرے تھے یا کہ گوہر و الماس تھے بہم
مینائے نقرئی جو نکالے حباب نے
سونا چڑھا دیا ورق آفتاب نے

ریگ زار کربلا میں صبح کا منظر، ذروں کا اُٹھ اُٹھ کے زر لٹانا، گلوں کا کم سنی کے جوش میں مسکرا پڑنا، پتیوں کا آویزہائے گوش کی طرح ہلنا اور آخری بند کا ٹیپ، ایسی تصویریں ہیں جو کسی زبان کے ادب میں بلند جگہ پاسکتی ہیں۔ شاد نے مشرقی طرز ادا کے ساتھ صداقت واقعہ کو جس طرح نباہا ہے اُسے محسوس کیا جاسکتا ہے، لفظوں میں بیان کرنا دشوار ہے:

تلوار

کچھ تھم کے یوں چلی وہ عدو کش، قضا نظیر — سن سے نکل کے تخت کمانوں سے جیسے تیر
کھینچی چمک نے دور تک اک نور کی لکیر — جھنکار نے بلند کیا شور دار و گیر
اس چال پر نثار ہر اک حیلہ ساز تھا
اپنی ادا پہ خود بھی جفا جو کو ناز تھا

اللہ ری جاں شکاری و انداز دلبری — ہر جا تھا غل کہ تیغ کے پیکر میں ہے پری
مشہور تھی زمانہ میں اس کی ستم گری — اس پر بھی خون ناحق انساں سے تھے بری
پہلے تو سن سے رو میں سوئے حلق جھک گئی
مانگی اماں جب اس سے تو خط دے کے رک گئی

بجلی سی کوندتی نظر آئی نکل گئی — مہماں سرائے تن میں در آئی نکل گئی
سر میں سمائی، تا کمر آئی، نکل گئی — گھوڑے کو کاٹتی اتر آئی نکل گئی
ہر دم نئی ادا تھی جفا جو کی چال میں
مچھلی تڑپتی پھرتی تھی لوہے کے جال میں

آتش مزاج و خود سر و پر خشم و تند خو　　سحر آفرین و لعل لب و دست و خندہ رو
خوں خوار و ظلم دشمن و عیار و کینہ جو　　ہر دم لئے ہوئے ہوئے آپ اپنی آبرو
عدل اس کے ساتھ امن و اماں اس کے ساتھ ہے
یہ جس کے ہاتھ میں ہے جہاں اس کے ہاتھ ہے

گھوڑا

کج دیج میں ہے جلالتِ شانِ ید اللہی　　گھوڑا دکھا رہا ہے شکوہ شہنشہی
کرتی ہے کیوں نسیم سحر اس کی ہم سری　　جاتی رہے گی اور بھی ہمت رہی سہی
اپنی بھی چال کو نہ کہیں بھولنے لگے
ایسا نہ ہو کہ راہ میں دم پھولنے لگے

وہ جوڑ بند اور عربی ساز کا بناؤ　　نور آئے آنکھ میں قدم اس کے اگر لگاؤ
خشکی پہ یوں بہاؤ پہ طوفاں میں جیسے ناؤ　　مُردوں میں روح آئے جو دیکھیں یہ آؤ جاؤ
دھوپ اک ذرا کڑی جو پڑی بس ہوا ہوا
سایہ بھی ڈھونڈتا ہے کہ رہوار کیا ہوا

جوزا عناں و نجم خط و مشتری حشم　　کوکب مثال و زہرہ جبین و قمر قدم
بے بعد بھی ہو جو بُعد مراحل تو کیا ہے غم　　طے کر چکا ہے دشت حدوث و رہ قدم
ناپے ہوئے ہے قصرِ فلک کے بُرج کو
روح الامیں سے پوچھئے اس کے عروج کو

مرثیہ میں تلوار اور گھوڑے کے خاص مقام ہیں۔ کلاسیکل مرثیہ ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ شاعر نے اس کی تکمیل کی ہے۔ تلوار کی تعریف میں پہلا اور آخری بند اور گھوڑے کی تعریف میں پہلا بند، الفاظ و معنی اور

مزاج کے لحاظ سے بلند مرتبہ ہیں :

ساقی نامہ

ساقی سوا ہو جس سے بصیرت وہ مے پلا ‏ ‏ ‏ ‏ روشن کرے جو چشمِ حقیقت وہ مے پلا
افزوں ہو جس سے نشۂ وحدت وہ مے پلا ‏ ‏ ‏ ‏ دل پر جو وا کرے درِ رحمت وہ مے پلا
ساغر جو ڈگ ڈگا کے پیوں جھومنے لگوں
اُٹھ اُٹھ کے مے کشوں کے قدم چومنے لگوں

ساقی ترے فدائے عرفاں پلائے جا ‏ ‏ ‏ ‏ بس بس کا لے نہ نام مری جاں پلائے جا
کچھ دن تک اور ہوں ترا مہماں پلائے جا ‏ ‏ ‏ ‏ نیت بھری نہیں، ترے قرباں، پلائے جا
اتنی تو اب انڈیل کہ دریا بہاؤں میں
تیرتا ہوا یہاں سے اسی مے میں جاؤں میں

ساقی مجھے کشاکشِ ہستی سے دے نجات ‏ ‏ ‏ ‏ سمجھوں کہ خوابِ مرگ ہے سرمایۂ حیات
پہنچا دے اس جگہ کہ جہاں دن ہو اور نہ رات ‏ ‏ ‏ ‏ کم تر ہو ایک ذرے سے جس جا یہ کائنات
حقا، وہی تو مامنِ اہلِ نیاز ہے
کیوں کر نہ ہوں خموش کہ سربستہ راز ہے
سو کیف لا رہا وہ مے مجھے بے اشتباہ دے ‏ ‏ ‏ ‏ قطرہ ہر اک بشارتِ عفوِ گناہ دے
اس دورِ بے پناہ میں دم بھر پناہ دے ‏ ‏ ‏ ‏ تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی نباہ دے
گزرے خمار میں بھی اسی آن بان سے
نکلوں جو میکدے سے تو مستوں کی شان سے

ساقی نامہ مرثیہ کا اہم جزو ہو چکا ہے، لیکن اس میں بھی شاد کی انفرادیت جھلک رہی ہے، شرابِ عرفان

کے زندگی بھر ستاتے رہے۔ اسی رنگ کو ساقی نامہ میں سمویا ہے۔ حق بھی یہ ہے کہ شاد کے نظریہ کے مطابق یہی رنگ اُن کے ساقی نامہ میں کھپ بھی سکتا تھا۔

شاد کے مرثیوں میں فلسفہ اور تصوف کی چاشنی اکثر ملتی ہے، اُن سے انھیں گہرا لگاؤ تھا ایک خط میں لکھتے ہیں:

"چار سو بند کا ایک مرثیہ کہا جس کے آغاز میں بہ طور مقدمہ دو سو بندوں میں
فلسفۂ مذہب کو بہ ترکیب جدید بیان کر کے شہادت امام حسین کو رزم و
بزم کے ساتھ نظم کیا۔"

اس سب کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاد کے کلام میں قدیم و جدید کی لطیف آمیزش ہے۔ وہ قدیم کی اچھائیوں اور جدید کی خوبیوں کو ملا کر کلام میں نئی راہ پیدا کر لیتے ہیں اور اس کو بڑے حسین انداز میں نبھا بھی لیتے ہیں۔ مرثیہ گوئی میں اُنھیں دوسرا انیس کہہ سکتے ہیں، بعض حیثیتوں میں وہ انیس سے بھی بلند ہیں۔ مرثیہ کے قالب میں انھوں نے نئی روح پھونکی، مرثیہ کو نیا انداز بیان عطا کیا اور اس میں فکر کی چاشنی ملائی اور اس کو زبان اور بیان کے انداز سے حسین تر بنا دیا۔

شاد کی علمی معلومات بہت وسیع تھیں ان کے خطوں سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جن میں اکبر الہ آبادی، میر نفیس، اقبال اور سر عبدالقادر کی فنی امدادوں کے تذکرے ہیں لیکن ان میں مولانا حالی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر حیرت اس لئے ہوتی ہے کہ حالی نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ شاد لکھتے ہیں:

"شاید ۱۸۸۸ء میں جب کہ میں دہلی گیا تھا، مولوی حالی مرحوم نے مجھ سے چند بند مولود کے سنے، وہ ایسے متاثر ہو گئے کہ میں کیا عرض کروں۔ پہلے وہ مرزا دبیر کے طرز کو پسند کرتے تھے چناں چہ اپنے دیوان کا مقدمہ جو سنایا تو مرزا دبیر کے کلام کی ترجیح میر صاحب پر صاف تھی۔ میں نے برابر دو دنوں تک میر صاحب کا کلام شستہ شستہ کر رستہ پر لگایا، میر صاحب کے مرثیے دئے، مجھ پر اصرار کیا کہ اس حصہ کو تم ہی لکھ دو، چناں چہ مقدمہ دیوان حالی میں یہ حصہ

قریب قریب میرا لکھا ہوا ہے۔"

اگر یہ صحیح ہے تو شاؔد کے بلند مرتبہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ مرکز سے دور رہنے کی وجہ سے اس صاحب علم و فن کی وہ قدر نہ ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔

انیسؔ ۱۹ برس کی لگاتار کوشش نے شاؔد کو مرثیہ گوئی کے قابل بنایا مگر اس ریاض نے انھیں اس فن کا مجدد بنا دیا۔ شاؔد نے بگڑنے اور بگڑتے ہوئے ذوق کو انیسؔ کی طرح پھر سدھارا، مرثیہ کی شکل و صورت کو سنوارا اور مرثیہ گوئی کو نئی ڈگر پر لگا دیا۔ ادب پر یہ اُن کا بڑا احسان ہے۔

ادیب مالیگانوی

غزل

اس چمن میں کبھی ایسی بھی فضا ملتی ہے
پھول ہنستے ہیں تو ہنسنے کی سزا ملتی ہے

دردمندانِ محبت سے یہ کہہ دے کوئی
کوئے قاتل سے گذرگاہِ وفا ملتی ہے

کر دیا مصلحتِ وقت نے اتنا محتاط
لالہ و گل سے دبے پاؤں صبا ملتی ہے

کس قدر شوخ ہوا خونِ تمنّا میرا
اب تو اس سے ترے ہاتھوں کی حنا ملتی ہے

اختر انصاری دہلوی

یک نہ شد دو شد

(ایک پُراَسرار کہانی)

چند روز قبل ایک نجی کام سے میں نے ایک مختصر سا سفر کیا۔ پڑوس کے ایک قصبے میں میری ایک رشتہ کی بہن رہتی ہیں، کیونکہ وہاں ایک گلاس فیکٹری میں اُن کا لڑکا اسسٹنٹ انجینیر ہے۔ آدھ گھنٹے کا بس کا سفر اِدھر سے، آدھ گھنٹے کا اُدھر سے، اور گھنٹہ دو گھنٹے کا وہاں کا قیام! صبح کو روانگی کے وقت میں نے سوچا تھا کہ دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔ مگر وہاں ایک عجیب و غریب واقعے سے دوچار ہوا۔ اور دوپہر تک واپس پہنچنا کیا معنی، مجھے رات بھی وہیں گزارنی پڑی اور بالآخر دوسرے دن صبح کو بھانجے نے اپنے کسی انجینیر دوست کی کار میں ساتھ خیریت کے گھر پہنچایا۔ گھر پہنچنے پر میرے ذہن میں صرف دو باتیں تھیں۔ ایک تو وہ واقعہ جو سفر میں پیش آیا اور دوسرے یہ خواہش کہ جلد سے جلد آغا صاحب سے ملاقات ہو تاکہ میں بلا کسی مزید تاخیر کے سفر کی رُوداد اُن کو سُنا کر ان کی کچھ ذہنی تواضع کروں اور جی بھر کر اُن کی خبر لوں۔

آغا صاحب تقریباً پچیس سال سے میرے یہاں آتے جاتے ہیں۔ پہلے اُن کا پھیرا بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہفتہ وار ہوا کرتا تھا۔ پیر کے دن آتے تھے اور شام کے چھ سات بجے سے لے کر رات کے بارہ ایک بجے تک جمتے تھے۔ پیر کے دن اس لیے کہ منگل کے روز شہر کا بازار بند رہتا ہے اور وہ اُس زمانے میں شہر کی ایک دوکان پر کام کرتے تھے۔ چنانچہ اگلے روز کی چھٹی کا سہارا لے کر پیر کی رات کا تقریباً نصف یا نصف سے کچھ زیادہ حصہ وہ میرے ساتھ گزارتے تھے۔ اور گھنٹوں اُن کے ساتھ گپ بازی کا شغل رہتا تھا۔ ہفتہ

بھر کے واقعات معرضِ گفتگو میں آتے تھے اور دنیا بھر کے موضوعات پر دو طرفہ اظہارِ خیال ہوتا تھا۔ میں نے ہفتہ بھر کی سات راتوں میں سے ایک رات ان کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ وہ ایک رات تو اب بھی ان کے لیے وقف ہے لیکن اب پیر کے دن کی کوئی قید نہیں ہے۔ اب پانچویں چھٹے یا ساتویں آٹھویں دن جب کہ اُن کا موڈ ہوتا ہے اور آنا ممکن ہوتا ہے آجاتے ہیں۔ اس تبدیلی کا باعث ایک تو یہ کہ اب وہ شہر کی دوکان پر کام نہیں کرتے اور پیر یا منگل کی کوئی اہمیت اب ان کے لیے باقی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ وہ میرے یہاں ادبدا کے پیر کے روز ہی آتے تھے اس لیے میرے دوستوں کے حلقے میں ان کو شیخ پیرو کے نام سے پکارا جانے لگا۔ پھر شیخ پیرو سے بگڑ کر ان کا نام شیکسپیر ہو گیا۔ (خواہ اُس مشہور ڈراماٹسٹ کے ساتھ یہ نہ ہوا ہو، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے) پھر شیکسپیر کے ساتھ لوگوں نے علامہ کا سابقہ نتھی کر دیا۔ اور یوں آغا صاحب علامہ شیکسپیر کہے جانے لگے۔ تو کچھ تو اس قسم کے فضول نام سے بچنے کے لئے اور کچھ اس لیے کہ اب وہ ہفتہ وار چھٹی کا سوال ہی ختم ہو گیا، اِدھر برسوں سے وہ کسی مقررہ دن کی پابندی کے بغیر آتے ہیں۔ مگر آتے بدستور ہیں۔

آغا صاحب کے ذکر میں دو باتیں خاص طور پر کہنی چاہوں گا۔

پہلی بات تو یہ کہ آغا صاحب سخت ملحد قسم کے آدمی ہیں۔ برسوں پہلے چڑھتی جوانی کی عمر میں انھوں نے خدا کے تصور کو اپنے نظامِ فکر سے خارج کر دیا تھا اور آج تک بڑی مضبوطی کے ساتھ اسی مسلک پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ عقلیت اور عقلیت پسندی کے علم بردار ہیں اور سائنسی طرزِ فکر پر جان دیتے ہیں۔ مثلاً ابھی چند روز پہلے اخبارات میں ایک خبر چھپی کہ کراچی میں ڈھائی سال کی ایک بچی کا انتقال ہوا۔ انتقال کے دوسرے یا تیسرے دن بچی کی ماں کو خواب میں ایک بزرگ نظر آئے جنھوں نے غم کی ماری بدنصیب عورت کو یہ بشارت دی کہ جا، تیری بچی زندہ ہے۔ قبر کھود کر نکال لے۔ وہ عورت سو کر اٹھی تو اس نے گھر والوں سے اپنا خواب بیان کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ قبر کو کھول کر دیکھا جائے۔ اُس نے کہا، کیا عجب ہے کہ اللہ میاں کو میرے اوپر ترس آ گیا ہو اور میری لاڈلی سچ مچ زندہ ہو، اور مجھے دوبارہ مل جائے۔ سب نے اس کی خواہش کا مذاق اُڑا لیا اور اس کی باتوں کو ایک دکھیاری ماں کا پاگل پن سمجھا۔ مگر وہ اپنی بات پر اَڑی رہی، اور جب کسی کو

اپنا ہمدرد و ہم خیال نہیں پایا تو رونا پیٹنا شروع کیا اور آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بالآخر لوگ بے بس ہو گئے اور یہ فیصلہ ہوا کہ اس کی ضد پوری کر دی جائے۔ قبر کھودی گئی، اور ــــ سدا رہے نام اللہ کا! لوگوں نے دیکھا کہ بچی مزے سے قبر میں لیٹی ہوئی انگوٹھا چوس رہی ہے۔ جسے خدا رکھے اسے کون چکھے والی بات ہوئی۔ سب کے دل جذبۂ عبودیت سے معمور ہو گئے اور خدائے ذوالجلال کی ہیبت سے ہر شخص لرزہ براندام ہو گیا۔ نظریں یکبارگی آسمان کی جانب اٹھیں اور کانپتے ہوئے ہاتھ دعاؤں کے لیے بلند ہوئے۔ بے اختیار ہر زبان سے کلمۂ لا الٰہ کا ورد جاری ہو گیا۔ کچھ دیر یہ کیفیت طاری رہی۔ پھر اللہ کا نام لے کر جھکے اور قبر میں ہاتھ ڈال کر بچی کو اٹھا لیا۔ اور حمد وثنا کے گیت گاتے ہوئے گھر لے آئے۔ ماں کی اجڑی ہوئی کوکھ آباد ہوئی اور قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کا ایک اور بدیہی ثبوت فراہم ہوا۔ یہ تھا وہ حیرت انگیز واقعہ جو ایک روز صبح کے اخبار نے پڑھنے والوں کے کانوں تک پہنچایا۔

اس کے دوسرے یا تیسرے دن آغا صاحب میرے یہاں آئے۔ گفتگو کے دوران میں میں نے ان کو سنایا۔ وہ ہوں کر کے خاموش ہو گئے۔ میں نے کہا، "جناب جس دن یہ خبر اخباروں میں آئی اس کے دوسرے دن اِسی سلسلے میں یہ خبر بھی چھپی کہ کراچی کے ایک ڈاکٹر نے بچی کا طبی معائنہ کیا۔ اخبار نے اس ڈاکٹر کا نام بھی دیا تھا جو مجھے اب یاد نہیں ہے۔ اس ڈاکٹر نے یہ رائے ظاہر کی کہ در اصل بچی کی موت واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کو محض سکتہ ہو گیا تھا اور غلطی سے اُسے مردہ سمجھ کر دفن کر دیا گیا۔ پھر چونکہ قبر کا پتھر اس کے جسم سے کچھ فاصلے پر تھا اور قبر کی مٹی نرم تھی اس لیے کچھ آکسیجن اندر موجود رہی جس نے بچی کو زندہ رکھا۔ ڈاکٹر نے مزید کہا کہ یہاں تک تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ بچی کا دفن ہو جانے کے بعد زندہ رہنا سمجھ میں آتا ہے اور کوئی غیر معمولی یا پُراسرار بات نہیں ہے۔ باقی رہا بزرگ کا خواب میں نظر آنا اور بچی کے بارے میں ماں کو بشارت دینا تو یہ بے شک ایک کرامت ہے۔"

میرے اس بیان پر آغا صاحب بولے، "یہ در اصل ماں کی شدید مامتا تھی جس نے خواب میں بزرگ کا روپ دھار لیا۔ شدید مامتا اور گہرے رنج وغم کے دباؤ کے تحت اس کے دماغ نے اس امر کا ادراک کر لیا تھا کہ بچی زندہ ہے اور دوبارہ اس دنیا میں آسکتی ہے۔" "اصل یہ ہے"، انھوں نے مزید

فلسفہ بگھارتے ہوئے کہا کہ انسانی دماغ تو بڑی عجیب و غریب چیز ہے اور اس میں نہایت پراسرا
اور حیرت انگیز طاقتیں پوشیدہ ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان مستقبلِ بعید میں پیش آنے والے
واقعات سے باخبر ہو جاتا ہے اور وقت آنے پر وہ واقعات بالکل اسی طرح رونما ہوتے ہیں جس
طرح ان کا ادراک قبل از وقت کیا گیا تھا۔ آپ کسی نیورو فزیالوجسٹ سے بات کیجیے۔ وہ آپ کو بتا
گا کہ انسانی دماغ کی قوتیں اتنی بے پناہ اور اس درجہ بے حد و حساب ہیں کہ آج تک دنیا کے کسی ذہین تر
یا عقل مند ترین آدمی نے بھی اپنے دماغ کی تمام قوتوں سے کام نہیں لیا۔ اور عام لوگ تو زیادہ سے
زیادہ دس پندرہ فیصدی صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں۔ باقی صلاحیتیں یونہی بے کار و بے مصرف خوابیدہ
حالت میں پڑی رہتی ہیں اور موت واقع ہونے پر انسان کے ساتھ قبر میں دفن ہو جاتی ہیں۔" اس موضوع
پر بہت دیر تک آغا صاحب سے بات چیت ہوتی رہی۔ مگر اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ
میرا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ آغا صاحب کس طرح سوچتے ہیں اور ان کا سائنسی طرز فکر کس طرح
کام کرتا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو حقیقت امر کچھ اور ہی ہے۔ بھلا اس شخص سے کون جیت سکتا ہے
جسے نہ زندگی سے کوئی لالچ ہو نہ موت کا کوئی خوف۔ آغا صاحب بیوی بچوں کے جھنجھٹ سے آزاد ہیں
معاشی مسئلہ بھی ان کے لیے وجود نہیں رکھتا۔ سات آٹھ مرفہ الحال بھائیوں میں سب سے چھوٹے
بھائی ہیں۔ رہنے کے لیے پشتینی مکان کا ایک کمرہ اور کھانے کے لیے دو وقت کی روٹی بے غل و غش ہمیشہ
ان کے لیے موجود ہے، اور ان موروثی حقوق کے چھن جانے یا تخفیف میں آجانے کا بظاہر کوئی سوال
پیدا نہیں ہوتا۔ گھر میں یا گھر سے باہر کوئی ان سے یہ پوچھنے والا نہیں ہے کہ تم کچھ کماتے بھی ہو یا نہیں اور اگر
کماتے ہو تو کس طرح اور کہاں خرچ کرتے ہو۔ سگریٹ وہ نہیں پیتے۔ پان کو آج تک منہ نہیں لگایا
چائے سے بھی کوئی خاص شغف نہیں۔ جوانی میں شراب مرغوب نہیں، محض گوارا تھی۔ وہ بھی دوسروں
کی خاطر۔ اب سونگھتے بھی نہیں۔ کوئی پچھاڑ کے بھی پلا دے تو قے کر دیں۔ کسی زمانے میں عورتوں سے
دلچسپی لیتے تھے اور محبوباؤں کے قصے سنایا کرتے تھے۔ لیکن اب برسوں سے وہ باب بھی بالکل بند
کبھی بھولے بھٹکے سے کسی طوائف کے بالاخانے پر بھی چڑھ جاتے تھے۔ مگر اب وہ بالاخانے ہی منہدم

ہو گئے اور ادھر یہ بیچارے خود بھی انہدام کے دور سے گزر رہے ہیں۔ لوگ طرح طرح کی علتیں پال لیتے ہیں۔ کسی کو لذیذ کھانوں کا شوق ہے۔ کوئی بڑھیا جدید الوضع لباس پر جان دیتا ہے۔ کسی کے سامنے یہ مطمحِ نظر ہے کہ دولت اکٹھی ہو تو دنیا کے خوبصورت اور قابل دید مقامات کی سیر کی جائے۔ کوئی اس ارمان کی پرورش کر رہا ہے کہ خدا وہ وقت لائے کہ ایک شاندار و خوش نما مکان بنے جو فریج اور ریڈیوگرام اور ٹی وی سٹ سے آراستہ ہو، جس کے گیراج میں ایک حسین وجمیل کار کھڑی رہا کرے، اور جس کے ڈرائنگ روم کی فضا کسی طلسماتی پرستان کی فضا سے کم نہ ہو۔ کوئی محض دولت کا پرستار ہے اور چمڑی جائے دمڑی نہ جائے کے اصول پر عمل پیرا ہو کر شب و روز زر اندوزی کے شغل میں مصروف ہے اور اس امر کی طرف سے بالکل بے نیاز کہ اس کی خست اس کے چہرے اور حلیے کو مکروہ سے مکروہ تر بناتی چلی جا رہی ہے اور وہ لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ سامانِ عبرت بنتا جا رہا ہے۔ ہمارے آغا ان تمام علتوں سے یکسر آزاد ہیں۔ پھر خدا سے لو لگا تو وہ لگائے جس کو اپنی زندگی کے ارمانوں کو پورا کرنے کا شوق ہو، یا وہ جسے شب و روز یہ اندیشہ لاحق ہو کہ اگر میں اللہ کو پیارا ہو گیا تو یہ نصف درجن بچے کیا کریں گے اور کہاں جائیں گے اور فلاں بھی جو سدا کی مریضہ ہے اور مسلسل علاج کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اس کا کیا حشر ہوگا۔ آغا صاحب کو اس نوع کے کسی مسئلے سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک اکیلی جان ہے جس سے محروم ہو جانے پر وہ ہر وقت آمادہ ہیں۔ اب کسی سے اُن کا کچھ بگاڑا جائے تو بگاڑ لے۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی مابعد الطبیعاتی گفتگو میں وہ میرے دلائل سے زچ ہو کر پھٹ ہی تو پڑے اور بولے، "صاحب! اگر خدا ہے تو بے شک ہو، اور نہیں ہے تو شوق سے نہ ہو۔ میرے اوپر اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور اگر پڑتا ہے تو مجھے اُس کی پروا نہیں۔"

چلو قصہ ہی ختم ہوا۔ اِس جائزے کو ختم کرنے سے پہلے آغا صاحب کے بارے میں یہ اور بتا دوں ——— اور یہ کہتے ہوئے میں سچ مچ اپنے سر کو احترام سے جھکتا ہوا محسوس کرتا ہوں ——— کہ اگر اس شخص کے دل میں واقعی کسی چیز کی تڑپ ہے تو وہ علم اور صرف علم ہے۔ کتابوں سے ان کا عشق جنون کی حدوں کو چھوتا ہے۔ اور اُن کا مطالعہ ادبیات کے مختلف شعبوں سے لے کر علومِ صحیحہ کی بیشتر شاخوں

تک پھیلا ہوا ہے۔ اُن کی تعلیم اور پھر ان کے ذاتی مطالعے کا انداز ہی کچھ ایسا رہا کہ وہ آرٹ اور سائنس دونوں سے یکساں شغف رکھتے ہیں۔

آغا صاحب کے سلسلے میں دوسری بات مجھے یہ کہنی تھی کہ اب چونکہ میری اُن کی ملاقات پر ایک چوتھائی صدی کی مدت گزر چکی ہے اس لیے تکلف اور رسمیت کے عناصر اِس دیرینہ تعلق سے بالکل خارج ہو چکے ہیں۔ وہ آتے ہیں۔ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ تسلیم و آداب کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتے۔ اندر پہنچ کر ایک کرسی میں دھنس جاتے ہیں اور سامنے میز پر پڑے ہوئے ہند و پاکستان کے اکناف سے آنے والے ادبی رسائل میں سے کوئی رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دیتے ہیں۔ میں اُن کے آتے ہی اپنا کام سمیٹ کر ایک طرف کر دیتا ہوں اور ان کی جانب رُخ کر کے بیٹھ جاتا ہوں۔ میرا گفتگو کا سلسلہ خود بخود شروع ہو جاتا ہے جس پر وہ رسائل کی ورق گردانی کے دوران میں ہوں ہاں کرتے رہتے ہیں۔ کبھی میری کسی بات پر ذرا سا ہنس دیئے۔ کبھی بزرگانہ شفقت سے کام لیتے ہوئے محض مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ ہاں، میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا تھا کہ آغا صاحب کسی زمانے میں میرے شاگرد بھی رہے ہیں۔ لیکن اب میری اُن کی ملاقاتوں میں اُن کا انداز بزرگانہ اور میرا کسی قدر برخوردانہ ہوتا ہے۔ کئی کئی گھنٹوں کی ملاقات میں وہ لبا اوقات میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ صبح کو شیو کرتے وقت میری مونچھوں کی تراش خراب ہو گئی۔ میں نے ٹھیک کرنے کی کوشش کی تو معاملہ اور بھی بگڑ گیا۔ آخر میں نے جلا کے مونچھوں پر استرا پھیر دیا۔ اور کچھ دنوں کے لیے اس کھکیڑ ہی سے آزاد ہو گیا۔ اسی دن شام کو آغا صاحب آئے۔ جب ملاقات ختم کر کے جانے لگے تو میں نے کہا، "تم نے میرے چہرے میں کوئی تبدیلی نہیں پائی؟" اِس پر انھوں نے نظر بھر کر مجھے دیکھا اور مونچھوں کی غیر حاضری پر مسکرا دیئے۔ کوئی بچہ کاغذ کی گاندھی کیپ بنا کر اپنے سر پر منڈھ لے اور آپ کے پاس داد وصول کرنے کے لیے آئے تو آپ جس مربیانہ انداز میں مسکرا کر اُس کو داد دیں گے، کچھ وہی انداز آغا صاحب کی مسکراہٹ کا تھا۔ بہر حال مسکراہٹ کا تحفہ عنایت کر کے وہ رخصت ہو گئے۔

اب یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جس دن میں اپنے مختصر سفر کے بعد گھر پہنچا اسی دن شام کو آغا

جب کا آنا ہوا۔ میں اُن سے ملنے کے لئے بیتاب تو تھا ہی۔ دیکھتے ہی جی خوش ہو گیا۔ وہ آتے ہی اپنی
میں کرسی پر ڈھیر ہو گئے اور سامنے پڑے ہوئے رسائل کے ورق اُلٹ پلٹ کرنے لگے۔ میں بھی سنبھل
ڈ گیا اور حملے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔ اور ایک سگار سلگا کر دو چار کش لیے۔ پھر اُن کی طرف دیکھ کر
مارا جس کا انھوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ پھر میں نے ایک زور دار ہوں کی آواز نکالی۔ اس پر بھی ان کے
کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی اور وہ رسالوں کی اُٹھا پٹخ میں معروف رہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا،
ا کے بچے! میں آج تیرا دماغ درست کر دوں گا اور تیری خود اعتمادی کے غبارے میں اس طرح چھید کر دوں
وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پچک کر رہ جائے گا۔ تو ذرا ٹھیر تو سہی!" اس کے بعد میں شروع ہو گیا۔
"کیوں بھئی آغا!" میں نے کہا، "تم خارقِ عادت امور پر اعتقاد رکھتے ہو؟ میرا مطلب بھوت پریت
ت، آسیب اور بزرگوں کی کرامات وغیرہ چیزوں سے ہے۔"
آغا نے کچھ اس طرح منہ بنایا اور کچھ اس انداز سے اونہہ کی آواز نکالی گویا میں نے اُن سے یہ پوچھا
تم نے کبھی گلی ڈنڈا کھیلا ہے یا کبڈی وغیرہ سے دلچسپی لی ہے۔
چنانچہ میں نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا، "تم نے وہ قصہ تو سنا ہو گا یا پڑھا ہو گا جس کو دنیا
سب سے چھوٹی گھوسٹ اسٹوری خیال کیا گیا ہے۔ یعنی وہی قصہ کہ ایک رات کسی تاریک اور ویران مقام
و شخصوں کی ملاقات ہوئی۔ پہلے شخص نے دوسرے شخص سے کوئی بات کہی جس پر دوسرے شخص نے
، تو گویا آپ بھوت پریت کے وجود کو مانتے ہیں؟ پہلے شخص نے کہا، ہرگز نہیں، میں بھوت پریت
ض خرافات سمجھتا ہوں۔ لیکن شاید آپ اُن کے وجود کے قائل ہیں! دوسرے نے کہا، بے شک
، بھوتوں کا قائل ہوں۔ اور یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا!"
"اچھا لطیفہ ہے،" آغا بولے۔
"خیر چھوڑو اس لطیفے کو،" میں نے کہا۔ "میں تمھیں دوسرا قصہ سناتا ہوں۔ یہ بھی ایک قدیم روایتی
ہے اور شاید ایڈون آرنلڈ نے اپنی تصنیف "لائٹ آف ایشیا" میں بھی اس کو لکھا ہے۔ قصہ
سا ہے کہ ایک دن سلطانِ دمشق کے محل میں ایک نوجوان بے تحاشا دوڑتا ہوا داخل ہوا اور تیر

کی طرح سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں سلطان مع اپنے درباریوں کے موجود تھا۔ وہ فوراً سلطان کے قدموں پر گر پڑا اور التجا کی کہ مجھے بلا تاخیر ایک صبا رفتار گھوڑا عنایت کیا جائے کیونکہ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر بغداد پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ یہ نوجوان سلطان کا منظورِ نظر غلام تھا۔ اس لیے اس کی خواہش کو شرفِ پذیرائی بخشتے ہوئے سلطان نے اُس کی پریشانی اور دمشق سے فرار ہونے کے ارادے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے دست بستہ عرض کیا کہ جہاں پناہ! مَیں ابھی محلِ شاہی کے باہر باغ کی سیر میں مصروف تھا کہ مجھے فرشتہ موت نظر آیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر عجب عجب طریقوں سے منہ بنایا اور مجھے ڈرانے اور دھمکانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ میں اپنی جان بچانے کی خاطر ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں سے فوراً بھاگ جاؤں اور اپنے اور فرشتۂ موت کے درمیان کم از کم اتنا فاصلہ ضرور پیدا کر لوں جتنا دمشق اور بغداد میں ہے۔ غلام یہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد سلطان نے سوچا کر کیوں نہ باغ میں جا کر فرشتۂ موت کو بہ نفسِ نفیس دیکھا جائے اور غلام کی شکایت کی تحقیق کی جائے۔ چنانچہ وہ اپنے مصاحبین کی معیت میں ٹہلتا ہوا محل سے باہر آیا اور باغ میں داخل ہوا۔ بلا شک و شبہ فرشتۂ موت وہاں موجود تھا۔ سلطان نے کہا، کیوں حضرت! کیا معاملہ ہے؟ اب آپ ہمارے غلاموں کی جان کے درپے ہو رہے ہیں۔ ابھی میرے غلام نے مجھے خبر دی کہ آپ نے اسے ڈرایا دھمکایا اور مرگِ ناگہاں کی خوش خبری، میرا مطلب ہے خبرِ بد سنائی۔ فرشتۂ موت نے کہا، ہرگز نہیں۔ آپ کے غلام نے بالکل جھوٹ کہا۔ میں نے اُس کو ڈرانے دھمکانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ البتہ میں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی حیرت کا اظہار ضرور کیا۔ سلطان نے اس کی حیرت کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا، میری حیرت کا سبب یہ تھا کہ وہ غلام یہاں دمشق میں موجود ہے، درآں حالے کہ مجھے یہ حکم مل چکا ہے کہ میں آج شام بغداد میں اس کی روح قبض کروں!"

میں قصہ ختم کر کے چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تاکہ آغا صاحب اس کے مفہومِ پنہاں کے لطف کو محسوس کر سکیں۔ لیکن بظاہر انھوں نے کوئی اثر نہیں لیا۔ گویا کوئی بہت ہی طفلانہ بات کہہ دی گئی تھی جس سے متاثر ہونا ان کے لیے ضروری نہیں تھا۔ "خیر یونہی سہی"، میں دل ہی دل میں ان سے مخاطب

ہا، آپ کی بے حسی کے قربان! آج میں آپ کو ہلا کر ہی رکھ دوں گا۔"

میں نے کہا، "یہ دونوں قصے جو میں نے آپ کو سنائے محض روایتی لطیفے تھے۔ ان کو چھوڑیئے۔ اب میں آپ کو ایک حقیقی واقعہ سناتا ہوں۔ یعنی یہ کوئی روایتی قصہ یا من گھڑت افسانہ نہیں ہے، بلکہ ایک سچی کہانی ہے، ایک اصلی واقعے کی روداد ہے۔ ایک مشہور فرانسیسی مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدے اور ذاتی علم کی بنا پر اس کو ابھی کچھ دن ہوئے ایک ادبی رسالے میں شائع کرایا ہے..."

"میں اس فرانسیسی مصنف کا نام معلوم کر سکتا ہوں!" آغا نے گویا مراقبے کی حالت سے برآمد ہو کر سوال کیا۔

"وہ مجھے اس وقت یاد نہیں"، میں نے کہا

"خیر، یہ نہی سہی۔ آپ واقعہ سنیئے جو ایک حقیقی واقعہ ہے۔ فرانس کے کسی دور افتادہ قصبے میں ایک لڑکی کی شادی ہوئی۔ شوہر ایک متمول گھرانے کا نوجوان صاحب کے پاس اپنی ذاتی کار تھی۔ دولہا دولہن نے پیرس میں ہنی مون منانے کا فیصلہ کیا اور اپنی ذاتی کار میں سوار ہو کر گھر سے چل پڑے۔ مختلف شہروں کی سیر کرتے ہوئے چند روز بعد پیرس کے مضافات میں پہنچے۔ ایک دن کسی خوبصورت مضافاتی گاؤں کے برابر سے گزر رہے تھے کہ لڑکی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے زور سے چلائی، ٹھیرو، ٹھیرو، گاڑی روکو۔ شوہر نے گاڑی روک دی اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ سڑک کے اس پار چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکانوں کی قطار پر نظریں جمائے ہوئے تھی اور مارے جوش کے اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ گاڑی کے رکتے ہی اس نے بے اختیار ایک خاص مکان کی طرف ہاتھ بڑھائے اور بولی، یہ تو میرا گھر ہے۔ یسوع مسیح کی قسم، یہی میرا گھر ہے۔ یہی وہ گھر ہے جس کو میں عمر بھر خوابوں میں دیکھتی رہی ہوں۔ بالکل وہی ہے۔ وہی لوہے کی سلاخوں والا بڑا سا دروازہ۔ وہی دیواریں، وہی منڈیر۔ وہی پھاٹک سے اندر کی طرف جاتا ہوا سیدھا راستہ، وہی روشیں۔ ہر چیز بالکل وہی ہے! اُف میرے خدا! شوہر کو معاملے کی تہ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ یہ پورا قصہ سن چکا تھا۔ اور وہاں اس قصبے میں جہاں اُن کا وطن تھا کون تھا جو اس راز سے واقف نہیں تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ رات کے وقت اور کبھی دن میں بھی

نیند کے عالم میں اس لڑکی کو کوئی چھوٹا سا خوبصورت مکان نظر آتا ہے جس کو یہ اپنا گھر کہتی ہے۔ وہ اکثر صبح کو سو کر اٹھتی تو لوگوں کو بتاتی کہ آج پھر میں نے اپنے گھر کی سیر کی۔ بہت دیر تک روشوں پر ٹہلتی رہی، پھولوں کی مہک سونگھتی رہی، اور لوگوں کو آتے جاتے دیکھتی رہی۔ آج وہ اپنے گھر کو مادی اور سہ ابعادی اجسام کی دنیا میں اپنی مادی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ اس کا اضطراب اور جوش و خروش ایک قدرتی بات تھی۔ وہ اچھل کر کار سے باہر نکلی اور شوہر سے کہا، کیوں نہ ہم ذرا اندر چلیں اور اپنے گھر کی سیر کریں، اور معلوم کریں کہ اس میں رہتا کون ہے۔ اور ہاں اگر ممکن ہوا اور اجازت مل جائے تو چند روز یہاں قیام بھی کریں۔ یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی۔ شوہر پیچھے پیچھے چلا۔ جب وہ دونوں مکان کے صدر دروازے کی طرف قدم بڑھا رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ مکان کے اندر سے ایک پادری دروازے کی طرف آ رہا ہے۔ اس نے بڑھتے ہوئے دروازے کے پٹ کھولے اور باہر آیا۔ لڑکی جھک کر آداب بجا لائی اور کہا، کیوں جناب! یہ مکان کس کا ہے؟ کیا ہم اندر جا سکتے ہیں؟ پادری نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ پھر کسی قدر جھکا اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، اور سوال کا جواب دیے بغیر چپ چاپ مگر تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ ایک لمحہ وہ گوموگو کے عالم میں رہے۔ اس کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ سامنے کیاریوں میں ایک مالی کام کر رہا تھا۔ اس کی پشت ان دونوں کی جانب تھی۔ لڑکی نے اس کے قریب پہنچ کر کہا، کیوں بھئی مالی؟ وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ مالی نے اپنا سر اٹھا کر اس کو دیکھا۔ پھر وہ اچھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لڑکی کے چہرے پر نظر جاتے ہی زور سے چیخا اور یک لخت بھاگ کھڑا ہوا۔ اب یہ دونوں اور بھی ہراساں ہوئے اور سخت حیران کہ آخر یہ قصہ کیا ہے۔ کچھ دیر دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور اپنی بے بسی پر غور کرتے رہے۔ آخر لڑکی نے شوہر سے کہا، اب ہم یہاں آئے ہیں تو ایک کوشش اور کر لیں۔ مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ یہی میرا گھر ہے۔ میں اس کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ یہ کہہ کر وہ مکان کے برآمدے کی طرف بڑھی۔ شوہر نے اس کی پیروی کی۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ اندر سے گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے سناٹا طاری رہا۔ پھر کسی

کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور ایسا معلوم ہوا کہ کوئی سیڑھیاں اُترتا ہوا آرہا ہے۔ دروازہ کھلا اور خادمہ کی وضع کی ایک متوسط العمر عورت کا چہرہ دکھائی دیا۔ ابھی لڑکی نے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ اس نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا اور اندر سے چٹخنی لگالی۔ اب تو یہ دونوں فی الواقع سراسیمگی کی آخری حد کو پہنچ گئے۔ اور اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ چپ چاپ وہاں سے رخصت ہو جائیں۔
چنانچہ نہایت درجہ افسردگی کے عالم میں روشوں پر خاموشی کے ساتھ چلتے ہوئے مکان کے پھاٹک سے باہر آئے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ دو ڈھائی گھنٹے بڑی بے دلی کے ساتھ گاؤں اور اس کے نواحی علاقوں میں گھومتے رہے اور آخر کار دوبارہ اسی سڑک پر آ گئے جہاں لڑکی کو کچھ دیر پہلے یکبارگی اپنا گھر دکھائی دیا تھا۔ گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے لڑکی نے "اپنے گھر" پر ایک آخری حسرت آمیز نظر ڈالی، اور پھر گاڑی کو پیرس جانے والی سڑک پر ڈالنے سے پہلے انھوں نے سوچا کہ کسی ریستوران میں بیٹھ کر کچھ کھا پی لیں۔ ہر چند کہ لڑکی کو "اپنے گھر" میں ایک چائے کی پیالی تک پینے کو نہیں ملی تھی، لیکن اپنے گھر کے پڑوس میں کسی ریستوراں میں بیٹھ کر کچھ کھانے پینے سے کون منع کر سکتا تھا۔
وہ ایک ریستوراں میں داخل ہوئے۔ ریستوراں کا مالک ایک خوش مزاج باتونی بڈھا تھا جو نوجوان جوڑے سے فوراً گھل مل گیا۔ انھوں نے ہلکا سا ناشتہ کیا اور جب ناشتے کے بعد ایک ہلکی سی شراب کا دور شروع ہوا تو اُن کی درخواست پر بوڑھا بھی اس میں شریک ہو گیا۔ گفتگو کا سلسلہ چل نکلا، اور جلد ہی نوجوان شوہر نے مکان کا قصہ چھیڑ دیا، کیونکہ یہی وہ بات تھی جو دونوں کے دل کو لگی ہوئی تھی۔ مکان کا ذکر چھڑتے ہی بوڑھا چیخ پڑا۔ ارے صاحب! وہ مکان! خدا اپنی پناہ میں رکھے! وہ تو آسیب زدہ ہے۔ برسوں سے اس مکان میں راتوں کو اور کبھی کبھی دن کے وقت بھی ایک نوعمر لڑکی کا بھوت نظر آیا کرتا ہے۔
اگرچہ اُس بھوت نے آج تک کسی سے تعرض نہیں کیا۔ بے چارہ بالکل بے ضرر ہے۔ اور آج تو اُس مکان میں ایک چھوٹی موٹی قیامت برپا ہے۔ میرے باورچی کا لڑکا وہاں مالی کا کام کرتا ہے۔ ابھی وہ وہاں سے ہانپتا کانپتا بھاگا ہوا آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ آج وہ بھوت دن دہاڑے عام انسانی روپ میں وہاں موجود ہے۔ بلکہ آج تو اُس کے ساتھ نوجوان مرد کا بھوت بھی ہے۔ دونوں بڑے مزے کے

ساتھ وہاں روشوں پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ شوہر نے یہ سن کر بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں خوف یا حیرت کے باعث پھٹی پڑ رہی تھیں۔ بوڑھے نے بات کو مذاق میں اُڑانے کی کوشش کی، لیکن جو کچھ یہ دونوں جانتے تھے وہ بھلا اُسے کب معلوم تھا!"

"کیا خیال ہے؟" میں نے قصہ ختم کر کے آغا سے پوچھا۔

"کوئی پُراسرار بات نہیں ہے،" وہ بولے۔ "جدید نفسیات نے ثابت کر دیا ہے کہ کسی انسانی وجود کا کوئی حصہ خاص خاص حالات میں اپنی اصل سے جدا ہو کر خارج میں وجود پذیر ہو سکتا ہے اور.....؟"

میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا، "آغا! تم اپنی نفسیاتی تحلیل و تعلیل کو فی الحال اپنے پاس رکھو۔ میں تم کو ابھی اپنا واقعہ سناتا ہوں اور اس کے بعد دیکھوں گا کہ تم اس کی کیا نفسیاتی تاویل پیش کرتے ہو۔"

"وہ بھی سنا ڈالیے،" آغا کسی قدر مرعوب ہوتے ہوئے بولے۔

میں نے کہا، "یاد رہے کہ یہ کوئی افسانوی روداد نہیں ہے، بلکہ ایک حقیقی چشم دید واقعہ ہے جو خود میرے ساتھ پیش آیا ہے۔ یہ گویا آپ بیتی ہے جس کی صداقت میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔"

"لاریب! لاریب!" آغا نے چہکنے کی کوشش کی۔

"اچھا تو سنو،" میں نے کہا۔ "میں کل صبح سعیدہ کے یہاں گیا تھا۔ ہولی کے فوراً بعد ہم لوگ دہلی جا رہے ہیں اور چند روز مکان بالکل خالی رہے گا۔ اس لیے ضروری سمجھا کہ بیوی اور لڑکیوں کا زیور سعیدہ کے یہاں پہنچا دیا جائے۔ زیورات کی صندوقچی اپنی اٹیچی میں رکھ کر علی الصباح روانہ ہو گیا۔ اور یہ بھی سوچا کہ واپسی پر اٹیچی میں زیورات کی صندوقچی کی جگہ پانوں کی ایک ڈھولی رکھ کر لیتا آؤں گا۔ وہ شاید پہلی ہی بس تھی جس سے میں نے سفر کیا۔ وہاں پہنچا ہوں تو ناشتے کی تیاری ہو رہی تھی۔ واجد اپنی ڈیوٹی پر جا چکے تھے۔ میں نے اپنے بچوں کے ساتھ ناشتہ کیا۔ زیورات کی صندوقچی سعیدہ کے حوالے کی، اٹیچی میں صندوقچی کے نکل جانے سے جو جگہ خالی ہوئی اس کو سعیدہ نے فیکٹری کے بنے ہوئے ایک خوبصورت گل دان سے پُر کر دیا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر دس گیارہ بجے وہاں سے چل پڑا۔ بس کا اڈا زیادہ دور نہیں تھا۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ کا راستہ ہو گا۔ ابھی دھوپ میں بھی

زیادہ تیزی نہیں آئی تھی۔ چنانچہ پیدل ہی بس کے اڈے کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بس آ چکی ہے اور تھوڑی دیر میں روانہ ہو گی۔ ٹکٹ خریدا اور بس میں جا بیٹھا جو ابھی تقریباً خالی تھی۔ بمشکل تین چار مسافر اپنی جگہوں پر نظر آ رہے تھے۔ مجھے بس میں بیٹھے دو تین ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ بس کے باہر سے میرے کان میں ایک کڑک دار آواز آئی، "پیسہ دے!" میں نے مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کوئی معمر سا فقیر تھا۔ اُس نے اس طرح اکڑ کے "پیسہ دے" کی صدا لگائی تھی کہ میں نے اسے کچھ دینا دلانا ضروری نہیں سمجھا اور خاموش اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ عام طور پر لوگ بھکاری کی التجا کو اس طرح سنتے ہیں گویا کچھ سُن ہی نہیں رہے ہیں اور اُس کے پھیلے ہوئے دستِ سوال کو اس طرح دیکھتے ہیں گویا کچھ دیکھ ہی نہیں رہے ہیں۔ یہ انتہائی بے حسی کا رویہ ہے جو تم جانتے ہو کہ میرا مسلک کبھی نہیں رہا۔ لیکن اس وقت اس فقیر کا طنطنہ مجھے واقعی برا معلوم ہوا۔ اس لیے میں نے بھی وہی بے حسی کا انداز اختیار کیا۔ کچھ ہی دیر میں "پیسے دے" کی کڑک دار آواز پھر میرے کانوں سے ٹکرائی اور اس دفعہ لہجہ پہلے سے بھی زیادہ کرخت تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا لیکن تحمل سے کام لیا۔ اور یہ طے کیا کہ اگر اس فقیر نے اس مرتبہ پھر یہی حرکت کی تو اس سے اتنا تو ضرور کہوں گا کہ بھئی تم بھیک مانگتے ہو یا نادر شاہی حکم جاری کرتے ہو؟ سر دست میں نے اس کی طرف سے مکمل بے اعتنائی اختیار کی اور اپنی اٹیچی کھولی تاکہ کتاب نکال کر پڑھنا شروع کر دوں۔ اٹیچی کھلی تو اس میں گُل دان نظر آیا اور گُل دان نے جو جگہ گھیر رکھی تھی اس کو دیکھ کر یہ یاد آیا کہ میرا ارادہ پانوں کی ڈھولی بھی تو خریدنے کا تھا۔ وہ ارادہ میرے ذہن سے بالکل ہی نکل گیا تھا۔ میں نے نظر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بس ابھی نصف سے زیادہ خالی تھی۔ لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ روانگی میں ابھی پندرہ بیس منٹ تو لگ ہی جائیں گے کچھ عجب نہیں جو آدھ گھنٹہ یا اس سے بھی زیادہ وقت لگ جائے۔ میں نے فوراً فیصلہ کیا کہ لپک کر پانوں کی منڈی تک ہو آؤں۔ ذرا دور تو ہے ہی دس پندرہ منٹ میں واپس آ جاؤں گا۔ چنانچہ ہڑبڑا کر اٹھا، اٹیچی سنبھالی اور بس سے اُتر پڑا۔ سامنے ہی یکوں کا اڈا تھا۔ خیال آیا کہ اگر یکے میں چلا جاؤں تو اور بھی اچھا ہے۔ چند ہی منٹ میں واپس آ جاؤں گا۔ یکوں کی طرف بڑھا۔ وہاں کوئی ایسا یکہ نہیں تھا جو دو تین سواریوں کو بٹھائے ہوئے ایک آدھ مزید سواری کے انتظار میں کھڑا ہو۔ مگر

اب چونکہ یکے پر ہی جانے کا موڈ بن چکا تھا، اس لیے ایک خالی یکے میں سوار ہو گیا۔ بلا سے دو چار آنے کا خرچ اور سہی۔ اس سارے ہنگامے میں اُس فقیر کو میں بالکل بھول گیا۔ بلکہ اس کا خیال بھی ذہن سے نکل گیا۔ پانچ سات منٹ میں یکے نے مجھے پھلوں کی منڈی پہنچا دیا۔ یکے سے اُتر کر ایک تھوک فروش کی دوکان کا رُخ کیا۔ وہاں کافی بھیڑ تھی۔ پان فروشوں اور پنواڑیوں کے علاوہ مجھ جیسے عام گاہک بھی خاصی تعداد میں تھے۔ اس ہڑبونگ میں پوری ڈھولی خریدنا کچھ نامناسب معلوم ہوا۔ پھر میری اٹیچی میں زیادہ جگہ بھی نہیں تھی۔ اس لیے صرف ایک مٹھا پانوں کا خرید لیا اور اٹیچی کھول کر اس کو شیشے کے گل دان میں داخل کر دیا۔ جیب سے ایک نوٹ نکال کر دوکان دار کو دیا۔ بقیہ پیسوں کے انتظار میں کھڑا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی، پیسہ دے! اور آواز میں وہی گھن گرج جو پہلے تھی۔ مڑ کر دیکھا تو وہی شخص سائے کی طرح میرے جسم سے لگا کھڑا تھا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ میں تو یکے میں سوار ہو کر آیا، لیکن یہ شخص پیدل ہی چل کر میرے ساتھ یہاں تک پہنچ گیا۔ اتنے میں دوکاندار نے بقیہ پیسے دے دئے جو پورے نہیں تھے۔ اس پر دوکاندار سے کچھ جھک جھک ہوئی۔ کچھ تو اس جھک جھک کی بدمزگی اور کچھ یہ خیال کر مجھے فوراً بس میں اپنی جگہ پر پہنچنا چاہیے، میں ہر غیر متعلق بات کو اپنے ذہن سے خارج کر کے وہاں سے چل پڑا۔ سڑک پر کہیں کوئی یکہ نہیں تھا۔ تیزی سے ہانپتا کانپتا پیدل روانہ ہو گیا۔ مشکل سے بیس پچیس قدم آگے بڑھا ہوں گا کہ پیچھے سے ایک یکہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سواریوں سے لدا ہوا تھا، لیکن یکے والے کو مجھے بھی بٹھا لینے میں اپنا فائدہ ہی نظر آیا، اور میں خاصے مزے کے ساتھ یکے کے ایک ستون سے لٹکتا ہوا بس کے اڈے پر پہنچ گیا۔ بس اب تقریباً بھر چکی تھی۔ مجھے پھر آسانی کے ساتھ جگہ مل گئی۔ بیٹھ کر پسینہ پونچھنا شروع کیا۔ رومال ابھی ماتھے تک پہنچا ہی تھا کہ "پیسہ دے" کی دندناتی ہوئی آواز پھر کانوں سے ٹکرائی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بس کے باہر وہ حضرت حسب سابق موجود تھے۔ اب تو میں لرز گیا! میں نے سوچا کہ یہ تو کچھ اور ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے گھبرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو سکے میری مٹھی میں آئے وہ ان کی طرف بڑھا دئے۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرا حکم صادر فرمایا ــــ کھانا کھلا! اب میری تابِ مقاومت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ میں بلا پس و پیش اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اٹیچی ہاتھ میں لی اور بس سے نیچے اتر گیا۔ بس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے

میں موجود ہوں اس کو اعلیٰ یونیورسٹی کہا جا سکتا ہے۔ اور آپ کی اس یونیورسٹی میں یہ ساری خوبیاں پوری طرح موجود ہیں۔

یہ بہت ہی افسوس اور بدقسمتی کی بات ہے کہ اس اعلیٰ تعلیمی ادارہ کے اس جشن زریں کے مبارک موقع پر آج ہمارے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب موجود نہیں ہیں جنھوں نے اس ادارہ کے لیے اپنی قیمتی زندگی کے ۲۷ سال بڑی لگن کے ساتھ گزارے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جو اس ادارہ کے روح رواں تھے وہ صرف اسلامی تہذیب ہی کے نمائندے نہیں تھے بلکہ وہ صحیح معنوں میں ہمارے سیکولرازم کے ایک اعلیٰ نشان بھی تھے۔ وہ ہمارے دیش کے اعلیٰ درجہ کے دیش بھگت محب وطن تھے۔ وہ بڑے ہی انوکھے اور اعلیٰ انسان تھے اور ایک ایسے عالم باعمل تھے جن میں ہر کام کو اعلیٰ پیمانہ پر کرنے کی لگن ہوتی تھی۔ ان کی یہی ساری خوبیاں اور اس ادارہ کی خدمات ایسی تھیں کہ انھیں اس عظیم ملک کے اعلیٰ عہدہ کا حقدار بنا دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سب میری اس بات کو مانیں گے کہ اس تعلیمی ادارہ کے ساتھ جن کا تعلق خواہ استاد کی حیثیت سے ہو یا طالب علم کی حیثیت سے ہو، آج یا آنے والے کل میں، ان سب پر ذاکر صاحب کی انسانیت اور خوبیوں کا اثر ہمیشہ قائم رہے گا اور وہ سب ہمیشہ ذاکر صاحب کے مشکور رہیں گے۔ میں ان تمام حضرات کو مبارکباد دیتا ہوں جنھوں نے اس ادارہ کو قائم کرنے اور ترقی دینے میں اپنا ہاتھ بٹایا۔ ذاکر صاحب کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ جامعہ دھیرے دھیرے ترقی کر رہا ہے اور اس کی ترقی کی حدیں آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔"

طلبائے قدیم کے سمپوزیم کا عنوان تھا: "آج کے ہندوستان میں جامعہ کا رول"۔ جلسہ جامعہ کے ایک قدیم طالب علم جناب معین الدین حارث صاحب (مدیر روزنامہ اجمل، بمبئی) کی صدارت میں شروع ہوا، جن کا خطبۂ صدارت جامعہ کے اس شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ خطبۂ صدار

اٹھاکر سڑک پر پھینکے۔ اپنا رومال سمیٹا، اور بدھنا مسجد میں رکھ آیا۔ شاہ صاحب! کوئی اور خدمت؟ میں نے ان سے کہا۔ وہ چندے خاموش رہے۔ پھر بولے، کیا چاہتا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ میرے حواس بجا نہیں تھے۔ میں صرف اتنا کہہ سکا، شاہ صاحب! میرے لیے دعا کیجیے۔ وہ بولے، اچھا جا! جا! جا! یہ سنتے ہی میں وہاں سے پلٹا اور پسینہ پونچھتا ہوا اس جگہ آگیا جہاں کچھ دیر پہلے بس کھڑی تھی اور اب جا چکی تھی۔ وہاں پہنچ کر میں نے ایک دزدیدہ نظر مسجد کے حجروں کی طرف ڈالی۔ آغا صاحب! کیا آپ میری بات کا یقین کریں گے؟ وہاں شاہ صاحب کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ مگر وہاں کوئی ہوتا تو دکھائی بھی دیتا۔ میری حالت غیر ہونے لگی۔ یہ خیال بھی آیا کہ جب انھوں نے کہا، کیا چاہتا ہے؟ تو میں نے کوئی ٹھوس مفید چیز کیوں نہ طلب کرلی؟ میری عقل پر پتھر کیوں پڑ گئے؟ اور سٹی گم کیوں ہوگئی؟ جتنا سوچتا اتنا ہی زیادہ پریشان ہوتا۔ پھر مجھے شدید تھکن محسوس ہوئی۔ میں نے طے کیا کہ اِس وقت سفر کو ملتوی کیا جائے اور بہن کے گھر جاکر آرام کیا جائے۔ چنانچہ یکّے کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ لیکن اب یہ ہول سا آیا کہ اگر راستے میں پھر کسی اجنبی شخص سے ملاقات ہوگئی تو کیا کروں گا ـــــ پھر یہ سوچا کہ اگلی بس بھی آتی ہی ہوگی۔ کیوں نہ اُس سے نکل ہی جاؤں؟ مگر ساتھ ساتھ یہ خیال بھی حملہ آور ہوا کہ بس میں بیٹھنے کے بعد اگر باہر سے پھر "پیسے دے" کی کڑک دار آواز سنائی دی تو کیا کروں گا۔ غرض کہ کچھ دیر سخت الجھن اور پس و پیش کی حالت رہی۔ آخر میں حلوائی کے پاس گیا اور اس سے کہا، دیکھنا بھئی! میری طبیعت ذرا خراب ہوگئی ہے۔ میں تھوڑی دیر تمھاری دوکان میں بیٹھ کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اُس نے فوراً میرے بیٹھنے کا انتظام کردیا اور میں دوکان کے اندر ایک دیوار کی ٹیک لگاکر اور سر کو گھٹنوں پر رکھ کر بیٹھ گیا اور ماحول سے غافل ہونے کی کوشش کرنے لگا لیکن حواس کو مجتمع نہیں کرسکا اور طبیعت کو سکون نہیں ملا۔ لہٰذا پھر حلوائی سے مخاطب ہوا۔ دیکھنا بھائی! تم اپنی دوکان کے کسی آدمی کو یہاں سامنے گلاس فیکٹری تک بھیج سکتے ہو؟ وہاں کوارٹروں میں میرا بھانجا رہتا ہے۔ واجد علی انجینیر۔ بس تمھارا آدمی وہاں جاکر یہ کہہ دے کہ تمھارے ماموں کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ جاکر ان کو لے آئے۔ حلوائی کے یہاں تو کوئی ایسا شخص نہیں تھا۔ لیکن دوکان کے سامنے دو تین آدمی کھڑے تھے۔ اُس نے اُن میں سے

نوجوان سے بات کی اور وہ تیار ہو گیا۔ میں نے اُس کو بہن کے گھر کا پتہ ٹھیک ٹھیک بتا دیا اور وہ اپنے
نا پر روانہ ہو گیا۔ چند ہی منٹ میں واجد اپنے ایک انجینیر دوست کے ساتھ کار لیکر آن موجود ہوئے۔
ں نے مزاج کی کیفیت معلوم کرنی چاہی۔ میں نے کہا، گھر چل کر بتاؤں گا۔ گھر پہنچے تو وہاں بھی اضطراب
ہر دوڑی ہوئی تھی اور سعیدہ سخت پریشانی کے عالم میں دروازے پر کھڑی انتظار کر رہی تھیں۔ میں
ں سے اُتر کر سیدھا بستر کی طرف گیا اور تمام مزاج پُرسی کرنے والوں سے کہہ دیا کہ کوئی خاص بات نہیں
۔ بس تھک گیا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔ غرضکہ بستر پر دراز ہوا اور چاہا کہ کچھ دیر سو لوں یا
ھیں بند کیے پڑا رہوں۔ مگر یہ بھی نہیں ہوا، کیونکہ لیٹتے ہی حرارت محسوس ہوئی اور تھوڑی دیر میں
ہی خاصی بخار کی سی کیفیت ہو گئی۔ قصہ مختصر یہ کہ ڈاکٹر آیا۔ دوا پلائی گئی۔ سہ پہر یا شام کو گھر کے لیے
انہ ہونے کا ارادہ بھی ترک کرنا پڑا۔ اور رات وہیں گزارنے پر مجبوراً راضی ہونا پڑا۔ صبح اُٹھا
طبیعت بالکل صاف تھی۔ بخار رات میں کسی وقت اُتر گیا تھا ——"

"ہیں! کیا کہا؟" آغا اچانک اچھل کر بولے۔ "آپ نے رات وہیں گزاری؟"

"ہاں ہاں! کیوں؟ کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا

"گویا آپ نے رات وہیں بسر کی! یعنی کل شام آپ یہاں نہیں تھے؟ —— اچھا خیر۔ اس
کے بعد کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، ہونا کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر واپسی کا قصد کیا۔ واجد اپنے
وست کی کار لائے اور مجھے یہاں پہنچایا۔ میں نے ان سے کہدیا تھا کہ اب میں بس میں ہرگز نہیں جاؤں
گا۔ غرضکہ میں صبح دس بجنے سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا۔ دن بھر پڑا رہا اور تم سے ملنے کے لیے بے تاب
ہوتا رہا۔ یہ بھی سوچا تھا کہ جمال کو بھیج کر تمھیں بلوالوں گا۔ مگر تم خود ہی آ گئے۔"

"تو گویا آپ نے کل کا پورا دن گھر سے باہر گزارا اور آج صبح واپس آئے؟" آغا نے پھر کہا۔

"ہاں ہاں بھائی بتایا تو! آخر تم اس بات کو کیوں رٹے جا رہے ہو؟ کتنی دفعہ کہوں کہ مجھے رات
وہیں گزارنی پڑی اور آج صبح طبیعت ٹھیک ہونے پر میں واپس آیا۔"

اس پر آغا نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بہت دیر تک ہنستے رہے۔ میں ان کی بے موقع اور بظاہر بے وجہ ہنسی پر حیران ہوتا رہا

جب اُن کی کھلی ہوئی باچھیں اپنی اصلی جگہ پر واپس آگئیں تو بولے، "یہ واقعہ تو آپ نے خوب گھڑا۔ خاصا زرخیز دماغ پایا ہے آپ نے!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ جناب والا کہ کل شام کو میں نے اپنی آنکھوں سے آپ کو گاندھی روڈ پر دیکھا۔ کل آپ یہیں، اسی شہر میں موجود تھے۔"

"تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہے؟" میں نے کہا۔ "کل شام تو میں بہن کے گھر میں پڑا ہوا تھا اور فیور مکسچر کی خوراکیں حلق سے اُتار رہا تھا۔ تم نے یہاں گاندھی روڈ پر میرے بھوت کو دیکھا ہوگا۔"

"ہوسکتا ہے وہ آپ کا بھوت ہی ہو،" آغا نے کہا، "لیکن میں اتنا مخبوط الحواس نہیں ہوں، نہ ابھی میری بینائی ہی اتنی کمزور ہوئی ہے کہ کسی بجلی کے کھمبے یا کسی عمارت کے ستون پر مجھے آپ کا دھوکا ہو جائے۔ میں سردار کلاتھ ہاؤس میں بیٹھا ہوا مہندر سنگھ سے باتیں کر رہا تھا کہ آپ سامنے سڑک کے چوراہے کی طرف جاتے ہوئے نظر آئے۔ آپ بہت لپکے ہوئے چلے جا رہے تھے اور میں کئی آدمیوں میں گھرا ہوا بیٹھا تھا، ورنہ شاید باہر نکل کر میں آپ سے بات بھی کرتا۔"

"بھئی حد ہوگئی!" میں نے کہا۔ "بہرحال اِس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ میں کل شام یہاں نہیں تھا۔ یہاں سے کم از کم دس میل کے فاصلے پر تھا۔"

"اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ میں نے کل شام آپ کو بازار میں دیکھا۔" آغا صاحب نے جواب دیا۔ "آپ وہی اپنی کتھئیا سِلک والی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ اُس کپڑے کی شیروانی یہاں اور کون پہنتا ہے؟ کسی دوسرے شخص کے پاس نہیں ہے۔"

"تو یہ تو ایک معمہ ہوا،" میں نے کہا۔ "اب اِس کو کون حل کرے۔"

"اِس معمے کا اگر کوئی حل ہوسکتا ہے تو صرف یہ کہ آپ کے اندر بیک وقت دو جگہ موجود ہونے کی

صلاحیت ہے!" آغا نے جواب دیا۔

"واللہ حد ہو گئی!" میں چیخ پڑا۔ "یعنی یک نہ شُد دو شُد!"

اور پھر ــــ آغا صاحب کے جانے کے بعد ــــ مجھے یاد آیا کہ اُس روز بہن کے یہاں غروب آفتاب کے بعد بستر پر پڑے پڑے میری طبیعت کچھ گھبرائی اور جی چاہا کہ گھر سے باہر نکل کر نکیڑی کی سڑک پر ذرا دیر چہل قدمی کروں۔ چنانچہ بستر سے اٹھا، شیروانی پہنی اور کمرے سے باہر آیا۔ بہن کو میرے ارادے کا پتا چلا تو انھوں نے مخالفت کی اور کہا کہ اس حالت میں تو آرام کرنا ہی بہتر ہو گا۔ پھر میری ہمت بھی جواب دے گئی۔ اور میں سخت بے دلی اور کوفت کے عالم میں دوبارہ کمرے میں پہنچا اور شیروانی پہنے پہنے بستر پر پڑ رہا اور اسی حالت میں کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگ گئی۔ تو کہیں ایسا تو نہیں کہ اُسی نیند کے دوران میں، میں اپنے شہر کے بازار میں آن پہنچا ہوں اور جس دوکان میں آغا صاحب بیٹھے تھے اس دوکان کے سامنے سے گزرا ہوں۔ ایک دھندلی سی یاد تو ہے کہ اس قسم کا کوئی خواب دیکھا تھا۔ واللہ اعلم!

میں نے آغا صاحب کو ہلا کر رکھ دینے کا ارادہ کیا تھا، لیکن خود ہی ہل کر رہ گیا!

بیان بابت ملکیت ماہنامہ جامعہ و دیگر تفصیلات

(فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

۱۔ مقام اشاعت : جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۲۔ وقفہ اشاعت : ماہانہ

۳۔ پرنٹر کا نام : عبداللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۴۔ پبلشر کا نام : عبداللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۵۔ ایڈیٹر کا نام : ضیاء الحسن فاروقی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پرنسپل جامعہ کالج، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ملکیت : جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

میں عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر : عبداللطیف اعظمی

۲ مارچ ۱۹۷۰ء

سالانہ چندہ
چھ روپے

جامعہ

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۱	بابت ماہ اپریل ۱۹۷۰ء	شمارہ ۴

فہرست مضامین

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون:

اڈیٹر: ۴۲۵۰۸، منیجر: ۴۳۷۰

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائیٹل: دیل پریس دہلی

شذرات

(پروفیسر محمد حبیب کا خیال ہے کہ محبوب الٰہی، سلطان الاولیاء حضرت نظام الدین رحؒ کی اخلاقی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ ——————) نماز انسان کے لئے بنائی گئی ہے نہ کہ انسان نماز کے لئے۔ نماز کے ساتھ دوسرے اعمال خیر میں زیادہ انہماک رکھو۔ نماز انسان کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس بات پر جس قدر غور و فکر کیجئے، اسرار دین کھلتے جاتے ہیں، سچی عبادت کے ذریعے بندے کا خدا سے جو تعلق قائم ہوتا ہے اس کی گوناگوں کیفیتوں کا حال اُن سے پوچھئے جن پر کیفیتیں گذرتی ہیں، اور غالباً وہ بھی بالکل صحیح صحیح انھیں بیان نہیں کرسکتے۔ آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد ۔ خدا سے اس تعلق کا اثر انسان کی زندگی اور اس کی سیرت اور کردار کے ہر پہلو پر پڑتا ہے، اس کا پہلا اثر تو یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں تواضع، مسکنت اور ندامت کا احساس جاگزیں ہو جاتا ہے، انانیت ٹوٹ جاتی ہے اور اخلاق حسنہ کے لئے دنیائے احساسات کی فضا ہموار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی ہی عبادت اور اس سے پیدا ہونے والی اسی طرح کی وابستگی کو پسند فرماتے ہیں۔ کہیں پڑھا ہے کہ خدا ہر عبادت گزار کی عبادت قبول نہیں کرتا۔ اس کے یہاں تو اس کی عبادت مقبول ہے جس نے تواضع اختیار کی اور اس کے بندوں پر جبر نہیں کیا، نیز بھوکے اور حاجتمند کو محض اُس کی خوشنودی کے لئے کھانا کھلایا۔ پس خدا سے یہ تعلق انسان کے دل میں یہ جذبہ بھی پیدا کرتا ہے کہ اللہ کے اخلاق کو اپنی زندگی میں پیدا کرنے کی کوشش کرے اور قرب الٰہی کی لذتوں سے بہرہ یاب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء نے خدمتِ خلق کو اصل عبادت قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بے پایاں اور بغیر کسی امتیاز کے تمام مخلوق کیلئے ہیں، یہی اخلاق الٰہی ہے اور اسی ایک کو اگر انسان اپنی عبادات کے وسیلے سے اپنے اندر پیدا کرلے تو حضرت محبوب الٰہی کی مذکورہ اخلاقی تعلیم کی بے پناہ اہمیت کا

اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

اس سلسلے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ عبادت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک لازمؔ جس کا تعلق اور جس کی فیض رسانیاں انسان کی اپنی ذات تک محدود ہیں اور دوسری مُتعدیؔ جس کا فائدہ عبادت گذار کی ذات سے گذر کر دوسروں تک بھی پہونچتا ہے اور دوسروں تک اسی طرح پہونچ سکتا ہے کہ انسان "تخلقو باخلاق اللّٰہ" پر عمل کر کے دوسروں کو اپنے رحم و کرم، فیاضی و سخاوت، عدل و انصاف، عیب پوشی و حلیمی سے فائدہ پہونچائے اور معاملات میں سچا اور کھرا ہو۔ بلاشبہ اس دوسری قسم کی عبادت کا اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا درجہ ہے۔ اوپر یہ جو بات کہی گئی ہے کہ نماز کے ساتھ دوسرے اعمالِ خیر میں زیادہ انہماک رکھو تو اس کا مطلب یہی ہے۔

انسانی فطرت ہے کہ وہ نیکی کے بدلے نیکی کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے لیکن عام طور پر بدی کے بدلے نیکی کرنے کے لئے رضامند نہیں ہوتی، لیکن بارگاہِ الٰہی میں اس کا بڑا انعام ہے اگر بدی کے بدلے نیکی کی جائے، کوئی بُرائی کرے، آزار پہونچائے، تو عفو اور درگذر سے کام لیا جائے، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت عدل ہے لیکن عفو اور درگذر "احسان" ہے اور اس کا بڑا رتبہ ہے۔ عام انسانی طبیعتیں اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتیں لیکن انسان کو کوشش یہی کرنی چاہیئے اور یہی اس کا آدرش ہونا چاہیئے۔ اخلاقِ الٰہی بھی یہی ہے، بے شمار لوگ ہیں جو اس کی اطاعت نہیں کرتے، کتنے ہیں جو اس کے وجود کے قائل نہیں، بہتیرے نافرمانی ہی میں اپنی اَنا کی تسکین کا سامان پاتے ہیں، لیکن وہ سب کا رازق، رب اور پروردگار ہے، منکروں کو بھی رزق اور ان کی محنت کا پھل دیتا ہے، یہ نہ ہو تو دنیا کا کارخانہ چل نہیں سکتا، ہر طرف بربادی اور تباہی کے سوا کچھ نہ ہو کیونکہ دنیا میں نیک، خدا ترس اور فرمانبردار بندے کتنے ہوتے ہیں؟ اسی لئے درویشی یہ ہے کہ انسان اپنی حیوانی قوت کو دبائے اور اخلاق

اور اخلاق کی قوت کو ابھارے جو صلہ رحمی، محبت اور اطاعت حق کا جذبہ پیدا کرتی ہے، حضرت سلطان الاولیاء نے فرمایا ہے کہ درویش کا فرض ہے کہ روح کے تقاضوں کو ترجیح دے، وہ نہ صرف نیکی کے بدلے نیکی بلکہ بدی کے عوض میں بھی نیکی کرے کیونکہ اگر لوگ حیوانی قوت کے تقاضوں پر عمل کریں تو دنیا میں فتنہ و فساد کا کبھی خاتمہ نہ ہوگا۔ پروفیسر محمد حبیب نے ابھی حال میں دہلی یونیورسٹی میں حضرت محبوب الٰہیؒ اور اُن کی اخلاقی تعلیمات کے موضوع پر جو نظام لکچرز دئے ہیں، اُن میں انھیں باتوں کو اجاگر کیا ہے، انھوں نے کہا کہ فارسی اشعار جو حضرتؒ اکثر پڑھا کرتے تھے آپ کے عفو و رحم کے کامل طور پر آئینہ دار ہیں۔

ان اشعار کا مفہوم یہ ہے "جو میرا یار نہیں خدا اس کا یار ہو، جو مجھے آزار پہونچائے خدا اس کی مسرت میں اضافہ کرے، جو کوئی میری راہ میں کانٹے بچھائے حق تعالیٰ اس کی زندگی کے پھول کو کانٹوں سے بچائے"۔

یہ باتیں دلوں کو جوڑنے والی ہیں، افسوس ہے کہ انسان ان کی طرف توجہ نہیں کرتا اور اپنے اندر کی نفسانی قوت کے اشارے پر چلتا ہے، خود غرضی، خود پروری، بدی اور مردم آزاری اپنا شعار بنا لیتا ہے اور انھیں چیزوں کو سرمایۂ حیات سمجھ بیٹھتا ہے، ایک روز حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور بڑی عقیدتمندی سے انھیں ایک قینچی نذر کرنی چاہی۔ آپ نے فرمایا میرا کام جوڑنا ہے جُدا کرنا نہیں ہے، تم مجھے ایک سوئی اور دھاگا لا دو ــــ یہاں بھی وہی 'فصل' کے بجائے 'وصل' کی طرف اشارہ ہے، شیخ رومیؒ نے اس طرح وضاحت کی ہے:

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

مولانا کمال الدین زاہد اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے، علم حدیث میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے تھے، حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حدیث کی تعلیم انھیں سے حاصل کی تھی، ایک دن سلطان بلبن نے آپ کو بلایا اور کہا کہ آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا متمنی ہوں، آپ امامت قبول فرمائیے

کہ اس طرح آپ کی امامت میں میری نمازیں قبول ہو جائیں گی۔ مولانا زاہد خوب سمجھتے تھے کہ یہ دنیوی جاہ و جلال کا ایک جال ہے، اس میں پھنس گئے تو نماز اور عبادت کا جو مقصد ہے اسی کے فوت ہو جانے کا امکان ہے، بڑی خوبی سے جواب دیا "تمہارے پاس لے دے کے نماز رہ گئی ہے، سلطان اس کو بھی ہم سے چھیننا چاہتا ہے"۔ سلطان نے پھر اصرار نہیں کیا، معذرت کی اور مولانا کو رخصت کر دیا۔ سوال یہ کہ مولانا زاہد نے اپنی نماز کو اس جنجال سے محفوظ کیوں رکھنا چاہا؟ میرے خیال میں وہ اپنی نماز اور اپنی عبادت کو حضور قلب کی دولت سے محروم کرنا نہیں چاہتے ہوں گے، فقہاء کے نزدیک نماز میں سلطان وقت کی امامت شریعت کے عین مطابق ہے لیکن صوفیانہ زندگی گذارنے والے اپنے اور اللہ کے درمیان کسی ایسی چیز کو آنے دینا نہیں چاہتے جس سے حضور قلب کی ضیا گستری میں کوئی رکاوٹ ہو۔ حضرت حسنؓ نے فرمایا ہے: "جس نماز میں دل حاضر نہیں وہ تو ثواب کے بجائے عقوبت کی زیادہ مستحق ہے"۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کا کہنا ہے: "نماز میں جس شخص کو یہ خیال رہے کہ اُس کے دائیں بائیں کون کون لوگ کھڑے ہیں اُس کی نماز نہیں ہوتی"۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم الدین میں ایک حدیث نقل کی ہے: "کم من قائم حظه من صلاته التعب والنصب" (کتنے ہی نماز پڑھنے والے ایسے ہیں کہ ان کا حصہ نماز میں بس اتنا ہے کہ اس سے تھکن اور کوفت حاصل کرتے ہیں) —— —— پس یہ جو کہا گیا ہے کہ نماز انسان کے لئے بنائی گئی ہے، تو اُس سے مقصود وہی نماز ہے، جس سے حضور قلب کی دولت بیدار ہوتی ہے اور اس دولت بیدار کی برکتوں کا شمار نہیں۔ ہمارے "ایماں کی حرارت" والے ہم قوم اور ہم جماعت اگر نماز اور عبادت کے اس مفہوم سے آگاہ ہو جائیں اور اپنی نمازوں اور عبادتوں میں اسے برتیں، تو انفرادی اور جماعتی دونوں طرح کی زندگیوں میں ایک انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔

ایمیلی ڈکنسن

ترجمہ: پروفیسر محمد مجیب

چند نظمیں

(ایمیلی ڈکنسن (EMILY DICKINSON) امریکہ کی ایک مشہور شاعرہ ہیں، ۱۰ دسمبر ۱۸۳۰ء کو پیدا ہوئیں اور ۱۵ مئی ۱۸۸۶ء کو وفات پائی۔ ایک عرصے تک ان کی شاعری کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی، ۱۹۱۲ء میں ایک غیر معروف شاعرہ کی حیثیت سے یاد کیا گیا اور اب امریکی ادب میں ان کی شاعری کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے اور بہت سے ادیبوں اور نقادوں کی نظر میں انیسویں صدی کی سب سے بڑی امریکی شاعرہ ہیں۔)

انساں کے لئے وقت نکل گیا تھا،
مگر خدا کے لئے ابھی آیا نہ تھا
کائنات کے بس میں نہ تھا کہ مدد کرے
مگر دعا ہماری طرف دار تھی۔

کیا خوب وہ جنت

کہ اس طرح آپ کی امامت میں میری نمازیں قبول ہو جائیں گی۔ مولانا زاہد خوب سمجھتے تھے کہ یہ دنیوی جاہ و جلال کا ایک جال ہے، اس میں پھنس گئے تو نماز اور عبادت کا جو مقصد ہے اسی کے فوت ہو جانے کا امکان ہے، بڑی خوبی سے جواب دیا "تمہارے پاس لے دے کے نماز رہ گئی ہے، سلطان اس کو بھی ہم سے چھیننا چاہتا ہے"۔ سلطان نے پھر اصرار نہیں کیا، معذرت کی اور مولانا کو رخصت کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ مولانا زاہد نے اپنی نماز کو اس جنجال سے محفوظ کیوں رکھنا چاہا؟ میرے خیال میں وہ اپنی نماز اور اپنی عبادت کو حضورِ قلب کی دولت سے محروم کرنا نہیں چاہتے ہوں گے، فقہاء کے نزدیک نماز میں سلطانِ وقت کی امامت شریعت کے عین مطابق ہے لیکن صوفیانہ زندگی گزارنے والے اپنے اور اللہ کے درمیان کسی ایسی چیز کو آنے دینا نہیں چاہتے جس سے حضورِ قلب کی ضیا گستری میں کوئی رکاوٹ ہو۔ حضرت حسنؓ نے فرمایا ہے: "جس نماز میں دل حاضر نہیں وہ تو ثواب کے بجائے عقوبت کی زیادہ مستحق ہے"۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کا کہنا ہے: "نماز میں جس شخص کو یہ خیال رہے کہ اُس کے دائیں بائیں کون کون لوگ کھڑے ہیں اس کی نماز نہیں ہوتی"۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم الدین میں ایک حدیث نقل کی ہے: "کم من قائم حظہ من صلاتہ التعب والنصب" (کتنے ہی نماز پڑھنے والے ایسے ہیں کہ ان کا حصہ نماز میں بس اتنا ہے کہ اس سے تھکن اور کوفت حاصل کرتے ہیں) —— پس یہ جو کہا گیا ہے کہ نماز انسان کے لئے بنائی گئی ہے، تو اُس سے مقصود وہی نماز ہے، جس سے حضورِ قلب کی دولت بیدار رہتی ہے اور اس دولتِ بیدار کی برکتوں کا شمار نہیں۔ ہمارے "ایماں کی حرارت" والے ہم قوم اور ہم جماعت اگر نماز اور عبادت کے اس مفہوم سے آگاہ ہو جائیں اور اپنی نمازوں اور عبادتوں میں اسے برتیں، تو انفرادی اور جماعتی دونوں طرح کی زندگیوں میں ایک انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔

ایمیلی ڈی کنسن

ترجمہ: پروفیسر محمد مجیب

چند نظمیں

(ایمیلی ڈی کنسن (EMILY DICKINSON) یہ امریکہ کی ایک مشہور شاعرہ ہیں ، ۱۰ دسمبر ۱۸۳۰ء کو پیدا ہوئیں اور ۱۵ مئی ۱۸۸۶ء کو وفات پائی ۔ ایک عرصے تک ان کی شاعری کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ، ۱۹۱۲ء میں ایک غیر معروف شاعرہ کی حیثیت سے یاد کیا گیا اور اب امریکی ادب میں ان کی شاعری کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے اور بہت سے ادیبوں اور نقادوں کی نظر میں انیسویں صدی کی سب سے بڑی امریکی شاعرہ ہیں ۔)

انساں کے لئے وقت نکل گیا تھا ،

مگر خدا کے لئے ابھی آیا نہ تھا

کائنات کے بس میں نہ تھا کہ مدد کرے

مگر دعا ہماری طرف دار تھی ۔

کیا خوب وہ جنت

جو ملے جب دنیا نہیں مل سکتی ،
کیسا مہماں نواز لگتا ہے چہرہ
ہمارے پرانے پڑوسی، خدا کا !

میں نے کبھی کوئی دشت نہیں دیکھا
کبھی سمندر کو نہیں دیکھا ،
مگر میں جانتی ہوں کہ دشت کی جھاڑیاں کیسی ہوتی ہیں
اور سمندر کی لہر کیسی ہوتی ہوگی۔

میں نے کبھی خدا سے بات نہیں کی ،
نہ آسمان پر ملاقات کے لئے گئی۔
مگر مجھے یقین ہے کہ وہ جگہ کہاں ہوگی
جیسے اسے نقشے پر دکھایا گیا ہو۔

کیا ہوگا اگر میں کہوں کہ بس اب اور انتظار نہ کروں گی ؟

کیا ہوگا اگر میں اس گوشت و پوست کے پھاٹک کو توڑ کر

بھاگ نکلوں، تیرے پاس پہنچ جاؤں ؟

کیا ہوگا اگر میں اس فانی عنصر کو جھیل کر

بس اتنا دیکھوں کہ یہ کہاں دکھا رہا تھا

اور آزادی کے پایاب میں چلنے لگوں ؟

اب ہم کو وہ نہیں پکڑ سکتے ——

چاہے زمیں دوز قید خانے بلائیں، چاہے توپیں خوشامد کریں ؟

اب یہ سب میرے لئے بے معنی ہیں،

جیسے ہنسی جو گھنٹہ بھر پہلے آئی تھی

یا ابلیس، یا شہر شہر پھرتا ہوا تماشا

یا یہ سوال کہ کل کون مر گیا !

مجھے اپنے ٹوٹے ہوئے دل پر ناز ہے، اس لئے کہ تو نے اسے توڑا

مجھے اس درد پر ناز ہے جو تجھ سے ملنے سے پہلے محسوس نہ ہوا تھا،

مجھے اپنی رات پر ناز ہے اس لئے کہ تو نے اس کی پیاس کو چاندنی سے بجھایا،

اور میری درماندگی یہ کہ تیرے شوق میں شریک نہ ہو سکی۔

عشق زندگی سے قبل ہے،

موت کے بعد،

تخلیق کی ابتدا اور

سانس کا ترجماں

یہاں میرے ایک تیر لگا ہے،

میں اُس ہاتھ کو پیار کرتی ہوں جس نے اِس تیر کو چلایا،

تیر کا احترام کرتی ہوں

کہا جائے گا جنگ میں کام آئی !

مگر میری روح کو معلوم ہو گا کہ مجھے ختم کیا

ایک معمولی سے تیر نے

جسے کسی تیر انداز کی کمان نے اٹھایا تھا

اے دل، ہم اسے بھلا دیں گے !

میں اور تم، آج کی رات

تم اس گرمی کو بھلا دینا جو اس نے پیدا کی تھی،

میں روشنی کو بھلا دوں گی۔

جب تم اپنا کام کر چکو تو مجھے بتا دینا،

کہ میں اپنے خیالات کی لَو دھیمی کر دوں۔

مگر جلدی کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم تیاری میں لگے رہو

اور وہ مجھے پھر یاد آ جائے !

دل لاٹھی سے نہیں توڑا جاتا
نہ پتھر سے
میں نے دیکھا ہے کہ ایک چابک،
اتنا چھوٹا کہ نظر بھی نہ آئے،
اِس طلسمی ہستی کو مارتا رہا
یہاں تک کہ وہ گر گئی،
مگر شرافت دیکھئے
کہ چابک کا نام تک نہ بتایا۔
کیا اعلیٰ ظرف ہے اس پرند کا
جسے ایک لڑکے نے شکار کیا
کہ اسی پتھر کو گیت سناتا ہے
جس سے وہ ہلاک ہوا۔

میں اُس خواب کے کامل حسن پہ

صبح کا داغ نہ لگاؤں گی،

بس اپنی راتوں کو اس طرح ترتیب دوں گی،

کہ وہی خواب آئے اور پھر آئے۔

موت ایک مکالمہ ہے

روح اور خاک کے درمیاں

موت کہتی ہے، "گھل جاؤ مٹ جاؤ"۔ روح، "جناب،

میرے سپرد ایک اور کام ہے"۔

موت اس پر رشک کرتی ہے، زمین کے اندر سے بحث کرتی ہے۔
روح منہ پھیر لیتی ہے،
بس ثبوت کے لئے
خاک کی قبا کو اتار دیتی ہے۔

سمندر نے چشمے سے کہا "آؤ"
چشمے نے کہا، "مجھے بڑھنے دیجئے!"
سمندر نے کہا، "تب تو تم سمندر ہو جاؤ گے،
مجھے چشمہ چاہیئے، ابھی آجاؤ!"

خواجہ غلام السیدین

نامۂ خلوص

دوستو، میرا یہ خط آپ سب کے نام ہے جو پاکستان میں معلّمی کا یا لکھنے پڑھنے اور اس کے ذریعے زندگی کی صحیح قدروں کی ترجمانی اور اشاعت کا کام کرتے ہیں۔ میں نے بھی عمر بھر اپنی بساط کے موافق (اور کسی قدر چھوٹی ہے یہ بساط، بساطِ عالم کے مقابلے میں!) اسی قسم کا کام کیا ہے۔ کچھ پڑھا ہے، کچھ پڑھایا ہے، کچھ لکھا ہے، کچھ تقریریں کی ہیں اور اس کے پس پشت ہمیشہ یہ جذبہ رہا ہے کہ شریف قدروں کی خدمت کر سکوں۔ یوں تو ہر انسان کا فرض ہے، لیکن ہماری جماعت کا خاص طور پر فرض ہے، کہ وہ اپنی اور اپنے ملک اور قوم کی زندگی کا سختی کے ساتھ محاسبہ کرتی رہے اور سوچے کہ اُس نے زندگی کو جو ظلم اور ناانصافی، محرومی اور افلاس، جہالت اور تعصب سے بھری ہوئی ہے، سنوارنے اور سجانے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ یہ ضروری نہیں، ممکن بھی نہیں، کہ ہر شخص جریدۂ عالم پر اپنے دوام کی مہر لگا سکے۔ یہ خوش نصیبی تو کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ لیکن اپنے قول و فعل سے، اپنی تحریر و تقریر سے، اپنی چھوٹی سی دنیا میں شرافت اور صداقت، رواداری اور فراخدلی، ہمدردی اور محبت کا پرچار کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں بہت سے نبی اور ولی، رشی اور مُنی، مصلح اور مردانِ خدا آئے جنھوں نے زندگی کو ایک حسین قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی اور اس میں انھیں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن کچھ مدت کے بعد ان کے ابتدائی فیض اور تعلیم کا اثر کم ہو گیا اور انھوں نے جس شاہراہِ نور کی جھلک دکھائی تھی وہ رفتہ رفتہ ان کے پیروؤں کی آنکھ سے اوجھل ہو گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ عام انسانوں کی قلب ماہیت کے لئے محض ایک معجزہ کافی نہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے

رفقائے کار کی، جو دن بہ دن، سال بہ سال، صدی بہ صدی ان کے پیغامِ انسانیت کو دنیا کے کونے کونے میں عام کریں اور عام کرتے رہیں۔ اس لئے، با وجود انکسار کے، میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ دراصل یہ کام ہمارا ہے، اور وہ سیاسی لیڈروں اور اہل قوت و ثروت کے کاموں سے کہیں زیادہ اہم ہے، کم اہم نہیں۔ ان کے کھیل میں اکثر ناپاک مقاصد اور نامبارک ذریعوں کی آمیزش ہوتی ہے جو نہ ہم لوگوں کے لئے قابل احترام ہیں نہ لائق تقلید!

ہمارے کام کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نسل اور رنگ، مذہب، ذات پات، تاریخ اور جغرافیہ کی تقسیم اور تفریق سے بلند ہے بلکہ شاید مجھے کہنا چاہئے کہ اس کو ان سے بلند ہونا چاہئے۔ کیونکہ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اہلِ علم، اہلِ قلم اور اہلِ فکر نے سیاسی دباؤ اور جبر سے مغلوب ہو کر یا کسی لالچ کے طلسم میں گرفتار ہو کر، بجائے حق اور صداقت کا علم بلند کرنے کے گھٹیا مقاصد کی چاکری قبول کر لی۔ ادیبوں، عالموں اور مفکروں کا ایسا کرنا، میرے نزدیک، نہ صرف علم، ادب اور فکر کے ساتھ بلکہ ہماری مشترک انسانیت کے ساتھ بھی غداری ہے۔

ہمارے ملکوں میں گزشتہ بیس سال سے بہت سے سیاسی اور اقتصادی اختلافات چلے جاتے ہیں۔ یہ بڑی بدقسمتی ہے لیکن میں اس وقت ان کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میری یہ دعا اور خواہش ضرور ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر آمین کہیں، کہ خدا ہم سب کو اتنی عقل اور توفیق دے کہ ہم اپنے باہمی تعلقات اور مراسم میں اتفاق کو اختلاف پر، وصل کو فصل پر، محبت کو نفرت پر، اعتماد کو شک پر ترجیح دیں لیکن مشکل یہ ہے کہ دُعا کرنا کافی نہیں۔ جس دُعا کے پیچھے خلوص اور عمل نہ ہو، اس کی قبولیت کا خدا نے کبھی وعدہ نہیں کیا۔ مانتا ہوں کہ ان سیاسی جھگڑوں کو سلجھانا براہِ راست ہمارے بس کی بات نہیں۔ لیکن کیا ہم اپنے دل اور دماغ کی قوتوں کو، اپنے قلم اور زبان کو اِس طرح استعمال نہیں کر سکتے کہ رفتہ رفتہ ہمارے ہم وطنوں اور ہم جنسوں کے دل اور دماغ میں فراخی اور رواداری پیدا ہو اور وہ آدمی کا احترام کرنا سیکھیں جس کو اقبال نے آدمیت کی بنیاد کہا ہے، آدمیت جو خدا کے طریقہ کو اپنا کر کفر و دین دونوں کو اپنے حریمِ قلب میں

جگہ دیتی ہے، جو حرفِ بد زبان پر نہیں لاتی کیونکہ جانتی ہے کہ کافر اور مومن سب خدا کے بندے ہیں اور
ان پر ایک ہی انداز میں شفقت کرتی ہے۔ جس کے نزدیک دل سے دل کا بھاگنا سب سے بڑا
گناہ ہے! آج کل ساری دنیا میں سیاسی بدعنوانیوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے جو تاریکی چھائی
ہوئی ہے اور انسانیت جن محرومیوں کا شکار ہے، ان کو دور کرنے کی کوشش کرنا ہمارا آپ
کا کام ہے، مشترکہ کام ہے۔ جب دوسرے لوگ آگ لگائیں، تعلیم اور ادب کا فرض ہے کہ وہ
اس کو بجھائیں، ہوا نہ دیں۔ اگر ہم خلیل اللہ کی سنت تازہ کرنا چاہتے ہیں، جو کسی خاص مذہب کی
سنت نہیں بلکہ سنتِ الٰہی ہے، تو ہمیں یاد کرنا چاہئے کہ

آوازۂ خلیل ز بنیادِ کعبہ نیست
مشہور گشت زاں کہ بہ آتش نکو نشست

دورِ حاضر میں صرف ہندوستان اور پاکستان ہی کی نہیں بلکہ ساری دنیا کی فلاح ایک ہو گئی ہے۔ جو لوگ
اس حقیقت کو نہیں جانتے یا نہیں مانتے وہ نہ صرف مفادِ عالم کے مطالبوں سے ناواقف ہیں بلکہ
اپنے وطن کے حقیقی مفاد کو بھی نہیں سمجھتے۔ کسی قوم کی زندگی پائیدار بنیادوں پر صرف اس وقت
قائم ہو سکتی ہے جب اس کا رشتہ شرافت اور دیانت کے ساتھ جوڑا جائے۔ یہ بات سچ ہے خواہ
کمزور یا ظاہر بیں نگاہوں کو تاریخ میں اس کی شہادت نہ ملے۔ اس بات کو بار بار دہرانا، اس پر زور
دینا، ناموافق فضا میں اس کا علم بلند کرنا، ذوقِ نغمہ کم ہو تو نوا کو زیادہ تلخ کر دینا ہم سب کا کام
ہے۔ اگر ہم بھی پانی کے ساتھ بہنے اور ہوا کے ساتھ اڑنے لگیں تو انسان کی نجات کس طرح ممکن
ہوگی؟ نمک کی کھوئی ہوئی نمکینی کیسے واپس آئے گی؟ انسانوں کے باہمی تعلقات میں جو تلخی،
نفرت، تشدد اور ناروا داری بڑھتی جاتی ہے، اس کی روک تھام کیسے ہوگی؟ اگر ہم سیاسی مخالفوں
کو مارِ آستین کی طرح پالتے رہیں گے تو یہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے؟ کبھی نہ کبھی تو عقل اور دانش
مندی کی شمع ہاتھ میں لیکر ان کو امن اور آشتی کی فضا میں طے کرنا ہوگا۔ پھر کیوں نہ انھیں سلجھانے
کے لئے ابھی قدم اٹھائیں، بجائے اس کے کہ، ہار جیت مار کر، ہر طرح کا جانی اور مالی نقصان

تاکہ ایسا کرنے کی کوشش کریں۔ اور یاد رکھئے کہ جان اور مال کے نقصان سے کہیں زیادہ خطرناک ہے شرافت، انسان دوستی اور ذہنی میل جول کا نقصان جو دونوں ملکوں کو گھن کی طرح کھا رہا ہے اور ان کی قدروں کو مسموم کر رہا ہے۔ کیا ہمیں پوری طرح اس بات کا احساس ہے کہ آج کل ہندوستان اور پاکستان میں کتابوں اور رسالوں کی آمد و رفت بھی تقریباً ممنوع ہے یعنی علم اور فکر پر بھی پہرے بٹھا دئے گئے ہیں؟ ہم امریکہ اور روس اور جرمنی کی کتابیں اور رسالے پڑھ سکتے ہیں، وہاں کا سفر بھی کر سکتے ہیں لیکن ہندوستانی پاکستانی علم و ادب سے اور پاکستانی ہندوستانی فکر و فلسفہ سے فیض یاب نہیں ہو سکتا!

میں جانتا ہوں کہ ان دونوں ملکوں میں کروڑوں بندگانِ خدا ایسے ہیں جن کو ایک دوسرے سے کوئی خاص پرخاش نہیں اور لاکھوں ایسے ہیں جن کے باہمی مراسم عزیزانہ اور دوستانہ ہیں۔ لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتے کہ سیاست کی موجودہ فضا میں ایسا کرنا گویا جرم ہے۔ ہندوستان میں کوئی "پاکستان زندہ باد" نہیں کہہ سکتا۔ پاکستان میں کسی کو "ہندوستان زندہ باد" کہنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ ایسا کرنا تو اپنے ملک کے ساتھ غداری سمجھا جائے گا! دوستو! میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا ہم میں کوئی ایسا ہے جو واقعتاً چاہتا ہے کہ ہندوستان یا پاکستان زندہ نہ رہے؟ اگر ہمارے مفکروں اور معلموں کی قدریں صالح ہوں تو ہم اپنے بچوں کو نہ صرف فراخدلی سے "ہندوستان زندہ باد" اور "پاکستان زندہ باد" کہنا سکھائیں بلکہ انھیں "انسانیت زندہ باد" کہنے کی، اور دل سے کہنے کی تعلیم دیں کہ اسی میں سب کا بھلا ہے۔ جو سب کا بھلا نہیں چاہتا وہ کسی کا بھلا نہیں چاہتا۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، مانیں یا نہ مانیں، زمانے کی نئی سائنسی اور اقتصادی قوتوں نے دنیا کو ایک بنا دیا ہے اور ایٹم بم کا کم سے کم یہ احسان ہے کہ اس نے انسان کی ناقابلِ شکست وحدت کا پیغام آسمان پر آگ کے حرفوں میں لکھ دیا ہے۔ یا تو ہم سب ایک دوسرے کی مدد سے عصرِ حاضر کے تاریک طوفان سے تیر کر نکل سکتے ہیں یا سب کو ایک ساتھ ڈوبنے کی سعادت نصیب ہو گی! اگر خواص اور عوام اس پیغام کو نہیں پڑھ سکتے یا نہیں پڑھنا چاہتے تو ہمارا اور آپ کا فرض ہے کہ اس کو

مضبوطی اور دل سوزی کے ساتھ ان کے دل اور دماغ میں بٹھائیں۔ کامیابی ہمارے ہاتھ میں نہ ہو لیکن کوشش ہمارا کام ہے۔

اگر اجازت ہو تو معذرت کے ساتھ اور دوستی کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک بات اور عرض کر دوں اور یہ جرأت اس وجہ سے کرتا ہوں کہ جب میرے ملک میں بھی کوئی نامناسب یا خلاف انسانیت بات ہوتی ہے تو میں حتی الامکان اس پر تنقید کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ کسی معاملہ کا فیصلہ کبھی بد زبانی کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ابھی تک دنیا نے عام طور پر اور خاص کر ہمارے ملکوں نے اس روشن حقیقت کو تسلیم نہیں کیا۔ میں کبھی کبھی آپ کے ریڈیو کا ایک پروگرام سنتا ہوں جس کا نام ہے "ندائے حق"۔ یقین جانئے کہ مجھے اس سے بہت دکھ ہوتا ہے کہ بعض پاکستانی حضرات اس پروگرام میں ایک پوری قوم، ایک ملک، ایک تہذیب کی شان میں نہایت ناشائستہ لفظ استعمال کرتے ہیں، ایک ایسی تہذیب جس نے دنیا کے تہذیبی کیسہ میں یقیناً بڑی دولت دان کی ہے۔ شاید ہمارے ریڈیو سے بھی نامناسب باتیں کہی جاتی ہوں لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے کبھی ایسے رکیک الفاظ پاکستان کے بارے میں اپنے کانوں سے نہیں سُنے۔ ہمارے ایک بلند پایہ اور بلند نظر شاعر علی سردار جعفری نے کہا ہے:

کم ظرفیٔ گفتار ہے دشنام طرازی
تہذیب تو شائستگیٔ دیدۂ تر ہے

اور ہمارے اور آپ کے مشترک شاعر اقبال نے ہمیں یہ پیغام دیا تھا:

سخن درشت مگو در طریق یاری کوش
کہ صحبت من و تو در جہاں خدا سازست

دوستو! کیا ہم اور آپ مل کر اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ باوجود مذہبی اور سیاسی اختلافات کے تہذیب کی وضع داری کو ہاتھ سے نہ دیں؟ کیا ہم اور آپ جو لفظوں کا بیوپار کرتے ہیں اور حسن و فا کی طلب کا دعویٰ، کم سے کم اپنے قلم کی زبان کو نفرت اور حقارت کی آمیزش سے پاک نہیں رکھ سکتے کیا

ایک مشترک انسانیت کے امین ہیں؟

میرے عقیدے میں شرافت کی قدروں کا تحفظ ایک ایسا فرض ہے جو جغرافی حدبندیوں کا پابند نہیں۔

جب انسان کی عمر کی کشتی پرے کنارے پر آلگتی ہے اور وقت حساب آنے والا ہوتا ہے تو ڈوبتے سورج کی روشنی میں ایک "لمحہ صداقت" اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس سے کچھ جواب مانگتا ہے۔ کہتا ہے تم نے زندگی کا مطلب کیا سمجھا، اس کو کس جھنڈے کے تلے بسر کیا؟ اگر ہم بزدلی دکھائیں اور اس کی طرف سے منہ موڑلیں یا بے حسی دکھائیں اور اس کو دیکھیں ہی نہیں تو سمجھ لیجئے کہ ہماری ساری زندگی رائیگاں گئی۔ ہم سب کو فرداً فرداً اس سوال کا جواب دینا لازم ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ اس کا کیا جواب دیں گے، خواہ آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں یا پاکستان کے۔ لیکن میں اپنی طرف سے ایک ہی جواب دے سکتا ہوں گو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ میرے قول اور فعل نے ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ دنیا میں صرف ایک حقیقت ہے انسان کی انسان سے محبت، باقی سب فنا کا مال ہے! یہ محبت "جس میں صبر ہوتا ہے اور شفقت، جو رشک سے پاک ہوتی ہے، جو پراپگنڈا سے پرہیز کرتی ہے۔ جو جھوٹے دعوے نہیں کرتی، جو بدزبانی نہیں کرتی، خود غرضی نہیں دکھاتی، جو زچ نہیں ہوتی، جو بُرا نہیں مانتی، جو دوسروں کی غلطیوں پر خوش نہیں ہوتی، جو اُن کی اچھائیوں پر خوش ہوتی ہے، جو عیب جوئی میں تاخیر کرتی ہے، جو دوسروں کے بارے میں خوش فہمی کو سوءظن پر ترجیح دیتی ہے، جو امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی، جو ہر بات میں صبر سے کام لیتی ہے ... تین ہی چیزیں پائندار ہیں، ایمان، امید اور محبت لیکن ان سب میں مقدم محبت ہے!"

یہ تو آپ نے انجیل مقدس کی زبان میں محبت کا گیت سنا، محبت اپنی سب سے پاک اور برتر شکل میں۔ چاہتا ہوں کہ یہی پیغام آپ کو اقبال کی زبانی بھی سنا دوں جیسا آپ یقیناً پہچان لیں گے۔ یہ ان کی لافانی نظم مسجد قرطبہ کا ایک بند ہے:

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر — کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

اول و آخر فنا، ظاہر و باطن فنا — نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام — جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود — عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

سید غلام ربانی

فیروز شاہ تغلق کی یادگاریں

شاہ جہاں اپنے جاہ وحشم یا شہنشاہی کے لئے اتنا مشہور نہیں ہے جتنا اپنی عمارتوں کے لئے ہے۔ اتنی خوبصورت عمارتیں شاید ہی کسی تاجدار نے بنوائی ہوں۔ دنیا بھر کے لوگ انھیں دیکھنے آتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں تو دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ان کے حسن کا ایک راز یہ بھی ہے کہ سر سے پاؤں تک سنگ مرمر سے بنی ہیں۔ یہ مرمر بھی اعلیٰ قسم کا ہے جس میں موتی کی سی آب ہے۔ شاہجہاں کو سنگ مرمر اتنا پسند تھا کہ آگرہ اور لاہور کے قلعوں میں جو عمارتیں اکبر اور جہانگیر نے بنوائی تھیں، ان کو بھی سنگ مرمر کا لباس پہنا دیا، یہی وجہ ہے کہ اس کا عہد "مرمریں عہد" کہلاتا ہے۔

عمارتیں بنوانے کا شوق اس سے پہلے دلی کے ایک اور بادشاہ کو بھی ہوا تھا جس کا نام فیروز شاہ تغلق تھا۔ اس نے اپنے طویل عہد میں بہت سی عمارتیں بنوائیں لیکن یہ عمارتیں خوبصورتی میں شاہجہانی عمارتوں کو نہیں پہونچتیں البتہ ایک بات میں فیروز شاہ تغلق شاہجہاں سے بڑھا ہوا تھا، وہ یہ کہ اس نے پرانی تاریخی عمارتوں کی مرمت کرائی اور ان کے تحفظ کا انتظام کیا اور کہا جا سکتا ہے کہ فیروز شاہ کا یہ عمل آرکیولوجی (علم الآثار) کی طرف پہلا قدم تھا، اس موقع پر اس کی تعمیری سرگرمیوں کا کچھ حال بیان کیا جاتا ہے۔

۱۳۵۱ء میں سلطان محمد تغلق کا انتقال ہوا اس کے کوئی بیٹا نہیں تھا، اس کا چچازاد بھائی فیروز شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ بہت رحمدل اور خدا ترس تھا۔ سلطان محمد تغلق نے جن لوگوں کو قتل کرا دیا تھا، ان کے وارثوں کو تلاش کر کے فیروز شاہ نے ان کو خون بہا دیا اور راضی کر کے

ان سے معافی نامے لکھوائے، اسی طرح جن لوگوں کے ہاتھ پاؤں کٹوا دئے تھے یا جن کو اندھا کر دیا تھا ان کو بھی روپے دے کر ان سے معافی نامے لکھوائے، ان سب دستاویزوں کو ایک صندوق میں بھر کر محمد تغلق کی قبر کے سرہانے دفن کرا دیا تاکہ اس کی روح کو ثواب پہونچے۔

مقبرہ میں خانہ کعبہ کے پردے چڑھائے اور مقبرہ پر صندل کا چھپر کھٹ چڑھایا اس مقبرہ کا نام دارالامان رکھا، کوئی مجرم خواہ خونی ہی کیوں نہ ہو، اس میں گرفتار نہیں کیا جاتا تھا۔

فیروز شاہ نے رفاہ کے بہت کام کئے جگہ جگہ مدرسے، خانقاہیں، سرائیں، پُل، تالاب، مسجدیں، حمام بنوائے۔ دارالشفا میں غریبوں اور محتاجوں کا علاج ہوتا تھا اور ان کو کھانا بھی ملتا تھا۔

ملک کی خوش حالی کے لئے ستلج اور جمنا سے دو نہریں نکالیں، ان میں سے ایک (ایسٹرن جمنا کنال) کو ہم نے بھی دیکھا ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ اس نے پچاس ندیوں پر بند بندھوائے اور ڈیڑھ سو پل تعمیر کئے۔ اپنے تعمیری شوق کے بارہ میں وہ خود "فتوحات فیروزی" میں لکھتا ہے:

"......خدا نے اس ناچیز بندہ کو جو نعمتیں بخشی ہیں، ان میں تعمیر کا شوق بھی عطا کیا ہے......"

اس نے چار شہر جونپور، حصار، فتح آباد اور فیروز آباد بسائے۔ یہ چاروں شہر قلعہ بند تھے۔ حصار کو تاریخ نویسوں نے حصار فیروزہ لکھا ہے۔ فیروز آباد بہت بڑا شہر تھا جو دلی کے جنوب میں جمنا کے کنارے آباد کیا گیا تھا اور ہندو رائے کے باڑہ تک پھیلا ہوا تھا، بھوجلا پہاڑی، بلبلی خانہ، رضیہ بیگم کی قبر، کلاں مسجد سب اس کے محلے تھے۔ شہر میں آٹھ جامع مسجدیں تھیں، ہر ایک میں دس دس ہزار نمازیوں کی گنجائش تھی، اس سے شہر کی آبادی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فیروز شاہ کا تعمیری شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا مگر اس کے پاس شاہجہاں کی سی دولت نہیں تھی، اس لئے کفایت سے کام لیا اور ایسی عمارتیں بنوائیں جن پر کثیر رقم خرچ نہیں ہوتی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ محمد تغلق کے آخری زمانے میں سلطنت کو زوال آگیا تھا۔ اس کی سخت گیری کی وجہ سے کئی صوبے اس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے، انہیں دنوں (۱۳۴۴ء) دلی میں سخت قحط پڑا، بہت لوگ

تلاش معاش میں ادھر اُدھر چلے گئے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ محمد تغلق نے دلی کی جگہ دیوگری (دولت آباد) کو دارالحکومت بنایا اور دلی والوں کو مجبور کیا کہ وہ سب دولت آباد چلے جائیں، چنانچہ سب کے ساتھ نقشہ نویس، معمار، سنگ تراش، پچی کار اور تجربہ کار کاریگر سب چلے گئے بہت سے راستے میں مرکھپ گئے اور جب دلی والوں کو واپس کے لئے کہا گیا تو بہت سے کاریگر اور معمار واپس نہیں ہوئے اور دکن کے مختلف مقامات میں تتر بتر ہو گئے۔

ایسی حالت میں فیروز شاہ کو عمارتیں بنوانے میں بڑی دقت پیش آئی مگر اس کا شوق ان سب مشکلات پر غالب آیا اور اتنی عمارتیں بنوائیں کہ اس وقت تک کسی بادشاہ نے نہیں بنوائی تھیں اس نے تعمیر میں ایک خاص طریقہ رائج کیا جو اس کے نام سے "فیروزی طرز" یا تغلق اسٹائل کہلاتا ہے۔

اس سے پہلے عمارتوں میں سنگ سرخ اور سنگ مرمر استعمال ہوتا تھا، اس نے سنگ خارا سے کام نکالا اس سے پہلے عمارتیں تراشیدہ پتھروں سے بنتی تھیں، اس نے عمارتوں میں اکھڑ پتھر استعمال کرائے۔ دروازے، ستون، چوکھٹ اور سردل وغیرہ ایک ڈال کے پتھر کے لگوائے۔ ان کی سطح کے کھردرے پن کو اس طرح دور کیا گیا کہ ان پر چونے کی تہہ جما دی اور مہین چونے کی استر کاری کرا دی گئی۔

خاندان غلاماں اور خلجی کے دور میں جو عمارتیں بنی تھیں ان پر اعلیٰ قسم کی منبت کاری ہوئی تھی اور سنگ سرخ میں سنگ مرمر کی لوحیں بڑی نفاست سے بٹھائی جاتی تھیں۔ فیروز شاہ کو اچھے سنگ تراش اور پچی کار میسر نہیں تھے۔ اس کا بدل یہ کیا گیا کہ چونے کی استر کاری میں نقش و نگار بنوائے گئے۔

دیواریں سلامی دار ہوتی تھیں یعنی اجارہ سے اوپر تک پتلی ہوتی چلی گئیں۔ اس کی وجہ سے دیواروں کے کونے نوّے درجہ کا زاویہ نہیں بناتے بلکہ کرسی وضع کے پہلودار ہو گئے ہیں۔ دروازے تنگ اور اندر کو دھنسے ہوئے ہیں۔ دیواروں میں مخروطی مینار پیوست ہیں جو پشتیبان کا کام بھی دیتے ہیں، گنبد چپٹے اور پست ہیں یہ عمارتیں حسن کے معیار سے تو گری ہوئی ہیں مگر مضبوطی اور استحکام

میں چٹان ہیں چنانچہ اس عہد کی مسجدیں اور مقبرے اچھے خاصے قلعے معلوم ہوتے ہیں۔

فیروز شاہ کا یہ طرز تعمیر بہت مقبول ہوا اور مالوہ اور دکن تک پھیل گیا چنانچہ مانڈو، بہاپور، گلبرگہ، بیدر اور گولکنڈہ میں یہی طرز کارفرما ہے۔ قطب شاہی خاندان کے بانی سلطان قلی کے مقبرہ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ محمد تغلق کا مقبوہ دلی سے اٹھا کر گولکنڈہ میں لا رکھا ہے۔ ہندوستان کے اسلامی فن تعمیر کی تاریخی کتابوں میں "تغلق اسٹائل" ایک مستقل باب بن گیا ہے۔

قلعہ بند شہروں میں سب سے زیادہ عمارتیں اس نے اپنے دارالحکومت فیروز آباد میں بنوائی تھیں جس کی فصیل سے جمنا کا پانی ٹکراتا تھا۔

تغلق خاندان کے بانی غیاث الدین نے جب تغلق آباد بسایا تو شہر پناہ کے اندر ایک چھوٹا سا قلعہ بھی بنوایا تھا جس میں شاہی محل تھے قرون وسطی میں یورپ کے بادشاہوں کے لئے اسی قسم کے قلعے بنتے تھے۔ فیروز شاہ نے بھی فصیل کے اندر قلعہ بنوایا جس کو اب "کوٹلہ" کہتے ہیں۔

اس قسم کے قلعے بیدر، گلبرگہ، گولکنڈہ میں اب تک موجود ہیں۔ ان کی اچھی مثال آگرہ، دلی اور لاہور کے قلعے ہیں۔ یہ قلعے نہیں ہیں بلکہ قلعہ نما شاہی محلات ہیں، چنانچہ دلی والے لال قلعہ کو لال حویلی ہی کہتے ہیں۔

فیروز شاہ کا کوٹلہ اب کھنڈر کی شکل میں باقی ہے مگر ان ٹوٹی پھوٹی عمارتوں سے ان کی عظمت کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ یہ کوٹلہ بلند حصار سے گھرا ہوا تھا جس میں جگہ جگہ برج تھے۔ فصیل پر کنگورے تھے دروازہ استحکام کے لحاظ سے دمدمہ معلوم ہوتا تھا اس کی حفاظت کے لئے سامنے گھونگھٹ کی دیوار تھی۔ اندر کی طرف پہرہ داروں کے حجرے یا بارکیں تھیں۔

حصار کا اندرونی رقبہ مربع اور مستطیل احاطوں میں منقسم تھا جن میں تخت محل یا دیوان خاص دیوان عام اور ایسے ایوانات تھے جن میں ارکان سلطنت سے ملکی معاملات یا دوسرے امور پر مشورہ ہوتا تھا۔ ان احاطوں سے جو بہت بڑا رقبہ بچ گیا اس میں مختلف عمارتیں تھیں۔ جگہ جگہ چمن، انگوری باغ، حوض، تالاب، بھول بھلیں، بارہ دری، حمام، بارکیں، اسلحہ خانہ، دینار خانہ

اور شاگرد پیشہ لوگوں کے مکانات تھے وسط میں بہت بڑی جامع مسجد تھی جو اب بھی اچھی حالت میں باقی ہے[1]۔ اس کے علاوہ اور کئی چھوٹی چھوٹی مسجدیں تھیں جن میں ایک بادشاہ کے لئے مخصوص تھی، اس قسم کی مسجدیں دو سو برس بعد مغلوں نے بھی بنوائی تھیں۔ آگرہ کی موتی مسجد اور دلی میں لال قلعہ کی موتی مسجد شاہی مسجدیں ہیں۔ یہ عبادت گاہیں روم اور بازنطینی فرمانرواؤں کے "Chapel Royal" کا پتہ دیتی ہیں۔

کوٹلہ فیروز شاہ میں ایک یادگار عجیب ہے یہ عمارت بیچ میں ایک نمایاں مقام پر بنائی گئی ہے۔ ایک بہت بڑا مربع چبوترہ ہے جس کے چاروں طرف مکانوں کا سلسلہ ہے، اس کے اوپر ذرا چھوٹا چبوترہ اسی وضع کا کانوں دار بنایا گیا ہے۔ اسی طرح چبوترہ پر چبوترہ بنتا چلا گیا ہے اور بالکل اہرام کی شکل بن گیا ہے۔ اس کی چوٹی پر اسی تغلق حکمران نے اشوک کا ایک مینار نصب کیا ہے جو انبالہ کے قریب سے لایا گیا تھا یہ ایک ٹال کی کرنڈ کی لاٹھ ہے[2]۔

لاٹھ پر ایک خوبصورت برجی بنائی گئی جس پر سونے کے پترے چڑھائے گئے اور اس کا نام "مینارۂ زریں" رکھا گیا۔ اس کی تکمیل کی خوشی میں بڑی دھوم سے جشن منایا گیا۔ یہ تعمیر ایک رسم کی تجدید تھی۔ قطب الدین ایبک نے مسجد قوت الاسلام کے صحن میں کمار گپتا کی لوہے کی لاٹھ نصب کی تھی یہ لاٹھ متھرا سے لائی گئی تھی جہاں وہ چھ سو برس سے قائم تھی۔ بالکل اسی طرح فیروز شاہ نے شاہی محلوں کے بیچ میں بدھ مت کی یہ لاٹھ نصب کی جو سولہ سو برس پرانی تھی۔

دلی اور اس کے نواح میں چند مسجدیں ایسی بنوائی تھیں جو تغلق طرز کو اچھی طرح پیش کرتی ہیں

---

[1] ۱۳۹۸ء میں جب امیر تیمور نے دلی میں قتل عام کیا تو اسی مسجد میں پیشوایان دین نے امان مانگی تھی تیمور نے امان دے دی۔

[2] اس لاٹھ کے لانے اور نصب کرنے کا دلچسپ حال شمس سراج نے "تاریخ فیروز شاہی" میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "مینار" جو جامعہ بابت نومبر ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں چھپ چکا ہے۔

ان میں کالی مسجد (۱۳۷۰ء) جہاں پناہ[1] میں، بیگم پوری مسجد (۱۳۷۰ء) تیمور پوری میں درگاہ شاہ عالم کی مسجد (۱۳۷۵ء) جہاں پناہ میں کھڑکی مسجد (۱۳۷۵ء) شاہجہاں آباد میں کلاں مسجد۔ ان میں سے آخری دو مسجدیں دیکھنے والے کو متاثر کرتی ہیں۔ یہ دونوں تہ خانوں پر اٹھائی گئی ہیں یہ تہ خانے محرابوں پر قائم ہیں۔ بلند کرسی کی وجہ سے ان میں کچھ شان پیدا ہو گئی ہے۔ ان کا نقشہ صلیب نما ہے۔ چاروں کونوں پر برج بنے ہوئے ہیں داخلہ دروازہ کے پاکھوں میں مخروطی مینار پیوست ہیں۔ ان میں داخل ہوں تو کمانوں اور ستونوں کا ایک جنگل نظر آتا ہے۔ یہ فیل پائے چھوٹے اور موٹے ہیں جن کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے ان کی چھتیں چھوٹے چھوٹے پیالہ نما گنبدوں سے بنائی گئی ہیں۔ ایک کھڑکی کی مسجد کی چھت پر اکیاسی ۸۱ گنبد ہیں جن سے یہ چھت کچھوے کی پیٹھ معلوم ہوتی ہے۔

اس عہد کے مقبروں میں خود فیروز شاہ تغلق کا مقبرہ سب سے نمایاں ہے یہ مقبرہ مہرولی میں حوض خاص کے پاس پر فضا جگہ موجود ہے۔ اس عہد کے لحاظ سے عمارت میں موزونی زیادہ ہے، دیواریں وہی سلامی دار گنبد پست اور چپٹا ہے جو ہشت پہل پایہ پر قائم ہے۔ مقبرہ کا حجرہ مربع ہے جس کے چاروں کونوں میں پکھرائی ٹائلیں Squinches بنی ہوئی ہیں۔

فیروز شاہ نے عمارتیں تو بہت سی بنوائیں لیکن ایک کام ایسا کیا جو ہندوستان کے کسی بادشاہ نے نہیں کیا وہ یہ کہ اس نے پرانی تاریخی عمارتوں کی مرمت کرائی، وہ خود اپنے قلم سے لکھتا ہے:

"...... میں نے قطب مینار کی مرمت کرائی اور ساتھ ہی بلندی میں اضافہ کیا ساتواں درجہ میں نے بنوایا ہے اور یہ لاٹھ مینارہ ہفت منظری کے نام سے

---

[1] سلطان محمد تغلق نے "شہر جہاں پناہ" آباد کیا تھا اس کا ارادہ تھا کہ اس وقت کے چاروں شہروں (مختلف دلیوں) کو ملا کر ایک فصیل ان کے گرد بنوا دے مگر یہ کام ادھورا رہ گیا (ابن بطوطہ)

موسوم ہوئی[۱]......"

سلطان علاء الدین کا مقبرہ قطب الدین مبارک کے عہد میں بنا، یہ مسجد قوت الاسلام کی پشت پر تعمیر ہوا تھا۔ اس وقت یہ مقبرہ ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر ہے۔ فیروز شاہ لکھتا ہے:

"......میں نے اس کی مرمت کرائی اور قبر پر صندل کا چھپر کھٹ چڑھایا......"

موضع ملک پور میں معزالدین بہرام کا مقبرہ تھا اب اس کے صرف آٹھ ستون باقی رہ گئے ہیں اس کی مرمت بھی فیروز شاہ نے کرائی۔

اسی موضع میں رکن الدین فیروز کا مقبرہ ہے یہ بادشاہ سلطانہ رضیہ سے لڑکر پکڑا گیا اور قید میں مرا۔ فیروز شاہ نے ازسرنو اس کی مرمت کرائی۔ آگے چل کر لکھا ہے:

"......شمس الدین التمش کے مقبرہ کی عمارت باہر سے سنگ خارا کی اور اندر سے سنگ سرخ کی ہے کہیں کہیں سنگ مرمر بھی ہے اس مقبرہ پر ستون دار گنبد بھی تھا جو گر پڑا ہے میں نے اس مقبرہ کی مرمت کرائی اور قبر پر صندل کا چھپر کھٹ چڑھایا...."

"......حوض علائی یا حوض خاص درحقیقت علاء الدین خلجی کا بنوایا ہوا ہے۔ یہ حوض مٹی سے بھر گیا تھا میں نے ۷۵۴ھ میں اس حوض کی صفائی کرائی اور یہاں ایک مدرسہ بنوایا[۲]....."

"......درگاہ حضرت نظام الدین میں جو جماعت خانہ ہے اس کو نئے سرے سے میں نے بنوایا ہے......"

---

[۱] فتوحات فیروزی

[۲] یہ مدرسہ اب بھی باقی ہے، اس سے ملا ہوا خود فیروز شاہ تغلق کا مقبرہ ہے۔

آج کل ترقی یافتہ اور مہذب ملکوں میں آثار قدیمہ کی تلاش اور تحفظ پر بڑی توجہ دی جا رہی ہے۔ کھدائیوں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے اور پرانے زمانہ کی ایک ایک اینٹ کو بھی سینت سینت کر رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کے گورنر جنرل ولیم بنٹنگ نے تجویز کی تھی کہ تاج محل کا سنگ مرمر نیلام کر دیا جائے لیکن جب حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ عمارت تڑوانے میں اس قدر اخراجات ہوں گے کہ سنگ مرمر کی فروخت سے اس کی پابجائی نہ ہو سکے گی۔ اس پر وہ لاچار ہو گیا پتھر بھاری تھا چوم کر چھوڑ دیا۔

اسی طرح کا ایک بُرا وقت دلی کی جامع مسجد پر بھی پڑا تھا یہ ۱۸۵۷ء کے کچھ دنوں بعد کا بات ہے مگر شاید شاہجہاں کی نیک نیتی کام آئی اور اس کی یہ دونوں پاکیزہ عمارتیں بچ گئیں۔ فیروز شاہ تغلق کا چھ سو برس پہلے آثار قدیمہ کی مرمت کرانا اگر تعجب نہیں تو لائق آفریں ضرور ہے۔

سید جعفر رضا بلگرامی

ہماری خود غرضیاں

ہر انسان اچھی فطرت کا حامل ہوتا ہے اور اُس میں قدرتاً دو طرح کے جذبے کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک جذبہ تو اپنی خواہشات کی تسکین کا ہوتا ہے اور دوسرا غیروں کی امداد کا۔ یہ دونوں ہی جذبے اپنی جگہ اچھے ہیں کیونکہ اگر ایک سے انسان کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے تو دوسرے سے سماج کی تشکیل۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ دونوں جذبے متضاد ہیں جس کی وجہ سے انسان ہمیشہ اس کشمکش میں مبتلا رہتا ہے کہ اپنی خواہشات کی تسکین کرے یا دوسرے کی امداد۔ اِسی کشمکش سے ضمیر پیدا ہوتا ہے جو ان دونوں جذبوں کے درمیان توازن قائم رکھتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ضمیر خود غیر جانبدار رہے۔ اِس کی غیر جانبداری مستحکم رکھنے کے لئے کچھ اُصول مرتب کر لیے گئے ہیں جن کو بہ حیثیت مجموعی ہم "مذہب" کہتے ہیں۔ چونکہ دوسروں کی امداد کے مقابلہ میں اپنی خواہشات کی تسکین زیادہ آسان و مفید ہوتی ہے اس لئے انسان زیادہ تر اسی جذبہ کی طرف مائل رہتا ہے۔ کچھ دن بعد پھر ضمیر بھی غیر جانبدار نہیں رہ پاتا اور اس کے فیصلے خود غرضانہ ہونے لگتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں جذبے اپنی متعین حدود سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اپنی خواہشات کی تسکین کا جذبہ جب ایک حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو "خود غرضی" بن جاتا ہے۔ اسی طرح جب دوسروں کی امداد کا جذبہ ایک حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو "قربانی" بن جاتا ہے۔ بڑھتی ہوئی "خود غرضی" دوسروں کے استحصال پر منتج ہونے لگتی ہے اور بڑھتی ہوئی "قربانی" کسی انقلاب کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے خود غرضانہ استحصال اور کوئی انقلاب ہی بڑھ کر چھین سکتا ہے۔ امریکہ، فرانس اور رُوس کے انقلابات کسی نہ

کسی نوعیت کے خودغرضانہ استحصال کے سدِباب کے لئے ہی تھے۔

اچھی مملکتیں اچھے افراد سے بنتی ہیں۔ اچھے افراد وہ ہیں جو اپنی خواہشات اور دوسرے کی امدا کے فطری جذبوں میں توازن برقرار رکھ سکیں۔ آج کے انتشار کی اصل وجہ یہی ہے کہ افراد یہ تواز کھو بیٹھے ہیں۔ ہماری خودغرضیوں اور مفاد پرستیوں نے مملکتوں کی ذہنی وحدت کو ختم کر دیا ہے جو کے نتیجہ میں قومی مملکتوں کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ یہ کہنا بالکل سطحی ہے کہ اگر کوئی انسانی گروہ مدّو دراز سے ایک ہی جغرافیائی رقبہ میں رہ رہا ہو جس کی وجہ سے اُس میں تہذیبی، سماجی، مذہبی اور لسانی ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہو تو ایسے متحدہ اور یکجا گروہ میں وہ "ذہنی وحدت" پیدا ہو جاتی ہے جو کسی قوم کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم تہذیب، ہم مذہب اور ہم زبان ہو جانے سے کوئی گروہ قوم بن جائے۔ اگر قوموں کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ اِن ظاہری اسباب کی عدم موجودگی میں بھی قومیں بن جاتی ہیں اور اِن عوامل کے موجود ہوتے ہوئے بھی قومیں نہیں بن پاتیں۔

ایک ملک میں مختلف مذاہب، تہذیبیں اور زبانیں پرورش پاتی ہیں۔ لیکن اگر ان افراد میں اپنی خواہشات اور دوسروں کی امداد کے جذبوں میں ایک منصفانہ توازن قائم رکھنے کی صلاحیت ہے تو مذہب، تہذیب اور زبان کے فرق کے باوجود وہ گروہ قوم بن جائے گا۔ اس کے برخلاف اگر افراد میں یہ توازن قائم نہیں ہے تو ہم مذہب، ہم تہذیب اور ہم زبان ہوتے ہوئے بھی وہ گروہ قوم نہ بن سکے گا کیونکہ اس توازن کی عدم موجودگی میں پھر اس کا بھی تو امکان ہے کہ کوئی قوم ہم زبان ہوتے ہوئے بھی فرقوں میں تقسیم ہو جائے یا ہم تہذیب ہوتے ہوئے بھی الگ الگ وضع قطع اختیار کر لے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس توازن کی عدم موجودگی میں وہ عوامل جو کسی قوم کی "ذہنی وحدت" کی امانت سمجھے جاتے ہیں ہماری خودغرضیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوم محض اِن عوامل کی موجودگی کا نام نہیں ہے۔ دراصل یہ دیکھنا ہے کہ اِن عوامل سے وہ جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو سکی ہے یا نہیں جس سے قومیں بنتی ہیں۔ اس کے

علاوہ یہ بھی پرکھنا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی یہ جذباتی ہم آہنگی الگ الگ عوامل سے پیدا شدہ جذباتی ہم آہنگی سے بلند و برتر ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ لسانی ہم آہنگی کی طرح رسم الخط کے جھگڑے میں ختم ہو جائے، یا تہذیبی ہم آہنگی کی طرح وضع قطع کے درمیان تقسیم ہو جائے، یا مذہبی ہم آہنگی کی طرح فرقوں میں بٹ کر رہ جائے۔ یہ جزوی جذباتی ہم آہنگی "کسی انسانی گروہ کو متحد ضرور کرسکتی ہے لیکن وقتی ہوتی ہے اس لیے کسی مستقل قوم کی تشکیل نہیں کرسکتی، اس کے لیے تو ایسی جذباتی ہم آہنگی چاہیے جو نا قابل تفریق ہو اور نا قابل تقسیم بھی، جو انسانی گروہ کو ذہنی وحدت بخش کر ایک پائدار رشتہ سے منسلک کر دے اور یہ "ذہنی وحدت" انسان کے انھیں دو فطری جذبوں میں توازن قائم رکھنے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ قومی تشکیل کے ظاہری اسباب کے باوجود جب کبھی انسانی گروہ کے افراد دوسروں کی امداد کا فطری جذبہ یکسر بھول کر صرف اپنی خواہشات کی تسکین میں لگ جاتے ہیں اور اس طرح خود غرضی اور مفاد پرستی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں تو قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، کیونکہ اب وہ افراد کا محض ایک گروہ ہیں جس کا ہر فرد اپنی خواہشات کو دوسروں کی خواہشات سے بے غرض ہو کر اور کبھی کبھی ان نقصان تک پہونچا کر پورا کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ ایسے نفسی نفسی کے عالم میں وہ "ذہنی وحدت" کب قائم رہ سکتی ہے جس سے قومیں بنا کرتی ہیں۔ آج قومی مملکتوں میں جو انتشار برپا ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے جزو لازم نہیں بن سکے ہیں۔ امداد و قربانی ہمارا مسلک نہیں رہا ہے اور ہم انسان کے دو فطری جذبوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کے کام کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

ہماری خود غرضیاں قومی مملکتوں تک ہی محدود نہیں رہی ہیں۔ انھوں نے ہماری سماجی، معاشی، سنعتی اور بین الاقوامی کوششوں کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ اس کی اگر اصل وجہ معلوم کی جائے تو پتہ چلے گا کہ بعض حالات نے بھی اِس جذبہ کو کافی تقویت بہم پہونچائی ہے۔ کوئی دو صدی قبل صنعتی انقلاب نے یورپ اور امریکہ کے ہر فرد کو اچانک دولتمند بنا دیا۔ مشین نے بے حساب دولت پیدا کی۔ اِس کی چاٹ ایسی پڑی کہ یہ بجائے خود ایک خدا بن گئی۔ ہماری شرافت، اخلاق، مروّت

اور انصاف کے پیمانے بدل گئے۔ خودغرضی اور ہر چیز کو انگیز کر لینے کا رجحان ایسا بڑھا کہ فرد، خاندان، سماج، قوم اور ملک کوئی اس کے اثر سے نہ بچ سکا۔ اور اب حالت یہ ہے کہ ہم آج جانوروں کی چربی کے بجائے بناسپتی تیل سے بنے ہوئے صابن سے ہاتھ دھونا پسند کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری یہ ترجیح افریقہ میں لاکھوں مزدوروں کے استحصال کا سبب بن جاتی ہے جو ایسی پیداوار کے لئے مجبور کئے جاتے ہیں۔ مزدوروں کی طاقت کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا جاتا ہے تاکہ چیزیں سستی خریدنے کی ہوس کو پورا کیا جا سکے۔ ربڑ کی پیداوار کے لئے جس پر آج کے رسل و رسائل کا بہت زیادہ انحصار ہے ہم افریقہ میں ہر طرح کے تشدد کو روا رکھتے ہیں۔ تیل جو آج صنعتی و مشینی زندگی کا جزو لازم ہے کمپنی اور ملک کے درمیان برابر تنازعہ کا باعث بنا رہتا ہے اور اس ملک کے معیار زندگی کی پستی و بلندی کا انحصار اس تنازعہ میں ہار جیت پر ہے۔ شکر کے لئے کیوبا اور پورٹوریکو کی آزادی خریدی و بیچی جاتی ہے۔ آج انگلینڈ اپنے ملک کے مزدوروں کو اچھی تنخواہ دینے سے قاصر نظر آتا ہے کیونکہ اب اس کا تسلط ہندوستان، افریقہ اور مشرق وسطی پر باقی نہیں رہا اور آج فرانس نوآبادیات میں اپنا اقتدار باقی نہ رکھ سکنے کا ماتم کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی نے روس کو صرف اس لئے اپنا نشانہ بنایا تھا کہ دوسروں نے نوآبادیات میں خود اس کے لئے کوئی موقع نہیں چھوڑا تھا۔ امریکہ اپنے ڈالر کے ڈھیر پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے، ڈرتا ہے کہ کہیں دوسرے ہاتھ مار جائیں اور اس ڈھیر کی بلندی کچھ کم ہو جائے۔ یہاں تک کہ روس کے افراد جن کو ان کا نظام فکر سماج میں ضم ہو جانے کی تعلیم دیتا ہے وہ بھی بقول ہرمن فائنر "اس حد تک بے غرض نہ بن سکے کہ گاندھی جی کا طرز زندگی اختیار کر کے ایک چادر کی ستر پوشی پر اکتفا کر لیتے"۔ ہماری یہی خودغرضیاں آج کے بین الاقوامی انتشار کا اصل سبب ہیں۔

صرف یہی نہیں ہوا بلکہ ہمارے مفکروں، مدبروں اور سیاستدانوں نے انسان کے ان دو فطری جذبوں کو متضاد مان کر اور ان میں ہم آہنگی کو غیر ضروری سمجھ کر الگ الگ نوعیتوں کی مملکتیں بنائی ہیں۔ آج کچھ مملکتیں ایسی ہیں جن میں فرد کی خواہشات کی تسکین کو اولیت حاصل ہے۔ وہاں

یر کا احترام، فرد کی آزادی اور فرد کے حقوق پر زور دیا جاتا ہے اور بحیثیت مجموعی یہ انفرادی مملکتیں کہلاتی ہیں جن کی بنیاد فرد کی "اپنی خواہشات کی تسکین" کے جذبہ پر ہے۔ کچھ مملکتیں ایسی ہیں جہاں کہ دوسروں کی امداد کے جذبہ کو مہمیز کیا جاتا ہے، فرد کو خود سپردگی کا جذبہ سکھایا جاتا ہے، اپنی شخصیت کو سماج میں ضم کر دینے کی تعلیم دی جاتی ہے، سماج کی فلاح و بہبود اور دولت کی مساوی تقسیم ایسی مملکتوں کا بنیادی نصب العین ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ اجتماعی مملکتیں کہلاتی ہیں جن کی بنیاد "غیروں کی امداد" کے جذبہ پر ہے۔ چونکہ یہ مان لیا گیا ہے کہ اپنی خواہشات اور غیروں کی امداد کے جذبے متضاد ہونے کی وجہ سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے اس لیے ان بنیادوں پر جو مملکتیں تشکیل ہوئی ہیں ان میں بھی ہم آہنگی مفقود ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی مملکتیں اپنی خود غرضانہ انتہا پر پہنچ کر "سرمایہ دارانہ جمہوریتیں" بن گئیں جس کے رد عمل میں اجتماعی مملکتوں نے اپنی انتہا پسندی میں "اشتراکیت" کا چولا پہن لیا اور افراد کو سماجی فلاح و بہبود کے نام پر قربان کرنے لگیں۔

اب یہ دونوں نوعیتوں کی مملکتیں ایک مستقل نظام حیات ہیں اور ایک دوسرے نبرد آزما بھی ہیں۔ ہماری آج کی بدنصیبی یہ ہے کہ ہم نے اس اختلاف میں مملکتوں کی نوعیتیں تقسیم کرلیں، دنیا تقسیم کرلی، ذہن تقسیم کر لیے، سوچنے سمجھنے کا انداز تقسیم کر لیا، حق گوئی و انصاف پسندی تقسیم کرلی۔ یہ ایک بڑے پیمانہ پر ہماری خود غرضی ہی تو ہے۔ ہم یا تو ایک یا دوسرے نظام حیات کے اندھے مقلد بن گئے ہیں۔ ہماری ذہنیتیں اس حد تک مفلوج ہو چکی ہیں کہ ہم یہ سوچنے سے بھی نظر آتے ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی مملکتوں کے دونوں مکتب خیال کے محرک دراصل وہی جذبے ہیں جو ہر انسان میں فطرتاً پائے جاتے ہیں۔ کسی ایک نظام فکر کی تقلید کا مطلب دوسرے جذبے کے وجود سے یکسر انکار ہے جو یقیناً غیر فطری ہے۔ لیکن آج جو علمی کارنامے یا سیاسی کارروائیاں ہو رہی ہیں وہ کلیتاً ایک یا دوسرے نظام فکر کی حامی نظر آتی ہیں۔ کچھ ایسے فلسفی ضرور گزرے ہیں جنھوں نے انسان کے ان دو فطری جذبوں کو تسلیم کرتے ہوئے فرد اور سوسائٹی میں توازن قائم کرنے کی اپنی جیسی کوشش کی ہے، ان میں لاسکی کا نام سرفہرست ہے۔ کچھ سیاسی مدبر بھی گزرے ہیں جنھوں نے انسان کے ان دونوں جذبوں کا احترام کرتے ہوئے

فرد اور سوسائٹی کے تقاضوں میں توازن قائم کرنے کی عملی کاوش کی ہے۔ ان میں پنڈت نہرو صفِ اول کے لوگوں میں ہیں۔ لیکن ہماری تقسیم شدہ ذہنیت نے لاسکی کو فلسفی ماننے سے انکار کردیا اور نہرو کو ناقابلِ اعتبار گردانا کیونکہ یہ دونوں ایک یا دوسرے نظامِ فکر کے کلیتاً ہمنوا ہونے کے بجائے ایک ایسے مخلوط نظامِ حیات کے لئے کوشاں تھے جس میں فرد کے انہیں دو فطری جذبوں کا توازن جھلکتا ہو۔

آج مملکتوں کے اندرونی خلفشار اور بین الاقوامی انتشار کی اصل وجہ یہی ہے کہ فرد میں تناسب و توازن باقی نہیں رہا ہے۔ ہماری خود غرضیوں نے داخلی حیثیت سے ملکوں کی قومیت کا شیرازہ بکھیر رکھا ہے۔ اور خارجی حیثیت سے یہ مملکتوں کے درمیان تنازعہ کا باعث بنی ہوئی ہیں جس سے امنِ عالم کو خطرہ ہے۔ اگر ہم انسان کے ان دو بنیادی جذبوں کو متضاد مانتے ہوئے ان میں ہم آہنگی کو ضروری سمجھ لیں تو ایک طرف ہم قومی یکجہتی اور دوسری طرف مملکتوں میں خوشگوار تعلقات پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک ہم فرد میں یہ توازن قائم کرکے ہم آہنگی کی فضا پیدا نہ کر سکیں گے اس وقت تک نہ تو مملکتوں کو "ذہنی وحدت" نصیب ہو سکے گی اور نہ امن و سلامتی دنیا کا مقدر بن سکے گی۔

مرزا احسان احمد بیگ

"نوائے عصر"

میرے عزیز ہم وطن یحییٰ اعظمی کا یہ مجموعۂ کلام ہے، جس کا ایک نسخہ عزیز موصوف نے اس خواہش کے ساتھ مجھ کو عنایت کیا ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ اظہار خیال کروں، شاہ معین الدین صاحب ناظم دارالمصنفین نے تعارف کے عنوان سے یحییٰ صاحب کی شاعرانہ صلاحیت کے متعلق جو کچھ سپرد قلم فرمایا ہے، اس کے بعد کسی مزید تبصرے کی چنداں ضرورت نہ تھی، پہلے جی میں آیا کہ خرابی صحت کی بنا پر جس نے مجھ کو مضمون نگاری کے حق میں کچھ کوتاہ قلم بنا دیا ہے، معذرت کر دوں، لیکن مطالعۂ کلام کے بعد مجھ کو شاعر کی کچھ ایسی امتیازی خصوصیات نظر آئیں کہ مجبوراً قلم اٹھانا پڑا، جس کو میں نے ذاتی تعلق سے متاثر ہونے نہیں دیا ہے، تبصرہ نگاری کے فرض سے صحیح معنوں میں عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے، کہ صاحب کلام کی شخصیت کو نظر انداز کر کے صرف کلام پر نظر رکھی جائے، اور اسی سے اس کی فکر و نظر کی وسعت اور بلندی کا اندازہ کیا جائے۔

شاعر کی فطری مناسبت سے شاعر کو ایک گہرا تعلق ہے، میرے نزدیک ایک پست فطرت اور بد اخلاق شخص کبھی بلند خیال شاعر نہیں ہو سکتا، سب سے پہلے میری نگاہ اپنے عزیز شاعر کی اس قابل احترام افتادِ طبیعت پر ہے، جس نے ان کے دل کو شہرت عام کی خواہش بے جا سے آلودہ ہونے نہیں دیا، یعنی انھوں نے مشاعروں میں عوام کے سامنے اپنے کو بحیثیت شاعر کبھی پیش نہیں کیا، ان کی بلند نظری اور صحیح المذاقی کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے، میرے خیال میں شاعر کو جب عوام کی واہ واہ سے مسرت محسوس ہونے لگتی ہے، تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی شاعرانہ صلاحیت کی بربادی کا اب وقت آ گیا، اس لئے

کہ خود اس کا کوئی مستقل ذوق نہیں، اور اب اس کی طبع آزمائی دوسروں کے مذاق کے مطابق ہوگی، حقیقت یہ ہے، کہ مجموعۂ کلام زیرِ نظر کے مصنف کی طرح جو اصلی شاعر ہوتا ہے، وہ اپنا ایک خاص ذوق رکھتا ہے بلا اسی ذوق کے مطابق وہ شعر کہتا ہے، ذوقِ عام کی اسے مطلق پروا نہیں ہوتی، اس لئے اس کا کلام سطحی، مبتذل اور عامیانہ خیالات سے آلودہ ہونے نہیں پاتا۔

میرے نزدیک یحییٰ صاحب کی صحیح المذاقی کا ایک دوسرا بڑا ثبوت یہ ہے، کہ قدرت نے ان کو جو شاعرانہ استعداد و صلاحیت عطا کی تھی، اس کو انھوں نے عام غزل گو شعرا کی طرح فرضی اور مصنوعی تخیلات پر ضائع نہیں کیا، بلکہ اس سے خود اپنے قلب و روح کے گوناگوں تاثرات کے اظہار کا کام لیتے رہے، "ادب برائے ادب" ان کا کبھی نظریہ نہیں رہا، یہی ان کے جذبات اور افکار و خیالات کی بلندی اور پاکیزگی کا اصلی راز ہے، وقت کی بے کیف اور عامیانہ شاعری سے گھبرا کر ڈاکٹر اقبالؔ بے اختیار یہ سوال کر بیٹھے تھے، "شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے" مذاقِ عام اس کا کیا جواب دیتا، البتہ زندہ ہوتے تو "نوائے عصر" سے ایک بڑی حد تک جواب مل سکتا تھا!

حالیؔ نے مقدمۂ شعر و شاعری میں واقعیت و اصلیت کو بھی شاعری کا ایک ضروری عنصر قرار دیا ہے، جس کے بغیر کلام موثر نہیں ہوسکتا، چنانچہ ہمارے عزیز شاعر کی نکتہ سنج اور حقیقت پسند طبیعت نے اس کا خاص لحاظ رکھا ہے، یعنی بجائے خیالی دنیا میں رہ نوردی کے انھوں نے اسی عالم آب و خاک سے اپنا تعلق رکھا، اور اسی کے ہر موثر واقعہ اور منظر سے متاثر ہوتے رہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں اسی وقت کہتے ہیں، جب ان کے دل پر کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی ہے، ہمارے نزدیک شاعر کا یہی حقیقی نشانِ امتیاز ہے، منافقانہ فکرِ سخن کو شاعری سے کوئی تعلق نہیں۔

شاعر کے لفظی معنی صاحبِ شعور کے ہیں شعور اصل میں احساس کو کہتے ہیں، اس لئے وہی شخص شاعر ہوسکتا ہے، جس کا احساس قوی اور مشتعل ہو، ہمارے عزیز شاعر کی اس خصوصیت کا ناظرین اندازہ کرنا چاہیں تو ان کی وہ نظمیں ملاحظہ فرمائیں، جو انھوں نے ملک و قوم کی مایۂ ناز ہستیوں مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان، مولانا عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، اقبال سہیل وغیرہ

وفات پر سپرد قلم کی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا جذبات کا ایک آتش کدہ مشتعل ہو گیا ہے۔

حبّ وطن کا شریفانہ جذبہ ہمارے عزیز شاعر کے درد آشنا دل پر جس شدت سے طاری ہے، اس کا اندازہ ان کی ان نظموں سے بخوبی ہو سکتا ہے جو انھوں نے "مستقبل کا ہندوستان"، "لعل و جواہر کے وطن"، "پندرہ اگست کا تاریخی دن" کے عنوان سے سپرد قلم کی ہیں، ۱۹۵۷ء میں ۱۸۵۷ء کے شہیدان وطن کو انھوں نے جو "پیغام بیداری" دیا ہے، وہ ان کے سیاسی احساس و ذہنیت کی پاکیزگی اور بلندی کا کافی ثبوت ہے، آزادی سب سے بڑی نعمت ہے، جس دل میں اس کی قدر و احترام کا احساس نہ ہو وہ میرے نزدیک کسی بلند نظر اور صاحب ہمت انسان کا دل نہیں ہے۔

منظر نگاری بھی شاعر کا ایک خاص کمال ہے، اس کے لئے غیر معمولی قوت نظم کے علاوہ ایک نکتہ سنج نگاہ بھی درکار ہے تاکہ منظر نگاری کا کوئی خاص پہلو نظر انداز نہ ہونے پائے اور اس کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے، ہمارے عزیز شاعر نے "جنت کشمیر، جنت رنگ و بو، تاج محل" پر نظمیں لکھ کر اپنی اس صلاحیت کا کافی ثبوت دیا ہے، متفرق خیالات کی ایک غزل تیار کر لینا آسان ہے لیکن کسی خاص موضوع پر مسلسل نظم لکھنا ایک قادر الکلام شاعر ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

ابھی عزیز شاعر کی ایک اور خصوصیت بھی ارباب نظر کی توجہ کی مستحق ہے، وہ حسن بیان ہے، جو شاعری کی نہایت ضروری شرط ہے، اور جس کے بغیر بلند سے بلند خیال بھی بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے، اقبال سہیل کے فیض صحبت نے ان میں فارسیت کا جو ذوق پیدا کر دیا تھا، اس سے اگرچہ وہ خاص طور پر کام لیتے ہیں، لیکن اس موقع پر بھی ذوق سلیم ان کو بے راہ رو ہونے نہیں دیتا، یعنی وہ ثقیل، نامانوس اور بے جوڑ ترکیبوں سے کلام کو گرانبار نہیں کرتے، الفاظ کی موزونی، فقروں کی دروبست، بندش کی چستی، روانی، برجستگی کے لحاظ سے ان کے کلام میں کوئی نقص یا ناہمواری نظر نہیں آتی، پڑھتے وقت کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک صاف قدرتی چشمہ ہے، جو پہاڑ کے دامن سے نکل کر بلا کسی رکاوٹ کے بہتا چلا جاتا ہے، ہمارے شاعر کی نظر اس پر بھی ہے کہ موسیقیت بھی شاعری کا ایک ضروری جزو ہے، یعنی مصرعوں کا باہمی ربط، ترتیب و ترکیب ایسی ہو، کہ شعر میں ایک گونہ خوش نوائی پیدا ہو جائے

اور سامعہ بھی اس سے لطف اندوز ہو سکے، غرض اس مجموعۂ کلام کی ہر نظم میں خواہ وہ کسی م
ہو، شاعر کی قدرت زبان کا جو دلکش سماں نظر آتا ہے وہ عام شعرا کے لئے یقیناً قابلِ رشک
یہ مجموعۂ کلام اپنے گوناگوں محاسن کے لحاظ سے در اصل ایک مبسوط تبصرہ کا مستح
جس کی افسوس ہے، اس مختصر مضمون میں گنجائش نہ تھی، تاہم سطورِ بالا کی نگارش سے ن
از کم اس کا اندازہ ضرور ہوگا کہ قدرت نے ہمارے عزیز شاعر کو دل و دماغ کی جو عطا
کی ہے، وہ حقیقی شاعری کے لئے کس قدر موزوں اور مناسب ہے، اور وہ کس خو
ہر قسم کے لطیف، بلند اور پاکیزہ قومی سیاسی مذہبی جذبات و احساسات کو ادا کر سکتے ہ

اقبال سہیل کی زندگی میں اکثر یہ خیال آتا تھا کہ شاید یہ اپنے استاذِ محترم علا
اندازِ سخن کا دور اپنے ہی اوپر ختم کر کے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے، لیکن ہم کو مسر
وہ "نوائے عصر"، "نوائے حیات" کے مصنف کو اپنا حقیقی جانشین چھوڑ گئے ہیں، جو نہایت
ساتھ ان کے فیضِ تلمذ کا حق ادا کر رہا ہے، تمنا ہے کہ اس "غریبِ شہر" کی "سخن ہائے گف
تا دیر قائم رہے، کہ اردو کے چمنستان ادب کو اپنی سرسبزی اور شادابی کے لئے ایسے ہی ا
در کار ہیں۔

ارادہ تھا، کہ اس مختصر مضمون کو یہیں ختم کر دوں، لیکن یہ خیال آیا کہ میں نے شاعر ک
خصوصیات کا جو اجمالی خاکہ اہلِ ذوق کے سامنے پیش کیا ہے، اس کی تائید میں کلام کا کچھ
کرنا ضروری ہے، تاکہ دعویٰ بلا ثبوت نہ رہے، اور مجھ پر بے بنیاد مدح سرائی کا الزام نہ آ
مسلسل نظموں کا پورا لطف اسی وقت آسکتا ہے، جب شروع سے آخر تک پڑ
لیکن طوالت کے لحاظ سے پوری پوری کوئی نظم نقل کرنا دشوار ہے، "جنت کشمیر"، "جنت
کے چند بند بطور نمونہ کے ملاحظہ ہوں:

اے شہرِ گل و لالہ اے وادیِ گل پوش　　اے خاکِ ارم در بر و فردوس در
ہے تیری ہوا میں اثرِ بادۂ سرجوش　　ہے تیری فضا گل کدۂ و مے کدہ

زیبا ہے جو کہتے ہیں تجھے خلد سے تعبیر
اے جنتِ کشمیر

پھولوں کی ہے وادی کہ بجی محفلِ رنگیں   جھیلوں کا ہے پانی کہ بچھی چادرِ سیمیں
ہر گام پہ اللہ رے ہجومِ گل و نسریں   ہے سنبل و ریحاں سے تری خاک کی تزئیں
اِن تازہ عناصر سے ہوئی ہے تری تعمیر
اے جنتِ کشمیر

ہیں خلد نظر سرو و صنوبر کی بہاریں   ہیں جنت نظارہ چناروں کی قطاریں
ہم خلد بریں کہہ کے تجھے کیوں نہ پکاریں   قدرت کے حسیں ہاتھ تجھے کیوں نہ سنواریں
ہے معجزۂ خامۂ فطرت تری تصویر
اے جنتِ کشمیر

خلدِ بہار در کنار خاکِ حسین کا شمر   خطۂ رنگ و بو ترا کیوں نہ ہو جنتِ نظر
تیرے نہال و نخل تر برگ و شگوفہ و ثمر   میوہ طراز و گل فشاں طیّب و طیب و تازہ تر
جھوم رہی ہے شاخ شاخ رقص میں ہیں شجر شجر
سبزہ و گل سے ہیں ڈھکے وادی و کوہ و دشت و در
باغ و بہار راغ راغ رشکِ چمن دمن دمن   جلوۂ رنگ رنگ سے قوسِ قزح چمن چمن
نکہتوں سے بسی ہوئی وادیٔ گل ختن ختن   لالۂ شقیق و ارغواں بن گئی ہے دلہن دلہن
وادیٔ رنگ و بو تری شانِ جمال مرحبا
سبزہ و برگ و بار کا حسنِ کمال مرحبا
ہے جو بسا ہوا سبو پہ ابرِ بہار خیمہ زن   جھوم رہے ہیں سبزہ زار وجد میں ہیں تل و دمن
آتشِ گل سے آج کچھ اور بھڑک اٹھا چمن   اور بھی شوخ ہو گیا رنگِ شقیق و نسترن

نغمۂ نو کی ہے نوید غنچۂ نو دمیدہ کو
نشاۃ تازہ کا پیام سبزۂ آرمیدہ کو

شاعر کے طرز نگارش کی رعنائی ناظرین کو کچھ اور دیکھنی ہو تو "تاج محل" کے بھی دو ایک بند ملاحظہ کریں۔

اے کشور تہذیب و تمدن کے حسین تاج　　زیبائی و رعنائی تعمیر کی معراج
دنیا ہے ترے جلوۂ دیدار کی محتاج　　تو دیدۂ عالم کا ہے مسجود نظر آج
جنت ہے تو نقاش کی تہذیب عمل کی
یا خواب گہہ ناز ہے ممتاز محل کی

یہ نقش دل آویز ترا تاجِ زمیں ہے　　یا خاتمِ فردوس کا تابندہ نگیں ہے
نقاش کی تخئیل کی فردوس بریں ہے　　یا خامۂ فن کار کا شہ کارِ حسیں ہے
یہ تاج نہیں حسن و تجمل کی ہے معراج
دراصل مصور کے تخیل کی ہے معراج

یہ نخل روش پر ہیں کہ طوبیٰ کی قطاریں　　یہ سرو و صنوبر ہیں کہ جنت کی بہاریں
ہم تجھکو خیابانِ ارم کیوں نہ پکاریں　　کرنوں کے حسیں ہاتھ تجھے کیوں نہ سنواریں
پانی سے بھرے حوض میں یا چادرِ مہتاب
یہ جلوۂ بیتاب ہے یا رقص میں سیماب

ایک دوسرے بند کا آخری شعر ملاحظہ ہو:

ہے دیدۂ زائر میں تو اک نقش طرب خیز
شاعر کی نگاہوں میں ہے اک بیت دل آویز

اس سے بہتر تعریف مشکل ہے، واقعی یہ محل نہیں ہے، بلکہ شعریت کا ایک پیکر مجسم ہے، جس کو

ایک بلند ذوق نظر رکھنے والا شاعر ہی محسوس کر سکتا ہے، شاعر نے آخر میں اپنے متعلق جو کہا ہے، وہ بالکل صحیح ہے، اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہے، ملاحظہ ہو:

کرتا ہے ترے تاج کو یہ نظم حسیں نذر
الفاظ و معانی کے یہ تابندہ نگیں نذر

"مستقبل کے ہندوستان" کے متعلق ہمارے عزیز شاعر نے جو پاکیزہ توقعات ظاہر کی تھیں، ان میں سے کچھ ناظرین بھی سن لیں:

اجڑی ہوئی خاک وطن بننے کو ہے پھر گلستاں ۔۔۔ دشت و بیابان و دمن ہونے کو ہیں پھر گل فشاں
ہر گاؤں ہر دیہات پھر بننے کو ہے بلغ جناں ۔۔۔ ہونے کو ہے باغ ارم ہر قریۂ ہندوستاں
ہوں گی یہاں پھر کوثر و تسنیم کی نہریں رواں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں، جنت نشاں

دہقاں کا ہر اک غم کدہ بن جائے گا عشرت کدہ ۔۔۔ مزدور کا ہر جھونپڑا ہو جائے گا راحت کدہ
پھر غیرت کاشانہ بن جائے گا ہر غربت کدہ ۔۔۔ ہوگا ہجوم نور سے معمور ہر ظلمت کدہ
ہر کلبۂ دہقاں میں موج برق ہوگی ضو فشاں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنت نشاں

چمکیں گے تعمیر و ترقی کے مظاہر ہر طرف ۔۔۔ ہوں گے فروغ زیست کے آثار ظاہر ہر طرف
مستِ طرب کر دیں گے قدرت کے نوادر ہر طرف ۔۔۔ کھینچیں گے دل فطرت کے جاں پرور مناظر ہر طرف
ڈھک جائے گی فرش زمرد سے بساط خاکداں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنت نشاں

انداز بیان کی روانی اور سلاست کا عالم دیکھنا ہو تو "لعل و جواہر کے وطن" کے چند بند ملاحظہ ہوں:

اے نازش و فخر زمن　　سرچشمۂ گنگ و جمن
گہوارۂ سرو و سمن　　رنگیں دمن رنگیں چمن
مرشکِ ختن جانِ ارم
باغِ جہاں میں محترم
ہر گوشہ تیرا گلستاں　　ہر چپہ تیرا گل نشاں
اے سبزہ زاروں کے جہاں　　جانِ جہاں رشکِ جناں
سرسبز و شاداب و جواں
گہوارۂ آبِ رواں
اے کوہساروں کے وطن　　اے آبشاروں کے وطن
اے مرغزاروں کے وطن　　رنگیں بہاروں کے وطن
اے خطۂ رنگ آفریں
فردوس برروئے زمیں

اس نظم سے شاعر کے ذوق خوش نوائی کا بھی کافی اندازہ ہوتا ہے۔

غرض خیالات کے تنوع و بوقلمونی، جذبات کی حرارت و وسعت کے لحاظ سے یہ مجموعۂ کلام ایک ایسا "خوانِ ادب" ہے، جس سے ارباب ذوق کافی لطف اٹھا سکتے ہیں۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ مختصر مضمون لکھ کر اپنے عزیز شاعر کے محاسنِ کلام کا پورا حق ادا کر دیا ہے، لیکن اس کی خوشی ضرور ہے، کہ ایک قابل قدر کلام کی قدر شناسی سے میں قاصر نہیں رہا۔

حرمت الاکرام

غزل

وہ دل جو تھا کسی کے غم کا محرم، ہو گیا رسوا — جہانِ بیش و کم میں خوابِ آدم ہو گیا رسوا

نہ چونکا نکہتِ آوارہ کی روداد پر کوئی — یہ کیوں افسانۂ پروازِ شبنم ہو گیا رسوا

دکھائی اہلِ دل کو منزلِ دار و رسن جس نے — تمہاری کجکلاہی کا وہ عالم ہو گیا رسوا

امانت سینۂ لالہ میں کس کی تھی، نہ یہ پوچھو — کہ سعیِ پردہ داری میں مرا غم ہو گیا رسوا

ہے آئینہ کی حیرانی بھی افسانہ در افسانہ — ترے اسرارِ محجوبی کا محرم ہو گیا رسوا

خبر کیا تھی کہ آنسو پی کے بھی جینا نہیں آساں — یہ غم کم ہے؟ گدازِ شیوۂ غم ہو گیا رسوا

پسند آئی غزل کو میرؔ کی آشفتہ سامانی — ترا راز آشنا، اے زلفِ برہم! ہو گیا رسوا

بسانا تھا کسی حیلے سے دنیا کے خرابے کو — یہ ایسی مصلحت تھی جس پہ آدم ہو گیا رسوا

عجب طرز ادا تھا ہمارے چارہ سازوں کا

کہ حرمتؔ ارتباطِ زخم و مرہم ہو گیا رسوا

کوائف جامعہ

محمد عتیق صاحب کا انتقال

جامعہ کے ایک سابق استاد اور ہم میں سے بہتوں کے ساتھی اور دوست، جناب محمد عتیق صاحب کا، وطن سے دور لندن میں، ۷ر جنوری کو یکایک انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

عتیق صاحب ایک طویل عرصے سے لندن میں مقیم تھے اور وہاں کے کسی اسکول میں پڑھاتے تھے۔ انتقال سے کچھ عرصہ پہلے دسمبر کے پہلے ہفتہ میں اطلاع آئی کہ ان پر دل کا حملہ ہوا ہے اور وہ ہسپتال میں داخل کر دئے گئے ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ مشیر فاطمہ کو، جو جامعہ نرسری اسکول کی ڈائرکٹر ہیں، اس وحشتناک خبر سے، قدرتی طور پر، سخت پریشانی ہوئی، انھوں نے ٹیلیفون کیا تو معلوم ہو کہ پہلے سے بہتر ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے آفاق احمد نیویارک (امریکا) میں زیر تعلیم ہیں، و. لندن پہنچے، ان کے پہنچنے تک ان کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی، کچھ دنوں میں اور بہتر ہو گئی، اور یہ سوچا جا رہا تھا کہ انھیں جامعہ لایا جائے، امید تھی کہ حالات کی تبدیلی اور گھریلو ماحول کا ان کی صحت پر زیادہ خوشگوار اثر پڑے گا، مگر، ۷ر جنوری کو یکایک دل کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ جاں نہ ہو سکے۔ ۱۱ر جنوری کو ہوائی جہاز کے ذریعہ میت دلی آئی اور اسی روز جامعہ نگر کے قبرستان میں سپردِ خاک کی گئی۔

عتیق صاحب مسلم یونیورسٹی کے ان چند ممتاز طالب علموں میں سے تھے جو قوم پرور اور ترقی پسند وہاں سے وہ ۱۹۳۹ء میں جامعہ تشریف لائے۔ ایک عرصہ تک مدرسہ ابتدائی کے نگراں کے فرائ

ہم دے ئے اور اپنی پرخلوص کوشش سے مدرسہ کی شہرت کو نہ صرف باقی رکھا، بلکہ چار چاند لگا دیئے۔
ئۂ میں مزید تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لے گئے اور وہیں کے ہو گئے۔

جناب شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی صدارت میں، ۱۶ر فروری کو جلسۂ تعزیت منعقد ہوا اور مرحوم کے ساتھی اور دوست ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب، پرنسپل اساتذہ اور مدرسین نے تقریر کی اور مرحوم کے کردار کی بلندی اور ان کے علمی ذوق وشوق پر روشنی ڈالی۔

ہم مرحوم کی رفیقۂ حیات مشیر فاطمہ صاحبہ، ان کے صاحبزادے آفاق احمد اور صاحبزادی نوانہ خاتون کے غم میں شریک ہیں، خدا سے دعا ہے کہ ان کو صبر جمیل کی توفیق دے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

پروفیسر مجیب کی بیرونی مصروفیات

شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی تعلیمی، تہذیبی اور علمی مصروفیات دلّی میں اور دلّی کے باہر اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ اگر انھیں پابندی کے ساتھ قلم بند کیا جائے تو ایک دلچسپ اور مفید کتاب تیار ہو جائے گی۔ مثلاً پچھلے دنوں ملک کے مختلف حصوں میں مہاتما گاندھی اور حضرت غالب کی صد سالہ اور جناب گرونانک کی پانچ سو سالہ تقریبات منائی گئیں اور اس سلسلے میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے دہلی اور بیرون دہلی اردو اور انگریزی میں متعدد تقریریں کیں اور مقالے پڑھے، مگر ماہنامہ جامعہ کے محدود صفحات کی وجہ سے ہر ماہ پابندی کے ساتھ کوائف جامعہ کا کالم باقی رکھنا ممکن نہیں ہوتا، اس لیے ان کی علمی وتعلیمی سرگرمیوں سے قارئین جامعہ کو آگاہ نہیں کیا جا سکا۔ اس مرتبہ اتفاق سے کوائف جامعہ کے لئے جگہ نکل آئی ہے، اس لیے ہم ان کی چند سرگرمیوں کا یہاں ذکر کر رہے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے اہم موصوف کا وہ انگریزی مقالہ ہے، جو "اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام" کے عنوان سے بمبئی میں پڑھا گیا۔ انجمن اسلام بمبئی کے ماتحت ایک اسلامک ریسرچ

الیوسی ایشن ہے، جس کے صدر جناب آصف علی اصغر فیضی اور جنرل سکریٹری جناب سید شہاب الدین دسنوی ہیں۔ اس الیوسی ایشن میں ہر سال اسلام کے کسی پہلو پر ملک کے کسی عالم یا مفکر کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ امسال پروفیسر محمد مجیب صاحب کو دعوت دی گئی۔ چنانچہ ۱۴ اور ۱۵ فروری کو موصوف نے اپنا مقالہ پڑھا، جسے بہت پسند کیا گیا۔ یہ مقالہ غالباً کتابی صورت میں وہاں سے شائع ہوگا، مگر اس کا ترجمہ ہم رسالہ جامعہ میں شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس سے پہلے موصوف نے بھوپال میں غالب پر مقالہ پڑھا اور تقریریں کیں۔ بھوپال میں "اکھل بھارتیہ بھاشا ساہتیہ سمیلن" کے اہتمام میں غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں جلسے اور نمائش کا انتظام کیا گیا تھا جس میں سمیلن کے سکریٹری جناب ستیش چترویدی صاحب کی دعوت پر پروفیسر مجیب صاحب نے شرکت کی۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیفیہ کالج میں بھی جلسے کا انتظام کیا گیا جس میں مجیب صاحب نے غالب کی عظمت پر تقریر کی۔ اس موقع پر کالج کے ایک استاد جناب عبدالقوی دسنوی صاحب نے بھی تقریر کی تھی، جس میں غالب کے کلام کے ان مخطوطوں کا ذکر کیا، جو بھوپال میں دریافت ہوئے ہیں۔ پہلا مخطوطہ "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہو چکا ہے اور دوسرا مخطوطہ جو پہلے سے زیادہ اہم ہے، ۱۸۱۶ء کا نوشتہ ہے، ابھی حال میں بھوپال سے دستیاب ہوا ہے، جو ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔

اب اپریل کے دوسرے ہفتہ میں امریکہ تشریف لے جا رہے ہیں، جہاں ایشیا سوسائٹی اور فورڈ فاؤنڈیشن کے مشترک اہتمام میں غالب صدی کے سلسلے میں وہاں کی مختلف یونیورسٹیوں میں جلسے، نمائش اور شعر خوانی کا پروگرام بنایا گیا ہے۔

پروفیسر مجیب صاحب نے ان جلسوں کے لئے تین مقالے تیار کئے ہیں، دو مقالے غالب اور ان کی شاعری پر ہیں اور تیسرے مقالے کا عنوان ہے: "دو ہم مزاج شاعر۔ غالب اور ایملی ڈی کنسن"۔ ابھی حال میں نیو یارک سے جو خط آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ تیسرا عنوان

وہاں بہت پسند کیا گیا۔ پروفیسر مجیب صاحب سے اب مزید درخواست یہ کی گئی ہے کہ لوگوں کی خواہش اور اصرار کے پیش نظر "ہندوستانی مسلمانوں" پر کچھ مقالے پڑھیں یا تقریریں کریں۔ چونکہ مجیب صاحب نے انگریزی میں ہندوستانی مسلمانوں کے علمی اور فکری کارناموں پر بہت بسوط اور مفصل کتاب لکھی ہے، اس لیے ان سے اس موضوع پر تقریر کرنے کی فرمائش کرنا قدرتی بات ہے۔ ایشیا سوسائٹی کی معرفت اور براہ راست بھی کناڈا سے بھی فرمائشیں آرہی ہیں کہ مجیب صاحب وہاں کی یونیورسٹیوں میں بھی لوگوں کو اسلام پہ اور غالب پر اپنے خیالات سے استفادہ کا موقع دیں۔ امید ہے کہ امریکہ اور کناڈا میں مجیب صاحب کا یہ علمی سفر کوئی چھ ہفتے جاری رہے گا۔

حضرت جگر کی یاد میں ٹرافی

حضرت جگر مرحوم کی یاد میں، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے جامعہ کالج کی بزم ادب کو ایک بڑی شاندار ٹرافی عطا فرمائی ہے، جس پر حضرت جگر کے دستخط کندہ ہیں۔ اس ٹرافی کے مقابلے کے لئے، طے پایا ہے کہ ہر سال کالج کی سطح پر غزل سرائی کا مقابلہ ہوگا اور اول آنے والے کالج کو ایک سال کے لئے یہ ٹرافی دی جائے گی۔ امسال ۱۱ مارچ کو اس کا پہلا مقابلہ ہوا، جس میں دلی کے متعدد کالجوں نے شرکت کی۔ مقابلے میں شرکت کرنے والے طلباء اور طالبات کی بڑی تعداد نے حضرت جگر کی غزلیں پیش کیں، اس کے بعد غالب کی، غزلوں کا انتخاب اچھا اور بحیثیت مجموعی پڑھنے کا انداز اور تلفظ قابل ستائش تھا۔ خاص بات یہ ہے کہ حصہ لینے والوں میں اچھی خاصی تعداد غیر مسلم طلباء اور طالبات کی تھی۔ پہلا انعام لیڈی شری رام کالج کی ایک طالبہ مس دینا کپور کو (ان کی دوسری ساتھی کسی مجبوری کی وجہ سے پہنچ نہ سکیں)، دوسرا انعام دلی یونیورسٹی کی ایک طالبہ امینہ بیگم کو، تیسرا انعام جامعہ کالج کے ایک طالب علم سہیل احمد اور خصوصی انعام ہندو کالج کے طالب علم روپ کمل جیتلی کو ملا، اور ٹرافی دلی یونیورسٹی کو گئی۔

فرانسیسی سفارت خانہ کا قیمتی عطیہ

دہلی میں غیر ملکی سفارت خانوں کے شعبۂ اطلاعات و ثقافتی تعلقات تعلیمی و علمی اداروں سے اپنا رابطہ قائم کرتے ہیں اور مختلف صورتوں میں تہذیبی و علمی لین دین ہوتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں جامعہ کے اعزازی لائبریرین پروفیسر محب الحسن صاحب کی کوشش ہوتی ہے کہ مختلف سفارت خانوں سے عطیہ کے طور پر کتابیں حاصل کی جائیں۔ ان کی اسی کوشش کے سلسلے میں فرانسیسی سفارت خانے نے کتابوں کا قیمتی تحفہ عنایت فرمایا ہے، یہ کتابیں فرانسیسی زبان میں ہیں اور چند فرانسیسی سے انگریزی ترجمے ہیں۔ اس سلسلے میں ۲۵ مارچ کو کتب خانہ میں ایک سادہ تقریب میں اپر تکلف چائے پر سفارت خانہ کے کلچرل کونسلر جناب فرانسس ڈورے نے شیخ الجامعہ کو یہ کتابیں عنایت فر

جشن زریں کی تیاریاں

جامعہ کے جشن زریں کی تاریخیں جوں جوں قریب آتی جاتی ہیں، اس کی تیاریوں میں اضا ہوتا جا رہا ہے۔ جامعہ نے اس موقع پر جو منصوبے بنائے ہیں، ان کی کامیابی کا دار و مدار عطیے اور چندوں پر ہے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے اور حالات یقیناً سازگار نہیں ہیں، لیکن ان منصوبو اور مقاصد کی اہمیت کے پیش نظر، جن کے لئے عطیوں کی اپیل کی گئی ہے، امید ہے کہ قوم اور مایوس نہیں کرے گا۔

مسجد کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے، اگرچہ رفتار خاصی سست ہے، کیونکہ جو روپے پہلے جمع تھے، وہ تقریباً ختم ہو گئے ہیں اور چندے کی رفتار بہت سست ہے۔ لوگوں کا یہ خیال کہ جب کام شروع کر دیا جائے گا تو قوم بڑھ چڑھ کر اس کی تعمیر میں حصہ لے گی اور منتظمین کو کسی قسم پریشانی نہیں ہوگی، مگر اب تک کا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ خدا کرے کہ یہ صورت حال وقتی ہو

(عبداللطیف اعظمی)

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

کالا پانی یا تواریخ عجیب — مؤلفہ: مولانا محمد جعفر تھانیسری مرحوم

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۱۲۰ صفحات، غیر مجلد۔ تاریخ اشاعت یکم نومبر ۱۹۶۹ء، قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ: مولانا وحید الدین قاسمی۔ مکان نمبر ۵۲۲۳ کوچہ رحمان چاندنی چوک۔ دہلی ۶

مولانا محمد جعفر تھانیسری مرحوم اُن علمائے کرام میں سے ہیں، جنھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا اور شدید تکالیف اور مصائب سے دوچار ہوئے تھے۔ مولانا تھانیسری مرحوم دسمبر ۱۸۶۳ء میں، جب ان کی عمر کوئی ۲۵ برس تھی، گرفتار کئے گئے اور ۲ر مئی ۱۸۶۴ء کو پھانسی کی سزا دی گئی اور ۱۶ر ستمبر تک پھانسی گھر میں قید رہے، مگر پھانسی کی یہ سزا، سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدل دی گئی مگر بیس سال کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی ۲۰ر دسمبر ۱۸۸۲ء کو رہائی کا حکم ہوا، ۲۲ر جنوری ۱۸۸۳ء کو یہ حکم انڈمان پہنچا اور دوسرے علماء کے ساتھ جو تحریک آزادی میں شرکت کرنے کی وجہ سے وہاں قید کی سزا کاٹ رہے تھے، مولانا تھانیسری بھی رہا کیے گئے، ان کی چھوٹی اہلیہ بھی عمر قید کی سزا کاٹ رہی تھیں اور ان کی مدت ابھی صرف ۱۴ سال پوری ہوئی تھی اور رہائی کا حکم نہیں آیا تھا، اس لیے موصوف کو وہاں رکنا پڑا، بالآخر یکم مئی ۱۸۸۳ء کو موصوفہ کی رہائی کا بھی حکم آگیا، مگر بعض نجی اسباب کی بنا پر وہ نومبر ۱۸۸۳ء کو وہاں سے روانہ ہوئے، ۲۰ر نومبر ۱۸۸۳ء کو کلکتہ پہنچے اور وہاں سے بذریعہ ریل انبالہ آئے، جہاں ان

کا شاندار استقبال کیا گیا۔

مولانائے محترم نے اپنی گرفتاری اور کالے پانی کے زمانے کے حالات زیر تبصرہ کتاب میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ کتاب کے بارے میں خود موصوف لکھتے ہیں:

"میں نے اس کتاب کو بطور روزنامچہ روزمرہ بول چال میں لکھا ہے اور دوسرے لوگوں کے مقولوں اور قصص کو جہاں تک مجھے یاد تھے بعینہٖ ہو بہو نقل کیا ہے۔"

یہ کتاب بڑی اہم ہے اور تاریخ آزادی کی اہم کڑی ہے۔ مولانا وحیدالدین قاسمی نے گاندھی جی کی صد سالہ سالگرہ اور خان عبدالغفار خاں کی ہندوستان میں آمد کے موقع پر شائع فرمایا ہے، انھوں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "... ان حضرات کی یاد کے ساتھ ان حضرات کو بھی یاد کرلینا چاہیئے جو جنگ آزادی کی تحریکات کے بنیادی ستون ہیں اور جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے جیلوں میں ناقابل برداشت سختیاں جھیل کر حبس دوام اور کالے پانی کی سزائیں پاکر پھانسی کے تختوں پر چڑھ کر سامراج کی گولیاں سینوں پر کھا کر اپنی جانیں قربان کی ہیں۔"

کتاب تاریخی لحاظ سے تو اہم ہے ہی، لیکن بیان اور واقعات کے لحاظ سے اتنی دلچسپ ہے کہ ایک مرتبہ شروع کر دینے کے بعد ختم کئے بغیر رکھنا مشکل ہے۔

اذان سحر   از انور اعظمی مرحوم

سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۲۲۴ صفحات، کتابت وطباعت وکاغذ عمدہ، مجلد، قیمت سات روپے

تاریخ اشاعت، اگست ۱۹۶۷ء، ناشر: انور اکیڈمی۔ سرائے میر۔ اعظم گڈھ (یوپی)

انور اعظمی اعظم گڈھ کے ہونہار نوجوان شعراء اور ادیبوں میں سے تھے، افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور عین جوانی کی حالت میں وفات پائی، ورنہ ان کی ادبی اور صحافتی صلاحیتوں اور قومی جذبۂ خدمت کی بنا پر توقع تھی کہ وہ اپنا اور اپنے دیار کا نام روشن کرتے۔ ان کے عزیزوں اور دوستوں نے ان کی یادگار میں ایک اکیڈمی قائم کی ہے اور ان کے کلام کا مجموعہ "اذان سحر" کے نام

سے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے کے ساتھ مرحوم کے دوست اور قدرداں کوثر اعظمی کا ۲۰ صفحات کا ایک مبسوط تعارف شامل ہے، جس میں تفصیل کے ساتھ، ان کی سیرت و شخصیت اور صحافتی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تعارف نگار کے بقول "جس میدان میں انور مرحوم کا جوہر صلاحیت سب سے زیادہ چمکا، وہ ان کی شاعری کا میدان ہے۔" کوثر صاحب نے، جو خود بھی ایک خوشگو شاعر ہیں، مرحوم کی شاعری کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "انور کی شاعری ایک عظیم مقصدیت کی حامل ہے، وہ مشق سخن برائے داد سخن کے قائل نہیں، تحسین و آفریں کو انھوں نے کبھی اہمیت ہی نہیں دی، یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام کبھی واہ واہ کی سطح پر گر کر سطحی عوامی لے قبول نہ کر سکا... ان کے کلام میں بڑا ٹھہراؤ اور گہرائی ہے، ان کے یہاں سامنے کی بات میں بھی ایک گہرا فلسفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔" (صفحہ ۷۸)

مرحوم کی شاعرانہ خصوصیات کو سمجھنے کے لئے ان کے کچھ اشعار بطور نمونہ۔ ۔ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، اس مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم صرف نظم کے شاعر ہیں اور کوئی نظم جب تک مکمل طور پر سامنے نہ ہو، اس کا حسن کامل پوری طرح محسوس نہیں کیا جا سکتا، مگر طوالت کے ڈر سے ایسا کرنا مشکل ہے، اس لیے مختلف نظموں کے انتخابات پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک نظم کے آخری دو بند ملاحظہ ہوں:

اٹھ! رہ شوق کا سامانِ سفر تازہ کریں
محفلِ دہر میں اندازِ نظر تازہ کریں

حسنِ افرنگ نہیں تیری نظر کا مقصود
ظلمتِ شب نہیں ہو سکتی سحر کا مقصود
یاس انگیزی نہیں دردِ جگر کا مقصود

نالۂ صبح کے افسردہ شرر تازہ کریں

ختم ہونے کو ہے یہ مملکتِ شب کا نظام
دے گئی موجِ صبا آکے سحر کا پیغام

میری امید یہ ہے آتشِ نمرود دلیل
پختہ ہوتے ہیں اسی آگ میں جذباتِ خلیل
ٹھوکریں کھا کے ابھر جاتی ہے آوازِ رحیل
کارواں کرنے کو ہے پھر جلوۂ منزل کو سلام

ایک نظم کا عنوان ہے "دارالعلوم"۔ آخری دو بند ملاحظہ ہوں :

تجھ کو کیا مشرق و مغرب کی حکایات سے کام
تو سجا نالۂ برباد سے محفل اپنی
تیری ہستی ہی کے اجزا ہیں پریشاں ہر سو
موج بھی اپنی ہے، خاموشیٔ ساحل اپنی
دشتِ حالات میں آوارہ بھٹکنے والے
کاش تو دیکھ سکے آنکھ سے منزل اپنی

مل سکے نالۂ بیتاب سے گرمی شاید
دلِ مایوس میں ہیں خفتہ شرارے اب بھی
تیرے ہی دل کو بھروسہ نہیں ان پر ورنہ
راہ دکھلاتے ہیں قرآن کے پارے اب بھی

جی چاہتا ہے کہ ابھی اور کچھ شعر پیش کروں، مگر نظمیں طویل ہیں اور خیالات جب تک پوری نظم نہ ہو، شاعر کے صحیح جذبے اور اس کے اصلی فن کو سمجھنا ممکن نہیں۔ [illegible] کو ختم کرتا ہوں :

فضا پر ہے شبِ تاریک طاری
نگہ میں دھند ہے وہم و گماں کی
دعاؤں سے سحر پیدا نہ ہوگی
ضرورت ہے مجاہد کی اذاں کی

چھپا چھپا کے نہ رکھ ان جگر کے داغوں کو
انھیں ستاروں سے اک آفتاب پیدا کر
نہ ہو سکے، تو شکایت نہ کر زمانے کی
جو ہو سکے تو کوئی انقلاب پیدا کر

مجھ کو بے ننگ و نام کہتا ہے
میری مے کو حرام کہتا ہے
یہ وہی شیخ ہے جو دولت کو
زر علیہ السلام کہتا ہے

بھوپال اور غالب از عبدالقوی دسنوی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۲۸ صفحات، غیر مجلد، قیمت : ڈھائی روپے۔ تاریخ اشاعت: فروری ۱۹۶۹ء — ناشر: شعبۂ اردو، سیفیہ کالج۔ بھوپال

غالب کبھی بھوپال نہیں گئے تھے، مگر نہ غالب کے حالات زندگی میں یا غالب کے خطوط میں ہی اس کا ذکر ملتا ہے کہ غالب نے کبھی بھوپال جانے کا ارادہ یا خواہش کی ہو۔ مگر مولوی سید محمد علی صاحب اشہری کے حوالے سے زیر تبصرہ کتاب کے مصنف جناب دسنوی صاحب نے لکھا

ہے کہ "نواب سکندر جہاں بیگم نے انھیں بھوپال بلانے کوشش کی اور تمام اخراجات کی ذمہ لی" اس بیان پر یقین نہیں آتا، کیونکہ ایسی صورت میں غالب کے سوانح نگار اس کا ضرور ذکر اس کے علاوہ اس کتاب میں بھوپال سے غالب کے جس تعلق کی نشان دہی کی گئی ہے وہ حسب:

"بھوپال سے غالب کا تعلق ملنے والوں، شاگردوں، نسخہ فوجدار محمد خاں وغیرہ کے علاوہ ان کے سسرالی خاندان سے بھوپال کی قرابت بھی ہے۔ ڈاکٹر حامد حسین نے اس رشتہ کی کھوج اس طرح لگائی کہ "یٰسین محمد خاں، نواب قدسیہ بیگم کے بھائی معز محمد خاں کے بیٹے تھے جن کی شادی غالب کی اہلیہ کی بھتیجی کی بیٹی اور داغ کی بھانجی خسرو جہاں بیگم ملقب بہ سردار دلہن بیگم سے ہوئی تھی، میاں معظم محمد خاں انھیں کے بطن سے تھے۔" (صفحہ ۷)

بھوپال سے تعلق کی ایک صورت یہ ہے کہ وہاں ان کے بہت سے شاگرد تھے، اگرچہ براہ راست نہیں ہے، مگر شاگرد معنوی اولاد کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے اس کو سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دسنوی صاحب نے اس کتاب میں اختصار سے ان شاگردوں پر ڈالی ہے اور چند کے فوٹو بھی شائع کئے ہیں۔ بھوپال کے فخر کے لئے یہ امتیاز کافی ہے کہ دو نایاب مخطوطے وہیں سے دریافت ہوئے ہیں۔ پہلے کا جو ۱۹۲۱ء میں نسخۂ حمیدیہ کے نام ہوا ہے، زیر تبصرہ کتاب میں ذکر ہے، مگر دوسرے کا جو آج کل مقدمہ بازی کا سبب بن گیا ہے سے ذکر نہیں ہے، شاید اس کی اشاعت تک اس کی تفصیلات سے محترم مصنف واقف نہیں چنانچہ ابھی حال میں انھوں نے اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ "نسخۂ بھوپال ثانی اس سے پہلے کہ دیکھ پاتے وطن سے بے وطن ہو گیا" (ہماری زبان مورخہ ۲۲ مارچ)

مختصر یہ کہ غالب یا غالبیات کا بھوپال سے جو گہرا تعلق رہا ہے، اس پر اس مختصر اچھی طرح سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کتاب کی اشاعت سے غالبیات میں اضافہ ہوا ہے۔

شاعر ــــ مہاتما گاندھی نمبر   مدیر اعلیٰ : اعجاز صدیقی

سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ ، حجم ۲۷۸ صفحات ، سالانہ چندہ : ۹ روپے ، گاندھی نمبر کی قیمت : ۴ روپے ، ملنے کا پتہ : ماہنامہ شاعر، قصر الادب ، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ، بمبئی ۴ بی سی

مہاتما گاندھی کی صد سالہ جینتی کے موقع پر اردو کے بعض رسالوں نے خصوصی نمبر نکالے ہیں، ان میں ماہنامہ جامعہ کے علاوہ اور کوئی نمبر مجھے پسند نہیں آیا، زیادہ رسالوں نے حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات کے بھیجے ہوئے ترجموں کو شائع کیا ہے اور یہ ترجمے بہت اچھے نہیں ہیں۔ اگرچہ شاعر کے گاندھی نمبر میں ایسے چند مضامین شامل ہیں، مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ واقعی اس نے بحیثیت مجموعی بہت اچھا نمبر نکالا ہے ، اس نے محض فرض پورا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، ذمہ داری کا حق ادا کیا ہے۔

دراصل گاندھی جی پر کچھ لکھنا بہت مشکل کام ہے، ان کی زندگی میں ان کو پوری طرح سمجھا نہیں گیا اور اس وقت تک ان کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں، جب تک ملک کی گروہی سیاست کے اثرات ہمارے قلب ونظر کو آزادی کے ساتھ سوچنے اور دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے، یا ہم میں مکمل طور پر معروضی انداز فکر پیدا نہیں ہوتا۔ زیر تبصرہ شمارہ کے مضمون نگاروں میں، میرے خیال میں، کوئی شخص ایسا نہیں ہے، جسے ہم گاندھی جی کا مخالف یا فرقہ پرست کہہ سکیں، مگر نقطۂ نظر کا اختلاف بہت سے مضامین میں موجود ہے۔ ظ انصاری کا مضمون مجھے بہت پسند آیا، واقعی انھوں نے محنت سے لکھا ہے، مگر مختلف مسائل پر انھوں نے جو رائیں ظاہر کی ہیں یا بعض واقعات سے جو نتیجے نکالے ہیں ان میں سے بعض سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ ذیل کے اقتباسات ان ہی باتوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن سے مجھے اختلاف ہے :

> "گاندھی جی کے دل میں جو ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ ابھرا تھا، جب وہ پہلی دوسری بار مجاہدانہ انداز سے سامنے آیا تو جس پتھر کو چھوا پارس بنا دیا، علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی کیسی کیسی آرزوؤں سے بنی تھی، لیکن بائیکاٹ کے اعلان کا اثر فقط اس پہ ہوا، آخا نہ تو آسو توش مکرجی کی کلکتہ یونیورسٹی

پر ہوا نہ مالوی جی کی بنارس یونیورسٹی پر ۔۔ دہلی، لکھنؤ اور بمبئی کی شاندار ہڑتالوں اور جلسوں میں بھی مسلمان ہی آگے رہتے تھے، نان کوآپریشن کے ہنگامی زمانے میں شہروں کے مسلمان وردیاں پہن کر پریڈ کرتے ہوئے نکلتے اور دوکانوں پر پہرہ دیتے، لیکن یہ سیاسی ہیجان ایک روپ تھا، اصلیت نہ تھی، اس کے پس پردہ معاشی اور سماجی اصلیت کو گاندھی جی نے نظر انداز کیا تو روپ بھی ان کے منتر سے نکل گیا۔"

"جس شدت سے انھوں نے اچھوتوں کو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ساتھ مخلوط انتخاب میں رکھنے کی کوشش کی اور اس کے ہرجانے میں جو حقوق ان کو دینے پر آمادہ ہو گئے، وہ انھوں نے سات کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو دلوانا گوارا نہ کیے تھے، بلکہ ۱۹۳۲ء کے بعد تو وہ صاف طور سے کہنے لگے تھے کہ پہلے میں ہندوؤں کو ساتھ لے لوں، رہا ہندو مسلم مسئلہ، اقلیت اکثریت کے حقوق کا سوال تو وہ انگریزوں کے اقتدار تک ہے، اس کے بعد خود بخود دور ہو جائے گا۔"

میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے کہ ۱۹۲۰ء کی تحریک عدم تعاون کا اثر صرف مسلم یونیورسٹی پر پڑا، کسی اور یونیورسٹی پر نہ تو مسلم یونیورسٹی بھی اسی طرح باقی رہی جیسے کلکتہ اور بنارس یونیورسٹی۔ اسی طرح "ہڑتالوں اور جلسوں میں بھی مسلمان ہی آگے رہتے تھے" میں "مجھے ہی" سے اختلاف ہے ۔اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، مگر یہ اس کا موقع نہیں۔ "کے اس شمارے میں جناب آصف فیضی کا مضمون "گاندھی جی اور اقلیتیں" بھی چھپا ہے۔ اس کے دو مختصر اقتباسات ذیل میں:

"تقسیم ملک کے بعد گاندھی جی کے بارے میں مسلمانان ہند کے متضاد خیالات سننے میں آتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ مسلم اقلیت کے زبردست حامیوں اور مخلص دوستوں میں تھے۔ مذہبی معاملوں میں ان کے خیالات نانک اور کبیر کی طرح کسی مخصوص عقیدے تک محدود نہ تھے۔۔۔"

"۔۔۔ ہندوستان کے اتحاد کے لئے عمر بھر کام کرتے رہے، ان سے ایک دو غلطیاں سرزد ہوئیں، مگر اس کے باوجود مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ تمام سمجھدار مسلمانوں کی رائے میں وہ مسلمانوں کے گہرے دوست اور مددگار تھے۔"

فاضل مدیر نے "تجربات" میں بالکل صحیح فرمایا ہے کہ گاندھی جی کی تعلیمات کو جس طرح پامال کیا گیا، اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ "مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گاندھی صدی کی تقریبات پر لاکھوں ۔۔۔ بلکہ شاید کروڑوں سے بھی زیادہ روپے صرف کئے گئے، مگر اس موقع پر اردو کی طرف وہ توجہ نہیں کی گئی، جس کی وہ مستحق تھی،" یہ بھی صحیح ہو کہ اس کو بڑی حد تک نظر انداز کیا گیا۔ مگر اس کے ساتھ مجھے مسلمانوں اور اردو والوں سے یہ کہنا ہے کہ مسلمانوں میں بہت تھوڑے سے لوگ ہیں جو دل سے گاندھی جی کے خیالات اور تعلیمات کی قدر کرتے ہوں، اسی طرح اردو والوں میں بہت کم ہیں جو ہندوستانی کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات سے متفق ہوں۔ پھر شکایت کی جائے تو کس سے اور کیوں ؟!

(عبداللطیف اعظمی)

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۱ | بابت ماہ مئی ۱۹۷۰ء [redacted] | شمارہ ۵

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلی فون:

اڈیٹر: ۷۴۲۵۸ منیجر: ۷۴۴۷۰

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائٹل:

شذرات

۳ مئی ۱۹۷۰ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی وفات پر ایک سال گذر جائے گا۔ ایک سال گذرنے کو تو گذر گیا۔ اور وقت کی یہی خوبی ہے کہ وہ گذر جاتا ہے ـــــ مگر شاید ہی کوئی اہم موقع آیا ہو اور ڈاکٹر صاحب یاد نہ آئے ہوں۔ جامعہ کے حالات اور ماحول میں ان کی یاد کا آنا ایک قدرتی بات ہے، کیونکہ اس کے چپے چپے پر ان کے ایسے گہرے اور تابندہ اثرات ہیں، جنھیں کوئی شخص نظر انداز کرنا چاہے بھی تو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مگر ملک کے ان حلقوں میں بھی، جن سے ان کا تعلق بہت گہرا اور دیرینہ نہیں تھا، ان کی کمی بہت محسوس کی گئی۔ تہذیبی اور تعلیمی اداروں اور شعبوں سے مرحوم کا تعلق ہمیشہ سے رہا ہے اور ان میں وہ بڑی قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، مگر سیاست سے وہ ہمیشہ کتراتے تھے، اس کی تلون مزاجی اور وقت پروری ان کے مزاج کے خلاف تھی، مگر عمر کے آخری زمانے میں جب انھیں گورنری، نائب صدارت اور صدارت کے عہدے قبول کرنے پڑے اور ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا جو ان کی طبیعت، شرافت اور مزاج سے میل نہیں کھاتے تھے، تب بھی انھوں نے اپنی امتیازی شان کو باقی رکھا اور ملک و قوم کے مفاد میں جہاں اور جب ضرورت محسوس کی اپنے اثرات کو استعمال کیا۔ ہمارے دستور کے لحاظ سے صدر جمہوریہ کو حکومت کے معاملات میں مداخلت کرنے اور اس کی پالیسی میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے، سوائے اس کے کہ صدر راج قائم ہو جائے، مگر عظیم شخصیتیں مداخلت کئے بغیر اہم معاملات پر بہر حال اثر انداز ہوتی ہیں، ان عظیم شخصیتوں میں، جن کے اثرات قبول کرنے پر لوگ مجبور ہوتے ہیں، یقیناً ذاکر صاحب کا شمار بھی ہوتا ہے اور جب "رموز مملکت" پر کسی "دانائے راز" نے کبھی روشنی ڈالی تو اس وقت معلوم ہوگا کہ ذاکر صاحب کی وفات سے ملک و قوم کو کتنا بڑا نقصان پہنچا ہے اور آج ملک میں جو انتشار ہے اور حکومت

جس طرح ڈانواں ڈول نظر آتی ہے، یہ سب نہ ہوتا اگر ذاکر صاحب کی سرپرستی اور سربراہی قائم رہتی۔ ذ
نے اپنے دور صدارت میں شرافت اور مروت، انسانیت اور خلوص، تدبر اور مصلحت پرستی، غیر جانبد
اور انصاف پسندی، سیکولرزم اور مذہبی اقتدار سے محبت اور حمایت کی ایسی روشن مثالیں قائ
جنھیں ایک طویل عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔

ذاکر صاحب نے آزاد قومی تعلیم کی ترویج و اشاعت کو مقصد زندگی بنایا تو راہ کی مشکلات
بخوبی واقف تھے، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جس ملک میں خدمت کا عہد کر رہے ہیں، وہ خود ان کے
میں "بڑا بدنصیب ملک ہے، وہ غلاموں کا ملک ہے، جاہلوں کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے، سستی کا ملک ہے،
ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے" وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ "اس دیس کی سیوا میں قدم قدم
دیکھ لوگ مخالفت کریں گے" مگر یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ جو کام خلوص اور دیانتداری سے کیا جائے،
کتنے ہی نامساعد اور لوگ کتنے ہی مخالف ہوں، کامیابی بہرحال ہوتی ہے۔ یہی معاملہ ذاکر صاحب کے
آیا، ۱۹۲۶ء سے، جب انھوں نے جامعہ کی خدمت کا عہد کیا ۱۹۴۸ء تک، جب مسلم یونیورسٹی کی حفا
سپرد ہوئی، کٹھن سے کٹھن مشکلات کا سامنا ہوا اور بڑی سے بڑی مایوسیوں اور ناکامیوں سے واسط
مگر بہرحال وہ دن آیا جب ان کے خلوص اور محنت کی قدر کی گئی، ان کے نصب العین اور مقصد حیات
اور حسن قبول حاصل ہوا، ان کی دن ورات کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ان کی ذات کو وہ
۔۔۔ اور بغیر کوشش اور جوڑ توڑ کے ۔۔۔ جو بہت لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ مگر ان ترقیوں کے
نہ تو سادگی اور شرافت میں کوئی فرق آیا اور نہ ان کے جذبۂ خدمت میں کوئی کمی آئی۔ وہ جہا
۔۔۔ چاہے راج بھون میں یا راشٹرپتی بھون میں ۔۔۔ معلم کے فرض کو انجام دیتے رہے اور
خدمت کا جب بھی موقع ملتا اس سے ضرور فائدہ اٹھاتے۔

اونچے عہدوں کی سبھی عزت کرتے ہیں، صحیح عزت وہ ہے جو عہدۂ بلند سے ہٹنے کے
ذاکر، ادب کی، وفات کے بعد عوام نے ۔۔۔ سبھی مذہب و ملت اور طبقوں کے لوگ ش

جس عقیدت اور محبت کا ثبوت دیا اور حکومت نے جس احترام و اعزاز سے نوازا، وہ صرف پرخلوص اور بے غرض خدمت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ آج ذاکر صاحب کو مرجع خلائق کا جو بلند مرتبہ حاصل ہے، وہ یا تو بزرگان اور صوفیوں کے مزاروں پر نظر آتا ہے یا قوم کے بلند ترین خادموں کی آخری آرام گاہوں پر۔

ہماری قوم پر جہاں یہ الزام ہے کہ وہ مردہ پرست واقع ہوئی ہے، یعنی اپنے محسنوں کی ان کی زندگی میں وہ قدر نہیں کرتی جس کے وہ مستحق ہیں، وہاں یہ الزام بھی ہے کہ وہ زود فراموش ہے، اس نے اپنے انتہائی مخلص رہنماؤں کو اس طرح بھلا دیا ہے کہ اب بھولے سے بھی یاد نہیں کرتی۔ امید ہے کہ ذاکر صاحب کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ ان کی یاد کو زندہ رکھنے اور ان کے اصولوں اور آدرشوں پر عمل کرنے اور عمل کرانے کی اولیں ذمہ داری جامعہ ملیہ پر ہے، جس کی نشوونما اور ترقی میں ذاکر صاحب کا خون پسینہ شامل ہے، ہمیں یقین ہے کہ جامعہ ملیہ اپنی اس ذمہ داری کو بہ حسن و خوبی انجام دے گی، دوسری ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے، جس کی خدمت کے دوران انھوں نے وفات پائی۔ حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی ہے جس کو مرحوم کے شایان شان یادگار قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ کمیٹی اپنے فرائض سے آگاہ ہے اور ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ وہ ذاکر صاحب کی خدمات کو سامنے رکھکر ایسی یادگاریں قائم کرے گی جو ملک و قوم کیلئے مفید ہو۔

جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی کی تعمیر و ترقی میں ذاکر صاحب کا جو حصہ ہے وہ سب کو معلوم ہے، لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر ذاکر صاحب نے توجہ نہ کی ہوتی تو آج شاید دہلی کالج کا وجود باقی نہ ہوتا، اور اگر ہوتا تو اس کی شکل و صورت کچھ اور ہوتی۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی ایجوکیشن سوسائٹی کے تمام عہدہ دار اور بیشتر اراکین پاکستان چلے گئے تھے۔ ذاکر صاحب نے ہی اسے کسی نہ کسی طرح سنبھالا اور سوسائٹی کا جامعہ سے تعلق پیدا کر کے اسے محفوظ کر دیا۔ اِدھر کئی سال سے دہلی کالج کی مالی حالت خراب تھی اور اور اس کی وجہ سے کچھ عجیب پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں، ذاکر صاحب کی توجہ اور کوشش سے حکومت نے اسے جامعہ ملیہ کی معرفت نو لاکھ کی گراں قدر رقم عطا کی۔ ذاکر صاحب کی اسی توجہ کا اثر تھا کہ ان کے

انتقال کے بعد محترم وزیر تعلیم نے ایک جلسے میں فرمایا کہ چونکہ ذاکر صاحب کو دہلی کالج بہت عزیز تھا اس لیے ان کے انتقال کے بعد یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کی بہبودی اور ترقی کا خیال رکھیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اب اس کا نام ذاکر حسین میموریل دہلی کالج رکھا جانے والا ہے اور ذاکر صاحب کی پہلی برسی کے موقع پر یہ اعلان کیا جائے گا۔ ظاہر ہے اس تجویز سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، مگر ذاکر صاحب کی روح اسی وقت خوش ہوگی جب یہ کالج اپنے تعلیمی معیار اور حسن انتظام کے لحاظ سے اگر مثالی نہیں تو کم از کم دہلی کے بہترین کالجوں میں سے ہو۔

ذاکر حسین میموریل کمیٹی نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ ذاکر صاحب کی انگریزی میں ایک مبسوط سوانح حیات لکھی جائے اور اس کا ترجمہ ملک کی تمام زبانوں میں شائع کیا جائے۔ یہ اہم کام ذاکر صاحب کے مدت العمر کے ساتھی اور عزیز ترین دوست پروفیسر محمد مجیب صاحب کو سپرد کیا گیا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب ان چند گنے چنے لوگوں میں سے ہیں، جنھیں ذاکر صاحب پر کچھ لکھنے کا حق ہے۔ ذاکر صاحب کے دوستوں اور قدر دانوں کو یہ سنکر یقیناً خوشی ہوگی کہ اس بڑے اہم کام کا آغاز ہو گیا ہے۔

ذاکر صاحب کی آخری کتاب "کچھوا اور خرگوش" ہے جو ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ یہ بظاہر معمولی کہانی ہے، مگر مرحوم نے کہانی کے انداز اور اپنے مخصوص اسلوب میں بڑی حکیمانہ باتیں کہی ہیں۔ تعلیمی خطبات کے بعد ان کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں ان کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اس میں ان کے قلم کی شگفتگی اور زندگی کبھی ہلکا اور کبھی بھرپور طنز قدم قدم پر ملتا ہے اور بقول رشید احمد صاحب "بہت سی باتیں سِرِّ دلبراں اور حدیث دیگراں کے راستے سے آ گئی ہیں، سرگذشت سے ذاکر صاحب کے فضائل پر روشنی پڑتی (ہے اللہ) اس تصنیف سے ان کے فضائل کی روشنی کا مینارہ سامنے آتا ہے۔" یہ کتاب اور اس کا انگریزی کا ترجمہ نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع ہو رہا ہے اور امید ہے کہ پہلی برسی کے موقع پر یہ دونوں چیزیں شائع ہو جائیں گی۔ بعد میں ملک کی دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ شائع ہوگا۔

اس تمام تفصیل کا مدعا صرف یہ بتانا ہے کہ اس ایک سال کے اندر ذاکر صاحب کو قوم اور ملک نے یاد رکھا اور ان کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے، وہ ایک خاص مقصد کے لئے جئے اور آخر عمر تک اس کی تکمیل و تحصیل میں لگے رہے، ان کی سچی یادگار وہی ہوگی جو ان کے مقصد زندگی کی تکمیل کرے۔ جامعہ نے چند منصوبے بنائے ہیں، ضرورت ہے کہ ان کو قابل عمل بنایا جائے، اس سے ذاکر صاحب کی روح بھی خوش ہوگی اور قوم و ملت کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

پروفیسر محمد مجیب

اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام

(۱)

جب کوئی مسلمان اسلام کے بارے میں تقریر کرتا ہے یا لکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کا کام کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے مغربی عالموں کی رائے میں تعصب نظر آتا ہے یا ادب اور لحاظ کی کمی، اور اسلام کو پیش کرنے کے روایتی طریقے یا تو اس کے نزدیک موجودہ زمانے کے علمی معیار پر پورے نہیں اترتے یا حالات سے بے تعلق معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ ان لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہے جن کی رہنمائی کرنا ضروری ہے، اور اس کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اسلام کو صحیح طریقے پر پیش کرے۔ میرا مقصد اصلاح کرنا نہیں ہے، بلکہ صرف اس کا جائزہ لینا کہ اسلام کے بتائے ہوئے حقوق و فرائض پر غور کرنے کا جو ہمارا طریقہ ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، اور وہ بھی اس لئے کہ اگر ہم اپنے عقیدے اور عمل کو محض عادت بنا کر لاحاصل یا بے جان نہیں کر دینا چاہتے تو ہم کو کسی نہ کسی قسم کا جائزہ برابر لیتے رہنا چاہیئے۔ حساس مسلمانوں اور خاص طور سے صوفیوں کو برابر اس کا خیال رہا ہے۔ شیخ عین القضاۃ ہمدانیؒ نے فرمایا ہے کہ عادت پرستی بت پرستی ہے، سچی عبادت وہ ہے جو ہم کو عادت سے آزاد کرے اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا کہ نماز، روزہ اور حج ایسے کام ہیں جنھیں ایک بڑھیا بھی کر سکتی ہے، مرد آدمی وہ ہے، جو ان سے زیادہ کا حوصلہ کرے۔ لیکن پچھلے تین سو برس میں جو اصلاحی تحریکیں ظہور میں آئیں ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ معنی سے ہٹ کر لفظ کی زیادہ سختی سے پابندی کرنے لگے۔ بیشک ان تحریکوں کی بدولت اصلاح بھی ہوئی، اوہام پرستی کے بہت سے طریقے چھوڑ دیئے

گئے، شرعی حقوق کا احساس دلایا گیا اور حقوق کے سلسلے میں مجھے خاص طور سے سید احمد شہیدؒ کا یہ کارنامہ یاد آتا ہے کہ بیوہ کو دوبارہ نکاح کرنے کا حق مل گیا، مگر ان تمام اصلاحی تحریکوں میں انسانی ضمیر کا منصب یہ تھا کہ وہ روایتی انداز فکر کو تقویت پہنچائے۔ یہ صحیح معنوں میں ایک قسم کی تقلید ہی تھی جس سے صرف یہ تسلی حاصل ہو سکتی تھی کہ شرعی قانون کی زیادہ صحیح اور زیادہ مکمل پیروی کی جارہی ہے۔ سوچنے کی ترغیب دلائی گئی تو بس اس لیے کہ پیروی یا تقلید کا اصول زیادہ مستحکم ہو جائے۔

سید احمد خاں روایتی معیار کے مطابق دینیات کے عالم نہیں تھے، مگر انھوں نے جو بحث چھیڑی اس کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے کہ انھوں نے شرعی مسائل میں عقل ناقد سے کام لیکر خود تقلید کے اصولاً صحیح نہ ہونے کا سوال اٹھایا۔ ان معاملات کو چھوڑ کر جنھیں وہ دین کی بنیاد مانتے تھے، انھوں نے کسی بات کو بغیر غور اور تحقیق کے ماننے سے انکار کر دیا۔ ہم ان کے اس خیال کے بارے میں جو بھی رائے رکھیں کہ قرآن کی تعلیم جدید سائنس کے مطابق ہے یا جن اور فرشتے دراصل جن اور فرشتے نہیں ہیں۔ بلکہ کچھ اور ہیں، لیکن قرآن اور حدیث کی جو تفسیر یا شرح انھوں نے لکھی، وہ اس کا اعلان ہے کہ دینی معاملات میں ہر مسلمان کو سوچنے اور رائے قائم کرنے کا حق ہے۔ سید احمد خاں کی ساری بحث اس وجہ سے ناقص ہو جاتی ہے کہ انھوں نے ترقی کا ایک غلط معیار پیش کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ حقیقت کی تلاش میں مصروف ہیں، اور ان کے خلوص میں شک نہیں کرنا چاہیئے لیکن جسے وہ حقیقت سمجھتے تھے وہ صرف ان کے زمانے کے سائنٹیفک تصورات تھے اور ایک طرح کی مادیت جس کی بنیاد عقلیت پسندی پر تھی۔

سید احمد خاں نے ایک تعلیمی ادارے کو قائم کرنے کی خاطر مذہبی بحث سے توبہ کر لی۔ ان کے مقابلے میں مولانا آزاد کا علم ان سے بہت زیادہ تھا اور سائنس یا ترقی کا کوئی تصور ان کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن گیا تھا، لیکن وہ ایسے اہم مسئلے کی طرف بس اشارہ کر کے رہ گئے کہ مسلمانوں کو ایک الگ دینی یا سیاسی جماعت بن کر رہنا چاہیئے یا نہیں، پھر بھی انھوں نے ایک نظریہ پیش کیا جو اختیار کیا

جاتا تو ہماری زندگی میں بڑا انقلاب پیدا کرسکتا تھا۔ نظریہ یہ تھا کہ مسلمان کو جو رب العالمین کا نام لیوا ہو، اپنی دنیا میں اپنے طریقے پر انسانوں کو فیض پہنچانا اپنا خاص منصب سمجھنا چاہیئے۔ مولانا آزاد کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ انھوں نے اس نظریے کا اپنے بس بھر حق ادا کیا تو بھی یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ یہ نظریہ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا، کیونکہ اس پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان دنیاوی معاملات میں بہ یک وقت مصروف بھی رہے اور اپنے دل کو آزاد بھی رکھے اور یہ صفت پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ شاید اسی وجہ سے ان کے اس نظریے پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔

اصل میں وضاحت طلب یہ مسئلہ نہیں ہے کہ مسلمان اچھا مسلمان کیسے ہوسکتا ہے، بلکہ یہ مسئلہ کہ اسے کس حد تک اور کن معاملات میں اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرنا اور کس حد تک روایتی تصورات کا پابند رہنا چاہیئے۔

یہاں ضمیر سے مراد غلط اور صحیح، اچھے اور برے کا وہ احساس ہے، جو روزمرہ کی زندگی میں ہماری رہنمائی کرتا ہے اور جس کی وجہ سے ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ صحیح بات پر عمل کرنا ہمارا فرض ہے۔ بعض لوگوں میں یہ احساس بہت قوی ہوتا ہے، عام طور پر لوگ دوسروں کی مثال اور جماعت کی رائے کا سہارا لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ہم اپنے لیے طے کریں کہ صحیح اور غلط کیا ہے، بس ایک دوسرے کی نقل کرتے ہیں۔ تاریخ کو دیکھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مسلمان جنھیں ان کے ضمیر نے مجبور کیا کہ عام رواج یا عام خیالات سے اختلاف کریں، وہ اپنی تائید میں قرآن کا حوالہ دیتے، لیکن قرآن کا حوالہ دینے کا حق بھی محدود تھا۔ اس سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھاسکتے تھے، جن کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ ان کا علم کافی ہے۔ مگر ایسے عالم خود کسی فقہی مذہب کی پابندی کرتے تھے، اور ان کی مثال سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ دینی عقائد اور عمل کے معاملے میں صحیح اور غلط کی تمیز عام رائے اور رائج اور مستند تصورات کے مطابق کی جاتی تھی۔ انفرادی طور پر ہر مسلمان کا ضمیر مجبور تھا کہ قرآن اور حدیث کی تشریح کے

کسی رائج طریقے کے مطابق ذہنی تسلی حاصل کرے۔

قرآن نے کسی ایسی تقلید کا حکم نہیں دیا ہے، اس کی نظر میں ملت بھی ہے اور افراد ملت بھی، اور اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے کہ افراد کی طرح ملت بھی غلطی کر سکتی ہے، جس کی مثالیں تاریخ سے دی گئی ہیں۔

رسول اللہ صلعم کی مثال اور ان کی ہدایتوں کی پوری تقلید در اصل وہی لوگ کر سکتے تھے جو ان کے ہم عصر تھے، جو ان کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے اور جو بات سمجھ میں نہ آتی اس کے بارے میں ان سے سوال کر سکتے تھے۔ ہم تک جو حدیثیں پہنچی ہیں، ان پر اس زمانے کے رائج تصورات اور عمل کا اثر پڑ چکا تھا جب وہ یکجا کی گئیں۔ چاہے ہم سید احمد خاں کے اس خیال سے اتفاق نہ کریں کہ تمام حدیثیں رسول اللہ صلعم کے قول اور عمل کے بارے میں دوسروں کے بیانات ہیں اور اس لیے ہمارے اوپر ان کی پابندی اسی حالت میں لازمی ہے جب کہ ہماری عقل انھیں قبول کرے، لیکن ہم سید احمد خاں کی اس رائے کو بالکل نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ حدیثوں کی جانچ کے لیے شروع ہی سے خاصے سخت قاعدے بن گئے تھے، صرف اس لیے کہ ہر راوی اور ہر روایت قابل اعتبار نہیں تھی۔

تقلید کے اس سارے مسئلے کو اس نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ دین کا مقصد انسان کے ذہن کو ایک حالت پر قائم رکھنا ہے یا اس میں نمو کی طاقت پیدا کرنا۔ اس سوال کو اٹھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عقیدے کو وقت کے ساتھ بدلنا چاہئے، بلکہ اس مسئلے کی طرف متوجہ کرنا کہ خود عقیدے میں کوئی مادہ ایسا ہے یا نہیں جو خود بڑھتا اور نشو و نما پاتا رہتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے بارے میں ہمارے جو روایتی عقائد ہیں ان میں کوئی ایسی جمہوری صفت ہے کہ جو ہمیں ملک کی موجودہ زندگی کا ایک تندرست، حیات آفریں عنصر بنا سکتی ہے؟ حالات کے مطابق قرآنی ہدایتوں کی جو تشریحیں کی گئی ہیں، ان میں سے کئی اب ہمارے زمانے کے اعتبار سے کار آمد نہیں ہیں۔ ہندی مسلمانوں کے اب ایسے مخالف نہیں ہیں، جنھیں مکے کے قریش کا نمونہ

مانا جاسکے، انھیں اب یہودی اور نصرانی قبیلوں سے معاملات طے کرنے نہیں ہیں، ان کے پاس بڑھنے اور پھیلنے کے وہ موقعے نہیں ہیں، جو مسلمان عربوں کو ساتویں اور آٹھویں صدی میں حاصل تھے اور وہ ایک ایسی ریاست نہیں ہیں جو غیر مسلم ریاستوں سے صلح یا جنگ کرسکے اب ہندوستان دارالاسلام ہے نہ دارالحرب، اور اگر اسے دارالامن مانا جائے تو اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم مجبور ہوکر جو حالات ہیں، انھیں تسلیم کرتے ہیں، اپنے آپ کو شہریت کے فرائض کو انجام دینے کا پابند نہیں سمجھتے اور مذہبی آزادی اور جان و مال کے تحفظ کے سوا دوسرے حقوق سے دست بردار ہوگئے ہیں۔ اس موقع پر کیا ہمیں طے کرلینا چاہیے کہ ہمیں کوئی ہدایت نہیں دی گئی ہے جو حسب حال ہو، یا یہ سوچنا چاہیے کہ ہدایت موجود ہے، صرف روایتی تصورات کو چھوڑنے کی ضرورت ہے؟ اگر ہم مان لیں کہ ہمارے عقائد میں نمو کی طاقت ہے تو ہم اپنے آپ کو برابر یاد دلاتے رہیں گے کہ "قوامین بالقسط شہداء للہ" سے ہمارا منصب واضح ہوتا ہے اور ہمیں یہ منصب صرف ہندوستان کے مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی خاطر ادا کرنا ہے۔

یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کے ضمیر نے مسلمانوں کے ذہن کو اس خیال سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانوں کی صرف دو قسمیں ہیں، مسلمان اور گمراہ۔ شیخ ابن عربی عقیدۂ وحدت الوجود کی علامت بن گئے ہیں، لیکن وحدت الوجود کے ماننے والے ان سے پہلے بھی تھے۔ اس عقیدے کو شیخ ابن عربی نے جس طرح پیش کیا ہے، وہ بہت پیچیدہ ہے اور اس نے لوگوں کے تصورات کو اتنا متاثر نہ کیا ہوتا اور وہ صوفیوں کے عقائد اور شاعروں کے کلام میں اس جوش اور شوق سے بیان نہ کیا گیا ہوتا اگر مسلمانوں میں ایک غیر شعوری، مگر قومی میلان نہ ہوتا کہ اپنی نظریں اونچی کرکے مسلمانوں کے علاوہ باقی انسانوں کو بھی دیکھیں اور غیر مسلموں کو اس کا حق دیں کہ وہ اپنے الگ عقیدے رکھیں اور ان پر عمل کریں۔ مسلمانوں کے ضمیر ہی نے عقیدے کی سچائی کا معیار، خلوص اور وفاداری کو بنایا اور محض زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہنا کافی نہیں سمجھا۔ یہی ضمیر تھا جس نے اکبر کے ذہن میں یہ سوال اٹھایا کہ انسانوں کے عقیدوں میں کوئی مشترک قدر

ہیں یا نہیں ؟

البتہ سیاست کے میدان میں مسلمانوں کے ضمیر نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔ بنوامیہ نے ایسے تمام خیالات اور رجحانات کو کچل ڈالا جن سے ان کے خاندانی اقتدار کو نقصان پہنچ سکتا تھا، اس سے بھی زیادہ مہلک معتزلہ کی یہ کوشش تھی کہ حکومت کی مدد سے اپنے عقائد کو تسلیم کرائیں، اس لیے کہ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ علمار اور حکومت کے درمیان ایک اتحاد سا ہو گیا اور حکومت اور علمار کی شراکت کی ایسی نظیریں قائم ہوئیں جنھوں نے ذہن کی آزادی بلکہ علمی تحقیق کو ایک خطرناک چیز بنا دیا۔ ہم اقتدار پرست علمار کو معاف کر سکتے اگر وہ مروّجہ سیاسی اور سماجی نظام کے مخالفوں کی مدد کے لیے فقہی دلیلیں دینے سے انکار کرتے، لیکن وہ تو اس سے بہت آگے بڑھ گئے اور ملت اسلامی اور حاکم وقت کے مفاد کو مترادف قرار دیدیا اور محکوموں کو حاکم اور حکومت کی اصلاح کرنے کے حق سے بالکل محروم کر دیا۔ مساوات اس شکل میں تو قائم رہی کہ خدا کے سامنے سب برابر مانے گئے لیکن حاکموں کی پالیسی مساوات کے اصول کی خلاف ورزی کرتی رہی، یہاں تک کہ یہ اصول ہی بے معنی ہو گیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار تھا اگرچہ وہ خود ایک اقلیت تھے، لیکن اپنے آپ کو اکثریت کا نمائندہ سمجھ کر اس کے خیالات اور رجحانات کے محافظ بن گئے اور چونکہ یہ ایک عقل کی بات تھی کہ عقیدے اور عمل کے معاملے میں اکثریت کی رائے مانی جائے اس لیے اکثریت کو اقلیت پر پوری طرح سیاسی اور دینی اختیار ہو گیا۔ ایک فرضی اکثریت پوری جماعت کی اور یہ پوری جماعت رائج سیاسی اور سماجی نظام کی مترادف قرار دی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ اس جماعت کا مفاد اور امت اسلامی یعنی اس کا مفاد ایک ہے۔ ایسی حالت میں تقلید کے معنی یہ تھے کہ انفرادی طور پر کسی مسلمان کو اس کا حق نہیں تھا کہ غلط اور صحیح، نیک اور بد کے بارے میں اپنی الگ رائے رکھے، یعنی دوسرے الفاظ میں اس کے ضمیر کو بحث سے خارج کر دیا گیا۔ ایسی تقلید کیسا تماشا بن سکتی تھی، انیسویں صدی کے نصف آخر میں واضح ہو گیا، جبکہ مسلمانوں کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار بالکل نکل گیا

تھا اور مذہبی لوگ اس طرح بات بنانے پر مجبور ہو گئے تھے، جس کا مذاق اکبر الٰہ آبادی نے اڑایا ہے:

قائم یہی بوٹ اور موزہ رکھیے
دل کو مشتاق مس ڈی سوزہ رکھیے
ان باتوں پہ ہوگا نہ معترض کوئی
پڑھیے جو نماز اور روزہ رکھیے

اسی زمانے میں عقیدے کی تخلیقی قوت کو ان کتابوں اور نظموں نے اور بھی کم کر دیا، جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی خوبیوں کو واضح کریں۔ موجودہ دور کے مسلمانوں کی سستی اور بے حسی، اپنے مفاد اور مستقبل سے بے پروائی اور ایک بڑے دینی اور تہذیبی ورثے سے بے وفائی کا بہت موثر انداز سے مقابلہ کیا گیا اس یقین اور ہمت اور جاہ وجلال سے جو مسلمانوں کے ماضی میں نظر آتا ہے۔ اس طرح کی نظموں اور کتابوں نے مسلمانوں کے ذہن پر ایسا جادو کیا کہ گذرا ہوا زمانہ معلوم ہوتا تھا کہ پھر زندہ ہو گیا ہے، اس کے دوبارہ زندہ ہو جانے کا احساس اتنا قوی تھا کہ حال ماضی میں بالکل گم ہو گیا، یہاں تک کہ برطانوی راج کا غلام اپنے آپ کو ایک فاتحانہ عالمی قوت سمجھنے لگا۔ مسلمانوں میں عام طور پر ایک طرح کا تکبر پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے وہ دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنے لگے اور کبھی ان کو حقیقت سے آگاہ کیا جاتا تو یہ کہکر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے کہ ان سے بھی بدتر لوگ موجود ہیں۔ اسلام کی مدح سرائی کا ایک سبب وہ غصہ تھا کہ جو مستشرقوں کے اسلام پر اعتراض کرنے سے پیدا ہوا۔ لیکن، بجائے اس کے کہ دین اور شریعت کا اور گہرا مطالعہ کیا جاتا، تاکہ علمی اعتراض کا علمی جواب دیا جا سکے، مسلمانوں کی قابل قدر خصوصیات کو اور زیادہ سراہا جانے لگا، تاریخی حقیقتوں کو نظر انداز کر کے ایسی اتفاقی باتوں کو جو بذات خود بہت اہم نہیں تھیں، مستقل صفات کی مثال قرار دیا جانے لگا، مثلاً اگر محمد تغلق ایک مرتبہ خود قاضی کے سامنے اپنے کسی فعل کی عذر داری کے لیے آیا یا جہانگیر نے اپنے محل میں ایک گھنٹی

لگادی، جس کو ہر انصاف کا طالب آکر بجا سکتا تھا، تو مسلمان بادشاہوں کو انصاف پرست اور حق پرست ثابت کرنے کے لیے کافی سمجھا گیا، ایسی اور مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ اسلام کی اس طرح کی حمایت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے سرسری مطالعہ سے بھی ظاہر ہو جائے گا کہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے، وہ حقیقت سے بہت دور ہے۔

اب خیالات اور احساسات کے اس دلدل سے ہمیں مسلمانوں کے ضمیر کو باہر نکالنا ہے۔ اس کی کوشش کہاں سے اور کیسے شروع کی جائے؟

اس سوال کا روایتی جواب یہ ہے کہ یہ معاملہ عقیدے اور عمل کا ہے اور علماء کو بحیثیت مجموعی یا پھر کسی امام یا لیڈر کو بتانا چاہیئے کہ ہم کیا کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کرنا ہے ساری ملت کو بہ یک وقت کرنا چاہیئے، ورنہ ہمارے سامنے بہت سی متضاد رائیں ہوں گی، جن کی پشت پر کوئی شرعی حیثیت نہ ہوگی۔ مگر دوسری طرف دیکھیے تو علماء صدیوں سے اسلامی شرع کے کامل اور ہمہ گیر ہونے پر اصرار کرتے رہے ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات بہت مشکل سے آئے گی کہ اس میں کسی اصلاح اور ترمیم کی ضرورت ہے، اس لیے کہ علماء کسی زمانے کے حالات کو یا کسی دور کے تقاضوں کو ایسی سند نہیں مان سکتے جو شرعی مسائل پر غور کرتے وقت پیش کی جا سکے۔ ہندستانی مسلمانوں کا اس وقت جو حال ہے، اس کی بنا پر وہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ شرعی احکام پر دوبارہ غور کرنا چاہیئے، دنیا میں جو سماجی اور معاشی انقلاب ہوئے ہیں، ان کا تو ذکر کرنا ہی بیکار ہے۔ اگر کبھی بحث مباحثے میں علماء مجبور ہو جاتے ہیں کہ شرعی مسائل پر دوبارہ غور کرنے کی یا از سر نو غور کرنے کی ضرورت کو مان لیں تب بھی وہ اصرار کریں گے کہ جو کچھ کیا جائے، علماء کی اجتماعی رائے کے مطابق کیا جائے۔ یہ شاید ثابت نہیں کیا جا سکے گا کہ انھیں دینی مسائل میں پنچ بن کر فیصلے کرنے کا حق ہے اور فقہی کتابوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے مسائل میں اختلاف رہا ہے اور جو رائے صحیح مانی جاتی ہے وہ صرف یہ کہہ کر کہ اسے دوسری رایوں پر ترجیح دینا چاہیئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام طور پر علماء میں کسی نہ کسی حد تک اختلاف

ہی رہا ہے اور اگر سوچنے سمجھنے والے مسلمانوں کے دلوں پر خوف طاری نہ ہوتا اور وہ اپنی رائے خود قائم کرتے تو علمار کی نہ کوئی حیثیت ہوتی نہ اختیار۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی کتاب میں بھی یہ واضح نہیں کیا گیا ہے کہ امام کا منصب کیا ہے۔ فقہ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اور امیر ہم معنی اصطلاحیں ہیں، گویا حاکم کو امام بھی کہا جا سکتا تھا، جیسے کہ اسے خلیفہ بھی کہہ سکتے تھے، اس روایتی نمونے کے مطابق کہ ملتِ اسلامی کا حاکم خلیفہ، امام اور امیرالمومنین ہوتا ہے۔ دراصل علمار حاکموں کے زیرِ اثر بلکہ ان کے ماتحت تھے اور اسی وجہ سے سلطانِ وقت کے خلاف بغاوت کرنا شرعی اعتبار سے ناجائز قرار دیا گیا ہے، سوائے اس کے کہ سلطان کافر ہو جائے اور کفر کو رائج کرنا چاہے۔ اکبر نے اس سلسلے میں یہ دلچسپ سوال اٹھایا تھا کہ سلطانِ عادل کی کیا حیثیت ہوگی، لیکن یہاں اس پر بحث نہیں کی جا سکتی۔ البتہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علمار سلطان کو غیر مشروط سیاسی اختیار دینے پر تیار تھے، لیکن انھیں یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ اس کی کوئی دینی حیثیت بھی ہو۔

ہمارے لیے زیادہ مفید مطلب یہ بحث ہے کہ مذہبی اعتبار سے کیا مسلمانوں کا اور تمام مسلمانوں کا نہیں تو ستیوں کا ایسا کوئی رہنما ہو سکتا ہے، جسے اس کی دینی اور روحانی عظمت کی بنا پر اس کا اختیار دیا جائے کہ وہ اجتہاد کرے، یعنی ایسی رائے دے جو چاروں مذاہب کی رائے سے مختلف ہو؟ ایسے اشخاص ہوئے ہیں، جنھیں ان کے علم کی بنا پر امام یا مجتہد کہا گیا ہے، مگر ان کی وفات کے بعد ہی۔ میرے خیال میں اگرچہ ایسے رہنما کا تصور موجود ہے جو اس قابل ہو کہ اجتہاد کر سکے، لیکن کسی کو اجتہاد کا اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں اجتہاد کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ گذشتہ زمانے کے غور و فکر کو نظر انداز کر کے دینی مسائل پر نئے سرے سے غور کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک اجتہاد صرف ایک شرعی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جو علم اور اعتبار رکھتا ہو، کسی شرعی مسئلے میں ایسی رائے دے سکتا ہے جو علم اور اعتبار رکھنے والے علمار کی رائے سے، جسے مستند

اناجاتا رہا ہے، مختلف ہو۔ اگر کوئی رائے دینے میں مستند کتابوں کو نظر انداز کرتا تو وہ بدعتی و رقابل مذمت سمجھا جاتا۔ اس معیار کے مطابق سید احمد خاں کے نظریے، اجتہاد کی نہیں بلکہ بدعت اور گمراہی کی مثال ہیں۔ مولانا آزاد کے تصورات کو بھی اجتہاد نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر اقبال، اس وقت جب اسلام کی مدح سرائی مقصود ہوتی، اجتہاد کو ذہنی جمود دور کرنے کے لیے کافی سمجھتے تھے، لیکن وہ تھوڑی بہت آزاد خیالی سے بھی ڈرتے تھے۔ وہ بہت بڑے شاعر تھے جنھوں نے چند پشتوں تک مسلمانوں کو خودستائی میں مست رکھا، لیکن اگر دیکھا جائے کہ انھوں نے فکر دینی کے میدان میں کیا کچھ کیا ہے، تو معلوم ہوگا کہ ان کا کوئی تصور، کوئی رائے اجتہاد کہلانے کے قابل نہیں۔

اگر کسی نے اجتہاد کو اپنا حق سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہا، تو اس سے پوچھا جاتا کہ اس کو یہ حق کیسے ملا۔ اس کے ذہن کا بیدار ہونا، اس کے اخلاقی شعور، اس کا حوصلہ کہ اپنی جماعت کو ایک بہتر جماعت بنائے، یہ شرعی سندیں نہیں تھیں اور اس کے حق کی بنیاد نہیں بن سکتی تھیں۔ اس کی ایک مثال سید محمد جونپوری ؒ ہیں، جن کا زمانہ پندرھویں صدی کا نصف آخر ہے۔ ان کی علمی قابلیت غیر معمولی، ان کی نظر عارفانہ، ہمت بلند تھی، وہ اپنے زمانے کی بے دینی اور اخلاقی بگاڑ سے بہت متاثر ہوئے اور چاہتے تھے کہ جو بھی اپنے آپ کو مسلمان کہے، وہ غیر مشروط طور پر دین کی روحانی اور سماجی قدروں کی خدمت کا پابند ہو۔ علماء سے جو ان کے مباحثے ہوئے، ان کی تفصیل ہم تک نہیں پہنچی ہے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ بحث میں انھیں کوئی قائل نہ کر سکا لیکن علماء کی مخالفت یا ان کے پیروؤں کے جوش یا اس یقین نے کہ وہ ملت کی اصلاح کے لیے پیدا ہوئے ہیں، انھیں مجبور کیا کہ مہدی آخر الزماں ہونے کا دعویٰ کریں۔ اس کے بعد یہی سوال کہ وہ مہدی ہیں یا نہیں، علماء کے حملے کا مرکز بن گیا اور اس سے ایک ہنگامہ برپا ہوا، جس میں سید محمد کی اصل تعلیمات کی حیثیت خود ان کے پیروؤں کے لئے ثانوی ہو گئی اور مسلمانوں کی عام جماعت اور اس کے طریق زندگی میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ ہمارے اپنے زمانے میں

مرزا غلام احمد قادیانی نے اصلاح کی کوشش کی، ان کے ساتھ بھی وہی ہوا جو سید محمد جونپوری کے ساتھ ہوا تھا۔ انھوں نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور قرآن کی اس آیت کی نئی تاویل کی، جس میں رسول اللہ صلعم کو خاتم النبیین کہا گیا ہے۔ اگر ہم ٹھنڈے دل سے مرزا غلام احمد کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اسلام کو پیش کرنے کا جو رائج طریقہ تھا، یعنی جس طرح علمار اسے پیش کرتے تھے، وہ خود اسلام کے لیے خطرے کا باعث بن گیا تھا۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مغربی تہذیب کی پشت پر کچھ ایسی سماجی اور اقتصادی قدریں ہیں، جنھیں مسلمانوں کو کسی نہ کسی شکل میں ماننا چاہئے اور خود اسلام میں اتنی طاقت ہے کہ مسلمان قوموں کے انحطاط کے باوجود اس کی مغربی ملکوں میں تبلیغ کی جاسکے۔ یہاں مجھے اُن دعوؤں سے کوئی بحث نہیں جو مرزا غلام احمد نے اپنے بارے میں کئے ہیں، مگر یہ مسئلہ ضرور قابل غور ہے کہ انھوں نے یہ دعوے کیوں کئے۔ ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ انھیں شروع میں کامیابی ہوئی اور کامیابی ایسی شراب ہے جس کے نشے کو بہت کم لوگ برداشت کرسکتے ہیں، ممکن ہے انھوں نے یہ سمجھا ہو کہ اصلاح اور مناظرے کے میدانوں میں انھوں نے ایسا کچھ کرلیا ہے کہ اب وہ آگے بڑھ کر پیغمبری کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے کے علمار کی علمی استعداد کا اندازہ کرلیا تھا اور سمجھتے ہوں گے کہ وہ ان کا مقابلہ نہ کرسکیں گے۔ لیکن ایسی حالت میں جب عقل اور ضمیر کو اصلاح کا محرک بنانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اگر انھوں نے پیغمبری کا دعویٰ نہ کیا ہوتا تو ان کی کیا حیثیت ہوتی۔ وہ محض ایک دینی عالم ہوتے، جن کے خیالات کو بہت سے لوگ پسند کرتے، مگر کوئی ان کی پیروی نہ کرتا، وہ ایک سیاسی لیڈر ہوسکتے تھے، جس پر مذہبیت غالب ہوتی، لوگ انھیں سرکار کا وفادار سمجھتے، ایک قسم کا دینی خان بہادر جسے سرکار کی خاص حمایت حاصل تھی، انھیں کسی قسم کا اختیار نہ ہوتا، وہ نہ ہدایت دے سکتے، نہ حکم۔ انھوں نے جو تحریک شروع کی تھی وہ بہرحال اختلافات پیدا کرتی اور وہ دماغوں میں ایک وبال سا پیدا کرکے ختم ہوجاتی۔

مرزا غلام احمد کا دعویٰ مسلمانوں پر اتنا شاق گذرا اور اتنا شدید ردعمل ہوا کہ انھوں نے

جو صحیح اور مفید باتیں کہی تھیں وہ بھلا دی گئیں، لوگوں کو بس یہ یاد رہا کہ انھوں نے ایک مذہبی جرم کیا، جسے کسی حالت میں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ مرزا غلام احمد کی مخالفت کرنے سے مسلمانوں کا بھلا ہوا یا نہیں، ہاں انھوں نے ایک مذہبی جماعت ضرور قائم کر لی جو بہت منظم تھی اور اپنی بہبودی کے لیے خود تدبیریں کر سکتی تھی۔ اسی جماعت کا ایک حصہ ایسا تھا جو مرزا غلام احمد کی پیروی میں کٹر نہیں تھا اور یہ ان کی تبلیغی منصوبوں پر عمل کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ پھر بھی قادیانی فرقے نے اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے ایسی بحثیں چھیڑیں، جن کی وجہ سے اسلام کا تصور وسیع ہونے کے بجائے اور تنگ ہو گیا۔

اس سے خیال ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ذہن اور جذبات کو دلدل سے نکالنے کے لیے نہ علماء کی رہنمائی کام آسکتی ہے اور نہ کسی فرضی امام کی۔ اگر کام آسکتا ہے تو یہ اصول کہ مسلمان کے ضمیر کو اور صرف اس کے ضمیر کو رہنما مانا جائے۔

قرآن میں بہت سی ایسی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعتوں پر مجموعی حیثیت سے عذاب نازل ہوا، یہ مسئلہ تاریخ سے متعلق ہے، خود قرآن میں پوری ذمہ داری تمام اچھے اور برے اعمال کی فرد پر ڈالی گئی ہے:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ	جس دن آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی جورو اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص کو اس دن فکر لگا ہو گا کہ وہ بس کرتا ہے۔
(سورۃ عبس آیت ۳۴–۳۷)	(ترجمہ: شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی)

اور یہ بھی کہا گیا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً	جس کسی نے اچھا کام کیا، خواہ مرد ہو خواہ عورت، اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے تو ہم ضرور اسے اچھی

طَیِّبَۃً ج وَلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ

زندگی بسر کرائیں گے اور ضرور اسے اجر دیں گے، انھوں نے جیسے جیسے اچھے کام کیے ہیں، انکے مطابق ہمارا اجر بھی ہوگا۔

(سورہ النحل (۱۶) آیت ۹۷)　(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ پر بھی یہی نازل ہوا تھا کہ:

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی

کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں لے گا اور یہ کہ انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی اور یہ کہ اس کی کوشش آگے چل کر دیکھی جائے گی۔

(سورہ النجم آیت ۳۸-۴۰)　(ترجمہ: شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی)

اگر فرد پر اس طرح سے صاف صاف ذمہ داری ڈالی گئی ہے تو پھر وہ رہنمائی کے لیے دوسروں کے پاس کیسے جا سکتا ہے یا جب حساب کا وقت آئے گا تو کیسے کہہ سکتا ہے کہ اسے دوسروں نے غلط ہدایت دی۔

علماء کے طرز بحث کے بارے میں میں جو کچھ کہہ چکا ہوں، یہ مناسب نہیں ہے کہ میں خود قرآن کی آیتوں کو دلیل کے طور پر پیش کروں ۔ دراصل یہ مناسب نہیں اور خود قرآن کے ساتھ ایک طرح کی بے انصافی ہے کہ اس کی ایک آیت کو لیکر اپنی دلیل کی سند بنائیں۔ قرآن سے ہم کو بصیرت اور ہمت حاصل کرنا چاہیئے، وہ ایسی کتاب نہیں ہے کہ جس سے حوالے دئے جائیں۔ بیشک اس کی بعض آیتیں ایسی ہیں کہ جو اس کی پوری تعلیمات کا خلاصہ سمجھی جا سکتی ہیں، لیکن اس کی کسی آیت کا سیاق و سباق وہ آیتیں نہیں ہیں جو اس سے پہلے یا اس کے بعد آتی ہیں بلکہ پورا قرآن ہے ۔ رسمی دین داری یا عادت یا اس جبلت نے جو ہمیں ایسی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے پر آمادہ کرتی ہے جنھیں برداشت کرنے کی طاقت ہم میں نہیں ہے قرآن کی تلاوت کو ایک بے اثر عمل بنا دیا ہے، ہم اس کی تلاوت اس پر غور کرنے کے لیے نہیں کرتے بلکہ ثواب کی خاطر۔ یہ ثواب معلوم نہیں ملتا ہے یا نہیں، لیکن غور کرنے سے جو فیض حاصل ہو سکتا

تھا اس سے ہم محروم رہتے ہیں۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ قرآن واردات قلبی کا محرک ہے اور یہی واردات قلبی ہیں جو قرآن کو ہماری آج کل کی زندگی میں رہنمائی کا ذریعہ بنا سکتی ہیں، یعنی ایک ایسی طاقت جو ہماری شخصی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل میں اپنا پورا اثر دکھا سکے۔

میں نے علمی مطالعے کے بجائے قرآن کے واردات قلبی کے محرک ہونے پر اس لیے زور دیا ہے کہ انسان کے اختیار کے نازک معاملے میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ	اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ جس کسی پر چاہتا ہے راہ گم کر دیتا ہے، جس کسی پر چاہتا ہے کھول دیتا ہے اور ضرور ایسا ہوتا ہے کہ تم سے ایسے کاموں کی باز پرس ہو جو کرتے رہتے ہو۔
(سورۃ النحل آیت ۹۳)	(ترجمہ: مولانا ابو الکلام آزاد)

اسی انداز کی اور آیتیں بھی ہیں۔ اگر ہم منطقی بحث کریں تو اس سے صرف الجھن پیدا ہو سکتی ہے، اگر ہم ایسی آیتوں کو عین حقیقت مان لیں، خدا کے اختیار مطلق اور ان نتیجوں پر جو اس کو مان لینے سے نکلتے ہیں غور کریں تو یہ تضاد دور ہو جاتا ہے۔ ایمان ایسی چیز نہیں ہے جو خود سے پیدا ہو، جیسے سر پر بال، ایمان لانے اور ایمان رکھنے کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ ہم قرآن کو روحانی فیض اور ہدایت کے لیے پڑھیں تو یہ بھی ایک عمل ہے جو اپنے ارادے سے کیا جاتا ہے، اگر ہمارا ارادہ شامل نہ ہو تو ہماری حیثیت وہی ہو گی جو منافقوں کی، جن کے بارے میں کہا گیا ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا	کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ اتنا کہنے پر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا اور ہم نے ان لوگوں کو آزمایا ہے جو ان سے پہلے تھے تو خدا ان لوگوں کو ضرور معلوم

وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ — کر کے رہے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی ضرور

سورۃ العنکبوت آیت ۲-۳ — معلوم کر کے رہے گا۔

(ترجمہ: شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی)

قرآن میں انسان کا اختیار فرض کر لیا گیا ہے، جس بات کو ماننے کو کہا گیا ہے، وہ خدا کا مطلق اختیار ہے۔ یہ صحیح معنی میں اسی وقت مانا جاتا ہے، جب اس کو ماننے کا ارادہ کیا جائے۔ قرآن میں یہ سمجھا گیا ہے کہ اس طرح ارادہ کر کے جو ہم مانتے ہیں وہی اصل حقیقت بھی بھی ہے اور اسی وجہ سے قرآن میں ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ

(سورہ یونس آیت ۹۹)

اور اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں، سب کے سب ایمان لے آتے۔ کیا تو ان پر جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لاویں چھوڑنے والا نہیں؟

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ

(سورہ یونس (۱۰) آیت ۱۰۰)

اور کسی جان کے اختیار میں نہیں ہے کہ یقین لے آئے مگر یہ کہ اللہ کے حکم سے اور وہ ان لوگوں کو گندگی میں چھوڑ دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

قرآن ایک لحاظ سے مکالمہ ہے خدا اور انسان کے درمیان۔ انسان کو جو کچھ کہنا ہے، تاریخ میں اپنے عمل کے ذریعہ کہہ چکا ہے، خدا اُس کے عمل کی جانچ کرتا ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ اسے ہر چیز پر ہر طرح کا اختیار ہے۔ اسلام کا مطلب اگر خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مسلمان جو کچھ ہو یا نہ ہو اس پر بے جس ہستیوں کی طرح راضی ہو جائیں، یعنی اپنی سستی اور بے مقصد زندگی کا ذمہ دار خدا کو بنادیں، اسلام کے معنی ہیں انسان کا اپنے

ارادے سے خدا کی تقدیر میں شریک ہونا اور اپنی فطرت کے مطابق جس قدر دینی اور دنیاوی ترقی کر سکتا ہے اتنی کرنا :

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ

اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمائے رکھے گا۔

(سورہ محمد آیت ۷)

انسان کے ضمیر کی حیثیت اور اس کے منصب پر ہمیں اسی آیت کی روشنی میں غور کرنا چاہیے نہ اس خوف میں کہ ہم کوئی غلط رائے قائم کر لیں گے۔ عام طور پر جسے غلطی سمجھا جاتا ہے، وہ دینیات کی ایک اصطلاح ہے یعنی قانون میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہٹ جانا اور جو قانون کے الفاظ پر ایمان لاتے ہیں، وہ ایسی غلطیوں سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں اس لیے کہ وہ ایسی تاکید نہ کریں تو ان کا بنا بنایا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ قرآن کا نقطۂ نظر بالکل دوسرا ہے :

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ٥ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ

سورۃ العنکبوت آیت ۶ و ۷

اور جو کوشش کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے کوشش کرتا ہے، خدا تو دنیا جہان کے سب لوگوں سے بے نیاز ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ہم ضرور ان کے گناہ ان سے دور کر دیں گے، اور جو نیک عمل کرتے رہے ہیں ان کو ان کا بہتر سے بہتر بدلہ دیں گے۔

(ترجمہ: شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی)

ایک اور آیت میں کہا گیا ہے :

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا

جن بڑی بڑی برائیوں سے تمھیں روک دیا گیا ہے اگر تم ان سے بچتے رہو گے تو ہم تمھاری لغزشوں اور غلطیوں کے اثرات تم پر سے محو کر دیں گے اور

كَرِيْمًا ○ — تمھیں ایک ایسے مقام پر پہنچا دیں گے جو عزت و خوبی کا مقام ہوگا۔

(سورۃ النساء آیت ۳۱)

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

یہاں جن گناہ کبیرہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ، مذکورہ بالا آیت کے علاوہ دوسری آیتوں سے بھی اخذ کئے گئے ہیں، لیکن یہاں اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو اپنے ارادے سے اور زندگی کے معاملات کو پوری طرح سمجھ کر، خدا کے دوست بنتے ہیں[۱] اور اس کے کاموں میں شریک ہوتے ہیں، اسی معنی میں کہ جس طرف ان آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ

(سورۃ یونس (۱۰) آیت ۱۴)

پھر اُن امتوں کے بعد ہم نے تمھیں ان کا جانشین بنایا، تاکہ دیکھیں تمھارے کام کیسے ہوتے ہیں۔

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(سورۃ الانعام (۶) آیت ۱۶۵)

اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں جانشین بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض پر مرتبے دئے تاکہ جو کچھ تمھیں دیا ہے، اس میں تمھیں آزمائے۔ بلاشبہ تمھارا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ وہ بخشنے والا، رحمت والا ہے۔

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

اور یہاں مراد تمام مرد اور عورتیں ہیں، صرف وہ لوگ نہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، بلکہ

---

[۱] اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

(سورۃ یونس (۱۰) آیت ۶۲)

یاد رکھو، جو اللہ کے دوست ہیں، ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا خوف ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

وہ تمام لوگ جن کا ضمیر بیدار ہے اور جو ہر کام اپنے ضمیر کے مطابق کرتے ہیں، مگر اس میں ان سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ قرآن کی ہدایت ہے کہ انھیں ان غلطیوں کے خوف سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ نہیں رہنا چاہیئے، بلکہ اپنے بس بھر جدو جہد کرنا چاہیئے۔

اس جدو جہد کی نوعیت کیا ہو گی، یہ وضاحت سے نہیں بتلایا گیا ہے، بلکہ صرف نیک اور صالح عمل کا ذکر ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا۔ یہ خود ایمان لانے والے کا کام ہے کہ اپنے ضمیر کے مطابق ان حالات میں کہ جن میں وہ زندگی گذار رہا ہے، طے کرے کہ نیک عمل کیا ہے اور معروف اور منکر سے مراد کیا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا ذکر ایک ساتھ اتنی مرتبہ آیا ہے کہ ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور ایمان کے بغیر نیک عمل ممکن نہیں ہے۔ دینیات کا عالم اصرار کرے گا کہ ایمان پہلے آتا ہے اور ایمان کے ساتھ اطاعت کی تمام شکلیں جیسے کہ روزہ، نماز، حج، لیکن اسے اس کا حق نہیں ہے کہ وہ یہیں پر رک جائے، اسے اس کی بھی وضاحت کرنی چاہیئے کہ عمل صالح کیا ہیں اور عمل صالح کی اتنی ہی سختی کے ساتھ تاکید کرنا چاہیئے، جتنی کہ وہ روزہ اور نماز کے لیے کرتا ہے۔ شاید دینیات کے عالموں نے ایسا کیا بھی ہوتا، لیکن ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ دراصل یہ ان کا منصب نہیں ہے۔ انھیں مطلب ہے قانون سے، نظریے اور معلوم فرائض کی صحیح صحیح ادائیگی سے۔ ان کا معیار ایسے میدان میں کام نہیں آتا، جہاں انسان کو خود اپنے لیے فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کی یہ رائے قائم ہو گئی ہے کہ ایسا کوئی میدان ہی نہیں اور ہماری شریعت، کامل اور ہمہ گیر ہے۔ یہاں پر ہمیں اس کو اور شریعت کے اس بے لوچ تصور کو جو وہ پیش کرتے ہیں، خیرباد کہنا چاہیئے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے ضمیر کے مطابق عمل کریں اور ان تمام ذمہ داریوں کا حق ادا کریں جو قرآن نے ہم پر ڈالی ہیں اور جن کے لیے ہم میں سے ہر ایک انفرادی طور پر خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

(باقی آئندہ)

عبدالسلام قدوائی

صاحب قاموس مجدالدین فیروزآبادی

(عربی زبان کے مشہور لغت القاموس المحیط کے مصنف مجدالدین محمد بن یعقوب فیروزآبادی کے سوانح حیات اور علمی کارناموں کے بارہ میں حسب ذیل مضمون اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے اجلاس اعظم گڈھ (منعقدہ دسمبر ۱۹۶۹ء) کے لئے لکھا گیا تھا بعض احباب کی خواہش پر اسے رسالۂ جامعہ میں شائع کیا جارہا ہے معلومات کا بڑا ماخذ مصنف کی کتاب بصائر ذوی التمییز کا مقدمہ ہے، جا بجا دوسرے ماخذ کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے۔)

نام ونسب

محمد نام مجدالدین لقب ہے والد کا نام یعقوب تھا سلسلۂ نسب حسب ذیل ہے:

محمد بن یعقوب بن ابراہیم بن عمر بن ابی بکر بن احمد بن محمود بن ادریس بن فضل اللہ ابن الشیخ ابی اسحٰق ابراہیم فیروزآبادی[1]۔

ابو اسحٰق شیرازی کے آگے کا نسب نامہ محفوظ نہیں ہے لیکن خود صاحب سوانح (شیخ مجدالدین) نے اپنی بعض تصانیف میں اپنے صدیقی ہونے کی تصریح کی ہے اگرچہ بعض ناقدین کو اس کے قبول کرنے

---

[1] الضوء اللامع للسخاوی

میں تامل ہے کیوں کہ سلسلہ نسب کے بارہ میں ان کے بیان کی دوسرے ذرائع سے تصدیق نہیں ہو سکی لیکن شیخ خود صاحب علم و تحقیق ہیں، ان کی صداقت و دیانت مسلّم ہے وہ لغت و ادب ہی کے نہیں حدیث و تفسیر کے بھی امام ہیں، تراجم رجال ان کا خاص موضوع ہے، ایسے صاحب نظر شخص کے بارہ میں یہ کیسے خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے حسب و نسب اور خاندانی حالات سے ناواقف ہے اور یہ تو وہم بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا متقی اور دین دار اس درجہ کا شیخ وقت کذب بیانی سے کام لے گا جب کہ اسے معلوم ہے کہ اپنا سلسلہ نسب کسی غیر شخص سے ملانا کتنا بڑا گناہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے بارہ میں کتنی سخت وعید بیان فرمائی ہے، ان اسباب کی بنا پر ہمیں بدظنی سے پرہیز کرنا چاہئے اور شیخ مجد الدین کے بیان پر اعتماد کرنا چاہئے۔

جد اعلیٰ شیخ ابو اسحٰق (متوفی ۴۷۶ھ) کے وقت سے ان کا خاندان ایران میں آباد تھا شیخ ابو اسحٰق فقہ شافعی کے بہت نامور عالم اور صاحب تصانیف تھے التنبیہ، المہذب اور طبقات الفقہاء[1] ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

ان کا اصل وطن فیروز آباد تھا لیکن تحصیل علم کی غرض سے شیراز آئے یہیں انھیں علمی شہرت حاصل ہوئی اس زمانہ میں بغداد دنیائے اسلام کا مرکز تھا اگرچہ ہارون و مامون کا سنہرا دور ختم ہو چکا تھا اور عباسی حکومت رو بہ زوال تھی لیکن پھر بھی بغداد کو بڑی حد تک مرکزیت حاصل تھی اس بنا پر شیخ ابو اسحٰق نے تحصیل علم کے بعد وہاں قیام کیا اور اپنے فضل و کمال سے اہل علم کو اتنا متاثر کیا کہ آج تک ان کے کمالات کا شہرہ ہے۔

شیخ مجد الدین کے والد یعقوب بھی اپنے زمانہ کے ممتاز عالم تھے اور شیراز میں ان کا حلقہ درس مشہور تھا۔

پیدائش

اس علمی ماحول میں ربیع الآخر ۷۲۹ھ مطابق ۱۳۲۹ء میں مجد کی پیدائش ہوئی ان کے مولد

---

[1] الاعلام للزرکلی

کا نام کازرون[1] ہے یہ شیراز کے اطراف میں ایک قصبہ تھا عرصہ سے ان کا خاندان یہاں آباد تھا ان کے والد تعلیم و تدریس کے مشاغل کی وجہ سے زیادہ تر شیراز میں رہتے تھے لیکن وقتاً فوقتاً کازرون آتے جاتے رہتے تھے۔

تعلیم

سات سال کی عمر تک کازرون میں قیام رہا یہیں قرآن مجید حفظ کیا اور لکھنا پڑھنا سیکھا اس کے بعد آٹھ برس کی عمر میں اپنے والد کے پاس شیراز گئے اور ان سے صرف و نحو اور ادب کی ابتدائی کتابیں پڑھیں شیراز کے دوسرے علماء سے بھی فیض حاصل کیا ان میں قوام عبداللہ بن محمود بن النجم اور محمد بن یوسف زرندی خاص طور پر قابل ذکر ہیں زرندی سے حدیث شریف پڑھی۔

۷۴۵ھ میں مزید تحصیل علوم کی غرض سے شیراز سے واسط گئے یہاں شہاب احمد بن علی الدیوانی سے دسوں قراتیں سیکھیں واسط سے بغداد گئے یہاں سراج عمر بن علی قزوینی سے بخاری شریف کی سماعت کی یہ عراق کے بہت بڑے محدث تھے۔ امام صاغانی سے مشارق الانوار پڑھی۔ قیام بغداد کے دوران قاضی عبداللہ بن بکتاش کے معید کی حیثیت سے مدرسہ نظامیہ میں کام کرتے تھے۔ ۷۵۵ھ میں عراق سے شام گئے اور دمشق کے علماء و محدثین سے فیض حاصل کیا جن میں شیخ تقی الدین سبکی اور ابن خیار خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

درس و تدریس

دمشق کے علاوہ شام کے دوسرے شہروں اور علمی مرکزوں میں بھی گئے اور اہل علم سے استفادہ کیا پھر بیت المقدس میں ٹھہر گئے یہاں علماء سے اکتساب فیض کے علاوہ متعدد مدرسوں میں خود

---

[1] علاوہ دوسرے مورخین کے خود مصنف نے القاموس المحیط میں زیر لفظ کرز اس کا ذکر کیا ہے۔

بھی درس دیا دس سال بیت المقدس میں قیام رہا اور ان کے فضل و کمال کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی درمیان میں کبھی کبھی قاہرہ بھی جاتے تھے اور مشاہیر اہل علم سے ملاقات اور علمی صحبتیں رہتی تھیں ان میں الفیہ کے شارح ابن عقیل اور دوسرے مشہور نحوی ابن ہشام عبداللہ بن یوسف خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

حج

بیت المقدس ہی کے قیام کے زمانہ میں ۷۶۰ھ میں پہلی مرتبہ مکۂ معظمہ کی زیارت کی اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اس کے بعد پھر ۷۷۰ھ میں دوبارہ مکہ معظمہ حاضر ہوئے اور مسلسل پانچ چھ سال وہاں مقیم رہے ۷۹۰ھ کے بعد تیسری بار مکہ مکرمہ گئے اور ۷۹۲ء تک وہاں قیام رہا، اس وقت تک ان کی علمی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی مکہ معظمہ میں بھی ان کے قدردانوں کی کمی نہ تھی ان لوگوں کی حسب خواہش درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور متعدد مدرسوں میں درس دیا جن لوگوں کو ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا ان میں العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین کے مصنف محمد بن احمد فاسی بہت ممتاز تھے وہ شیخ مجد الدین کے علم و فضل سے بہت متاثر تھے۔ اس سفر میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ طائف بھی تشریف لے گئے آخری مرتبہ ۸۰۲ھ میں حج و زیارت کی سعادت حاصل ہوئی مکہ معظمہ میں کوہ صفا پر ایک مکان بھی بنالیا تھا یہیں اپنی مشہور کتاب القاموس المحیط مکمل کی[1]

علمی منزلت

لغت و ادب کے علاوہ علوم قرآن، علوم حدیث، تاریخ و سیر تمام علوم منقولہ میں مہارت تامہ

---

[1] قاموس ذکر صفا

رکھتے تھے۔ کتابوں کے مطالعہ کا بے حد شوق تھا اس بارہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ بھی انھیں کم معلوم ہوتا تھا آمدنی کا اچھا خاصا حصہ کتابوں کی خریداری پر صرف کرتے تھے۔ خود ان کا بیان ہے کہ :

"میں نے کتابوں کی خریداری پر پچاس ہزار مثقال[1]
سونا صرف کیا ہے"

ایک مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا ہے اس حساب سے پچاس ہزار مثقال ۱۸۷۵۰ تولے کے برابر ہوئے اتنی خطیر رقم وہی صرف کرسکتا ہے جسے کتابوں کے مطالعہ کا عشق ہو ان کے شوق کا یہ حال تھا کہ سفر میں بھی کتابوں کی بڑی تعداد ساتھ رکھتے تھے اور صرف رکھتے ہی نہیں تھے بلکہ ان کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔

کتابوں کے مطالعہ کے ساتھ مشاہیر اہل علم سے ملاقات بھی کرتے رہتے تھے اس زمانہ میں حجاز، عراق، شام، مصر، یمن وغیرہ میں شاید ہی کوئی محدث، مفسر، مورخ، لغوی اور ادیب ہو جس سے وہ نہ ملے ہوں مطالعہ کی کثرت اور اہل علم کی ملاقات نے انھیں بڑا وسیع النظر اور کثیر المعلومات بنادیا تھا۔ ان کے علمی کمالات کے اظہار کے لئے متنبی کا یہ شعر کیسا حسب حال ہے :

ادیب رست فی ارض صدرہ   جبال جبال الارض فی جنبہا قف[2]

ایسا ادیب ہے کہ اس کے سینہ کی زمین میں،   (ایسے بلند) علم کے پہاڑ ہیں کہ جن کے پہلو میں
زمین کے پہاڑ ٹیلے (کی حیثیت رکھتے) ہیں

شاعر بھی بہت اچھے تھے عربی ان کی علمی اور فارسی وطنی زبان تھی اس طرح وہ دونوں زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے اور دونوں میں شعر کہتے تھے ان کے اشعار میں حسن الفاظ، حسن

---

[1] الضوء اللامع

[2] متنبی نے دوسرے شخص کے متعلق کہا ہے یہاں شیخ مجدالدین کے مطابق حال ہونے کی وجہ سے ذکر کیا گیا ہے۔

ادا، ندرت خیال اور حلاوت بیان کے ساتھ صنائع و بدائع کی چاشنی بھی ہوتی ہے جس سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

شہرت

ان کے ان کمالات کی وجہ سے ان کی شہرت دور دور تک پہونچ گئی اہل علم ان سے ملاقات کی کوشش کرتے بڑے بڑے فضلاء ان کے حلقۂ درس میں بیٹھنے کی آرزو کرتے اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے۔

وہ محض اہل علم ہی کی عقیدت کا مرکز نہیں تھے بلکہ سلاطین و امراء بھی ان کی زیارت کے متمنی اور ان سے اکتساب فیض کے آرزومند تھے۔ شاہ مصر سلطان اشرف شعبان بن حسین، والی بغداد احمد بن اویس، امراء شام و مصر ..... ، شاہ یمن سلطان اشرف اسمٰعیل بن عباس، حاکم عراق شجاع بن محمد بن مظفر یزدی، شاہ دہلی سلطان ناصر الدین محمد بن فیروز تغلق اور اس کے بیٹے سلطان ناصر الدین محمود تغلق، سلطان روم سلطان بایزید بن مراد اور جہاں کشا امیر تیمور سبھی نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور عزت و تکریم سے پیش آئے۔ تیمور لنگ کی سفاکی کا حال کون نہیں جانتا لیکن شیخ مجد الدین کے علمی کمال نے اسے بے حد متاثر کیا اور اظہار عقیدت و اعتراف کمال کے ساتھ اس نے ان کی خدمت میں ایک لاکھ درہم کا نذرانہ پیش کیا تیمور سے شیخ کی ملاقات شیراز میں ہوئی تھی۔

والی بغداد احمد بن اویس ان کے فضل و کمال کا بے حد معترف تھا اس کے یہ اشعار اس کی عقیدت کے گواہ ہیں:

القائل القول لو فاہ الزمان بہ ... کانت لیالیہ ایاما بلا ظلم

والفاعل الفعلۃ الغراء لو مزجت ... بالنار لم یک ما بالنار من حمم

وہ ایسی بات کا کہنے والا ہے کہ اگر زمانہ وہ بات کہے تو اس کی راتیں دن بن جائیں اور تاریکی باقی نہ رہے

وہ ایسے روشن کام کرتا ہے کہ اگر آگ میں ملا دیا جائے تو آگ میں کوئلے باقی نہ رہ جائیں

ایک بار ان کی خدمت میں تحفہ بھیجا تحفہ شاہانہ تھا لیکن ان کی عظمت کے سامنے وہ اس کی نگاہ میں ایسا حقیر نظر آتا ہے کہ کہتا ہے۔

ولو نطیق لنهدی الفرقدین لکم	والشمس والبدر والعیوق والفلکا
اگر یہ سب بس میں ہوتا تو ہم آپ کی خدمت میں	عیوق (ثریا کے بعد کا ستارہ) فرقدین (قطب شمالی کے مشہور ستارے) چاند، سورج اور فلک کے تحفے پیش کرتے

ان تحائف اور اظہار نیاز مندی کے ساتھ اس نے ملاقات کی درخواست کی چنانچہ حج کے بعد عراق گئے اور بغداد میں اسے ملاقات کا شرف بخشا احمد بن اویس بہت مسرور ہوا اور اظہار عقیدت کے طور پر بہت کچھ پیش خدمت کیا۔

شاہ یمن کی قدر دانی

۷۹۶ھ میں ہندوستان کی سیاحت سے واپس آرہے تھے عدن میں شاہ یمن اشرف اسمٰعیل بن عباس کا عامل حاضر خدمت ہوا اور عرض کی کہ بادشاہ آپ کی ملاقات کے متمنی ہیں چار ہزار درہم سفر کے لیے پیش کئے اور درخواست کی کہ یمن کے پایۂ تخت زبید تشریف لے جائیں اس درخواست پر زبید تشریف لے گئے، سلطان بڑی عزت و تکریم سے پیش آیا اور گزارش کی کہ آپ یہاں درس دیا کریں چنانچہ آپ نے صحیح بخاری کا درس دینا شروع کیا اس درس میں سلطان اشرف خود شریک ہوتا تھا۔

ایک سال کے بعد ۷۹۷ھ میں عہدۂ قضا بھی تفویض ہوا۔ سلطان کی طرف سے شیخ کی بڑی قدر دانی ہوئی کتابوں کی تصنیف پر بڑی بڑی رقمیں پیش کی جاتی تھیں بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ جن طباقوں میں رکھکر کتابیں سلطان کی خدمت میں بھیجی گئیں انھیں درہموں سے بھر کر واپس کیا گیا۔ اجتہاد سے متعلق ان کی کتاب الاسعاد بالاصعاد الی مرتبۃ الاجتہاد تین جلدوں میں اس شان

۱؎ العقد الثمین

سے بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوئی کہ تین آدمی کتابوں کی جلدیں اپنے سروں پر رکھے ہوئے تھے اور ان کے آگے آگے فقہاء، قضاۃ اور طلبہ چل رہے تھے سلطان نے تین ہزار دینار نذر کئے۔

سلطان کی شادی بھی شیخ کی صاحبزادی سے ہوگئی تھی اس کی وجہ سے علمی احترام کے ساتھ عزیز داری کا سلسلہ بھی ہوگیا تھا سلطان کی محبت و عقیدت کا یہ حال تھا کہ ان کی مفارقت کسی طرح اسے گوارا نہ تھی یہاں تک کہ ۷۹۹ھ میں کعبہ مکرمہ جانے کی اجازت مانگی تو اسے بھی منظور نہیں کیا اور کہا کہ یمن آپ کی تشریف آوری سے منور ہوگیا ہے علم کی بجھی ہوئی شمع روشن ہوگئی ہے آپ اپنی خیر و برکت سے اس ملک کو محروم نہ کیجئے۔

اس اصرار کی وجہ سے چند سال کے لئے سفر حجاز ملتوی کرنا پڑا لیکن بیت اللہ کی زیارت کا شوق اور مدینہ طیبہ میں حاضری کا جذبہ رہ رہ کر جوش مارتا تھا آخر ۸۰۲ھ میں پھر درخواست کی اور اتنا اصرار کیا کہ سلطان منظور کرنے پر مجبور ہوگیا حج کے بعد کچھ عرصہ اور قیام رہا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حدیث شریف اور امام مالک و امام شافعی کی فقہ کی تعلیم کے لئے دو مدرسے قائم کئے ان امور سے فراغت کے بعد یمن واپس ہوئے لیکن ان کی واپسی سے کچھ پہلے ۸۰۳ھ میں سلطان اشرف اسمٰعیل کا انتقال ہوگیا۔ یہ بڑا ذی علم اور علماء کا قدردان، منتظم اور رعایا پرور تھا اس کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا سلطان ناصر احمد یمن کا حکمران ہوا اس کے اندر باپ کی سی صلاحیت نہ تھی مورخین نے اس کے ظلم و جور اور عدم تدبر اور بد معاملگی کی شکایت کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی وجہ سے یمن کی رونق و آبادی اور خیر و برکت کا خاتمہ ہوگیا اس کے دور میں شیخ مجد الدین کی بھی وہ قدر دانی نہ رہی اور زندگی کے باقی دن معمولی طور پر گزرے۔

وفات

بالآخر ۸۱۷ھ (۱۴۱۵ء) کو ۲۰ ر شوال کی شب میں وفات پائی زبید میں شیخ اسمٰعیل جبرتی کے مقبرہ میں دفن ہوئے آخر وقت تک کانوں اور آنکھوں کی قوت باقی رہی مرنے سے کچھ

پہلے تک ان کی نگاہ میں اتنی طاقت تھی کہ باریک خط پڑھ لیتے تھے۔

مذہب ومسلک

عقیدہ کے لحاظ سے راسخ العقیدہ سنی تھے اور اشعری مکتب خیال کے پیرو تھے فقہی اعتبار سے امام شافعی کے تابع تھے لیکن دوسرے ائمہ کا بھی احترام کرتے تھے۔ تصوف سے بھی غیر معمولی دلچسپی تھی ان کی کتابوں میں اس کا اثر نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ یمن کے زمانۂ قیام میں شیخ اسمٰعیل جبرتی سے ملاقات ہوئی شیخ اسمٰعیل شیخ محی الدین ابن عربی کے خیالات سے بہت متاثر تھے بلکہ ان کے مبلغ تھے ان کی صحبت میں شیخ مجد الدین نے بھی ابن عربی کی کتابیں پڑھیں اور ان کے خیالات سے متاثر ہوئے حالانکہ محدثین ابن عربی کے خیالات خاص طور سے عقیدہ وحدت الوجود کے سخت مخالف تھے اس مخالفت کے پیش نظر کبھی کبھی ابن عربی کے ساتھ اپنی عقیدت کے اظہار میں احتیاط سے کام لیتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے دل میں ابن عربی کی عقیدت جاگزین ہوچکی تھی بعض مواقع پر انھوں نے شیخ الطریقت اور امام الحقیقت کے الفاظ سے ابن عربی کا ذکر کیا ہے ان کی شان میں یہ شعران کی فرط عقیدت کا گواہ ہے:

اذا تغلغل فکر المرء فی طرف — من بحرہ غرقت فیہ خواطرہ

جب کسی شخص کی فکر ان کے سمندر کے کنارہ میں داخل ہوتی ہے تو اس کے اندر اس کے افکار وخیالات غرق ہوجاتے ہیں

تصانیف

شیخ مجد الدین نے ساری زندگی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں بسر کی اور بکثرت کتابیں لکھیں لیکن بہت سی زمانہ کے دستبرد کی نذر ہوگئیں پھر بھی بہت سی کتابوں کے نام معلوم ہیں اور کتبخانوں کے گوشوں میں ان کا کافی ذخیرہ مل جاتا ہے۔ اہم کتابوں کی فہرست درج ہے:

۱۔ القاموس المحیط ۔ لغت کی مشہور کتاب ہے
۲۔ منح الباری ۔ صحیح بخاری کی دس جلدوں میں شرح لکھی ہے ۔
۳۔ بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز ۔ سلطان یمن الملک الاشرف اسمٰعیل بن عباس کی خواہش تھی کہ ایک ایسی جامع کتاب تیار کی جائے جس میں تمام علوم وفنون کے بارہ میں ضروری معلومات درج ہوں یعنی علوم وفنون کی انسائیکلوپیڈیا مرتب ہو اس کا ایک خاکہ خود سلطان نے پیش کر دیا تھا اس کتاب کے ۵۶ حصے تجویز کیے گئے تھے پہلا حصہ قرآن مجید سے متعلق تھا ۔ یہ حصہ بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز کے نام سے دو جلدوں میں قاہرہ سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہو گیا ہے دوسرے علوم کے متعلق جو حصے تھے معلوم نہیں ان کا کیا حشر ہوا بظاہر قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ باقی حصے مرتب نہیں ہو سکے ۔
۴۔ شوارق الاسرار ۔ یہ حدیث شریف کی مشہور کتاب مشارق الانوار کی شرح ہے ۔
۵۔ عدۃ الحکام ۔ شیخ عبدالغنی بن عبدالواحد نے عمدۃ الاحکام کے نام سے احکام شرعیہ سے متعلق احادیث جمع کی تھیں عدۃ الحکام اسی کی شرح ہے ۔
۶۔ تیسیر فاتحۃ الاہاب ـــ یہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے ۔
۷۔ الدر النظیم ۔ اس میں قرآن مجید کے مقاصد کے بارہ میں وضاحت کی گئی ہے ۔
۸۔ النفحۃ العنبریہ ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مولد سے متعلق ایک کتاب ہے ۔
۹۔ المغانم المطابہ ـــ اس میں مدینہ منورہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں ۔
۱۰۔ مہیج الی البلد الحرام ـــ یہ مکہ معظمہ سے متعلق ہے ۔
۱۱۔ روضۃ الناظر ـــ اس میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے حالات لکھے گئے ہیں ۔
۱۲۔ المرقاۃ الوفیہ ـــ یہ فقہاء احناف کے حالات میں ہے ۔
۱۳۔ المرقاۃ الارفعیہ ـــ یہ فقہاء شوافع کے حالات میں ہے ۔
۱۴۔ البلغہ ـــ یہ لغت اور نحو کے علماء کے حالات میں ہے ۔

۱۵۔ الفضل الوفی ـــــ اس میں السلطان الاشرف اسمعیل بن عباس کے عدل و انصاف کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

۱۶۔ نزہۃ الاذہان ـــــ یہ اصفہان کی تاریخ ہے۔

۱۷۔ التجاریح ـــــ اس میں حدیث کی مشہور کتاب مصابیح کی احادیث کے بارہ میں ضروری تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

۱۸۔ سفرالسعادہ ـــــ یہ مشہور کتاب ہے اور ہر جگہ چھپی ہوئی ملتی ہے۔

۱۹۔ الاحادیث الضعیفہ ـــــ اس میں ضعیف روایات کی نشان دہی کی گئی ہے۔

۲۰۔ تنویرالمقباس ـــــ اس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیری روایات جمع کی گئی ہیں یہ بھی چھپ چکی ہے۔

سطور بالا میں چند اہم کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے طوالت کے خوف سے بہت سی کتابوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

انور صدیقی

کچھ نثر کے بیان میں

آج سے تقریباً نصف صدی پہلے اردو ہی کیا فرانسیسی نثر کو چھوڑ کر، دنیا کی زیادہ تر زبانوں کی نثر پر شاعری کا غلبہ رہا ہے۔ اس کی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول تو یہ کہ شاعری تمام عالمی تہذیبوں کی مادری زبان رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ملکوں میں شاعری پہلے شروع ہوئی اور نثر بعد میں۔ دراصل تہذیبیں اپنے اولیں دور میں زندگی کو ایک خاص جذباتی اور شعری انداز سے دیکھتی اور سمجھتی ہیں ان کے کائناتی تصورات پر ایک طرح کا اساطیری یا دیو مالائی رنگ حاوی ہوتا ہے ان کی زندگی اور کائناتی مظاہر کے درمیان ایک واضح معنوی رشتے کی عدم موجودگی کی وجہ سے دیو مالا پیدا ہوتی ہے۔ معنوی رشتے جب واضح نہیں ہوتے تو زندگی اور کائنات پر ابہام کی دھند چھا جاتی ہے اس ابہام کو تہذیبیں مبہم انداز سے پیش کرتی ہیں یا وہ جو انداز اختیار کرتی ہیں اس میں ایک طرح کا خوبصورت ابہام ہوتا ہے۔ وہ کائنات یا مظاہر کائنات کے صرف جذباتی ادراک پر قادر ہوتی ہیں اور جذباتی ادراک کی زبان شاعرانہ ان معنوں میں ہوتی ہے کہ اس میں علامتی اور استعاراتی انداز بیان غالب ہوتا ہے۔ نثر تہذیبی ارتقاء کی بہت بعد کی منزل پر وجود میں آتی ہے۔ مظاہر کائنات کا ادراک جس قدر فکری، غیر جذباتی، لاشخصی اور واضح ہوتا جاتا ہے اسی تناسب سے نثر بھی شعری اسالیب، جذباتی ردعمل اور استعاراتی انداز سے آزاد ہوتی جاتی ہے۔ یونانی تہذیب [illegible] آرفی مسلک کے غلبے کی وجہ سے ایک عرصے تک ایک ایسی شاعری کی گرفت میں رہی جس میں موسیقی کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ نثر کی ضرورت کا احساس ارتقاء کی اس منزل پر ہوا جب

یونانی ذہن شاعری اور موسیقی کو ترک کر کے فکری استدلال کی طرف مائل ہوا۔ موسیقی اور شاعری دونوں میں ایک متعین معنوی دنیا نہیں ہوتی اس میں پھیلاؤ اور رمزیت کی کیفیت ہوتی ہے۔ فکری استدلال، وضاحت اور قطعیت کا مطالبہ کرتا ہے چنانچہ یونانیوں نے نثر کے لئے جو اصطلاح وضع کی تھی اس کا مفہوم تھا برہنہ الفاظ۔ دنیا کی تمام زبانوں کی نثر کے ابتدائی نمونوں میں ہمیں اس وجہ سے جذباتیت اور ایک ایسی موسیقیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے جس کا تعلق شعر کی موسیقی سے ہے۔ ہر زبان کی نثر ایک عرصے تک جہاں ایک طرف موسیقی کے آہنگ سے قریب ہوتی ہے وہیں دوسری طرف اس میں خطابت اور شاعری کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ انگریزی نثر خود ایک عرصے تک شاعری اور خطابت اور موسیقی کی گرفت میں رہی۔ اس نے ایک زمانے کے بعد اپنے آپ کو ان عناصر سے پاک کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے یہ عمل اب بھی جاری ہے اور نثر کو شاعری کی تابعداری سے آزاد کرانے اور اسے اس کی آزادانہ حیثیت دلانے کی تحریک شعوری یا غیر شعوری طور پر مل رہی ہے۔ اس لئے کہ انگریزی نثر پر بھی ایک زمانے تک یہی اعتراض رہا ہے کہ وہ شاعری سے نجات نہیں پا سکی ہے۔ مشہور انگریزی انشا پرداز کلٹن بروک نے بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ انگریزی نثر ایک ایسی قوم کی نثر ہے جو گانا بھی جانتی ہے اور تقریر کرنا بھی مگر گفتگو کرنے کے فن سے ناآشنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی نثر میں موسیقیت اور خطابت زیادہ ہے اور عقلی استدلال کا عنصر کم۔ نثر میں لاشخصی انداز، معروضیت اور منطقی انداز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی لئے مڈلٹن مرے اور بونامی ڈابری دونوں نے ہی نثر کے مزاج کو منصفانہ . . . . . قرار دیا ہے۔

نثر اور نظم کے فرق پر عالمانہ، نیم عالمانہ اور غیر عالمانہ انداز پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس کا اعادہ کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ یہاں میں اس فرق کی طرف ضرور اشارہ کروں گا جو Herbert Read نے قائم کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ صرف فارم کے اعتبار سے دونوں میں فرق کرنا ممکن نہیں ہے ہم صرف یہ کہہ کر عہدہ برآ نہیں ہو سکتے کہ ایک میں آہنگ ہوتا ہے اور دوسرے میں نہیں۔

اس لئے کہ نثر میں بھی ایک طرح کا آہنگ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ آہنگ اتنا ہموار اور Regular نہیں ہوتا جتنا کہ شاعری میں۔ شاعری تخلیقی اظہار ہے اور نثر تعمیری اظہار۔ شاعری میں الفاظ تخلیقی اور فکری عمل کے دوران پیدا ہوتے ہیں یا دوبارہ جنم لیتے ہیں۔ یہاں لفظ اور خیال کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔ خیال لفظ ہے اور لفظ خیال۔ خیال اور لفظ دونوں ہی شاعری ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نثر تعمیری اظہار ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ نثری مواد عدم سے وجود میں نہیں آتا بلکہ اس کی حیثیت ریڈی میڈ مواد کی ہوتی ہے۔ اس میں موجود اور مستعمل الفاظ کو ان کے موجود اور مستعمل تلازم میں ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ نثر میں الفاظ کا مفہوم واضح اور متعین ہوتا ہے جبکہ شاعری میں الفاظ ایک بسیط، غیر واضح رمزیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے شاعری میں معنی اور جذبے کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ اگر نثر میں یہ کیفیت پائی جائے تو یہ عیب قرار پائے گی۔ نثر میں وضاحت اور قطعیت پر جو اصرار ہے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ مثالی نثر میں بے کیفی اور اکتاہٹ پائی جاتی ہے۔ اچھی نثر میں ایک طرح کا لوچ اور سہولت اظہار بھی ہوتی ہے جو ایک زمانے کے لسانی ارتقار کا حاصل ہوتی ہے۔ اچھے نثری اظہار میں آہنگ کی جو متنوع دنیا آباد ہوتی ہے وہ بذات خود ایک ایسا وصف ہے جس سے آزاد سے آزاد شاعری بھی محروم ہوتی ہے۔ نثر میں آہنگ کے تنوع، لوچ، جامعیت اور منطقی ارتکاز کے اوصاف تہذیبی ارتقار اور لسانی ترقی کے فیضان ہوتے ہیں۔ نثر میں جو وضاحت ہوتی ہے وہ نتیجہ ہوتی ہے ذہنی وضاحت کا۔ یہ ذہنی وضاحت تہذیب کے تمام مرحلوں میں نہیں ملتی بلکہ اس مرحلے پر نظر آتی ہے جب افراد کے ردّ عمل کے نظام پر عقلیت غالب آجاتی ہے اور اقدار کی ترتیب واضح ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس اور انگلستان میں اٹھارویں صدی کو نثر کا دور زریں قرار دیا جاسکتا ہے۔

اردو قدرے نئی زبان ہے۔ اس کا جن زبانوں سے تعلق رہا ہے وہ بھی تہذیبوں کی پروردہ تھیں جن میں شاعری اور جذباتی ردّ عمل کی روایت خاصی راسخ ہو چکی تھی۔

ان تہذیبوں میں سماجی انقلاب تو آئے تھے مگر حقیقی اور ذہنی نشاۃ ثانیہ کا کوئی دور نہیں ملتا۔ یہ دراصل شعری اور مذہبی تہذیبیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ مذہب اور شاعری دونوں کی بنیاد عقل سے زیادہ جذبے پر ہوتی ہے۔ ان تہذیبوں کی سماجی تنظیم میں قبائلی نظام کو اہمیت حاصل تھی بہت ہوا تو یہ قبائلی جاگیردارانہ نظام میں تبدیل ہو گیا۔ خطابت قبائلی دور کے باقیات میں ہے۔ ایسی تہذیبوں میں مذہب کی وجہ سے ایک طرح کی دروں بینی اور جذباتیت کو فروغ حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے شاعری پروان چڑھتی ہے۔ سماجی تنظیم انھیں خطابت دیتی ہے۔ چنانچہ شاعری اور خطابت کا کاروبار ایک عرصے تک چلتا ہے اور خوب چلتا ہے۔ یہاں میری مراد ایرانی اور عربی تہذیب سے ہے جس کا تمدنی مواد بڑی حد تک اردو نے قبول کیا۔ ان زبانوں میں آزاد اور خودمکتفی نثر کی کوئی قابل ذکر روایت نہیں تھی۔ اور اگر نثر تھی بھی تو اس پر شاعری اور خطابت کا آمرانہ غلبہ تھا۔ نثر شاعری کی صرف ایک نوآبادی تھی اور بس۔ ان دونوں تہذیبوں کی وساطت سے جس طرح کا مزاج اردو میں منتقل ہوا یا جو اسالیب راہ پا گئے ان میں شعری اور خطیبانہ اظہار کی سہولت مزید تھی۔ اردو نثر کی پسماندگی کی ایک اور وجہ ہے وہ یہ کہ اردو نے تہذیبی ابہام اور انتشار کے دور میں اپنے ارتقا کے مراحل طے کئے۔ تاریخ انسانی کے ایسے ہر دور میں اچھی شاعری ہوتی ہے سو اردو میں بھی ہوئی مگر نثر شاعری کے صرف ایک اسلوب کی حیثیت سے باقی رہی۔ کم لوگوں نے درخور اعتنا سمجھا۔ نثر نگار کو سماج میں وہ مقام نہیں ملا جو شاعر کو حاصل تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نثر شاعری کی خوشہ چین تھی اور عام پڑھنے والے بھی اعلیٰ نثر کے تصور سے ناواقفیت کی وجہ سے اسے صرف خراب شاعری کا نمونہ سمجھتے تھے۔ میرامن کی 'باغ و بہار' اور غالب کے بہت سے خطوط اردو نثر کی تشکیل کے اولین نمونے ہیں۔ سن ۵۷ء کے بعد کے دور نے مغربی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے نثر کو ایک وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے قبول کیا۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ بہت سے ادیبوں نے نثر کو شاعری کی چاکری سے نکالنے کی کوشش کا کام شروع کیا۔ حالی اور سرسید نے مغرب سے اخذ کردہ عقلیت کے سطحی تصور کے پرچار کے لئے نثر کو استعمال کیا۔ حالی اور سرسید کے ذہن میں مبہم طور پر ہی سہی یہ تصور

ضرور تھا کہ نثر تفریحی اور شعری مشاغل کا ذریعہ نہ رہے بلکہ کسی اعلیٰ مقصد کی تابع ہو جائے۔ وہ شاعری کے سہارے کا محتاج نہ رہے۔ یہ وہ تصور تھا جس نے اردو میں حقیقی نثر نگاری کی داغ بیل ڈالی ــــ اس نثر کی جسے میں مہذب نثر کا نام دیتا ہوں۔ مگر چونکہ یہ نثر کا عبوری دور تھا اس لئے خود نئی نثر کے حامیوں کی تحریروں میں جا بجا ایسے مقامات مل جائیں گے جس پر شاعری یا شعری اسالیب اظہار کا پرتو ہے۔ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ اردو میں نثر کے سلسلے میں بہ یک وقت دُو متضاد رویئے، رجحانات، یا روایات کی کارفرمائی ملتی ہے۔ حالی اور سرسید جس زمانے میں نثر کو اس کا منصب دلانے کی جدوجہد کر رہے تھے اور ایک طرح کی عقلیت جسے میں کسی مناسب اصطلاح کی عدم موجودگی کی وجہ سے رومانی عقلیت کہوں گا، اسی دور میں محمد حسین آزاد شاعری میں انقلابی تبدیلیوں کی علمبرداری کے باوجود نثر کے میدان میں رجعتی رول ادا کر رہے تھے اور نثر کو شاعری سے قریب کر رہے تھے۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ انھیں اس تضاد کا احساس تک نہیں ہوا۔ خود علی گڑھ تحریک سے وابستہ رومانی نثر نگاروں نے کم از کم نثر کے سلسلے میں حالی اور سرسید سے زیادہ محمد حسین آزاد کے مسلک کو قبول کیا اور شعری طرز احساس اور استعاراتی طرز بیان کی مدد سے ایک طرح کی شعر زدہ پرتصنع نثر کی روایت کو آگے بڑھایا جس میں بہت سے لوگوں کو آج بھی ایک طرح کی تخلیقی شان نظر آتی ہے۔ جبکہ سچ بات یہ ہے کہ اچھی نثر تخلیقی نہیں ہوتی صرف تعمیری ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق جیسے لوگوں نے سرسید کے تصور کے مطابق نثر نگاری کی مگر عام پڑھنے والوں نے مہدی افادی، سجاد انصاری اور سجاد حیدر یلدرم کے نثر پاروں کو سینے سے لگایا جو عالمی نثر کے معیاروں سے نہ تو اچھی شاعری ہی ہے اور نہ ہی اچھی نثر۔ ہم شاعری، سیاست اور تہذیب کے تمام شعبوں میں ایک زمانے سے پرشعر غلطیوں کے قائل رہے ہیں اور اچھی نثر چونکہ اپنے حسن کا اقرار آہستہ آہستہ اور منزل بہ منزل کراتی ہے اس لئے ہم آج تک اچھی نثر کے معیاروں کے احساس سے محروم ہیں۔ آج بھی جدید افسانے میں شعریت موجود ہے اگرچہ اس میں جو شعریت ہے اس کا مزاج بدلا ہوا ہے پھر بھی یہ شعریت ہی ہے اور اسے نثر سے دور رکھنا چاہیئے ــــ ہمارے افسانہ نگاروں کو ہربرٹ ریڈ کی یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ صرف شاعری ہی تخلیقی ہے نثر کا فن تخلیقی نہیں تعمیری یا منطقی ہے۔ اس گفتگو سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اردو میں اچھی نثر کے نمونے نہیں ملتے ایسے نمونے کم ہی سہی مگر موجود ہیں مگر ان کے حسن کے اعتراف و اقرار کے لئے ضروری ہے کہ ہماری نگاہوں سے شعریت اور خطابت کی دھند ہٹ جائے۔ ویسے ایک اچھی اردو نثر کی ترقی کے لئے سماج اور تہذیب میں واضح عقلیت کے فروغ کا انتظار کرنا چاہیئے!

مراسلہ

شاد عظیم آبادی کی مرثیہ گوئی

عزیز مکرم و فاضل محترم حضرت ضیاء سلمکم الرحمان   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا ۱۴ رمارچ کا کارڈ ۱۸ رمارچ کو ملا۔ پڑھ کر دل خوش ہوا۔ اکبر مرحوم کا مصرعہ مزا دے گیا۔ غالباً اکبر اور اقبال مرحومین نے فدائیان جامعہ ملیہ اسلامیہ ایسے لوگوں کو دیکھتے ہوئے ذیل کے شعر کہے ہیں :

اکبر

تو وضع پہ اپنی قائم رہ، تاثیر دکھا تقریر نہ کر

دے پائے نظر کو آزادی قدرت کی مگر تحقیر نہ کر

اور اقبال

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست

من از حرم نہ گذشتم کہ پختہ بنیاد است

برادر عزیز حارث صاحب کو آپ کا سلام پہونچا دیا۔ ان کا جوابی سلام قبول کیجئے۔ بزرگان و عزیزان جامعہ کا شکریہ۔

مارچ کے پرچہ کے شذرات کے بعد جناب سید سفارش حسین صاحب رضوی کا مضمون "شاد عظیم آبادی کی مرثیہ گوئی" شاید ایام محرم کی وجہ سے پہلے پڑھا۔ مضمون برا نہیں۔ حضرت شاد کی مہارت فن اور کمال سخن وری کا انکار نہیں۔ لیکن اچھا ہوتا کہ سید صاحب حالی و اقبال کو درمیان میں نہ

لاتے اور انیس سے شاد کو نہ بڑھاتے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اردو مرثیہ کبھی میرا موضوع مطالعہ نہیں رہا۔ لیکن اتنا بے خبر بھی نہیں کہ دبیر و انیس کے کارناموں سے بالکل بے خبر ہوں۔ رہے شاد مرحوم تو ان کے حالات و سیرت کا جو حصہ ان کے یا ان کے مداحوں کے قلم سے شائع ہو چکا ہے اسے بھی بذوق و شوق پڑھا ہے۔ اسی نسبت سے ان کا کلام بھی کسی حد تک نظر سے گذر چکا ہے۔ اس مطالعہ کا مجھ پر اثر یہ ہے کہ مختلف حالات کا شاد پر نفسیاتی اثر یہ تھا کہ وہ خود کو اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے اور خیال کرتے تھے کہ زمانہ اور اہل زمانہ نے ان کی رفعت شان کو پہچانا ہی نہیں۔ لوگ جن کا کلمہ پڑھتے ہیں انھوں نے انہی کے خوان ادب سے زلہ ربائی کی ہے۔ حتیٰ کہ شاد کے بعض مداحوں نے انھیں انیس سے بلند مرتبہ مرثیہ گو ظاہر کیا ہے۔

اقبال کو ہم نے پڑھا تو ہے ہی، دیکھا بھی ہے ان کا طریقہ بڑی عمر کے بزرگوں سے ادب کا تھا، رہے ہمعصر تو ان سے بھی مربیانہ نہ تھا۔ ستم ہوگا کہ اس طریقہ کو کوئی مسترشدانہ یا مستفیضانہ سمجھ بیٹھے۔ مگر حالی کے متعلق شاد کا بیان سراسر اوعائے بے دلیل ہے۔ حالی نے بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی کبھی مدعیانہ طور پر لوگوں سے خطاب نہیں کیا۔ حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری میں شاد کا پیوند محض خوش نما خواب ہے۔ شاد اور حالی کے تحریری دفتر سامنے ہیں۔ حالی کے کسی دور کی تحریر کو شاد کے کسی دور کی تحریر سے مقابلہ کر کے دیکھ لیا جائے، زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

حالی اور شاد کی افتاد مزاج میں نمایاں فرق ہے۔ شاد خود ستائی سے کبھی نہیں چوکتے اور حالی کا طرۂ امتیاز سچا اور مخلصانہ و عارفانہ انکسار ہے، مثلاً، سر سید مرحوم کی سوانح حیات بعنوان "حیات جاوید" لکھی نامی پریس سے اس کا شاندار پہلا ایڈیشن شایع ہوا جو میں نے ۱۲ھ میں پڑھا تھا۔ مولف و مصنف حالی نے خود کو صرف "خاکسار الطاف حسین حالی" کے الفاظ میں پیش کیا تھا۔ دیوان حالی ۱۸۹۳ء میں شایع ہوا۔ مقدمۂ شعر و شاعری اسی کا حصہ ہے۔ اس کے سرورق پر

بھی حالی نے اپنے آپ کو "خاکسار الطاف حسین حالی پانی پتی" کے نام سے متعارف اور "مقیم مدرسۃ العلوم علی گڑھ" بتایا تھا۔

فاضل مضمون نگار نے دو ایک جگہ شاد کو انیس کا ہمسر اور بعض جگہ ان سے افضل و برتر قرار دیا ہے اور مثال میں کلام شاد کے نمونے پیش فرمائے ہیں۔ شاد و انیس کے کلام میں کیا نسبت ہے اس پر تو شاید "انیسئے" غور کریں گے مگر راقم الحروف جو اردو کا ایک معمولی پنجابی طالب علم ہے چند باتیں عرض کرنے کی جرارت کرے تو اسے معاف کیا جائے۔ مضمون نگار لکھنوی ہیں یا دہلوی اس کا تو مجھے علم نہیں۔ انیس کو چھوڑ کر شاد جو موضوع گفتگو ہیں نہ لکھنوی تھے نہ دہلوی بلکہ بقول مقالہ نگار "مرکز سے دور" یعنی بہار کے رہنے والے تھے۔ اور حالی و اقبال کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ مقدم الذکر پانی پتی (ہریانوی) اور اقبال پنجابی تھے۔ ان تینوں کا مرکز سے دور ہونا ان کے لئے عیب نہیں۔ کیونکہ انسان کی عزت اس کے وطن کی نسبت سے نہیں ہوتی بلکہ صاحبان کمال سے ان کا وطن شرف و اعزاز حاصل کیا کرتا ہے۔

ان سطور میں نعوذ باللہ شاد کے فضل و کمال سے انکار مدنظر نہیں بلکہ گفتگو اس میں ہے کہ شاد کا کمال انیس، حالی اور اقبال سے مقابلہ کئے بغیر بھی دکھایا جا سکتا ہے۔ پیش نظر مضمون میں شاد کے کمال کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں مجھے ان میں وہی مبالغہ اور تاریخ سے بے نیازی اور وہی مروجہ پیشہ ورانہ پیرایۂ بیان اور وہی بے تکلف مقامی تراکیب اور معنی فی بطن الشاعر قسم کے الفاظ دکھائی دے رہے ہیں مثلاً ملاحظہ ہو جامعہ (بابت مارچ ۷۰ء) ص ۱۳۵ پر مندرجہ اشعار کا چھٹا شعر:

ادیب لازم معنی پہ سب کے غور کرے
کہ واسطے ہیں کم ان معنیوں میں یا کہ سوا

"ان معنیوں میں" کیا ہے۔ شاید نظیر میں موتی موتیوں میں، ہاتھی ہاتھیوں میں، وردی وردیوں میں کو پیش کیا جائے۔ مگر کیا کیا جائے تحریر و تقریر میں معنی سے "معنوں" میں تو پڑھا اور سنا ہے معنیوں

میں نہ پڑھا ہے نہ سنا۔ مولوی عبدالحق مرحوم اپنی قواعد اردو مطبوعہ اورنگ آباد ۱۹۳۶ء کے صفحہ ۱۴۱ پر لکھتے ہیں۔ "بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو بعض معنوں میں مذکر ہیں اور بعض معنوں میں مونث" فرمائیے یہ "معنیوں میں" کیسی ترکیب ہے۔

اسی نظم کا نواں شعر ہے:

خلاصہ یہ کہ بہت دور کی نہ کوڑی لائے
کہ سننے والوں کو اک انزجار ہو پیدا

پہلے مصرع میں ادیب و شاعر کو دور کی کوڑی لانے سے منع کیا ہے۔ مگر خود دوسرے مصرع میں "انزجار" کا استعمال خدا جانے کہاں کی کوڑی ہے۔

ص ۱۳۶ پر آئیے۔ دوسرا شعر ملاحظہ کیجیے:

قلم سے لیتے ہیں وہ لوگ جو قلم کا کام
اتار لیتے ہیں گویا ھُوَ ھُوَ نقشا

دوسرے مصرع میں "ھُوَ ھُوَ" نہ بول چال کی بولی ہے نہ تحریر میں آتی ہے۔ اس کی بجائے "ہو بہو" مستعمل ہے:

ص ۱۵۱ پر جو مرثیہ کے بشکل مسدس پانچ بند نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں چوتھے بند کا تیسرا شعر ہے:

موقع کے ساتھ غیظ بھی تھا اور خَصَم بھی تھا
الفت کی بھی نظر تھی جلال و حَشَم بھی تھا

پہلے مصرع میں "غیض" یقیناً نقل و کتابت کی غلطی ہے۔ کیونکہ صحیح لفظ "غیظ" ہے "غیض" نہیں ہے۔ "خصم" کا لفظ دو طرح کیا جاتا ہے۔ خَصْم اور خَصَم۔ اہل لغت نے دونوں صورتوں میں جدا جدا معنے بھی بتائے ہیں یعنی خَصْم کے معنی دشمن اور خَصَم کے معنی خاوند وغیرہ اور بعض نے تلفظ کی دونوں صورتوں کو جائز رکھا ہے اور دونوں صورتوں میں مذکورہ بالا دونوں معنوں کا ذکر کیا ہے۔

حضرت شاؔد نے خشَم کا قافیہ خَصَم باندھا ہے۔ بجا اور درست۔ مگر سوال شعر کے معنی اور مفہوم کا ہے۔ مجھے اپنے قصور فہم کا اعتراف ہے۔ تاہم کھلتا نہیں کہ پہلے مصرعہ کا دوسرے سے کیا ربط ہے اور پورے شعر کا کیا مفہوم ہے۔

اسی صفحہ پر منقول مسدس کا پانچواں بند ہے:

وہ گہرے گہرے زخم وہ اُبلا ہُوا لہو　　وہ قلب مطمئن وہ شہادت کی آرزو
وہ مشفقانہ پند وہ دلجوئی عدو　　لہجہ وہ جانفزا وہ فصیحانہ گفتگو

حیرت سے منہ کو تکتا تھا وہ خود گروہ بھی
وہ بردباریاں کہ ہو شرمندہ کوہ بھی

پہلے مصرعہ میں "اُبلا ہُوا لہو" چوتھے مصرعہ میں فصیحانہ گفتگو۔ پانچویں مصرعہ میں "وہ خود گروہ بھی" خامی بیان اور سستی ترکیب کی شہادت ہے اور چھٹا مصرعہ محض مبالغہ اور حقیقت کے خلاف دعویٰ۔

صفحہ ۱۳۹ پر جو بند نقل کئے گئے ہیں ان میں سے دوسرے بند کا تیسرا شعر ہے:

کہتے ہیں کس کو صبر یہ سب کو بتا دیا
منکر کے دل سے نقش نبوت مٹا دیا

دوسرا مصرعہ غیر واضح و مبہم ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ "نقش نبوت" کیا تھا جو منکر کے دل سے مٹایا گیا۔ قائل کا مفہوم "فی بطن الشاعر" ہے۔

اسی صفحہ ۱۳۹ پر مندرج تیسرے بند کو دیکھئے:

آمادہ اپنی مرگ پہ ہو جو فلک مقام　　سُن سُن کے حرف سخت بہ نرمی کرے کلام
ہرگز نہ ہو عدو سے بھی خواہانِ انتقام　　ایسا بجز حضور کے کس سے ہو یا امام

عالم نہ اس کے حال پہ کیوں کر ہلاک ہو
قاتل کے جو مآل پہ انسوسناک ہو

"حرف سخت" تو خیر مگر پانچویں مصرعہ میں نثار ہونے کے مفہوم کو "ہلاک ہو" سے ادا کرنا، اور قاتل

کے مآل پر افسوس کرنے والے کو "افسوسناک" قرار دینا خدا جانے کونسا مستحسن پیرایۂ بیان اور انیس سے اونچا کمالِ فن ہے۔

گرمی کی فصل اور وہ سولہ پہر کی پیاس
حلقے پڑے تھے چشم میں، تھا رنگِ رخ اداس
خالی کٹورے لے لے کے بچے کھڑے تھے پاس
اب آئے گا اب آئے گا، پانی یہی تھی آس

ممکن تھی ایک بوند نہ منہ میں چوانے کو
پانی کہاں تھی آگ لگی تھی زمانے کو

جب زمانے کو آگ لگی تھی تو وہاں پانی کہاں سے آتا۔ ایسی حالت میں بچے خالی کٹورے لے لے کے کس کے پاس کھڑے تھے جبکہ نظر آ رہا تھا کہ منہ میں چوانے کو ایک بوند بھی نہ تھی۔ اس لئے بڑے تو شلید کھڑے رہ سکیں معصوم بچے خالی کٹورے لے لے کر کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کو ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنا چاہیئے تھا۔ قطع نظر اس کے پانچویں مصرع میں لفظ "ممکن" شاعر کا مفہوم صحیح طور پر ادا نہیں کرتا۔ اس کی بجائے ایسا لفظ ہوتا جس سے "موجود" کا مفہوم ادا ہوتا۔ مصرعہ کی ترکیب سست اور مطلب غیر واضح ہے۔

اگر کسی کو خیال ہو کہ شاؔد نے صداقت سے واقعہ نگاری کی ہے اور مبالغہ سے کام نہیں لیا اور اس لئے وہ انیسؔ یا دبیرؔ سے ممتاز مقام کے مستحق ہیں تو اسی رسالے کے ص ۱۴۲ پر گھوڑے کی تعریف میں جو بند کہے گئے ہیں دوبارہ پڑھ لئے جائیں۔

اس درازنفسی سے شاؔد مرحوم کے فضل و کمال کا انکار مقصود نہیں۔ یقیناً مرحوم اچھے شاعر تھے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ جن باکمالوں سے برابری یا برتری کا ان کو یا ان کے مداحوں کو دعویٰ تھا۔ وہ محض خوش خیالی اور خودستائی ہے، اور حاؔلی جیسے رفیع المنزلت مصنف کی تحریر میں پیوندکاری کا ادعا اسی خودبینی و خودستائی کا قابلِ افسوس اظہار ہے۔

مہر محمد خاں شہاؔب مالیرکوٹلوی
مقیم بمبئی

جامعہ میں مشاعرہ

دہلی میں ہر سال دہلی کلاتھ ملز کے اہتمام میں "بزم شنکر و شاد" کے عنوان سے ایک مشاعرہ ہوتا ہے جس میں ملک کے مشہور شاعروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ پہلے یہ بزم سخن ہندپاک مشاعرے کے نام سے منعقد ہوتی تھی، لیکن کئی برس سے اس میں پاکستان کے شعرار شریک نہیں ہو پاتے اور ان کی ہندوستان آنے اور یہاں کے شاعروں اور ادیبوں سے ملنے کی آرزو سیاسی پابندیوں کے ہاتھوں حسرت بن کے رہ جاتی ہے۔ دہلی کلاتھ ملز کے اس مشاعرہ کے بعد اس میں شریک ہونے والے شعرار کی ایک نشست جامعہ میں بھی ہوتی ہے، امسال ڈاکٹر سید عابد حسین کی صدارت میں جامعہ میں یہ نشست ۱۳/ اپریل کو ہوئی، اس میں نازش پرتاب گڑھی، ملک زادہ منظور احمد، منظر سلیم، جگناتھ آزاد، والی آسی لکھنوی، مخمور سعیدی، کلیم عاجز، صبا افغانی، ہلال رضوی، بیکل اتساہی اور سلام مچھلی شہری نے شرکت کی، ہم ان حضرات کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست پر جامعہ کے اساتذہ اور طلبار کو اپنے کلام سے نوازا اور استفادہ کا موقع دیا۔ ذیل میں ہم ان نظموں اور غزلوں کے منتخب ٹکڑے اور اشعار نقل کرتے ہیں جو جامعہ کے اس مشاعرہ میں پڑھی گئیں۔

جگناتھ آزاد

مری رگوں میں تو میرے لہو کی گردش تھی
تمھارے پاس تھا کیا

ایک خوف جاں کے سوا
تمھیں یہ خوف تھا بزمِ طرب نہ لُٹ جائے
تمھیں یہ غم تھا کہ برہم نہ ہو وہ بزمِ نشاط
جو موجِ مئے پہ رواں ہے سیاہ راتوں میں
مجھے یہ ڈر تھا مری آبرو پہ حرف نہ آئے
مجھے یہ ضد تھی کہ میرے وطن کی دھرتی پر
کسی عدو کے قدم کا کوئی نشاں نہ پڑے
مجھے یہ ضد تھی کہ میرے چمن پہ آنچ نہ آئے
چمن کے پھول اسی طرح مسکراتے رہیں
وطن کے کھیت اسی طرح لہلہاتے رہیں
یہ رودبار اسی طرح گیت گاتے رہیں

(نظم کا عنوان — 'سپاہی')

سلام مچھلی شہری

خداوندانِ شہرِ زر میں انجانے بھی ہوتے ہیں
کرم گستر خردمندوں میں دیوانے بھی ہوتے ہیں
پُرانی دِلّی کا ہر خواب ہے مفلس کی انگڑائی
نئی دِلّی میں کیا کیجیے پری خانے بھی ہوتے ہیں
یقیناً ابنِ آدم ہر فضا کو جیت لیتا ہے
مگر کچھ مسئلے دنیا کو سمجھانے بھی ہوتے ہیں
سلامؔ اس مصلحت کوشی سے اب بھی باز آجاؤ
کہ تاریخِ ادب کے سخت پیمانے بھی ہوتے ہیں

نازش پرتاب گڑھی

لفظ ہی پھول بھی ہے لفظ ہی زنجیر بھی ہے
لفظ ہی زخم بھی ہے لفظ ہی شمشیر بھی ہے
لفظ ہی خواب بھی ہے خواب کی تعبیر بھی ہے
اور لفظوں پہ رہا کرتی ہے دنیا کی نظر
لفظ کو جاننے والے ہی سمجھتے ہیں مگر
لفظ شبنم ہے نہ موتی ہے نہ پتھر نہ آگ
لفظ کے سینۂ خالی میں نہ آہیں ہیں نہ راگ
لفظ میں نور سمو دو تو ستارا بن جائے
دل جو رکھ دو تو لبِ ناز کا بوسہ بن جائے
اور بارود جو بھر دو تو دھماکہ بن جائے
لفظ تو آج بھی انساں کی طرف تکتا ہے
لفظ کا نٹا ہی نہیں پھول بھی بن سکتا ہے
لفظ ٹپکائے گا امرت لبِ گوتمؐ تو ملے
رقص فرما ہو مگر کوئی کنہیا تو ملے
منتظر ہے کسی چشتیؒ، کسی نانکؒ کے لئے
لفظ ہو جائے گا زندہ کوئی عیسیٰؑ تو اٹھے
کوئی بنسی میں سمولے تو یہ نغمہ ہو جائے
لفظ کو کرشن جو مل جائے تو گیتا ہو جائے

(نظم کا عنوان — لفظوں کا المیہ)

کلیم عاجز

غرض کسو سے نہ اے دوستو، کبھو رکھیو — بس اپنے ہاتھ یہاں اپنی آبرو رکھیو
زمانہ سنگ سہی، آئینہ کی خو رکھیو — جو دل میں رکھیو، وہی سب کے روبرو رکھیو
زبان درد بہت کم سمجھنے والے ہیں — یہاں نہ ہر کس و ناکس سے گفتگو رکھیو
اُڑا نہ دیجیو سب غم کی رنگ رلیوں میں — بچا کے دل کے پیالے میں کچھ لہو رکھیو

ملک زادہ منظور احمد

دیدۂ عبرت سے پہلے تم مجھے دیکھا کرو — دوستو، پھر اس نگاہِ ناز کا چرچا کرو
گل گریباں چاک، غنچے مضمحل، بلبل اداس — ایسی تعبیروں سے اپنے خواب مت رسوا کرو
آج ہر لمحہ کے ہاتھوں میں ہے سنگِ ملامت جسی — اپنا غم کہنے سے پہلے دیر تک سوچا کرو

منظر سلیم

دریا ہیں پھر بھی ملتے نہیں مجھ سے یار لوگ — جرأت کہاں کہ صحرا سے ہوں ہمکنار لوگ
اب سایہ و ثمر کی توقع کہاں رُکے — سوکھے ہوئے شجر ہیں سرِ رہگذار لوگ
اک دوسرے کا حال نہیں پوچھتا کوئی — اک دوسرے کی موت پہ ہیں شرمسار لوگ
سورج چڑھا تو پگھلی بہت چوٹیوں کی برف — آندھی چلی تو اُکھڑے بہت سایہ دار لوگ

والی آسی لکھنوی

اب تمناؤں کی محفل نہ سجا دیوانے — لٹ چکا شہرِ وفا ہوش میں آ دیوانے
اتنی حیراں ہے کیوں راہِ وفا دیوانے — مٹ گئے کیا ترے نقشِ کفِ پا دیوانے

کب خدا جانے کسی بت کا گزر ہو جائے — دل کو دل رہنے دے کعبہ نہ بنا دیوانے

مخمور سعیدی

رُخ کبھی اپنا ہواؤں کو بدلنا بھی پڑا ہے — سر پھرا کوئی پرندہ جب ہواؤں سے لڑا ہے
جب وہ زندہ تھا تو اک چھوٹے سے قد کا آدمی تھا — آج جو لیٹا ہے پر جس کا دیو قامت بُت کھڑا ہے
خوشنما ہر تاج جو بخشا گیا ہے مجھ کو لیکن — کام میرے آ نہیں سکتا کہ میرا سر بڑا ہے

صبا افغانی

زندگی نکھر آئی غم کی بے پناہی سے — روشنی ملی دن کو رات کی سیاہی سے
مجھ کو بے گناہی کی کون سی سزا دو گے — ہر سزا لرزتی ہے میری بے گناہی سے

بیکل اتساہی

گیت کو روپ ترنم کو جوانی کہیے — لب و رخسار کو الفاظ و معانی کہیے
قاضیِ شہر کے فتوے میں یہی ہے تاکید — آج سے بادۂ گلرنگ کو پانی کہیے
قید یہ ہے کہ سرِ بزم رہیں ہونٹ سلے — حکم یہ ہے کہ ہر اک بات زبانی کہیے

ہلال رضوی

فکر کر شاعر، نہ ان کی شعر ہیں کمزور جو — دوستی ٹھیری تو وزنی کون دیکھے شعر کو
واہ واہ تیری کروں میں تو مری کر واہ واہ — من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

ذاکر صاحب اپنے ساتھیوں کی نظر میں

(ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے انتقال کے بعد اردو میں ان پر دو کتابیں شائع ہوئی ہیں اور "اردو ادب" (علی گڑھ) کا ذاکر نمبر نکلا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ ذاکر صاحب کی پہلی برسی کے موقع پر ان پر تبصرہ کروں گا مگر اس شمارے میں اتنی گنجائش نہیں نکل سکی کہ ان پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا جاسکے، اس لیے اس کی جگہ پیشِ نظر مضمون مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس وقت صرف "اردو ادب" کا ذاکر نمبر پیشِ نظر ہے، اس لیے مرحوم کے دو عزیز ساتھیوں، پروفیسر محمد مجیب صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی رائیں اور خیالات نہیں پیش کئے جا رہے ہیں، جن کے مضامین حسبِ ترتیب ماہنامہ جامعہ اور سہ ماہی اسلام اور عصرِ جدید میں شائع ہوئے ہیں۔ لطیف اعظمی)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ذاکر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ کتنی مختصر خبر لیکن کتنا بڑا حادثہ، ان تمام لوگوں کے لئے جو اچھے شخص اور اچھی باتوں کا احترام کرنا جانتے ہیں، تین دن تک مسلسل دہلی میں جو کچھ دیکھنے میں آیا اس سے اندازہ ہوا کہ آج بھی لاتعداد ایسے لوگ ہیں جو اچھے اشخاص اور اچھی باتوں کا احترام کرنا جانتے اور چاہتے ہیں۔ موت اور زیست ہر متنفس کے لیے تقدیر ہے، لیکن ان کا شرف کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب کی زندگی اور مرگ دونوں باشرف تھے، اس لیے کہ ان کے دونوں ایک دوسرے سے مشرف تھے۔۔۔

بایں ہمہ ذاکر صاحب شروع سے آخر تک کبھی بھی رہن سہن، شکل صورت، وضع قطع، میل جول، ہنسنے بولنے، رزم و بزم، تفریح و تفنن کے اعتبار سے دور دور تک عابد و زاہد یا سادھو سنت نہ تھے بلکہ جن کے بغیر ہر محفل سونی ہوتی، جہاں ہوتے اس کی رونق و اہمیت کئی گونہ بڑھ جاتی، اجتماع کیسا

ہو، ہر مہمان خصوصی کوئی ہو، سب کی نظر ذاکر صاحب ہی پر پڑتی، ان کی موجودگی سے مجلس کا ٹون صحت مند، خوشگوار اور بلند ہوجاتا۔ ذہانت شخصیت اور انسانیت میں سب ان کو اپنے سے بلند و بہتر سمجھتے تھے، ان کے معاصرین خواہ شناسا ہوں یا اجنبی کسی جولانگاہ میں ذاکر صاحب کو رشک و رقابت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، وہ ہر ایک کے محبوب و محترم تھے، ہر شخص ان کی خوبیوں کا خوشی اور فخر سے اعتراف کرتا۔۔۔

ذاکر صاحب ہر شخص کو عزت و محبت کا مستحق سمجھتے تھے، طالب علمی کی زندگی سے لیکر آخری جدائی تک انھوں نے بھولے سے بھی کسی موقع پر اپنی برتری نہیں جتائی، پردہ داری اور پردہ پوشی، عفو و درگذر، ان کی سیرت کا بڑا نمایاں اور قیمتی جوہر تھا، کسی موضوع پر بحث ہوتی، اس میں تحمل، توازن اور خوش دلی ملتی، گفتگو سہل اور سادہ ہوتی ہوئی پرمعنی، فکر انگیز اور پرمعنی اور فکر انگیز ہوتے ہوئے سہل اور سادہ ہوتی ۔۔۔ کوئی منافشہ ہوتا تو صلح صفائی کرانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے، فریقین کتنے ہی ضدی اور غیر ذمہ دار کیوں نہ ہوتے، ذاکر صاحب کو حکم بنائے جانے پر بلا تامل راضی ہوجاتے۔ اس کی بڑی اچھی مثالیں ان کی صدارت میں راجیہ سبھا کے اجلاس میں ملتی تھیں۔ ان کی وفات پر سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے جو ہدیۂ عقیدت پیش کیے، ان میں ایک ممتاز کمیونسٹ ممبر کا یہ کہنا کہ ذاکر صاحب اپنی صدارت میں اپوزیشن کے تحفظ کو بھی ملحوظ رکھتے تھے بڑا تاریخی اور قابل فخر فقرہ ہے، شاید کسی اپوزیشن نے دنیا کے کسی سیاسی ادارے کے اعزاز میں ایسا ہدیہ نہیں پیش کیا ہوگا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ذاکر صاحب کے تصفیہ پر کسی نے بددلی یا اپنے غیر مطمئن ہونے کا اظہار کیا ہو۔ وہ دانشمندی اور قطعاً غیر جانبدار ہوکر تصفیہ کرانے کی کوشش کرتے تھے۔۔۔

ذاکر صاحب میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو کسی درماندہ، متشکک یا برہم و بیزار کو طمانیت خاطر سے بہرہ اندوز کرسکتی تھیں، وہ آرٹ اور علوم پر وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے، سیرت کی بلندی، پختگی اور پاکیزگی کے لحاظ سے معتبر و محبوب تھے۔ ان میں مذہب کا جو خصوصی احترام ملتا

تھا، وہ کچھ تو خاندان سے ورثہ میں آیا تھا، کچھ بزرگوں کے فیض سے اور بہت کچھ انھوں نے اپنے کو تربیت دے کر حاصل کیا تھا۔ اس تربیتِ نفس کے لیے انھوں نے کتنا ریاض کیا ہوگا اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو نہ صرف اس منزل سے گذر رہے ہیں بلکہ مسلسل گذرتے رہتے ہیں، وہ صوفی اور آرٹسٹ دونوں تھے، اسکالر بھی تھے عارف بھی۔۔۔

خواجہ غلام السیدین

میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کو ہر حالت، ہر رنگ، ہر مقام پر خالص سونا ہی سونا پایا ہو اور کہیں کھوٹ نظر نہ آیا ہو۔ لیکن جب قدرت کسی کو اپنی فیاضی سے مالا مال کرتی ہے (اور بہت بخل کرتی ہے قدرت ایسا کرنے میں) تو پھر اس کی بخشش کی انتہا نہیں رہتی۔ کیا کیا نہیں دیا اس نے ذاکر حسین کو؟ ایسا جمال صورت جو لاکھوں میں ایک آدھ کو نصیب ہوتا ہے، ایسا جمال سیرت جو کروڑوں میں ایک آدھ کے حصے میں آتا ہے، ایسا روشن دماغ جو ہر مسئلے کی تہہ کو پہنچ جاتا، ہر پیچیدہ صورت حال میں سے مغز نکال لیتا اور ہڈیاں کو کتوں کے لیے چھوڑ دیتا، ایسا قلب گداز جس میں عالم انسانیت کے لیے سمائی تھی، جو ہر کسی کی بھلائی چاہتا تھا، کسی کی برائی نہ صرف چاہتا نہ تھا بلکہ ایسا سوچ بھی نہ سکتا تھا، جو ان لوگوں کے ساتھ بھی شفقت اور پردہ پوشی کا سلوک کرتا تھا جنھوں نے اسی کے ساتھ برائی کی ہو، گفتگو میں وہ کشش کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی، تقریر میں وہ روانی اور برجستگی، وہ سوز و ساز کہ لفظ دل سے نکلتا تھا اور بجلی کی طرح دل پر گرتا تھا، تحریر میں وہ سادگی اور پرکاری اور خلوص کا وہ بے پناہ جوش جو ہر پڑھنے والے کو اپیل کرتا تھا اور ان سب پر مستزاد وہ لطیف لیکن موثر ذوق ظرافت جو ہر قسم کے عناد اور دل آزاری سے پاک تھا اور جس کا شکار بڑی خوبصورتی کے ساتھ کبھی دوسرے لوگ اور اکثر خود ان کی ذات ہوتی تھی۔ وہ یا تو ہر بات میں ایک نئی بات پیدا کرتے اور اپنی طباعی کا ثبوت دیتے یا اگر پرانی بات بھی ہوتی تو اس کو ایک

نئے انداز میں بیان کرتے کہ اس میں نئی جان پڑ جاتی۔ ان کے دماغ میں ماضی حال اور مستقبل؛
مذہب اور سائنس، فلسفہ اور معاشیات، قوم کی فکر اور انسانیت کا غم، جمالی دلچسپیاں اور
حسن عمل کا شیوہ، سب اچھے پڑوسیوں کی طرح پہلو بہ پہلو رہتے تھے انھوں نے نہ فکرجا
سے مرعوب ہو کر کبھی مذہب کو بھلایا (مجھے بتایا گیا کہ رمضان شریف میں وہ ایک دن میں پندرہ
پندرہ سپارے پڑھتے تھے اور اکثر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں رہتے تھے) نہ مذہب کی
تنگ نظر تعبیر کر کے اس کو حالات حاضرہ سے بے تعلق سمجھا۔ ان کا کہنا تھا کہ زندگی ایک وحدت
ہے اور اس کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہئے۔ لیکن کیا انھیں معلوم تھا کہ اس وحدت کو دیکھنے
کے لیے ذاکر حسین کی نظر کی ضرورت ہے؟ ہر نظر اس وحدت کو نہیں دیکھ سکتی۔ وہ تو اس
کے بے شمار پہلوؤں میں سے اپنے چند پسندیدہ اور مفید مطلب پہلو ہی دیکھ سکتی ہے۔ ان
کے نزدیک ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی، سفید و سیاہ سب برابر تھے کیونکہ
ایک ہی خدا کے بندے تھے۔ یاد ہوگا کہ انھوں نے صدر ہونے کے بعد جو پہلی تقریر کی تھی اس
میں کہا تھا کہ ہندوستان میرا گھر ہے اور اس میں رہنے والے میرے خاندان کے لوگ۔ ان کے
لیے یہ کوئی خطیبانہ دعویٰ نہ تھا بلکہ ایک زندہ حقیقت تھی جو ان کے ہر قول اور فعل سے نمایاں
تھی اور وہ اس کنبہ کو صدر ہونے سے برسوں پہلے اپنا چکے تھے!

پروفیسر آل احمد سرور

ذاکر صاحب دو سال سے کم ہی صدر رہے، مگر اس زمانے میں بھی انھوں نے صدر کے عہدے
کی شان اور بڑھادی۔ ان کے پیش رو کوئی معمولی آدمی نہ تھے، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر
رادھا کرشنن نے اس عہدے کو خاصا وزن و وقار عطا کیا تھا۔ ذاکر صاحب نے صدر ہونے کے
بعد کہا تھا کہ ان کا انتخاب ایک معلم کی خدمات کا اعتراف ہے، واقعی وہ ساری عمر ایک معلم رہے،
انھوں نے طالب علموں کو افکار و اقدار اور کردار کی دولت سے مالا مال کیا، انھوں نے

استادوں کو علم کی لگن اور خدمت کی دُھن دی، انھوں نے سیاست والوں کو اخلاق سکھایا، انھوں نے عوام کو محنت اور خدمت کی تلقین کی، انھوں نے اپنے عمل سے دکھادیا کہ وطن کی محبت اور قوم کے دکھ درد میں شرکت اور سماج کی فلاح کے لیے جدو جہد کس طرح بالآخر سب کے دلوں کو موہ لیتی ہے، خادم کس طرح مخدوم بنتا ہے، عاشق کیوں محبوب ہوتا ہے، عارف کیوں رہ نما مان لیا جاتا ہے۔ وہ بڑے اچھے مسلمان تھے، مگر ان کا اسلام سکڑا سہما، اپنے خول میں بند، تازہ ہواؤں اور نئے خیالات سے خائف اسلام نہ تھا، یہ اپنے ایمان میں مضبوط، اپنے عقائد میں پختہ، اپنی خصوصیات پر مضبوطی سے جما ہوا اسلام تھا۔ جو سب کے لیے اور سب کا تھا۔ یہ اسلام اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کے بجائے دنیا میں اسلامی اقدار اور اسلامی کردار کے اثرات کو عام کرنے والا اسلام تھا، اس میں تمام مذاہب کا احترام تھا۔ ...

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے انجام سے ان کا آغاز زیادہ شاندار تھا، وہ ان کے خدمت کے دور کو دیکھتے ہیں، ان کے حکومت کے دور کو نظر انداز کردیتے ہیں، حالانکہ، دونوں میں ایک وحدت ہے۔ ذاکر صاحب کی طرح جو بھی ملک و قوم اور انسانیت کی خدمت کرے، قوم اسے سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔ صدارت ان کی زندگی کی تکمیل کرتی ہے، بذاتِ خود اس کی اہمیت نہیں، یہ صرف اس بات کی علامت ہے کہ خلوص اور خدمت بالآخر اپنا رنگ دکھاتے ہیں اور محبوبیت و مقبولیت کے جو مظاہر ہیں ان میں ایک ہندوستان کے پہلے شہری کے عہدے کا بھی ہے۔

ذاکر صاحب تمام ہندوستانیوں کے لئے عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے خصوصاً جینے کا ایک ڈھنگ اور عاشقی کے کچھ آداب دے گئے ہیں۔ انھیں برتنا ہی ان کی گراں قدر خدمات کا سب سے اچھا اور سچا اعتراف ہوگا۔ کاش ہم اس کا ثبوت دے سکیں۔

سالانہ چندہ
چھ روپے

جامعہ

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۱ | بابت ماہ جون ۱۹۷۰ء | شمارہ ۶

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ :

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون :

اڈیٹر : ۶۳۲۵۸

منیجر : ۶۳۴۶۰

طابع وناشر : عبداللطیف اعظمی
مطبوعہ : یونین پریس دہلی
ٹائیٹل : جمال پریس دہلی

شذرات

ذاکر صاحب کی لکھی ہوئی کہانی یا تمثیل، یا کہانی اور تمثیل اسے دونوں کہئے، کچھوا اور خرگوش چھپ کر بازار میں آ گئی ہے، اسے شائع کیا ہے حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی امداد سے نیشنل بک ٹرسٹ نے، اور چھپی ہے مکتبہ جامعہ کے زیر اہتمام اس کے اپنے لبرٹی آرٹ پریس میں، کتابت و طباعت دیدہ زیب، تصویریں دلفریب، کاغذ اچھا، صحت کتابت کا خاص اہتمام، قیمت برائے نام (مجلد، دو روپے اور غیر مجلد، ایک روپیہ)، ذاکر صاحب ہوتے اور اسے دیکھتے تو خوش ہوتے اور ہم لوگوں کا دل بھی بڑھتا، مگر افسوس، آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

کچھوا اور خرگوش، یہ کہانی بہت پرانی ہے، اور اس سے یہ سبق سکھانا مقصود رہا ہے کہ اگر راستہ چلنے والے میں عزم و حوصلہ اور صبر و استقامت ہے، دھن اور لگن ہے، محنت مشقت کی عادت اور انکسار اور مسکنت ہے، تو ہزار دشواریوں کے باوجود راستہ طے ہو ہی جاتا ہے، راہی اپنی منزل پا ہی لیتا ہے۔ جامعہ ملیہ کی کہانی اور ذاکر صاحب کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی رہی جیسی رہی ہے، اس کہانی میں شروع کے تین صفحے اسی حقیقت کی نشان دہی کے لئے وقف ہیں اور آخر میں ایک بلیغ جملہ اسی کی طرف اشارہ ہے "... بہرحال کوئی چلتا رہے، چاہے کتنا ہی آہستہ، تو فاصلہ طے ہو ہی جاتا ہے۔" اس راہ میں غفلت، خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو،

بڑی ہی ہلاکت، مایوسی اور محرومی کی منزل ہوتی ہے، بس کام آتی ہے تو ہر وقت کے نصب العین کی سرشاری، ایک بے نام دیوانگی اور سرمستی، یہ وہ بے خودی ہے جس پر ہزار ہشیاریاں نثار، یہ وہ سرمستی ہے جس پر لاکھوں ہوشمندیاں فدا،

ذاکر صاحب کی اس کہانی میں ایک دوسری حقیقت بھی بیان کی گئی ہے، اور وہ یہ کہ اکثر بہت سیدھی بات، معمولی بات، ہمارے عالموں کی سمجھ میں کہ ان کا علم محض کتابی ہوتا ہے، سمجھ میں نہیں آتی اور نہ وہ اسے سیدھے سادے لفظوں میں سمجھا سکتے ہیں، یہ لوگ علم کی شان یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی عالم بالا میں رہے اور ساد کر کبھی زمین پر نہ آئے، ایک ان پڑھ، گنوار سے بھی بات کرے تو علم کی شان ملحوظ خاطر رہے اور انھیں اصطلاحوں، تشبیہوں اور استعاروں میں گفتگو کرے جن سے کہ ان کے نزدیک علم کا بھرم قائم ہے، علم کی دنیا میں جب سے تخصص کی وبا پھیلی ہے، یہ مرض عام ہے کہ ایک مضمون بلکہ ایک مضمون کی کسی خاص شاخ کا عالم اپنے مضمون کے سوا اور کسی مضمون یا اپنے مضمون کی کسی اور شاخ سے کوئی ... واقفیت نہیں رکھتا، اور زندگی کی بہت ہی سادہ حقیقتوں کے سامنے اکثر اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنے...
خاص اسلوب میں، طنز و مزاح کے لطیف چھینٹوں سے، ایسے عالموں کے 'بار گراں' پر ایک طرح سے اظہار تاسف کیا ہے، اس کہانی کے ایک کردار پروفیسر کپچاق ہیں، وہ تاریخ کے عالم و ماہر ہیں، مولوی غفران جو دینیات کے عالم ہیں، ان سے ادکھلے میں جمنا کے کنارے ایک بوڑھے کچھوے نے یہ سوال کیا تھا کہ "ملا جی، آپ کی اتہاس کی پستکوں میں کیا لکھا ہے؟ کہیں یہ لکھا ہے کہ پراچین کال میں کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہوئی تھی اور بھلا کیا لکھا ہے کہ کون جیتا تھا؟" مولوی غفران اس کا جواب نہ دے سکے، مشکل یہ تھی کہ اس سوال کا تعلق "تاریخ قدیم" سے تھا اور ان کا میدان تھا دینیات اور الہیات۔ اس میں کہتے بلی، خرگوش اور کچھوے کا کیا کام؟ اس لئے انھیں کچھوے سے کہنا پڑا کہ وہ کل اپنے ساتھ تاریخ کے پروفیسر کو لائیں گے، شاید وہ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔

تاریخ کے ماہر پروفیسر کچاچاق کی ملاقات جب کچھوے سے ہوئی اور اس نے ان کے سامنے اپنا وہی سوال رکھا تو ان کی طبیعت بہت منغض ہوئی اور وہ سخت ناخوش ہوئے، بولے حضرت کچھوے اور خرگوش سے میرے فن کو کیا علاقہ۔ میں تو تاریخ کا استاد ہوں۔ اقوام و ملل کے عروج و زوال کے عمل مسلسل پر تفکر و تفقہ میرا کام ہے۔ قوائے دولت آفریں کی مخصوص اشکال کے تقاضوں کا تفحص اور ہیئت اجتماعیۂ انسانیہ پر ان کے اثرات کی توضیح، معاشرے میں طبقات معاش کے تصادم کے ناگزیر عواقب و نتائج کی تشریح، محرکاتِ انقلابی کے ظہور و بلوغ کے اسرار و غوامض کو تحقیق و عقیدے کے آمیزے سے قابل فہم بنانا، استعمار و استحصال کے داخلی تضادوں کی روشن بصیرت اور ان عفریتوں کے مفتوح و معدوم ہونے پر انسانیت کی حقیقی تاریخ کا ایک عقلی و معروضی نقشہ مرتب کرنا، یوں کہ ماضی سے مستقبل منطقی لزوم کے ساتھ مستخرج ہو، یہ میرا کام ہے۔ یہ کچھوے اور خرگوش سے متعلق استفسار آپ نے مجھ سے خوب فرمایا"——"کچھوے بیچارے کا سانس اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا"——یہی معاملہ ادب اور تاریخ ادب کے پروفیسر ڈاکٹر ذی الغور اور منطق و فلسفہ کے استاذ الفیلسوف الہندی کے ساتھ بھی پیش آیا اور ان حضرات نے اپنے اپنے مضمون کے تمام لزوم علمی کے ساتھ کچھوے سے گفتگو کی، اس دوران مولوی غفران ترجمان کے فرائض انجام دیتے رہے، الفیلسوف الہندی کی فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقی استدلال کا یہ نتیجہ نکلا کہ اگر چند شرائط کے ساتھ کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہو تو اس کا قوی امکان ہے کہ کچھوے کی جیت ہو جائے، لیکن چلتے چلتے انھوں نے شرائط کی پابندی پر بہت زور دیا اور کہا کہ "شرط بھول جائیں گے تو سب نقشہ ختم۔ "إذا فات الشرط فات المشروط" بالآخر بوڑھے کچھوے اور نوجوان خرگوش جو اکثر میاں کچھوے سے شوخیاں کرتا تھا، دونوں کی دوڑ ہوئی۔ اور یہاں سے یہ دلچسپ طربیہ ایک المیہ میں بدل جاتا ہے، خرگوش منزل مقصود پر پہونچنے سے پہلے ایک شکاری کتے کے ہاتھوں زخمی ہو جاتا ہے جس کا مالک اُسے پکڑ کر ذبح کر ڈالتا ہے۔ کچھوے پر اس المناک انجام کا ایک خاص اثر مرتب ہوتا ہے۔

کہنے کو تو یہ ایک مختصر سی کہانی ہے، مگر اسے مصنف نے بڑی توجہ اور دیدہ ریزی سے لکھا ہے اور بڑے بلیغ جملوں میں زندگی کی کئی حقیقتوں کو اجاگر کیا ہے، یہی بلیغ جملے درحقیقت اس کی جان ہیں۔ بلاشبہ ہم اسے ذاکر صاحب کا کارنامہ کہہ سکتے ہیں، مثلاً چند جملوں میں بڑی خوبصورتی سے یہ بیان کر دیا ہے کہ زبانوں کے فرق کے باوجود انسانوں میں میل جول اور باہمی تعلق و ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ مولوی عنفران اور کچھوا شروع میں ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے، مولوی صاحب مشکل اُردو بولتے ہیں اور کچھوا ٹھیٹھ ہندی، لیکن ذاکر صاحب کچھوے کی زبان سے ایک اہم تاریخی صداقت اور زندگی کی ایک سچی حقیقت بیان کراتے ہیں ـــــ کچھوے نے کہا "سوال اتھوا پرشن۔ جواب اتھوا اُتر۔ مطلب، سو یہ شبد ہم نے اپنے پرکھوں سے سن رکھا ہے۔ جب جمنا ندی ادھر نیلوی کیری کے پاس بہتی تھی اور بڑے بڑے مسلمان سنت وہاں سورج نکلنے سے پہلے آکر منہ ہاتھ دھوتے کُلّا کرتے تھے، ان کی باتیں ہمارے پرکھے سُنا کرتے تھے۔ اس میں سے کچھ شبد یاد رہ گئے تھے۔ سو مطلب تو ہم جانتے ہیں۔ مطلب اتھوا ارتھ۔ ہاں اور لُگت اتھوا شبد کوش جس میں شبدوں کا ارتھ لکھا ہوتا ہے۔ سمجھے، ہم سمجھ گئے۔

"اچھا ہوا آپ سمجھ گئے، مگر کل لغت یا آپ کا شبد کوش لاؤں گا تو آپ سے باتیں ہوں گی" ملاجی نے کہا۔

"نہیں نہیں" کچھوا بولا "ایسی بھی کیا بات ہے۔ دیکھیے تھوڑے سے سمے میں ہم نے ایک دوسرے کے کتنے شبد جان لئے۔ بات چلے گی تو میں آپ کا مطلب سمجھ لوں گا۔ میرے شبدوں کا اُرتھ آپ سمجھ لیں گے۔"

ڈاکٹر فی الغفور نے جو ادب کے امین اور تاریخ ادب کے راز داں ہیں، اپنی تقریروں کے دوران تخلیق ادب، شاعری، تنقید و تحقیق، سب پر روشنی ڈالی ہے، اس طرح ذاکر صاحب نے بڑے حسین پیرائے میں اس فن کے مدعیوں پر بھرپور طنز کئے ہیں اور اپنے تخلیقی ذہن اور بے پناہ

ادبی صلاحیت کا ایک نادر نمونہ پیش کیا ہے، نوٹس کے سہارے یونیورسٹیوں کے پروفیسر جنھیں اکثر قبض کی شکایت رہتی ہے اپنے لکچرز میں کیا کیا گل کھلاتے ہیں، اس کی عکاسی بھی بڑے لطیف اور دلآویز انداز میں ملتی ہے (ڈاکٹر فی الفور اپنے سارے نوٹس لے کر کچھوے سے نبرد آزما ہونے گئے تھے۔) تاجرانہ ذہنیت رکھنے والے اہل سیاست واہل صحافت اور بدمزاج شاعر اور ادیب، ہفتے میں ایک بار نہانے والے مسلمان، 'ع' کو حرف حلق کے صحیح مخرج سے نکالنے والے مولوی ملا، سب کے متعلق کچھ نہ کچھ اس میں ہے اور اس طرح ہے کہ چند جملے ہی، چند کنایے ہی، پوری تصویر سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ درحقیقت یہ کہانی یا تمثیل ایک مرصع غزل ہے جس کا ہر مصرع، ہر ٹکڑا اپنے اندر اسرار و معانی کا ایک دفتر رکھتا ہے اور بیدار مغز انسانوں کے لئے زندگی کی وہ بصیرتیں جنھیں اگر برتا جائے تو یہ دنیا بہت حسین بن جائے۔

اور آخر میں خرگوش کے حسرتناک اور المناک انجام پر کچھوے کا جو حال ہوتا ہے، جس طرح اس کے دل و دماغ کی دنیا دگرگوں ہو کر رہ جاتی ہے اور جو خیالات اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، وہ پڑھنے والے کے دل پر نہ مٹنے والے نقش چھوڑ جاتے ہیں، یہ حصہ پڑھنے کے لائق، بار بار پڑھنے کے لائق ہے، ندامت اور پچھتاوے کا ایک اتھاہ احساس ہے جو کچھوے کو گھیر لیتا ہے، دنیا اسے سنسان نظر آتی ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے جتنا کہ وہ دوڑ میں تھکا تھا، وہ پچھتاتا ہے کہ یہ اُسے کیا سوجھی تھی کہ دل میں صدیوں کا غبار لئے اس نے اس کم سن، رنگیلے چھبیلے خرگوش کو دوڑ پر اکسایا، اس کے تو ابھی جینے کے دن تھے، کچھ ہونا تھا تو اُسے ہو جاتا۔ اس سے بڑی بھول ہوئی، یہ تو بڑی ہتیا ہوئی، اتنی عمر پاکر بھی وہ اتنا نہ سمجھ سکا کہ سنسار میں ہر جاندار کی اپنی اہمیت ہے، ہر جاندار کی دنیا الگ الگ ہے، ایک کے لئے جو چیز اہمیت کی ہے دوسرے کے لئے اس میں کوئی خصوصیت نہیں، کچھوے کا جہاں اور، خرگوش کی دنیا اور، ہم زمین پر بھاگ نہیں سکتے تو وہ مرنے والا بچہ بھی تو پانی میں نہیں

تیر سکتا تھا، کسی کو کچھ ملا ہے، کسی کو کچھ اور، کسی کا کچھ کرتو ہے، کسی کا کچھ۔ سب اپنا اپنا کرتو پورا کریں تو اس میں ایشور کی مرضی پوری ہوتی ہے۔ اس مرضی کو جاننا پہچاننا اور اس کے سامنے گردن جھکانا ہی جیون کا آنس ہے۔ یہی دھرم ہے، یہی ستیہ ہے، یہی آنند ہے، یہی موکش ہے۔ یہ جان پہچان، یہ گردن جھکانا ہر ایک کا اپنے اپنے رنگ میں ہوتا ہے۔ اپنی پہچان کو دوسرے کی پہچان سے ناپنا اپنے گردن کو جھکانے کے ڈھنگ کو دوسرے کے جھکاؤ سے ٹکرانا، دوسرے کے کرتو کو اپنے کرتو کا ترازو بنانا، یہ سب بھول ہے، بڑی بھول ہے، بڑی بھول ہے، اور ہم سے یہی بھول ہوئی۔" نوجوان خرگوش کی بے وقت کی موت کا غم، اور جن حالات میں یہ موت ہوئی خاص طور سے اس کا غم، وہ بوجھ تھا جو اب کچھوے کا عمر بھر کا بوجھ بن گیا تھا، کوئی نہیں تھا جس سے کچھ کہہ کر اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرتا، مگر کہنے سے دکھ مدھم ہی تو ہوتا ہے، جاتا تو نہیں۔

——— یہاں بھی ذاکر صاحب کی شخصیت (اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو انوار سے بھر دیں) کے اندر جو معلم تھا وہ پورے طور پر بیدار رہا۔ اس میں ایک پیغام ہے جو وہ چھوڑ گئے ہیں، کاش ہم سب کو سارے ملک والوں کو یہ توفیق ہو کہ اس پر عمل کریں۔

پروفیسر محمد مجیب

اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام

(۲)

پہلا سوال جو ہر مسلمان کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے یہ ہے کہ وہ اسلام کو ایک عالمی مذہب سمجھتا ہے یا صرف ان لوگوں کا مذہب جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ دینیات کی رو سے جس کی سند قرآن میں ملتی ہے، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دین کی تعلیم پیغمبروں کے ذریعہ ساری نوع انسانی کو دی گئی ہے اور پیغمبروں میں سے بعض ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نام سے کیا گیا ہے اور ایسے بھی ہیں جن کے ناموں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن وہ لوگ جنھیں اس دین حقیقی کی تعلیم دی گئی، اس سے ہٹ گئے اور اس سلسلے میں قرآن میں یہودیوں اور نصرانیوں کے دین سے ہٹ جانے کا خاص طور سے ذکر ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ رہا ہے کہ وہ صحیح راستہ پر ہیں اور بعض عالموں نے تو اس کی ضمانت لی ہے کہ جس نے کلمہ پڑھ لیا، اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور وہ جنت میں جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ شک بھی پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے بعض فرقے صحیح راہ پر نہیں ہیں اور عوام میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے عقائد میں نامناسب باتیں شامل ہو گئی ہیں، اس لیے کہ انھیں پوری طرح سے ہدایت نہیں ملی۔ ویسے بھی مسلمان اگرچہ اپنے دین پر فخر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ صحیح راہ پر ہیں، پھر بھی بھول جاتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی مومنوں اور مسلمانوں کا ذکر ہے، وہاں سچے دل سے ایمان لانے اور نیک عمل کرنے کی شرطیں بھی لگائی گئی ہیں، وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب

یعنی یہودیوں اور نصرانیوں میں بھی مومن ہیں۔ لیکن مومنوں کی جماعت سے ان لوگوں کو خارج کر دینے کے میلان کی وجہ سے جن کا ایمان درست نہیں ہے، مسلمانوں کے خیال میں اسلام کے عالمی مذہب ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک اسلام ایک عالمی ہدایت ہے، جو رب العالمین کے ذریعہ تمام انسانوں تک پہنچی ہے اور جیسا کہ قرآن اپنے بارے میں کہتا ہے:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ٥

(سورہ آل عمران (۳) آیت ۱۳۸)

یہ لوگوں کے لیے ایک بیان ہے اور ان لوگوں کے لیے جو متقی ہیں، ہدایت اور موعظت ہے۔

(ترجمہ: مولانا ابو الکلام آزاد)

اور اس آیت کا اشارہ کر:

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ

(سورۃ الانبیاء (۲۱) آیت ۳۵)

اور ہم تمہیں اچھی بری حالتوں کی آزمائش میں ڈالتے ہیں تاکہ تمہارے لئے آزمائشیں ہوں اور پھر تم سب کو ہماری طرف لوٹنا ہے۔

(ترجمہ: مولانا ابو الکلام آزاد)

تمام نوع انسانی کی طرف ہے، چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

ل لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ٥

(سورہ آل عمران (۳) آیت ۱۱۳)

یہ بات نہیں ہے کہ تمام اہل کتاب ایک ہی طرح کے ہوں، ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو راہ ہدایت پر قائم ہیں، وہ راتوں کو اٹھ کر خدا کی آیتیں تلاوت کرتے اور اس کے حضور سربسجود ہوتے ہیں۔

(ترجمہ: مولانا ابو الکلام آزاد)

اگر اسلام ایک عالمی مذہب ہے اور انسانوں یعنی مسلموں اور غیر مسلموں میں ایسے لوگ تھے جو ایک خدا اور اس کی ہدایت پر دل سے ایمان لائے، ایسے جو خالی زبان سے ایمان لائے اور ایسے بھی جو ایمان لائے ہی نہیں تو ہمیں تمام مسائل پر صرف تاریخ اسلام کے پس منظر میں نہیں بلکہ تاریخ عالم کے پس منظر میں غور کرنا چاہیئے۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ انسان کے ضمیر نے تمام قوموں میں اور تمام حالات میں کس طرح اپنا اثر دکھایا ہے، قرآن کی اُس آیت کی روشنی میں، جس میں انسان کی حیثیت کا ذکر ہے اور ان آیات کی جہاں یہ حکم دیا گیا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ	اے ایمان لانے والو! ایسے ہوجاؤ کہ خدا کے لیے مضبوطی سے قائم رہنے والے اور انصاف کے لیے گواہی دینے والے ہو۔
(سورۂ مائدہ (۵) آیت (۸)	(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)
وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ	اور دیکھو، ضروری ہے کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی طرف دعوت دینے والی ہو، روشنی کا حکم دے، برائی سے روکے۔
(سورہ آل عمران (۳) آیت ۱۰۴)	(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

ہمیں تمام مذہبوں کی تاریخ، ان کے عقائد اور رسوم کا مطالعہ کرنا چاہیئے، یہ دیکھنے کے لیے نہیں کہ وہ کہاں پر صحیح راستے سے ہٹ گئے ہیں، اس لیے کہ اس کا فیصلہ صرف خدا ہی کر سکتا ہے، بلکہ یہ دیکھنے کے لیے کہ اصلیت میں وہ انسان کے بنیادی دین سے کس قدر قریب ہیں اور ہمارا مطالعہ مذہبی عقائد اور رسوم تک محدود نہیں ہونا چاہیئے، ہمیں ایسے لوگوں کی زندگی اور خیالات کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے کہ جنھوں نے سقراط کی طرح "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی مثالیں قائم کیں، خیالات کا ایسا تجزیہ کیا جس سے جہالت اور ریاکاری کی شکلیں سامنے آگئیں، اس حوصلے اور ہمت کا نمونہ پیش کیا جو انصاف پر مبنی جماعتی زندگی قائم کرنا چاہتا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ

کے سلسلے میں وہ تمام نقصان اٹھایا، جس کے لیے ہر سچے مسلمان کو تیار رہنا چاہیے۔ ہمیں ہر جگہ نظر ڈالنا چاہیے یہ دیکھنے کے لیے کہ جن اسلامی قدروں کو ہم مانتے ہیں وہ کب اور کس طرح عملی شکل میں نمودار ہوئیں اور ہمیں اپنی جانچ اتنی ہی سختی سے کرنا چاہیے، جتنی سختی سے ہم دوسروں کی کرتے ہیں، اس لیے کہ اس کے بغیر ہمارا دعویٰ کہ ہم ایمان لائے ہیں کسی غیرجانبدار مواخذے کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس آیت کا حوالہ میں دے چکا ہوں کہ "یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُونُوا قَوَّامِینَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ" اسی آیت میں آگے کہا گیا ہے:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ○

اور ایک قوم کی دشمنی کے باعث، عدل نہ چھوڑو، عدل کرو، یہی بات لگتی ہے تقویٰ سے۔

(سورۂ مائدہ (۵) آیت ۱۱) (ترجمہ: شاہ عبدالقادر مرحوم)

مسلمانوں کی دوسری قوموں سے دوستی بھی رہی ہے اور دشمنی بھی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں نے ایک دوسرے کے بارے جو باتیں کہی ہیں، ان کی وجہ سے ہم میں ایسا تعصب پیدا ہو سکتا ہے کہ ہمیں دوسروں میں کوئی اچھی بات نظر نہ آئے اور اپنی ہر بات اچھی معلوم ہو۔ ہندوستان میں مسلمان اور ہندو صدیوں تک ساتھ رہے اور تاریخ میں جو کچھ ہوا ہے، اس کے بارے میں غیرجانبداری سے رائے قائم کرنے کے لئے انصاف پسند ضمیر کو اپنا جوہر دکھانا ہوگا۔ عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ صدیوں تک لڑتے رہے ہیں اور حالات اور واقعات نے باہمی نفرت کو ایک مستقل شکل دیدی ہے، اب چاہے پورا حساب لگا کر ثابت کیا جائے کہ ایک فریق زیادہ قابل الزام ہے یا دوسرا، مسلمانوں کا بہرحال یہ فرض ہے کہ وہ عدل سے کام لیں۔

ہمیں ماننا پڑے گا کہ مغربی قوموں نے، چاہے ہماری دینیات کے مطابق وہ صحیح معنوں میں عیسائی نہ ہوں، غلامی کو مٹانے کا بڑا نیک کام انجام دیا ہے۔ غلامی کو مٹانا ایک

ایسا کام ہے، جسے مسلمانوں کو اس سے بہت پہلے کر دینا چاہئے تھا، لیکن ہم نے اپنے آپ کو ساتویں صدی کے سماجی نظام میں گرفتار کر لیا اور اس کا خیال نہ کیا کہ غلاموں کو آزاد کرنا ثواب کا کام اس نیت سے ٹھہرایا گیا ہے کہ غلامی کا سدباب ہو جائے۔ یہی مغربی قومیں تھیں جنھوں نے بالآخر جمہوری نظام قائم کیا، اس لیے نہیں کہ یہ ان کا مذہبی عقیدہ تھا بلکہ اس لیے کہ ان کے ضمیر نے ان کو مجبور کیا۔ اس کے برخلاف ہم شخصی حکومت پر راضی رہے، اگرچہ وہ استبدادی تھی اور ایسی حکومت کی قرآن میں اجازت نہیں ہے۔ اور اگر اس نظام کی مخالفت کی گئی تو انفرادی طور پر۔ امام غزالیؒ نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ بادشاہوں، درباریوں اور سرکاری ملازموں سے الگ رہیں، اس لیے کہ ان سے میل جول رکھنا دین کے لیے خطرناک ہے اور اچھے مسلمان اس مشورے پر عمل کرتے رہے ہیں۔ بے شک اگر مسلمان قرآن کی ہدایت پر عمل کرتے اور "قوامین بالقسط" بننے کی کوشش کرتے تو بہت خون خرابا ہوتا اور تکلیفیں پہنچتیں، لیکن مغربی قوموں نے خون بہائے اور مصیبتیں اٹھائے بغیر سیاسی آزادی اور قانونی مساوات حاصل نہیں کی۔ مسلمانوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا اس لئے کہ فقہی دلیلیں ان کے لیے زنجیریں بن گئی تھیں، جنھیں توڑنے کی طاقت ان کے ضمیر نے اپنے اندر پیدا نہیں کی۔ قرآن میں یہ ہدایت کہ مسلمانوں کی حکومت جمہوری ہونا چاہئے، اتنی واضح نہیں تھی کہ شخصی حکومتیں عالموں سے اپنے مطلب کی بات نہ کہلوا سکیں، لیکن یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ حاکم کو زکواۃ بیت المال میں جمع کرکے حاجت مندوں کی مدد کرنا چاہئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان قبیلوں کو زکواۃ ادا کرنے پر مجبور کیا جو اسے ادا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے مسلمان حاجت مندوں کے ساتھ غیر مسلم حاجت مندوں کی بھی مدد کرکے سبق آموز مثالیں قائم کیں، اس کے بعد صرف خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مثال ملتی ہے، جنھوں نے زکواۃ سے حاجت مندوں کی حاجت پوری کی، لیکن ان کی حکومت صرف دو سال قائم رہی اور اس کے بعد سے زکواۃ کو سرکاری طور پر محتاجوں کی مدد اور رفاہ عام کے کاموں کے لئے استعمال کرنے کی رسم اٹھ گئی، یہ اور بات

ہے کہ بعض مالدار اور پرہیزگار لوگ کارِخیر میں دولت صرف کرتے رہے۔ آج کل جو ویلفیر اسٹیٹ قائم ہوئی ہے، اس پر مسلمانوں کے سماجی تصورات یا ان کے ضمیر کا کوئی احسان نہیں ہے اور یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ پہلے دو نوں خلفاء کو چھوڑ کر مسلمانوں کا قائم کیا ہوا کوئی سیاسی نظام اسلام کے نصب العین کے اتنا قریب نہیں ہے جتنی آج کل کی ویلفیر اسٹیٹ۔

عیسائیوں میں مذہبی اختلافات کی بنا پر قرونِ وسطیٰ میں اور عصرِ جدید کے شروع تک سزائیں دی جاتی تھیں، ایسی مثالیں مسلمانوں کے یہاں بھی ملیں گی، پھر بھی غلط عقیدہ رکھنے والوں کو زندہ جلا دینے کا جو رواج عیسائیوں میں تھا اس کی مثال مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ملتی، لیکن جہاں ہم عیسائیوں کے اس عیب کا ذکر کریں وہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ عیسائی راہبوں کے جو سلسلے تھے انھوں نے خدمت کے بڑے نمایاں کام کئے اور یہ کام مختلف شکلوں میں ہمارے زمانے تک جاری ہیں مسلمانوں میں کارِخیر کے جو طریقے رائج تھے، ان میں اس بے لوث خدمت کا جواب نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیساؤں کے تسلط کے خلاف بغاوت ہوئی جو بظاہر علمی لیکن بنیادی طور پر دینی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قیمت پر علم حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور اب جو ہم علمی اور صنعتی ترقی دیکھتے ہیں، وہ اسی کا سلسلہ ہے۔ مسلمانوں میں کوئی کلیسا نہیں تھا، صرف علماء اور حاکموں کا ایک اتحاد ملتا ہے، جس کی بدولت شیخ بوعلی سینا اور استاد البیرونی جیسے فلسفیوں، عالموں اور سائنسدانوں کو مسلسل جان کا خطرہ رہا، ایسے لوگ اطمینان سے زندگی گذار سکتے اور ان ہی کے ساتھ ایسے سیکڑوں آدمی بھی جو علم کی ترقی میں اپنی جان کھپانے پر تیار تھے، اگر مسلمانوں کا ضمیر علماء کی رائے سے مرعوب نہ ہوتا اور علمی تحقیق کے شوق کو خیرباد نہ کہتا۔ ضمیر نے اس طرح ہتھیار ڈال دئے کہ دنیاوی علوم کے ساتھ دینی علوم کو بھی نقصان پہنچا۔ اگر آپ دیکھیں کہ پچھلے دو سو برس میں مستشرقوں کے مقابلے میں مسلمانوں نے اسلام کو سمجھنے، سمجھانے اور مختلف مسائل کے بارے تحقیق کرنے کے لئے کتنا کچھ کیا ہے تو ہنسی آتی ہے۔ مستشرق ہمارے عقائد کا احترام نہیں

کرتے اور کبھی کبھی ان کا تعصب صاف نظر آتا ہے لیکن ہمارے مقابلے میں انھوں نے ہمارے دینی ماخذوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کی مذمت کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم نے اپنا علمی فرض ادا کر دیا ہے۔

اگر تاریخ عالم سے یہ ثابت ہے کہ غیر مسلم اسلامی اصولوں کو عمل میں لا سکتے ہیں تو ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہمیں اپنے ضمیر کو گواہ اور رہنا بنا کر موجودہ سیاسی اور سماجی حالات میں کیا کرنا چاہیئے۔

نیشنلسٹ مسلمان اس کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ اپنے اس عقیدے کے لئے شرعی سندیں فراہم کریں کہ مسلمان ہندوستانی قوم کا جزو لاینفک ہیں۔ ان کی کوئی سند نہیں ہے، افراد، تصورات اور تحریکوں کے بارے میں غیر جانبدار اور علمی رائے صرف ایک روشن اور حساس ضمیر کی بدولت قائم ہو سکتی ہے۔ اگر مسلمانوں میں انفرادی ضمیر کو وہ حیثیت دی گئی ہوتی جو اس کا حق ہے تو نیشنلسٹ مسلمانوں کے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ عالم کی سند کافی ہوتی۔ مسلمان یہ کہہ سکتے کہ غیر مسلموں میں صرف اس کا مادہ نہیں ہے کہ وہ مساوات اور عدل کے اسلامی اصولوں کو عمل میں لائیں۔ بلکہ وہ انھیں واقعی عمل میں لا چکے ہیں اور یہ ہر مسلمان کا فرض اولین ہے کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ آزادی حاصل کرنے اور ایک جمہوری ویلفیر اسٹیٹ قائم کرنے میں غیر مسلم شہریوں کا ساتھ دیں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ شرعی اسناد کی تلاش میں ان لوگوں کو جو بنیادی طور پر خود غرض تھے اس کا موقع مل گیا کہ وہ ایک اسلامی نظام حکومت کے خیال کی تبلیغ کریں۔ وہ کہتے یہ تھے کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور مطلب یہ تھا کہ مسلمان الگ قسم کے انسان ہیں اور ان کی اخلاقی اور سماجی ذمہ داریاں ہیں جنھیں پورا کرنے میں غیر مسلم شریک نہیں کئے جا سکتے۔ مسلمانوں کی ریاستیں تاریخ میں اور ہمارے زمانے میں ملتی ہیں، اسلامی نظام حکومت یا اسلامی ریاست ہندوستانی مسلمانوں کی ایک ذہنی اختراع ہے۔ مسلمان بادشاہ یہ ظاہر کرنے کی ہر طرح سے کوشش کرتے رہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خادم ہیں اور عام طور سے اس کا طریقہ

یہ تھا کہ وہ مذہبی تعصب کے مظاہرے یا غیر مسلموں کے خلاف جنگ کرتے۔ "ہدایہ" میں جو عربی مدارس کے نصاب تعلیم کی ایک متداول کتاب ہے، غیر مسلموں کے خلاف ہر جنگ کو جہاد قرار دیا گیا ہے اور اس طرح کا جہاد کرکے مال غنیمت اور ثواب دونوں حاصل کئے جا سکتے تھے لیکن کوئی مسلمان بادشاہ اس کی جرأت نہ کرتا کہ اپنے سیاسی اور انتظامی عمل کو اسلام کی تعلیمات کو معیار قرار دے کر جانچے، اس لئے کہ اس طرح اس کی غیر ذمہ دار استبدادی حکومت کے عیب فوراً ظاہر ہو جاتے۔

لیکن وہ اسلامی حکومت جس کے خواب ہندوستانی مسلمان دیکھ رہے تھے، وہ عیبوں سے پاک مسلمانوں کی ایک ریاست نہیں تھی، وہ سمجھتے تھے کہ خدا کے اختیار کامل کو کسی طرح سے محدود اور مشروط نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کوئی عہدہ دار یا کوئی جماعت یا مجموعی طور پر ملت اسلامی فرماں روا نہیں ہو سکتی تھی، ایسا کوئی قانون نہ بنایا جا سکتا، جس کے بارے میں علماء کی یہ متفق رائے نہ ہو کہ نہ قرآن کی ہدایت کے مطابق ہے یا اس کی دوسری کسی ہدایت کی خلاف ورزی نہ ہوگی۔ ایک عالم جو دینی اور دنیاوی معاملات میں امام بننے کا حوصلہ رکھتے ہیں، انھوں نے تو یہ حکم بھی لگا دیا کہ صرف وہ لوگ قانون ساز منتخب ہو سکیں گے اور عہدوں پر مامور کئے جا سکیں گے، جن کی دینداری ثابت ہو، ریاست اور اس کے منصب کے بارے میں ایسے تصورات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن اور ضمیر کے، اس زمانے میں بھی جب حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی، سیاسی اور سماجی معاملات سے الگ رہنے کے کیسے مہلک نتیجے نکلے ہیں۔ اس زمانے میں بادشاہ کی اطاعت اور شخصی طور پر اس سے وفاداری کی جا سکتی تھی، لیکن ریاست کی اجتماعی حیثیت سے وفاداری برتنے اور اس کے ہر مقصد کو اپنا مقصد سمجھنے کا کوئی سوال نہ تھا، ہر ایک کو اپنی فکر تھی اور ریاست کی فکر کرنا خدا پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

مگر یہ رویہ صرف مسلمانوں کا نہیں تھا، بلکہ ہندوستان والوں کا شروع سے یہی رویہ رہا ہے، ہماری قومی تحریک نے ہم کو برطانوی حکومت کی مخالفت میں متحد کر دیا، آزادی

حاصل کرنے کے بعد سے یہ رفتہ رفتہ بہت خطرناک طور پر واضح ہوتا گیا ہے کہ ریاست اور عام مفاد سے شخصی اور غیر مشروط لگاؤ کی کتنی کمی ہے۔ انفرادی ضمیر کو بروئے کار نہیں لایا گیا ہے کہ وہ ہمارے عمل کو قابو میں رکھے اور سماجی اور شہری طرز عمل کے معیاری نمونے قائم کرے۔ عام میلان یہ ہے کہ خود کچھ نہ کیا جائے اور دوسروں سے توقع کی جائے کہ جو کچھ کرنا چاہئے، وہ کریں۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو مشورہ دوں کہ انھیں کیا کرنا چاہئے، مجھے ایک بہت بڑے اور پیچیدہ مسئلے کے صرف ایک پہلو سے اس وقت بحث ہے اور وہ ہے مسلمان کے ضمیر کا مقام۔ مجھے یہ مسئلہ بہت اہم معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ مسلمان کا ضمیر ہی اس کو اس فرض سے آگاہ کر سکتا ہے کہ اپنی عقل، اپنی ہمت، اور اپنے ارادے سے کام لے اور اس کے دل میں یہ یقین پیدا کر سکتا ہے کہ خدا کی مرضی بھی یہی ہے۔

میں امام یا مذہبی رہنما کے بارے میں جو کچھ کہہ چکا ہوں، اسے یہاں دہرانا نہیں چاہتا، رہنما کی تلاش ہم اپنے ضمیر کے حکم سے نہیں بلکہ اپنی کمزوری کی وجہ سے کرتے ہیں۔ ملت اسلامی کے اتحاد اور یکجہتی کا مسئلہ دوسری نوعیت کا ہے۔ ہم کو مختلف موقعوں پر مختلف طریقوں سے معلوم ہو گیا ہے کہ فرقہ واری اعتبار سے ملک کی جو اکثریت ہے، اس میں ایک جماعت ہے، (جس کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا) جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں بہت کامیاب ہوتی ہے، جو مسلمانوں سے غیریت برتتی رہے گی جب تک کہ مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی جماعت کی سی رہے گی جس کے اپنے عقیدے، اپنا طرز زندگی اور اپنے معاشی مقاصد ہیں، ہمیں ایسے لوگوں کی وجہ سے ایک جماعت بنے رہنے کا خیال کسی طرح چھوڑ نہیں دینا چاہئے، لیکن جیسے کہ میں کہہ چکا ہوں کہ تقلید کے جو معنی ہم نے سمجھے ہیں اور جن کے صحیح ہونے پر صدیوں سے اصرار کرتے رہے ہیں، ہماری روحانی اور ذہنی آزادی کی بنیادیں کمزور کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلعم اور پہلے دو خلفائے راشدین کے

بعد تمام مسلمان دینی اعتبار سے متحد رہے ہیں، سوائے اس کے کہ ہم اتحاد کے معنی یہ سمجھیں کہ اکثریت، خواہ وہ حنفیوں کی ہو یا شافعیوں کی یا شیعوں کی، حاوی رہی ہے اور اسلامی دینی اتحاد کا مطلب یہی ہے۔ آج کل کے حالات میں یہ تقریباً ناممکن ہے کہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا ایک دینی اور سیاسی محاذ ہو، غالباً ہم اپنی تمام قوت کو یکجا کرنے کے معاملے کو اپنی فلاح کا واحد ذریعہ نہ مانتے اگر ہمیں ہر مسلمان کے ضمیر کی سلامت روی پر اتنا بھروسہ ہوتا کہ اپنی طاقت کو منتشر کر دیں اور یہ سمجھیں کہ ہر شخص اور ہر چھوٹی بڑی جماعت اپنے ضمیر پر بھروسہ کر کے صداقت، عدل اور فیاضی کا حق ادا کر سکے گی۔ ملت کے ایسے نظام کا تصور کہ جس کا اولین اور بنیادی مقصد یہ ہو کہ اپنے مفاد کی تدبیر کرے، ملت کے ہر فرد کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے اور غیر کے فرق پر اصرار کرے اور ہندوستان کی تمام مذہبی جماعتیں یہی کر رہی ہیں، اگرچہ کھلا الزام صرف مسلمانوں پر لگایا جاتا ہے۔ اگر اسلام کا منصب صرف انسانوں کو متحد کرنا ہے اور ان میں تفریق پیدا کرنا نہیں ہے، تو ہمیں ہر مسلمان کو آزاد چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق طے کرے کہ مسلم اور غیر مسلم کا فرق قائم رکھنا کس حد تک ضروری یا مناسب ہے اور ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ مسلمان کا ضمیر ہی یہ طے کر سکتا ہے کہ وہ اسلام کے روحانی، اخلاقی اور سماجی مقاصد کی خدمت کس طرح کر سکتا ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ملت کے تصور کو ذہن نشین کرنے کے لیے جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے باوجود اسلام دراصل انفرادی مذہب ہے۔ اسلام نے کوئی کلیسا نہیں قائم کیا، ہر مسلمان خدا کے سامنے بلا واسطہ ذمہ دار ہے اور اس ذمہ داری میں کوئی اور شریک نہیں، مردوں اور عورتوں کے مذہبی فرائض ایک سے ہیں اور دونوں سے ایک ہی طریقے سے جواب طلب کیا جائے گا، ملکیت چاہے وہ امانت سمجھی جائے، ایک شخص کے قبضے میں رہتی ہے اور نکاح کی وجہ سے عورت کے حق ملکیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسلام کا اصل منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملت کا ہر فرد اپنے ارادے سے ملت کو قائم رکھے، یہ نہیں کہ ملت ہر فرد کے ارادے کو سلب کر لے۔

میری نظر میں بعض معاملے ہیں، جن میں ایک ملی محاذ قائم کرنے کی کوشش بیجا طور پر کی گئی ہے اور جن میں ہم نے اپنی عقل اور ضمیر سے کام لینے کے بجائے دینیات کی کتابوں پر بھروسہ کیا۔

جب مرکزی اسمبلی میں شاردا ابل پر بحث ہو رہی تھی تو وہ مسلمان جو جانتے تھے کہ مسلمانوں میں بچپن کی شادیوں کا رواج ہے اور اس سے مضر نتیجے نکلتے ہیں، یا تو خاموش رہے یا مسلمانوں کی عام رائے سے دب کر انھوں نے اس تحریک کی تائید کی کہ مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ اس کے لئے سب سے اہم دلیل یہ تھی کہ ایسی اسمبلی جس کے اکثر رکن غیر مسلم ہوں، اس کا حق نہیں رکھتی کہ شرعی معاملات میں مسلمانوں کے لیے قاعدے اور قانون بنائے۔ میرے خیال میں دینیات کے اعتبار سے بھی صحیح طریقہ یہ ہوتا کہ بل کی اس بنا پر مخالفت کی جائے کہ نکاح کے لیے کم سے کم جو عمر تجویز کی گئی ہے، وہ بہت کم ہے اور چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے، اس لیے وہ نابالغ کی مرضی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اگر نکاح کے لیے جائز عمر بڑھائی نہیں جا سکتی تو لڑکی کو یہ حق ہونا چاہیئے کہ بالغ ہونے کے بعد وہ نکاح کے معاہدے کو منسوخ کرا سکے۔ یہ دلیل کہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کے شرعی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیئے، بہت کمزور تھی، اس لیے کہ لڑکیوں کے حق وراثت کے بارے میں عدالتوں میں فیصلے ہو چکے تھے، جو شریعت کے خلاف تھے اور قانون تعزیرات اور دوسرے قوانین میں جو برطانوی حکومت نے نافذ کئے تھے، شریعت کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے جس طرح سے شاردا ابل کی مخالفت کی، اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ دوسروں کی نظر میں ان کی عزت کم ہو گئی۔

اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے نکاح کو ایک روحانی اور دائمی تعلق کے بجائے ایک قانونی معاہدے کی شکل دی۔ اب مسلمان بجائے اس کے کہ اصرار کریں کہ نکاح کے بارے میں ان کا تصور جو اخلاقی اور سماجی اعتبار سے زیادہ صحیح ہے، عام طور پر صحیح تسلیم کیا جائے، رفتہ رفتہ اپنے رویہ سے اپنے اوپر یہ الزام اوڑھ رہے ہیں کہ وہ یک نوعگی کے مخالف ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ عقل سلیم رکھنے والے مسلمان اور خاص طور سے وکیل لیے

معاہدے مرتب کریں کہ جن سے عملی طور پر عورتوں کو اُن کے جائز اور پورے حقوق مل سکیں ۔ لیکن اس کے برخلاف یہ کہا جارہا ہے کہ اس معاملہ میں صرف علمار کی متفقہ رائے ہی سند ہوسکتی ہے، اگرچہ اس کا بھی یقین ہے کہ علما متفق نہ ہوں گے، چاہے ان سب کو ایک جگہ جمع بھی کردیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس خیال کی تصدیق کردیں گے، جو ویسے بھی پھیل رہا ہے، کہ مسلمان چاہے انفرادی طور پر بہت معقول ہوں، مگر اجتماعی طور پر ان کا ذہن اور ان کی اخلاقی حس دینیات کے ایک ایسے نظام میں گرفتار ہے، جس میں کوئی تبدیلی کوئی حرکت ممکن نہیں۔

یہاں پھر وہی سوال آتا ہے جو میں پہلے اٹھا چکا ہوں کہ اسلام کے بارے میں ہمارا تصور کیا ہے؟ کیا وہ ایک جامد چیز ہے یا اس میں نشو ونما کا امکان بھی ہے؟ اسلام حکم الٰہی کی اطاعت ہے، خدا کے جو احکامات نازل ہوئے، قرآن میں موجود ہیں، لیکن قرآن کے ذریعہ نازل ہونے سے پہلے اور اس کے نزول کے بعد جو کچھ تھا اور جو کچھ ہوا، وہ بھی خدا کے حکم سے ہوا اور ہم سے کہا گیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اسے مشیئت ایزدی کہیں ۔ ہم واقعات کو نظر انداز نہیں کرسکتے، خود قرآن میں ایسے واقعات کا ذکر ہے، جو پہلے ہوچکے تھے اور ان کا بھی جو اس زمانے میں ہوئے ۔ قرآن کے نزول کے بعد جو کچھ ہوا، اس کے لیے یا جو کچھ ہوا، اس کے باوجود اگر ہم معاملات کو سمجھنے کے لیے قرآن ہی سے ہدایت حاصل کرنا چاہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کے نزول کے بعد جو کچھ ہوا، اسے کالعدم سمجھنا چاہیئے۔ اگر اسے کالعدم سمجھنا ہے تو اس کے لیے کوئی واضح سند چاہیئے اور مجھے کوئی سند نہیں ملی۔ معتزلہ کی رائے تھی کہ قرآن مخلوق ہے ۔ ان کی اس رائے کو صحیح نہیں مانا گیا، شاید اس پر جس طرح غور کرنا چاہیئے غور بھی نہیں کیا گیا اور اس کا دینی سے زیادہ سیاسی تھا۔ اس کے برخلاف وہ رائے مانی گئی جو اس وقت راسخ العقیدہ لوگوں کی ہے۔ قرآن مخلوق نہیں ایک دائمی حقیقت ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر ہم اسے دائمی حقیقت مان لیں تو رہنمائی کے لیے ہم براہ راست قرآن تک نہیں پہنچ سکتے، بلکہ تشریحوں اور تفسیروں اور ان مسائل میں جن کا تعلق الفاظ کے اصل معانی سے ہے، الجھ جاتے ہیں، ایمان اور عمل کے

اعتبار سے اسلام کی تکمیل رسول صلعم کی زندگی میں ہو گئی، لیکن خود فقہ کی تدوین سے ثابت ہے کہ اس کے بعد بھی بہت سے سوال تھے جو اس وجہ سے اٹھے کہ حالات بدل گئے تھے اور ان سوالوں کا جواب دینا ضروری تھا۔ بعد میں تقلید کا اصول مان لیا گیا، اس کا سبب کچھ بھی رہا ہو، لیکن اس کی وجہ سے اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا حکم کیا ہے اور جو واقعات ہو رہے تھے، ان کے مشاہدے سے کیا نتیجے نکلتے ہیں، خود حالات اور واقعات پر غور نہیں کیا گیا، بلکہ پہلے کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھی جاتی رہیں۔ صوفیوں نے مسلمانوں کے ذہن کو تقلید کے تنگ دائرے سے نکال کر بڑی خدمت انجام دی، لیکن انھوں نے اگر ایک طرف یہ کہا کہ خدا اور انسان کا تعلق براہ راست ہے تو دوسری طرف شیخ کو ایک وسیلہ بھی قرار دیا اور اس طرح بھی ایک پابندی لگ گئی۔ تصوف کی ایک اعلیٰ شکل واردات قلبی اور وجد کی کیفیتوں میں نظر آتی ہے۔ اس کی معمولی شکل سے بس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ واقعات کی دنیا سے پناہ لینا اور واقعات میں خدا کی مرضی جس طرح سے ظاہر ہوتی تھی اسے سمجھنے کی ذمہ داری سے بھاگنا چاہتے تھے، پھر بھی تصوف مسلمان کے ضمیر کے اثبات خودی کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔

اس سوال کا ابھی کوئی جواب نہیں ملا ہے کہ ہم خدا کے حکم کی تعمیل کیسے کر سکتے ہیں، جب تک کہ ہم کو یہ نہ معلوم ہو کہ زندگی اور زمانے کے حالات میں اس کی مرضی کس طرح ظاہر ہو رہی ہے۔ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے، وہ ہمارے مقدر کا نتیجہ ہے۔ علم کامل خدا کو ہے، ہم کو حاصل نہیں ہے، خدا کے علم اور کامل اختیار پر قرآن میں بار بار زور دیا گیا ہے، لیکن انسان کو اپنے عقیدے اور عمل کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ ہم یہ سمجھ کر کہ جو کچھ ہونے والا ہے خدا کے حکم سے ہے، ایسے عمل سے پرہیز نہیں کر سکتے جو عقل یعنی انسانی عقل کو ضروری اور مفید معلوم ہوتا ہو۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم سمجھیں کہ کامل علم اور کامل اختیار کی صفات سے مطلب کیا ہے، ایمان لانا کیوں ضروری ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور عمل صالح اور عدل کے قیام کے ذریعہ خدا کی اطاعت کرنا کیوں ضروری ہے۔ اطاعت خلا میں نہیں کی جا سکتی، اسی عمل کی دنیا میں کی جا سکتی ہے اور

ایسے ہی افراد کے ذریعہ کی جا سکتی ہے جو حساس ہوں اور عاقل ہوں، جو اس کوشش میں لگے ہوں
کہ ان کا ذہن زیادہ وسیع ہو جائے اور جنھیں ان کا ضمیر مجبور کرتا ہو کہ وہ حق اور عدل کو اپنی زندگی
کا نصب العین بنائیں۔ دین اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم اس دنیا اور اس کے معاملات میں برابر
مصروف رہیں تاکہ وہ مقصد حاصل ہو سکے جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ ایسے ہی دین کو نمو پذیر
کہیں گے۔ مسلمان مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتا، کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ جتنا کر لیا ہے وہ کافی ہے، مسلمان کو ہمیشہ
خود اسے اور دوسروں کو برابر یاد دلاتے رہنا چاہیئے کہ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ

(سورۃ الانبیاء (۲۱) آیت ۱)

وقت قریب آلگا کہ لوگوں سے حساب لیا جائے اس پر بھی ان کا یہ حال ہے کہ رُخ پھیرے غفلت میں متوالے چلے جا رہے ہیں۔

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

ڈاکٹر سید عابد حسین

مردِ مومن، مردِ حق

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اپنے سہ ماہی مجلّہ "اسلام اور عصرِ جدید" میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے انتقال کے موقع پر ایک مضمون لکھا تھا مگر چونکہ اس کے آخری حصّے میں دس بارہ سال کی داستان حد سے زیادہ اختصار سے بیان کی گئی تھی، بہت سے پڑھنے والوں کو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، اب موصوف نے اُس حصّے کو کسی قدر پھیلا کر لکھا ہے۔ ہم اس مضمون کو اس اضافے کے ساتھ "جامعہ" میں شائع کر رہے ہیں ——— مدیر

اقبالؔ نے عصرِ جدید کے مثالی مسلمان کا جو تصوّر "مردِ مومن" کے نام سے اپنے کلام میں اور گاندھی جی نے مردِ حق کا جو نمونہ اپنی زندگی میں پیش کیا ہے ان دونوں کی جیتی جاگتی شبیہ مجھے اور میری طرح اور بہت سے لوگوں کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت میں نظر آتی تھی۔ گزشتہ سال ۳ مئی کو سنیچر کے دن یہ محبوب صورت ہماری آنکھوں سے چھُپ گئی مگر ہمارے مغموم دلوں پر اپنا اَن مِٹ نقش چھوڑ گئی۔

ذاکر صاحب ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے طوفانی دور میں پلے اور بڑھے۔ اِس طوفان و ہیجان کے زمانے میں جہاں بحرِ زندگی کی سطح پر ساحل سے ٹکر لینے والی تُند و پُرشور موجیں اُبھریں، وہاں قعرِ دریا میں اُن موتیوں نے بھی پرورش پائی جن میں بقول غالبؔ دریا کا اضطراب محو ہو گیا تھا۔ ایسا ایک موتی جس کے سکون میں طوفانوں کی خاموش قوت چھُپی ہوئی تھی نوجوان ذاکر حسین تھا جو ۱۹۲۰ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے ایم۔ اے فائنل میں پڑھ رہا تھا۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کے ارتقا کی کہانی ۱۹۲۰ء سے شروع کرنے کی دو وجہیں

ہیں۔ اوّل تو یہ کہ یہ سال ان کی عمر کا نہایت نازک اور اہم موڑ تھا جہاں سے اُن کی ایک نئی زندگی شروع ہوئی اور ان کی شخصیت کی ایک نئی شان نظر آئی۔ اسی زندگی اور اسی شخصیت کا مجھے ذکر کرنا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی سال میری ملاقات اُن سے ہوئی اور دوستی اور رفاقت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو نصف صدی تک جاری رہنے کے بعد آج سے ایک سال پہلے ختم ہوگیا، اور میری زندگی میں ایک اُداس، سنسان خلا چھوڑ گیا۔ اس سارے عرصے میں ان کی نشوونما کا حال میں قریب قریب شاہدِ عینی کی حیثیت سے بیان کر سکتا ہوں۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب میں میور سنٹرل کالج الٰہ آباد سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انگریزی ادب میں ایم۔ اے کرنے کے لئے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخل ہوا تو سارا کالج ذاکر حسین کی شہرت سے گونج رہا تھا۔ وہ ایم۔ اے معاشیات کے دوسرے سال کے طالب علم بھی تھے اور شعبۂ معاشیات میں جونیر لکچرر بھی۔ مجھے اگر پہلی ملاقات میں نہیں تو دو چار ملاقاتوں میں اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ میں نے ان کی غیر معمولی ذہنی اور اخلاقی صفات اور دلکش شخصیت کے بارے میں جو افسانوی روایتیں سُنی تھیں وہ بڑی حد تک صحیح تھیں۔ مجھے اُن کی ذہانت میں ایک طرف ادراک و وجدان کا اور دوسری طرف تفکر و تخیل کا ایک ایسا مرکب نظر آیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ اُن سے گفتگو کریں تو وہ چشم زدن میں بات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ اُبھر کر سطح پر آتے تھے۔ وہ خود کسی مسئلے پر غور کریں تو اُن کی قوتِ فیصلہ بجلی کی طرح کوند کر صحیح حل کے مرکزی نقطے کو روشن کر دیتی تھی۔ پھر اس کی ضو رفتہ رفتہ پورے دائرے میں پھیلتی تھی۔ ان کی تقریر میں بھی یہ خصوصیت تھی کہ پہلے سیدھی دل میں اُتر جاتی تھی اور پھر استدلال کے ذریعے دماغ کو قائل کرتی تھی۔ ان کی شخصیت میں بڑی دلکشی تھی مگر یہ دلکشی اس وقت تک ہمہ گیر نہ تھی۔ جو لوگ ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے اُن کے ہم جنس اور

ہم رنگ تھے وہ بے اختیار اُن کی طرف کھنچتے تھے مگر ناجنس ان سے بہت گھبراتے اور ڈرتے تھے۔ بڑے بڑے زبردست حریفوں کو جب بحث و مباحثے میں ان سے پالا پڑتا تو اُن کے چبھتے ہوئے طنز و مزاح اور بے پناہ قوتِ مناظرہ کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہو جاتا۔ سرسری نظر سے دیکھنے والے کو ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک خوش باش، لااُبالی مزاج رکھتے ہیں۔ زندگی ان کے لئے کوئی گہرا وزنی، سنجیدہ مقصد نہیں بلکہ ایک ہلکا پھلکا دلچسپ مشغلہ ہے۔

مگر چند ہی روز بعد ذاکر صاحب کی شخصیت کا ایک نیا پہلو جو اب تک دبا اور چھپا ہوا تھا اُبھر کر نظروں کے سامنے آیا اور معلوم ہوا کہ اس بظاہر بے تہہ، بے پروا نوجوان کے سینے میں ایک پُرخلوص، پُرسوز اور پرجوش دل ہے اور اس دل میں محکم ایمان، اٹل ارادہ اور اتھاہ ہمت و حوصلہ ہے۔

شروع اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد نے علی گڑھ کے طالب علموں کو جنگِ آزادی میں حصہ لینے کی دعوت دی تو لبیک کہنے والوں کے سرگروہ ذاکر صاحب تھے۔ یہ منچلے معلم اور طالب علم سرکاری امدادی کالج کو خیرباد کہہ کر ایک آزاد تعلیم گاہ میں داخل ہو گئے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم کی گئی اور ہندوستانی مسلمانوں میں قومی تحریک کی ہراول بن گئی۔

اپنے دوست اور رفیقِ کار خواجہ عبدالحمید کے اصرار سے ذاکر صاحب اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی پہنچے جہاں میں پہلے سے برلن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور مجیب صاحب آکسفورڈ سے بی۔ اے آنرز کی ڈگری لینے کے بعد فنِ طباعت میں مہارت حاصل کر رہے تھے۔ برلن میں تین سال سے کچھ اوپر قیام کے دوران میں ذاکر صاحب کو وہ سازگار ماحول ملا جس میں نئی صلاحیتوں کے اُبھرنے اور نئی قدروں کے نشو و نما پانے سے ان کی شخصیت میں بڑی وسعت، گہرائی اور پختگی پیدا ہو گئی۔ شعر و ادب سے انھیں پہلے ہی سے لگاؤ تھا۔ یہاں رہ کر فنونِ لطیفہ، موسیقی، مصوری، ڈراما اور فنِ تعمیر کا ذوق پیدا ہوا اور پروان

پڑھا۔ یونیورسٹی میں ان کا میدان مطالعہ معاشیات تھا، لیکن اپنے خاص مضمون سے کہیں زیادہ دلچسپی وہ علم تعلیم اور فن تعلیم سے رکھتے تھے۔ انھیں میرے استاد پروفیسر (پیڈاگوگ) ڈاکٹر اشپرانگر سے جو فلسفۂ تعلیم کے جیّد عالم سمجھے جاتے تھے، گہری عقیدت تھی، بڑے شوق سے اُن کے لکچر سنتے تھے اور ان کی کتابیں پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ جرمنی کے مختلف حصّوں میں جو مدرسے تعلیم کے جدید ترین تصورات اور طریقوں کا تجربہ کرتے تھے انھیں وہاں جاکر غور و تحقیق کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تعطیل کے زمانے میں انھوں نے جرمنی کے مختلف علاقوں کے علاوہ انگلستان، فرانس، ڈنمارک، ناروے اور سویڈن کا سفر بھی کیا اور مغربی تہذیب کے مادّی، ذہنی اور روحانی مظاہر کو مختلف صورتوں میں دیکھا اور سمجھا۔ اپنے ذہن کو مغربی علم و عقل کی روشنی سے منوّر کرنے کے باوجود انھوں نے اپنے دل میں نورِ ایمان کی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔

ہندوستان واپس آکر ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ کی قیادت کی باگ سنبھالی اور چند سال کے اندر اُسے قومی تعلیم کی ایک خانقاہ بنا دیا جہاں وہ اور اُن کے رفیق گاندھی جی کے فیضان سے نئے زمانے کے سادھوؤں کی طرح صاف ستھری فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے اور بچوں اور نوجوانوں کو خدا پرستی، انسان دوستی اور وطن پروری کی تعلیم دیتے تھے۔ اگلے تیئس ۲۳ سال میں ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ کے اندر تعلیم کو جس اصول کے مطابق چلایا وہ کام کے ذریعے سیکھنے "کا اصول تھا۔ "کام" کا تصور ان کے یہاں محض ذہنی نہیں بلکہ بڑی حد تک روحانی تھا۔ اس کا ذہنی عنصر انھوں نے جدید مغربی ماہرین تعلیم خصوصاً کیرشن اشٹائنر سے لیا تھا اور روحانی عنصر مہاتما گاندھی سے اور ان دونوں کے امتزاج سے خود اپنے نظریۂ تعلیم کی تشکیل کی تھی۔ اسی نظریے کے سانچے میں انھوں نے بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم ڈھالی تھی جو ذاکر حسین اسکیم کے نام سے مشہور ہوئی۔

اگر ہم اس نظریے کو چند لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم نام

ہے کسی قوم کی روحانی اور تہذیبی قدروں کو اُس کی نئی نسل تک اس طرح پہنچانے کا کہ وہ اس کی زندگی کا جز بن جائیں۔ یہ قدریں مجسّم شکل میں قوم کی تہذیبی میراث کے مختلف شعبوں میں موجود ہوتی ہیں جیسے مذہب، اخلاق، علم، آرٹ وغیرہ۔ معلّم کا کام یہ ہے کہ ان قدروں کو پہلے خود اپنائے اور پھر اپنے شاگرد بچّوں اور نوجوانوں کو ان کے حاصل کرنے میں مدد دے۔ قدروں کے حصول کا مؤثر ذریعہ صرف "کام" ہے یعنی مذہب صرف مذہبی عمل سے، اخلاق صرف اخلاقی برتاؤ سے، علم صرف علمی تجربے سے اور آرٹ صرف آرٹ کی مشق سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر ذاکر صاحب نے جامعہ کو ایک نمونے کے "کام" کا مدرسہ بنا دیا تھا جہاں کتابی درس کم سے کم ہوتا تھا اور تعلیمی قدر و قیمت کی حامل عملی سرگرمیاں زیادہ سے زیادہ دکھائی دیتی تھیں۔ کام — مفید منظم ماہرانہ کام — ذاکر صاحب کے نزدیک صرف تعلیم و تعلّم کا آلہ ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ بلند و برتر شے ہے۔ اسی سے انسان زندگی کا لطف اٹھا سکتا ہے، اسی سے بحیثیت فرد کے اور بحیثیت سماج کے رکن کے اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل کر سکتا ہے اور اسی سے نجات روحانی اور معرفتِ الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔

ہمیں اس فلسفۂ زندگی کی طرف جو ذاکر صاحب بحیثیت معلّم کے رکھتے تھے اس وجہ سے اشارہ کرنا پڑا کہ وہ اپنے کام اور اپنی ذات کو ایک سمجھتے تھے اس لئے ان کی زندگی بحیثیت انسان کے بامعنی طور پر صرف اسی فکر و نظر کے پس منظر میں دکھائی جاسکتی ہے جو بحیثیت معلّم کے ان کی خصوصیت تھی۔ ذاکر صاحب کی شخصیت میں جو وسعت اور رنگا رنگی یورپ کے قیام سے پیدا ہوئی تھی اس کو وحدت اور ہم آہنگی اس ریاضت سے نصیب ہوئی جو انھوں نے جامعہ کی تعلیمی خانقاہ کے مرشد کی حیثیت سے کی تھی۔ مختلف انسانوں کی وضعِ نفسی کے اس نقشے کے مطابق جو ایڈوارڈ اشپرانگر نے ترتیب دیا ہے ذاکر صاحب ایک "سماجی انسان" بن گئے یعنی ایک ایسے شخص جن کے وضعِ نفسی

میں غالب رجحان خلقِ خدا کی خدمت اور محبت کا ہو۔ اگرچہ ان کی شخصیت کے مرقع میں مذہبی عقیدت، فکر و نظر، ذوقِ جمال کے گہرے رنگ موجود تھے لیکن اس کی ساری زمین انسان دوستی کے رنگ میں رچی ہوئی تھی۔ اس کی دو بڑی علامتیں یہ تھیں، ایک یہ کہ ان کے لئے انسان سے خواہ وہ فرد کی شکل میں ہو یا جماعت کی شکل میں، محبت اور اس کی خدمت کرنا محض اخلاقی یا مذہبی فرض نہ تھا جس کے لئے شعور اور ارادے کی ضرورت ہو بلکہ ان کی فطرت کا قانون تھا جو بلا شعور اور بلا ارادہ کام کرتا تھا۔ میرے علم و یقین میں انھیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنی زندگی کو قومی خدمت کے لئے وقف کیا ہے اور اس میں کسی قسم کے ایثار یا قربانی سے کام لیا ہے۔ اگر احساس ہوا تو صرف یہ کہ زندگی کا دھارا خود بخود ایک خاص سمت بہہ رہا ہے اور انھوں نے کہا کہ اچھا ہے، بہنے دو۔ ان میں "خودی" اور "بے خودی" اس طرح گھل مل کر ایک ہو گئی تھی کہ کسی انسان کے مقابلے میں خواہ وہ کسی ملک، کسی مذہب، کسی طبقے کا ہو انھیں احساسِ کمتری اور اظہارِ برتری کی کش مکش سے گذرنا، خود نمائی اور خود فراموشی کے بیچ میں جھولنا نہیں پڑا۔ نئے آدمی سے وہ اس طرح کھلے آغوش اور کھلے دل سے ملتے تھے جیسے برسوں کا دوست ہو۔ انسان کو وہ کتاب سمجھ کر اس کی تنقید یا تحلیل نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی طرح بحرِ وجود کا ایک قطرہ جان کر جیسا بھی ہو سارے کا سارا لے لیتے تھے اور اپنے آپ کو تمام و کمال اس کے حوالے کر دیتے تھے۔

ذاکر صاحب جامعہ ملیہ میں معلموں اور طالب علموں کو بہت جانچ اور پرکھ کر لیتے تھے۔ جانچ اور پرکھ ان کی ذہانت اور قابلیت سے کہیں زیادہ ان کی شرافت اور انسانیت کی ہوتی تھی۔ دو ڈھائی سو اشخاص کا یہ گروہ ایک متحد، ہم آہنگ خاندان تھا۔ افسرِ خاندان کی حیثیت سے ذاکر صاحب ہر چھوٹے بڑے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک رہتے تھے اور ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیتے تھے۔ اُن کا ہر شخص کے ساتھ ایک مخصوص طریقہ تھا جو نہ صرف اُن کے فطرتِ انسانی کے ادراک پر بلکہ ایک

حد تک ان کی وجدانی بصیرت پر بھی مبنی تھا۔ کسی کو وہ کڑی تنقید سے اکساتے تھے، کسی کی تعریف و تحسین سے ہمت بڑھاتے تھے، کسی کی قدم قدم پر رہنمائی کرتے تھے اور کسی کو تنہا چھوڑ دیتے تھے کہ جاؤ اپنی راہ خود ڈھونڈو۔

ان کی ہمدردی اور محبت کا یہ حال تھا کہ کسی رفیق یا شاگرد کو ذرا سی بھی تکلیف ہو تو بے چین ہو جاتے اور ہر امکانی طریقے سے خواہ وہ کتنا ہی مشکل اور صبر آزما کیوں نہ ہو اُسے دُور کر کے رہتے تھے۔ مگر اسی محبت کا ایک رُوپ بظاہر بے دردی کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا تھا۔ اگر ان کا کوئی عزیز ساتھی ان مشکلوں اور مصیبتوں سے جن کا جامعہ کے لوگوں کو ایک چوتھائی صدی تک مقابلہ کرنا پڑا، گھبرا کر جامعہ کو چھوڑنا چاہتا تھا تو وہ ان اخلاقی بندھنوں کو جنھوں نے اُسے ان کی ذات اور ان کے ادارے سے وابستہ کر رکھا تھا اس طرح کس دیتے تھے کہ وہ ہل نہیں سکتا تھا۔ مگر یہ صورت بہت کم پیش آتی تھی۔ عام طور پر یہ ہی دیکھنے میں آتا تھا کہ جب کوئی رفیق نیم فاقہ کشی کی زندگی سے تنگ آکر اُن کے پاس جاتا کہ فریاد، شکایت یا طنز و طعن کے ذریعے اپنے دل کا بخار نکالے تو وہ خود اُن کی حالت دیکھ کر اور اُن کے صبر و حلم سے شرمندہ ہو کر یا اُن کی محبت اور اعتماد سے خوش ہو کر لوٹتا۔ وہ اُسے روٹی کے بدلے "کام" دیتے تھے اور وہ فخر و مسرت سے پھُولا نہ سماتا تھا۔

میں نے کہا تھا کہ طالب علمی کے زمانے میں جہاں ذاکر صاحب کی شخصیت کی موہنی اچھوں کو ان کی طرف کھینچتی تھی وہاں ان کے بحث و استدلال کی کاٹ اور طنز و مزاح کی دھار بُروں کو ان سے دور رکھتی تھی۔ مگر اب کچھ تو معلّمی کے پیشے کے رُوحانی تقاضے سے، کچھ صوفیائے کرام کی تعلیم سے اور کچھ گاندھی جی کی مثال سے ان میں بے حد برداشت اور رواداری پیدا ہو گئی تھی۔ معلّم کی حیثیت سے وہ ہر شخص کی سیرت کے بُرے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اچھے پہلو ڈھونڈ نکالتے تھے اور ان کی قدر و ہمت افزائی کرتے تھے۔

مہاتما گاندھی کے پیرو کی حیثیت سے وہ بُرے آدمی اور اس کی بُرائی میں اسی طرح فرق

کرتے تھے جیسے بیمار اور اس کی بیماری میں، بُرائیوں سے اور خصوصاً کمینہ پن اور بے وفائی سے انھیں نفرت تھی مگر بُرے کام کرنے والے سے اس قدر درگذر، ہمدردی اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے کہ اگر اس میں ذرا سی بھی انسانیت ہوتی تو اس کی سیرت میں کایا پلٹ ہو جاتی تھی فیاضی اور سیر چشمی میں ان کی مثال مشکل سے ملے گی۔ آس بائیس تیئس برس کے عرصے میں جب وہ جامعہ ملیہ میں پچھتر روپے ماہوار پاتے تھے اور اس تنخواہ کے ساتھ بھی جامعہ کی تھوڑی سی آمدنی ملا کر تنگی سے بسر کرتے تھے، نہ صرف مستحق طالب علموں کی مدد کرتے بلکہ کسی مستحق یا غیر مستحق سائل کے سوال کو نہیں ٹالا خواہ ان کو اس کی وجہ سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔

ذاکر صاحب کی خوشی اور کامیابی کی زندگی اُسی روز سے ختم ہو گئی جب وہ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے اصرار سے جامعہ ملیہ کو چھوڑ کر مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر گئے۔ انھوں نے خوف و ہراس اور غم و غصے کے اُس کابوس کو جو تقسیمِ ہند کے بعد سے یونیورسٹی پر مسلط تھا، دُور کیا، بدخواہی اور مخالفت کے اس طوفان کو جو اس کی سمت چاروں طرف اُمڈ رہا تھا روکا، اور اس کی مالی اور تعلیمی حالت کو بہت کچھ درست کیا، مگر ان کی یہ سعی کہ جس طرح جامعہ ملیہ میں انھوں نے اتحاد اور یک جہتی کی رُوح پھونک دی تھی اسی طرح مسلم یونیورسٹی کو ایک ہم رنگ اور ہم آہنگ ادارہ بنا دیں مشکور نہ ہو سکی۔ علی گڑھ میں انھیں جامعہ ملیہ جیسی کامیابی نہ ہونے کی دو وجہیں ہیں، ایک وہاں پہنچنے کے تھوڑے ہی دن بعد اُن پر قلب کا شدید دَورہ پڑا اور اُن کی صحت جو پہلے بھی کچھ بہت اچھی نہ تھی، نہایت کمزور ہو گئی، اس لئے وہ اس قدر محنت اور لگن سے جو اتنی بڑی اقامتی یونیورسٹی کو چلانے کے لئے درکار تھی، کام نہ کر سکے، دوسرے جن رفیقوں سے انھیں واسطہ تھا وہ اُن کے منتخب کئے ہوئے نہ تھے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرنی تھی وہ اُن کا بنایا ہوا نہ تھا۔ اس کے بعد جب وہ قومی خدمت کے تقاضے سے پہلے بہار کے گورنر، پھر

ہندوستان کے نائب صدر اور آخر میں صدر بنے تو اُن کی کتاب زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ ذاکر صاحب کے قریبی دوستوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب مرحوم مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے سبکدوش ہوئے تو انھیں بوجوہ یہ اُمید تھی کہ وہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے پہلے غیر سرکاری چیرمین بنائے جائیں گے، مگر جب یہ نہیں ہوا اور انھیں اس کے بدلے گورنری کا منصب پیش کیا گیا تو انھوں نے قطعاً انکار کر دیا۔ پھر ایک بیرونی ملک کی سفارت پر جانے کو کہا گیا، انھوں نے اسے بھی قبول نہیں کیا۔ کچھ عرصے بعد اُن کی صحت بہت خراب ہو گئی اور وہ علاج کے لئے جرمنی چلے گئے۔ طبیعت کچھ سنبھلی تھی کہ ہندوستانی سفیر متعینہ برلن کے ذریعے انھیں پنڈت جواہر لال نہرو کی یہ محبت آمیز تہدید پہنچی کہیں تمھیں بہار کا گورنر بنانا چاہتا ہوں، تمھیں وہاں جانا پڑے گا۔ کوئی عذر نہیں سُنا جائے گا۔ ذاکر صاحب نے جواب کے لئے چند روز کی مہلت مانگی اور ہندوستان میں اپنے دوستوں کو خطوط لکھ کر مشورہ چاہا۔ جہاں تک مجھے علم ہے سب کی یہی رائے تھی کہ ذاکر صاحب کی صحت کا جو حال ہو گیا ہے اسے دیکھتے ہوئے انھیں گورنری قبول کر لینا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس وقت تک گورنر کی زندگی مقابلتاً پُرسکون ہوتی تھی۔ پھر یہ خیال بھی تھا کہ ہر چند گورنر عوامی وزارت کی موجودگی میں آئینی طور پر ریاست کے کاروبار میں دخل نہیں دے سکتا پھر بھی اپنی شخصیت کے اثر سے کسی نہ کسی حد تک حکومت کی پالیسی پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ یہ اُمید تھوڑی بہت پوری بھی ہوئی۔ ذاکر صاحب کو بہت سے معاملات (خصوصاً تعلیمی معاملات) میں حکومت کو مشورے دینے اور ان پر عمل کرانے کا موقع ملا۔ گورنری کی پانچ سال کی مدت ختم ہونے پر وہ یہ طے کر چکے تھے کہ مزید پانچ سال کی توسیع جس کا تقریباً یقین تھا، منظور نہیں کریں گے۔ مگر جب حکومتِ ہند نے انھیں اپنا نائب صدر مقرر کرنا چاہا تو انھوں نے یہ سمجھ کر قبول کر لیا کہ اس عہدے کا کام بھی ہلکا ہوگا اور بے ضابطہ طور پر مرکزی حکومت کو مفید مشورے دینے کا موقع بھی ملے گا۔ ابتدا

کے چند سال میں واقعی یہ توقع پوری ہوئی ۔ راجیہ سبھا میں جس کی صدارت اُن کا اصل کام تھا اُن کی رہنمائی میں بڑا خوشگوار اور پُرامن ماحول پیدا ہو گیا تھا اور حکومتِ ہند بھی بہت سے معاملات میں بے ضابطہ طور پر اُن سے مشورہ لیتی رہتی تھی۔ مگر آخر میں جب عام طور پہ ملک میں ایک طوفان اور ہیجان کی کیفیت پیدا ہو گئی اور اس کے اثر سے ایوانِ بالا بھی پہلوانوں کا دنگل بن گیا تو وہ عارضی سکون جو ذاکر صاحب کو میسّر آیا تھا غارت ہو گیا۔ گو وہ بڑے وقار اور صبر و تحمّل کے ساتھ اس طوفان میں راجیہ سبھا کی کشتی کو کھیتے رہے، مگر ہر وقت کی کوفت سے ان کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا اور اس کا اعلان بھی کر دیا کہ وہ نائب صدارت کی میعاد ختم ہونے کے بعد نئے انتخاب میں اس عہدے کے اُمیدوار نہیں ہوں گے۔ مگر ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں ملک کی تاریخ میں ایک ایسا نازک موڑ آ گیا، معلوم ہوتا تھا کہ مرکزی حکومت بھی اسی پراگندگی اور ابتری کا شکار ہو جائے گی جو بعض ریاستوں میں نظر آ رہی تھی۔ اس موقع پر ملک کی حکمراں پارٹی کی یہ رائے ہوئی کہ اگر ذاکر صاحب صدرِ جمہوریہ منتخب ہو جائیں تو ممکن ہے کہ مرکزی سیاست میں جو بُری طرح ڈانوا ڈول ہو رہی تھی توازن پیدا ہو جائے۔

ذاکر صاحب اپنی زندگی میں بہت سے کڑے امتحانوں سے گزرے تھے، مگر یہ اُن کے لئے سب سے سخت امتحان تھا۔ ان کی صحت قریب قریب جواب دے چکی تھی۔ اس طوفانِ بے تمیزی میں جو سارے ملک میں برپا تھا اس کی کچھ زیادہ اُمید نہ تھی کہ وہ صدر منتخب ہو سکیں گے اور اگر ہو بھی گئے تو بگڑے ہوئے حالات اُن کی مدد سے دُرست ہو جائیں گے مگر مشکلات سے ٹکّر لینا ذاکر صاحب کی طبیعت بن گئی تھی۔ وہ اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر اس آزمائش کے لئے تیار ہو گئے۔ خلافِ توقع رائے عامّہ کے نمائندوں کی بڑی اکثریت نے اُن کا ساتھ دیا اور وہ صدر

منتخب ہوگئے۔ انتخاب سے پہلے اور انتخاب کے بعد کچھ لوگوں نے نادانستہ بدگمانی سے اور بعض نے دانستہ بدبینی سے اُن پر طرح طرح کے الزام تراشے مگر مجموعی طور پر اُن کی دلکش شخصیت کی موہنی نے دوست دشمن سب ہی کے دلوں کو موہ لیا۔ اور انھیں وہ ہردلعزیزی نصیب ہوئی جو اُن سے پہلے بہت کم قومی رہنماؤں کو نصیب ہوئی تھی۔ مگر جہاں تک ملک کی بگڑی کو بنانے کا تعلق ہے وہ اس سے زیادہ نہ کرسکے کہ ایک طرف ان خوشگوار ذاتی تعلقات کی بنا پر جو ان میں اور قریب قریب سب سیاسی گروہوں کے لیڈروں میں پیدا ہوگئے تھے، انھیں سمجھا بجھا کر اُن کی باہمی رقابتوں اور عداوتوں کو ایک حد سے آگے نہ بڑھنے دیں اور منظرِ عام پر نہ آنے دیں اور دوسری طرف بیرونی ملکوں کے رہنماؤں کے میزبان یا مہمان کی حیثیت سے اُن کے دلوں پر ہندوستان کی قدر و عزت کا نقش بٹھائیں۔ اُن کے یہ کارنامے اپنی جگہ کچھ کم نہ تھے، مگر خود اُن کے نزدیک یہ قومی تعمیر و ترقی کی میزان میں کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتے تھے۔ دنیا نے پبلک زندگی کے پیمانے سے ناپ کر اُن کی عظمت کا اعتراف کیا اور ان کے سر پر کامیابی کا تاج رکھا۔ مگر ان کے دل کی دنیا میں بے حاصلی اور ناکامی کے احساس سے افسردگی چھائی رہی۔ ذاکر صاحب بنیادی طور پر ایک معلّم تھے اور ان اعلیٰ مناصب پر پہنچ کر بھی معلّم ہی رہنا چاہتے تھے، مگر یہاں انھیں سابقہ سیاست کاروں سے تھا جنھیں تعلیم دینا بہت مشکل کام ہے۔ معلّم صرف اخلاقی اثر ڈال سکتا ہے اور سیاست کار اور رہبر اثر سے تو متاثر ہوسکتے ہیں، مگر (بہ استثنائے چند) اخلاقی اثر کو قبول نہیں کرتے۔ پھر بھی چونکہ ذاکر صاحب نے اس آخری دور میں بھی عوام کی تعلیم کے لئے اتنا کچھ کیا کہ ملک کی تاریخ میں بہت کم لوگوں نے کیا ہوگا۔ اس لئے خواہ وہ کتنے ہی بددل کیوں نہ ہوں، مایوس ہرگز نہ تھے۔ انھیں یقین تھا کہ جب ملک کے عوام تعلیم پاجائیں گے تو وہ خود اپنے سیاسی رہنماؤں کو

حسبِ ضرورت سبق پڑھا سکیں گے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا ڈاکٹر صاحب میں اقبال کے مردِ مومن اور گاندھی جی کے مردِ حق دونوں کی شان نظر آتی تھی۔ انھوں نے "فقیری میں بھی شاہی" اور شاہی میں بھی فقیری کی۔ انھوں نے کبھی تلوار پر بھروسہ نہیں کیا، عمر بھر "بے تیغ" لڑتے رہے۔ انھوں نے کبھی تقدیر کی آڑ نہیں لی بلکہ خود تقدیرِ الٰہی بن کر اپنی قوم کا مقدر بدلنے کی کوشش کی۔ خدا اُن کی رُوح کو سکونِ ابدی بخشے اور ہم سب کے دل میں وہ مبارک بے چینی اور بیتابی پیدا کرے جو سکونِ ابدی کی راہ دکھاتی ہے۔

غلام ربانی تاباں

غزل

شکستِ شوق بہت ناگوار بھی تو نہیں
یہ کیا ستم ہے کہ دل بے قرار بھی تو نہیں

مری وفا پہ عجب سانحہ سا گزرا ہے
کہ مدتوں سے ترا انتظار بھی تو نہیں

تری جفا کے سہارے گزر تو سکتی ہے
تری جفا کا مگر اعتبار بھی تو نہیں

چمن میں پھول کھلیں ، یا جگر میں زخم کھلیں
ہوائے دہر پہ کچھ اختیار بھی تو نہیں

کچھ اس طرح سے مٹا شہرِ آرزوؤں کا
کوئی نشان، کوئی یادگار بھی تو نہیں

مجھے تو خار بھی پھولوں سے کم نہیں لیکن
میں کیا کروں کہ مقدر میں خار بھی تو نہیں

عروج پر ہے مرا بختِ نارسا تاباں
کہ غیرِ درد کوئی غمگسار بھی تو نہیں

اختر انصاری دہلوی

غیر مرئی مہمان

میجر برائٹ کے تقریباً سارے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ بڑی بیتابی کے ساتھ اپنے سر کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہلا رہا تھا اور ہائے ہائے کر رہا تھا۔ کروٹ بدلنے یا اٹھ کر بیٹھ جانے کی اس میں طاقت نہیں تھی۔ صرف ہاتھوں کو جنبش دے سکتا تھا مگر اس کی اسے اجازت نہیں تھی۔ ذرا ہاتھ ہلاتا اور گارڈ ماسٹر پھرتی کے ساتھ اس کے بیڈ کے قریب آکر اسے بے حس و حرکت لیٹے رہنے کی ہدایت کرتا۔ کبھی وہ اس کے سرہانے کی طرف آکر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتا اور دلاسائی کے طور پر کہتا "میجر برائٹ! صبر اور ہمت سے کام لیجئے۔ آپ کی حالت سدھر رہی ہے۔ آپ جلد اچھے ہو جائیں گے۔ اور وہ ہوائی جہاز بھی بس آیا ہی چاہتے ہیں جو آپ لوگوں کو یہاں سے مختلف ہسپتالوں میں منتقل کریں گے۔" ایسے موقع پر میجر برائٹ اس سے یہ ضرور پوچھتا، "گارڈ ماسٹر! ہنری کی کوئی خبر؟" گارڈ ماسٹر جواب دیتا، "آپ کا پیغام بھیجا جا چکا ہے۔ جلد ہی جواب آئے گا۔ صبر سے کام لیجئے۔"

یہ دوسری جنگِ عظیم کے شباب کا دور تھا۔ اتحادی طاقتیں پوری قوت کے ساتھ محوری طاقتوں سے نبرد آزما تھیں۔ اور کئی محاذوں پر گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ شرق اوسط میں بن غازی کے محاذ پر میجر برائٹ زخمی ہوا اور دوسرے زخمیوں کے ساتھ فسٹ ایڈ کے لئے فیلڈ ہاسپٹل میں لایا گیا جو گویا محاذِ جنگ کا ایک ناگزیر دُم چھلا تھا اور چند چھوٹے بڑے خیموں پر مشتمل تھا۔ کسی خیمے میں دواؤں کا ذخیرہ تھا۔ کسی میں زخمیوں کی مرہم پٹی کی جاتی

تھی، اور اس بڑے خیمے میں جہاں اِس وقت میجر برائٹ پٹیوں سے کسا بندھا اور دواؤں میں نہایا ہوا پڑا تھا سب کو برابر برابر بچھے ہوئے پلنگوں پر لاکر لِٹا دیا جاتا تھا اور وہ اس وقت تک یہاں زندگی اور موت کے درمیان معلق رہتے تھے جب تک کہ ان کو مستقل علاج کے لئے کسی مستقل ہسپتال میں منتقل کرنے کا انتظام نہیں ہوجاتا تھا۔

میجر برائٹ ابتدائی امداد کے بعد جب پہلی مرتبہ ہوش میں آیا تو اوّلیں الفاظ جو اُس کی زبان سے ادا ہوئے وہ ہنری کے بارے میں تھے۔ کیپٹن ہنری اُس کا عمر بھر کا ساتھی اور جگری دوست تھا جو شمالی فرانس میں نارمنڈی کے محاذ پر لڑتا ہوا زخمی ہوا تھا اور اب وہاں کے فیلڈ ہاسپٹل میں زیرِ علاج تھا۔ برائٹ جو اب خود بھی اسی حالت میں تھا اور موت جس کے سامنے مُنہ پھاڑے کھڑی تھی دنیا کی ہر بات اور ہر چیز کی طرف سے بظاہر بالکل بے پروا تھا اور صرف ہنری کی یاد کو حرزِ جاں بنائے ہوئے تھا۔ وہ شاید زندہ ہی اس لئے تھا کہ اُسے ہنری کی خیریت معلوم کرنی تھی۔

خیمے کی دوسری طرف سے گارڈ ماسٹر اپنی نپی تُلی فوجی چال سے چلتا ہوا برائٹ کی طرف آیا۔ اور جھانک کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ برائٹ نے آنکھیں کھولیں اور بولا، "گارڈ ماسٹر! کیا وقت ہوگا؟"

گارڈ ماسٹر نے کہا، "چار بجنے والے ہیں۔ ٹھیک چار بجے آپ دوا کی اگلی خوراک پئیں گے" اور یہ کہہ کر برابر کی میز پر جو چارٹ رکھا ہوا تھا اُسے اُٹھا کر دیکھنے لگا۔

"ہنری کے بارے میں ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی؟" برائٹ نے سوال کیا۔

"آپ کو بتایا جا چکا ہے" گارڈ ماسٹر نے جواب دیا، "کہ نارمنڈی کے محاذ سے شام کے چھ بجے کے قریب خبریں موصول ہوں گی۔ اُس وقت تک صبر کے ساتھ انتظار کیجئے اور آرام کرنے کی کوشش کیجئے ۔۔۔ آرام آپ کے لئے بہت ضروری ہے۔ آپ کو کیپٹن ہنری کا جتنا دھیان ہے اتنا اپنا نہیں ہے۔ آخر کیوں؟ جی اچھا تو جہان اچھا! اپنی صحت کا

خیال کیجئے اور خاموش رہ کر آرام کیجئے۔ آرام! آرام! آرام!"

برائٹ نے خالی خالی نظروں سے یہ اپدیش سُنا اور آہ کر کے خاموش ہو گیا۔ گارڈ ماسٹر وہاں سے پلٹ کر ایک نرس کی طرف متوجہ ہوا جو قریب ہی کسی مریض کو دوا پلا رہی تھی۔

چند منٹ کے بعد برائٹ اچانک اپنی غفلت اور نیم بے ہوشی کی حالت سے بیدار ہوا اور ہڑبڑا کر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ہنری! میرے دوست، جان سے عزیز دوست! تم یہاں؟ آؤ آؤ! خوش آمدید! خوش آمدید!" اس نے اپنے سامنے کسی غیر مرئی وجود کو دیکھتے ہوئے کہا۔

گارڈ ماسٹر لپکا ہوا اور ہائیں ہائیں کرتا ہوا اس کی طرف آیا: "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اُٹھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ آپ اپنے آپ کو سخت نقصان پہنچائیں گے۔ آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ کہاں جانا چاہتے ہیں؟ کیوں اُٹھنے کی کوشش کر رہے ہیں؟....."

برائٹ نے گارڈ ماسٹر کی تنبیہ کا بالکل کوئی خیال نہیں کیا اور بدستور کہنیوں کے بل پہلو پہ اُٹھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"ٹھہرو، ٹھہرو" اُس نے کہا: "مجھے مت روکو۔ مجھے اپنے دوست سے ملاقات کرنے دو۔"

جب گارڈ ماسٹر نے اپنی فہمائش کو بے اثر اور روک تھام کی کوشش کو بے سود پایا تو اپنا ایک پاؤں بیڈ پر رکھ کر خود ہی برائٹ کو اپنے ایک ہاتھ کے سہارے سے اوپر اُٹھایا۔ اور برائٹ اپنے غیر مرئی اور نامعلوم مہمان کی پذیرائی میں لگا رہا۔

اتنے میں نرس دبے پاؤں وہاں پہنچی اور میز پر رکھا ہوا چارٹ اُٹھا کر دیکھنے لگی پھر اُس نے دوا کی شیشی اُٹھائی اور شیشے میں دوا انڈیلنے لگی۔ برائٹ، گارڈ ماسٹر اور غیر مرئی مہمان، ان تین کرداروں کی مدد سے جو ڈرامہ یہاں کھیلا جا رہا تھا اُس کا اُس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس طرح کی ہڑبونگ اُس کے لئے غالباً کوئی نئی چیز نہیں تھی۔

گارڈ ماسٹر نے اسی ہڑبونگ کے درمیان برائٹ سے کہا: "چار بج گئے ہیں میجر برائٹ!

دوا پیجئے۔"

"دوا گئی جہنم میں" برائٹ نے جواب دیا "مجھے اپنے دوست سے بات کرنے دو۔ بیٹھو ہنری! تم بیٹھتے کیوں نہیں؟ گارڈ ماسٹر! مہمان کو کرسی دو!"

نرس نے دوا کا شیشہ برائٹ کی طرف بڑھا دیا۔

"مجھے دوا نہیں چاہیئے" اس نے چیخ کر کہا "مجھے ایک کرسی چاہیئے۔ میرے دوست کے لئے ایک کرسی لاؤ۔ کرسی! خدا کے لئے کرسی! اللہ ایک مرتے ہوئے فوجی افسر کی آخری التجا پر کان دھرو!"

اس دوران میں ہسپتال کے اسٹاف کے کچھ اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ کسی نے ایک کرسی وہاں لا کر رکھ دی۔

"بیٹھو ہنری! بیٹھو!" برائٹ نے کسی قدر مطمئن لہجے میں کہا، اور پھر اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ گفتگو ناقابلِ فہم تھی اور لہجہ اکھڑا اکھڑا!

"اچھا اچھا! میں سمجھتا ہوں.... تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ شاباش میرے دوست شاباش!..... یہ تو ہونا ہی تھا .... بے شک، بے شک! ہاں کیوں نہیں! کیا واقعی؟ ...... اچھا! تو پھر یہ تو خوب ہوا۔ بہت خوب! بہت خوب! یہ سب تقدیری امور ہیں میرے دوست! تقدیری امور! اور ہم دونوں کی قسمتیں تو ازل سے ..... ضرور! اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ یہ نوشتے ہے....."

یہ اور اس قسم کے کچھ اور الفاظ تو لوگوں کی سمجھ میں آ رہے تھے، لیکن اس کی بنا ہر یک طرفہ گفتگو کا بڑا حصہ بالکل بے ربط اور یکسر ناقابلِ فہم تھا۔

"اچھا خدا حافظ! خدا حافظ!" یہ آخری الفاظ کہہ کر برائٹ نے ایک طویل آہ کھینچی اور پھر اپنے بدن اور گردن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ گارڈ ماسٹر نے اپنا ہاتھ اس کی گردن کے نیچے سے نکال لیا اور اس کے سر کو تکئے سے ٹکا دیا۔

ایک مرتبہ پھر اُس کو دوا پلانے کی کوشش کی گئی، لیکن اُس نے اِس طرح کڑک کر "نہیں نہیں" کہا کہ سب مرعوب ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ کچھ دیر بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد اُس نے پھر کراہنا اور سر کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہلانا شروع کر دیا۔

چھ بجے کے قریب ایک وردی پوش فوجی خیمے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک رجسٹر تھا اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے مختلف زخمیوں کے پاس ٹھہرتا ہوا اور اُن سے کچھ کہتا ہوا برائٹ کے بیڈ کی طرف آیا۔ کسی قدر جھکا اور اس سے کہا، "میجر برائٹ! نارمنڈی کے محاذ سے یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ آج سہ پہر کو چار بجے کیپٹن ہنری کا انتقال ہو گیا!"

برائٹ پر اس اطلاع کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے ہنری کی موت کی خبر اس طرح سنی گویا یہ اس کے لئے کوئی نئی خبر نہیں تھی۔ وہ اس المناک واقعہ سے دو گھنٹے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا، بلکہ اپنے گزرے ہوئے دوست سے ملاقات بھی کر چکا تھا!

کوائف جامعہ

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحبؒ کی پہلی برسی

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کی پہلی برسی کو حکومت ہند نے بڑے اہتمام مگر بڑی سادگی کے ساتھ منایا۔ ۳ مئی کی صبح کو نائب صدر جمہوریہ جناب گوپال سروپ پاٹھک صاحب تشریف لائے، قبر پر پھول چڑھائے، فوج کی تینوں شاخوں، بری، بحری اور ہوائی فوج کے ڈیڑھ سو جوانوں نے سلامی دی اور اپنی بندوقیں سرنگوں کرلیں اور تینوں شاخوں کے ۱۲ نوجوانوں نے ماتمی بگل بجایا اور اس کے بعد دو منٹ تک سب لوگ خاموش رہے اور چپ رہ کر خراج عقیدت پیش کیا۔

اس موقع پر وزیراعظم مسز اندرا گاندھی اور دوسرے وزیر، بہت سے سفیر اور معززین شہر موجود تھے۔ محمد علی ہال میں مردوں کے لیے اور ذاکر صاحب کے مکان پر خواتین کے لیے قرآن خوانی کا انتظام تھا، محترمہ بیگم ذاکر حسین صاحبہ اور ان کی دونوں صاحبزادیاں بھی تشریف لائی تھیں۔ وزیراعظم مسز اندرا گاندھی ذاکر صاحب کے مکان پر بھی تشریف لے گئیں اور تھوڑی دیر بیگم ذاکر حسین صاحبہ کے ساتھ رہیں۔ قرآن خوانی کے بعد بچوں کے گھر کے طلبا اور طالبات کھانے پر مدعو تھے۔

دوسرے دن یعنی ۴ مئی کی سہ پہر کو جامعہ کے اہتمام میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس کی صدارت کے فرائض ذاکر صاحب کے ایک پرانے ساتھی ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے انجام دیے۔ تلاوت قرآن حکیم کے بعد مدرسۂ ثانوی کے ایک طالب علم خورشید لطیف نے "بچوں کے ذاکر صاحب" کے عنوان پر ایک مضمون پڑھا، جس میں اختصار کے ساتھ ان خدمات کو بیان کیا گیا تھا جو ذاکر صاحب نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں انجام دیے ہیں اور بچوں سے مرحوم کو جو غیر معمولی محبت اور تعلق تھا، اس کا بھی ذکر تھا۔

آخر میں دو اقتباس تھے، جن میں بتلایا گیا تھا کہ وہ جامعہ کے بچوں سے کیا چاہتے تھے۔ یہ دونوں اقتباسات قارئین جامعہ کے لئے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے، عرصہ ہوا جب وہ شیخ الجامعہ تھے، ایک موقعہ پر اپنے پیغام میں فرمایا تھا:

"جامعہ تمھیں سکھانا چاہتی ہے کہ اپنے سینوں میں بھائیوں کی خدمت کا ولولہ پیدا کرو، سچائی کو ہاتھ سے جانے نہ دو، اس راہ میں مشکلیں سامنے آئیں تو منہ مت موڑو، خود سختیاں اٹھاؤ اور دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، تن بدن موٹے کپڑے سے ڈھانپ لو، رُوکھا پھیکا کھا کر گذارہ کر لو، مگر دماغ اونچے سے اونچا خیال سوچ سکے، دل اچھی سے اچھی آرزوؤں سے بھرا ہو۔"

"جامعہ تمھیں یہ بھی سکھانا چاہتی ہے کہ تم سچے ہوگے، اچھے ہوگے، تندرست ہوگے، صاف ستھرے ہوگے، بڑوں کے لیے لوہا ہوگے، اچھوں کے لیے موم، غریبوں کا سہارا ہوگے، بے کسوں کا آسرا، سوتوں کو جگاؤ گے، ڈوبتوں کو تراؤ گے، غریب ہوگے تو بھی سیر چشم، دوسروں کی دولت کو منہ پھیر کر نہ دیکھو گے، امیر ہوگے تو اپنی دولت کو خدا کی امانت سمجھو گے اور اس کے بندوں کی سیوا میں خرچ کرو گے۔"

اس کے بعد وزیر تعلیم ڈاکٹر راؤ نے ہندوستانی میں تقریر کی، ڈاکٹر صاحب کی انسانیت، شرافت، خلوص اور جذبۂ خدمت کی تعریف کرنے کے بعد مرحوم کی یادگار کے سلسلے میں ان باتوں کا اعلان فرمایا جن کے بارے میں جامعہ کے پچھلے شمارے کے شذرات میں لکھا جا چکا ہے۔ دونوں باتیں انھوں نے یہ بتائیں کہ ایک تو مرکزی یونیورسٹیوں میں ذاکر حسین میموریل لکچرز کا سلسلہ شروع کیا جائے گا جو باری باری سے جامعہ ملیہ، دلی یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی، شانتی نکیتن میں ہوا کریں گے، دوسرے نہرو یونیورسٹی میں ذاکر صاحب کے نام پر علم تعلیم اور فن تعلیم کا ایک اعلیٰ مرکز قائم ہوگا۔

وزیر تعلیم کی تقریر کے بعد استادوں کے مدرسے کے پرنسپل ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب نے ذاکر صاحب کے تعلیمی تصورات پر ایک مضمون پڑھا، اس کے بعد ڈاکٹر پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے تقریر کی اور ذاکر صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا، کنزرو صاحب کے بعد ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے تقریر کی۔ انھوں نے خاص طور پر مرحوم کی رواداری، انسان دوستی، امید پروری پر اور ان کی سیرت و شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ ان کی خاص خوبی ان کی امید پروری تھی وہ

کبھی مایوس نہ ہوتے، خراب سے خراب حالات میں بھی امید کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ جاتا۔ آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے تقریر کی۔ موصوف نے فرمایا کہ ذاکر صاحب کی جس خوبی سے سب سے زیادہ لوگ متاثر ہوئے اور آج جو سب سے زیادہ یاد آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جو شخص بھی ان سے ملنے جاتا تھا وہ نیا حوصلہ لیکر آتا تھا، مایوس سے مایوس اور بد دل سے بد دل آدمی جب ان سے ملتا تو اس کی افسردگی اور مایوسی، حوصلے اور امید سے بدل جاتی۔ ان میں قوت کا یہ خزانہ اس لیے تھا کہ ان میں کامل ایمان تھا، اپنے اوپر ایمان، اپنی قوم پر ایمان، ملک پر ایمان اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے مالک، اپنے سب پر ایمان تھا۔ وہ انتہائی مخالف اور نامساعد حالات میں بھی مایوس نہیں ہوتے تھے، ان کا ایمان تھا کہ ملک ترقی کرے گا اور مسلمان اس میں عزت وآبرو سے رہیں گے، ان کے اس ایمان میں کبھی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔

جامعہ جب مشکل حالات سے دوچار تھی تو وہ جامعہ والوں سے کہا کرتے تھے کہ آپ بہت سی خوشیوں سے محروم ہیں اپنا کام اچھی طرح کرنے اور اس میں کامیابی حاصل ہونے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ سب خوشیوں سے بڑھ کر ہے اور اسے کوئی آپ سے نہیں چھین سکتا۔ ان کا یہ پیغام اب صرف جامعہ والوں کے لیے نہیں ہے، سارے ملک کے لیے ہے اور ضرورت ہے کہ سب تک پہنچایا جائے۔ ملک کے معاشی اور سماجی حالات بدل رہے ہیں، اس میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی، ان کو برداشت کرنا ہے۔ ہر حال میں اپنا اپنا فرض اچھی طرح انجام دینا ہے اور اسی میں مسرت وسعادت حاصل کرنا ہے۔

پروفیسر محمد مجیب صاحب امریکہ میں

پروفیسر محمد مجیب صاحب آج کل امریکہ میں ہیں، جیسا کہ ہم نے اپریل کے شمارے میں لکھا تھا، وہ ۱۰ اپریل کو دہلی سے روانہ ہوئے، پہلے ترکی گئے، چند روز ٹھہر کر ۵ ارکو نیویارک گئے اور ۱۵ مئی تک وہاں کی مختلف یونیورسٹیوں میں ان کا پروگرام ہے، وہاں سے فارغ ہوکر دوبارہ ترکی واپس آئیں گے

اور تقریباً ۱۰ جون تک دہلی واپس ہوں گے۔

جاتے وقت ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنے سفر کا روزنامچہ لکھتے رہیں اور واپسی کے بعد ماہنامہ جامعہ کے لیے ایک دو مضمون میں اپنے تاثرات سے قارئین جامعہ کو مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمائیں۔ امید ہے کہ وہ اس کا ضرور لحاظ رکھیں گے۔ موصوف کے جس مضمون کی پہلی قسط مئی کے جامعہ میں شائع ہوئی تھی اور دوسری قسط اس شمارے میں شامل ہے، اسے انھوں نے میکگل یونیورسٹی (مانٹریال، کینیڈا) کے ادارۂ علوم اسلامیہ (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز) میں بھی لوگوں کی خواہش اور اصرار پر پڑھ کر سنایا اور اس پر عالمانہ بحث و گفتگو ہوئی۔

"امریکن رپورٹر" جو دہلی سے شائع ہوتا ہے، پروفیسر محمد مجیب صاحب کا بڑے شاندار لفظوں میں ذکر کیا ہے۔ اس نے اپنی ۸ مئی کی اشاعت میں ان کی تصویر شائع کی ہے اور لکھا ہے کہ جامعہ ملیہ دہلی کے وائس چانسلر اور ممتاز ہندستانی ماہر تعلیم پروفیسر محمد مجیب صاحب کا نیویارک میں بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا، اس نے اس مقالے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، جس کا عنوان ہے "دو ہم مزاج شاعر۔ غالب اور ایمیلی ڈکنسن" اور اس نے لکھا ہے کہ جب یہ مقالہ پڑھا جا رہا تھا تو حاضرین جلسہ نے اپنے قہقہوں سے بار بار اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

ملا نظام الدینؒ پر مقالہ

مولانا مفتی محمد رضا انصاری صاحب، استاد شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی نے ۲۶ اپریل کو جامعہ میں ملا نظام الدینؒ پر ایک مقالہ پڑھ کر سنایا جس کا انتظام ناظم شعبۂ دینیات مولانا عبد السلام صاحب قدوائی نے کیا تھا۔ مقالے میں ملا نظام الدین کے حالات زندگی اور ان کی علمی و مذہبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ موصوف پر اردو میں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ کے مضامین میں جستہ جستہ معلومات ملتی ہیں مگر کسی ایک مضمون میں پوری تفصیل سے ان کے تمام حالات اور ان کی مذہبی اور تعلیمی خدمات کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اس مضمون کی اشاعت سے یہ کمی بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔ انشاء اللہ جامعہ کی اگلی اشاعت میں یہ مضمون شائع ہوگا۔ (عبد اللطیف اعظمی)

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

صحرا میں اذان   از گوپال متل

سائز ۱۸×۲۲/۸ ، حجم ۱۱۲ صفحات ، مجلد مع گرد پوش ، کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ ،

قیمت : چھ روپے ، تاریخ اشاعت : ۱۹۷۰ء

ملنے کا پتہ : مکتبۂ تحریک ۹۔ انصاری مارکیٹ ، دریا گنج دہلی ۶

'صحرا میں اذان' اردو کے مشہور صحافی اور معروف شاعر جناب گوپال متل کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ پہلا مجموعۂ کلام تقسیم ملک سے پہلے لاہور سے شائع ہوا تھا۔ متل صاحب ہمارے ان شاعروں میں ہیں جو بہت کم کہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ اس کم سخنی اور کم گوئی کی وجہ یہ ہے کہ وہ شعری اظہار کے جمال اور شاعری کے منصب سے آگاہ ہیں۔ یہ آگہی جس میں بھی ہوگی وہ بسیار گوئی سے گریز کرے گا۔ اپنی بات کو اپنی آواز اور اپنے لہجہ میں کہنے کے لمحے کم آتے ہیں اور دوسروں اور اپنے آپ کو دہرانے کے زیادہ۔ صحیح تخلیقی لمحوں کو جو بھی شاعر پہچان لیتا ہے، اچھے شعر کہتا ہے۔ چنانچہ متل صاحب کے زیر نظر مجموعے میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جو اپنے اندر تازگی اور ندرت رکھتے ہیں اور شاعر کی تخلیقی صلاحیت کے غماز اور اظہار کی انفرادیت کے مظہر ہیں۔ میں ذاتی طور پر متل صاحب کے اس شعر سے پہلے واقف ہوا یہ جانے بغیر کہ یہ شعر اُن کا ہے :

مجھے زندگی کی دعا دینے والے   ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

اس کے بعد تحریک کے صفحات پر میں نے کبھی کبھار ان کی کوئی غزل دیکھ لی یا پھر مشاعروں میں انھیں سن لیا۔ مگر ہر بار یہ محسوس ہوا کہ میں کسی ایک شاعر کو پڑھ یا سن رہا ہوں جو بے خودی میں بھی اندازِ گفتار رکھتا ہے اور وہ بھی ایک ایسا اندازِ گفتار جس میں ایک طرح کی انفرادیت ہو۔ مثل صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ وہ غزل کی مانوس اشاریت اور عام موضوعات کو اپناتے ہیں ان ہی کے انداز سے اپناتے ہیں۔ مثلاً زاہد و شیخ پر اردو میں بے شمار اشعار ہیں مگر مثل صاحب جب انھیں اپنا ہدف بناتے ہیں تو اس میں ایک ایسا رنگ پیدا ہو جاتا جو لطف سے خالی نہیں ہے ویسے مجموعی طور پر اُن کی فطانت میں ایک نمایاں طنزیاتی رد ملتی ہے۔ یہ طنزیاتی رَوں کبھی ماٹشیر کی طرح اداروں کو اپنی زد میں لیتی ہے کبھی افراد کو اور کبھی خود اپنے آپ کو۔ دوسروں پر ہنسنا آسان ہے مگر اپنے آپ کو بھی نہ بخشنا ایک ایسی خوبی ہے جو کم لوگوں میں نظر آتی ہے۔ وہ جب اپنے آپ پر ہنستے ہیں تو اس میں ایک ایسی غمگینی پیدا ہو جاتی ہے جس کا تجربہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس کا شدت سے احساس ہے کہ ان کی ذہانت رائگاں گئی۔ اس احساس نے اُن سے بہت سے اچھے شعر کہلوائے ہیں جن میں کہیں خود اذیتی ہے، کہیں خود ترسی تو کہیں خود تنقیدی۔ اس لحاظ سے ان کا شعری کردار جدید اردو شاعری کے شعری کردار سے ہم آہنگ ہو گیا ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے ذہنی اور فنی سفر میں کہیں رُکے نہیں اور یہ کہ ان کا تخلیقی ذہن عمر کی اس منزل پر بھی جامد نہیں ہوا ہے۔ وہ متحرک ہے اور جدید زمانہ و زندگی کی ہوش رُبا حقیقتوں کو سمیٹنے کے لئے بے تاب۔ انھیں ہر لمحہ اپنی فطانت کا احساس رہتا ہے اور یہ احساس اکثر صورتوں میں ایک طرح کا احساسِ تنہائی پیدا کرتا ہے اس وجہ سے کہ فطانت کی ہم راہی مشکل ہوتی ہے، اسے ایسے رفیق نہیں ملتے جو اُسے مطمئن کر سکیں۔ مجموعۂ کلام کے نام کے انتخاب میں بھی اسی احساس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

معرف کے بغیر جل رہا ہوں — میں سونے مکان کا دیا ہوں
منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی — آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں

اس شہر میں وضعِ کج کلاہی — میں واقعی درخورِ سزا ہوں

اور کس کو ہو مرے زہر کی تاب — اپنے ہی آپ کو ڈستا ہوں میں

سر یہ کہتا ہے گوارا نہیں اب بارشِ سنگ — دل یہ کہتا ہے اسی کوچہ میں جایا جائے
ہم بھی پیچھے رہیں کیوں دعوئ جانبازی میں — کیا ضروری ہے کہ مر کر بھی دکھایا جائے

وہ بھی انسان ہے اے دل اُسے الزام نہ دے — جانے اس کو بھی کن آفات نے گھیرا ہوگا

آؤ کچھ جشنِ شہادت ہی میں شرکت ہو جائے — اپنی کھڑکی ہی سے مقتل کا نظارہ دیکھیں
کون منجدھار میں جائے سرِ ساحل بیٹھیں — دور سے ڈوبنے والوں کا تماشا دیکھیں
اب بھی ہوتا ہے وہاں ذکر ہمارا کہ نہیں — عالم اس بزم کا اب کیا ہے ذرا جا دیکھیں

ہر ایک شخص ترکِ تمنّا کا مدعی — ہر ایک شخص تیری تمنّا لئے ہوئے

پی ہے اگر شراب تو کچھ لطف اٹھائیے — کیوں اتنی احتیاط ذرا لڑکھڑائیے
اتنا لحاظ روح کا اور اتنی فکر بھی — جھوٹا ہے شیخ، باتوں میں اس کی نہ آئیے

بہت جی چاہتا ہے یہ فقط نقشِ بصارت ہو — بڑی سرعت سے دنیا کھو رہی ہے دلکشی اپنی

مجموعے میں آزاد نظمیں بھی ہیں اور پابند بھی۔ ان کی بہت سی نظمیں اپنی شدّتِ احساس

کی وجہ سے متاثر کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر متین صاحب کی نظموں میں بھی ایک طرح کی خوشگوار تغزلیت ہے۔ ایک عرصے کے بعد ایک معتبر مجموعۂ کلام سامنے آیا ہے جو مجھے امید ہے کہ "سرمۂ دیدۂ صاحب نظراں" ثابت ہوگا۔

(انور صدیقی)

غالب اور حیدر آباد　　از ضیاء الدین احمد شکیب

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۴۴ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت: ۷ روپے،
تاریخ اشاعت: فروری ۱۹۶۹ء / ملنے کا پتہ: ادبی ٹرسٹ بکڈپو۔ کنارا بنک بلڈنگ
حیدر آباد – ۱ (اے پی)

حیدر آباد ان جگہوں میں سے ہے، جہاں غالب کبھی نہیں گئے، انھیں مشورہ ضرور دیا گیا کہ اگر حیدر آباد جائیں تو ان کی مالی مشکلات کا حل نکل آئے گا، مگر یہ کہکر ٹال گئے "اب میں کہاں اور سفر دکن کہاں"۔ ان سے کہا گیا کہ حیدر آباد کے وزیر اعظم چندو لال جو ریاست کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں، ان کی قدر کریں گے، اس پر فرمایا "چندو لال میرے زمزمے کو کیا جانے اور میری روش کو کیا پہچانے۔" مگر وہاں ان کی شہرت گئی، جس طرح ملک کے اور حصوں میں گئی، وہاں ان کے شاگرد اور قدرداں تھے، جس طرح اور مقامات پر پھیلے ہوئے تھے، وہاں کے ادیبوں نے ان کے ادبی محاسن کا جائزہ لیا اور مشکل اشعار کی شرحیں لکھیں، ان ہی سب باتوں کی تفصیل زیر تبصرہ کتاب میں بیان کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے بہرحال اس کتاب کے لکھنے کا ایک جواز ہے اور غالبیات میں ایک اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر کتاب بہت ہی عجلت میں لکھی گئی ہے۔ چنانچہ محترم مصنف نے پیش لفظ میں لکھا ہے:

"یہ کام مجھے ایک ایسے وقت سونپا گیا، جب غالب صدی تقاریب کے لیے صرف تین ہفتے باقی تھے۔ اس مختصری مدت میں اس موضوع سے انصاف کر سکنا دقت طلب اور جو

وسائل موجود ہوں ان سے استفادہ کرنا مشکل تھا، بہر حال تین چار ہفتوں میں جو بن پڑا
وہ کیا۔" (صفحہ ۷)

اس کی وجہ سے کتاب میں بہت سی خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ سب سے بڑی خامی مجھے ترتیب نظر آئی۔ کتاب کئی ابواب میں تقسیم ہے، مثلاً پہلے باب کا عنوان ہے "فضا" اس میں حیدر آباد پس منظر، عہد غالب کے حیدر آباد اور غالب کے بعد کے حیدر آباد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے کا عنوان ہے "تعلقات" پہلے کی طرح اس کے بھی تین حصے ہیں، تماشائے اہل کرم، ادبی تعلقات ہائے گفتنی۔ تیسرے کا عنوان ہے "دبستان" جس کے دو حصے ہیں تشکیل اور اثرات۔ چوتھے عنوان ہے "غالبیات" جس کے ذیلی عنوانات ہیں، انتقادیات، غالب کی شرحیں، شذرات۔ ب کی یہ ترتیب مناسب اور اچھی ہے، مگر واقعات بیان کرتے وقت اس ترتیب کا پورا را لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، جس کی وجہ سے تکرار کا عیب پیدا ہو گیا ہے، مثلاً "حیدر آباد پس از ب" (۱۸۶۹ تا ۱۹۶۹) کے تحت لکھتے ہیں:

"حیدر آباد کی علمی ادبی محفلوں میں غالب موضوع بحث ہوا کرتے تھے اور یہ بحثیں بعض اوقات سخت و شدید بھی ہوتی ہیں، طرفداران غالب کی تعداد بھی کافی تھی اور ان کی منزلت بھی اونچی تھی، یہی دور ہے جب حیدر آباد میں غالب فہمی کی کوششیں شروع ہوئیں، کلام غالب کی شرحیں لکھی گئیں، ان کے کلام پر مناظرہ اور مباحثے ہوئے اور تنقیدات غالب کا آغاز ہوا، ساتھ ہی ساتھ غالبیات کو حیدر آباد کے بعض کالجوں کے نصاب میں بھی داخل کیا گیا۔" (صفحہ ۳۱ و ۳۲)

یہ بحث و گفتگو چوتھے باب "غالبیات" میں آنی چاہئے تھی اور آئی بھی ہے، اسی وجہ سے اس یہ ذکر بے موقع محسوس ہوا۔ اسی طرح "حیدر آباد پس از غالب" میں صفحہ ۴۲ پر حبیب اللہ ذکا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"غالب کے حیدر آبادی شاگرد حبیب اللہ ذکا غالب سے اس وقت متاثر ہوئے

ہیں جب غالب کی وفات سے برسوں پہلے وہ موجودہ اندھرا پردیش کے ضلع نیلور کے ایک چھوٹے سے مقام ایدگیر میں رہتے تھے ...." (صفحہ ۳۵)

اولاً حبیب اللہ ذکا کے بارے میں "ادبی تعلقات" کے تحت بہت تفصیل سے لکھا گیا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ "عہد غالب کا حیدر آباد" (۱۷۶۱ء تا ۱۸۶۹ء) میں ذکا کا بالکل ذکر نہیں کیا گیا، جبکہ محترم مصنف کے مطابق ذکا کا ربط مرزا غالب سے بذریعہ مراسلت، ۱۸ستمبر ۱۸۶۱ء سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔" (صفحہ ۱۰۲)

اس کتاب میں دعوے بہت ہیں اور ثبوت بہت کم دئے گئے ہیں، مثلاً صفحہ ۴۳ پر جامعۂ عثمانیہ کے ابتدائی اساتذہ کی ایک لمبی چوڑی فہرست دیکر لکھا ہے کہ "ان میں سے کئی ایسے ہیں جنھوں نے "غالبیات" کے ارتقاء میں اہم خدمت انجام دی ہے۔" اگرچہ ان میں سے بعض اساتذہ کی کتابیں اس قدر مقبول اور مشہور ہیں کہ ان سے شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ناواقف ہو، لیکن مصنف کا فرض تھا کہ ان کتابوں کا یہاں ذکر ضرور کر دیتے، اس کے دارالترجمہ اور فاضل مترجمین کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اصحاب دارالترجمہ کی اس مختصر سی فہرست سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں دلدادگان غالب کتنے ہیں۔" میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ جب تک ان مترجمین کے کاموں کی طرف اشارہ نہ کیا جائے، محض فہرست سے کیسے واضح ہو گیا کہ فلاں فلاں دلدادگانِ غالب میں شامل ہیں۔ "حیدر آباد پس از غالب" میں صفحہ ۳۶ پر درج ہے: نواب عماد الملک اور سر راس مسعود نے غالب کی شرحیں لکھوانے کی طرف خصوصی توجہ دی۔" غالب کی شرحوں پر جہاں مستقل عنوان کے تحت تفصیل سے بحث کی گئی ہے، وہاں یہ تو لکھا ہے کہ "غالب کی شرحیں لکھوانے کا خیال سب سے پہلے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو پیدا ہوا" (صفحہ ۲۱۰) مگر سر راس مسعود کا ذکر کہیں نظر نہیں آیا۔ صفحہ ۳۶ پر سر راس مسعود کے ذکر کے بعد ہی ہے: "اس دور کے حیدرآباد کے ادبی ماحول کو ان شخصیتوں کے علاوہ جو یہاں مقیم تھیں، مرزا غالب کے اہم ترین شاگرد مولانا حالی اور رفقاء سرسید میں مولانا ذکاء اللہ اور مولانا شبلی نعمانی کے گاہ بہ گاہ دوروں سے

رونقِ تازہ ملتی رہی۔" اے کاش تھوڑی بہت تفصیل دیدی گئی ہوتی۔ مولانا شبلی پر میں نے تھوڑا بہت کام کیا ہے، میرا احساس ہے کہ انھوں نے غالبؔ کو بالکل نظرانداز کیا ہے۔ ایک صاحب کا جامعہ کے غالب نمبر میں مضمون شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے "شبلی ۔۔۔ منکرِ غالب" منکرِ غالب ہونے کی فاضل مضمون نگار نے جو دلیل دی ہے، اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے، مگر کوئی ایسا ثبوت میری نظر سے نہیں گذرا جس سے معلوم ہوتا کہ شبلی غالب کی عظمت کے معترف رہے ہوں۔ حیدرآباد کی ادبی رونق میں اگر شبلی کے دوروں سے اضافہ ہوا ہو، تو اس کی تفصیل سے مجھ جیسے بہتوں کو فائدہ پہنچا۔ "حیدرآباد پس از غالب" کے خاتمہ پر فاضل مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ: "جدید سائنٹیفک طریقہ ہائے تحقیق کے مطابق غالبیات کے آغاز کا سہرا حیدرآباد ہی کے سر جاتا ہے۔" (صفحہ ۴۲) میرے خیال میں یہ دعویٰ بہت زیادہ ہے۔

اپنی ناپسند کی آخری بات یہ عرض کردوں کہ بعض الفاظ اور طرزِ نگارش مجھے غالبؔ کی شان اور مرتبے کے خلاف نظر آئے۔ فاضل مصنف کے قیاس کے مطابق ناسخ نے غالبؔ سے زرِ ڈگری معلوم کیا تھا، غالبؔ نے اس کے جواب میں جو خط لکھا ہے، جس کا ترجمہ زیرِ تبصرہ کتاب میں درج ہے، اس کا انداز اور لب ولہجہ بہت اچھا ہے، مگر محترم مصنف نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "مرزا اس مشورے پر اتنا چراغ پا ہو گئے۔" (صفحہ ۵۰) اسی طرح جب مرزا غالب کو نظامِ دکن کی خدمت میں قصیدہ لکھکر بھیجنے کا مشورہ دیا گیا تھا تو غالبؔ اپنی بدنصیبیوں کی داستان لکھنے کے بعد فرماتے ہیں: "اب جو میں والیِ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع جائے گی اور والیِ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست تہ و بالا ہو جائیگی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔" (صفحہ ۳۷)، بہ ظاہر غالبؔ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی شوخیِ قلم کا نتیجہ ہے، نہ کہ واقعی غالبؔ سمجھتے تھے کہ ان کے قصیدہ لکھنے سے نظامِ دکن پر آفاتِ سماوی و ارضی ٹوٹ پڑیں گے۔ مگر محترم مصنف نے اسے حقیقت سمجھ کر لکھا ہے کہ اس عمر میں (بڑھاپے میں) وہ

اپنے آپ کو بڑا منوس اور مربی سوز سمجھنے لگتے ہیں۔" (صفحہ ۷۱) آگے چل کر لکھتے ہیں: میرزا اگرچہ اپنی نحوست کے خیال سے والیِ دکن کا قصیدہ نہیں لکھنا چاہتے تھے..." (صفحہ ۷۵)

اس میں شبہ نہیں کہ کتاب اچھی اور مفید ہے، اگر روا روی میں نہ لکھی گئی ہوتی اور تحقیق و تفتیش کا پورا حق ادا کیا گیا ہوتا تو یہ کتاب اور بہتر اور مفید ہو سکتی تھی۔ مگر موجودہ حالت میں بھی اسے غالبیات میں ایک مفید اضافہ سمجھنا چاہیے۔

آثارِ محروم

مرتبہ: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

سائز ۲۰×۳۰/۸، حجم ۲۶۸ صفحات، قیمت: سات روپے، سنہ اشاعت: ۱۹۷۰ء

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

"آثارِ محروم" دراصل ماہنامہ "نیرنگِ خیال" (امرتسر) کا محروم نمبر ہے، فاضل مرتب کے بیان کے مطابق، حضرت محروم کی زندگی ہی میں شروع ہوا تھا، لیکن بوجوہ اس کی اشاعت میں تاخیر ہو گئی۔ یہاں تک کہ حضرت محروم کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد منتظمین نے شاید فیصلہ کیا کہ ان کی پہلی برسی کے موقع پر شائع کیا جائے، لیکن نہ جانے کیوں اس موقع پر بھی شائع نہ ہو سکا اور اب انتقال کے چار سال کے بعد شائع ہوا ہے۔ اس غیر معمولی تاخیر سے ایک عجیب صورت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اس کے بہت سے مضمون نگار اور پیغامات دینے والے بھی وہیں پہنچ گئے ہیں، جہاں حضرت محروم ۶ر جنوری ۱۹۶۶ء کو تشریف لے گئے۔ مثلاً پیغامات دینے والوں میں، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، سردار پرتاپ سنگھ کیروں، نواب مہدی نواز جنگ، سردار گورمکھ نہال سنگھ، احمد محی الدین، شری شام ناتھ نواب سعادت علی خاں اور مضمون نگاروں میں، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، نعیم الدین ہاشمی، مہر اجل خاں، زلش کمار شاد اور مولانا عبدالباقی۔ یہ وہ نام ہیں جو میرے علم میں ہیں، تحقیق کی جائے تو ممکن ہے ایک آدھ نام اور نکل آئیں۔ اتنے مرحومین کو اکٹھا دیکھ کر ذہن کو ایک جھٹکا لگا کہ اس مختصر مدت میں ہم اتنے مدبروں اور ادیبوں سے محروم ہو گئے۔

حضرت محروم کی پہلی برسی پر "افکارِ محروم" کے نام سے مختلف مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا جسے جناب مالک رام صاحب نے مرتب فرمایا ہے اور جس کی رسم اجرا، جامعہ ملیہ کے ایک جلسے میں عمل میں آئی تھی۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے، مگر اس میں مرحوم کی شخصیت اور شاعری کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل مضامین شامل ہیں، زیر تبصرہ کتاب "آثارِ محروم" کے مضامین مختصر ہیں، مگر ان میں تنوع ہے اور مضامین کے علاوہ بہت سی اور چیزیں بھی ہیں، جن سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، مثلاً مشاہیر کے پیغامات اور مکتوبات ہیں، منظوم خراجِ عقیدت ہے، اخبارات اور رسالوں کے اقتباسات ہیں اور وہ سپاسنامے ہیں جو مرحوم کو ان کی زندگی میں مختلف مواقع پر پیش کیے گئے تھے۔ غرض اس کتاب — یا خاص نمبر — میں حضرت محروم کی زندگی اور شاعری کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے اور اس کے مطالعہ سے مرحوم کی مکمل شخصیت کے بارے میں جملہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

جگر بریلوی

مرتبہ: مالک رام، سیفی پریمی

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$، حجم ۱۹۲ صفحات، تاریخ اشاعت: مئی ۱۹۷۰ء

ملنے کا پتہ: علمی مجلس، ۱۴۲۹۔ چھتہ نواب صاحب، فراش خانہ۔ دہلی ۶

"تحریر" ایک سہ ماہی رسالہ ہے جو اردو کے مشہور ادیب جناب مالک رام صاحب کی ادارت میں چار سال سے کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے، اس کا بارہواں شمارہ، بابت مئی ۱۹۷۰ء جناب شیام موہن لال جگر بریلوی کے لیے مخصوص ہے، جن کا اردو کے بلند پایہ ادیبوں اور ممتاز اساتذہ میں شمار ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ مجموعہ مضامین میں موصوف کی نثری اور شعری خدمات اور کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ موصوف کی نظم و نثر میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں جنھوں نے نقادوں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ حضرت نیاز فتحپوری نے ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: "جگر بریلوی کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے اور غزل گو شاعر ہونے کی حیثیت

سے وہ بہت معروف و مقبول ہیں، وہ کلاسیکل رنگ کے شاعر ہیں اور بہت شائستہ، صاف ستھرے ذوق کے "۔ اس مجموعے میں موصوف کے اشعار کا الگ سے انتخاب نہیں دیا گیا ہے، حالانکہ اس کی ضرورت تھی، اس لیے مختلف مضامین میں جو اشعار حوالے کے طور پر دئے گئے ہیں، ان میں سے کچھ اشعار نقل کرتا ہوں، جن سے قارئین جامعہ موصوف کی شاعری کا کچھ اندازہ کرسکیں گے۔

چھوٹی بحر کے کچھ متفرق شعر ملاحظہ ہوں:

کیا تبسم میں اس کے دیکھ لیا
کیوں جگر اشک بار رہتا ہے؟

تھک کے منزل پہ سو گیا ہے، جگر
منہ پہ ڈالے ہے کوئی داماں سا

لا رہا ہوں انھیں تصور میں
اپنے خاکے میں رنگ بھرتا ہوں

وہ سمایا ہوا ہے رگ رگ میں
فیض ہے یہ غم نہانی کا

تیری رحمت سے ناامید نہیں
اپنی محرومیوں سے ڈرتا ہوں

ستم وجور پر یقین کرم
اور بھی استوار ہوتا ہے

نہ پوچھو زندگی کس طرح گذری
میں ہر ہر سانس پہ رو رو دیا ہوں[۳۲]

کچھ نسبتاً طویل بحر کے چند شعر پیش خدمت ہیں:

دل کی سی کہاں ویرانی ، دل کی سی کہاں شادابی
سو بار بیاباں دیکھ لیا ، سو بار گلستاں دیکھ لیا
غم خانۂ دل کی ویرانی ، کچھ گھٹ نہ سکی کچھ بڑھ نہ سکی
مہتاب کو تاباں دیکھ لیا ، خورشید درخشاں دیکھ لیا

یاد کسی کی آ گئی ، کٹ گئی زندگی کی رات
ورنہ کہاں نمودِ صبح ایسی شبِ دراز میں

تیرے ستم نے توڑ دیا دل ، لیکن اس کو کیا کہیے
تیرا ہی دامن پکڑا ہے ، جب آنکھ میں آنسو آئے ہیں

جسے دیکھے وہ فلک زدہ ، یہ جہاں ہے یا کوئی غم کدہ
جو پلٹ دے گردشِ آسماں ، رہیں اس جواں کی تلاش ہے

حضرت جگر بریلوی کی عمر اس وقت کوئی ۸۰ برس ہے اور کچھ عرصہ سے صحت خراب رہتی ہے، اس لیے مدیر "تحریر" جناب مالک رام صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ مجموعہ شائع کر کے اور اردو کے ایک بزرگ ادیب کی خدمات کا اعتراف کر کے فرض کفایہ ادا کیا ہے اور جناب سیفی پریمی کا بھی اردو ادب پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے ان مضامین کو اکٹھا کر کے ایک مفید کام کیا ہے۔

(عبداللطیف اعظمی)

ماہنامہ جامعہ

ہر ماہ کی پہلی یا دوسری کو روانہ کیا جاتا ہے، اگر کسی صاحب کو ۱۰ تک کوئی شمارہ نہ ملے تو براہ کرم اسی مہینے کے اندر اندر اطلاع کر دیا کریں تاکہ اگلے شمارے کے ساتھ اسے بھیجا جا سکے۔ بہت تاخیر سے اطلاع کرنے پر مطلوبہ پرچہ کبھی مہیا کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہوتا۔

مینیجر

جامعہ

سالانہ چندہ چھ روپے		قیمت فی پرچہ پچاس پیسے
جلد ۶۲	بابت ماہ جولائی ۱۹۷۰ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

مجلس ادارت

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، دہلی ۲۵

ٹیلیفون:

ایڈیٹر: ۷۴۲۵۸

منیجر: ۷۴۴۷۰

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی

مطبوعہ: یونین پریس دہلی

ٹائٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

ادھر کچھ عرصہ سے عربی مدرسوں، خاص طور سے بڑے عربی مدرسوں میں جو دارالعلوم ہونے کا مرتبہ رکھتے ہیں، طالب علموں کی اسٹرائک کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے، ان اسٹرائکوں میں کبھی کبھی طلبا تشدد کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں، ایسی نازیبا حرکتیں دیکھنے میں آتی ہیں جن سے ملت کے اخلاقی انحطاط کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔ دو ایک دارالعلوموں میں تو صورت حال ایسی ہوگئی کہ ارباب اہتمام کو پولیس بلانی پڑی، غیر معینہ مدت کے لئے دارالعلوم بند کر دیئے گئے اور طلبا سے ہوسٹل اور مدرسہ کے احاطے خالی کرائے گئے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے اخلاق و شائستگی کے اصولوں کو صدمہ پہونچا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ قدروں کا پرانا اور روایتی ڈھانچا منتشر ہو کر رہ گیا ہے، اور ہمارے دینی حلقوں میں بھی مذہبی قدروں کی وہ قدر نہیں رہی جس سے ان حلقوں کا بھرم قائم تھا۔

عربی مدرسوں میں شاگرد اور استاد کے رشتے نے ایک طرح کے تقدس کی شکل اختیار کرلی تھی، اور صدیوں سے یہی صورت چلی آتی تھی، طالب علم اپنے استاد کی عزت کرتے تھے، ان سے محبت کرتے تھے، ان کی خدمت کو سعادت تصور کرتے تھے، سمجھتے تھے کہ یہ شخصیتیں خود علم کا ایک سرچشمہ ہے اور اس سے محرومی بہت بڑی محرومی ہے۔ استاد طالب علموں کا مربی ہوتا تھا، ان کے دکھ درد میں شریک اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ہر وقت متفکر، ہم نے ایسے استاد دیکھے ہیں جو طالب علموں کی خدمت ایک مذہبی فریضہ سمجھتے تھے اور یہ دیکھتے رہتے تھے کہ اس فریضہ کی بجا آوری میں کوتاہی نہ ہو۔ اس طرح مدرسوں کی فضا خدمت اور محبت کی فضا تھی، اس کے سکون میں کبھی ارتعاش پیدا ہوتا تو ذمہ دار اساتذہ و طلبا

جن میں باہم خاندان کے افراد جیسا قریب ہوتا، حالات کو سنبھال لیتے تھے۔ لیکن اب یہ صورت عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتی۔ ایسا کیوں ہے؟ کیوں اساتذہ وارباب اہتمام اور طالب علم ذرا سی دیر میں ایک دوسرے کے فریق اور حریف بن جاتے ہیں اور وہ سب کچھ دیکھنے میں آرہا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا؟

ہمارے خیال میں ان سوالوں پر غور کرنے اور کسی مثبت نتیجے پر پہنچنے کی ذمہ داری نوجوان طالب علموں پر اتنی نہیں جتنی کہ عربی مدرسوں کے استادوں اور اہتمام کے لوگوں کی ہے۔ آج کا ہر نوجوان خواہ وہ جدید تعلیم کے اداروں کا طالب علم ہو خواہ قدیم تعلیم کے اداروں کا، یا وہ کہیں نہ پڑھتا ہو، اپنا وقت آوارگی میں گذارتا ہو یا کسی شعبہ میں کام کرتا ہو، بیزار ہے اپنے حالات سے، اپنی سماج سے، اپنی پوری زندگی سے، اس بیزاری میں تلخی ہے، بےچینی ہے، جھنجلاہٹ ہے، وہ کیا چاہتا ہے اسے خود نہیں معلوم، ہاں، وہ جن حالات میں ہے اُن پر قانع نہیں رہنا چاہتا، کوئی تبدیلی چاہتا ہے، یہ تبدیلی کیوں ہو اور کیسی ہو، عام طور پر اُسے اس کا کوئی شعور نہیں۔ عربی مدرسوں کے طالب علموں کی بڑی تعداد جس طبقہ سے تعلق رکھتی ہے وہ معاشی، معاشرتی اور ذہنی اعتبار سے پچھڑا ہوا طبقہ ہے، یہ طبقہ اور اِس سے تعلق رکھنے والے یہ طالب علم اپنے گردوپیش زندگی کے معیار کو اونچا ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور بجا طور پر اس کے آرزومند ہوتے ہیں کہ اُن کے بھی معاشی ومعاشرتی حالات بہتر ہوں اور بدلتی ہوئی زندگی میں ان کا بھی اعتبار قائم ہو، لیکن وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ جس طرح کی تعلیم وہ حاصل کر رہے ہیں اُس سے اُن کے معیار زندگی میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی، ہاں قناعت اور دین کی خدمت وہ قدریں ہیں کہ انھیں مادی سود وزیاں سے منہ موڑ کر دین کی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے، اور پھر فارغ ہونے کے بعد دین کے کام میں لگ جانا چاہیئے، لیکن وہ کیا کریں جب وہ دیکھتے ہیں کہ عیسائی مبلغین اپنے دین کی خدمت بہتر طور پر کر رہے ہیں اور ان کی زندگی کا معیار بھی اونچا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے پاس اتنے ذرائع ہیں کہ اگر انھیں سلیقے اور دیانتداری کے ساتھ ایک نظام کے تحت استعمال میں لایا جائے تو کمیت وکیفیت دونوں اعتبار سے ہمارے عربی مدارس دین کی خدمت بہتر طریقے سے کرسکتے ہیں۔ اسی لئے یہ بات بھی کہی جاتی رہی ہے کہ عربی مدرسوں کے

نصابِ تعلیم میں بھی وقت کی ضرورت کے مطابق تبدیلی ہوتی چاہیے، طریقۂ تعلیم بھی بدلنا چاہیے اور تربیت کے اصولوں پر بھی نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔

عربی مدرسوں کے نصاب تعلیم، طریقۂ تعلیم اور تربیت کے اصولوں کی کمزوری کا اندازہ صرف ایک مثال سے کیا جا سکتا ہے، ہم نے عربی مدرسوں اور دارالعلوموں سے نکلے ہوئے ایسے سیکڑوں طالب علم دیکھے ہیں جو ایسے بدلے کہ اپنے فکر و عمل سے کسی طرح یہ ثابت نہیں کر سکتے تھے کہ کبھی انھوں نے عربی مدرسے میں پڑھا ہے، حالانکہ اُن میں سے تقریباً سبھی خالص دینی ماحول میں تقریباً سات آٹھ برس گزار کر آئے تھے، نیا ماحول پاتے ہی تھوڑی ہی مدت میں انھوں نے اپنے آپ کو اس طرح بدل لیا کہ پرانی تربیت کا کوئی اثر اُن سے ظاہر نہ ہوتا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی قید خانے میں مقید تھے اب جو آزاد ہوئے ہیں تو اسیری کا ہر نقش مٹا ڈالنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آج سے تیس چالیس سال پہلے ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا تھا۔ اب شاید تربیت کے وہ پرانے اصول بھی ان مدرسوں میں نہیں برتے جاتے۔ تعلیم کا جو نصاب رائج ہے اور جس طریقے سے تعلیم دی جاتی ہے اس سے زیادہ تر طالب علموں کو دین کی صحیح تعلیم اور علوم اسلامیہ کی کافی معلومات حاصل نہیں ہو پاتیں، ہمارے علماء کو اس اہم مسئلہ کی طرف فوری توجہ کرنی چاہیے، نصابِ تعلیم کو دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے مفید بنانا چاہیے، طریقۂ تعلیم ایسا ہو کہ طالب علموں میں غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو، اور تربیت اس ڈھنگ سے کی جائے کہ مزاج میں پختگی، اعلیٰ اخلاقی قدروں سے محبت اور دین کی خدمت کا سچا جذبہ پیدا ہو۔

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ نوجوانوں کی تربیت کے لئے استادوں کو اپنی زندگی میں بڑی تبدیلی کرنا ہوگی، انھیں اخلاق، ایثار، نفس کشی، محنت اور دیانتداری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا چاہیے، اگر وہ قناعت کی تعلیم دیں تو خود قناعت پسند ہوں، اگر توکل کی بات کریں تو اپنی زندگی سے ثابت کریں کہ وہ خود اس پر ایمان رکھتے ہیں، ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت عربی مدرسوں میں استادوں کا جو حال ہے اُس کا بہت خراب اثر طالب علموں پر پڑ رہا ہے، بلاشبہ ان مدرسوں میں اچھے اساتذہ بھی ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے اور روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے، ان مدرسوں میں بھی

سیاست" کا وہ انداز ہے جو آج یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پایا جاتا ہے، گروپ بندی، ایک دوسرے کی برائی، اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ، اپنے مفاد کے لئے طالب علموں کو استعمال کرنا، طالب علموں کے سامنے اپنے ساتھیوں کی غیبت، رشد وہدایت کے نام پر طویل اسفار، تبلیغ کو بہانہ بنا کر اسباق سے بچنے کا رجحان ــــ یہ اور اس طرح کی دوسری خرابیاں بڑھتی جارہی ہیں، ظاہر ہے کہ ان باتوں کا اثر طالب علموں پر پڑتا ہے اور یہ سب خرابیاں ان میں بھی پیدا ہو رہی ہیں۔ طالب علم جو پہلے ہی سے اپنے حال سے بیزار اور مستقبل سے مایوس ہیں، معمولی سی بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں اور مدرسوں کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔

عربی مدرسوں کے ارباب اہتمام کی اپنی الگ سیاست ہو گئی ہے اور وہ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے اساتذہ کی گروپ بندیوں کو مفید سمجھتے ہیں، حالانکہ اُن کا کام یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ ایسے عناصر کی حوصلہ شکنی کرتے، اچھے اساتذہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے اور روز بروز گرتے ہوئے معیار تعلیم و تربیت کو سنبھالتے، مدرسے کے انتظام و انصرام میں اساتذہ و طلباء کو شریک کرتے اور ادارہ کو چلانے کی ذمہ داری انھیں پر ڈالتے، یعنی مدرسے کا ماحول جمہوری ہوتا، آمرانہ نہ ہوتا۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ طالب علم، استاد اور اہتمام کے افراد، کوئی بھی سوچنے سمجھنے اور دوسرے کی سننے کے لئے تیار نہیں، کس سے کہئے اور کیا کہئے! پوری ملت پر ایک ہمہ گیر انحطاط ہے جو ادبار بن کر چھایا ہوا ہے، ہمارے جدید تعلیم کے ادارے تو زبوں حالی کا شکار تھے ہی، اب عربی مدرسے اور دارالعلوم بھی جو کبھی دین کے قلعے تھے، اخلاقی اور تعلیمی لحاظ سے کمزور ہوتے جارہے ہیں:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

ڈاکٹر امت اللہ

ڈاکٹر ذاکر حسین — افکار و نظریات

(یہ مضمون جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اُس جلسے میں پڑھا
گیا جو ذاکر صاحب مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر
بتاریخ ۳ مئی ۱۹۷۰ء منعقد ہوا ——)

جناب صدر، ڈاکٹر وی، کے، آر، وی، راؤ، خواتین و حضرات،

ذاکر صاحب کو ہم سے جدا ہوئے ایک سال بیت گیا مگر ہمیں یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہے، ہم لوگ جنھیں ان کی رہنمائی میں کام کرنے کا موقع ملا، ان کی ذات اور صفات سے اس قدر متاثر ہیں کہ اب جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کا جائزہ لینا بڑا کٹھن کام ہے، پھر جو شخصیت اتنی ہمہ گیر اور پہلودار ہو اس کا نقش کھینچنا اور بھی مشکل بات ہے، اس کے علاوہ موقع اور وقت اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی طویل مضمون پیش کیا جائے۔

ہندوستان میں اپنے دور کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سبھی اہم پہلوؤں کا ذاکر صاحب نے بغور مشاہدہ کیا اور اپنے علم اور مطالعے کی روشنی میں ان سے متعلق نظریات قائم کیے۔ ان کی تحریریں اور تقریریں، ان نظریات کی آئینہ دار ہیں۔ یہاں ہم صرف دو چیزوں سے بحث کریں گے ایک تو یہ کہ ذاکر صاحب کے نزدیک قومیت اور قومی تعلیم کا تصور کیا

تھا اور دوسرے یہ کہ وہ فرد اور جماعت کے باہمی رشتے کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور وہ کس قسم کا سماج قائم کرنا چاہتے تھے، دراصل یہ دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ آپس میں گہرا تعلق رکھتی ہیں۔

موضوع کی حد بندی کرنے کے بعد بھی یہ بات مشکل معلوم ہوتی ہے کہ مضمون کو کیسے شروع کیا جائے۔ غالباً اس معاملے میں اس سے مدد ملے گی کہ اگر ذاکر صاحب آج زندہ ہوتے تو ملک کے موجودہ حالات سے ان کے دل و دماغ پر کیا کیفیت طاری ہوتی، پچھلے ایک سال کی مدت میں ملک کو نہایت شرم ناک فرقہ وارانہ حادثات سے دوچار ہونا پڑا ہے، درندگی اور بہیمیت کے اعتبار سے یہ بھی کم و بیش اسی درجے کے ہیں جو ملک کے بٹوارے سے پہلے رونما ہوئے تھے۔ ان واقعات سے ایک بار پھر ہمارے کانوں میں ذاکر صاحب کے وہ الفاظ گونجنے لگے ہیں جو انھوں نے جامعہ کی سلور جبلی کے موقع پر ۱۹۴۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے رہنماؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے:

"آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے، یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے، حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ اس کے نئے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ ...... ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے، جب ہم یہ سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں........ خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھایئے، یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھایئے۔ یہ مسئلہ اس قوم اور اُس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے، خدا

کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو کھدنے نہ دیجیے۔"

کتنا گہرا درد اور شدید کرب ہے ان الفاظ میں! آج کا ہندوستان ۱۹۲۶ء کے ہندستان سے مختلف ہے، ملک کے دو حصے ہو چکے ہیں اور دونوں حصے اپنی اپنی جگہ آزاد اور خود مختار ہیں۔ لیکن قوم کے لیڈروں سے ان الفاظ میں جو اپیل کی گئی ہے اس کی معنویت کم نہیں کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے۔ اور آج روئے سخن چند چوٹی کے نیتاؤں کی طرف نہیں بلکہ دیس میں بسنے والے سب کے سب مخاطب ہیں۔ اس آواز میں ایک پیغام عمل پوشیدہ ہے جو ہم سب کو جد و جہد کی دعوت دیتا ہے۔

ہندوستان کی متحدہ قومیت کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ہیں۔ مذہب، ذات پات، تہذیب، زبان اور علاقے کی بنا پر شدید اختلافات پائے جاتے ہیں اور یہ قومی یک جہتی اور ہم آہنگی قائم کرنے کی کوششوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے کاشی ودیا پیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ۱۹۳۵ء میں فرمایا تھا:

"مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہے کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔"

اسی خطبے میں ذاکر صاحب نے قومی تعلیم کے مسئلے کا بھی ذکر کیا ہے اور تعلیم کے سماجی اور تہذیبی تصور کی روشنی میں اس گتھی کے حل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہماری قومی تعلیم کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے، مثلاً ہمارے دیس میں طرح طرح کے

کے لوگ بستے ہیں، جن کی بولیاں الگ الگ ہیں، رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، عادتیں اور رسمیں جدا جدا ہیں، مذہب علاحدہ علاحدہ ہیں، قومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کو سوچنا ہوگا کہ وہ نظام کی یکسانیت کی خاطر اور متحدہ قوم پیدا کرنے کے ولولے میں ان تفریقوں کو بالکل پس پشت ڈال دیں یا ہر صوبے اور ہر گروہ کو جس کا تمدنی اثاثہ اتنا ہے کہ اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بن سکے، اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے تعلیم کا کام لے اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی ترقی کی راہیں نکالے۔ اگر آپ کے نزدیک تعلیم کا وہ نظریہ صحیح ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو غالباً اپنے شہریوں کے ان مختلف گروہوں کو اپنے اپنے تمدن سے تعلیمی کام لینے کا موقع دینا سیاسی دانشمندی کا تقاضا ہی سمجھا جائے گا بلکہ خود صحیح تعلیم کے لیے لازمی مانا جائے گا۔"

دراصل قومی یک جہتی اور قومی تعلیم کا یہ تصور اُس تصور سے بالکل مختلف ہے جو بعض قومی یک جہتی کے نام لیوا "بھارتی کرن" کے نعرے میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اکثریت کی تہذیب ہی فقط ہندوستانی تہذیب کہلانے کی مستحق ہے۔ اس لیے اُسی کو تمام لوگوں پر مسلط کر کے قومی یک جہتی کی ضمانت کی جا سکتی ہے۔ یہ گروہ کثرت میں وحدت تلاش کرنے کا قائل نہیں اور اسی وجہ سے اُسے وحدت میں کثرت گوارا نہیں۔

ذاکر صاحب کا قومی تعلیم سے متعلق یہ خیال تعلیم کے اُس تصور سے ہم آہنگ ہے جو انہوں نے متعدد بار مختلف موقعوں پر واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"سماج کی تمام مادی اور غیر مادی چیزیں سب ذہن انسانی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انسان کا ذہن اپنے کو ان چیزوں سے ظاہر کرتا ہے، یا یوں کہیے کہ ذہن اپنے کو اپنے سے باہر یہ شکلیں دیتا ہے۔ ان چیزوں میں اس شخصیت کے ذہن کا اثر بھی ہوتا ہے جس نے انھیں بنایا، اس قوم یا نسل کا اثر بھی ہوتا ہے جن میں اس نے یہ چیزیں بنائی تھیں۔

ان سب کا اثر یوں کہیے کہ ان چیزوں میں آکر چھپ رہتا ہے، سو جاتا ہے، کوئی نیا ذہن جب انھیں اپنے اندر قبول کرتا ہے تو یہ چھپی ہوئی قوتیں ابھرتی ہیں، سوئی ہوئی طاقتیں جاگتی ہیں۔ تمدنی چیزوں کی ان سوئی ہوئی قوتوں کو پھر سے کسی انسان کے ذہن میں جگانے سے اس ذہن کی تعلیم ہوتی ہے، اور کسی چیز سے ذہن کی تربیت اسی حد تک سمجھنی چاہئے جس حد تک اس کی سوئی ہوئی قوتیں قبول کرنے والے کے ذہن میں جاگی ہیں ـــ مثلاً اچھے سے اچھے شعر کو کوئی رٹے جائے، ذہن کی کوئی تربیت نہ ہوگی، اگر پڑھنے والے کے ذہن میں پوری طرح یا کچھ نہ کچھ وہ کیفیات پیدا نہ ہوں جو کہنے والے پر طاری تھیں اور جنھیں اس نے اپنے کلام میں گویا لاکر چھپایا تھا، سلایا تھا۔"

ہر تعلیم کا یہ تصور اصل میں تمدنی یا تہذیبی اشیار کے لین دین کا معاملہ ہے۔ یہ لین دین صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ لینے اور دینے والے دونوں کی طبیعت میں کسی حد تک یکسانی ہو۔ اسی بات کو ذاکر صاحب نے کسی اور جگہ مختصر الفاظ میں اور جامع طور پر یوں کہا ہے:

"ذہن معروض اور ذہن موضوع میں مطابقت اور مناسبت کا خیال رکھنا تعلیم کا بنیادی گُر ہے۔" یہی وجہ ہے کہ ذاکر صاحب سب کے لیے ایک قسم کی تعلیم اور وہ بھی فقط کتابی تعلیم کے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک طلبہ کی بہت بڑی اکثریت ایسی ہے جو صرف ان اشیار تمدنی سے اپنی ذہنی تربیت کا انتظام کر سکتی ہے، جن کا تعلق ہاتھ کے کام سے ہے، کچھ بنانے بگاڑنے سے ہے، توڑنے جوڑنے سے، غرض کچھ کرنے سے ہے۔

ذاکر صاحب تعلیم میں نری انفرادیت کے قائل نہ تھے، وہ فرد اور سماج کے باہمی رشتے کو ذہنی زندگی کی اصل سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک جگہ کہا ہے:

ذہنی زندگی تو بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں ...... ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی ہی سے پیدا ہو سکتی ہے یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ ہی سے جلایا جا سکتا ہے.... اس لیے ذہنی زندگی کے لیے، جو اصلی معنوں میں انسانی زندگی ہے، سماج کا وجود

لازمی ہے، بدن میں ہر حصے کی کچھ الگ الگ حیثیت بھی ضرور ہوتی ہے، مگر اسی حد تک کہ وہ کل جسم سے وابستہ ہے اور اسی کے اندر اپنی خدمت انجام دے رہا ہے، ایک حصے کے کٹ جانے سے جسم میں کمی آجاتی ہے۔ مگر وہ باقی رہ سکتا ہے، مگر حصہ جسم سے الگ ہوکر باقی بھی نہیں رہ سکتا۔"

اسی لئے ذاکر صاحب کے نزدیک تعلیم محض نجی صلاحیتوں کو ترقی دینے کا نام نہیں، اپنی شخصیت پختہ کرنا، نام نمود یا آسائش حاصل کرلینا بھی تعلیم کا مقصد نہیں۔ اور نہ ہی کسی فن میں کمال حاصل کرلینا، یا کوئی خاص مہارت پیدا کرلینا، تعلیم کا منصب ہے، تعلیم صرف اسی وقت تعلیم کہلانے کی مستحق ہے جب کہ وہ کسی جماعتی مقصد کے حصول کا ذریعہ بن جائے۔ فرماتے ہیں:

"تعلیم مہارتوں سے نہیں ہوتی، مہارتوں کو اچھے مقاصد کا خادم بنانے سے ہوتی ہے...... جب تک فرد اپنی قوتوں کو جماعت کی خدمت کے لئے صرف کرنا نہ سیکھے اس وقت تک اس کی ہنرمندی جماعت کے انتشار کا باعث بن سکتی ہے۔"

ذاکر صاحب کے افکار پر فلاطوں اور جرمنی کے بعض مفکرین کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب نے فلاطوں کی شہرۂ آفاق تصنیف "ریاست" یا "تحقیق عدل" کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا اور اس پر ایک مقدمہ لکھا اس میں وہ فلاطوں کے بعض بنیادی خیالات سے متفق نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"حیات انفرادی کا پودا جماعت کی نمو بخش فضا ہی میں پرورش پاتا ہے، مرد و تو یکساں طور پر ذہنی زندگی کے لوازم ہیں۔ بچہ ہی ماں کو ماں بناتا ہے اور اس میں وہ ساری ذہنی خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو عورت میں محض بحیثیت جنس نہیں ہوتیں۔ اور ماں ہی اپنی محبت اور شیفتگی سے بچے کی ذہنی زندگی کو وہ متاعِ گراں مایہ دے سکتی ہے جس کا بدل دنیا کی اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی........ فلاطوں کے نزدیک انسان محض انفرادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے

کسی جماعت، کسی ریاست کی رکنیت کا محتاج ہوتا ہے۔ اچھا آدمی اچھی ریاست ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔"

ذاکر صاحب کے تعلیمی افکار میں افلاطون کے اس اصول کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے جسے اس نے "تخصیص کار" کے اصول کا نام دیا ہے۔ مقدمے میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

"افلاطون فرد کو جسم اجتماعی کا ایک عضو مانتا تھا۔ اس لیے اس نے اس اخلاقی صفت پر بحث کی جس کی وجہ سے آدمی ہوائے نفس کا بندہ بن جانے کے بجائے ضبط نفس سے کام لیتا ہے اور جماعت کی فلاح کے لیے بس ایک کام اختیار کر لیتا ہے یعنی اپنے وظیفۂ اصلی کو پورا کرتا ہے۔ اس انفرادیت کے بجائے جو جمہوریت کے پردے میں پھیلی ہوئی تھی، افلاطون اجتماعی تعاون کا پیام دیتا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے تخصیص کار کا اصول پیش کرتا ہے تاکہ ہر فرد اور ہر طبقہ اپنے فرض مفوضہ کو قناعت اور خوش دلی سے انجام دیتا رہے۔ اپنا "دھرم" پورا کرتا رہے کہ افلاطون کی نظر میں یہی اجتماعی زندگی کا سچا اصول یعنی عدل ہے .... اس تخصیص کار کو کامیاب بنانے کے لیے لازمی ہے کہ ہر فرد اور ہر طبقے کو اس کے وظائف مخصوصہ کے لیے تیار کرنے کا انتظام کیا جائے، یہ تعلیم کا کام ہے۔"

ذاکر صاحب افلاطون کے اس نظریے کے حامی تو نہیں، جس کے مطابق وہ سماج کو تین طبقوں میں مستقل طور پر تقسیم کرتا ہے، یعنی حکمراں فلسفیوں کا طبقہ، ریاست کے محافظوں، جنگ آزماؤں کا طبقہ اور دولت پیدا کرنے والوں یا محنت کشوں کا طبقہ۔ مگر ذاکر صاحب افلاطون کے اس معاملے میں ہم نوا معلوم ہوتے ہیں کہ سماج میں تخصیص کار کا اصول کارفرما ہونا چاہئے کہ یہی وہ کام ہے جس کے ذریعے فرد نہ صرف سماج کی خدمت کرکے اسے مستحکم اور پائیدار بنا سکتا ہے بلکہ خود اپنی نشوونما کا اہتمام کر سکتا ہے۔

ذاکر صاحب فلاطون کے اس خیال کی بھی تائید کرتے ہیں کہ تعلیم درحقیقت ریاست کا کام ہے۔ انھوں نے بنیادی قومی تعلیم کی دوسری سالانہ کانفرنس، ۱۹۴۱ء میں اس خیال کی وضاحت ان الفاظ میں کی :

"میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی تعلیم کا کام ریاست کا کام ہے، یہ اتنا بڑا اور اتنا پھیلا ہوا کام ہے کہ نجی کوششیں اسے سمیٹ نہیں سکتیں لیکن اگر ریاست کسی ایک فرقے یا گروہ کی حکومت کا نام ہے، تو یہ ایسی چلتی پھرتی چھاؤں ہے کہ تعلیم کبھی زیادہ دیر تک سیدھے راستے پر نہیں چل سکے گی۔ ہاں ریاست اگر سماجی زندگی کی اس تنظیم کو کہتے ہیں جس کی بنا عدل پر ہو، جو خود روز بروز اپنی اس بنیاد کو مضبوط کر کے اخلاقی ترقی کرتی جاتی ہو اور دن بدن اپنے شہریوں کی کوشش سے ہر گروہ اور ہر طبقہ کیا ہر آدمی کی اخلاقی شخصیت کی پوری ترقی کا راستہ اس میں سہل سے اور سہل ہوتا جاتا ہو، تو پھر تعلیم ایسی ریاست کا سب سے ضروری کام ہے اس لیے کہ خود اس کی اخلاقی ترقی اس کام سے ہوتی ہے۔"

تعلیم میں اور خاص طور پر ابتدائی تعلیم میں جسے بنیادی تعلیم بھی کہتے ہیں، ذاکر صاحب نے ہاتھ کے کام پر بہت زور دیا ہے کہ یہی ان کے نزدیک اس عمر کے بچوں کی تعلیم کا موزوں اور موثر ذریعہ ہے مگر وہ تعلیمی کام کو میکانکی عمل بنانے کے خلاف ہیں۔ کیوں کہ بلا سوچے سمجھے کسی عمل کو بار بار دہرانا تعلیمی کام نہیں ہے۔ تعلیمی کام صرف وہی ہے جس سے ذہنی اور اخلاقی تربیت ہو۔ وہ کہتے ہیں :

"سچے کام کا مدرسہ وہی ہے جو بچوں میں کام سے پہلے سوچنے اور کام کے بعد جانچنے اور پرکھنے کی عادت ڈالے تاکہ کام سے اس بات کی عادت سی ہو جائے کہ جب کبھی کوئی کام کریں، ہاتھ کا یا دماغ کا، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔"

کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یاد رکھنا چاہیے کہ کام بے مقصد نہیں

ہوتا۔ کام بس کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں۔ کام خالی دل لگی نہیں، کام کھیل نہیں، کام کام ہے، بامقصد محنت ہے، کام دشمن کی طرح آپ اپنا محاسبہ کرتا ہے، پھر اس میں پورا اترتا ہے تو وہ خوشی دیتا ہے جو کہیں نہیں ملتی۔ کام سیاحت ہے، کام عبادت ہے۔"

ذاکر صاحب تعلیم کے علاوہ معاشیات کے بھی عالم تھے ۱۹۴۴-۴۵ء میں "سرمایہ داری" کے موضوع پر انھوں نے دہلی یونی ورسٹی میں جو لکچر دئے تھے ان سے ان کا اقتصادیات سے متعلق نقطۂ نظر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ "سرمایہ داری" کو ایک تہذیبی اور تمدنی مظہر کی حیثیت سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں سائنسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ وہ ان سماجی محرکات کی کھوج کرنا چاہتے ہیں، جن سے "سرمایہ داری" عالم وجود میں آئی اور پروان چڑھی۔ وہ اس کی اچھائی یا برائی پر حکم لگانا نہیں چاہتے۔ مگر یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص جو اخلاقی اقدار کا پیرو ہو اور جس نے اپنی حیات عزیز کا بیشتر حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا ہو "سرمایہ داری" جیسے ایک سماجی مظہر کو خالص معروضی نقطۂ نظر سے سمجھے اور سمجھائے۔ اس نقطۂ نظر کو اپنانے میں غالباً انھیں اپنے استاد زومبارٹ کی پیروی مقصود ہے، جیسا کہ انھوں نے اپنے پہلے لکچر میں خود واضح کیا ہے۔ مگر ذاکر صاحب کا آخری لکچر ان کی آرزوؤں کی غمازی کرتا ہے۔ یہاں انھوں نے آئینۂ حال میں مستقبل کی جھلک دکھائی ہے۔ فرماتے ہیں: "جب سماج کے قابو میں پوری معیشت آجائے گی اور جب وہ ذاتی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت ہو جائے گی۔ صرف اسی وقت یہ ممکن ہوگا کہ ضمیر اجتماعی کا حالات محنت پر اختیار ہوگا۔" آج سے پچیس سال پہلے ذاکر صاحب نے بشارت دی تھی کہ ہندوستان میں سرمایہ داری اپنے مفاد کی خاطر ضروری تنظیم کرے گی اور جب وہ نامعقول پاگلوں کی جیسی حرکتیں کر چکے گی تو سماجی ضمیر بیدار ہوگا اور اپنا زور دکھائے گا اور اس معیشت کو جس کی بنیاد ذاتی فائدے پر ہے، ایسی سماجی معیشت میں تبدیل کر دے گا جو منصوبہ بندی کے ذریعے

سب لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنا اپنا مقصد سمجھے گی ___ اس وقت ذاکر صاحب نے کتنی حسرت کے ساتھ کہا تھا کہ نہ جانے وہ دن کب آئے گا اور قطرے پر گوہر ہونے تک کیا کچھ گزرے گی ___ مگر ہم جانتے ہیں کہ ان کی زندگی ہی میں اس منزل کی طرف ملک نے قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا ___ کیا عجب کہ ان کے خواب کی تعبیر جلد پوری ہو جائے۔

اجیت بھٹاچاریہ جی
ترجمہ: ڈاکٹر سید جعفر رضا بلگرامی

عرب و اسرائیل

①

جنگ کا پس منظر: ایک نفسیاتی جائزہ

ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر جناب اجیت بھٹاچاریہ جی نے ماہ اپریل میں 'رپورٹ آن ویسٹ ایشیا' کے عنوان سے چار حصوں میں اپنے مغربی ایشیا کے سفر کے تاثرات شائع کیے تھے۔ ۱۴ مئی ۱۹۶۸ء کو انھوں نے ایک مختصر اور بلیغ اداریہ بھی لکھا۔ ہم جامعہ کالج کے استاد جناب ڈاکٹر جعفر رضا بلگرامی کے ممنون ہیں کہ ہماری درخواست پر انھوں نے قارئین جامعہ کے لئے اس کا خلاصہ اور ترجمہ کیا ہے۔ اجیت بھٹاچاریہ جی کی ہر بات سے اتفاق کرنا تو مشکل ہے لیکن اُن کے تاثرات سے ایک حد تک مغربی ایشیا کی موجودہ صورت حال واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ جون ۱۹۶۷ء میں عربوں پر اسرائیل کو جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی، سیاسی لحاظ سے اُسے اس کا خاطر خواہ فائدہ نہیں پہونچا۔ فوجی نقطۂ نظر سے یہ فائدہ ضرور پہونچا ہے کہ مقبوضہ علاقوں کے بیچ میں حائل ہونے سے اس کی دفاعی پوزیشن مضبوط ہو گئی ہے، لیکن اس کے لئے ایک خطرناک صورت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ آزادی فلسطین کی تحریک اور اس کے گوریلا حملوں کی شدت اور وسعت بڑھ گئی ہو۔ مغربی ایشیا میں پی۔ ایل۔ او (Palestine Liberation Organisation)

اب ایک ایسی طاقت بن گئی ہے جسے کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس تحریک کا نعرہ اب یہ نہیں ہے کہ اسرائیل کو سمندر میں ڈھکیل دو، بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ فلسطین کی ایک نئی مملکت قائم کی جائے جس میں مسلمان، عیسائی اور یہودی ایک سیکولر نظامِ حکومت کے تحت برابر کے شہری اور بھائی کی حیثیت سے رہیں اور ترقی کریں۔ اس تحریک کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ یہی ایک ایسی صورت ہے جو مغربی ایشیا میں مستقل امن وسلامتی کی ضامن ہوسکتی ہے۔ فلسطینی رہنما جانتے ہیں کہ اسرائیل اس تجویز کو آسانی سے ماننے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ پھر بھی یہودیوں میں کچھ لوگ ہیں جو اِسے سننے اور سمجھنے کے لئے تیار ہیں۔ اس سلسلہ میں اسرائیل ملٹری انٹیلیجنس کے ڈائرکٹر جنرل، جنرل حکابی اور عالمی صیہونی تنظیم کے سابق صدر اور عالمی یہود کانگرس کے موجودہ صدر ناہم گولڈمن کے خیالات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حکابی کا کہنا ہے کہ ہم اسرائیلیوں کو عربوں کے نکتۂ نظر کو سمجھنا چاہئے کہ وہ ہمارے وجود کو اپنی تباہی کا سبب کیوں سمجھتے ہیں، وہ ہمارے اس تصور کو کسی طرح انگیز نہیں کرسکتے کہ وہ صدیوں ہمارے وطن پر قابض رہے اور اب جبکہ ہم واپس آئے ہیں، انہیں فلسطین چھوڑ دینا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا یہ نقطۂ نظر انھیں کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ دو ماہ قبل فارین افیرز میں گولڈمن کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اس نے بڑی جراءت کے ساتھ یہ بات کہی تھی کہ "اسرائیل کی ریاست کا موجودہ کردار اور اس کی پوری ساخت اس کے وجود کے لئے خطرہ ہے۔" اس کا خیال ہے کہ اسرائیل کا موجودہ ڈھانچہ فلسطینیوں کے ساتھ ناانصافی پر مبنی ہے۔ ان کا یہ دعویٰ کہ وہ صدیوں سے فلسطین میں رہتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ ان کا وطن ہے، ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، اور اس سے انکار ایک احمقانہ اور غیر منصفانہ فعل۔

• اسرائیل آخر کب تک فوجی طاقت کے بل پر قائم رہے گا؟ کیونکہ عربوں نے ماضی میں ایک عظیم الشان تہذیب کی بنیاد رکھی تھی اور کوئی شبہ نہیں کہ ایک دن وہ اپنے

پرامن اور جنگی مقاصد کے لئے مغرب کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی میں پوری مہارت حاصل کر لیں گے۔ یہ اسرائیل کے قیام میں اس با اثر یہودی رہنما کا اہم رول رہا ہے، لیکن آج یہ رہنما اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اسرائیل کو اپنی جنگجویانہ روش چھوڑ کر عربوں کی روایتی فیاضی سے فائدہ اٹھانا چاہئے جنھوں نے ہمیشہ یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ منصفانہ اور شریفانہ سلوک کیا ہے۔ مسٹر گولڈمن نے یہودیوں کو یہ انتباہ دیا ہے کہ وقت ان کے ساتھ نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ رفتہ رفتہ سیاسی اعتبار سے ان کی حیثیت کمزور ہوتی جا رہی ہے اور ترقی پسند دنیا کا ایک بڑا حصہ اُن سے مایوس اور ان کا مخالف ہو گیا ہے۔

افسوس ہے کہ اسرائیل میں گولڈمن کی طرح کے لبرل یہودیوں کی تعداد برائے نام ہے جو وقت کے تقاضوں اور مغربی ایشیا کے مسئلوں کو حقیقت پسندانہ اور منصفانہ زاویہ نگاہ سے دیکھ سکیں۔ جب تک یہ صورت نہ پیدا ہوگی اور اسرائیل کا حکمراں اور دانشور طبقہ نسلی برتری اور فوجی طاقت کے سحر سے آزاد نہ ہوگا، مغربی ایشیا کا بحران ختم نہیں ہو سکتا۔

'مدیر'

جون ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ جو بہ ظاہر فیصلہ کن نظر آتی تھی آج تک جاری ہے۔ اب امن کی توقع کرنا بیکار ہے کیونکہ خود جنگ کے اختتام کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اسرائیل کی فضائی فوج نے پڑوسی ملکوں کو کافی تباہ کیا ہے لیکن اس فوجی برتری کے باوجود جنگ فیصلہ کن نہیں ہو سکی ہے۔ اسرائیل اپنی فضائی طاقت کے بل بوتے پر عربوں کو ایک غیر معین مدت کے لئے بے دست و پا کر سکتا ہے لیکن فضائی "سپاہ" آباد علاقوں پر قبضہ نہیں کر سکتی۔ پورے عرب ممالک کی دس کروڑ آبادی کے مقابلے میں اسرائیل کی تقریباً تیس لاکھ کی آبادی اتنی بڑی فوج نہیں تیار کر سکتی کہ وہ تمام تباہ شدہ علاقوں پر قبضہ کر لے۔

ان حالات میں اسرائیل کے پاس بس ایک ہی چارۂ کار باقی ہے کہ وہ اپنی شرطیں منوانے کے لئے اپنے پڑوسی ملکوں پر شدید اور بار بار حملے کرتا رہے اور اس طرح ان کو گفت وشنید پر مجبور کر کے اپنی مرضی کے مطابق امن قائم کرالے۔ لیکن چھ روزہ جنگ کی واضح کامیابی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے جنگی برتری کے مظاہرے کے باوجود پڑوسیوں نے اب تک ہار ماننے سے انکار کیا ہے۔ ان ملکوں کے لیڈر اور ان کی حکومتیں جنگ میں ناکامیابی کے باوجود صرف یہ کہ اسرائیل کو چیلنج کرتی رہتی ہیں بلکہ مستحکم بھی رہتی ہیں۔ اسی استحکام نے اسرائیل کی توقعات پر پانی پھیر دیا ہے۔ دراصل چھ روزہ جنگ میں شکست کا یہ ردعمل ہوا ہے کہ عربوں کی جنگی سرگرمیاں کچھ اور بڑھ گئی ہیں۔

اگر ایک مقررہ مدت میں فوجی شکست وفتح پر مغربی ایشیا کے حالات کا انحصار ہوتا تو اسرائیل بہت پہلے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔ دراصل کچھ اور عوامل ہیں جن کی وجہ سے مغربی ایشیا شدید بحران میں مبتلا ہے۔ عربوں اور اسرائیلیوں کی تہذیب، اقدار اور طبیعت ومزاج میں ایسا زبردست اختلاف ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو گوارا کرنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ دونوں جانب ایسے افراد موجود ہیں جن کا سوچنے سمجھنے کا انداز اور ردعمل یکساں ہے اور ان میں آپس میں بھی اختلاف موجود ہے۔ لیکن عرب واسرائیل کے درمیان اختلافات کی خلیج اتنی گہری اور چوڑی ہے کہ کسی سمجھوتے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

ایک لحاظ سے اسرائیل کی فوجی برتری اور مادی ترقی بھی اسرائیل اور عرب ممالک کے لئے ایک دوسرے کے قریب آنے میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ یہودیوں نے اپنی معاشی تنظیم، ٹیکنالوجی، محنت اور قابلیت کے ذریعہ ریاستی معاملات میں ممتاز وموثر حیثیت حاصل کر کے یورپ اور امریکہ کی سوسائٹی کو متاثر کیا ہے اور ان کا پڑھا لکھا طبقہ اس سوسائٹی میں غالب رہا ہے۔ اب جب کہ انھوں نے اپنا نیا ملک بسایا ہے، فطری طور پر ان سب میں ہم مقصدیت اور ہم آہنگی کا احساس بڑھ گیا ہے،

اسرائیلیوں کی خود بینی و جذبۂ مفاخرت کے مقابلہ میں عربوں میں شکست و سزا کے سامنے تسلیم و رضا کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہ زندہ رہیں گے جیسا کہ اب تک رہے ہیں، چاہے اس کے لیے سو برس کا زمانہ درکار ہو۔ اسرائیلی عوام پر یہ ایک عجیب طنز ہے کہ اپنے دشمن کی اس خوش عقیدگی کو کوئی ان سے بہتر سمجھ بھی نہیں سکتا کیونکہ وہ خود ایک عرصۂ دراز تک صبر و تحمل کے ساتھ جد وجہد کر کے اپنے آپ کو زندہ رکھ سکے ہیں۔ صدیوں پُرانی تہذیب کے وارث مصر میں یہ تسلیم و رضا کا جذبہ اور انتظار کی صلاحیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مزاج کی اس پوری کیفیت کو عربی کے لفظ 'مالیش' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وقت کی شدت کو برداشت کیجئے چاہے اس قوت برداشت کے مقابلہ میں عملی کاوشوں کا تناسب گھٹ جائے۔ اردو میں جس لہجہ میں "یہ بھی ہوتا ہے، بھئی" ادا کیا جاتا ہے وہ بہت کچھ عربی کے اس لفظ کے معنی کے قریب ہے۔ اس انداز فکر کا منفی نتیجہ غیر ذمہ داری، غیر مستعدی اور کمزور تنظیم کی شکل میں نظر آتا ہے جبکہ کسی مہم کو سر کرنے کے لئے افراد میں پیش قدمی اور جلد فیصلہ کرنے کی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ناموافق حالات میں بھی خوش مزاجی، ملنساری اور صبر و تحمل باقی رہتا ہے۔ یہ اسی مزاج کی کرشمہ سازی ہے کہ فوجی شکست نہ تو مصریوں کو بہتر طور پر منظم ہوجانے کا سبق سکھا سکی اور نہ ہی اُن کی اسپرٹ کو کچل سکی کہ وہ صدر ناصر کے خلاف ہو جائیں وہ انتظار کرنے پر قانع ہیں۔

اِس جھگڑے کے کئی پہلو ہیں جو نسلی، مذہبی اور قومی رشتوں سے منسلک ہو کر پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ یہودی ایک وعدۂ فردا پر بھروسہ کر کے اپنے وطن سے اُنیس سو سال بچھڑے رہنے کے بعد اب واپس ہوئے ہیں۔ انھوں نے صدیوں جور و ستم سہے ہیں۔ ہٹلر کی جرمنی میں وہ ساٹھ لاکھ کی تعداد میں صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ اب ان کو پناہ ملی ہے۔ کوئی اُن کے اِن احساسات سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا جب وہ جذبات میں ڈوب کر کہتے ہیں کہ "یہ ہمارا گھر ہے، اب ہم کو یہیں مرنا جینا ہے۔" عربوں کا اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار، تین بڑی

لڑائیوں کے تجربات، اور آئے دن ہونے والے حادثات نے ان میں محاصرہ کی نفسیات پیدا کر دی ہے۔ آج اُن میں جو 'ڈسپلن' اور ان کے ہر فرد میں 'پیش قدمی' کی جو صلاحیت پائی جاتی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے بے مقصدیت اور آسودگی کے مسائل نہیں ہیں۔ ان کو ہر وقت اپنی بقا کا خیال رہتا ہے جس کے لئے وہ اپنی تمام تنظیمی اور فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لے آئے ہیں۔ یہیں پر عرب غلط فہمی کا شکار ہیں۔ شاید اُن کو یہ احساس نہیں ہے کہ دباؤ اور کشمکش کی فضا میں اسرائیلیوں کا 'مورل' اور اونچا ہو جائے گا۔

عربوں کے لیے عموماً لیکن فلسطین کے رہنے والوں کے لیے خاص طور پر اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنا اپنے وطنِ عزیز سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جانے کے مترادف ہے۔ یہ احساس بڑا شدید ہے کہ ان کو صرف اس وجہ سے گھر سے بے گھر کر دیا گیا ہے تاکہ ان کے وطن میں باہر کی ایک مغرب زدہ قوم کو لا کر بسا دیا جائے۔ استعمار اور سفید فام اقوام کے احساس برتری کی یادیں جو ابھی تازہ ہیں، اس احساس محرومی کو اس قدر شدید اور تلخ بنا دیتی ہیں کہ ان کی اپنی کمزوریاں اور ناکامیاں درگذر کی مستحق قرار پاتی ہیں۔

مذہبی سطح پر یہ توجیہہ پیش کی جاتی ہے کہ اس علاقے میں نہ صرف یہ کہ یہودیوں کے بلکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے بھی مقدس آثار موجود ہیں، پھر آخر یہودیوں ہی کے لیے وطن کیوں؟ ہم کو اجاڑ کر ہٹلر کے ہاتھوں ستم رسیدہ لوگوں کو بسانا کہاں تک مناسب ہے؟ یہ وہ سوال ہیں جن کا کوئی مناسب جواب نہیں۔ تین لڑائیوں میں اسرائیل نے جن علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے اُن علاقوں سے نکالے ہوئے تقریباً بیس لاکھ عرب پناہ گزینوں پر نظر پڑتے ہی اس مسئلہ کا انسانی پہلو پوری طرح سامنے آجاتا ہے۔ ان کی بھاری اکثریت جس میں وہ فلسطینی عرب بھی شامل ہیں جنھیں اپنے وطن سے نکلے ہوئے ۲۳ برس ہو گئے ہیں، اب تک کیمپوں میں زندگی گزار رہے ہیں اور دوسری جگہ بسنے سے صرف اس وجہ سے انکار کرتے ہیں کہ شاید ان کے نصیب میں کبھی فلسطین واپس جانا لکھا ہو۔

اِس طرح تاریخی حقائق، تہذیبی مسائل اور مذہبی احساسات نے مغربی ایشیا کی جنگ کو پیچیدہ اور دوررس نتائج کا حامل بنا دیا ہے۔ اسرائیل ایک ایسا آزاد ملک ہے جس کا مغربی رنگ اور غالب رہنے کا جذبہ ایشیا میں نو آبادیاتی نظام کے تجربوں کی ایک ناخوشگوار یاد ازہ کرتا رہتا ہے۔ اس جذبے اور دوسرے تہذیبی رشتوں کی وجہ سے ایشیا کے تمام ممالک یں عربوں کے لئے ایک ہمدردی پائی جاتی ہے۔ مذہبی سطح پر بھی عربوں کو ان تمام ممالک کی ہمدردی حاصل ہے جہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے، چاہے ایسے ممالک کے سیاسی مفاد مغرب ہی سے کیوں نہ وابستہ ہوں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے اعتبار سے اور اس لحاظ سے بھی کہ یہودیوں کا مغربی تہذیب کی ترقی میں نمایاں حصہ رہا ہے ترقی یافتہ مغربی ممالک اسرائیل سے ایک ذہنی وابستگی محسوس کرتے ہیں۔ ایسے تمام ممالک کی حمایت اسرائیل کو حاصل ہے جہاں یہودیوں کی بااثر اقلیت آباد ہے۔ اس طرح جذباتی سطح پر بھی مغربی ایشیا کی جنگ کا دائرہ وسیع ہے۔

دو بڑی طاقتوں نے طرفین کا ساتھ دے کر اختلاف کو اور شدید کر دیا ہے۔ مغربی اقدار کی ہم آہنگی اور یہودی فرقے کی موثر حیثیت نے امریکہ کو اسرائیل کی حمایت پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن آخر کس حد تک امریکی حکومت اپنی پوزیشن اور اثر کو داؤں پر لگا کر اور عرب ممالک کی مخالفت مول لے کر اسرائیل کی حمایت کر سکے گی؟ امریکی حکومت جس انداز میں اسرائیل کی امداد کر رہی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ نے یہ قیاس کر لیا ہے کہ ٹیکنالوجی کے میدان میں اسرائیل کی برتری اس کو اس علاقہ میں غالب رکھے گی۔

عربوں کی حمایت کر کے روس نے مغربی ایشیا میں بہت سے سیاسی و معاشی فائدے اٹھائے ہیں۔ جو حکومتیں پہلے مغرب کی طرف جھکتی تھیں اب وہ بالاعلان ایسا نہیں کر سکتیں۔ معاشی ترقیاتی اسکیموں میں بھی روس کی شرکت بڑے پیمانہ پر ہو گئی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اب روس کے جہاز بحیرۂ روم کی بندرگاہوں تک پہونچنے لگے ہیں جس کا کہ روس ایک عرصہ سے خواہشمند تھا

لیکن اس کی یہ خواہش اب تک کوئی عملی شکل اختیار نہیں کر سکی تھی۔

دونوں بڑی طاقتیں نہ صرف یہ کہ اس علاقہ کے ملکوں کو خطرناک ہتھیار سپلائی کر کے مالی منفعت حاصل کر رہی ہیں بلکہ مغربی ایشیا کی جنگ میں شرکت کئے بغیر اپنے جنگی اسلحوں اور ہوائی جہازوں کی کارپردازی اور صلابت کا اندازہ بھی کر رہی ہیں۔

(۲)

موجودہ صورتحال

اُردن کی گھاٹی میں اسرائیل اور اُردن کی فوجیں ایک دوسرے کے روبرو کھڑی ہیں لیکن ایک فوج کے سپاہی دوسری فوج کے سپاہی سے بات چیت نہیں کرتے، دریائے اُردن کے مغرب میں مقبوضہ علاقے سے جو عرب خاندان آتے ہیں، اسرائیلی سپاہی ان سے کچھ سوالات کر کے دریا پار کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ پھر اُردن کی پولیس اُن کو دیکھ بھال کر اپنے علاقہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دیتی ہے۔ اِدھر ٹیکسیاں منتظر رہتی ہیں جنھیں لے کر یہ لوگ عمان کی طرف چلے جاتے ہیں۔

ہاں، دریائے اُردن سے کچھ دور پہاڑیوں کی ڈھلان پر کرامہ نام کا قصبہ ہے جو سنہ ۱۹۶۸ء کے اسرائیلی حملہ میں اس حد تک تباہ ہو چکا ہے کہ وہاں آج ایک فردِ بشر بھی نظر نہیں آتا۔ یہ اب بھی کبھی کبھی غیر متوقع طور پر اسرائیل کی بمباری کا نشانہ بنتا رہتا ہے۔ کئی ہزار عرب مہاجرین نے کرامہ میں پناہ لی تھی، لیکن اب وہ عمان کے باہر کیمپ میں سرد ہواؤں کے تھپیڑے مستقل طور پر برداشت کر رہے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جن کو تین بار ہٹنا پڑا ہے۔ پہلی بار اپنا وطن چھوڑ کر مغربی ساحل پر آباد کئے گئے جبکہ اسرائیل کی مملکت بنی، دوسری بار اُردن کی گھاٹی میں بسائے گئے جبکہ جون سنہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مغربی ساحل پر قبضہ ہو گیا اور تیسری بار عمان کے باہر کیمپ میں بسائے گئے جبکہ دس ماہ بعد سنہ ۱۹۶۸ء میں کرامہ پر حملہ ہوا۔

گمائی کی زرخیز زمین خشک ہورہی ہے کیونکہ نہریں اور بجلی کے کنویں تباہ ہو چکے ہیں۔ اسرائیلی کسان زمین کے کچھ قطعات اب بھی جوتتے ہیں لیکن کام کرنے سے قبل خندق کھود لیتے ہیں اور شام کے وقت پہاڑیوں میں جا چھپتے ہیں۔ شمال کی جانب چند میل دور جہاں دریائے اردن بحیرۂ گیلیلی سے باہر نکلتا ہے، تناؤ اور انتشار کی کوئی کیفیت نظر نہیں آتی۔ جنگ کی باتیں زراعتی فارموں میں کھانے کی میز پر بھی کم ہی ہوتی ہیں لیکن ہر ڈائیننگ ہال کے سامنے ایک زمین دوز تہہ خانہ ضرور ملتا ہے۔ پوچھئے تو پلا ارادہ جواب ملے گا "فرض کیجئے ہم کھاتے ہوئے بچٹے جائیں تو؟" ہر گھر کے خوبصورت لانوں میں اس طرح کی پناہ گاہیں بنی ہوئی ہیں جن میں رات کے وقت بچے سلا دیے جاتے ہیں۔ دن میں وہ شکستہ اور شکست خوردہ ٹینکوں کے ارد گرد کھیلتے نظر آتے ہیں۔

بحیرۂ گیلیلی کے شمال میں گولان کی پہاڑیاں ہیں جن کو چھ روزہ جنگ میں شام سے چھین لیا گیا ہے۔ اب یہاں سیاح آتے ہیں اور اس حسین خطۂ ارضی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ جنگ بندی لائن اب اگرچہ دمشق کے پاس تک پہونچ گئی ہے لیکن اس سے کسی طرف کسی پریشانی کا اظہار نہیں ہوتا۔ لیکن لبنان میں صورت حال ذرا مختلف ہے۔ لبنان کی مادی خوشحالی کا انحصار تجارت پر ہے اور یہ تجارت اب پہلے جیسی نہیں رہی ہے، ایک بے یقینی کی کیفیت ہر جگہ پائی جاتی ہے جو یقیناً اسرائیلی حملوں کا نتیجہ ہے لیکن اس بے یقینی کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ آزادیٔ فلسطین کی تنظیم (PLO) کے گوریلا سرزمین لبنان سے اسرائیل پر حملہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں مخلوط ردعمل پایا جاتا ہے۔ ایک طرف اسرائیل سے انتقام لینے کا عام جذبہ ہے جو اس عمل کی تائید پر مجبور کرتا ہے دوسری طرف معاشی و تجارتی نقصان کے پیش نظر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گوریلا سرگرمیاں اسرائیل کے مقابلہ میں خود لبنان کے لیے زیادہ نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ اس طرح لبنان "ملکی مفاد" اور "عرب قومی مقاصد" کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

قدامت پسند اور عیسائی فلانگسٹ پارٹی کے لیڈر اور لبنان کی حکومت کے وزیر

شیخ گیمایل نے کہا کہ " PLO اسرائیل کو اتنا نقصان نہیں پہونچا رہا ہے جتنا کہ وہ لبنان کو تباہ کر رہا ہے۔" ایک ہفتہ کے بعد PLO نے اُن کے لڑکے کو اغوا کر لیا اور فلانگسٹ اور گوریلا کے درمیان بندوقوں کی لڑائی چھڑ گئی۔ اسی طرح عمان میں بھی PLO اور حکومت کے درمیان ایک "مضطرب صلح" کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ دو ماہ قبل عمان کی فوج اور PLO کے گوریلا میں تصادم ہو گیا جس کے بعد گوریلا نے یہ منظور کیا کہ وہ اس شرط پر شہر میں مسلح ہو کر نہیں گھومیں گے کہ سرحدی علاقوں میں اُن کو پوری آزادی ہوگی۔ اسی طرح شاہ حسین پر یہ لوگ کھلم کھلا تنقید کرتے ہیں اور حکومت اردن کے اس دعوے پر خفا ہوتے ہیں کہ اسرائیل کا قبضہ ختم ہوتے ہی مغربی ساحل پر اردن کا مستقل قبضہ باقی رہے گا۔

لبنان کی سرزمین سے اسرائیل پر حملہ کرنے میں PLO کے گوریلا اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی لڑائی میں اسرائیل نے مصر، اردن اور شام کے علاقے چھین لئے ہیں اور اس کی وجہ سے اسرائیل کی زمین اُن کی زد سے دور ہو گئی ہے۔ اب وہ لبنان کی سرزمین ہی سے آسانی سے حملہ کر سکتے ہیں جس کا کوئی علاقہ اب تک اسرائیل کے قبضہ میں نہیں گیا ہے اور جس کی وجہ سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ لبنان اور اسرائیل میں کسی طرح کا کوئی معاہدہ ہو جائے۔ لیکن لبنان کی سرزمین کو استعمال کرنے کی اس دلیل سے لبنان کے لوگ مطمئن نہیں ہیں۔

قاہرہ میں رات کے وقت روشنیاں مدھم رہتی ہیں۔ اہم عمارتوں کے سامنے اور قاہرہ میوزیم کے قیمتی مجسموں کے ارد گرد بالو بھرے تھیلے لگا دیئے گئے ہیں۔ نہر سویز کے علاقے سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کی وجہ سے قاہرہ کی آبادی بڑھ کر پچاس لاکھ ہو گئی ہے، اس کے باوجود اندازِ زندگی ویسا ہی دوستانہ، مخلصانہ، مہذب اور پُرسکون ہے۔ بالو بھرے تھیلوں کے علاوہ کوئی اور ایسی علامت نہیں ملتی جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ قاہرہ پر بمباری ہو سکتی ہے جبکہ تقریباً روزانہ نہر سویز جو قاہرہ سے صرف ۵۰ میل دور ہے اسرائیلی حملوں کا نشانہ بنتی رہتی ہے،

..ائی جہاز ارد گرد اڑتے رہتے ہیں، فوجی ذخیروں کو تباہ کرتے ہیں اور کبھی کبھی مصر میں دور تک داخل ہو جاتے ہیں۔ غیر متوقع طور پر غیر فوجی جہازوں کے لئے قاہرہ کے ہوائی اڈے کے بند ہو جانے کا بھی اعلان اکثر و بیشتر ہوتا رہتا ہے۔ نئے میزائل کو چلانے کی ٹریننگ دینے کے لئے تجربہ کار روسی ہواباز آ رہے ہیں لیکن قاہرہ میں اس کی خبر باہری اخباروں سے ملتی ہے۔ اندرونی خبر رساں ایجنسیوں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

اسرائیل میں کہیں بھی بلیک آوٹ نہیں ہوتا۔ صرف سرحدی علاقوں میں توپ خانوں اور گوریلا حملوں سے حفاظت کی غرض سے بالو بھرے تھیلے اور پناہ گاہیں نظر آتی ہیں۔ چھ روزہ جنگ میں جن علاقوں کو حاصل کر لیا گیا ہے وہ حملوں سے حفاظت کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مرکزی آبادی یا سڑکوں پر کوئی ٹینک، بندوق یا مسلح سپاہی نظر نہیں آتے۔ اس سے خود اعتمادی اور فضائی برتری کا پتہ چلتا ہے۔ ان کو اطمینان ہے کہ وہ جب چاہیں گے کسی عرب ملک کو اپنا نشانہ بنا لیں گے۔ وقتاً فوقتاً وہ اس کا مظاہرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں تبدیلی صرف اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ یا تو اسرائیل کی فضائی برتری کم ہو جائے یا پھر کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کسی مخصوص مقام کو نشانہ بنانے کی پالیسی ترک کر کے وہ عام تباہ کن حملے شروع کر دے۔

۳

اسرائیل

یوروشلم ایک بار پھر قومی و مذہبی گرمجوشی کا مرکز بن گیا ہے۔ یہ عرب اور اسرائیل کے جھگڑے کا مرکزی مقام ہے۔ چھ روزہ جنگ میں حاصل کئے گئے مقبوضہ علاقوں کو اب بھی سرکاری طور پر "اسرائیلی تنظیم کے تحت کے علاقے" کہا جاتا ہے، لیکن یوروشلم کا پرانا شہر اور دوسرے حصے جو اسرائیل کے زیرِ حکومت نہ تھے اب اسرائیلی حکومت کا اٹوٹ حصہ سمجھے جاتے ہیں۔

اسرائیلی تنظیم کے تحت علاقوں میں مروجہ قانونی، تعلیمی اور تنظیمی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں

ہوئی ہے۔ نقشہ وہی ہے جو جون ۱۹۶۷ء سے پہلے تھا۔ صرف فرق یہ ہے کہ اب اختیار اعلیٰ اسرائیلی فوجی گورنر کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن یوروشلم میں اس طرح کا بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ تین سال قبل پرانے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد اسرائیل نے کچھ اہم تبدیلیاں کیں۔ وہ تنگ سڑک جو دیوارِ گریہ تک جاتی ہے، آس پاس کے مکانات منہدم کر کے کشادہ و روشن کر دی گئی ہے۔ یہ تبدیلیاں اس بات کی علامت ہیں کہ یہودیوں نے پورے یوروشلم پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ دیوارِ گریہ ہی وہ مقام ہے جہاں وزیر دفاع موشے دایان نے جذبات بھری تقریر کی تھی کہ "ہم اب اس مقدس ترین مقام پر واپس آ گئے ہیں اور اس سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔"

بائیس سال قبل اسرائیلی مملکت وجود میں آئی۔ عربوں سے پہلی جنگ میں اسرائیل نے اپنی سرحد یوروشلم تک پہونچا دی تھی (اقوام متحدہ کی تجویز تھی کہ یوروشلم کو بین الاقوامی نوعیت کا شہر بنا دیا جائے)۔ نیا شہر جو آباد ہوا اس میں اسرائیل کی پارلیمنٹ، دوسرے سرکاری دفاتر اور ہٹلر کے ہاتھوں ستائے ہوئے ۶۰ لاکھ آفت رسیدہ یہودیوں کی یادگاریں عمارتیں تعمیر کی گئیں لیکن پرانے شہر پر قبضہ (جس میں دیوارِ گریہ موجود ہے) جون ۱۹۶۷ء میں اردن سے لڑائی کے بعد ہوا۔ قبضہ کے تین ہفتے کے اندر اس بات کا اعلان کر دیا گیا کہ پورا یوروشلم اسرائیل کی عملداری میں ہوگا۔ چونکہ اب "گریہ" کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے اس لئے اس دیوار کا رواجی نام بدل کر "مغربی دیوار" کر دیا گیا ہے۔ لیکن پرانے شہر میں مغربی دیوار ہی مقدس مقام نہیں ہے۔ قبۃ الصخریٰ جہاں حضرت ابراہیمؑ نے، کہا جاتا ہے کہ اپنے بیٹے اسحاقؑ کی قربانی کی پیشکش کی تھی یہیں ہے، اور حضرت ابراہیمؑ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں تینوں کے پیغمبر ہیں، اور یہی مقام ہے جہاں سے پیغمبر اسلامؐ معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ بعد میں اسی کے قریب مسجد اقصیٰ تعمیر کر دی گئی تھی۔ یہیں وہ مقام بھی ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا تھا۔ اب اس جگہ عیسائیوں کا مقدس کلیسا ہے جو (church of Holy Sepulchre) کے نام سے موسوم ہے

اسرائیلی سپاہیوں نے پرانے شہر پر قبضہ کرتے وقت مذہبی مراکز کو نقصان نہیں پہنچایا۔

یہ مذہبی مراکز اپنے پرانے سرپرستوں کی نگرانی میں رہے ۔ پرانے شہر میں کسی طرح کی کشیدگی یا انتشار کی علامت نہیں پائی جاتی ۔ عرب تاجر باہر سے آنے والے زائرین اور سیاحوں کے ساتھ اچھی تجارت کر رہے ہیں۔ گلیاں اور کوچے ہر مذہب کے ماننے والوں سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اردن کی حکومت کے تحت میونسپل بورڈ یا محکمۂ پولیس میں کام کرنے والوں کا تقرر اسرائیل نے پھر سے کر لیا ہے ۔ یوروشلم نہ معلوم کتنے حکمرانوں کی قلمرو میں رہ چکا ہے اور اس نے تاریخ کے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں، اس لئے اسرائیل کے قبضہ یا مسجدِ اقصیٰ میں آگ لگ جانے سے خود اتنا متاثر نہیں ہے جتنا کہ باہر کی دنیا۔ اسرائیل کو اعتماد ہے کہ وہ یوروشلم پر مکمل قبضہ رکھے گا ۔ دوسرے مقبوضہ علاقوں کی بہ نسبت اس شہر پر قبضہ رکھنے کی توجیہہ الگ ہے ۔ سینائی ، گولان کی پہاڑیاں اور اردن کے مغربی ساحل کے علاقے پر قبضہ حفاظت کی غرض سے ہے جبکہ یوروشلم کے قبضہ کے ساتھ قومی و مذہبی جذبات وابستہ ہیں ۔

حفاظت کی غرض سے ہی سہی لیکن اسرائیل مقبوضہ علاقوں کو چھوڑ دینے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہے، چاہے عرب سرحدی حفاظت کی ذمہ داری خود ہی کیوں نہ لے لیں ۔ اسرائیل کے وزیر خارجہ نے کہا کہ نہر سوئیز اور دریائے اردن مخالف فوجوں کو علٰحدہ کرتے ہیں ۔ اگر محدود دست برداری قبول کر لی جائے تو یہ فائدہ ختم ہو جائے گا اور کوئی مستقل معاہدہ ہونے سے قبل پہلے کی سرحدوں تک جانے کا مطالبہ بھی شدید ہو جائے گا ۔

اسرائیل اب تک کسی ثالث کے ذریعہ فریقین میں سمجھوتے کی مخالفت کر رہا ہے ۔ وہ عرب و اسرائیل کے درمیان براہِ راست گفت و شنید پر زور دیتا ہے ۔ اگر کوئی ثالث مترجم کی حیثیت سے فریقین کے خیالات کو ایک دوسرے تک پہونچانے کا کام کرے تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ سمجھوتے کے اس طریق کار کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسرائیل کی تمام جنگی کامیابیوں کے باوجود عربوں نے اسرائیل کے وجود کو اب تک تسلیم نہیں کیا ہے ۔ اسرائیل یہ جانتا ہے کہ عرب ممالک جب تک اسے تسلیم نہ کر لیں خود اس کا چین اور آرام سے زندگی گزارنا ناممکن ہے ۔ براہ راست گفتگو کے بعد دست بردار

ہو جانے کی شرط دراصل اپنا وجود تسلیم کرانے کی قیمت ہے جو اسرائیل ادا کرنے کو تیار
لیکن اسرائیل معاہدے پر بات چیت ہونے سے قبل یہ بھی بتلانا نہیں چاہتا کہ وہ
تک دست بردار ہوگا۔ قبل از وقت اس اعلان کا مطلب معاہدے سے اٹھائے جانے والے
کو کمزور کرنا ہے۔ اسرائیل یورو شلم کے علاوہ اور کسی علاقے پر قابض ہونے کا خواہشمند نہیں۔
ان علاقوں پر قبضہ رکھنے کا مقصد صرف سرحدی حفاظت ہے۔ گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کرنے
نشیب میں بسنے والے شام کے تمام لوگ اسرائیل کی زد میں ہیں۔ ہاں وہ گولان کی پہاڑیاں
چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائے گا اگر سرحد کو مکمل طور پر فوج سے پاک کر دیا جائے۔

اسرائیل کو مغربی ساحل کا علاقہ اپنے پاس رکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن جب تک
کوئی پرامن سمجھوتہ نہ ہو جائے سرحدی حفاظت کی غرض سے اس پر قبضہ رکھنا ضروری ہے۔
طرح خلیج عقبہ میں آزادانہ جہاز رانی کا حق مل جانے کے بعد ہی اسرائیل مصر کو سینائی کا
واپس کر سکتا ہے۔

مقبوضہ علاقوں کے حدود کے تعین میں اسرائیل میں اختلاف ہے۔ کچھ اعتدال پسند عناصر
علاقوں کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں جبکہ انتہا پسند عناصر کچھ اور علاقے بھی لے لینا چاہتے ہیں
معاہدے میں جتنی تاخیر ہوتی جاتی ہے متوازن خیالات کے لوگوں کی اکثریت بڑھتی جاتی ہے۔
ردوبدل کے ساتھ پرانی سرحد باقی رکھنے کی حمایت کرتے ہیں، اگرچہ توسیع پسند عناصر کے حامی
ہیں لیکن وہ اکثریت میں نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ عرب اخبارات میں اس کو اس طرح پیش
جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیل میں اس نقطہ نظر کے لوگ اکثریت میں ہیں۔

اسرائیل میں اختلاف صرف سیاسی نقطہ نظر ہی کا نہیں ہے، امریکہ اور یورپ سے
آئے ہوئے سفید فام یہودیوں اور دوسرے براعظموں سے آئے ہوئے غیر سفید فام یہودیوں
کے درمیان بھی اختلاف موجود ہے۔ لیکن یہ اختلاف رنگ کا نہیں ہے بلکہ جفاکشی، دولتمن
اور خوش حالی کا اختلاف ہے جو سفید فام یہودیوں میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے اور جو غیر سفید

یہودیوں میں مفقود ہے۔ ہندوستان سے جاکر بسنے والے یہودیوں کو پہلے ناسازگار حالات کی شکایت تھی لیکن اب وہ بھی اسرائیل کی تعمیر میں اپنے رول پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

ایک اور اختلاف ہے جو رجعت پسند اور لبرل خیال کے یہودیوں میں نظر آتا ہے۔ لبرل خیال کے یہودی اسرائیل کو ایک نیشن یا قوم مانتے ہیں نہ کہ ایک مذہبی فرقہ۔ ان کا خیال ہے کہ اسرائیل ایک سیکولر حکومت ہے جس میں عربوں کو کہا ہے وہ مسلمان ہوں یا عیسائی، برابر کا حق حاصل ہے۔ (عربوں کو ووٹ دینے اور پارلیمنٹ میں اپنے نمائندے بھیجنے کا اختیار بھی ملا ہوا ہے) لیکن رجعت پسند عناصر اسرائیلی مملکت اور دوسرے ملکوں میں بسنے والے یہودیوں کے درمیان کوئی فرق برقرار رکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ مذہب کی بنیاد پر ساری دنیا کے یہودیوں کو ایک قوم سمجھتے ہیں — لیکن یہ سارے اختلافات عربوں کے مقابلے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ کسی معیار پر پرکھئے اسرائیلی یہودی مستعد، متحد اور مہم جو ہیں۔ فوجی کامیابی کے باوجود اسرائیل اور اس کے مقبوضہ علاقوں کی شہری زندگی میں فوج کا غلبہ ناپید ہے۔ فوج دراصل اسرائیل کی کامیابی کی ذمہ دار بھی نہیں ہے۔ بنیادی طور پر اسرائیلی شہریوں کی ذمہ دارانہ قوت اقدام اس کامیابی کی ضامن ہے۔ تل ابیب کے کسان اس ذمہ دارانہ قوت اقدام کی ایک مثال ہیں جو ۲ بجے رات کو اٹھ کر پھل، پھول اور ترکاریاں توڑتے ہیں تاکہ مغربی یوروپ جانے کے لیے پہلا ہوائی جہاز پکڑ سکیں اور جہاں پہونچ کر ان کے پھل، پھول اور ترکاریاں اٹلی اور اسپین سے آئے ہوئے پھل، پھول اور ترکاریوں سے، بہ لحاظ معیار اور تازگی، ہمسری کا دعویٰ کر سکیں۔

(۴)

عرب

عربوں کے عمل میں وہ مقصدیت اور مطابقت نظر نہیں آتی جو اسرائیلیوں کا خاصہ ہے۔ ناانصافی، فوجی شکست اور مایوسی عربوں کے درمیان اتحاد کی بنیاد ہے۔ یہ وہ یکساں جذبہ ہے

جو عرب سماج کے ہر طبقہ میں پایا جاتا ہے، اور جس کی شدت کو کوئی حکومت یا لیڈر نظر انداز نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ محض جذباتی شدت ہے جو مربوط طرزِ عمل سے بے نیاز ہے اور جس کی وجہ سے کسی مخصوص مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔ عربوں کی یہ کیفیت مغلوب ہونے یا صلح کرنے پر راضی نہیں ہے لیکن ساتھ ہی فتح کا بھی یقین نہیں دلاتی۔

عرب حکومتوں اور گوریلا تنظیموں دونوں کا مقصد مقبوضہ علاقوں کو اسرائیل سے حاصل کرنا اور عربوں کے لیے فلسطین کو آزاد کرنا ہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان ترجیح وتخصیص میں بڑا اختلاف ہے۔ یہ اختلاف چھ روزہ جنگ سے پہلے مخفی تھا اُس وقت صدر ناصر یہ کہہ سکتے تھے کہ اسرائیلی مملکت کو تباہ کردو۔ اُس وقت فلسطین کے انتہا پسند گوریلا لیڈر بھی یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ یہودیوں کو سمندر میں پھینک دو۔ لیکن شکست کے بعد عرب ملکوں نے دنیا سے اپیل کی کہ وہ اسرائیل کو مقبوضہ علاقوں سے دست بردار ہوجانے کے لئے راضی کریں، اگرچہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ جون ۱۹۶۷ء سے پہلے کی سرحدوں میں اسرائیلی مملکت کے باقی رہنے کے حق کو انھوں نے تسلیم کرلیا ہے۔ عربوں نے اسرائیلی مملکت کے وجود کو سلامتی کونسل کے اس رزولیوشن کو مان کر بھی تسلیم کرلیا جس میں کہا گیا تھا کہ

"اسرائیل ہٹ جائے گا اور اِس علاقے (مغربی ایشیا) کے تمام ملکوں کی علاقائی آزادی اور اقتدارِ اعلیٰ کا احترام کیا جائے گا۔"

لیکن ان رعایتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ یروشلم میں اسرائیل اپنی پوزیشن تبدیل کئے بغیر عربوں سے اپنا وجود تسلیم کرانے کا عملی ثبوت چاہتا ہے۔ اس سے فلسطین کے رہنے والے بھڑک گئے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چھ روزہ جنگ سے پہلے کی سرحدوں تک واپس جانے سے اُن کا کوئی مسئلہ حل نہ ہوسکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلسطین کی نئی مملکت کے دوبارہ قائم ہونے کی امید یا اقوام متحدہ کی پیش کردہ تجویز کے مطابق ایک الگ مملکت میں اکثریت کے علاقے بنا دینے کی اسکیم کو ختم سمجھا جائے۔

پہ چھ روزہ جنگ کی پہلی پوزیشن پر محض واپس جانے کے خلاف فلسطین کی رائے عامہ متحد
یسے مسائل ہیں اُن میں اختلاف ہے ۔ انتہا پسند عناصر یہودیوں کو دربدر کرنے کی
ہیں کرتے ۔ PLO کے لیڈر یاسر عرفات اب مسئلہ کا حل زیادہ جمہوری انداز سے
ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ پورا فلسطین معہ اسرائیل کے ایک سیکولر حکومت ہونا چاہیے
ہودیوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے حقوق مساوی ہوں ۔ موجودہ یہودی آبادی اس شرط پر
ہ سکتی ہے کہ باہر سے آکر بسنے والوں کا سلسلہ ختم کر دیا جائے ۔ لیکن اس حل میں صرف
ہی ہے اور وہ یہ کہ اسرائیل کی انفرادیت ختم ہو جائے گی اور وہ فلسطینی مملکت میں اقلیت
میں گے ۔ اس حل کو وہ فاتح کیسے قبول کر سکتا ہے جس نے اب تک اپنی فوجی برتری
ما ہو ۔

معتدل عناصر چاہتے ہیں کہ فلسطین کی ایک علٰحدہ عرب مملکت بنا دی جائے جو صرف دریائے
کے مغرب کے علاقے اور غازہ پٹی پر مشتمل ہو، حالانکہ اقوام متحدہ نے جب یہ تجویز پیش کی
س وقت عربوں نے اسے نامنظور کر دیا تھا ۔ پھر بھی اگر اسرائیل کو اس فارمولے کو مان
رضامند بھی کر لیا جائے تو اُردن کو یہ منظور نہ ہوگا جس نے ۱۹۴۸ء میں دریائے اردن
پہ میں مذکورہ علاقے کو اپنی مملکت کا حصہ بنا لیا تھا ۔ تمام عرب ممالک میں یہی علاقہ سب سے
زرخیز سمجھا جاتا ہے، پھر فلسطین کے لوگ بھی تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہیں ۔ اگر یہ علاقہ
ہ مملکت کی صورت میں اردن کے ہاتھ سے نکل گیا تو اسے ہر لحاظ سے کافی نقصان

اس سے پتہ چلتا ہے کہ فلسطینی پناہ گزینوں اور اردن کے رہنے والوں کے درمیان
تصادم ہے ۔ عرب عوام کے جذبات اور باہر کی مالی امداد سے PLO تو مضبوط ہو رہی ہے
ساتھ ہی شاہ حسین کے اختیارات ختم ہوتے جا رہے ہیں ۔ اس لیے اردن چاہتا ہے کہ جہاں
جلد ممکن ہو سکے پر امن معاہدہ ہو جائے ۔ لیکن ساتھ ہی عوامی جذبات اردن کو مجبور کرتے

ہیں کہ وہ اپنی جنگی وضع کو باقی رکھے۔ اردن کے وزیر داخلہ نے کہا ہے کہ ان کی حکومت روس سے نئی طرز کے اسلحے لینے کے لئے رضامند ہے اس سے اردن کی پالیسی میں نمایاں تبدیلی کا اندازہ ہوتا ہے۔

چونکہ لبنان کا کوئی علاقہ اسرائیل کے قبضہ میں نہیں گیا ہے اس لیے وہ اس کو مشتعل نہیں کرنا چاہتا۔ لبنان نے بڑی حد تک سوئٹزرلینڈ کا تتبع کیا ہے۔ اسرائیل کے پڑوسیوں میں لبنان ہی معاشی حیثیت سے ترقی یافتہ اور ریاستی حیثیت سے منظم ملک ہے۔ لیکن اس سرزمین سے فلسطینی کے گوریلا اسرائیل پر حملے کرتے ہیں اور پھر اسرائیل جوابی حملہ کرتا ہے جس کی وجہ سے تجارت کو سخت نقصان پہونچتا ہے اور ایک بار غیر یقینی سی کیفیت مستقل طور پر موجود رہتی ہے۔ اس سے جذبات اور مفاد میں ایک ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے جو خانہ جنگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

متحدہ عرب جمہوریہ اور شام کی حکومتیں فلسطینیوں کی کارکردگی سے زیادہ مضطرب اور پریشان نہیں۔ اُن کے جنگی انقلابی اعلانات PLO کی پالیسی کے عین مطابق ہیں لیکن اسرائیل نے سنائی اور گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کرکے گوریلوں کی کارروائی کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان گوریلوں کو قاہرہ اور دمشق سے مالی امداد دی جاتی ہے اور ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہے لیکن یہ اپنے عملی اقدام کے لئے اردن اور لبنان کے علاقے استعمال کرتے ہیں عمان اور بیروت میں اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دراصل PLO کو اسرائیل کے خلاف نہیں خود اُن کے خلاف بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ مغربی ایشیا میں ترقی پسند اور قدامت پسند حکومتوں کے تعلقات میں کھینچاؤ کی وجہ سے مکمل طور پر فوجی تعاون بھی مفقود ہے۔

چونکہ لبنان کے علاوہ اور تمام عرب ممالک میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اس لیے مذہب ان سب میں ایک نقطۂ اتحاد ہے۔ یوروشلم کے مقدس مقامات چھن جانے اور خاص طور سے پچھلے سال مسجد اقصیٰ میں آگ لگ جانے کے بعد یہ اتحاد اور بھی نمایاں ہو گیا ہے، یہاں تک کہ شام کی بعث حکومت کے لیڈر اور متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر ناصر نے ان واقعات کے پیش نظر اسرائیل

کے خلاف جنگ کو "جہاد" کا درجہ دے دیا ہے۔ بحالت جنگ اس اتحاد سے تقویت ضرور پہونچتی ہے اور دوسرے اسلامی حکومتوں سے حمایت بھی حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے کچھ نقصانات بھی ہیں۔ اس سے قدامت پرست عناصر کو تقویت ملتی ہے۔ قدامت پرستی سے اسرائیل جیسے ترقی یافتہ ملک کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے بھی عرب اتحاد کمزور ہے۔ لبنان ایک خوش حال ملک ہے۔ کھلی ہوئی سوسائٹی ہے اور کثیر الجماعت جمہوریت ہے جو بڑی متوازن ہے۔ اس کے برخلاف شام قدامت پرست، مطلق العنان اور فوجی ملک ہے۔ اردن لبرل ہے اور نظم و نسق کے اعتبار سے ایک اچھی اور منظم بادشاہت ہے جبکہ متحدہ عرب جمہوریہ سماجی حیثیت سے ایک کھلی ہوئی اور سیاسی حیثیت سے ایک بند سوسائٹی ہے۔

عرب ممالک میں متحدہ عرب جمہوریہ ہی سب سے گنجان آبادی کا ملک ہے جو اسرائیل کا مقابلہ کر رہا ہے۔ عرب اتحاد میں اسی کو مرکزیت حاصل ہے، اور علاقے اور آمدنی کے اعتبار سے اسی کو اسرائیل کے ہاتھوں سب سے زیادہ نقصان پہونچا ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ کو ایک طرف نہر سوئز کے علاقوں کی تمام آبادی کو بسانا پڑا ہے اور دوسری طرف نہر سوئز بند ہو جانے کی وجہ سے مستقل طور پر مالی نقصان برداشت کرنا پڑا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ دیوالیہ نہیں ہے۔ مالدار عرب ممالک کی مالی امداد اور مغربی ریگستان میں تیل کی دریافت نے اس ملک کی معاشی حالت سدھار دی ہے۔ افسروں کا کہنا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ اپنے بین الاقوامی معاہدے پورے کر رہا ہے، یہاں تک کہ اسوان بند کے قرض کی ادائگی بھی معمول کے مطابق ہو رہی ہے۔ حکومت سب کو روزگار فراہم کرنے میں کامیاب ہے اور بنیادی غذائی اشیاء اتنی قیمتوں میں مہیا کرتی ہے کہ غریب سے غریب بھی ان کو خرید سکتا ہے۔ "ہائی ڈیم" (جس کی تکمیل اس سال ہو جائے گی) بن جانے کی وجہ سے متحدہ عرب جمہوریہ نے ایک تہائی ریگستان کو زرخیز بنا لیا ہے لیکن یہ سماجی و معاشی ترقی ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے اور اس معیار پر نہیں پہونچی ہے جہاں پہونچ کر ملک

تنظیمی اور تکنیکی اعتبار سے ترقی یافتہ کہلاتا ہے ۔ اس منزل تک پہونچنے کے بعد ہی کسی فوجی کامیابی کا یقین کیا جاسکتا ہے۔

۵

ایک اور حملہ

۱۲ مئی ۱۹۷۰ء کو لبنان کے جنوبی حصہ پر حملہ کرکے اسرائیل نے اپنے قیام اور آزادی کی بائیسویں سالگرہ منائی ۔ لبنان پر اسرائیل کا یہ سب سے بڑا حملہ تھا جس میں ٹینک استعمال کئے گئے اور ہوائی فوج بھی حملہ آور ہوئی ۔ اس حملے کے دو بڑے مقصد تھے ۔ ایک مقصد فلسطینی فدائیوں کے مراکز کو تباہ کرنا تھا اور دوسرا مقصد عربوں کے اتحاد عمل کا اندازہ لگانا تھا ۔ جس تیزی سے جوابی حملے میں شام، عراق اور اردن نے تعاون کیا ہے اس سے اسرائیل بھی حیران ہے کیونکہ ۱۹۶۷ء کے بعد پہلی بار عربوں کا یہ اجتماعی حملہ تھا ۔ شام نے اسرائیل سے ملحق لبنان کی سرحد پر اپنی ساری توجہ مرکوز کردی جبکہ عراق اور اردن نے لبنان کے مشرقی حصوں کو سنبھالا ۔ متحدہ عرب جمہوریہ اس لڑائی میں شریک نہیں ہوا ۔ لیکن صدر ناصر نے اعلان کیا ہے کہ وہ سنائی میں جنوب کی طرف سے اسرائیل پر بری و فضائی دونوں طرح کا حملہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ صدر ناصر نے کھلم کھلا اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ MIG اور SAM میزائل کو چلانے کی ٹریننگ دینے کیلئے مصر نے روسی ہوا بازوں کی خدمات حاصل کی ہیں ۔ اس نازک صورت حال میں روس کی موجودگی انسدادی اور اشتعالی دونوں قسم کے اقدام کا باعث بن سکتی ہے ۔ امریکہ کے صدر نکسن نے اعلان کیا ہے کہ وہ مغربی ایشیا میں اسرائیل کے خلاف فوجی توازن کسی طرح بگڑنے نہ دیں گے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ضرورت سمجھی گئی تو امریکہ اسرائیل کو "فینٹم جٹ" سپلائی کرے گا ۔ لیکن ساتھ ہی دونوں طاقتیں محتاط ہیں کہ لڑائی پھیلنے نہ پائے ۔ ایک انٹرویو میں صدر ناصر نے اعلان کیا کہ وہ اسرائیل کو نہر سویز میں اس شرط پر جہاز رانی کی اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ مقبوضہ علاقوں سے دست بردار ہوجائے ۔ ۱۲ مئی ۱۹۷۰ء کے اسرائیلی حملے کے متعلق سلامتی کونسل میں غور و فکر اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مغربی ایشیا کی صورت حال سے تمام دنیا فکرمند ہے۔

سید غلام ربانی

دلّی کی قدیم مسجدیں

اسلامی فن تعمیر میں مسجد ایک مقام رکھتی ہے عقیدے کے لحاظ سے بھی اس کو اہمیت حاصل ہے۔ مسلمان اپنے عروج کے زمانے میں جہاں گئے وہاں سب سے پہلے انھوں نے مسجد بنائی۔ چنانچہ قطب الدین ایبک ابھی دلی میں تخت نشین نہیں ہوا تھا کہ اس نے مسجد قوت الاسلام کی بنیاد رکھی۔ یہ مسجد ایبک نے اپنے آقا محمد سام شہاب الدین (محمد غوری) کے حکم سے تعمیر کرائی۔ پانچ در سنگِ سرخ کے بنوائے اور شمالی دروازہ پر تعمیر شروع ہونے کی تاریخ کندہ کرائی۔

یہ عمارت تراشیدہ پتھروں سے بنی ہے۔ اس کے دروں پر نفیس منبت کاری ہے۔ صحن کے ہر طرف سہ گچھے دالان ہیں۔ پانچوں دروں پر کلام اللہ کی آیتیں اور حدیثیں کندہ ہیں۔ صحن کے بیچ میں لوہے کی لاٹھ ہے جو متھرا میں چھ سو برس سے قائم تھی۔ جب مسجد تیار ہوئی تو اس نے در و دیوار پر سنہرے کلس چڑھوا دیے۔ اذان کے لئے قطب مینار کی تعمیر شروع کی، یہ کام بھی محمد غوری کے ایما سے ہوا۔

ہندوستان میں سنگ تراشی کا فن دو ہزار برس سے چلا آرہا تھا۔ یہاں کے کاریگر نقش و نگار اور منبت کاری میں کمال رکھتے تھے چنانچہ مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار کی تعمیر میں مقامی ہاتھ صاف نظر آتا ہے۔

مندروں کی پیروی میں سطح پر پخیں بنانے کا رواج عام تھا، کہیں یہ پخیں عمودی ہوتی

ہیں کہیں افقی، قطب مینار میں یہ پچیں عمودی ہیں۔

مسلمان دروں کی محرابیں ڈاٹ کے اصول پر بناتے تھے۔ اس مسجد کی محرابیں ڈاٹ پر نہیں بنائی گئی ہیں بلکہ پتھروں کو افقی سلسلوں میں نصب کر کے اوپر کی جانب گھٹاتے چلے گئے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں یہاں مسلمان معماروں اور کاریگروں کی کمی تھی، تعمیری کام زبانی ہدایات پر ہوتا تھا چنانچہ مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار ہندو مسلم طرز تعمیر کی طرف پہلا قدم تھا۔

قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین التمش نے اس مسجد کو اور بڑھایا۔ شمال اور جنوب میں تین تین درا ور بنوا دیئے۔ چوتھے اور پانچویں درجے علاء الدین خلجی نے بنوانے شروع کئے مگر ادھورے رہ گئے۔ فیروز شاہ تغلق اپنی "فتوحات" میں لکھتا ہے:

"........ میں نے اس مسجد کی مرمت کرائی
اور اس کو نیا بنوا دیا ...."

اب گیارہ درجے موجود ہیں، جن میں سے تین بڑے اور آٹھ چھوٹے ہیں۔ مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار کی تعمیر سو برس سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی۔ علم الآثار کے ماہر فرگسن نے لکھا ہے کہ

"..... اس مسجد کی محرابوں کو اونچائی اور قطب مینار کے
سبب سے دنیا کے عجائبات میں شمار کرنا چاہیئے....."

خاندان خلجی کی عمر بہت کم رہی یعنی صرف تیس برس جیا۔ سلطان علاء الدین خلجی وسیع فتوحات میں لگا رہا۔ اس دور میں کوئی قابل ذکر مسجد نہیں بنی البتہ تغلق دور میں نقشہ بدل گیا۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دارالحکومت فیروز آباد اور اس کے مضافات میں آٹھ جامع مسجدیں موجود تھیں، ان میں سے دو کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کھڑکی مسجد

موضع کھڑکی میں ست پلے کے پاس یہ مسجد ہے جس کو خان جہاں نے ۱۳۷۵ء میں

تعمیر کرایا[1]۔ یہ مسجد تہ خانہ پر بنی ہے جس سے کرسی بلند ہو گئی ہے تہ خانہ میں گاتھک طرز کی سنگین محرابیں قائم کر کے ان پر عمارت بنائی گئی۔ صحن کا بیشتر حصہ چھت سے ڈھکا ہوا ہے البتہ بیچ میں چار چھوٹے چھوٹے ٹھانے روشنی کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ یہ چھت چار ربعوں میں تقسیم کی گئی ہے جن کے ہر طرف نو نو گنبدوں کے نو نو مجموعے ہیں، اس طرح پوری چھت ۹×۹ یعنی ۸۱ گنبدوں سے پٹی ہوئی ہے، ہر گنبد کے تلے چار چار ستون ہیں جن سے نچلا حصہ ستونوں کا جنگل نظر آتا ہے۔

مشرق اور جنوب میں دو دروازے ہیں، جن میں داخل ہونے کے لئے بہت سی سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ دروازے کے دونوں طرف دو مخروطی مینار پاکھوں میں پیوست ہیں۔ ادھر ادھر سات سات محرابیں اور کونوں پر برج بنے ہوئے ہیں۔ اس وضع کی مسجد ہندوستان میں کہیں نہیں ہے۔

کلاں مسجد یا کالی مسجد

یہ مسجد فیروز آباد میں ۱۳۸۷ء میں بنی تھی، اس شہر کی ویرانی کے بعد شاہجہاں آباد میں آگئی چنانچہ ترکمان دروازہ کے قریب موجود ہے یہ بھی تہ خانہ پر بنی ہے جس سے اس کی کرسی اتنی بلند ہو گئی ہے کہ دروازہ میں داخل ہونے کے لئے ۳۲ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ عمارت مربع ہے اور ہر گز میں پانچ پانچ در ہیں۔ یہ مسجد تغلق طرز کی بہت اچھی مثال ہے، وہی سلامی دار دیواریں، دروازے کے دونوں طرف مخروطی مینار، چاروں کونوں پر زبردست برج، چار دیواری فصیل کی طرح مضبوط ہے۔ دور سے یہ مسجد عبادت گاہ تو نہیں اچھا خاصا قلعہ معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] سید احمد خاں نے اس کا سن تعمیر ۱۳۸۷ء لکھا ہے۔

کھڑکی کی مسجد کی طرح اس کا صحن بھی مسقف ہے یعنی گنبدوں کے سلسلے سے ڈھکا ہوا ہے۔ پشتیاں کسی قدر چھوٹے مگر مضبوط بہت ہیں۔ یہ ستون دو دو اور بعض جگہ چار چار ایک ڈال کے پتھر کے ہیں۔ اس مسجد کے استحکام کا یہ عالم ہے کہ چھ سو موسم اس پر برس چکے ہیں مگر کہیں سے جنبش نہیں کھائی ہے۔

مسجد درگاہ حضرت نظام الدین اولیا

حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ میں مزار شریف سے چند گز کے فاصلے پر ایک خوبصورت مسجد ہے جو جماعت خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا نچلا حصہ سنگ مرمر کا ہے۔ گنبد کی شکل نیم کروی ہے مگر شاندار ہے۔ بڑے دروازے کے ادھر ادھر اور اس کی چھت پر دو دو برج ہیں اس طرح ساری مسجد کے پانچ برج ہوئے۔ ان کا وزن تقسیم کرنے کے لئے مسجد کے اندر کچھ دائیں (Squinch) بنائی گئی ہیں، ان محرابوں اور ہندسی اشکال سے اندرونی حصے میں رعنائی پیدا ہو گئی ہے۔

مسجد کی پیشانی پر نسخ اور کوفی خط میں آیات قرآنی کندہ ہیں۔ اس مسجد کا درمیانی حصہ علاء الدین خلجی کے بیٹے خضر خاں نے بنوایا ہے۔

فیروز شاہ لکھتا ہے:

"...... درگاہ نظام الدین میں جو جماعت خانہ ہے
اس کو نئے سرے سے میں نے بنوایا ہے[1]...."

خاندان تغلق کے آخری دنوں میں دلی پر ایک بلا نازل ہوئی۔ ۱۳۹۸ء میں تیمور نے شہر پر حملہ کیا، ہزاروں آدمی قتل کئے، لوٹ میں مال و زر کے ساتھ یہاں کے کاریگروں، معماروں،

---

[1] فتوحات فیروزی

سنگ تراشوں اور پچیکاروں کو سمرقند لے گیا تاکہ اپنے دارالحکومت میں ایسی مسجد بنوائے جس کا جواب کسی ملک میں نہ ہو۔[1]

یہ شہر اس بری طرح برباد ہوا کہ مدتوں پنپ نہ سکا چنانچہ خاندان سادات اور لودھی کے حکمراں کوئی بڑا تعمیری کام نہ کر سکے۔ انھوں نے نہ شہر بسائے، نہ قلعے بنائے، نہ محل تعمیر کیے، مدرسے، ایوانات اور مسجدیں بھی نہیں بنوائیں البتہ مقبرے کم سے کم پچاس ضرور بنوائے ان سے متعلق چھوٹی چھوٹی مسجدیں بھی بنوائیں لیکن ایک مسجد ایسی خوبصورت بنی کہ آگے چل کر مسجدوں کے لئے ایک نمونہ بن گئی اس کا نام موٹھ کی مسجد ہے۔

موٹھ کی مسجد

مبارک پور کوٹلے سے تھوڑی دور آگے یہ مسجد ہے۔ اس مسجد میں کئی چیزیں ایسی ہیں جو اس سے پہلے کی مسجدوں میں نہیں۔ عمارت وسیع ہے، اس کا دالان چالیس گز لمبا چوڑا ہے۔ دکار میں پانچ پانچ در کی خوش وضع محرابیں ہیں، چھت پر تین بڑے بڑے گنبد، قبلہ کی دیوار میں مخروطی مینار، دروازوں کے حاشیے، عمارت کے دونوں پہلوؤں میں باہر نکلی ہوئی بالکنی، ان پر جھروکے، عقبی دیوار کے سروں پر دو منزلہ مینار ہیں جن میں خوبصورت نشیمن نکالے ہیں مسالا جو عمارت میں استعمال ہوا ہے، رنگین ہے۔ گنبد کے سہارے کے لئے نئے طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ اندر درمیانی حصہ میں پکھوائی ڈاٹیں، چونے میں نقش ونگار، پچی کاری کی جگہ پلاسٹر ہیں منبت کاری محرابوں کی پیشانی پر قرآنی آیات کے رنگین طغرے منبت کیے گئے ہیں جو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ پرسی براؤن کا بیان ہے کہ یہاں کے صناع اور کاریگر وہی کام کر رہے تھے جو انہی دنوں الحمرہ (اسپین) کی دیواروں پر ہو رہا تھا۔

---

[1] ملفوظات تیموری

اس مسجد کے کنویں میں سنگ سرخ کا کتبہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ مسجد ۱۴۸۸ء میں سکندر لودھی کے عہد میں تعمیر ہوئی [1]

مسجد قلعہ کہنہ

یہ مسجد پرانے قلعہ میں شمال مشرقی فصیل کے پاس ہے۔ اس کو شیر شاہ نے ۱۵۴۱ء میں تعمیر کرایا۔ یہ عبادت گاہ بادشاہ اور اس کے خاندان کے لئے مخصوص تھی، اس عمارت کی بیرونی دیواروں پر بعض چیزیں بہت خوشنما ہیں۔ ہر طرف خوبصورت جھروکے ٹوڑوں پر قائم ہیں عقبی کونوں پر دو چھوٹے مگر مستحکم مینارے ہیں جن میں زینے بنے ہوئے ہیں لیکن باہر کا اصلی حسن اس کی روکاریں ہے۔ پانچ محرابی در ہیں، ہر محراب کے اندر ایک اور چھوٹی محراب ہے جو مستطیل چوکھٹے میں جڑی ہوئی ہے۔ چھوٹے بڑے حاشیے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں روکاریں مختلف رنگوں نے رعنائی پیدا کردی ہے۔ سنگ سرخ میں سنگ مرمر کی لوحیں بڑی صفائی سے بٹھائی گئی ہیں اس کے علاوہ رنگین پچی کاری بھی ہے۔ ان جمالیاتی اوصاف کے علاوہ کچھ اور بھی چیزیں ہیں جو تاریخی روایات رکھتی ہیں مثلاً درمیانی ایوان کے دونوں پہلوؤں پر پتلے پتلے مینارے، کر کی وضع کے آرائشی حاشیے، جن کا خیال قطب مینار سے لیا گیا ہے۔ عقبی دیوار پر تغلق طرز کے مخروطی مینار، محراب کا بانکپن اور اس کی وضع جو آگے چل کر شاہجہانی محراب بن گئی۔

مسجد کا اندرونی حصہ بھی اعلیٰ درجے کی پیداوار ہے۔ پانچوں ایوانوں کا تناسب، محرابوں کی ترتیب اور ان کا سلسلہ، ان کے گرد حاشیے، قبلہ کی دیوار میں مہین چونے کے

---

[1] ایک روایت مشہور ہے کہ کسی شخص نے راہ چلتے زمین سے موٹھ کا دانہ اٹھالیا۔ اس کو بویا، اس میں خوشے لگے، پھر بویا اسی طرح چند سال میں بہت روپوں کی موٹھ ہوگئی اس سے یہ مسجد بنی۔

نقش و نگار، لداؤ کی چھت میں جدت یہ سب چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ ان کے بنانے والوں کو اپنے اوپر اعتماد تھا۔ ماہرین نے چھت کی بہت تعریف کی ہے۔

دیواروں پر طاقوں کے سلسلے میں جو لداؤ کے اصول پر طاق در طاق بنائے گئے ہیں۔ بڑی محراب پر بیل بوٹے اور حاشیوں پر آیات قرآنی خط ثلث میں کندہ ہیں، ان چیزوں کو اس سلیقہ سے بنایا گیا ہے کہ Applied Art کی تصویر بن گئی ہے۔ اس مسجد کو اکبر نامے میں جامع مسجد لکھا ہے۔ سرسید احمد خاں کا خیال ہے کہ شاید ہمایوں کے وقت میں اس کو جامع مسجد ٹھیرا دیا گیا ہو۔

مسجد جہاں نما یا جامع مسجد

جس دن شاہجہاں آباد میں لال قلعہ کا پہلا پتھر رکھا گیا، اس کے چھ سال بعد اس مسجد کی بنیاد رکھی گئی۔ شاہجہاں کے دیوان اعلیٰ سعد اللہ خاں کی نگرانی میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ روزانہ پانچ ہزار راج، مزدور، بیلدار، سنگ تراش اور پچی کار کام کرتے تھے پھر بھی چھ سال میں جا کر پوری ہوئی۔

عمارت سر سے پاؤں تک ایک رنگ کے سنگ سرخ کی ہے۔ تین طرف بلند سیڑھیاں ہیں جو اہرام مصری کی شکل کی ہیں، تین عالیشان دروازے، سامنے وسیع صحن، چاروں کونوں پر برج، شاندار محرابیں، دو بلند مینار اور تین بڑے بڑے گنبد عمارت میں عظمت پیدا کرتے ہیں۔ ہر شخص جو اس میں داخل ہوتا ہے اس کی عظمت سے متاثر ہوتا ہے اور اگر وہ مسلمان ہے تو چاہتا ہے کہ اس میں نماز پڑھے اور یہی اس کا مقصد ہے۔

اس مسجد کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ موزونی اور تناسب بلا کا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں مقام پر اس چیز کی کمی رہ گئی یا فلاں جگہ پر یہ چیز زیادہ ہو گئی۔

روکار بہت خوشنما ہے۔ درمیانی بڑی محراب کے دونوں طرف پانچ پانچ محرابیں

ہیں، یہ سب محرابیں مرغول دار ہیں۔ ان کے اوپر سنگِ مرمر کی لوحوں میں سنگِ موسیٰ سے کتبے پچی کیے گئے ہیں جو صحن میں سے نقش و نگار معلوم ہوتے ہیں۔ بڑے در پر یا ہادی بطور طغریٰ اور اور باقی دروں پر شاہ جہاں کا نام نامی اور مسجد کے اخراجات کا حال درج ہے۔

محرابوں کے سروں پر دو بلند مینار ہیں ان کی برجیاں سنگِ مرمر کی ہیں اور میناروں پر نیچے سے اوپر تک عمودی دھاریاں ہیں۔ اندر کی طرف سات محرابیں ہیں۔ دالان سہ گہا ہے جو چالیس ستونوں پر قائم ہے۔ فرش سنگِ مرمر کا ہے جس میں سنگِ موسیٰ کی پچی کاری سے مصلے بنے ہوئے ہیں۔ چھت پر تین شاندار گنبد ہیں جو نرے سنگِ مرمر کے ہیں ان پر کلس سے گردن تک سنگ موسیٰ کی کروی دھاریاں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ صحن کے ہر طرف دالان ہیں اور چاروں کونوں پر مرمریں برج ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پاکیزہ عمارت ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے خوبصورت مسجد ہے۔

مسجد فتح پوری

یہ مسجد چاندنی چوک کے ختم پر ہے، اس کو شاہ جہاں کی بیوی نواب فتح پوری بیگم نے ۱۶۲۹ء میں تعمیر کرایا۔ نیچے سے اوپر تک سنگ سرخ کی ہے۔ اندر تین تین در کے دالان در دالان ہیں۔ فرش سنگ مرمر کا ہے کونوں پر دونوں طرف مینار ہیں۔ صحن اچھا خاصا وسیع ہے اس میں سنگ سرخ کے چوکے بچھے ہوئے ہیں۔

مسجد اکبر آبادی

یہ مسجد فیض بازار میں ہے[1]۔ اس کو نواب اعزاز النسا بیگم نے

---

[1] اس مسجد کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ مسجد کی اصل جگہ وہ تھی جہاں اب نیتا جی سبھاش چندر بوس پارک ہے، جسے پہلے ایڈورڈ پارک کہتے تھے۔ جامعہ

۱۶۵۰ء[1] میں تعمیر کرایا۔ اعزاز النسا بیگم عرف اکبر آبادی بیگم شاہ جہاں کی بیوی تھی۔ فیض بازار اسی بیگم نے بنوایا تھا چنانچہ اس کا نام بھی اکبر آبادی بازار تھا۔ یہ مسجد سر سے پاؤں تک تمام سنگ سرخ کی ہے اس کے سات در ہیں۔ پیش طاق سنگ مرمر کے ہیں اس کی پچی کاری ہیں پر چین بڑی صفائی سے بٹھائے گئے ہیں۔ صحن پچاس گز لمبا اور ۲۵ گز چوڑا ہے جس کے گرد طالب علموں کے حجرے بنے ہوئے ہیں۔[2]

مسجد سرہندی

یہ مسجد لاہوری دروازہ کے پاس بنوائی گئی تھی۔ دروازہ تو غائب ہو گیا ہے مگر مسجد اب تک موجود ہے۔ صحن کا کچھ حصہ ملبے میں آ گیا ہے۔ عمارت گہرے رنگ کے سرخ پتھر کی ہے اس کو سرہندی بیگم نے ۱۶۵۰ء میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ بیگم بھی شاہ جہاں کی بیوی تھی۔ اس مسجد کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے کئی جگہ سے شکستہ ہے۔

موتی مسجد

اورنگ زیب کو تخت نشین ہوئے دو تین سال گزرے تھے کہ اس نے حکم دیا، قلعہ میں مسجد

---

[1] رمضان المبارک ۱۰۶۱ھ مطابق اگست ۱۶۵۰ء ۔ جامعہ

[2] مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "سید احمد شہیدؒ" میں اس مسجد کے بارے میں لکھا ہے: "اس (مسجد) پر ڈیڑھ لاکھ روپے صرف ہوئے تھے اور یہ دو برس میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی مسجد کا مسقف حصہ تریسٹھ گز لمبا اور سترہ گز چوڑا تھا، اس کے تین گنبد اور سات در تھے، مسقف حصے کے سلسلے کی طرف دائیں بائیں دو خوبصورت اور بلند مینار تھے۔ تریسٹھ گز لمبا اور تریسٹھ گز چوڑا صحن تھا جو زمین سے تین گز اونچا تھا اور اس کے اردگرد تین گز اونچا کٹہرا بنا ہوا تھا، صحن سے باہر سامنے کی طرف وضو کے لیے حوض تھا، اس کے دونوں جانب سے مسجد میں جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں ......" (صفحہ ۷۱) جامعہ

تعمیر کی جائے۔ چنانچہ ۱۶۵۹ء میں موتی مسجد تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد دیوان خاص کے پاس ہے، فرش سے کلس تک تمام سنگ مرمر کی ہے اور یہ مرمر اتنا اعلیٰ ہے کہ اس میں موتی کی سی آب ہے۔ محرابوں کی مرغولیں بہت خوشنا ہیں اور در و دیوار پر اعلیٰ قسم کی منبت کاری ہے ایسی منبت کاری قلعہ کی کسی عمارت میں نہیں۔ پرسی براون نے اس کی تصویر اپنی کتاب Indian Architecture کے سرورق پر دی ہے۔ شمالی ضلع میں ایک حجرہ ہے جو اورنگ زیب کے ورد و وظائف کے لئے مخصوص تھا۔

مسجد اورنگ آبادی

شہر میں پنجابی کٹرہ کے اندر یہ مسجد موجود ہے اس کو اورنگ زیب کی بیوی نواب اورنگ آبادی نے ۱۷۰۳ء میں بنوایا تھا۔ پوری عمارت سنگِ سرخ کی ہے۔ صحن میں حوض ہے جس میں نہر سے پانی آتا تھا۔ اس کا صحن وسیع تھا مگر لوگوں نے اس کا بہت سا حصہ اپنے مکانوں میں ملا لیا ہے۔

زینت المساجد

فیض بازار کے مشرق میں شہر پناہ کے قریب یہ مسجد ہے۔ اس کو اورنگ زیب کی بیٹی زینت النساء بیگم نے ۱۷۱۰ء میں تعمیر کرایا اور اپنے دفن کے لئے حجرہ بھی بنوایا تھا۔ عمارت تمام سنگ سرخ کی ہے۔ چھت پر تین برج سنگ مرمر کے ہیں جن پر سنگ موسیٰ کی دھاریاں ہیں دونوں سروں پر دو مینار ہیں جو اتنے بلند ہیں کہ میلوں سے دکھائی دیتے ہیں۔ مسجد کے سات در ہیں جن میں حسب معمول درمیانی بڑا باقی چھوٹے ہیں اس کا صحن بہت وسیع ہے۔

کسی زمانہ میں یہ مسجد بہت آباد تھی، حضرت غوث علی شاہ پانی پتی جب دلی آتے تھے اسی مسجد میں قیام کرتے تھے شام کو علماء اور مشائخ جمع ہوتے۔ مرزا غالب شام کو اکثر یہاں آتے اور اپنے ساتھ خوان بھی لاتے تھے۔ اب یہ مسجد مصلیوں کو ترستی ہے۔

زینت النسار بیگم کے مزار پر یہ شعر کندہ ہے:

مونسِ ما در لحد فضلِ خدا تنہا بس است
سایہ از ابر رحمت قبر پوش ما بس است

سنہری مسجد کوتوالی

یہ مسجد محمد شاہ کے عہد کی ہے، اس کو نواب روشن الدولہ ظفر خاں نے ۱۷۲۱ء میں تعمیر کرایا۔ اس کے برج اور کلسیاں سب سنہری ہیں۔ شاید اپنے خطاب روشن الدولہ کی مناسبت سے اس کو چمکدار بنوایا ہے۔ آثار الصنادید میں لکھا ہے کہ اس کے بُرج شکستہ ہو گئے تھے، اس لئے روشن الدولہ نے اپنی دوسری مسجد کے برج اس پر چڑھا دئے۔ نواب کی یہ دوسری مسجد فیض بازار کی پھول کی منڈی میں ہے۔

فخر المساجد

یہ مسجد کشمیری دروازہ کے پاس ہے، اس کو نواب شجاعت علی خاں کی بیوی فخر النسا بیگم نے بنوایا۔ یہ مسجد کچھ زیادہ بڑی نہیں مگر وضع میں لاجواب ہے۔ روکار اس کی تمام سنگِ مرمر کی ہے جس میں جا بجا سنگ سُرخ کی دھاریاں ہیں۔ اس کے گنبد سنگِ مرمر کے ہیں، اندر کا فرش بھی مرمریں ہے صحن میں سنگ سُرخ کا فرش ہے۔ سید احمد خاں نے اس مسجد کی خوش وضعی کی بہت تعریف کی ہے۔ راقم نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ایک فرنگی سیاح کو دیکھا جو کینوس پر اس مسجد کی تصویر بنا رہا تھا۔ یہ ۱۹۰۲ء کی بات ہے۔

موتی مسجد

یہ مسجد مہرولی میں قطب صاحب کی درگاہ کے پاس ہے۔ درگاہ سے اتنی قریب ہے کہ

ایک دیوار پیچ میں ہے، زرے سنگ مرمر کی ہے۔ فرش بھی سنگ مرمر کا ہے۔ اس میں سنگ موسیٰ کا لہریا ہے۔ مسجد کے تین در اور تین گنبد ہیں۔ کونوں پر دو مینار سنگ مرمر کے ہیں۔ اس مسجد کو شاہ عالم بہادر شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔

نئی دلی پرانی دلیوں پر آباد ہے۔ یہاں قدیم مسجدوں کی کمی نہیں، مسجد بیگم پور، مسجد کالوسرائے، مسجد جامی، مسجد خیرپور، مسجد درگاہ قطب صاحب، مسجد عیسیٰ خاں اور کئی مسجدیں ہیں جو معمولی نہیں مگر ہم نے ان مسجدوں کو لیا ہے جو فنی خصوصیات رکھتی ہیں یا تاریخی دلچسپی کی ہیں۔

اختر انصاری دہلوی

اردو افسانے پر مغرب کا اثر

اردو افسانے پر مغربی اثرات کے ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ خود اُردو افسانہ مغرب کی دین ہے اور یہ پوری صنف ہی مغربی اثرات کا نتیجہ ہے۔ اردو کا قدیم نثری ادب داستان کے علاوہ قصہ نگاری کے کسی دوسرے اسلوب سے واقف نہیں تھا۔ ناول، ناولٹ، مختصر افسانہ اور طویل مختصر افسانہ وغیرہ وہ اسالیب ہیں جو پچھلے سو برسوں میں مغربی ادبیات کے زیر اثر ہی ہمارے یہاں رواج پذیر ہوئے۔

مختصر افسانے کے آغاز سے پہلے اردو میں قصہ نگاری کی تاریخ تین مختلف ادوار سے گزر چکی تھی۔ پہلا دور چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک کا طویل زمانہ تھا جو دراصل اردو نثر کا دکنی دور تھا۔ اس دور میں طبع زاد قصوں کا پتا نہیں چلتا، اور صرف چند ترجمے سب رس اور طوطی نامہ جیسے قصوں کی شکل میں ہماری توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ دوسرا دور اٹھارویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کے وسط تک کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں اردو نظم و نثر کا مرکز ثقل دکن سے شمالی ہندوستان منتقل ہوا جہاں فورٹ ولیم کالج میں اور کالج سے باہر قصے کہانیوں کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں جو تقریباً سب داستانی انداز کی چیزیں تھیں۔ پھر اسی زمانے میں الف لیلہ، بوستانِ خیال، داستانِ امیر حمزہ اور اردو کی دوسری طویل داستانیں وجود میں آئیں جو سیکڑوں جلدوں پر مشتمل اور ہزاروں صفحات کو محیط ہیں۔ تیسرا دور انیسویں صدی کے نصف آخر سے عبارت تھا۔ اس دور میں قصہ نگاری

کی روایت داستان اور داستانی اسلوب سے منقطع ہو کر ناول نگاری کی منزل میں داخل ہوئی اور نذیر احمد، سرشار، شرر، انجم کسمنڈوی اور مرزا ہادی رسوا کے کارناموں میں مغربی ناول کی واقعیت، ارضیت، حقیقت نگاری اور سماجی مقصدیت نے اپنی اولین جھلکیاں دکھائیں۔ جدیدیت کے اسی سلسلے کی کڑی مختصر افسانہ تھا جس نے بیسویں صدی کے آغاز میں جنم لیا۔

اس نہایت مختصر اور سرسری تاریخی جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں قصہ نگاری کے ضمن میں داستان اور داستانی اسلوب کی ایک روایت کم و بیش پانچ سو سال سے متداول تھی۔ وہ انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہی اور اُس کے بعد مغربی اثرات کے [illegible]نہ کا لوازمہ بن گئی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر مغربی اثرات کی درآمد اور یورش نہ ہوئی ہوتی تو اس روایت کا اگلا قدم کیا ہوتا اور اس کے ارتقار کی اگلی منزل کیا ہوتی۔ ادب کی تاریخ صرف اس حقیقت کی مظہر ہے کہ وہ روایت ختم ہوئی اور اس طرح ختم ہوئی کہ بالکل ناپید ہو کر رہ گئی۔ سیاسی تغیرات اور تہلکات کے جلو میں جو نئے علمی و ادبی اور فکری و تہذیبی رجحانات ملک میں داخل ہوئے انھوں نے داستان کی روایت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے مغربی ادب سے پہلے ناول اور اس کے کچھ دنوں کے بعد مختصر افسانے کی صنف کو برآمد کیا گیا۔

اردو میں مختصر افسانے کی ایجاد کا سہرا پریم چند کے سر باندھا جاتا ہے۔ یہ صرف ایک حد تک ہی صحیح ہے۔ اس لیے کہ پریم چند سے پہلے ماسٹر پیارے لال کے قلم سے دو تین افسانے وجود میں آ چکے تھے جن میں سے کم سے کم ایک افسانہ (من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ) ضرور ایسا تھا جو جدید مختصر افسانے کے فنی اوصاف سے متصف تھا۔ یہ شاید اردو کا پہلا مختصر افسانہ تھا۔ لیکن ماسٹر پیارے لعل یا ان کے افسانے کسی تحریک یا روایت کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لیے لامحالہ پریم چند ہی اردو میں مختصر افسانے کے بانی خیال کئے گئے۔ علاوہ ازیں پریم چند سے پہلے نشتر اور کچھ اور طویل مختصر افسانے بھی لکھے جا چکے تھے، اور گو اُس

وقت اُن سب کو ناول کے ذیل میں شمار کیا گیا، لیکن در اصل وہ مختصر افسانے ہی کے قبیل کی چیزیں تھیں۔ پھر اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ کوئی اہم یا دیرپا تحریک، خواہ وہ ادبی ہو یا سیاسی، تمدنی ہو یا معاشرتی، کبھی کسی ایک شخص کا کارنامہ نہیں ہوتی۔ کسی بھی قابل ذکر تاریخی تبدیلی کا سہرا کسی ایک شخص کے سر باندھنا اصولی طور پر غلط ہے۔ عصر آفریں شخصیتیں، عصر آفریں ہونے سے پہلے یا عصر آفریں ہونے کے ساتھ عصری پیداوار بھی ہوتی ہیں۔ حالات و واقعات کو متاثر یا منقلب کرنے والے اشخاص خود بھی حالات و واقعات کی تخلیق ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں زمانے کی تاریخی ضرورتیں اور تاریخی تقاضے اصل چیز ہیں، اور اشخاص و افراد مع اپنے کارناموں کے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز میں مختصر افسانے کو وجود میں لانے کا باعث پریم چند سے زیادہ ادب، زندگی اور زمانے کے مختلف عوامل و محرکات تھے جن کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سب سے پہلی بات تو یہ کہ بیسویں صدی کے آغاز تک اردو قصہ نگاری کی روایت مذہبی قصوں، اخلاقی حکایتوں، طلسماتی داستانوں اور جدید الوضع ناولوں سے گزرتی ہوئی اس منزل میں داخل ہو چکی تھی جہاں مختصر افسانے کی پیدائش کوئی مستبعد اور دشوار بات نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ اردو کے علاوہ بعض دوسری ہندوستانی زبانیں مختصر افسانے کے فن سے آشنا ہو چکی تھیں اور بنگالی زبان میں ٹیگور اور سرت چندر جیسے عظیم افسانہ نگار منظر عام پر آچکے تھے۔ تیسری بات یہ کہ مغرب میں مختصر افسانہ نگاری کا فن پوری ایک صدی کے نشو و ارتقا کے بعد اب عروج و بالیدگی کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ واشنگٹن ارونگ، ہاتھورن، ایڈگر ایلن پو، چارلز ڈکنس، رابرٹ لوئی اسٹیونسن، اناطول فرانس، پال ہارویو، اور مارسل پراؤسٹ جیسی تابناک ادبی شخصیتوں کے گہوارۂ فن میں پرورش پانے کے بعد اب مغربی افسانہ اپنی تمام جاذبیت اور رعنائیوں سمیت، چیخوف اور موپساں کی عظیم شخصیتوں سے وابستہ ہو چکا تھا۔ چیخوف اور موپساں افسانے کی دنیا میں دو منارۂ نور تھے جن کی روشنی سے عالمی ادب کے بعید ترین

گوشے جگمگا رہے تھے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ اردو کی دنیائے ادب اِس رنگ و نور کے فیضان سے یکسر محروم رہتی، خصوصاً اس لیے کہ اب ہندوستانی نوجوانوں کی جو نسلیں پروان چڑھ رہی تھیں وہ یکسر مغربی طرزِ تعلیم کی ساختہ و پرداختہ تھیں۔ اِس سلسلے میں جو تھی قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ مغرب میں انفرادی اور اجتماعی زندگی انیسویں صدی کے سکون و خواب سے نکل کر بیسویں صدی کے ہیجان و اضطراب میں داخل ہو چکی تھی۔ ہر شعبہ حیات اُس انتشار سے دوچار تھا جو آگے چل کر دو عظیم جنگوں کی بدولت ابھی اور شدید اور بحرانی صورت اختیار کرنے والا تھا۔ داخلی طمانیت مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ ضیقِ فرصت کا احساس بتدریج بڑھ رہا تھا اور اس صورتِ حال کے ہوتے ہوئے مختصر افسانے کی مقبولیت کا غیر معمولی طور پر بڑھ جانا بالکل قدرتی بات تھی۔ ہندوستان اِس صورتِ حال سے ابھی اِس حد تک دوچار نہیں ہوا تھا۔ لیکن اِن اثرات سے بالکل بیگانہ بھی نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہوش رُبا واقعات کے بعد کم و بیش پچاس برس تک ہندوستانیوں کے ذہن و ضمیر اور اعصاب و قویٰ پر جو دہشت چھائی رہی اب بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان آہستہ آہستہ اُس کے اثر سے آزاد ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہو۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں نئی لرزشوں اور نئی تھرتھراہٹوں کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ ادبیات کی دنیا بھی نئے رجحانات کی پذیرائی پر آمادہ اور نئے زمانے کی خوش آیند تبدیلیوں کو اپنے دامن میں جگہ دینے کے لئے مستعد نظر آتی تھی۔ اردو شعر و ادب نے جن نئے اسالیب، اصناف اور مناہج کے لیے اپنا آغوش وا کیا ان میں جدید مختصر افسانہ بھی تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ پریم چند کی رہنمایانہ کارگزاری مسلّم، لیکن مغربی اثرات نے جو تہذیبی پس منظر مہیا کیا اور ثقافتی عوامل بہم پہنچائے اُن کے بغیر یہ کارگزاری شاید ممکن نہ ہوتی۔ اور خلاصہ اس ساری گفتگو کا یہ ہے کہ اردو میں مختصر افسانہ تمام و کمال مغرب کی دین ہے اور مغربی اثرات کا نتیجہ ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس صنف نے اردو میں رائج ہونے کے بعد وقتاً فوقتاً مغرب

کے اثرات کو کس طرح اور کہاں تک اپنے دامن میں جگہ دی، تو یہ امر تو بالکل ظاہر ہے کہ پریم چند اور اُن کے معاصرین کے افسانوں پر یہ اثرات مخصوص طور پر نہیں بلکہ ایک سرسری اور عمومی انداز میں پائے جاتے ہیں۔ اردو افسانہ نگاری کے اس اولین دور کو ۱۹۰۷ء سے ۱۹۳۵ء تک کے زمانے پر حاوی خیال کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۰۷ء کی یہ اہمیت ہے کہ پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" ۱۹۰۷ء میں چھپا اور ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" بھی اسی سال شائع ہوا۔ اِس دور کا خاتمہ ۱۹۳۵ء پر اس لیے ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ اردو افسانہ بھی عروج و ارتقار کی ایک نئی منزل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب اس اولین دور کے افسانہ نگاروں پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مترجمین کے علاوہ ان میں رومانی، نیم رومانی، مزاحیہ اور اصلاحی و مقصدی افسانہ نگاروں کے متعدد مختلف گروہ تھے۔ ان سب کی تخلیقات میں مغربی اثرات کی کارفرمائی صرف اس حد تک ملتی ہے کہ وہ ایک ڈھیلے ڈھالے انداز میں مختصر افسانے کی صنف سے متعلق ہیں۔ اکثر افسانے تو جدید مختصر افسانے کی ہیئت اور خارجی تشکیل کے معیار پر بھی پورے نہیں اترتے۔ اِس کے برعکس قدیم داستانی رنگ کے اثرات کی ان میں کمی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کا نوزائیدہ افسانہ ایک مدت تک داستان اور داستانی فنون کے عناصر سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ اور اپنی پیدائش کے بعد کم و بیش تیس سال تک واضح اور شعوری قسم کے مغربی اثرات سے بیگانہ رہا۔

البتہ جب ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے ساتھ اردو افسانہ اپنے تاریخی ارتقار کی دوسری منزل میں داخل ہوا تو اس میں اچانک ایک غیر معمولی نمو پذیری اور ایک عجیب و غریب حرکی توانائی کے آثار پیدا ہوئے، اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے گویا ایک جست لگا کر، ادب و فن کے بامِ رفیع پر متمکن ہو گیا۔ اسی دور میں اردو کے وہ افسانے بھی وجود میں آئے جن کی فنی بلندی آج بھی ہمارے افسانوی ادب کے انتہائی عروج و کمال کی آخری حد ہے اور جن کو دنیا کے بہترین افسانوں کے مقابلے میں بلا تامل اور بے محابا پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ حیرت انگیز

فنی ترقی سراسر مغربی اثرات کی مرہونِ منت تھی۔ اول تو اِس دور کے لکھنے والوں نے مغربی افسانے کے تکنیکی عناصر کی پیروی پر، اپنے پیش روؤں کے علی الرغم، بہت شعوری توجہ صرف کی، اور وحدتِ تاثر اور نقطۂ عروج اور افسانوی ڈرامائیت جیسے مسلمات کو سختی کے ساتھ ملحوظ رکھا، جس کی بنا پر سارا اردو افسانہ داستانی روایت سے مکمل طور پر آزاد ہو کر صحیح معنوں میں مختصر افسانے کی ہیئت سے آراستہ ہوا۔ پھر ترقی پسند مصنفین نے ادب کی مارکسی تعبیر کی روشنی میں ترقی پسند افسانوی ادب کو پروان چڑھایا اور فن اور مقصد کے امتزاج کی اچھی سے اچھی مثالیں پیش کیں۔ یہ تو اس دور کا حاوی رجحان تھا اور عالمی ادب کا قوی ترین دھارا جو ترقی پسندوں کی کوششوں سے اردو میں رائج و مقبول ہوا اور برگ و بار لایا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ دوسرے مغربی میلانات بھی کام کر رہے تھے۔ فرائیڈ کی تعلیمات نے تحلیل نفسی کے جس دبستان کی بنیاد ڈالی تھی اس نے بھی ہمارے بعض افسانہ نگاروں کو متاثر کیا اور نفسیاتی تجزیہ نگاری کے اصول پر بے شمار افسانے لکھے گئے۔ مغربی اثرات ہی کے تحت تاثراتی افسانے یا بے پلاٹ کی کہانیاں بھی لکھی گئیں اور یہ تکنیک اِس قدر مقبول ہوئی کہ اردو افسانے کا ایک خاص اسکول قرار پائی۔ خاص خاص مغربی مصنفوں سے خاص خاص ذہن اثر پذیر ہوئے۔ چنانچہ اردو کے کتنے ہی لکھنے والوں نے ڈی ایچ لارنس، جیمز جوائس کافکا، ہنری جیمس، اور ورجینیا وولف کے افکار یا اسالیب کے زیر اثر افسانے لکھے اور اِن مختلف میدانوں میں قابلِ ذکر فتوحات حاصل کیں۔

مدہوش بلگرامی

غزل

اُن کو اپنے قریب دیکھا تھا
ہائے کتنا حسین سپنا تھا

اپنے گلشن میں عکسِ رنگِ بہار
ہم نے بس ایک بار دیکھا تھا

میرا ساتھی وہ میرا راہ نما
جانے کن راستوں پہ بچھڑا تھا

زندگی کی اُداس راہوں میں
دور تک حسرتوں کا سایہ تھا

زندگی کا اتہ پتہ ہم نے
رک کے ہر رہر قدم پہ پوچھا تھا

گلستاں میں بہار آئی تھی
گلستاں پھر بھی ایک صحرا تھا

شاہراہوں کی بھیڑ میں مدہوش
میں وہ اک شخص تھا جو تنہا تھا

جامعہ

سالانہ چندہ		قیمت فی پرچہ
چھ روپے		پچاس پیسے
جلد ۶۲	بابت ماہ اگست ۱۹۷۰ء	شمارہ ۲

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون:

اڈیٹر: ۶۳۰۲۵۸

منیجر: ۶۳۰۴۹۰

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبعہ: یونین پریس دہلی   ٹائٹل: دیال پریس د

شذرات

عرصہ ہوا ایک ناول پڑھا تھا "اور انسان مرگیا" ناول پڑھ کر میرے اوپر یہ اثر نہیں ہوا تھا کہ انسان مرگیا ہے، ہاں وقتی طور پر کسی واقعہ سے متاثر ہو کر انسان کی انسانیت پر آدمی کا یقین متزلزل ہو جائے، یہ اور بات ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان نہ پہلے کبھی مرا تھا اور نہ آیندہ کبھی مرے گا، جب تک یہ کائنات اور اس کا کارخانہ قائم ہے، انسان باقی رہے گا، انسانیت باقی رہے گی، مردود ہے جو حالات کے اندھیاروں سے ہراساں اور مایوس نہ ہو۔ ایک زاویے سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے انسان کے ہاتھوں بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں۔ تاریخ انسانی خونیں ہنگاموں اور معرکہ آرائیوں کی تاریخ ہے، لیکن ایک اور نظر ہے، اس سے دیکھئے تو انسان انسان کا سہارا بنا ہے، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوا ہے، زندگی اس کے ہاتھوں حسین بنی ہے اور تہذیب و تمدن کے نشیمن ہائے روح افزا اور منازل دلکشا اسی کے مرہون منت ہیں۔

آپ نے شاعرِ مشرق کی ایک فارسی نظم بارہا پڑھی ہوگی، نظم کا عنوان ہے 'محاورہ مابین خدا و انسان' آج اس سلسلہ میں اِسے ایک بار پھر پڑھئے اور دیکھئے کہ حالات کی ناسازگاریوں کے باوجود زندہ رہنے اور کچھ کر جانے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے یا نہیں، خدا انسان سے کہتا ہے:

جہاں را ز یک آب و گِل آفریدم   تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم   تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان جواب میں کہتا ہے:

توشب آفریدی چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

معاصر حیات میں ضلع نینی تال کے ایک گاؤں کے ایک سابق فوجی چودھری نیپال سنگھ کا خط چھپا ہے، اس میں انھوں نے جل گاؤں کی ہاجرہ کی دردناک کہانی سے متعلق اپنے قلبی تاثرا بیان کئے ہیں جن کے چاروں بچوں کو حالیہ فساد میں ان کی آنکھوں کے سامنے آگ میں جھونک دیا گیا۔ چودھری صاحب نے اپنے دل کا جو حال لکھا ہے اس سے انسان کی انسانیت پر یقین پختہ ہو جاتا ہے اور آج کی زہرناکیوں کی تلخی بہت کم ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں ایک سابق فوجی ہوں۔ میں نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک جنگ میں حصہ لیا اور بھاری توپ خانے کا رسالدار رہا۔ میں جاٹ ہندو ہوں اور میں نے تبروک، قاہرہ اور سسلی کی بڑی بڑی لڑائیوں میں حصہ لیا ہے، میری جوانی کا ہر لمحہ گولیاں چلانے میں گذرا۔ میں نے شہر کے شہر تباہ ہوتے اور ہزاروں انسانوں کو مرتے دیکھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اپنے کئی ساتھیوں کو دفن کیا اور جلایا۔ لیکن اس پورے عرصہ میں کبھی میری آنکھ سے آنسو نہ نکلا، لیکن حیات میں ہاجرہ کی دردناک کہانی پڑھ کر میں بہت دیر تک روتا رہا۔ بہت کوشش کے باوجود میری آنکھوں سے آنسو تھم نہ سکے۔ مجھے یقین ہے کہ ان دردناک واقعات نے میرے جیسے کئی فوجیوں کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا...... حیات میں جل گاؤں اور بھیونڈی کے واقعات پڑھ کر بے حد رنج ہوا لیکن اس میں ہم سب کے لئے سبق بھی ہے کہ ہم سب ان فرقہ پرستوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دینے کا تہیہ کرلیں۔

بہن ہاجرہ بیگم کے لئے میں یہ کر سکتا ہوں کہ وہ میرے پاس آجائیں۔ میری بیوی اور بچے ان کی خدمت کر کے ان کا دکھ کم کرنے کی کوشش کریں گے اور میں اپنی آخری سانس تک ان کی خدمت کرتا رہوں گا۔"

ہمارے ملک میں ایسے شریف النفس انسان بے شمار ہیں جن کے دل اس قسم کے واقعات پر تڑپ اٹھتے ہیں، بہتیرے خون خرابے، لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات کے درمیان اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے مظلوموں کی مدد کرتے ہیں، ان کو پناہ دیتے ہیں، ظالموں کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس طرح انسانیت کو مرنے نہیں دیتے۔ احمد آباد، چانباسہ، بھیونڈی اور جل گاؤں کے فسادات میں کئی ہندو بھائیوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد اور حفاظت کی، مادر وطن کی روح ان کے کارناموں پر نازاں ہے، انسانیت کو ان پر فخر ہے، اور ہم بھارت کے نواسیوں پر ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اپنے دیس میں آدمیت کو زندہ رکھا۔

آج کل ہمارے ملک میں پیچھے کی طرف دیکھنے، دیکھتے رہنے اور لوٹ جانے کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے، یہ علامت ترقی کی نہیں ہے، جو کچھ ہو چکا وہ اب نہیں لوٹے گا، ہاں اُس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، بہت کچھ لے سکتے ہیں، اس لئے کبھی کبھی مڑ کر پیچھے دیکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، اس کے فائدے بھی ہیں، لیکن ہمیں تیار رہنا ہے آنے والے زمانے کے لئے، دیکھنا ہے تو آگے کی طرف دیکھنا ہے، ہماری ساری کاوشیں، ساری جدوجہد ایک خوش آیند اور تابناک مستقبل کی تعمیر کے لئے ہونی چاہئے۔ جماعتی زندگی ہو یا قومی زندگی، سب کا نصب العین یہی ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں امن و امان ہو اور قومی اتحاد و یک جہتی کے رجحان کو تقویت ملے۔ افسوس ہے کہ آج اتحاد اور قومی یکجہتی کے لئے جتنا کہا جاتا ہے انتشار اتنا ہی بڑھتا ہے، سوچنا چاہئے کہ ایسا کیوں ہے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری قوم ابھی تک عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کے تعصبات سے

نجات حاصل نہیں کر سکی ہے۔ سماج کا وہی پرانا ڈھانچا بڑی حد تک باقی ہے، حیرت ہوتی ہے کہ شہروں کے وہ خاندان بھی جن کی معاشرت بالکل 'موڈرن' ہے، ان تعصبات میں ڈوبے ہوئے ہیں، اس طرح ہماری 'موڈرن ازم' کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے وہ افراد جو پوجا پاٹ اور نماز روزہ کے قائل نہیں، معاشی مفاد کے پیش نظر مذہب، زبان یا ذات پات کے نام پر تعصب سے کام لیتے ہیں اور یہ دعویٰ بھی ہے کہ ہم موڈرن ہیں اور ہر معاملہ میں 'ریشنل نقطۂ نظر' رکھتے ہیں، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے یہ افراد آج ملک کے لئے بہت بڑا خطرہ بن گئے ہیں۔

انھیں افراد کا ایک گروہ ہے جو 'نیشنلزم' کا نعرہ بڑے جوش سے لگاتا ہے اور اپنے آپ کو جمہوریت کا بھی علمبردار کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں اصطلاحیں عہد جدید کی پروردہ ہیں، لیکن یہی گروہ ہے جو مذہب کے نام پر انسانوں کی تقسیم کو جائز قرار دیتا ہے، تہذیب اور زبان کے معاملہ میں رواداری اور انصاف سے کام نہیں لیتا اور ذات پات کے پرانے نظام کو باقی رکھنا چاہتا ہے، ایک طرف وہ صنعتی ترقی کا خواہاں ہے، یعنی ایک قدم آگے بڑھاتا ہے، تو دوسری طرف سماجی اعتبار سے وہ رجعت کا حامی ہے، یعنی اس کا دوسرا قدم پیچھے پڑتا ہے، اس طرح اُس نے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ نئی نسل کی ایک بڑی تعداد کو فکر و عمل کی ایسی الجھنوں میں ڈال دیا ہے کہ ملک و قوم کو شدید نقصان پہونچ رہا ہے۔ جو لوگ اس گروہ کی سرگرمیوں کے مُضر نتائج کا شعور رکھتے ہیں انھیں اپنے اپنے حلقے میں اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ اس گروہ کا اثر کم ہو، یہاں تک کہ زائل ہو جائے۔ آج سچی حب الوطنی کا یہی تقاضا ہے۔

پروفیسر محمد مجیب

نئی دنیا پر ایک نئی نظر

عربوں اور اسرائیلیوں کی کشمکش کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ انقرہ، فرینک فرٹ اور غالباً دوسرے ہوائی اڈوں پر جب مسافر جہاز پر سوار ہونے کے لئے جاتے ہیں تو ان کے سامان کی بھی تلاشی لی جاتی ہے جو ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ انقرہ میں مجھ سے بھی اپنا بستر کھولنے کو کہا گیا، اور یہ مطالبہ ایسا نرالا تھا کہ تلاشی لینے والے کو تین بار کہنا پڑا، تب بات میری سمجھ میں آئی۔ پھر یاد آیا کہ انقرہ کے پین امریکن کے دفتر کے بڑے بڑے شاندار شیشے ٹوٹے ہوئے تھے، اور یہی حال اس کے سامنے کے ایک امریکن بینک کا بھی تھا۔

ہوائی جہاز کے سفر کے اوقات اور انسانی جسم کے نظام میں ہم آہنگی اسی حالت میں ہوسکے گی جب بڑے سے بڑے فاصلے دو تین گھنٹوں میں طے ہو جایا کریں گے۔ آج کل تو صورت یہ ہے کہ آدمی انقرہ سے ساڑھے دس بجے صبح چل کر نیویارک ساڑھے سات بجے شام کو پہنچتا ہے، لیکن یہ گھڑی کا فریب ہے۔ انسانی جسم کہتا ہے کہ رات کے ساڑھے سات نہیں ساڑھے بارہ بجے ہیں، اور سرکاری قاعدوں کی پابندی اور ہوائی اڈے سے ہوٹل تک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اگر گھڑی کی بات مان جائے اور رات کا کھانا کھایا جائے تو ایک حساب کے مطابق بس سونے کا وقت آتا ہے اور دوسرے کے مطابق گزر چکا ہوتا ہے۔ مجھے زیادہ دیر اس وجہ سے بھی لگی کہ میں بس پر کر جو مجھے ہوائی اڈے پہ لینے آئی تھیں، پہچان نہ سکا۔ انھوں نے ایک پہچان بھی کرائی تھی اور مجھے جہاز سے اترنے کے بعد ہی مل گئی، کہ مجھے لینے کے لئے بس پر آئیں گی اور پیا تو سہولت

گی جہاں اسباب لاکر رکھا جاتا ہے یا پین امریکن کمپنی کے دفتر کے سامنے۔ پہچان کے لئے بتایا گیا تھا کہ بال سنہرے اور اوور کوٹ بھورا ہے۔ اسباب وصول کرنے کی جگہ پر ان شرطوں کو پوری کرنے والی کوئی خاتون نظر نہ آئیں تو میں پین امریکن کے دفتر کے پاس گیا، ادھر ادھر دیکھا، دفتر والوں سے پوچھا، مگر ان کا پتہ نہ چلا۔ پھر اس خیال سے کہ دفتر میں کام کرتی ہیں تو رعب داب والی ہوں گی میں نے دو خواتین سے جن کی عمر اور جسامت مناسب معلوم ہوتی تھی اور جو سنہرے بال اور بھورے اوور کوٹ کی شرط بھی پوری کرتی تھیں سوال کیا، مگر ان میں سے کوئی مس بلڑ نہ نکلی۔ اس دوران میں میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی سی گھوم رہی ہے اور پین امریکن کے دفتر میں لوگوں سے کچھ پوچھ رہی ہے۔ مجھے خیال بھی نہ آیا کہ مس بلڑ یہی ہیں۔ بہرحال، آدھے گھنٹے کے قریب انتظار کرنے کے بعد میں ٹیکسی لیکر ہوٹل پہنچ گیا۔ یہاں آفاق میاں اپنے ایک دوست کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے مل کر بڑی خوشی اور تسلی ہوئی، سامان لیکر کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ ہوٹل کے دفتر سے فون آیا کہ مس بلڑ آپ سے ملنے آئی ہیں۔ نیچے جا کر دیکھا تو یہ وہی لڑکی سی تھیں جو ہوائی اڈے پر میرے سامنے مجھے تلاش کر رہی تھیں۔ مس بلڑ نے مجھے میرے پورے سفر کا پروگرام دیا جو پہلے سے ٹائپ کیا ہوا تیار تھا، کہ کس دن کہاں جانا ہوگا، کون ہوائی اڈے پر مجھے لینے آئے گا اور میرے پروگرام پر عمل کرانے کا ذمہ دار ہوگا۔ اس کے مطابق مجھے اگلے ہی دن ریل سے فلاڈلفیہ جانا تھا۔ امریکہ میں آج کل ریلوے کمپنیوں کی حکومت سے اور پبلک سے ان بن ہو گئی ہے، حکومت ہوائی جہاز کی کمپنیوں کو امداد دیتی ہے، ریلوے کمپنیوں کو نہیں دیتی، اگرچہ یہ بھی مسافروں کو لاتے لے جانے کے کام میں نقصان پر چلتی ہیں، پبلک ریلوے کمپنیوں کو بدنام کرتی رہتی ہے، اور سفر کے ہر ذریعے کو ریل کی سواری پر ترجیح دیتی ہے۔ اس کے جواب میں ریلوے کمپنیوں نے طے کیا ہے کہ وہ صرف مال کو لانے لیجانے کا کام کریں گی، اور مسافروں کو ریل سے سفر کرنے سے روکنے کے لئے انھوں نے گاڑیوں کی صفائی اور وقت کی پابندی کا خیال کرنا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن نیویارک سے فلاڈلفیہ اور واشنگٹن جانے والی گاڑیاں پھر بھی صاف ستھری ہیں اور وقت سے چلتی ہیں۔ میں وقت سے پہنچ گیا، اور پلیٹ فارم

سے نکل کر اسٹیشن کے ہال میں آیا تو پروفیسر مسعود غزنوی، جو مجھے لینے آئے تھے، نظر آ گئے۔ یہ پنجاب کے مشہور لیڈر داؤد غزنوی صاحب کے لڑکے ہیں، علی گڑھ کے پڑھے ہوئے ہیں، پنڈت نہرو سے ان کا چچا بھتیجے کا رشتہ تھا، کوئی دو سال ہوئے علی گڑھ اور جامعہ آ چکے ہیں۔ مجھے یہ سب معلوم ہونا چاہئے تھا، مگر ذہن کا وہ حصہ جس کے سپرد ایسی معلومات کو محفوظ رکھنا اور وقت پر پیش کر دینا ہے کبھی کارپرداز نہ تھا اور اب بیکار سا ہو گیا ہے۔ پھر بھی آنکھوں نے ہندوستانی شکل صورت پہچان لی، اور غزنوی صاحب بھی آگے بڑھ کر مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے کالج کی تین لڑکیوں کو ساتھ لایا ہوں کہ اسٹیشن سے باہر جانے کے ہر رستے کی ناکہ بندی کر لوں، مگر آگے بڑھے تو دیکھا کہ تینوں ایک دکان کے سامنے کھڑی چاکلیٹ کھا رہی ہیں۔ غزنوی صاحب نے تعارف کرایا، پھر سب باہر نکلے اور موٹر پر سوار ہو کر روزمونٹ کالج کے لئے روانہ ہو گئے۔

امریکہ میں یونیورسٹیوں کی کوئی حد نہیں، اور دولت کی فراوانی ایسی ہے کہ ہر قسم کے کورس پڑھائے جا سکتے ہیں۔ غزنوی صاحب روزمونٹ کالج میں ہندوستان کی تاریخ: عہد وسطیٰ پڑھاتے ہیں، اور پاس ہی ٹمپل یونیورسٹی ہے جس میں اسلامیات کا ایک شعبہ ہے جس کے صدر ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی صاحب ہیں۔ مجھے خیال نہیں تھا کہ جو لڑکیاں مجھے لینے آئی ہیں انھیں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کچھ معلوم ہوگا، غزنوی صاحب نے بتایا کہ وہ سب مسلمانوں کی تاریخ بڑی دلچسپی سے پڑھ رہی ہیں، ایک نقشبندی سلسلے پر مضمون لکھ رہی ہے، ایک تصوف پر۔ اس پر لڑکیوں نے ایک مسلمان استاد کا ذکر کیا جو کھانے پینے کے معاملے میں بہت تکلف کرتے تھے اور اپنی پرہیزگاری اور تقویٰ کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ غالباً ان کی اس عادت کا روزمونٹ کالج اور ٹمپل یونیورسٹی میں خاصا چرچا تھا اور لڑکیوں کو بہت لطف آیا جب میں نے پوچھا کہ یہ استاد پرہیزگاری اور تقویٰ کے بیان کے ساتھ یہ بھی بتایا کرتے تھے یا نہیں کہ مسلمان کو جھوٹ بولنا منع کیا گیا ہے۔

روزمونٹ کالج رومن کیتھلک فرقے کے لوگوں کا قائم کیا ہوا لڑکیوں کا کالج ہے، اور اس کے ہر چھوٹے بڑے کمرے میں ایک صلیب لٹکی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کالج کی فضا میں مذہبیت کہیں

اور کسی شکل میں بھی نظر نہیں آتی۔ قیام کے دوسرے دن ایک لڑکی مسز سینڈرا شون فلٹ نے VOICE of AMERICA کی طرف سے میرا انٹرویو لیا، اور ایک استاد جون اسپوزٹو سے تعارف کرایا گیا جو شعبۂ دینیات میں پڑھاتے ہیں۔ شام کو یہ دونوں اس ہوٹل میں آئے جہاں مجھے ٹھہرایا گیا تھا، گفتگو کے دوران لڑکی نے، جو روز مونٹ کالج میں پڑھ چکی تھی بتایا کہ وہ کچھ عرصہ تک نن رہ چکی ہے، پھر دل میں کچھ ایسے شبہات پیدا ہوئے کہ اس نے یہ مسلک چھوڑ دیا اور شادی کرلی۔ استاد نے کہا کہ میں دس برس تک منک (MONK) تھا، پھر ایک لڑکی پر عاشق ہو گیا جو اب میری بیوی ہے۔ ان دونوں سے دیر تک مذہب اور تصوف پر باتیں ہوتی رہیں۔ شاید اسی گفتگو کا نتیجہ تھا کہ سینڈرا شون فلٹ نے دوسرے دن مجھے سگار اور سگار کیس تحفہ کے طور پر پیش کیا اور اسپوزٹو نے مجھے فلاڈلفیہ کے ہوائی اڈے تک پہنچانا اپنے ذمہ لیا۔ کھانے پر غزنوی صاحب مارگریٹ کو پر کو لے آئے، جو کئی سال بمبئی میں رہ چکی ہیں اور حارث صاحب اور نورانی صاحب کو اچھی طرح جانتی ہیں۔

میں روز مونٹ کالج ۲۱ر اپریل کو پہنچا تھا اور اسی شام کو غالب اور ایمیلی ڈکنسن پر لکچر تھا۔ جلسہ کی صدارت ٹمپل یونیورسٹی کے پروفیسر لیمبرٹ نے کی۔ اب اعلیٰ تعلیم میں مضامین کی کچھ ایسی تقسیم ہوگئی ہے کہ ایک کا دوسرے سے تعلق صرف اصولی طور پر مانا جاتا ہے، تاریخ کا ادب سے ہی نہیں، ایک ملک کی تاریخ کا دوسرے ملکوں کی تاریخ سے کوئی حقیقی رشتہ قائم نہیں کیا جاتا، اور انسانیت کے رشتے تو بالکل فرضی ہوتے ہیں۔ میں نے بھی غالب اور ایمیلی ڈکنسن پر ایک ساتھ بحث کرنے کا ارادہ صرف اس وجہ کیا تھا کہ مجھے دونوں بہت پسند ہیں۔ اس سفر کے دوران کہیں مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا غالب ایمیلی ڈکنسن کے بارے میں کچھ جانتے تھے؟" میں نے جواب دیا کہ "نہیں"۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا ایمیلی ڈکنسن غالب کے بارے میں کچھ جانتی تھیں؟" میں نے پھر جواب دیا کہ "نہیں، مگر میں دونوں کو جانتا ہوں۔" میرے اس جاننے سے کام نہ بنتا اگر اپنا مطلب بیان کرنے کی یہ ترکیب سمجھ میں نہ آئی ہوتی کہ وقت اور فاصلہ اور زبان کی رکاوٹوں کو نظر انداز کر کے یہ فرض کیا جائے کہ دہلی میں مشاعرہ ہوا ہے، غالب اور ایمیلی ڈکنسن نے اپنا کلام سنایا ہے، اور

مشاعرہ کے بعد میں دونوں سے الگ ملتا ہوں اور ایک سے دوسرے کے بارے میں گفتگو کرتا ہوں۔ یہ ترکیب بہت مناسب ثابت ہوئی، کہ اس سے دونوں شاعروں کے کلام پر اور مشرقی اور مغربی شاعری کی خصوصیات پر تبصرہ کرنے کا موقع نکل آیا۔ ظاہر ہے امریکہ میں پڑھے لکھے لوگ غالب کے کلام سے کیا ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں، ایملی ڈکنسن کی دو چار نظمیں ثانوی مدرسوں کے نصاب میں شامل کی جاتی ہیں، اس لئے بیشتر لوگوں کو اس بیچاری کا نام ہی یاد رہ جاتا ہے۔ میں نے جہاں بھی یہ مضمون پڑھا لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی قومی عظمت کا ایک پہلو نمایاں کیا جارہا ہے جس سے وہ واقف نہ تھے۔

۱۷ اپریل کو ایک جلسہ ہوا جس میں اعجاز احمد صاحب نے غالب کی غزلیں اردو میں پڑھکر سنائیں اور ایک امریکن شاعر نے کچھ نظمیں پڑھیں جو غالب کے ترجموں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ ترجمے اعجاز احمد صاحب نے کئے ہیں۔ یہ نئے فیشن کے مطابق داڑھی اور لمبی زلفیں رکھتے ہیں، لباس میں بھی شعریت برتتے ہیں، میرے سامنے انھوں نے غالب کی غزلیں زنانہ لہجے میں پڑھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ موزوں اور ناموزوں میں فرق نہیں کر سکتے ہیں۔ امریکن شاعروں کے لئے انھوں نے جو ترجمہ کیا ہوگا اس کی صحت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ کسی موقع پر اردو اور فارسی جاننے والوں کے مجمع میں انھوں نے "ہم موحد ہیں ....." کے بجائے "ہم موجد ہیں ...." پڑھا اور اصرار کرتے رہے کہ یہی صحیح بھی ہے۔ بہرحال، وقت کسی طرح کٹ گیا۔

روز مونٹ کالج سے مجھے مونٹریول (کینیڈا) جانا تھا۔ یہاں میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز کے ڈائرکٹر ڈاکٹر چارلز ایڈمز کا مہمان تھا۔ ان کی اور ان کی بیوی کی مہمان نوازی اور محبت بیان نہیں کی جاسکتی۔ انسٹی ٹیوٹ کی مالی حالت اب اچھی نہیں ہے اور طالب علموں میں پہلے کی طرح اب بھی ایسے لوگ ہیں جن کے ذہن صاف نہیں ہیں، انھیں یہ معلوم نہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہئے اور کیسے، اور اس وجہ سے بے چین رہتے ہیں۔ وہاں استادوں میں ہمیشہ ایک دو کٹر مذہبی اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔ آج کل اس قبیلہ کی نمائندگی ایک ایرانی مجتہد کر رہے ہیں۔ میں نے انسٹی ٹیوٹ میں اپنا مضمون

اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام" جو دو حصوں میں ہے، پڑھا ــــــ انھوں نے ان پر جو اعتراض کئے وہ میری سمجھ میں نہیں آئے، اس لئے کہ یہ بات میرے خیال ہی میں نہیں آسکتی تھی کہ ان پر ایسے اعتراض کئے جا سکتے ہیں اور میں نے جو جواب دئے وہ انھیں قطعاً غلط معلوم ہوئے۔ پروفیسر عبدالرحمٰن بارکر بھی دینی معاملات میں بند ذہن کی مثال ہیں۔ علمی اعتبار سے میرا یہاں کا قیام خاصا بے سود اور بے لطف رہا، ڈاکٹر اور مسز ایڈمز کی شفقت ہمیشہ یاد رہے گی۔

اگلی منزل شکاگو یونیورسٹی تھی۔ یہاں میزبان محمد نعیم صاحب تھے۔ یہ سنہ ۵۴ یا ۵۵ء میں دہلی کالج میں اردو کے لکچرر کی جگہ کے امیدوار تھے، مگر منتخب نہیں ہوئے۔ پھر یہ امریکہ پہنچ گئے، قریب گیارہ سال سے وہاں ہیں اور اب وہیں رہنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ شکاگو میں حمید احمد خاں صاحب سے ملاقات ہوئی جو میری طرح غالب پر تقریریں کرنے کے لئے بلائے گئے تھے۔ مجھے ان کی تعلیمی اور ادبی کارگذاریوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ دونوں میں وہ بہت ممتاز رہے ہیں اور غالباً میں اپنی ناواقفیت کو چھپا بھی نہ سکا۔

شکاگو یونیورسٹی بہت بڑی ہے، شہر بھی بہت بڑا ہے، مگر غنیمت یہ ہے کہ یونیورسٹی شہر کے ایک کونے میں ہے، اور وہاں آدمی نسبتاً سکون سے رہ سکتا ہے۔ یونیورسٹیوں کے طالب علم کیسی شکل صورت بنائے رکھتے ہیں، اور کسی محتسب سے ان کے لباس کے بارے میں رائے لی جاتی تو وہ کیا کہتا اس کا اندازہ شکاگو پہنچ کر ہوا۔ جو استاد وہاں رہتے ہیں وہ اس فضا کے عادی ہو گئے ہیں، اور عادت کس بات کی نہیں ہو سکتی، وہ اپنا تعلیمی اور علمی کام بھی شوق اور یک سوئی سے کر سکتے ہوں گے، میں زیادہ عرصہ تک رہتا تو شاید میں بھی انھیں کی طرح ہو جاتا، پہلا اثر تو یہ پڑا کہ اپنی قدامت پسندی اور بے مائگی اس تہذیب کے مقابلے میں کچھ بری نہیں۔

میرا شکاگو کا پروگرام پروفیسر فضل الرحمٰن صاحب کے ایک سیمینار میں شرکت سے شروع ہوا۔ اس کے بعد چند استادوں کے ساتھ لنچ تھا۔ یہاں آغا ایرج دہقان سے ملاقات ہوئی۔ وہ مصدق کے حامی اور ان کی وزارت کے زمانے میں خاصے ممتاز تھے، پھر اپنے سیاسی خیالات کی وجہ سے

ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے، اور کچھ عرصہ تک خاصا ادبی کام کر کے گذر اوقات کرتے رہے۔ یہ سب مجھے ان سے بعد کو معلوم ہوا اور میں نے ان سے درخواست کی کہ اپنی سوانح حیات لکھ کر مجھے بھیجیں، رسالہ جامعہ کے لئے ان سے مضمون بھی مانگا ہے۔ پہلی ملاقات میں تو میں نے ایرانیوں اور ہندستانیوں کی فارسی اور ان کے مذاق کے اختلاف کا ذکر چھیڑا، اور ان سے فرمائش کی کہ حافظ کی کوئی غزل جو انھیں پسند ہو سنائیں، انھوں نے ایک غزل سنائی اور پھر اپنے کہے ہوئے دو شعر:

شکست عہد من وگفت ہرچہ بود گذشت
بگریہ گفتمش آرے ولے چہ زود گذشت

بہار بود و تو بودی و عشق بود و امید
بہار رفت و تو رفتی و ہرچہ بود گذشت

سہ پہر کو حمید احمد خاں کا نوجوان غالب پر لکچر تھا۔ غالب کے اس دور کے کلام میں جو کچھ مجھے پسند ہے اس کا ذکر ان کے لکچر میں نہیں تھا، جو مثالیں انھوں نے دیں وہ میرے نزدیک مثالیں نہیں تھیں۔ مطبوعہ کلام کا ایک شعر:

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

میرے خیال میں شعر کہلانے کے قابل نہیں ہے، اس پر انھوں نے تفصیل سے تبصرہ کیا۔ لیکن ذوق کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے، میں نے اس وقت اور اس کے بعد کبھی غالب کے بارے میں ان سے گفتگو نہیں کی۔

نعیم صاحب نے طے کیا تھا کہ میرے لکچر کا موضوع "اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام" ہوگا۔ میک گل یونیورسٹی میں میں نے محسوس کیا تھا، اور ڈاکٹر ایڈمز نے بتایا بھی کہ میری نظر ہندوستانی حالات پر تھی، پورے عالم اسلام پر نہ تھی، اس لئے یہاں میں نے دو لکچروں کو ملا کر ایک کر دیا۔ لکچر سے پہلے مجھے پروفیسر فضل الرحمن صاحب کا ایک مضمون پڑھنے کو مل گیا تھا اور میں نے بات اس پر ختم کی کہ میرے عقیدے

وہ باتیں جو فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے مضمون میں بیان کئے ہیں مگر مجھے معلوم نہیں کہ انھوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ان کے اپنے عقیدے بھی ہیں۔ فضل الرحمٰن صاحب جلسے میں موجود نہیں تھے، مگر کسی نے یہ بات ان تک پہنچادی اور انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کیوں ان کے عقیدے پر شبہ کیا۔ یہی میں ان کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ میں نے اس اطمینان کے ساتھ معذرت کرلی کہ ان کا دین ان کے علم میں گھل کر غائب نہیں ہو گیا ہے۔

۲۵ راپریل کو نیویارک واپسی ہوئی اور ۲۶ کو ڈاکٹر اور مسز سید اور میرا بھانجا عمران اس کی بیوی سلمیٰ اور بچہ شاہد، آفاق اور مس بلڑ سب میرے ہوٹل میں جمع ہوئے، پھر ایک جگہ ساتھ کھانا کھایا اور نیویارک کے سنٹرل پارک میں سیر کے لئے گئے۔ اتوار کا دن تھا، پارک میں بہت لوگ سیر کے لئے آئے تھے، اور معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک مرد عورت نے اس موقع کے لئے ایک نیا فیشن نکالا ہے۔ میں بار بار مس بلڑ سے پوچھتا تھا کہ کیا یہ مرد یا یہ عورت ہپی ہے اور ہر دفعہ جواب ملتا تھا کہ نہیں، یہ معمولی امریکن شہری ہے۔ یہ جواب سنتے سنتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ منظر امریکی قوم کے نوخیز ہونے کا ثبوت ہے، اور اس کی تہذیب اور سیاست کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس بچپن کو اس معقولیت سے کیسے ہم آہنگ کیا جائے جو امریکہ کی صنعتی ترقی اور سماجی اور کاروباری نظام میں ہر طرف نظر آتی ہے اور جس نے امریکہ کو اس قابل بنادیا ہے کہ وہ آزاد دنیا کی سیاسی قیادت کو اپنا منصب سمجھے۔

۲۷ راپریل کی سہ پہر کو نیویارک کی مشہور کولمبیا یونیورسٹی میں سیمینار ہوا۔ یہ ایک عجیب تماشا تھا۔ دو تین فاضل مقررین کے علاوہ ایک ہندوستانی، ایک امریکن اور دو ایرانی استاد اور دو ایرانی لڑکیاں تھیں۔ موضوع تھا ہندوستان اور ایران کے تعلقات، اور اس سلسلے میں غالب کا بھی ذکر آگیا۔ ۲۸ راپریل کو ایشیا سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک رسپشن ہوا اور اس کے بعد حمید احمد خاں صاحب نے غالب پر اور میں نے غالب اور ایملی ڈکنسن پر مضمون پڑھے۔ اس جلسے کی رپورٹ امریکن رپورٹر میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ رپورٹ ایک خاتون نے مرتب کی تھی جنھوں

نے جلسے سے دو روز پہلے میرا انٹرویو بھی لیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کی رپورٹ نیو یارک کے اخبار وں میں بھی چھپے گی؟ انھوں نے کہا کہ میں جو کچھ لکھتی ہوں وہ صرف امریکہ کے باہر کے امریکن اخبار وں میں چھپ سکتا ہے، ملک کے اندر میں کسی اخبار کے لئے نہیں لکھ سکتی۔ اس لئے معلوم نہیں کہ نیو یارک کے اخباروں میں کسی نے اس جلسے کا نوٹس لیا یا نہیں، اور لیا بھی ہوتا تو مجھے پتہ نہ چلتا، مجھے صبح سویرے ایک دن کے لئے ڈیوک یونیورسٹی جانا تھا۔

یہ یونیورسٹی شمالی کیرولائنہ اسٹیٹ میں ہے، اسے حکومت سے تھوڑی بہت امداد ملتی ہوگی مگر اس کا شمار پرائیویٹ یعنی غیر سرکاری یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ یہاں کے وائس چانسلر کو چانسلر کہتے ہیں۔ اس کا کیمپس شہر سے دور بہت پر فضا مقام پر ہے، تعلیم گاہ کے لئے جو کچھ چاہیے وہ فراوانی کے ساتھ موجود ہے، تعلیم کے بہت سے شعبے ہیں، یہاں تک کہ ہندی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ شکاگو یونیورسٹی میں بھی ہندی پڑھائی جاتی ہے، استاد پنجابی ہیں، اور ان سے ملتے ہی میں نے پوچھا کہ آپ ہندی کس نسبت سے پڑھاتے ہیں، آپ کو تو اردو کی تعلیم دینا چاہئے۔ وہ خود بھی کچھ خوش نہیں ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ میں ہندی تو پڑھاتا ہوں، مگر یہ بھی بتاتا رہتا ہوں کہ یہ زبان پڑھی اور لکھی جاتی ہے، بولی نہیں جاتی۔ ڈیوک یونیورسٹی میں بھی ہندی کے استاد پنجابی ہیں، میرے سوال پر انھوں نے اسی طرح کا جواب دیا۔ مگر یہ تو بعد کی بات ہے۔ میں تو پروفیسر اینزلی ایبری کی محبت کا گرفتار تھا۔ غالباً ڈیوک یونیورسٹی کا پروگرام انھیں کے اصرار پر رکھا گیا تھا۔ وہ مجھے صبح ہوائی اڈے پر لینے آئے، ناشتہ خود تیار کر کے کھلایا، اس لئے کہ اکیلے رہتے ہیں، پھر یونیورسٹی لے گئے، وہاں چانسلر گولڈ مین سے ملایا، جو دکھانے کو تھا دکھایا، پھر اپنے کلاس میں لکچر کرایا۔ ہندی کے استاد سے لنچ پر ملاقات ہوئی تھی۔ شام کو ایک کلب میں، جو انٹرنیشنل سنٹر بھی کہلاتا ہے، میری غالب پر تقریر ہوئی۔ اس کی دعوت یونیورسٹی اور آس پاس کے کارخانوں اور ریسرچ کے اداروں میں کام کرنے والے ہندوستانیوں کی طرف سے دی گئی تھی، اور جلسے میں ہندوستانی اور پاکستانی ہی تھے۔ اس کے بعد میں ایک دعوت میں شریک ہوا جو ایک سابق ہندوستانی کی طرف سے دی گئی تھی۔

یہاں مہمانوں میں سفید چوڑی دار پائجامہ، چکن کا کرتا پہنے اور دوپٹہ ڈالے ہوئے ایک نوجوان خاتون تھیں جنھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ میرے نام اردو میں خط آیا ہے، وہ مجھے پڑھ کر سنا دیجئے۔ خط کے القاب تھے "میری پیاری گڑیا" اور لکھنے والی تھیں لکھنؤ کی ایک خاتون جن کے شوہر اس گڑیا کو ستار بجانا سکھاتے تھے۔ خط سنانے کے بعد میں نے سوال کئے تو معلوم ہوا کہ یہ نوجوان خاتون، مسز چرچ، اپنے شوہر کے ساتھ دو برس لکھنؤ میں رہ چکی ہیں، اردو سیکھی تھی مگر اب بھولتی جا رہی ہیں، اور دل کی سب سے بڑی آرزو ہے کہ پھر لکھنؤ جائیں۔ ایک طرف یہ آرزو تھی اور دوسری طرف میزبان تھے جو امریکن شہری بن چکے ہیں، امریکی بیوی کے ساتھ امریکن طریقے پر رہتے ہیں اور ہندوستان واپس جانے کی خواہش نہیں رکھتے۔

ڈیوک یونیورسٹی امریکہ کی ممتاز تعلیم گاہوں میں نہیں ہے، ہارورڈ یونیورسٹی ساری دنیا میں مشہور ہے، مگر وہاں پہنچ کر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہاں علمی اور تعلیمی کام ہوتا ہے اور ہو بھی سکتا ہے۔ مجھے عابد اللہ غازی صاحب ایک امریکن دوست کے ساتھ لینے آئے تھے، ہوٹل پہنچ کر میں نے کہا کہ کچھ چھوٹی موٹی چیزیں خریدنا ہیں، بازار لے چلئے بازار کا مرکز ایک چوراہا ہے جسے ہارورڈ اسکویر کہتے ہیں۔ یہاں شاذ ہی کوئی صورت نظر آتی تھی جس پر وحشت یا وحشت زدگی کا کچھ اثر نہ ہو، اور لباس صورت کے مناسب تھا۔ غازی صاحب نے بتایا کہ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں بہت کم ہے، چوراہے پر رونق شام کو ہوتی ہے، اس وقت آئیے گا۔

ہارورڈ یونیورسٹی کو ڈرانی فاونڈیشن اور یونسکو کی طرف سے صرف غالب اور میر پر نہیں بلکہ ہندوستانی اور ایرانی شاعری کے پورے سلسلے پر تحقیق اور کتابیں لکھنے کا کام سپرد ہوا ہے۔ اپنی مصروفیت کے باوجود پروفیسر شِل نے، جو اس سارے کام کی نگراں اور ذمہ دار ہیں، مجھ سے تفصیلی ملاقات کے لئے وقت نکالا۔ ان سے معلوم ہوا کہ وہ خود غالب کے اردو اور فارسی کلام پر لکھ رہی ہیں، غالب کے منتخب کلام کا جرمنی میں ترجمہ کر چکی ہیں جو جلد شائع ہونے والا ہے، اور اب تک انھوں نے غالب پر جو مضمون لکھے ہیں انھیں یکجا کر کے چھاپنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

داؤد رہبر صاحب غالب کے تمام خطوط کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں، اور ایک صاحب ابوطالب کلیم پر کتاب لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر شِل کو موسیقی کا بھی شوق ہے، اور انھوں نے ایک ستار لیے محمود مرزا کو ہارورڈ بلاتے اور امیر خسرو کے فن موسیقی پر کام کرنے کا انتظام کیا ہے۔ ویسے ہارورڈ کی فضا پروفیسر شِل کو بھی پسند نہیں اور سال میں چھ مہینے وہ اپنی یونیورسٹی بون میں جا کر رہتی اور پڑھاتی ہیں۔ مگر انھوں نے کہا کہ ہارورڈ کی زندگی بھی لطف سے خالی نہیں۔ میرا ایک طالب علم تھا جو ہر روز کسی ایک رنگ کے کپڑے پہن کر آتا تھا، کسی دن سب گلابی، کسی دن سب نیلے، کسی دن سب زرد۔ میں نے اس سے کہا کہ شاید تم اپنے لباس کے ذریعہ مصوّر پکاسو کے ہر دور کے طرز کی مثالیں پیش کر رہے ہو۔ یہ بات اسے پسند آئی اور وہ میرا ایسا گرویدہ ہو گیا کہ اپنی بلّی مجھے تحفے کے طور پر دینا چاہتا تھا، اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ میں نے بلّی پالی ہے۔

امریکہ میں موٹر پر ڈیڑھ دو سو میل جانا کوئی بڑی بات نہیں، اس لئے مجھے ڈاکٹر الورٹ ووڈمین نے، جو ہارورڈ سے قریب سو میل کے فاصلے پر ایک کالج کے پرنسپل ہیں، اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اور میں نے اسے قبول کر لیا۔ ان کے کالج کا نام کولبی ہے، اور اس کا مقصد دولت مند گھرانوں کی لڑکیوں کی تعلیم ہے۔ روز مونٹ کالج کی طرح یہ بھی مذہبی لوگوں کا قائم کیا ہوا ادارہ ہے، یہاں بھی ایک گرجا ہے جس میں عبادت کے لئے اجتماع ہوتے رہتے ہیں، ہر قسم کے تعلیمی سامان کی فراوانی ہے، مذہبیت کے آثار ذرا بھی نہیں ہیں۔ مکان پر پہنچنے سے کچھ پہلے ڈاکٹر ووڈمین کے پاس ٹیلیفون آیا اور انھوں نے ذرا غصہ میں جواب دئے۔ میں نے سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ چند دن ہوئے میں نے یہاں تقریر کی تھی، ایسے معاملوں پر جن کا تعلق صرف مجھ سے اور کالج کی لڑکیوں سے ہے، اور والدین تقریر کی نقلیں مانگ رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ میں نقل کسی کو نہیں دوں گا۔ اس کے بعد ہی انھوں نے مجھ کو تقریر کی نقل دی اور کہا کہ اسے کسی وقت پڑھ لیجئے گا۔ کولبی کالج سے واپسی کے وقت میں نے تقریر پڑھی۔ معلوم ہوا کہ زیر بحث یہ مسئلہ ہے کہ لڑکیاں لڑکوں کو بلائیں تو انھیں کتنی دیر ٹھہرنے کی اجازت ہو۔ اس وقت انھیں صبح سے بارہ بجے رات

تک ٹھہرنے کی اجازت ہے، لیکن امریکہ کے بعض ترقی پسند لڑکیوں کے کالج ہیں، جہاں چوبیس گھنٹے ٹھہرنے کی اجازت ہے، اور کوہی کالج کی لڑکیوں کا مطالبہ تھا کہ ان کے لئے بھی یہی "قاعدہ" منظور کر لیا جائے۔ اس پر کالج کے منتظمین اور والدین کے اور لڑکیوں کے نمائندوں میں گفتگو ہوئی، لڑکیاں اپنی بات پر اڑی رہیں اور ڈاکٹر ووڈمین کی تقریر سے معلوم ہوتا تھا کہ لڑکیوں کا مطالبہ مان لیا گیا ہے۔ تقریر میں ڈاکٹر ووڈمین نے کہا تھا کہ جو لڑکیاں ایسی آزادی چاہتی ہیں انھیں اپنا اعتبار بھی قائم رکھنا چاہئے، اس وقت صورت یہ ہے کہ دوکاندار شکایت کرتے ہیں کہ لڑکیاں دکانوں سے چیزیں چرالاتی ہیں اور کمروں میں چھپ کر شراب پی جاتی ہے۔

ہارورڈ سے مجھے مشیگن یونیورسٹی جانا تھا، جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نائب صدارت کے آخری زمانے میں ایک اہم تقریب میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ یہ یونیورسٹی ایک چھوٹے سے شہر این آربر میں ہے، اور شہر پر چھائی ہوئی ہے۔ یہاں میرے پروگرام کے ذمہ دار پروفیسر پارک تھے جو ہندوستان میں کئی سال ایشیا فاؤنڈیشن کے نمائندے کی حیثیت سے رہ چکے ہیں، اور ایسے بے عذر خیرخواہ ہیں کہ کلکتے کے موسم کی بھی تعریف کرتے ہیں اس لئے کہ وہاں انھیں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ پروفیسر پارک کے ہم خیال پروفیسر اگیرٹ سن شعبۂ تعلیم میں کام کرتے ہیں اور ان کی کوشش سے مشیگن اور بڑودا یونیورسٹی نے مشترک طور پر تعلیمات کا ایک ریسرچ کا ادارہ قائم کیا تھا۔ دونوں اپنی جگہ موجودہ صورت حال پر بہت افسوس کر رہے تھے۔ ایشیا فاؤنڈیشن کا کام حکومت ہند نے بند کر دیا، اس لئے کہ اسے سی آئی اے (CIA) سے مدد ملتی تھی، بڑودا یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیمات کے ڈین نے مشیگن یونیورسٹی، یعنی پروفیسر اگرٹ سن کو بتائے بغیر اپنی طرف سے اسی کام کے متعلق جو مشترک طور پر ہو رہا تھا یو جی سی میں ایک تجویز پیش کر دی جو منظور ہو گئی تو وہ کام جو مشترک طور پر ہو رہا ہے بند ہو جائے گا۔ پروفیسر اگیرٹ سن کو شبہ تھا کہ ڈین نے اپنی تجویز اس لئے پیش کی ہے کہ اس طرح انھیں نگرانی کے دوسو روپے ماہوار ملا کریں گے، اور اسی کا انھیں اور رنج تھا۔ پروفیسر پارک اور اگرٹ سن دونوں ہندوستانی طالب علموں کو داخل کرانے اور

انھیں وظیفہ وغیرہ دلوانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اور ان کوششوں سے انھیں شکوؤں سے کہیں زیادہ ان طالب علموں کی خود غرضی اور بیجا مطالبوں سے دکھ پہنچا ہے جن کی وہ مدد کرتے تھیں۔ پھر بھی وہ میری اس رائے کو ماننے پر تیار نہیں تھے کہ امداد کا سلسلہ بند کر دینا چاہئے، اس لئے کہ یہ کسی ملک کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ دوسرے کسی ملک کا دست نگر ہو۔ کسی کے دل کا حال معلوم نہیں ہوتا، مگر ان دونوں کی باتوں کا میرے اوپر یہ اثر ہوا کہ دونوں اپنی طبیعت سے مجبور ہیں، جہاں تک ہوسکے گا امداد اور اشتراک عمل کی کوشش کرتے رہیں گے۔

میں جہاں بھی گیا جامعہ ملیہ کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں ضرور آیا۔ پروفیسر اگبرٹ سن کو جامعہ سے اتنی دلچسپی ہے کہ انھوں نے مجھ سے اپنے اسٹاف کے جلسے میں جامعہ پر تقریر کرائی۔ یہ لوگ سب ہندوستان میں رہ چکے ہیں، مگر مہاراشٹرا اور گجرات میں، جامعہ کے کام کو دیکھنے کا موقع کسی کو نہیں ملا ہے۔ غالب کی یادگار منانے کے سلسلے میں میری غالب اور ایملی ڈکنسن پر تقریر ہوئی۔ جلسے کے بعد رات کے کھانے پر ایک خاتون نے مجھ سے کہا کہ میں نے ایملی ڈکنسن کی چند نظمیں ثانوی کے ادب کے نصاب میں پڑھی تھیں، آپ کی تقریر کے بعد میں نے اس نصاب کو پھر دیکھا، اور بہت غصہ آیا کہ ایسے اعلیٰ شاعر کی حیثیت غلط انتخاب کی وجہ سے طالب علموں کی نظروں میں گرائی جاتی ہے۔ پروفیسر برودم فیلڈ نے، جو جنوبی ایشیا کی تاریخ پڑھاتے ہیں، دوسرے دن مجھے ایملی ڈکنسن کی نظموں کا ایک باتصویر انتخاب، جو حال میں چھپا ہے، تحفے کے طور پر دیا۔

اس پورے سفر میں نوجوانوں کے جوش کے سب سے دلچسپ مظاہرے کارلٹن کالج میں دیکھنے کو ملے۔ یہاں تعلیم مخلوط ہے، اور اس سال فروری میں لڑکوں لڑکیوں کے آزادی اور ترقی پسندی کے شوق نے منتظموں کو اس پر مجبور کیا کہ مخصوص ہوسٹلوں کے علاوہ مخلوط ہوسٹل بھی قائم کئے جائیں، اور اب چند ہوسٹل ایسے ہیں جن میں لڑکے لڑکیاں ساتھ رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ پروفیسر ہیتھ کوکس نے، جو میرے میزبان تھے، کہا کہ امریکہ میں اب خاندانی اور سماجی زندگی ایسی ہوگئی ہے اور تعلیمی اداروں کی فضا ایسی ہے کہ بہت سے نوجوانوں میں محرومی کا احساس پیدا ہوجاتا ہے،

یعنی وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس دنیا میں ان کا کوئی نہیں ہے اور وہ کسی کے نہیں ہیں، اور اگر یہ احساس زیادہ شدید ہو جائے تو اس سے طبیعت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ مخلوط ہوسٹل اس کا امکان پیدا کر دیتے ہیں کہ لڑکے لڑکیاں بھائی بہن کی طرح رہیں، اور کسی کو تنہائی کا نقصان دہ احساس نہ ہو۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ اب تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ مخلوط ہوسٹل قائم کرنے کا فیصلہ غلط تھا۔ دوسری طرف کارلٹن کالج کی میگزین میں میں نے ایک ماہر نفسیات کا مضمون دیکھا جس میں یہ دعویٰ تھا کہ لڑکوں لڑکیوں کا اس طرح ساتھ رہنا انھیں ایک دوسرے کا محرم بنا دیتا ہے اور ان کی طبیعتیں خود بخود اپنے اوپر وہ پابندیاں لگا لیتی ہیں جو قدیم زمانے سے محرموں کے تعلقات پر لگتی رہی ہیں۔ انگریزی میں اس پابندی کو INCEST TABOO کہتے ہیں۔

خاص اس وقت جب میں کارلٹن کالج پہنچا کمبوڈیا میں امریکن فوجوں کی پیش قدمی کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے سٹوڈنٹس یونین کی عمارت نشر و اشاعت کا مرکز بن گئی تھی، تعلیم کا کام بند تھا، اور تقریروں کا سلسلہ جاری۔ کوئی دس گیارہ لڑکوں لڑکیوں نے احتجاج کے طور پر چار دن کا برت رکھنے کا عہد کیا تھا۔ ان میں سے اکثر اپنی تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان آنے والے تھے اور شاید برت رکھنے کا خیال بھی اسی وجہ سے آیا۔ ۸ مئی کی شام کو میرا غالب پر لکچر رکھا گیا تھا، جب پروفیسر ہیتو کوکس مجھے لیکر وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ سٹرائک کرنے والے طالب علموں نے کسی غلط فہمی کی بنا پر وہاں کمبوڈیا پر تقریر کرنے کے لئے کسی اور کو بلایا ہے۔ میں نے کہا کچھ حرج نہیں، میرا لکچر کسی اور وقت کرا دیجئے گا، لیکن انھوں نے طے کیا کہ میرا لکچر ایک اور ہال میں ہوگا جو خالی تھا، اور پھر اعلان کرایا کہ جو طالب علم غالب پر لکچر سننا چاہیں وہ وہاں چلے چلیں۔ اس پر طالب علموں کی خاصی تعداد ساتھ چلی، اور جہاں تک میں اندازہ کر سکا، لکچر شوق سے سنا۔ دوسرے دن صبح ۱۰ بجے سے ۱۲ بجے تک دو گھنٹے اس لئے رکھے گئے تھے کہ اگر کوئی طالب علم مجھ سے ملنا چاہے تو مل سکے۔ ساڑھے دس بجے کے قریب ایک لڑکی جو ہندوستان آنے والی ہے اور برت رکھنے میں شریک تھی ملنے آئی، کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرکے اس نے غالب کے ترجمے سننے کی خواہش ظاہر کی، جو کچھ میں نے سنایا

سنتی رہی اور آخر میں خود مجھے کہنا پڑا کہ ترجموں کا خزانہ خالی ہوگیا ہے۔ سہ پہر کو تین بجے غالب خوانی کی محفل ہوئی۔ اس کے بعد ایک طالب علم نے اپنے کام کے بارے میں مشورہ چاہا، اور باتیں کرتے کرتے مجھے اپنے ہوسٹل میں، جو مخلوط ہوسٹلوں میں سے تھا لے گیا اور دیر تک دینی اور اخلاقی مسائل کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔

یہ امریکی نوجوانوں کے مزاج کا دوسرا رخ ہے۔ مگر میں نے جو مثالیں دی ہیں ان سے کہیں زیادہ اہم کارلٹن کالج کے طالب علموں کا یہ مطالبہ ہے کہ ان کے کالج میں نیگرو لڑکوں لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ کالج نے ان کا یہ مطالبہ منظور کر لیا ہے اور ایک نیگرو پروفیسر کے سپرد یہ کام ہوا ہے کہ وہ ملک کا دورہ کریں اور کالج کے لئے نیگرو طالب علموں کا انتخاب کریں۔ دولت مند طالب علموں میں کچھ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ انھیں ان کے حق سے زیادہ مل رہا ہے اور زندگی کی نعمتیں انصاف کے مطابق تقسیم ہونی چاہئیں، مگر یہ ابھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس جذبہ میں کتنی گہرائی ہے اور اس کا ثبات کتنا ہوگا۔

طالب علموں میں بے چینی مسوری یونیورسٹی میں بھی تھی، دوسری یونیورسٹیوں کی طرح یہاں بھی استادوں اور طالب علموں میں کوئی اختلاف نہ تھا، اگرچہ استادوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ طالب علموں کی رہنمائی کیسے کریں۔ یونیورسٹی کے پریزیڈنٹ سے سب ناخوش تھے، اس لئے کہ ان کا برتاؤ اچھا نہیں تھا۔ میرے پہنچنے کے دوسرے دن طالب علموں نے طے کیا کہ یونیورسٹی کے دفتروں کی عمارت کے سامنے مظاہرہ کریں گے اور کسی کو اندر نہ جانے دیں گے۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب جب پریزیڈنٹ کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو انھوں نے مجمع کو ہٹانے کے لئے یونیورسٹی کی پولیس کو بلا لیا اور پولیس نے تیس پینتیس طالب علموں کو گرفتار کر لیا۔ لیکن جلد ہی طالب علموں کی کیفیت دیکھ کر انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا، اور وہ طالب جنھیں پولیس نے گرفتار کیا تھا چھوڑ دئے گئے۔ اب طالب علموں کی طرف سے جو مطالبے کئے گئے ان کا امریکہ کی سیاست اور کیمبوڈیا سے کوئی تعلق نہ تھا، انھوں نے کہا کہ فلاں امتحان ملتوی کر دیا جائے، جو طالب علم سیاسی تحریک میں حصہ لینے کی وجہ

سے اپنا کام پورا نہیں کر سکتے تھے ان کے ساتھ رعایتیں کی جائیں، وغیرہ وغیرہ۔

امریکہ کی ہر یونیورسٹی میں جہاں جنوبی ایشیا سے متعلق علوم کا شعبہ ہے بیشتر ایسے لوگ درس دیتے ہیں جو ہندوستان سے آئے ہیں۔ مسوری یونیورسٹی میں اعجاز احمد صاحب ملے، جو میرے اور میرے پروگرام کے ذمہ دار تھے، پروفیسر بیریر سے ملایا، جو پنجاب کی تاریخ کے ماہر ہیں اور صورت اور انداز سے سکھ معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ سکھ ہندو نہیں ہیں، اور تاریخی مواد جمع کرنے کے سلسلے میں ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پندرہ سو روپے میں امرت سر کی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے اس کے قیام سے اس وقت تک کے تمام جلسوں کی رودادوں کی نقل حاصل کر لی ہے۔

مسوری یونیورسٹی آخری جگہ تھی جہاں کچھ اطمینان سے رہنے کا موقع ملا۔ لوس اینجلیز میں زین العابدین رفاعی صاحب نے اپنے یہاں مہمان رکھا اور برابر ساتھ رہے، باقی اساتذہ، جیسے کہ پروفیسر فون گروں باؤم، یونیورسٹی کے انتظامی اور سیاسی معاملات میں ایسے مصروف تھے کہ ان سے بس رسمی دعوتوں میں سرسری ملاقات ہو سکی۔ سین فرنسسکو میں وحشت زدگی کا وہی عالم تھا جو کہ ہارورڈ میں، اور اب یاد کر کے تعجب ہوتا ہے کہ وہاں ہندوستانی مسلمانوں پر میری ایک تقریر بھی ہو گئی۔

امریکہ میں بہت ہی مختصر ملاقات سے بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ کم از کم لوگ کہتے یہی ہیں۔ ان کے نظام حیات میں یہ ممکن ہی نہیں معلوم ہوتا کہ ایک انسان دوسرے سے رفتہ رفتہ اثر لے، سوائے اس کے کہ کوئی مستقل باضابطہ رشتہ قائم کیا جائے۔ سفر کے دوران ایک جگہ کی زندگی کا جو دھندلا سا نقشہ ذہن میں قائم ہوا اسے حرکت کی برکت نے بہت جلد مٹا دیا، دنیا ایک سڑک بن گئی جس پر جہاں تک نظر جاتی سرپٹ بھاگتے ہوئے موٹر دکھائی دیتے، اور آسمان وہ خلا جس کی وسعتوں کو پر کرنے کے لئے سیکڑوں ہوائی اڈوں سے سیکڑوں ہوائی جہاز اڑائے جاتے ہیں۔

روشؔ صدیقی

غزل

کون کہتا مجھے شائستۂ تہذیبِ جنوں
میں تری زلفِ پریشاں کو اگر چھیڑ نہ دوں

کون حسرت زدۂ شوقِ تکلم ہے یہاں
لڑکھڑاتا ہے تری چشمِ سخن گو کا فسوں

یہ ہجومِ غمِ دوراں میں کہاں یاد رہا
داستانِ غمِ دل تیرے تغافل سے کہوں

کیا خبر، خیمۂ لیلیٰ کے نگہبانوں کو
کہ حریمِ دلِ لیلیٰ میں ہے مہماں مجنوں

رنگ رہ رہ کے ترے رُخ کا اُڑا جاتا ہے
ورنہ میں اور تری محفلِ رنگیں سے اٹھوں

قیدِ ہستی میں یہ اک گوشۂ دامانِ خیال
پھر غنیمت ہے کہ زنداں میں بھی آزاد تو ہوں

ہو سلیقے سے بہکنا تو مزا دیتا ہے
میرے ساقی کو گماں ہے کہ بہت ہوش میں ہوں

جستجو کی کوئی منزل جو نہیں ہے تو نہ ہو
ہمتِ عشق یہ کہتی ہے کہ بڑھتا ہی رہوں

اب ترے حال پہ تجھ کو دلِ ناداں چھوڑا
سوچنا بھی تو قیامت ہے کہاں تک سوچوں

میں نے پہچان لیا اُس کو سرِ بزم روشؔ
اس کی آنکھوں کو ہے اصرار کہ خاموش رہوں

سید جمال الدین

لیوپولڈ رانکے

۱۷۹۵ ——— ۱۸۸۵

۱۸۲۵ء میں لیوپولڈ رانکے برلن میں تاریخ کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس نے اپنی آمد سے فن تاریخ نگاری (Historiography) میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ رانکے نے فن تاریخ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اسی لئے اُسے جدید فن تاریخ نگاری کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

وہ ایک متوسط گھرانہ کا فرد تھا۔ ۱۸۱۴ء میں وہ لیپزگ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ فلسفہ اور دینیات اس کے خاص مضامین تھے۔ وہ علم اللسان اور فلسفہ کے لکچر غور سے سنتا۔ کانٹ کی کتاب 'تنقید عقل محض' (Critique of Pure Reason) نے رانکے کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ لیکن اس پر سب سے زیادہ اثر فشتے کا ہوا۔ وہ گوئٹے کا قدردان تھا لیکن طرز فکر اور انداز بیان میں اس کی نقل نہیں کرتا تھا۔ رانکے نے لوتھر کا مطالعہ بھی کیا تاکہ جرمن زبان کی مشق بہم پہنچا سکے۔ ابھی تک اس نے تاریخ کو بالکل نظر انداز کیا۔ نیبہور واحد مورخ تھا جس نے اسے اُس وقت تک متاثر کیا۔

ذہنی تجسس اور معلومات حاصل کرنے کی خواہش نے رانکے کو تاریخ کے مطالعہ کے لئے آمادہ کیا۔ ۱۸۱۸ء میں اس نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور فرینکفورٹ میں لاطینی اور یونانی کلاسک کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس نے ہومر، ہورکیس اور ورجل کے افکار اور کلاسیکی ادب کی تاریخ پڑھائی۔ بہت جلد اس نے محسوس کیا کہ اسے ماضی کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے اور صرف ادیبوں پر اکتفا کرنا کافی نہ ہوگا۔ اس طرح اس نے باقاعدہ کلاسیکی مورخین کا مطالعہ شروع کیا۔ تھیوسیڈڈیز سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اب اس نے دوسرے مورخین کا انہی کی زبانوں میں مطالعہ کیا۔ جن میں

ہیروڈوٹس، ایکسی نوفن، لیوی اور ٹیسی ٹس قابل ذکر ہیں۔ وہ مطالعہ کے ساتھ ان پر نوٹس بھی لکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنی معلومات کا دوسروں کی معلومات سے موازنہ کیا۔ اولذکر اصول میں اس نے صنمیات کے عناصر زیادہ پائے۔ صرف تھیوڈ اطمینان بخش تھا، حالانکہ رانکے کے تنقیدی ذہن نے اس کے تمام نتائج کو تسلیم نہیں کیا۔ آزادی فکر ہی دراصل اس کی سب سے بڑی خوبی تھی ر رفتہ رفتہ اصلی تاریخی تحقیقات کی فرینگی نے رانکے کے ذہن کو تاریخ کی بے پناہ وسعتوں کی طرف متوجہ کیا۔ قدیم روم کے تحقیقاتی مطالعہ کے بعد وہ دور وسطیٰ کے جرمنی کی طرف رجوع ہوا۔ اب رانکے نے ان تبدیلیوں کا سراغ لگانا شروع کیا جو قدیم روم سے دور وسطیٰ کے جرمنی کی تاریخ میں ہوئی تھیں۔ آخری عہد وسطیٰ کے مطالعہ کے دوران اس نے محض تفریح کی خاطر سر ولیم اسکاٹ کے افسانوں کو دلچسپی سے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن رانکے نے ناولوں میں بھی حقیقت سے مبرا باتوں کو ناپسند کیا۔ اسکاٹ کی روشن اور تابدار تصویر کشی اس کے لئے فرحت بخش تھی لیکن اس کی تاریخی غلطیوں سے وہ چراغ پا ہوجاتا تھا۔ رانکے اسکاٹ کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھا کیونکہ وہ تاریخ کی عدالت میں ایک مجرم تھا اس لئے کہ اس نے تاریخ میں ایسے خاکے کھینچے جو قطعی غیر تاریخی تھے، لیکن اس کے پیش کرنے کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان پر یقین رکھتا تھا۔ تاریخ اور افسانہ کا موازنہ کرتے سے اسے معلوم ہوا کہ خیالی فسانہ کے مقابلہ میں تاریخی ذرائع زیادہ دلکش اور لازمی طور پر دلچسپ ہوتے ہیں۔ اسی لئے رانکے نے فسانہ سے بالکل منہ موڑ لیا اور یہ طے کیا کہ اپنی تحریروں میں وہ فسانہ سازی اور دروغ گوئی سے گریز کرے گا اور سختی سے حقائق کا پابند رہے گا۔

مندرجہ بالا پس منظر میں رانکے کا ذہن اور طریقۂ فکر اپنی جھلکیاں دکھا رہا ہے۔ اس کے ذہن کی ہر جھلک ظاہر کرتی ہے کہ وہ حقائق کا کتنا احترام کرتا تھا اور صحت کا کتنا خواہشمند تھا۔ اسے یقین تھا کہ بہ نسبت فسانہ کے حقیقی تاریخ زیادہ دلکش اور دلچسپ ہے۔ اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ رانکے نے تاریخ کے مطالعہ اور تحریر میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لی اور کس طرح اس کے نوک قلم

سے تاریخی حقائق اکیانوے سال کی عمر تک افشا ہوتے رہے۔

جب وہ فرینکفورٹ میں تھا تو رومانی تحریک اپنے عروج پر تھی اور اسی طرح میٹرنیک کا ردِ عمل بھی۔ لیکن رانکے ان تحریکوں سے الگ تھلگ رہا۔ وقت و زمانہ کے خلاف اس کا ردِ عمل بھی انوکھا تھا۔ وہ قدامت پسند لیکن فطرتاً معتدل تھا۔ اس نے ہمعصر حکومتوں کی لبرل تحریکوں اور اشخاص کے خلاف سخت اقدام کو ناپسند کیا۔ وہ بخوبی واقف تھا کہ ماحول ہی خیالات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے باوجود رانکے سیاسی طور پر حساس نہ تھا۔

لیکن رانکے رومانٹک تھا اور حقیقتاً مذہب کا پیرو بھی۔ اس کے دل میں مذہب کی دہشت اس قدر بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ مذہب سے مرعوب ہو کر تاریخی عمل کے بارے میں سوچتا۔ اس کے خیال میں وہ لوگ جو زمانہ سَلَف کے بارے میں سطحی باتیں کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سب گناہگار تھے وہ قابلِ الزام ہیں، جو تاریخ کے ساتھ بُرا سلوک کرتے ہیں وہ غیبی سزا کے مستحق ہیں، کیونکہ تاریخ وجودِ الٰہی کا ثبوت ہے۔ تمام تاریخ میں خدا کا وجود اور اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ہر فعل اس کی موجودگی کی تصریح کرتا ہے، ہر لمحہ اسی کے نام کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن رانکے کو یہ سب زیادہ تر تاریخ کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے۔ ان مذہبی خیالات نے اس کے طرزِ زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

انہی دنوں رانکے اپنی پہلی کتاب لکھ رہا تھا۔ جس نے اسے قومی شہرت دی اور جس کے باعث اسے برلن یونیورسٹی میں جگہ دیدی گئی۔ یہ کتاب تھی 'لاطینی اور ٹیوٹونک قوموں کی تاریخ' جو ۱۸۲۴ء میں منظرِ عام پر آئی۔ رانکے کی کتاب میں وہ تازگی اور نیا پن تھا کہ دنیا نے اسے ایک ابھرتا ہوا آدمی کہہ کر پکارا اور مرحبا کہا۔ کتاب کی خوبی تین باتوں میں پنہاں ہے۔ رومن جرمن دنیا کی وحدت کا خیال، تاریخی ذرائع کی زیرک تنقید اور کتاب کی تمہید میں یہ اعلان کہ تاریخ لکھنے میں اس کی منشا وہ تاریخ دکھانا ہے جو واقعی تھی۔

رانکے نے ان تسلیم شدہ وحدتوں کو ماننے سے انکار کر دیا جو اس وقت روایتی طور پر مسلّمہ سمجھی جاتی تھیں۔ اُس کے خیال میں آفاقی عیسائیت کی وحدت ایسی چیز نہیں تھی، جس کو مانا

جائے کیونکہ اُس تصور کے مطابق تو در اصل آرمینیا کے باشندوں کو بھی شامل کرنا پڑے گا جو یورپین نہیں ہیں۔ اس طرح اُس نے یورپی وحدت کے خیال کو بھی رد کر دیا کیونکہ اس کا مطلب ترکوں اور روسیوں کو بھی شامل کرنا ہوگا۔ اب باقی کیا رہتا ہے جس کے لئے یورپین وحدت کا دعویٰ کیا جائے۔ رانکے کا جواب تھا کہ یورپی تہذیب رومن اور جرمن عناصر کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ اس کے خیال میں وحشی اور ناشائستہ بربری اقوام نے تنزل کی طرف جاتی ہوئی سلطنت کے تہذیبی عناصر کو اپنی تہذیب میں سمو لیا۔ اس طرح سرزمین یورپ پر کچھ خاص ادارے قائم ہوئے، جیسے ریاست اور کلیسا، سلطنت اور پاپائیت۔ رانکے نے ان اداروں کے عروج پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ نقاد رانکے کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ یورپی تاریخ کی ابتدا رومن جرمن اقوام کی ترقی کے ساتھ ہوئی۔

تاریخی ذرائع کی تنقید کے مسئلہ پر رانکے نے ایک الگ ضمیمہ مرتب کیا جس نے جدید تنقیدی تاریخ نگاری کا آغاز کیا۔ رانکے نے بحث کا آغاز اس سوال سے شروع کیا کہ کون سے طبع شدہ ذرائع تازہ اطلاعات کے حامل ہیں۔ اس کے بعد اس نے چند معروف مورخین کا انتخاب کیا اور ایک ممتحن کی طرح ان کی تصانیف کی سختی سے جانچ کی۔

'کیا کرنا باقی ہے' عنوان کے تحت رانکے نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہم پہلے وہ دہراتے ہیں جو اس زمانہ کے عام مورخین کے بارے میں کہا گیا یعنی یہ کہ ہر شخص تسلیم کرے گا کہ ان کی اطلاعات نہ کافی تھیں اور نہ معتبر، اور یہ کہ جب تک ہم ان کی تقلید کریں گے اپنے کو اندھیرے میں محسوس کرتے رہیں گے۔ یوں رانکے نے ثابت کیا کہ حقیقتاً عام تاریخ کو ذرائع تسلیم کرنا لاحاصل ہے۔ مزید یہ کہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ معلومات سے بچنے کے لئے ایک مورخ کو لازمی طور پر آرکائیوز اور دستاویزات سے استفادہ کرنا چاہئے۔ رانکے کی مقبولیت اس لئے بھی ہے کہ اس نے مورخین کو اندھیرے سے نکال کر ایک نئے راستے کی روشنیوں کو سمیٹنے کی دعوت

۔ [illegible] ۱۴-۵-۸۰ [illegible]

مئی ۱۸۲۵ء میں رانکے برلن یونیورسٹی میں تاریخ کے ایک خاص پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ وہاں پہلے مغربی یورپ کی تاریخ اس کے سپرد کی گئی۔ وہ ایک کمزور اور منحنی سی شخصیت کا مالک تھا۔ اس میں ایک ہردلعزیز استاد کی سی کوئی وضع نہ تھی۔ اس کی کامیابی اور شہرت کا راز اس کی معلمی میں نہیں بلکہ اس ذہانت میں ہے جو اس نے ایک استاد کی حیثیت سے تاریخ کے سیمینار میں دکھائی۔ اس سیمینار کا سنگ بنیاد بھی اسی نے رکھا تھا۔ رانکے کے اس سیمینار سے ایسے عالم نکلے جن میں سے سو سے زیادہ تو خود جرمنی کی دوسری یونیورسٹیوں میں معلم بن گئے۔ اور انھوں نے رانکے کی روایات پر مزید طلبار کی تربیت کی۔ رانکے کی روایات پر تربیت شدہ طلبار جرمنی میں ہی نہیں امریکہ میں بھی مورخ کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

رانکے کے لئے سیمینار اپنی اختراع نہیں تھی۔ برلن میں اپنے پہلے سیمسٹر میں اس نے تاریخ کی تعلیم دینے کے لئے ایک نیا نصاب پیش کیا۔ نصاب کا ایک مقصد طالب علم کو استاد کے قریب لانا تھا اور دوسرا مقصد تاریخ کے لئے معلم کی تربیت دینا تھا۔ رانکے کا سیمینار بعد کے تمام سیمناروں کے لئے ایک مثال بن گیا۔ (۲۱)

استاد نے شاگردوں کے دل میں جو اصول دل نشین کئے وہ مختصراً یہ تھے، معاملہ کی سچائی اور ذرائع کی تہہ تک پہنچو، ہر دستاویز میں تھوڑے بہت داخلی عناصر ہوتے ہیں، ایک مورخ کا فرض یہ ہے کہ وہ خارجی عناصر کو داخلی عناصر سے جدا کرے، بہ الفاظ دیگر جزوِ اصلی تک پہنچے۔ طالب علموں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ تین اصول ذہن نشین کرلیں، تنقید، باریک بینی اور تہہ تک پہنچنا۔

۱۸۲۷ء میں رانکے نے اپنی دوسری کتاب بعنوان "سولھویں اور سترھویں صدی میں جنوبی یورپ کے شہزادگان اور عوام" چھپوائی۔ یہ کتاب جیسا کہ اس نے بعد میں تسلیم کیا، یونانیوں اور ترکوں کے خلاف بغاوتوں سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب اس کی پہلی کتاب سے سبقت لے گئی، خاص کر اس لئے کیونکہ اس میں پہلی مرتبہ کافی جگہ غیر سیاسی امور پر بحث کی گئی ہے (مثلاً مالیات اور معاشیات وغیرہ)

اس کتاب کی تکمیل کے بعد پرشیا (Prussia) کی حکومت نے اس کو مزید علمی تحقیق کے لئے دور دراز مقامات پر بھیجا۔ اس کے بعد رانکے نے نادر تخلیقات پیش کیں۔ اس نے کئی تاریخیں لکھیں مثلاً جرمنی، انگلینڈ، پرشیا، فرانس کی تاریخیں، جنگوں کی تاریخیں اور سیاستدانوں کی سوانح حیات۔ تاریخ عالم کے علاوہ اس کی تمام تصنیفات چون جلدوں پر مشتمل ہیں۔ 'پوپس' اس کی سب سے معروف کتاب ہے اور شاید اس کی بہترین کتاب بھی۔ اس کتاب کی ترتیب کے لئے اس نے اٹلی کے آرکائیوز کو چھان مارا۔ سوانح حیات اور ادبی تصویر کشی نشاط ثانیہ کی تاریخ نگاری کا خاصہ تھیں اور رانکے ان تاریخی ذرائع سے جن کا اس نے مطالعہ کیا تھا اتنا متاثر تھا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ماضی میں کھوئے ہوئے فن کا بغیر کسی جانی بوجھی کوشش کے احیا کر رہا ہو۔ اس کی تحریروں میں کردار نگاری کی افراط ہے۔ رانکے کی ناقدانہ باریک بینی نے اسے ان کوتاہیوں سے محفوظ رکھا جو عام طور سے سوانحی تاریخ میں داخل ہو جاتی ہیں۔

سولھویں، سترھویں اور اٹھارہویں صدیاں رانکے کا موضوع تھیں۔ 'پوپس' کے علاوہ اس نے ایک تاریخ فرانس خاص کر سولھویں اور سترھویں صدی میں' تصنیف کی جو پڑھنے والے کو ایک عالیشان عمارت کا تاثر دیتی ہے۔ 'انگلینڈ کی تاریخ خاص کر سترھویں صدی میں'، جو برطانیہ کے مورخین کے خیال میں ایک الہام ساوی تھی، تاریخ کے بجائے اس عہد کی تاریخ کی تفسیر زیادہ ہے۔

۱۸۷۱ء میں رانکے معلمی سے سبکدوش ہو گیا اور بقیہ زندگی تاریخ کی تصنیف کے لئے وقف کر دی۔ اس نے اکیانوے سال کی عمر پائی اور اس پر کبھی تھکن کے آثار نہیں پائے گئے۔ وہ ہمیشہ اپنے کام میں مشغول رہا۔ سن رسیدہ رانکے میں غیر معمولی قوت تھی۔ اس کے دو مددگار تھے جن کو وہ تھکا دیتا تھا لیکن خود کبھی وہ تھکا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ صبح نو بجے اٹھتا اور ایک مددگار کے ساتھ روز ساڑھے نو بجے صبح سے دو بجے بعد دوپہر تک کام کرتا رہتا اور پھر دوسرے مددگار کے ساتھ شام کے سات بجے سے شب کے بارہ بجے تک کام کرتا رہتا۔ کرسمس کے علاوہ نہ تفریح کے لئے کوئی وقت تھا اور نہ کوئی دوسری تعطیلات۔ اپنے مددگاروں کے ساتھ اس کا طریقہ کار

ہیں، نئے طریقے آرہے ہیں۔ ہمارے ملک اور ہماری تعلیم کو اسی وقت ترقی ملے گی جب آپ نئے نئے راستے ڈھونڈیں گے، ہمارے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ایسی ٹریننگ دیں گے کہ وہ ہمیشہ طالب علم بنے رہیں اور ہمیشہ سیکھتے رہیں۔ اداروں کو جب بڑی امداد ملی ہے اور پیسوں کی طرف سے اطمینان ہوا ہے تو اس سے فائدہ بھی ہوا ہے اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ کہ کام آگے بڑھا، سیوا کا میدان وسیع ہوا، نقصان یہ کہ کام کرنے والوں میں اطمینان پیدا ہوگیا اور نئی ذمہ داریاں اٹھانے کی ان میں سکت باقی نہیں رہی۔ ہمارے دیش میں بڑے بڑے لوگ اسی دور میں پیدا ہوئے ہیں جو سب سے زیادہ مشکل اور پریشانی کا دور تھا۔ ان کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پرانے طریقوں کو چھوڑ کر نئے طریقوں کو اختیار کیا، اپنے بزرگوں کی عزت اور احترام کو باقی رکھتے ہوئے ان کے راستے کو چھوڑ کر نئے راستے کو تلاش کیا۔ جامعہ کو اس لیے کامیابی ہوئی کہ وہ تعلیم کے پرانے طریقوں اور نظریوں پر مطمئن نہیں ہوئی اور آئندہ بھی یہ اسی وقت ترقی کرے گی اور کامیاب ہوگی جب اپنی موجودہ ترقی پر قانع ہو کر بیٹھ نہیں رہے گی بلکہ نئی کھوج میں لگی رہے گی۔ اس کے ساتھ اس کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اپنا بار خود ہی اٹھانا ہے، باہر کی مدد کافی نہیں ہے اگر خود اپنی آپ مدد نہ کی جائے۔

امسال کانووکیشن کے موقع پر خطبہ پڑھنے کے لیے صدر جمہوریہ عالی جناب وی وی گری سے درخواست کی گئی تھی، جسے موصوف نے ازراہ کرم منظور فرمایا اور تشریف لائے۔ موصوف کو خطاب کرتے ہوئے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے فرمایا:

ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس کانووکیشن میں، جس کا اجلاس جامعہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر ہو رہا ہے تشریف لا کر جامعہ کے طالب علموں اور استادوں کو خطاب کرنا منظور فرمایا ہے۔ ہمیں خاص خوشی اس وجہ سے بھی ہے کہ آپ کا ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے بہت قریبی تعلق تھا اور اسی کی بنا پر ہمیں یقین ہے کہ جامعہ کو آپ کی رہنمائی اور خاص سرپرستی حاصل رہے گی۔ جامعہ والوں کو اپنی طرف سے چاہیے کہ آپ کو اپنے حالات اور اپنی

جانے میں ہی تاریخ کا بڑا راز پوشیدہ ہے"

نیم صوفیانہ روش کے باوجود رانکے بنیادی طور پر تجرباتی مزاج کا آدمی تھا۔ عام طور پر نکے میں ایسا رویہ پایا جاتا ہے جو تجربی طریقہ سے مل جاتا ہے۔ رانکے کا تجربی طریقہ ہی اس کی ہرت کا باعث بنا۔ اسے روایت، سنی سنائی بات، گپ اور مختصراً ہر وہ چیز جس کی اصلیت نہ

اس پر ذرہ برابر اعتبار نہیں کیا۔

نوے سال کی عمر میں رانکے اس نتیجہ پر پہنچا کہ تاریخ میں ہر اس چیز سے گریز کرنا چاہئے جو بنیادی رپر معتبر حقائق سے دور ہو۔ تحریر شدہ حقائق سے وابستہ رہنا رانکے کا بنیادی اصول تھا۔ رانکے ہر اس چیز پر بے اعتباری جسے وہ کاغذ پر نہ دیکھ سکے اور جس کی جانچ پڑتال نہ کر سکے اتنی زیادہ تھی کہ اس نے تاریخ کے اہم ابواب اور ادوار کو صرف اس لئے نظر انداز کر دیا کہ ان کے لئے ستاویزات میسر نہ تھیں۔ اس لئے اس نے زمانہ سلف یا معاشی تاریخ پر قلم نہیں اٹھایا۔ اس کو سرار سے نفرت تھی۔ رانکے کا اصول تھا کہ تاریخ صرف اس مواد کی بنیاد پر لکھی جائے جو تحریر میں محفوظ ہو۔ اس سلسلہ میں اس کا کہنا تھا کہ وہ بات جو زبانی طور پر ہم تک پہنچی ہے اسی وقت قابل بول ہے جبکہ ہم اس کی بنیاد پر کسی بات کا یقینی طور سے حکم لگا سکتے ہیں۔ اپنی پہلی تصنیف ہی میں رانکے نے اپنے طرز کو اس طرح واضح کیا: "تاریخ کو یہ منصب سونپا گیا ہے کہ وہ ماضی کی تحقیق کرے اور ہمارے مستقبل کے بھلے کے لئے ہمیں ہدایت دے۔ یہ موجودہ تصنیف اتنے بلند کام کا قصد نہیں رر ہی ہے۔ اس کا مقصد محض یہ دکھلانا ہے کہ حقیقتاً ماضی میں کیا اور کس طرح ہوا" اور اس مقصد وحاصل کرنے کے لئے اس کا سب سے بڑا اصول یہ رہا کہ حقائق کو سختی سے پیش کیا جائے چاہے وہ کتنے ہی غیر مشروط اور بد شکل کیوں نہ ہوں۔

تاریخ میں صداقت دریافت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تاریخی ذرائع سے استفادہ کیا جائے اور خاص طور پر آرکائوز سے مدد لی جائے۔ لہٰذا رانکے نے مختلف آرکائوز میں تحقیق کا کام کیا۔ مواد جمع کرنے کے بعد رانکے نے ان کی نسبتی قدر وقیمت دریافت کی اور

پھر تصنیف شروع کر دی۔ اس کا کہنا تھا کہ تاریخ ایک ہی وقت میں فن بھی ہے اور علم بھی، اُسے تنقید اور علمیت کے تمام مطالبوں کو پورا کرنا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کو ان تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی خوش کرنا ہے جیسے دوسری کامیاب ادبی تخلیقات کرتی ہیں۔ رانکے بے شبہ ایک فنکار تھا۔ وہ ایک زیرک ماہر نفسیات نہیں، لیکن مردم شناس تھا۔ مزید یہ کہ ڈا فرلو کو ان کے تاریخی پس منظر میں رکھنے میں ماہر تھا۔ اس فن میں شاید وہ نشاط ثانیہ سے متاثر تھا، بالخصوص تصویر کشی سے۔ رانکے ایک بہترین مصور تھا اور وہ خوبصورت اور موزوں الفاظ سے تصویریں بناتا تھا۔ رانکے نے اپنی عبارت پر ادنیٰ، بے معنی، عام اور مکرر تفصیلات کا بار گراں نہیں ڈالا لیکن اس کے ہاں وضاحت اور تفصیل ہے، ترتیب و لطف بیان کا سلیقہ ہے اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

رانکے ایک بڑا عالم اور ایک ذہین مصنف تھا۔ اس نے خارجی اور بے لاگ صداقت کا دعویٰ کیا ہے اس لئے یہ سوال کرنا بجا ہوگا کہ کیا وہ ثابت قدم تھا؟ اور کیا یہ ممکن بھی ہے؟ سب سے پہلے اس بات پر زور دینا چاہئے کہ رانکے نے دستاویزی ذرائع کے خبط کی وجہ سے کئی اہم باتوں سے غفلت برتی جیسے سوانح نگاری۔ اس غفلت نے اس کے طریقہ کو کسی حد تک محدود کر دیا۔ رانکے کی دستاویزات نے اسے ایک قسم کی تاریخ دی، لیکن وہ مشکل سے ہی ایک عالمی تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ اسے ریاستوں، قوموں، مذاہب اور تہذیب وغیرہ یا کسی اور چیز کے بارے میں زیادہ عام معلومات نہ مل سکیں۔

لیکن رانکے اور رانکے مکتب کی غیر باطنی اور حقیقی تاریخ کے خلاف تنقید کا باعث سب سے زیادہ اس کا مجموعی طور پر غیر فلسفیانہ انداز ہے۔ سائنٹیفک ہونا تو درکنار رانکے بڑی حد تک جانب دار تھا۔ اس نے تمام تاریخ میں خدا کی کاریگری دیکھی۔ اس نے خالص فلسفہ یا نفسیات کو شکل دینے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ در اصل رانکے خود اپنے زمانہ ہی کی ایک پیداوار تھا۔ وہ پرشین بادشاہت کا ایک وفادار ملازم اور کلیسا اور ریاست کا حامی تھا۔ جو کچھ اس نے تصنیف کیا اس کے خیالات، میلان اور مفاد کا مکمل عکس تھا۔ رانکے نے تاریخ میں معاشرتی اور اقتصادی مفاد کو نظر انداز کیا۔

اس نے ہر اس تاریخی تصنیف سے گریز کیا جس میں ہمعصر یورپ کے دقیانوسی خیالات سے اختلاف کیا گیا تھا۔ ان دلائل کی بنیاد پر رانکے کا نام انیسویں صدی کے جانب دار مورخین کی فہرست میں درج کیا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ رانکے کا فن تاریخ نگاری کے لئے سب سے بڑا عطیہ یہ ہے کہ اس نے تاریخ کو علم (Science) کی حیثیت سے مانا۔ اس نے تاریخ کو کسی اور چیز کی کنیز نہیں سمجھا اسی لئے وہ ایسے طریقہ کے لئے کوشاں رہا جو تاریخ میں خارجی صداقت کی طرف رہنمائی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر اس چیز کو رد کیا جو ثابت نہیں تھی یا جس کو ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کچھ اسی لئے اس نے محض یا خیالی میدانوں میں داخل ہونے سے انکار کیا۔ رانکے نے ماضی کے مقابلہ میں بے لاگ انداز نظر، توازن اور زیادہ دور اندیشی کی طرف رہنمائی کی۔ یہی اس کی عظمت ہے، یہی اس کی شان ہے۔ بنیادی طور پر رانکے کا خاص اثر سیاسی تاریخ نگاری پر تھا۔ وہ بذات خود ایک سیاسی مورخ تھا اور اس کے شاگردوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔

پن چکی

بابا شاہ مسافرؒ بخارا سے تن تنہا نکل کر اورنگ آباد پہنچے، جسے دکن کا کشمیر کہا جاتا تھا۔ کتنی اولوالعزم اور برگزیدہ ہستی تھی۔ جب بابا شاہ مسافر نے ہمیشہ کے لئے اورنگ آباد میں رہنا پسند کرلیا تو پن چکی کی جگہ اپنے لئے تجویز کی۔ اس وقت برگد تلے بسم اللہ شاہ بخاری خلقت کے ہجوم میں گھرے ہوئے تشریف فرما تھے، جوں ہی آپ آئے بسم اللہ شاہ بخاری اٹھ کھڑے ہوئے اور بے ساختہ کہہ اٹھے۔ "آب آمد تیمم برخاست۔" اس وقت سلطان گنج چلے گئے۔

پن چکی میں برگد آج بھی کھڑا ہے۔ یہ برگد سب سے بلند، گھنا اور سایہ دار ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی عمر ہزار سال ہے۔ اس برگد تلے بسم اللہ شاہ بخاری کی نشست تھی۔ جہاں زیادہ تر سادھوؤں، سنیاسیوں اور عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اسی برگد کے پیڑ سے ذرا فاصلے پر چوکور کنواں تھا جو اب بڑے حوض کے اندر ہے۔ یہیں غالباً تکیہ بھی تھا جو 'شاہ عنایت کا تکیہ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دنیا کا عجیب و غریب کنواں ہے۔ پانی جھرنوں کی طرح ابلتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا پانی جاری ہے جس کو زندہ پانی کہتے ہیں۔ لیکن یہ پانی لوگوں کی ضرورتوں کے لئے ناکافی تھا، بابا شاہ مسافرؒ نے اس کنویں کو، جس کی گہرائی اسی فٹ ہے، اسی طرح رہنے دیا۔ عام قیاس یہ ہے کہ اس پر جو نہر بنائی گئی ہے اسے ملک عنبر[1] نے بنایا ہے، یہ وہی ملک عنبر ہے جو جنوبی ہند

---

[1] ملک عنبر دکن کا مشہور سپہ سالار، مدبر اور بادشاہ گر حبشی ۹۵۵ھ میں پیدا ہوا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کا زبردست سپہ سالار، فرمانروا، جید عالم، ماہر علم نجوم اور انجینیر تھا اور جس کا آج تک ثانی پیدا نہیں ہوا۔ اس مہارت کا ثبوت یہ نہریں ہیں، جو اب جاریہ کی شکل میں جاری ہیں۔ اگر انسان کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اورنگ آباد کو نہروں کا شہر کہیں تو بیجا نہیں ہے۔ یہاں سے سولہ میل دور دولت آباد میں تغلق نے ہندوستان کا تخت و تاج دہلی سے منتقل کیا۔ اورنگ زیب نے جو شہنشاہ ہند تھا، مر کر بھی یہیں دفن ہونا پسند کیا۔ اگر ملک عنبر نے بھی دکن کے کشمیر کو منتخب کیا تو حیرت کی بات نہیں ہے، اس نے کل باون نہریں بنوائیں جو اس تاریخی شہر میں چاروں طرف جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، لیکن انگریزوں نے نہروں کے زیر زمین فلڑ سسٹم کی تکنیک کا پتہ چلانے کے لئے نہروں اور دیوہیکل پانی کی لاٹوں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ تمام نہریں سوکھ گئیں، زمین کھدوا کر تقطیری اصول دیکھنا چاہا لیکن پانی یک لخت غائب ہو گیا۔ ایک بوڑھے مزدور نے وہاں ریت پر پتلی چھڑی برمے کی طرح چلائی تو پانی سوتوں سے ابلنے لگا۔ انگریزوں نے اس بوڑھے پر جبر و تشدد کر کے نہروں کا سسٹم دریافت کرنا چاہا، مگر اس نے بتلانے سے انکار کر دیا جس کی پاداش میں انگریز انجینیر نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ بہر حال انگریزوں کو پتہ نہ چلا کہ کیا سسٹم تھا اور پانی کہاں سے لایا جاتا تھا۔ ایک دن ملک عنبر نے اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر خدا سے دعا مانگی :

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مکہ میں ابتدائی تعلیم و تربیت پائی اور دکن کے بازار میں آکر فروخت ہو گیا۔ احمد نگر میں چنگیز خاں کے غلام کی حیثیت سے تربیت حاصل کی اور آقا نے غلام کو اولاد کی طرح پالا۔ آقا کی وفات کے بعد ۱۵۸۲ء میں ملک عنبر گولکنڈہ میں لشکر شاہی کا ملازم ہوا، پھر بیجاپور جا کر ابراہیم عادل شاہ کے ملازمان میں شریک ہو کر ایک ممتاز عہدہ پر فائز اور ملک عنبر کے خطاب سے سرفراز ہوا .... ملک عنبر کی جوانی بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کے عروج میں شروع ہوئی اور دکن کی سلطنتوں کے زوال کے ساتھ ساتھ ملک عنبر کی حوصلہ مندیوں نے عروج حاصل کیا.... ۱۳ شعبان ۱۰۳۵ھ کو اسّی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

(مرقع دکن (سب رس کا سالگرہ نمبر ۱۹۳۹ء) صفحہ ۵۶) جامعہ

"اے اللہ۔ یہ پانی اس وقت تک جاری رکھ جب تک کہ اس پر ٹیکس نہ لیا جائے۔ جس دن کوئی پر ٹیکس وصول کیا جائے گا، اس کا مجھے ذمہ دار نہ ٹھہرا۔"

پن چکی کی نہر بھی اعلیٰ ترین ذہانت اور فنِ انجینئری کا اچھا نمونہ ہے۔ پانی پارے کی طرح موتی جیسا شفاف صدیوں سے خود بخود فلٹر ہوتا چلا آرہا ہے۔ جس وقت بابا شاہ مسافرؒ نے اس سرزمین کو دیکھا، بے حد مسرور ہوئے اور پن چکی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ چوکور کنویں کو اس طرح قائم رکھ کر بابا شاہ محمودؒ نے، جو بابا شاہ مسافرؒ کے خلیفہ تھے، ۱۷۳۱ء میں بڑا حوض بنوایا۔ اس حوض کے پہلو میں مشرقی سمت ایک سرنگ ہے، جسے سرنگ والا پل کہتے ہیں، لیکن اکثر لوگ اسے "سرنگ" تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سرنگ ہزاروں میل دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ پہلے کے راجہ اور بادشاہ جنگی نقطۂ نظر سے اس طرح کی سرنگیں تعمیر کرواتے تھے۔ یہ پل زمین کے نیچے بنا ہوا ہے۔ اس پل کا خاص کمال یہ ہے کہ ایسے پل اس وقت تک تعمیر نہیں کیے جاتے تھے جب تک پانی کی خاصیت، بہاؤ کا رُخ اور اس کے ردِعمل کی قوت سے آگاہی نہ ہو۔ ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھ کر سرنگ نما پل کی کمانیں بنائی گئی ہیں۔ دوسری کمانوں سے ندی کا پانی بہتا رہتا ہے۔ اس پل میں سے سیلاب کا پانی آسانی سے گذر جاتا ہے۔ حوض یا کنویں کو نقصان نہیں پہنچتا۔ اس کا اصول جتنا سادہ ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ باہر سے سرنگ نما پل نظر نہیں آتا۔ اندر ایک لانبا حوض ہے جو قدیم گسٹ ہاؤس کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے، اس سے سرنگ نظر آتی ہے، یہ دو سو فٹ لمبی ہے۔ اس کی وجہ سے بڑا حوض اور سرنگ ایک سے معلوم ہوتے ہیں۔

بڑے حوض میں تیس یا چالیس فٹ کی بلندی سے آبشار کا صاف شفاف پانی گرتا رہتا ہے۔ اس کے معمار ایسے زبردست انجینئر تھے کہ پانی، طبعیات اور اس کے اصول سے پوری طرح واقف تھے۔ انھیں اس کا بھی علم تھا کہ پانی کے جھرنے اچانک اپنا رخ کب اور کیوں بدل دیتے ہیں۔ در اصل وہ لوگ زمین کے اندر گہری نہروں میں جھرنے نکال دیتے تھے۔ بابا شاہ محمودؒ نے

یہ انوکھی اور ہمیشہ جاری رہنے والی نہر اسی اصول پر نکلوائی۔ آج تقریباً دو سو اڑتیس سال سے شفاف پانی فلٹر ہو ہو کر موصوف کے فیض جاری کی مانند یکساں گر رہا ہے۔ نہر کہاں سے اور کس طرح لائی گئی، یہ ایک سربستہ راز ہے۔ یہیں پر ایک عجیب و غریب نہر بھی تعمیر کی گئی ہے جو زمین کے سینے میں ہے، جس کی کوکھ سے پانی فلٹر ہو کر نکلتا ہے۔ اس پانی کی خاصیت یہ ہے کہ آنتوں کی جملہ بیماریوں سے مریض شفایاب ہوجاتا ہے۔ اس لئے اکثر لوگ یہاں کی آب و ہوا نیز قومی یکجہتی کی بنا پر ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو رہنا پسند کرتے ہیں۔

اس عجیب وغریب عمارت کو دیکھا نہیں جاسکتا ہے۔ کیونکہ موتی جیسے پانی سے یہ لبالب بھری رہتی ہے۔ قیاس ہے کہ ایک چوتھائی زیر زمین بھی ایک "پن چکی" ہے۔ آج تک پتہ چلایا نہیں جاسکا کہ درحقیقت یہ کیا ہے۔ عام طور پر یہ بھی قیاس ہے کہ اس پن چکی کے آبشار کے پانی کا منبع نامعلوم ہے۔ متصلاً مقام سے جو ایک پہاڑی ہے، جنواڑہ اور بی بی کے مقبرہ سے گذار کر کھام ندی سے لائی گئی ہے۔ اس نہر کی خوبی اور کمال یہی ہے کہ پانی کے منبع کا راستہ اس طرح رکھا گیا ہے کہ وہ زمین دوز تعمیر کے اندرونی حصے سے مل جائے تاکہ منبع سے نکلا ہوا اور نہر کے جھرنوں کا پانی جمع ہو کر آبشار کی شکل میں بہتا رہے۔ یہ نہر میلوں کسی نہ کسی ندی کے قریب بنائی گئی ہے تاکہ ایک ایک انچ کے فاصلے سے جھرنے نکلتے رہیں۔ نہر میں سے ایک گھوڑ سوار گذر سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کمانوں میں بعض جگہ محراب نما مسجدیں بھی ہیں۔

بی بی کے مقبرہ سے سفید چونے اور ریت کے پائپ شروع ہوجاتے ہیں جو آبشار تک لگائے گئے ہیں۔ آبشار کے مغربی سمت کمانیں تعمیر کی گئی ہیں، ان کمانوں کے اندر راست ڈھلان میں بھی پائپ ہے جس کے ذریعے سے پانی لوہے کے بڑے بڑے پنکھوں سے ٹکراتا ہے۔ پانی کے ٹکراؤ سے پنکھے گردش کرنے لگتے ہیں۔ ان پنکھوں کو چھت کے نیچے فٹ کیا گیا ہے۔ چھت کے اوپر پتھر کی بڑی چکی ہے۔ مسجد کا تعلق پنکھوں سے قائم کیا گیا ہے۔ آبشار پر چڑھ کر کاگ کھولنے سے چکی بڑی تیزی سے گھومتی ہے۔ اسی بنا پر اُسے "پن چکی" کہا جاتا ہے۔ اس سے متصل رصدگاہ

اور ہوائی چکی بھی تھی، جو اس طرح برباد ہوگئی ہیں کہ اب ان کا ذکر بھی کرنے والا کوئی نہیں رہا۔

تین گنبد والی مسجدیں بہت کم ہیں، اورنگ آباد میں ایسی تین مسجدیں ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں شہنشاہ ہند اورنگ زیب کی خصوصی مسجد کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ دوسری جمیل بیگ کی مسجد تیسری سنگین مسجد۔ یہ دونوں مسجدیں پن چکی میں ہیں۔ جمیل بیگ خاں فوج کا سپہ سالار اور حضرت بابا شاہ کا مرید تھا۔ اس مسجد کو شاہ محمود خلیفہ کی نگرانی میں تعمیر کیا گیا۔ اسی کے متصل جانب جنوب محمود دروازہ ہے۔ موصوف یہیں پر عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ یہ مسجد بے حد خوبصورت اور آٹھ پہلو ستون پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس کے پلاسٹر کا راز ابھی تک نامعلوم ہے۔ نہایت چمکدار بنفشئی اسپارکلنگ استری کاری کی گئی تھی۔ اس کے تینوں گنبد خالص پتھر کی کڑی دار سلوں سے بنائے گئے ہیں۔

مسجد سنگین بھی تین گنبدوں پر مشتمل ہے۔ یہ مسجد بلند و بالا برگد کے جنوب مغربی سمت میں بڑی دلکش ہے۔ اس مسجد کے مشرقی جانب طویل حوض ہے۔ اس مسجد کو ترکتاز خاں نے بنوایا تھا۔ مسجد کے اندر کا ایک حصہ قدیم زمانے کی تعمیر ہے۔ اس کے پلاسٹر میں یہ خوبی ہے کہ کئی صدیوں کے بعد بھی اس کی چمک میں فرق نہیں آیا۔ چاندی کی چاندنی کی مانند اس کا دودھیا پلاسٹر آج بھی عجوبہ روزگار ہے۔ مسجد کے سامنے کا حصہ بعد کی تعمیر معلوم ہوتی ہے کیونکہ دونوں کا فرق بہت نمایاں ہے۔ اندرونی نقش دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناگ پھن نکالے کھڑے ہیں۔ بغور دیکھیں تو خوبصورت بیل بوٹے نظر آتے ہیں۔ اسی مسجد کے مغربی سمت بابا شاہ مسافرؒ اور بابا شاہ سعید پلنگ پوش کے مزار ہیں۔ بابا شاہ سعیدؒ کا وصال ۱۱۳۷ھ میں ہوا تھا۔

بابا شاہ مسافرؒ کی درگاہ فن تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ اس کے ستون بڑے بڑے خالص پتھر کے تراشے ہوئے ہیں۔ نازک سی کمانیں بلا چھت کی ہیں جو سرخ رنگ کی ہیں۔ مسجد سنگین کے مشرق میں طویل حوض فواروں کی بہار دکھلاتا ہے۔ اسی حوض کے نیچے گیسٹ ہاؤس ہے۔ اس کے اوپر حوض ہے اس لئے گرمیوں میں بے حد ٹھنڈا رہتا ہے۔ اس کے پہلو میں ندی محوِ خرام ہے۔ یہ ایرانی فن تعمیر

اس حوض کی مثال پورے ایشیا میں نہیں ملتی۔ مسجد سنگین کے جنوب میں نگینہ حوض اور بارہ
بارہ دری برباد ہو کر خاموش احتجاج کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس بارہ دری کے نیچے تہ خانہ
دار استہ کتب خانہ سے سرنگ کے ذریعہ ملایا گیا ہے۔ یہ سرنگ بھی جانے کہاں جا کر ختم
بارہ دری کا اب صرف چبوترہ رہ گیا ہے۔

چکی کی تعمیر اعلیٰ قسم کی ریاضی کی مرہون منت ہے۔ کوئی گوشہ اپنے فن و کمال سے محروم
تا۔ باباشاہ مسافرؒ کے مزار کے دروازہ پر کچھ اشعار تھے۔ بائیں طرف کے اشعار ہتھوڑی
سے مٹا دئے گئے جو سونا بنانے کی کیمیا ر سے لکھے گئے تھے۔ بہرحال پن چکی حقیقت
ن اور عافیت کی جگہ محسوس ہوتی ہے۔ اجنتا ایلورہ دیکھنے ساری دنیا سے لوگ آتے
پن چکی میں آکر بے حد سکون اور طمانیت محسوس کرتے ہیں، جیسے کہتے ہوں یہ ہے ہمارے
لی سرزمین۔

اختر انصاری دہلوی

بہروپیا
(ایک ریڈیائی تمثیل)

افرادِ تمثیل: (۱) ایک نفسیاتی معالج (۲) ایک اعصابی مریض

(دیواری کلاک پانچ بجاتا ہے۔ گھنٹے کی پانچویں ضرب کے بعد ڈاکٹر کی آواز سنائی دیتی ہے)

ڈاکٹر: دیکھیے بات وہی ہے جو میں نے شروع میں کہی تھی۔ آپ تقریباً تین بجے آئے تھے اور اب پانچ بجے ہیں۔ ان دو گھنٹوں کی بات چیت اور پوچھ گچھ اور چھان بین کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کسی عارضے میں مبتلا نہیں ہیں۔ اگر کچھ ہے تو وہ تنہائی اور بیکاری کی پیداوار ہے۔ اس تنہائی کو دور کیجیے اور بیکاری کا علاج کیجیے۔ آپ اپنے آپ کو بالکل بھلا چنگا محسوس کریں گے۔ کیا سمجھے؟ ——— بات اصل میں یہ ہے کہ یہ دنیا ایک کاروباری منڈی ہے جو لین دین کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں کوئی چیز اجرت یا قیمت ادا کیے بغیر نہیں ملتی۔ اور سب سے زیادہ قیمت ہمیں جس چیز کی دینی پڑتی ہے وہ دو وقت کی روٹی ہے جو ہم کھاتے ہیں۔ اب اگر کسی کو یہ دو وقت کی روٹی ہاتھ پیر ہلائے بغیر ملتی ہے تو عام طور پر سمجھا تو یہی جاتا ہے کہ وہ شخص بڑا خوش قسمت ہے کیونکہ وہ روزی کمانے کے جھنجھٹوں سے آزاد ہے مگر ایسا سمجھنا غلط ہے۔ اُس شخص کو بھی اپنی دو وقت کی روٹی کی کچھ نہ کچھ قیمت کسی نہ کسی شکل میں ضرور ادا کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسے لوگوں کو کچھ زیادہ ہی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اگر ان کو ہاتھ پیر ہلائے بغیر کھانے کو ملتا ہے تو کچھ ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہاتھ پیر کی بجائے

دل اور دماغ بل کر رہ جاتے ہیں۔ ابھی آپ نے مجھے بتایا کہ آپ کوئی کام نہیں کرتے۔ نہ آپ کے لیے ضروری ہے کہ کوئی کام کریں۔ بظاہر یہ بڑی قابل رشک بات ہے۔ جو بھی سنے گا اُس کو آپ کے اوپر رشک آئے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدرت آپ سے اس کی بہت بڑی قیمت وصول کر رہی ہے۔ بیکاری اور فرصت نے آپ کے لیے طرح طرح کے مسئلے پیدا کر دیے ہیں۔ آدمی بے کار رہ سکتا ہے مگر آدمی کا دماغ بیکار نہیں رہ سکتا۔ اگر اُس کے لیے کوئی جائز اور مفید شغلہ نہ ہوگا تو وہ ناجائز اور غیر مفید مشاغل کا سہارا لینے پر مجبور ہوگا۔ یہی کچھ آپ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور آپ کے مسئلے کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آپ کسی اہم کام میں مشغول ہو جائیں۔ اہم کام سے میرا مطلب ہے کوئی ایسی ذمہ داری جس کا بوجھ آپ کا دماغ ہر وقت محسوس کرے اور اس طرح لایعنی افکار سے محفوظ رہے! بس یہی میری تشخیص ہے اور یہی وہ علاج ہے جو میں آپ کے لیے تجویز کرتا ہوں۔

(وقفہ)

ڈاکٹر: ہائیں! آپ تو منہ لٹکا کر بیٹھ گئے۔ بھئی آپ ماشاءاللہ ایک خوش حال اور تندرست نوجوان ہیں۔ خوش رو بھی ہیں اور خوش پوش بھی۔ یہ سرخ و سپید رنگ، یہ دلکش و دل آویز نقوش، یہ مضبوط کاٹھی! قدرت نے آپ کو کس قدر فیاضی کے ساتھ نوازا ہے! پھر آپ کے چہرے پر اس قدر افسردگی اور بے دلی کیوں؟ یہ تو ٹھیک نہیں!

(وقفہ)

ڈاکٹر: کیوں صاحب! کیا کہا میں نے؟ آپ نے میری بات کو سنا؟ (زیادہ نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے اور سمجھانے بجھانے کے انداز میں) دیکھیے میری بات مانیے۔ آپ بالکل تندرست ہیں۔ بیماری کے وہم کو دل سے نکال دیجیے۔ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آپ نفسیاتی مریض ہیں؟ نفسیاتی مریض بھلا ایسے ہوتے ہیں؟ میں نے آپ کے بدن کو خوب ٹھونک بجا کے دیکھ لیا۔ کہیں کوئی جسمانی یا عضوی خرابی نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ جسمانی صحت و تندرستی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔ آپ کی دماغی حالت بھی بالکل اطمینان بخش ہے۔ ذہنی لحاظ سے آپ ایک قطعی نارمل انسان ہیں۔ کہیں کسی نفسیاتی خرابی یا عدم اعتدال

کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ آپ کی ذہانت کا معیار عام معیاروں سے کافی اونچا ہے۔ وہ جو ٹسٹ میں نے آپ کو دیا اس کا نتیجہ آپ سُن چکے ہیں۔ ذہانت کے ایسے معیار پر کوئی بھی شخص فخر کر سکتا ہے۔ تو پھر بھول جائیے اس بات کو کہ آپ کسی دماغی مرض میں مبتلا ہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے کو کسی کام میں غرق کر دیں اور خالی وقت تنہائی میں گزارنے کی بجائے دوستوں کے ساتھ ہُو حق میں گزاریں۔ آپ نے ایسا کیا تو کامیابی آپ کے قدم چُومے گی۔ بس جی کڑا کر کے نئے راستے پر چل پڑیے اور بھول جائیے خود کو بھی اور اپنے دماغی افکار کو بھی۔ یقین مانیے، ایک خوش و خرم زندگی اور ایک پُر بہار مستقبل آپ کے انتظار میں ہے۔

(وقفہ)

ڈاکٹر: کیا سمجھے آپ؟ میری رائے سے آپ کو اتفاق نہیں ہے کیا؟ —— اچھا یہ بتائیے، مَیں جو مشورہ آپ کو دے رہا ہوں اُس پر عمل کرنے میں آپ کو کیا دشواری محسوس ہوتی ہے؟

مریض: آپ کا مشورہ؟ میں تو آپ کے پاس مشورے ہی کے لیے آیا تھا ڈاکٹر صاحب! لیکن جو مشورہ آپ مجھے دے رہے ہیں وہ —— میرا مطلب ہے یہ مشورہ تو ہر شخص مجھے دیتا رہا ہے۔ بلکہ میں خود اپنے آپ کو یہ مشورہ دیتا رہا ہوں۔ سوال تو یہ ہے کہ میں اس مشورے پر کس طرح عمل کروں —— میرا مطلب ہے میں کس طرح اپنے افکار سے پیچھا چھڑاؤں۔ اور کس طرح خود کو کسی دوسرے کام میں مصروف کروں؟

ڈاکٹر: اپنی قوتِ ارادی سے کام لیجیے۔

مریض: (جھنک کر جواب دیتے ہوئے) اپنی قوتِ ارادی سے کس طرح کام لوں؟ آپ مجھے وہ طریقہ بتائیے جس کے ذریعے میں اپنی قوتِ ارادی سے کام لوں اور اپنے ملعون خیالات کو دماغ سے جھٹک دوں۔ وہی طریقہ معلوم کرنے کے لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔

ڈاکٹر: جبر سے کام لیجیے! اپنے اوپر جبر کیجیے۔ جب فضول اور غیر صحت مند خیالات آپ کے دماغ پر حملہ آور ہوں تو اُن کو بے دردی کے ساتھ رد کر دیجیے۔ اُن کا بالکل کوئی نوٹس نہ لیجیے۔

مریض : اِس معاملے میں میرا دماغ کسی جبر کو قبول نہیں کرتا۔ میں خود کو بالکل بے بس پاتا ہوں۔ اور یہی وہ مرض ہے جس کے علاج کے لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ مگر علاج تجویز کرنے کی بجائے آپ محض ایک بزرگانہ مشورہ دینے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ حد ہو گئی۔

ڈاکٹر : (ہنس کر) آپ کا مطلب ہے نالائق کی حد ہو گئی۔

مریض : نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب ! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ میں دراصل ذہنی طور پر بہت پریشان ہوں اور اکثر بات چیت میں گستاخانہ الفاظ میری زبان پر آجاتے ہیں۔ میں اس گستاخی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ للّٰہ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ علاج تجویز کرنے کی بجائے محض یہ مشورہ عنایت فرما رہے ہیں کہ مجھے اپنا علاج خود کرنا چاہیے ــــــ ارے توبہ ! میں پھر گستاخانہ بات کہہ گیا۔ خدا کے واسطے ڈاکٹر صاحب ! مجھے معاف کر دیجیے !

(ڈاکٹر کے ہنسنے کی آواز)

ڈاکٹر : بھئی آپ کی گفتگو گستاخانہ ہو یا نہ ہو، لیکن کسی ذہنی مریض کی گفتگو ہرگز نہیں ہے۔ آپ کی ہر بات بلکہ آپ کا ہر نفسیاتی ردِعمل آپ کے اس دعوے کو جھٹلاتا ہے کہ آپ کسی مرض میں مبتلا ہیں۔

مریض : نہیں ڈاکٹر صاحب ! ایسا نہیں ہے۔ میں ہرگز وہم میں مبتلا نہیں ہوں۔ میرے دماغ کو جو روگ لگا ہوا ہے وہ کوئی وہمی و خیالی چیز نہیں ہے بلکہ ایک واقعاتی حقیقت ہے۔ یقین مانیے ڈاکٹر صاحب ! اس کو توہم سے ہرگز کوئی علاقہ نہیں ! اور یہ بھی تو سوچیے کہ اب جو میں آپ کے پاس آیا ہوں تو میرا کوئی دماغ تو خراب ہے نہیں یا میں کوئی پاگل تو ہوا نہیں ہوں کہ بے وجہ ڈاکٹر وں کے پیچھے بھاگا پھروں۔

ڈاکٹر : یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کا دماغ خراب نہیں ہے۔ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ اور میں اتنی دیر سے کیا کہہ رہا ہوں۔

(دونوں کے ہنسنے کی آواز)

مریض : نہیں ڈاکٹر صاحب ! واقعہ یہ ہے کہ تنہائی میں میرا دماغ ایک پاگل کے دماغ کی

طرح کام کرتا ہے اور میں بالکل ایک پاگل کی طرح سوچتا ہوں۔

ڈاکٹر: آپ شاید یہ بات نہیں جانتے کہ کوئی پاگل اپنے آپ کو پاگل نہیں سمجھتا۔ اگر آپ کسی پاگل کو پاگل کہہ دیں تو وہ آپ کو مارنے کے لیے پتھر اٹھا لے گا اور آپ کو جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔

مریض: آپ صحیح فرماتے ہیں، لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ اچھا یہ لیجیے، اب میں آپ کو یہ بتاتا ہوں کہ میں یہاں سے جانے کے بعد کیا کروں گا۔

ڈاکٹر: یعنی؟ کیا مطلب؟

مریض: مطلب یہ کہ اس قسم کی ہر ملاقات کے بعد، خواہ وہ طویل ہو یا مختصر، میرا دماغ جس طرح کام کرتا ہے اُس کا مجھے پورا تجربہ ہے اور اُس تجربے کی روشنی میں میں یہ بتا سکتا ہوں کہ آپ سے رخصت ہو کر جب میں گھر پہنچوں گا تو مجھے لازمی طور پر کس ذہنی عمل سے گزرنا ہوگا۔

ڈاکٹر: اچھا کہیے۔

مریض: یہ جو دو ڈھائی گھنٹے آپ سے گفتگو ہوئی ہے، میں اس پوری گفتگو کو شروع سے آخر تک اپنے ذہن میں دہراؤں گا۔ اور گفتگو کے دوران میں جن جن مقامات پر مجھے کوئی الجھن محسوس ہوئی اُن مقامات کو دریافت کروں گا، اور اُن کو انگلیوں پر گنوں گا اور ایک فہرست مرتب کر لوں گا۔

ڈاکٹر: کیسی الجھنیں؟ میں سمجھا نہیں۔

مریض: دیکھیے نا۔ گفتگو کے دوران میں میرا ذہن بعض دوسری چیزوں کی طرف بھی منتقل ہوتا رہا اور مجھے بعض دوسری باتیں بھی یاد آتی رہیں۔ اب گفتگو کے دوران میں تو میں آپ سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جناب! ذرا ٹھیریے! میں کچھ الجھن سی محسوس کر رہا ہوں اور میرا ذہن کسی دوسری بات کی طرف جا رہا ہے۔ میں اس الجھن کو سلجھا لوں، اُس کے بعد گفتگو آگے بڑھے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ بات چیت ہوتی رہی اور پے بہ پے الجھنیں بھی پیدا ہوتی رہیں۔ اب میں گھر پہنچ کر اُن سب الجھنوں کی یاد تازہ کروں گا اور ان کو سلجھانے کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر: آپ یہ کوشش کیوں نہ کریں کہ اُن الجھنوں پر خاک ڈالیں اور ان کو بھلا کر کسی دوسرے

کام میں لگ جائیں۔

مریض : یہی تو میں نہیں کرسکتا اور اسی مصیبت کے علاج کے لیے تو میں یہاں آیا ہوں۔ اچھا خیر آگے سنیے۔ گفتگو کے دوران میں بعض مقامات پر مجھے اظہارِ مطلب میں دشواری محسوس ہوئی اور صحیح الفاظ دماغ کے خزانے سے برآمد ہو کر زبان تک نہیں آئے۔ ایسے تمام مقامات اور الفاظ کی بھی میں ایک فہرست مرتب کروں گا۔ پھر بعض مقامات ایسے بھی آئے جہاں میں نے مافی الضمیر کو بڑی عمدگی اور کامیابی کے ساتھ ادا کیا۔ ان مقامات کو بھی کھود کر نکالوں گا اور ان کی بھی ایک فہرست مرتب کروں گا۔ اس طرح متعدد فہرستیں تیار ہو جائیں گی۔

ڈاکٹر : پھر ان فہرستوں کی ایک فہرست ؟

مریض : جی نہیں۔ پھر ان فہرستوں کو بار بار دہراؤں گا۔ جب وہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں گی تو اُن میں مزید باقاعدگی اور تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب! میری اس گفتگو سے آپ کو کوفت تو نہیں ہو رہی ہے؟ میرا مطلب ہے، آپ اِن باتوں کو سُنتے سُنتے اُکتا تو نہیں گئے؟

ڈاکٹر : نہیں بالکل نہیں۔ آپ کہے جائیے بلکہ ہر بات کو خوب کھول کر بیان کیجیے۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔

مریض : کیا کروں ڈاکٹر صاحب! یہی وہ خرافات ہے جو میرے دماغ میں بھری رہتی ہے اور جس سے میں کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ خیر، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اُن فہرستوں کو مرتب کرنے کے بعد میری یہ کوشش ہوگی کہ اُن میں مزید باقاعدگی اور تنظیم پیدا ہو۔ مطلب یہ کہ اگر کسی ایک فہرست میں پانچ چیزیں ہیں، دوسری میں چھ، تیسری میں آٹھ اور چوتھی میں بھی آٹھ، تو میں یہ کوشش کروں گا کہ تیسری فہرست صرف سات چیزوں پر مشتمل ہو۔

ڈاکٹر : میں نہیں سمجھا۔ اس کو دوبارہ بتائیے۔

مریض : دیکھیے نا، ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ میں نے کُل چار فہرستیں مرتب کیں، حالانکہ حقیقت میں عموماً فہرستوں کی تعداد چار سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ خیر فرض کیجیے کہ چار فہرستیں وجود میں

آئیں۔ اب پہلی فہرست میں تو کُل پانچ چیزیں ہیں، دوسری میں چھ ہیں، اور تیسری اور چوتھی آٹھ آٹھ ہیں۔ یعنی سات کسی میں نہیں ہیں۔

ڈاکٹر: اچھا! پہلی فہرست میں پانچ، دوسری میں چھ ۔۔ سات کسی میں نہیں! ۔۔ تیسری میں آٹھ اور چوتھی میں بھی آٹھ! اچھا پھر؟

مریض: تو اب میری کوشش یہ ہو گی کہ تیسری فہرست میں آٹھ کی بجائے صرف سات چیزیں ہوں۔ تاکہ پانچ، چھ، سات اور آٹھ کے سہارے مجھے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔

ڈاکٹر: اچھا میں سمجھا۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ پانچ، چھ، سات اور آٹھ میں جو حسابی ترتیب ہے اُس کی مدد سے آپ کو یاد رکھنے میں آسانی ہو گی۔ اچھا اس کے بعد آپ کیا کریں گے؟

مریض: بس اس کے بعد میں تیسری فہرست میں سے ایک چیز کم کر دوں گا تاکہ آٹھ کی بجائے سات چیزیں رہ جائیں، اور اس طرح مجھے مطلوبہ تنظیم حاصل ہو جائے گی۔ یعنی پہلی فہرست میں پانچ چیزیں، دوسری میں چھ، تیسری میں سات اور چوتھی میں آٹھ!

ڈاکٹر: ٹھیک ہے۔ اُس کے بعد کیا؟

مریض: اُس کے بعد میں اِن فہرستوں کو حرزِ جاں بنا لوں گا۔ اُن کو بار بار دہراؤں گا گویا کوئی وظیفہ گھوٹ رہا ہوں اور اس کے بعد مطمئن ہو کر سو جاؤں گا۔ دوسرے دن اولین فرصت میں ان کی یاد کو از سرِ نو تازہ کر لوں گا۔ علاوہ ازیں دوسرے دن کی نئی الجھنیں بھی وجود میں آ چکی ہوں گی۔ اُن کا سلجھانا اور ان سے نپٹنا بھی ضروری ہو گا۔

ڈاکٹر: اچھا!

مریض: جی ہاں، اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ فہرستوں اور فارمولوں اور مختلف امور اور واقعات کے مجموعوں کا ایک ہمالیہ پہاڑ تعمیر ہوتا چلا جائے گا۔ اس سارے ذہنی عمل کے دوران میں اگر کچھ پڑھوں گا تو اُس مطالعے کی بنا پر بھی کچھ فہرستیں تیار ہو جائیں گی۔ اگر کسی کا خط آئے گا تو اُس خط کے مندرجات کو بھی ایک فارمولے کی شکل میں محفوظ کرنے

کی کوشش کروں گا۔ اگر کسی شخص کے ساتھ کسی خاص موضوع پر کوئی بحث آرائی ہوگی تو یہ ساری بحث تنہائی میں ایک مکمل ذہنی تبصرے کا موضوع بنے گی جس کے نتیجے میں اصول یا نظریات کا ایک مخصوص ڈھانچہ وجود میں آئے گا، اور اُس کو بھی اپنے ذہنی و فکری مواد کا ایک مستقل جزو بنانے کی کوشش کروں گا

....

ڈاکٹر: حد ہو گئی۔

مریض: مطلب یہ ہے ڈاکٹر صاحب! کہ اِس دنیا کے ادنیٰ ترین معاملات اور ارذل ترین اشیا سے لیکر ادب، سائنس اور فلسفے کے اعلیٰ ترین مسائل تک کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو میرے اس مخصوص ذہنی عمل کے دائرے میں نہ آتی ہو۔ اس ذہنی عمل کے تحت مجھے حقیر ترین چیز بھی اعلیٰ ترین معلوم ہوتی ہے اور میں کسی حال میں اُس کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اور یہ تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ کوئی بڑی سے بڑی مصروفیت اور اہم سے اہم ذمہ داری مجھے اِس ذہنی کارروائی سے باز نہیں رکھ سکتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سارا ذہنی عمل ایک قطعی مہمل، لغو، فضول اور دور از کار چیز ہے میں اِس کو رد کرنے پر قادر نہیں ہوں......

ڈاکٹر: اچھا فرض کیجیے کہ آپ کو اس ذہنی عمل کی مہلت ہی نہ دی جائے۔ یعنی یہاں سے رخصت ہو کر جب آپ گھر پہنچیں تو اپنے آپ کو ایک فوری اور شدید ذہنی و عملی مصروفیت سے دوچار پائیں۔ مثلاً گھر پہنچتے ہی آپ کو معلوم ہو کہ باہر سے دو تین خاص دوست رات کی گاڑی سے آرہے ہیں۔ آپ کو فوراً اسٹیشن پہنچنا ہے، اُن کو گاڑی سے اُتار کر گھر لانا ہے، ان کے قیام و طعام کا انتظام کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو پھر آپ کیا کریں گے؟

مریض: (نہایت اطمینان اور وثوق کے ساتھ) کچھ نہیں۔ جب تک یہ خارجی مصروفیت رہے گی میرا وہ ذہنی فریضہ ملتوی رہے گا۔ لیکن پھر اولین فرصت کے حاصل ہوتے ہی میں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کروں گا۔۔۔۔ آپ کچھ سوچ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! سر جھکائے

ہوئے اور آنکھیں بند کیے ہوئے!

ڈاکٹر: نہیں آپ اس کا خیال نہ کیجیے۔ میں سب سُن رہا ہوں۔

مریض: ڈاکٹر صاحب! میں نے اپنے ذہنی خلفشار کی جو تصویر ابھی پیش کی وہ بہت سادہ تصویر ہے۔ اُس سے اُن پیچیدگیوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا جن سے دراصل مجھے سابقہ رہتا ہے۔ میری ساری ٹریجڈی یہی ہے کہ میں اپنی ظاہری ہیئت سے، بات چیت سے، عادات و اطوار اور نشست و برخاست سے ایک تندرست اور صحت مند آدمی معلوم ہوتا ہوں، لیکن میرے دماغ میں ایک عجیب قیامت برپا رہتی ہے۔ گویا دماغ نہیں ہے، کوئی پکا پھوڑا ہے جو کھولتے ہوئے لاوے سے پُر ہے۔ جو لوگ میرے خارج کو دیکھتے ہیں اُن کو گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ کیسے کیسے سانپ بچھو اور کنکھجورے میرے اندرونی وجود سے لپٹے ہوئے ہیں اور اُسے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ بارہا میرے دل سے یہ دعا اُٹھتی ہے کہ خدا کرے میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں اور کسی پاگل خانے میں اپنی زندگی کے بقیہ دن گزار کر مر جاؤں۔ یا کم سے کم اِتنا ہی ہو کہ میرے حواس کند اور میرا حافظہ معطل ہو جائے تاکہ یہ جو ہر وقت ہر چیز کو کریدنے، ہر بات کو ٹٹولنے اور ہر امر کا تجزیہ کرنے کا مرض ہے اِس سے تو نجات پاؤں۔ آپ شاید سو گئے ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر: نہیں بھئی، میں آپ کی بات پوری توجہ سے سُن رہا ہوں۔ کہے جائیے۔

مریض: میں جب کسی بے پروا، قلندر سے اور ہنسنے ہنسانے والے شخص کو دیکھتا ہوں اور اُس کی حالت سے اپنی حالت کا موازنہ دل ہی دل میں کرتا ہوں تو میرے کلیجے پر چھریاں چل جاتی ہیں۔ یقین مانیے گا ڈاکٹر صاحب! میں سچ مچ مرنے کی دعائیں مانگنے لگتا ہوں، اور لطف یہ ہے کہ لوگ مجھے دن رات یہی مشورہ دیتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وقت زندہ دل دوستوں کی صحبت میں گزارو۔ خدارا مجھے بتایئے کہ میں اِس عذاب سے کس طرح چھوٹوں۔ مجھے تو جیتے جی جہنم میں دھکیل دیا گیا ہے ـــــ آپ کیا سوچ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟

(وقفہ)

ڈاکٹر: (جیسے کسی گہرے خواب سے بیدار ہو کر) ہوں! ـــــ آپ نے بتایا تھا کہ آپ روزانہ ورزش بھی کرتے ہیں۔ تو کیا آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ گھر پر ورزش کرنے کی بجائے آپ گھر سے باہر ہوا خوری کے لیے جایا کریں؟

مریض۔ مَیں ایک زمانے میں ہوا خوری کے لیے بھی جاتا رہا ہوں۔ لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر: نہیں، محض ہوا خوری کے لیے جانا کافی نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ برسک واکنگ کریں اور واک زیادہ سے زیادہ لمبی ہو۔ ہانپتے ہوئے جائیں اور ہانپتے ہوئے واپس آئیں۔ اور حتی الامکان طلوعِ آفتاب سے قبل واپس آجائیں۔ مزید برآں جس راستے سے جائیں اس راستے سے واپس نہ آئیں۔ واپسی کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں۔

(وقفہ)

ڈاکٹر: ارے! آپ پھر خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ (لہجے میں مزید نرمی پیدا کرتے ہوئے) دیکھیے، میری خواہش اصل میں یہ ہے کہ آپ روزانہ کم سے کم دو تین گھنٹے کسی ایسی مصروفیت میں گزاریں جو شدید قسم کی ذہنی و عملی مصروفیت ہو۔ آپ اُس میں پورے طور پر جذب ہو جائیں اور اپنے تیس سال پرانے وجود کو بالکل بھول جائیں۔ آپ نے اپنی عمر تیس سال بتائی تھی نا؟

مریض: جی ہاں، لیکن اس چہل قدمی اور ہوا خوری سے مجھے کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں ہے۔

ڈاکٹر: یقیناً فائدہ پہنچے گا۔ بشرطیکہ آپ ان باتوں کو ملحوظ رکھیں جو میں نے ابھی بتائیں۔ آپ چند روز تجربہ کر کے تو دیکھیے ـــــ اچھا بتایئے کہ آپ سینما وغیرہ دیکھتے ہیں؟

مریض: جی برابر دیکھتا ہوں۔

ڈاکٹر: دو تین گھنٹے پکچر ہاؤس میں گزارنے کے بعد آپ کو کوئی خاص تازگی محسوس ہوتی ہے؟

مریض: جی نہیں، کوئی تازگی محسوس نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات تو کچھ پرانی الجھنیں از سرِ نو تازہ ہو جاتی ہیں جن کو تنہائی ملتے ہی سلجھانا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر: ظاہر ہے کہ آپ پکچر کے دوران میں بھی اپنے اندر ہی غرق رہتے ہیں۔ آپ کو خود

آپ کے اپنے وجود سے الگ کرنے کے لیے کسی شدید تر کارروائی کی ضرورت ہے!

مریض: جی؟ کیا فرمایا؟

ڈاکٹر: کچھ نہیں۔ یہ بات تو دراصل میں نے اپنے آپ سے کہی ـــــ (پھر ذرا چونک کر) اچھا یہ بتائیے، آپ نے نٹ راج دیکھا ہے؟

مریض: (اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے) جی؟

ڈاکٹر: میرا مطلب ہے نٹ راج سینما جو متھرا روڈ پر ہے۔ وہاں کچھ دنوں سے رقص و موسیقی کا ایک ملا جلا پروگرام ہو رہا ہے۔ باہر سے کوئی ٹروپ آیا ہوا ہے جس نے سارے شہر کو دیوانہ بنا رکھا ہے، لوگ ہنستے ہنستے پاگل ہو جاتے ہیں۔ آپ ذرا ایک دن وہ شو تو دیکھیے۔ بلکہ مسلسل کئی دن تک دیکھیے۔

مریض: ارے ڈاکٹر صاحب! آپ پھر مذاق کرنے لگے۔ بھلا ان باتوں سے کسی مریض کا علاج ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر: نہیں بھائی میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ میں یہ بات پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ آپ وہاں جائیں گے اور تین گھنٹے تک قہقہے لگائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہنسنے ہنسانے سے کتنے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اور اس کا دماغی صحت سے کتنا گہرا تعلق ہے۔

مریض: چھوڑیے بھی ڈاکٹر صاحب! کوئی کام کی بات بتائیے۔

ڈاکٹر: یقین مانیے، میں بہت کام کی بات بتا رہا ہوں۔ (کسی قدر جوش میں آکر) آپ اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں کہ یہ جو دنیا میں چاروں طرف افسردگی اور پژمردہ دلی اور بے لطفی اور بدمزگی کا ایک طوفان سا نظر آتا ہے، وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ انسانوں نے ہنسنا ہنسانا ترک کر دیا ہے، اور قہقہہ زنی کو ایک غیر سنجیدہ اور اوباشانہ حرکت خیال کیا جاتا ہے۔ دنیا ضرورت سے زیادہ متین ہو گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قہقہہ مار کر ہنسنا نہ صرف ایک جسمانی ورزش ہے بلکہ دل، دماغ اور روح کی ورزش بھی ہے۔ آپ اس چیز سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیجیے اور اس کو اپنے مرض کا علاج سمجھیے۔

مریض: معاف کیجیے ڈاکٹر صاحب! مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر: سنیے! آپ نے کبھی اِس حقیقت پر غور کیا ہے کہ تمام انسانی افعال میں صرف ہنسنا ہی ایک ایسا فعل ہے جو خالص انسانی وصف ہے اور حیوانوں میں نہیں پایا جاتا۔ آپ نے کبھی کسی جانور کو ہنستے ہوئے نہ دیکھا ہوگا! ہنسنے کے علاوہ باقی تمام افعال انسان اور حیوان دونوں میں مشترک ہیں۔ حتیٰ کہ عقل بھی جانوروں میں پائی جاتی ہے۔ یعنی وہ چیز بھی جس کو انسان کا نفسِ ناطقہ خیال کیا گیا ہے اور جو تمام انسانی ترقیوں کی بنیاد ہے۔ کیا اِس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہنسنا انسان کے لیے نہایت ضروری ہے؟

مریض: بے شک ضروری ہے، لیکن......

ڈاکٹر: لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آپ آج رات ہی نٹ راج کا شو دیکھیے۔ شو کے خاتمے پر آپ ہال سے باہر آئیں گے تو ایک مختلف انسان ہوں گے۔ آپ کی دنیا بدل چکی ہوگی۔ اور آپ کے دماغ کو جو روگ لگا ہوا ہے وہ دھواں بن کر اُڑ چکا ہوگا۔ کیا سمجھے آپ؟ وہ ٹروپ بہترین فن کاروں کا مجموعہ ہے۔ اور ٹروپ لیڈر کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہوسکتا۔ وہ دنیا کا بہترین مسخرہ ہے۔ اس سے بڑا کامیڈین آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ آپ اس سیاہ فام ٹھگنے کی کارگزاری ذرا جاکر تو دیکھیے۔ ہنستے ہنستے آپ کا بُرا حال ہو جائے گا۔ آپ جس گھٹن کا شکار ہیں وہ دھواں بن کر اُڑ جائے گی۔ جی!

مریض: للہ ڈاکٹر صاحب! کوئی علاج تجویز کیجیے! مجھے ہنسنے ہنسانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جس کو بھوک ہی نہ ہوگی وہ نانبائی کی دوکان پر ہی کیوں جائے گا؟ میں وہاں کاہے کے لیے جاؤں؟ ہنستے ہوئے لوگ مجھے زہر معلوم ہوتے ہیں۔ میں ان کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

ڈاکٹر: نہ سہی! لیکن اس بہروپیے سے آپ ضرور ملاقات کیجیے۔ وہ کالا کلوٹا بدہیئت آدمی آپ کو بدل کر رکھ دے گا۔ ایک دنیا اس کے کرتبوں پر فریفتہ ہو رہی ہے۔ آپ بھی اُس کے سحر سے نہیں بچیں گے ــــــ اچھا ایک کام کیجیے۔ آپ میرے ساتھ چلیے۔ میں آپ کو آج ہی اپنے ساتھ لے چلوں گا ــــــ

مریض: نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھے معاف رکھیے ـــــ میں چلتا ہوں ـــــ حد ہوگئی!

ڈاکٹر: ارے نہیں۔ بیٹھے رہیے۔ آپ تو سچ مچ اٹھ کھڑے ہوئے۔۔ ذرا بیٹھیے تو۔ ہاں، یوں۔ بھئی اب تو آپ کو میری بات ماننی ہی پڑے گی۔ میں آپ کو اپنے ساتھ ضرور لے چلوں گا ـــــ لیجیے ابھی دو سیٹیں بُک کراتا ہوں۔

(ٹیلیفون کھسکائے جانے کی آواز)

مریض: خدا کے واسطے ڈاکٹر صاحب! مجھے معاف رکھیے۔ میں نہیں جاؤں گا ـــــ آپ بیکار فون کر رہے ہیں۔

(فون پر نمبر ملانے کی آواز سنائی دیتی ہے)

ڈاکٹر: ہیلو!

مریض: اُف وہ ڈاکٹر صاحب! اب میں آپ سے کیسے کہوں کہ حقیقت کیا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں ـــــ میں خود ہی وہ مسخرہ ہوں!

ڈاکٹر: جی!

مریض: جی ہاں، میں ہی وہ شخص ہوں جس سے آپ میری ملاقات کرانا چاہتے ہیں!

ڈاکٹر: یعنی؟ کیا مطلب؟

مریض: مطلب یہی کہ وہ شخص جسے آپ سیاہ فام بھتنا کہہ رہے ہیں میں ہی تو ہوں!

ڈاکٹر: (سخت حیرت کے لہجے میں) آپ؟

مریض: جی جی وہ بہروپیا یہی خاکسار ہے۔

ڈاکٹر: یعنی نٹ راج ٹروپ کے لیڈر آپ ہی ہیں! آخر یہ کیسے ممکن ہے؟ ـــــ بھئی حد ہوگئی! اور آپ تو یہ کہہ رہے تھے کہ میں کوئی کام نہیں کرتا اور بڑے بھائی کے سہارے زندگی بسر کرتا ہوں؟

مریض: وہ میں نے غلط نہیں کہا۔ میرے بڑے بھائی اُس ناٹک منڈلی کے مالک ہیں۔ میں

تھوڑی سی دیر اسٹیج پر مسخرہ پن کرکے ان کا ہاتھ بٹاتا ہوں۔ تو یہ تو کوئی کام نہیں ہوا۔

ڈاکٹر: مگر مجھے واقعی حیرت ہے کہ آپ ہی وہ شخص ہیں جس کا میں ذکر کرتا رہا ہوں۔ واللہ حد ہوگئی۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

مریض: آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ لیکن وہ شخص دراصل میں ہی ہوں۔ اور اب آپ خدا کے لیے میرے علاج کی طرف توجہ فرمائیں۔ (گلوگیر آواز میں) واللہ میں بہت دکھی ہوں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں!

ڈاکٹر: ہائیں ہائیں اِس قدر دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنے آنسو پونچھیے اور مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیجیے۔ کس قدر عجیب بات ہے! میں آپ کو خود آپ ہی سے ملانے لے جا رہا تھا!

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے)

ترجمان القرآن (جلد سوم) از مولانا ابو الکلام آزاد (مرحوم)

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۹۹۲ صفحات، مجلد مع گرد پوش، طباعت ٹائپ میں، قیمت: ۴۲ روپئے
سال اشاعت: ۱۹۶۸ء، ناشر: ساہتیہ اکاڈمی، رابندر بھون، نئی دہلی ۱

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی مقبول ترین تفسیر، ترجمان القرآن کی دو جلدیں، مولانا آزاد کی زندگی میں شائع ہوئی تھیں، مگر ساہتیہ اکاڈمی نے، جس نے مولانا آزاد مرحوم کی جملہ کتابوں کو ازسرِ نو شائع کرنے کی ذمہ داری قبول کی ہے، پانچ جلدوں میں تقسیم کیا ہے، دو جلدیں پہلے شائع ہو چکی ہیں، جن پر حسب ترتیب دسمبر ۱۹۶۵ء اور اگست ۱۹۶۷ء میں رسالہ جامعہ میں تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تیسری جلد ہے جس میں سورہ بقرہ سے سورہ انعام تک کا ترجمہ اور تفسیر شامل ہے۔ حسب سابق اس میں حواشی (مولانا آزاد کے حواشی کے علاوہ) اور اشاریہ کا اضافہ کیا گیا ہے پچھلی دونوں جلدوں کی طرح یہ جلد بھی مطبع دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ حاشیے اور اشاریہ کس نے مرتب کئے ہیں۔

مولانا ابو الکلام آزاد برصغیر ہند و پاک کے ان چند ممتاز لوگوں میں سے ہیں جنھیں مفکرین اسلام کا درجہ حاصل ہے، مگر اپنی سیاسی معروفیت کی وجہ سے وہ فکر و اجتہاد کے میدان میں ملک و قوم کی رہنمائی کا حق ادا نہ کرسکے، صرف "ترجمان القرآن" اور ان کے مختلف مضامین میں ایسے

نمونے ملتے ہیں جن سے ان کے فکر و اجتہاد کی غیر معمولی صلاحیتوں اور ان کے طرز فکر پر روشنی پڑتی ہے۔ اگرچہ ترجمان القرآن" کی تصنیف کے وقت مولانا آزاد کے پیش نظر صرف اس قدر تھا کہ "قرآن کے مطالعہ و تعلیم کے لیے ایک درمیانی ضخامت کی کتاب مہیا ہو جائے، مجرد ترجمے سے وضاحت میں زیادہ، مطول تفاسیر سے مقدار میں کم" لیکن مولاناؒ جب لکھنے بیٹھتے تو انھیں اپنے قلم پر مشکل سے قابو حاصل ہوتا تھا اور معلومات کا دریا بے قابو ہو کر بہہ نکلتا تھا۔

"ترجمان القرآن" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اطناب اور تفصیل سے بچنے کی بار بار کوشش کرتے ہیں، مگر پھر بھی کوئی خاص نکتہ سامنے آجاتا ہے تو صفحے کے صفحے لکھ ڈالتے ہیں۔ زیر تبصرہ جلد میں ایسے بہت سے موضوعات ہیں، جن پر مولانا نے اگرچہ چند صفحے لکھے ہیں، مگر وہ اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے کتابوں پر بھاری ہیں مثلاً سورہ توبہ کی تفسیر میں زکوٰۃ یا منافقوں کے اعمال و خصائص کے سلسلے میں یا سورہ یونس کی تفسیر میں "کائنات کا چھ ایام میں پیدا ہونا" اور "قرآن اور آخرت کی زندگی" کے عنوانات کے ماتحت لکھا ہے یا سورہ یوسف کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں، وہ مولانا آزاد کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ مولاناؒ نے اپنے مطالعہ کے بارے میں خود لکھا ہے:

> "کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے لئے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے، اس کی ایک ایک سورۃ، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں طے کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں۔ تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گذر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو"
>
> علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں، لیکن میرے لئے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا ہے اور جو کچھ جدید ہے اس کے لئے اپنی راہیں آپ نکالیں۔ میرے لئے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی

ہیں، جس طرح قدیم راہوں کے چپہ چپہ کا شناسا ہوں :

رہا ہوں رند بھی میں اور پارسا بھی میں
مری نظر میں ہیں رندان و پارسا اک ایک

ترجمان القرآن جلد اول (قدیم ایڈیشن) ص۵۰

امید ہے کہ مولانا آزاد کی دوسری کتابوں کی طرح اسے بھی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

(عبداللطیف اعظمی)

سالانہ چندہ
چھ روپے

جامعہ

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۲	بابت ماہ ستمبر ۱۹۷۰ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائٹل: دیال پریس د

شذرات

۲۲ اگست کو ضیاء الحسن فاروقی صاحب کی طبیعت یکایک خراب ہوگئی۔ وہ سہ پہر میں ایک جلسے میں شرکت کے لیے گھر سے روانہ ہوئے، راستے میں سینے میں کچھ درد محسوس کیا، اسی حالت میں دفتر تشریف لائے، ٹھنڈا پانی پیا اور طبیعت بحال ہوگئی، مگر تھوڑی ہی دیر میں طبیعت پھر خراب ہوئی اور انھیں فوراً ہی ہسپتال پہنچایا گیا۔ اسی وقت گلوکوز اور آکسیجن دی گئی اور کارڈیو گرام لیا گیا۔ ڈاکٹروں نے بتلایا کہ انھیں قلب کا شدید دورہ اٹھا تھا، جس کا دل پر گہرا اثر ہے۔ اس بات کو آج چار روز ہوگئے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ اس کے فضل سے اور مناسب علاج کی وجہ سے اب خطرہ جاتا رہا ہے اور صحت رفتہ رفتہ بہتر ہو رہی ہے، مگر اب بھی مکمل آرام اور بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور غالباً کچھ عرصے تک ہسپتال میں رہنا ہوگا اور معمول کے مطابق کام کرنے کی اجازت تو شاید مہینوں کے بعد ملے۔ قارئین جامعہ سے درخواست ہے کہ وہ موصوف کی مکمل صحت کے لئے دعا کریں۔ ہم ان حضرات کا جنھوں نے موصوف کی صحت اور خیریت معلوم کرنے کے لیے خطوط لکھے ہیں، تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

مجھے ہسپتالوں کا اچھا خاصا تجربہ ہے، اچھے اسپتالوں میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی پر خلوص خدمات کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ضیاء صاحب کی اس علالت کے زمانے میں ہولی فیملی ہسپتال میں جو ایک امریکی مشن کے زیر انتظام ہے، نرسوں کے کام کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

ان کی محنت، چستی اور فرض شناسی کو دیکھکر بے حد خوشی ہوئی، اسی کے ساتھ ساتھ اس بات پر ملال اور افسوس ہوا کہ ہم مسلمانوں نے نہ جانے کیوں خدمت خلق کے اس اہم کام کی طرف توجہ نہیں کی۔ ہندوستانی مسلمانوں میں بڑے سرمایہ داروں کی یقیناً بہت کمی ہے، تاہم اب بھی کئی ایسے شہر ہیں جن کے مسلمان اچھے خاصے خوش حال ہیں اور وہ کم سے کم ایک ہسپتال تو قائم ہی کر سکتے ہیں، اور اگر مان لیا جائے کہ ان کی مالی حالت کوئی ہسپتال قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتی تو مسلمان لڑکیاں اگر کلرکی کر سکتی ہیں تو نرس کا کام بھی کر سکتی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری جماعت کو اس کام سے نفرت ہے چنانچہ شاید ہی کسی ہسپتال میں کوئی مسلمان نرس ملے گی۔ اسی سال کا واقعہ ہے۔ جامعہ کی ایک گریجویٹ مسلمان خاتون شیخ الجامعہ صاحب سے ملازمت اور کام کے سلسلہ میں ملیں اور انھوں نے نرسری کی معلمی کی ٹریننگ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ شیخ الجامعہ صاحب نے معلوم کیا کہ کیا وہ نرسنگ کی ٹریننگ حاصل کرنا پسند کریں گی تو انھوں نے اس طرح انکار کیا جیسے یہ بہت ہی پست اور ذلیل کام ہے۔ یہ طرز فکر صرف ان ہی خاتون کا نہیں ہے، اگر میں غلطی نہیں کرتا تو شاید پوری ملت کا ہے۔ ہماری اجتماعی خامیوں اور خرابیوں کی اصلاح کی طرف مختلف طریقوں سے توجہ دلائی جا رہی ہے، مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ہسپتال کے قیام اور نرسنگ کی ٹریننگ کی طرف اب تک کوئی توجہ نہیں دلائی گئی ہے، حالانکہ رفاہ عام اور خدمت خلق کے لیے، جسے اسلامی تعلیمات میں بڑی اہمیت دی گئی ہے اور جس سے مسلمانوں کو اپنے عہد عروج میں بہت شغف رہا ہے، اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح اللہ کے تمام بندوں کی، چاہے وہ کسی طبقے یا کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں، بے لوث اور بے غرض خدمت کی جا سکتی ہے۔ خدا وہ دن لائے جب ہماری قوم کو اس مفید اور اہم ضرورت کا بھی احساس ہو اور یہ احساس عمل کی صورت اختیار کرے۔

جامعہ کے جشن زریں کا ان صفحات میں کئی مرتبہ ذکر آچکا ہے۔ اب طے ہوگیا ہے کہ ۲۸ اکتوبر سے یکم نومبر تک پانچ دن یہ جشن منایا جائے گا۔ جوبلی کے افتتاح کے لیے، نائب صدر جمہوریہ، جناب گوپال سروپ پاٹھک سے، جلسۂ یوم تاسیس میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت کرنے اور جلسہ سے خطاب کرنے کے لیے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے اور جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر سندیں دینے اور خطبہ پڑھنے کے لیے صدر جمہوریہ عالی جناب وی وی گری سے درخواست کی گئی ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ ان معززین نے ہماری درخواست کو منظور فرمالیا ہے۔ ان تین اہم جلسوں کے علاوہ اور بہت سے پروگرام ہیں جو اپنی افادیت اور عام دلچسپی کے لحاظ سے کافی اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً بعض اہم مسائل پر سمپوزیم کیے جائیں گے، تعلیمی اور علمی نمائشیں کی جائیں گی، مفید اور دلچسپ ڈرامے ہوں گے۔ غرض یہ پانچ دن ایسے ہوں گے، جن میں جامعہ اپنے کاموں کا جائزہ لے گی، اپنی خدمات کو قوم کے سامنے پیش کرے گی، اصحاب علم اور دانش ور قومی اور ملکی مسائل پر بحث و گفتگو کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ ایسی شائستہ تفریحات کا سامان بھی ہوگا، جن میں چھوٹے بڑے سب شریک ہو سکیں اور لطف اٹھا سکیں۔ انشاء اللہ مفصل پروگرام بہت جلد مختلف اخبارات میں شائع کر دیا جائے گا۔

ہماری ایک خواہش یہ بھی ہے کہ اس اہم موقع پر ماہنامہ جامعہ کا ایک خاص نمبر شائع کریں، جس میں جامعہ کے تمام شعبوں کا اختصار کے ساتھ تعارف ہو، جامعہ کی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے اور جامعہ کے معماروں اور خادموں کو یاد کیا جائے۔ یہ خاص نمبر اکتوبر اور نومبر کے دو شماروں پر مشتمل ہوگا اور حجم کوئی ڈیڑھ دو سو صفحات ہوگا۔

یہ تو ہوئے ہمارے ارادے اور حوصلے، اب سوال ہے کہ خود قوم کی کیا ذمہ داری ہے؟ وہ جامعہ سے کیا توقعات رکھتی ہے اور ان توقعات کی تکمیل کے لیے خود کیا کرنا چاہتی ہے؟

جامعہ کو جب سے حکومت کی امداد مل رہی ہے، اس کے روزمرہ کے کام خوش اسلوبی سے انجام پارہے ہیں اور تعمیرات اور توسیع کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ مشکلات اور رکاوٹیں ضرور پیش آتی رہتی ہیں، مگر بہرصورت ان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور کیا جارہا ہے مگر بہت سے کام ہیں جن کے لئے حکومت سے مدد نہیں مل سکتی، اس سلسلے میں ہم نے قوم سے تین اپیلیں کی ہیں، ایک اسکول کی عمارت کی تکمیل کے لئے، جو ایک طویل عرصے سے نامکمل ہے اور قوم و ملک کی بے توجہی کی مرثیہ خواں ہے، دوسری اسکالرشپ فنڈ کے لیے، تیسری مسجد کی تعمیر کے لیے۔ ہمیں افسوس ہے کہ قوم نے ان تینوں اپیلوں کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے۔ اب بھی وقت باقی ہے، امید ہے کہ مخیر اور علم دوست حضرات اس طرف توجہ کر کے جوبلی کا ایک بڑا مقصد پورا کرنے میں تعاون فرمائیں گے۔

---

۱۵ اگست کے موقع پر حکومت ہند کی طرف سے جن اصحاب علم کو اعزازات ملے ہیں، ان میں دار المصنفین کے ناظم اعلیٰ حاجی شاہ معین الدین ندوی بھی ہیں۔ موصوف نے واقعی علم وادب کی جو غیر معمولی خدمت کی ہے اس کے پیش نظر صحیح معنی میں وہ اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ ہم ان کی خدمت میں تمام اہل جامعہ اور بالخصوص شیخ الجامعہ صاحب کی طرف سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ خدا کرے ان کا سایہ ہمارے سروں پر عرصۂ دراز تک قائم رہے اور وہ صحت و سلامتی کے ساتھ اپنے فکر و عمل اور اپنے قلم سے اسی لگن کے ساتھ خدمت کرتے رہیں۔

وفیسر عصمت گرتلی
تلخیص: عبداللطیف اعظمی

ترکی اور روس کے تعلقات

پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی اور روس کے باہمی تعلقات کی تاریخ میں تین دور بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلا دور ۱۹۲۰ء سے شروع ہوتا ہے جب ترکی اور سوویٹ یونین میں مغربی ملکوں بالخصوص برطانیہ کے خلاف اتحاد پیدا ہوا۔ مصطفیٰ کمال نے، جب اناطولیہ پر برطانوی حملے کا دباؤ بہت بڑھ گیا تھا، ۲۶ر اپریل ۱۹۲۰ء کو حکومت روس کو لکھا کہ وہ سامراج کے خلاف جنگ کرتے اور اس سلسلے میں روس سے فوجی اور سیاسی معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ روس ایک غیر کمیونسٹ حکومت سے مستقل معاہدہ کرنا مصلحت کے خلاف سمجھتا تھا اس لیے اس نے ۱۹۲۰ء میں مصطفیٰ کمال کی حکومت سے سفارتی سطح پر تعلقات قائم کرلئے۔ ۱۶ر مارچ ۱۹۲۱ء کو ماسکو میں دونوں حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جس میں سرحدی جھگڑے طے کئے گئے اور جس کے مطابق کارس اور اردہان کے صوبے ترکی کے پاس رہے اور باطوم روس کے پاس۔

سفارتی تعلقات اور سرحدی معاہدہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ روس نے ترکی کو ہتھیار اور مختلف قسم کے فوجی سامان بھیجے اور ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو میکائیل فرنزی جو اس وقت یوکرین میں روس کے کمانڈر انچیف تھے اور بعد میں ٹراٹسکی کی جگہ جنگ کے کیسار مقرر ہوئے، انقرہ تشریف لائے،

فاضل مضمون نگار ڈاکٹر عصمت گرتلی استنبول یونیورسٹی (ترکی) کے ڈیپارٹمنٹ آف پبلک لا اینڈ گورنمنٹ میں پروفیسر ہیں۔

جہاں ان کا بڑا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ فرنزی کے واپس جانے کے بعد فوراً ہی نیا هندی سفیر ابرالوف
ترکی آیا اور اس نے مصطفیٰ کمال کے ساتھ محاذ جنگ کا معائنہ اور فوج سے خطاب کیا۔ ۱۹۲۲ء کے
کے موسم گرما میں مصطفیٰ کمال نے مسلسل آگے بڑھنا شروع کیا جس پر ماسکو سے مبارکباد کا تار موصول ہوا۔
ترکی کی جنگ آزادی ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو ختم ہوئی، جب مدانیا میں صلحنامے پر دستخط ہوئے۔
اتحادیوں کو توقع تھی کہ فاتح ترکی صلحنامۂ سیورے کو مسترد کر دے گا، جس کے مطابق برطانیہ، فرانس،
اٹلی، جاپان، یگوسلاویہ، رومانیہ، بلغاریہ، سوویٹ روس، سوویٹ یوکرین، سوویٹ جارجیا اور
ترکی نے لوزان میں ایک کانفرنس بلانے پر اتفاق کیا تھا۔ ماسکو نے بہت سخت احتجاج کیا کہ اسے
کانفرنس میں اپنے اہم مفاد پر گفتگو کرنے کے لیے پورا موقع نہیں دیا گیا، مگر اس کے باوجود بحث
و گفتگو میں اس کو ایسی باتیں کہنے کا موقع نہیں مل سکا، جن کا درۂ دانیال، آبنائے باسفورس
اور قسطنطنیہ کے مستقبل پر اثر پڑ سکے۔

بالشویک انقلاب سے پہلے قسطنطنیہ (استنبول) اور ترکی آبنایوں کی وجہ سے زار حکومت سے
صدیوں سے عداوت چلی آرہی تھی اور روس اور ترکی کے درمیان تیرہ جنگیں ہو چکی تھیں۔ دوسری
جنگ عظیم کے زمانے میں زار حکومت نے فرانس اور انگلستان سے خفیہ معاہدہ کے ذریعہ یہ
طے کر لیا تھا کہ قسطنطنیہ اور ترکی آبنائیں اسے دیدی جائیں گی۔ انقلاب کے بعد جب عارضی حکومت
قائم ہوئی تو نئے وزیر خارجہ ملیوکوف نے اعلان کر دیا کہ فرانس اور انگلستان کے خفیہ معاہدہ
کے ذریعہ قسطنطنیہ اور ترکی آبناؤں پر روس کو جو حقوق حاصل ہیں، وہ علیٰ حالہ باقی رہیں گے۔
کرنیسکی کے زوال کے بعد بالشویکوں کی حکومت قائم ہوئی تو انھوں نے تمام خفیہ معاہدوں اور
فیصلوں کو ختم کر دیا اور ۷ دسمبر ۱۹۱۷ء کو لینن اور استالن کے دستخطوں سے ایک فرمان
جاری کیا گیا کہ "قسطنطنیہ مسلمانوں کے قبضے میں رہے گا۔"

انقلاب روس کے بعد درۂ دانیال کے بارے میں روس کی پالیسی میں بہت بڑی تبدیلی آئی۔
نکولس دوم کی خواہش تھی کہ اس کے جنگی جہاز بغیر کسی روک ٹوک کے درۂ دانیال سے گذرا

کریں، زار حکومت کی توسیع پسندی کی وجہ سے برطانیہ اور دوسرے ممالک بھی چاہتے تھے کہ ترکی آبنائیں روس کے لیے بند کر دی جائیں۔ اب انقلاب کے بعد روس چاہتا تھا کہ آبنائیں سب کے لیے کھلی رہیں۔ لوزان کانفرنس کے موقع پر لارڈ کرزن نے تسلیم کیا کہ اب یورپ اور روس کی پالیسیاں بالکل برعکس ہو گئی ہیں۔ لوزان کانفرنس (منعقدہ ۲۳-۱۹۲۲ء) کے موقع پر چچرن اور کرزن میں جو جھڑپیں ہوئیں وہ تاریخ کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ اس کانفرنس میں روسی ترکوں سے زیادہ ترک تھے اور یہ واقعہ ہے کہ چچرن نے آبنائیوں پر ترکی کی حکمرانی کی حمایت کی۔

کاکیشیا، کریمیا اور یوکرین کی حفاظت اور مدافعت اسی وقت ممکن ہے جب آبنائیوں کی آمدورفت پر پابندی لگا دی جائے۔ چنانچہ بالشویک وفد کے سربراہ چچرن نے ۴ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو لوزان کانفرنس کے علاقائی اور فوجی کمیشن کو بتلایا کہ روس کا خیال ہے کہ درۂ دانیال اور آبنائے باسفورس ترکی کے علاوہ تمام ملکوں کے جنگی جہازوں کے لیے مستقل طور پر، چاہے امن کا زمانہ ہو یا جنگ کا، بند کر دی جائے۔

صلحنامہ پر ۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء کو لوزان میں تمام اتحادی ممالک اور ترکی نے دستخط کئے۔ سوویٹ نمائندے جارڈنسکی (Jordansky) نے جمہوریۂ روس کی طرف سے ۱۴ر اگست ۱۹۲۳ء کو روم میں دستخط کئے۔ ترکی نے اس صلحنامے پر دب کر دستخط کئے تھے، مگر مصطفیٰ کمال کے سامنے جو مقصد تھا وہ کبھی اوجھل نہیں ہوا، وہ ترکی کو ایک مغربی یا ایک یورپین ریاست بنانا چاہتے تھے ان کے سامنے فرانس اور برطانیہ نمونہ تھے نہ کہ روس۔ لیکن ترکی کی سیاست خارجہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، روس اور ترکی موصل کے سوال پر کچھ اور قریب آ گئے تھے، لوزان کانفرنس میں عصمت انونو اس کے لئے بہت بحث اور بہت دیر تک لڑتے رہے، مگر کرزن کا اصرار تھا کہ موصل عراق کے ماتحت رہے، چنانچہ صلحنامہ لوزان میں موصل کی تقدیر کا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا اور یہ معاملہ ترکی اور برطانیہ کی باہمی گفتگو پر چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ نو مہینے کی مقررہ مدت میں یہ مسئلہ طے نہیں ہو سکا، اس لیے اسے انجمن اقوام کی کونسل کے حوالہ کر دیا گیا اور اس نے ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو یہ نزاعی علاقہ

عراق کو دیدیا۔ اس کے دوسرے ہی دن ترکی اور سوویٹ روس میں غیر جانبداری اور دوستی کا معاہدہ ہوگیا، جس کی بعد میں، ۱۹۲۹ء میں پھر ۱۹۳۱ء، میں تجدید کی گئی اور ۱۹۳۵ء میں اس کی مدت میں دس سال کی توسیع کردی گئی۔ ۱۸ر جولائی ۱۹۳۲ء کو ترکی انجمن اقوام کا ممبر بنایا گیا۔ اس وقت مصطفیٰ کمال کا نعرہ تھا "ملک میں بھی امن اور غیر ممالک میں بھی امن"۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ترکی کا کسی ملک سے تصادم نہ ہو، وہ ہر قسم کی کشمکش سے محفوظ رہے۔ جمہوریت کی دسویں سالگرہ کے موقع پر، ۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو سرکاری اخبار "حاکیت ملیہ" نے لکھا کہ روس سوویٹ جمہوریہ سے ترکی کی دوستی لینن اور مصطفیٰ کمال کے باہمی تعلق سے پیدا ہوئی تھی اور اس کی جڑیں بہت مضبوط ہوگئی ہیں۔

ترکی میں سوویٹ روس کی دوستی کی بڑی تعریف کی گئی جب مسولینی نے اناطولیہ پر اٹلی کا دعویٰ کیا، اس کے علاوہ روس نے ترکی کو فنی امداد دی اور بغیر سود کے قرضے دئے۔ ترکی نے اس نوٹ میں اٹلی کے حملے کے خطرے کا ذکر کیا تھا، جو ۱۹۳۶ء میں برطانیہ کو بھیجا گیا تھا اور جس میں ۱۹۲۳ء کے اسٹریٹس (آبنائے) کنونشن پر نظر ثانی کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس نوٹ کے جواب میں معاہدۂ لوزان پر دستخط کرنے والے ملکوں نے مونٹرو میں ایک کانفرنس طلب کی، جس نے ۲۰ر جولائی ۱۹۳۶ء کے کنونشن کے مطابق آبنایوں پر ترکی کا حق تسلیم کرلیا۔ سوویٹ یونین نے معاہدۂ لوزان کی تصدیق نہیں کی، مگر مونٹرو کنونشن کے فیصلے پر سوویٹ یونین نے باقاعدہ دستخط کئے اور آبنایوں پر ترکی کے جملہ حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے کنونشن کی کارروائی کی تصدیق کی۔

(۲)

اس کے بعد ترکی اور روس کے تعلقات رفتہ رفتہ خراب ہونے لگے۔ ۱۹۳۹ء کے موسم بہار میں ترکی میں بڑی بے چینی تھی۔ جرمنی اور اٹلی نے چیکوسلوواکیہ اور البانیہ پر حملہ کر دیا تھا۔ ترکی، برطانیہ اور فرانس نے ان کی حفاظت کے لیے مشترکہ اعلان پر سوچ بچار شروع کیا۔

۱۲ مئی ۱۹۳۹ء کو برطانیہ کے ساتھ اور ۲۳ جون ۱۹۳۹ء کو فرانس کے ساتھ یہ مشترکہ اعلان شائع کیا گیا۔ اس درمیان میں برطانوی اور فرانسیسی وفد ماسکو گئے اور سوویٹ یونین سے گفت وشنید شروع کر دی۔ ترکی کو اس گفتگو کی کامیابی کا بالکل یقین تھا۔ ترکی، برطانیہ اور فرانس کے مشترکہ اعلان کا جرمنی اور اٹلی پر بہت خراب ردعمل ہوا، جرمن ریڈیو اور اخبارات نے ترکی کو سخت برا بھلا کہا اور دھمکیاں دیں اور اس کے بعد برطانیہ، فرانس اور روس میں باہمی گفتگو شروع ہوگئی اور ۲۳ اگست ۱۹۳۹ء کو ناجنگ معاہدہ کا اعلان سن کر دنیا دنگ رہ گئی۔

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ترکی، برطانیہ اور فرانس میں باہمی اتحاد کے معاہدہ پر گفتگو شروع ہوئی اور بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھی، اس کے مطابق طے یہ پایا تھا کہ برطانیہ اور فرانس ترکی کو فوجی سامان دیں گے اور ترکی کو روس کے خلاف جنگ کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اسی درمیان میں سوویٹ یونین نے ترکی کے وزیر خارجہ شکری سراج اوغلو کو معاہدۂ دوستی کی تکمیل کے لیے ماسکو آنے کی دعوت ملی۔ سراج اوغلو نے برطانیہ اور فرانس کے ساتھ جو کچھ طے ہوا تھا، اس کی سوویٹ یونین کو اطلاع کی اور معاہدہ پر دستخط کرنے سے قبل دونوں ملکوں کو بتلایا کہ روس سے بات چیت کرنے کے لیے وہ ماسکو جا رہے ہیں، نیز انھوں نے یہ بھی کہا کہ اپنے ملک کے مفاد میں دونوں فریقوں سے تعلقات کے بارے میں عجلت میں کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتے۔

سراج اوغلو ۲۶ ستمبر کو ماسکو پہنچے اور ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو واپس آگئے۔ ابتدائی گفتگو بہت کامیاب رہی، لیکن معاہدہ پر دستخط سے قبل برطانیہ کے ساتھ جو سمجھوتہ ہوا تھا، روس نے اس میں بعض ترمیموں کا مطالبہ کیا۔ ترکی نے برطانیہ اور فرانس سے ان ترمیموں پر رضامندی کی درخواست کی، جو طویل بحث وگفتگو کے بعد منظور کر لی گئیں۔ ترکی کو اطمینان ہو گیا کہ سوویٹ یونین سے معاہدہ کی تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں، مگر سوویٹ یونین نے ایک نیا مطالبہ کر دیا اور معلوم ہوا کہ ابھی بعض مسئلوں پر مزید گفتگو باقی ہے۔ یہ نئی صورت حال ترکی کے وزیر خارجہ سراج اوغلو کے لیے

بالکل غیر متوقع تھی، اس لیے وہ ماسکو سے واپس آگئے اور ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو انگلستان ترکی، برطانیہ اور فرانس کے درمیان معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ سرکاری تقریروں سے معلوم ہوا کہ اس معاہدے سے سوویٹ یونین ناخوش ہو گیا ہے۔

جرمنی نے فرانس پر قبضے کے زمانے میں ایسی فرانسیسی دستاویزیں شائع کیں، جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ترکی نے روس کے خلاف فرانس اور برطانیہ کی مدد کی ہے، اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ ترکی اور روس میں لڑائی چھڑ جائے گی اور رومانیہ کی طرح ترکی مجبور ہو کر جرمنی سے مل جائے گا اور روس کا متوقع حملہ ٹل جائے گا۔ ترکی نے اس صورت حال کا سکون اور حکمت عملی سے مقابلہ کیا اور روس کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ دستاویزات فرضی ہیں۔ نیز جرمنی کی توقعات کے بالکل خلاف ترکی نازی حکومت کی طرف ذرا بھی نہیں جھکا۔

۱۹۴۱ء کے موسم بہار میں جرمنی نے بلقان کے علاقے پر حملہ کیا اور یونان اور یوگوسلاویہ پر اس کا قبضہ ہو گیا، اس طرح ترکی، خشکی اور سمندر دونوں طرف سے جرمنی اور اٹلی کی فوجوں سے گھر گیا۔ اپریل ۱۹۴۱ء میں ترکی نے اپنی تمام فوجوں کو، جن میں پانچ لاکھ فوجی شامل تھے، تھریس اور ایجین کے سواحل پر متعین کر دیا۔ رومانیہ پر قبضہ کے بعد، سوویٹ جرمن تعلقات میں، جو کچھ عرصے سے پُرسکون تھے، ۱۹۴۱ء کے موسم سرما میں نئی سرگرمیاں پیدا ہوئیں، فروری اور مارچ ۱۹۴۱ء میں سوویٹ اور بلغاریہ کے تعلقات میں بھی زندگی پیدا ہو گئی، کچھ سوویٹ سیاسی شدا سرکاری حیثیت میں بلغاریہ گئے تو وہاں ترکی کے خلاف مختلف قسم کی افواہیں پھیل گئیں، مختصر یہ کہ ترکی پر حملہ کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔

اس نازک موقع پر جرمنی نے ظاہر کیا کہ وہ ترکی پر حملہ نہیں کرے گا اور اس کے بعد ناجنگ معاہدہ کی پیش کش کی۔ ترکی نے اس شرط پر اس پیش کش کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ برطانیہ سے جو معاہدہ ہوا ہے، اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جون میں جرمنی سے ناجنگ معاہدہ کی گفتگو شروع ہوئی اور جولائی ۱۹۴۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

سوویٹ یونین پر جرمنی کے حملے اور افریقہ میں محوری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے بعد ترکی نے جرمنی کو راستہ دینے سے انکار کر دیا، مونٹرو کنونشن کے سرپرست کی حیثیت سے اس نے ایک طرف اطالوی بحریہ کو بحیرۂ روم سے بحر اسود جانے کی اجازت نہیں دی اور دوسری طرف اچانک حملے کے خطرے کی بنا پر اپنی سرحدوں پر تمام فوجیں متعین کر دیں۔

دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی برسوں میں سوویٹ یونین اور ترکی کے باہمی تعلقات عام طور پر معمول پر رہے، سوویٹ یونین چاہتا تھا کہ ترکی غیر جانبدار رہے اور اس کی اس پالیسی اور عمل کی تعریف کی۔ ۱۰ اگست ۱۹۴۱ء کو سوویٹ یونین نے ترکی کو ایک نوٹ دیا، جس پر برطانیہ کے بھی دستخط تھے، اس میں مونٹرو کنونشن سے مکمل اتفاق اور وفاداری کا یقین دلایا گیا تھا۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں سوویٹ حکومت نے اپنے سفیر متعینہ انقرہ کے ذریعہ حکومت ترکی کو ایک پیغام دیا، جس میں ترکی کے طرز عمل پر اطمینان ظاہر کیا گیا تھا۔ ۱۹۴۳ء کے شروع میں ونسٹن چرچل کاسابلانکا میں صدر روزولٹ سے مل کر اور ان سے پوری مفاہمت کے بعد عدنہ پہنچے تو انھوں نے بھی ترکی کے موقف کی تعریف کی۔ اس وقت جرمنی اور اٹلی کا پورے یورپ پر کنٹرول تھا، مگر شرق وسطیٰ میں ابھی گھسنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ۱۹۴۳ء کے اواخر میں تہران میں طے پایا کہ ترکی کو بھی جنگ میں شریک ہونا چاہیے اور اس فیصلہ کی اسے اطلاع کر دی گئی اور عصمت انونو کو روزولٹ اور برطانوی وزیر اعظم سے قاہرہ میں گفتگو کے لیے دعوت دی گئی۔ ترکی نے ایسے سامان جنگ کا مطالبہ کیا جس سے وہ جرمنی اور بلغاریہ کے متوقع حملے کا جواب دے سکے، برطانوی فوجی مشن انقرہ گیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ ترکی کو ضروری سامان دینے سے قاصر ہیں۔

چرچل نے ۲۴ مئی ۱۹۴۴ء کو ایک تقریر میں ترکی پر الزام لگایا کہ وہ خطرے اور احتیاط کے معاملہ میں مبالغے سے کام لے رہا ہے اور بہت زیادہ سامان جنگ کا مطالبہ کر رہا ہے، مگر جیوفرے لیوس کے بقول ترکی کی احتیاط حق بجانب تھی۔ اسے واقعی صورت حال کا مقابلہ

کرنے کے لیے جدید قسم کے ہتھیاروں کی شدید ضرورت تھی۔

۱۴ جون ۱۹۴۲ء کو اعلان کیا گیا کہ ترکی نے ایک جرمن بحری امدادی فوج کو درۂ دانیال سے گذرنے کی اجازت نہیں دی۔ دوسرے دن وزیر خارجہ نعمان مینیمنجی اوغلو (Numan Menemencioglu) کو جو ترکی زمانۂ جنگ کی خارجہ پالیسی کے ذمہ دار تھے، سبکدوش کر دیا گیا اور ان کی جگہ وزیر اعلیٰ سکرو سراج اوغلو اور بعد میں حسن ساکا کو وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔

اگست ۱۹۴۴ء میں جرمنی سے ترکی کے سفارتی اور معاشی تعلقات منقطع ہو گئے۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں جب بلغاریہ نے سرخ فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو استنبول اور بحر اسود کے شہروں میں بڑے اہتمام کے ساتھ بلیک آؤٹ کے قاعدوں پر عمل ہونے لگا۔ اس زمانے میں استنبول میں یہ مذاق بہت عام تھا کہ روسی سفیر نے ترکی کے وزیر خارجہ سے کہا کہ "آپ خواہ مخواہ کے لیے بلیک آؤٹ سے عوام کی زحمتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ہم اگر حملہ کریں گے تو دن کے وقت کریں گے۔"

۲۳ فروری ۱۹۴۵ء کو ترکی نے جرمنی اور جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، مگر مارچ تک اس پر عمل ملتوی رکھا گیا۔ یہ اعلان اس فیصلے کی وجہ سے کرنا پڑا جس میں طے پایا تھا کہ سین فرانسسکو میں اقوام متحدہ کی ہونے والی کانفرنس میں صرف انہیں ملکوں کو بلایا جائے گا، جو محوری طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ کریں گی۔

ترکی اور روس کے معاہدۂ دوستی کی، جو ۱۹۲۵ء میں کیا گیا تھا، ۱۹۳۵ء میں مزید دس سال کے لیے تجدید کی گئی تھی، مگر ۱۹ مارچ ۱۹۴۵ء کو سوویٹ حکومت نے نوٹس دیا کہ دوستی اور ناجنگ معاہدہ کی مدت میں، جو اگلے نومبر میں ختم ہونے والی ہے، مزید توسیع نہیں کی جائے گی۔ روس نے تین بڑوں کی کانفرنس کے ایجنڈے میں جو یالٹا کے مقام پر فروری ۱۹۴۵ء میں ہونے والی تھی، ترکی آبنایوں کا مسئلہ شامل کرا دیا اور اسٹالن نے اعلان کیا کہ مونٹرو کے کنونشن میں روس کے ساتھ تعصب سے کام لیا گیا ہے، انھوں نے تجویز کیا کہ اس میں الیتہ ترمیم

کرنے کی ضرورت ہے کہ روس کے فوجی جہاز بھجوانے میں — چاہے جنگ کا زمانہ ہو یا امن کا — ترکی آبنائوں سے آزادی کے ساتھ گذر سکیں۔ جولائی کے شروع میں ترکی وزیراعظم شکرو سراج اوغلو نے امریکا کے سفیر ایڈون، سی، ولسن سے کہا کہ: "ہم روس سے پوری سرگرمی اور جوش کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتے ہیں اور آبنائوں کے کنونشن کے فیصلوں پر نظر ثانی کے لیے گفتگو کرنے پر ہم پوری طرح تیار ہیں۔ آبنائوں سے گذرنے کے معاملہ میں ہمارے مقابلے میں آبنائوں کے قرب وجوار کے ممالک کو زیادہ دلچسپی ہے، ہم تو صرف اپنی سرزمین کا تحفظ چاہتے ہیں، ہم سوویٹ غلبہ کو تسلیم نہیں کریں گے۔" جولائی ۱۹۴۵ء میں پوٹس ڈم کانفرنس میں سوویٹ نمائندے نے اس مسئلے کو دوبارہ اٹھایا تو چرچل نے جواب دیا کہ ترکی نہ تو اس پر تیار ہوگا کہ آبنائوں کے کنارے سوویٹ روس اپنے اڈے قائم کرے اور نہ اس پر کہ آبنائوں پر صرف روس کا کنٹرول رہے۔ چرچل نے جہاں ترکی کی حمایت کی وہاں اس سے بھی اتفاق کیا کہ مونٹرو کنونشن کی نظر ثانی کے لیے تین بڑے ممالک میں سے ہر ایک ترکی سے براہ راست بات کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۸ راگست ۱۹۴۶ء کو روس نے مطالبہ کیا کہ مونٹرو کنونشن پر ایک ایسی کانفرنس میں نظر ثانی کی جائے جس میں ترکی اور صرف بحر اسود کے ممالک اور روس شریک ہوں، نیز سوویٹ یونین کو آبنائوں کی مدافعت کی ذمہ داری میں شریک کیا جائے۔ مگر ترکی نے سوویٹ روس کے مطالبے کو ماننے سے قطعی انکار کردیا۔

مارچ ۱۹۴۷ء کو ٹرومن ڈاکٹرائن (TRUMAN DOCTRINE) کے تحت ترکی اور یونان کو امریکی امداد جاری کی گئی، اس امداد کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ دونوں ملک سرخ خطرے کا مقابلہ کرسکیں۔ ۱۹۴۹ء میں جرمنی کی وزارت خارجہ کے خفیہ معاہدے شائع کیے گئے، جن سے معلوم ہوا کہ جرمنی اور روس کے درمیان معاہدہ ہوا تھا کہ سوویٹ یونین کو ترکی آبنائوں پر پورا کنٹرول حاصل ہوگا۔

(۳)

کمال کارپات نے لکھا ہے کہ ترکی کی کمیونسٹ تحریک اور اس کے بارے میں سرکاری طرز عمل کے

رجحانات ترکی اور سودیٹ روس کے تعلقات میں نظر آتے ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے شروع میں مصطفیٰ کمال کی اجازت سے محمود جلال بایار اور تیرہ دوسرے فوجیوں نے [illegible] (سبز فوج) قائم کی۔ اس فوج کے رہنما جرکس اِتہم سوشلسٹ نظریات سے متاثر تھے اور انھوں نے سودیٹ روس کے طرز پر ترکی میں مزدوروں اور فوجیوں کی کونسلوں کے قیام میں مدد دی۔ جب جرکس اِتہم نے فوجی خود مختاری کی تحریک شروع کی تو انکرا کے ارباب اختیار نے اس کی مخالفت کی اور مصطفیٰ کمال کے عقیدت مندوں نے اسے الگ کر دیا، ۱۹۲۰ء ہی میں اشتراک خلق پارٹی قائم ہوئی تو اسے عام طور پر سبز فوج ہی کی ایک شاخ سمجھا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں حکومت نے اس پارٹی کو ختم کر دیا۔ ۱۹۲۰ء ہی میں عارف عروج اور صالح ذکی نے غیر قانونی طور پر ایک کمیونسٹ پارٹی قائم کی، جو سلطان اور مصطفیٰ کمال کے خلاف تھی، اس کے متعدد اخبارات بھی تھے، مثلاً ایمک (مزدور) اور اینی دنیا (نئی دنیا)، ۱۹۲۲ء میں جب ترکی میں کمیونسٹ سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کی گئیں تو یہ ختم ہو گئی مگر مزدوروں اور فوجیوں کی کونسلوں کی شدت میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے خود مصطفیٰ کمال نے اپنے قریبی دوستوں کی ایک کمیونسٹ پارٹی قائم کرنے کے لیے خفیہ ہدایت کی۔ اس پارٹی کے نقطۂ نظر کے مطابق کمیونسٹ ترکی قوم کی فلاح و بہبود کے منصوبوں کی تکمیل کا ایک ذریعہ تھے اور قومیت ان کا اعلیٰ مقصد تھی۔ جلد ہی کونسلوں نے اس سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دیا اور اس پر الزام لگایا کہ اس کی پشت پر ترکی کے سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں جو جفاکش عوام کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔

ترکی میں صحیح معنی میں کمیونسٹ پارٹی وہ تھی جو ۲۲ ستمبر ۱۹۱۹ء کو ترکی کے مزدوروں اور کسانوں کی سوشلسٹ پارٹی شفیق حسنو اور اتہم نجات کی رہنمائی میں استنبول میں قائم ہوئی تھی۔ مارکس اور لینن کے سماجی اور سیاسی نظریات اس پارٹی کا مطمح نظر تھے۔

ترکی کے باہر کمیونسٹ تحریک کے رہنما مصطفیٰ صوفی تھے۔ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے اپنا صدر دفتر باکو میں منتقل کیا، جہاں سے انھوں نے نئی دنیا شائع کیا اور ۱۹۲۰ء میں وہ مشرقی عوامی کانگریس کے پریزیڈیم کے ممبر تھے۔ پارٹی کی سرگرمیوں کو منظم کرنے کی غرض سے مصطفیٰ صوفی اور

ن کے سولہ پیروکار ترکی میں داخل ہوئے تو طرابزون میں عوام نے انھیں مار ڈالا۔ مزدور کونسلوں سے تعلقات میں توسیع ہوئی تو ترکی حکومت نے گرفتار کمیونسٹوں کی رہائی اور مصطفیٰ صوفی کے قاتلوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۲۵ء میں جب لا اینڈ آرڈر کے قیام کے لیے قانون نافذ ہوا تو شفیق حسنو کی پارٹی انڈر گراؤنڈ چلی گئی، مگر پمفلٹ اور ہینڈ بل اور خفیہ تنظیموں کے ذریعہ اس کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ ساتھ ہی ساتھ گرفتاریوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۹۳۲ء میں ناظم حکمت کو ان کی انقلابی نظموں کی بنا پر گرفتار کیا گیا، ۱۹۳۸ء میں انھیں دوبارہ گرفتار کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں انھیں رہا کیا گیا اور ۱۹۵۱ء میں انھوں نے بھاگ کر سوویٹ یونین میں پناہ لی، جہاں ۱۹۶۰ء کے عشرہ میں وفات پائی۔

سیاسی آزادی، خصوصاً ۱۹۴۶ء میں ایسوسی ایشن لا، میں ترمیم کے بعد ۱۹ رجون ۱۹۴۶ء کو شفیق حسنو نے ترکی مزدوروں اور کسانوں کی سوشلسٹ پارٹی کو دوبارہ قائم کیا، ۱۴ رمئی ۱۹۴۶ء کو الیست عادل مستجاب لی اوغلو نے ترکی سوشلسٹ پارٹی قائم کی، جو نظریے کے اعتبار سے مارکسی تھی، لیکن عملاً روایتی سوشلسٹ پارٹیوں سے ملتی جلتی تھی۔ ۱۶ ردسمبر ۱۹۴۶ء کو مارشل لا کے تحت شفیق حسنو اور الیست عادل کی پارٹیوں پر پابندی عائد کر دی گئی، اور ان کے رہنماؤں کا مقدمہ ایک طویل عرصے کے بعد ۱۹۴۸ء میں ختم ہوا، شفیق حسنو اور پچپن دوسرے رہنماؤں کو قید کی سزا ملی، الیست عادل بری کر دیے گئے اور انھیں اپنی پارٹی کی تنظیم کی اجازت مل گئی، ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں اس پارٹی کو استنبول میں ۱۷۵،۰۰۰ ووٹوں میں سے زیادہ سے زیادہ ۲۲۰۰ ووٹ ملے، ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۸ء کی درمیانی مدت میں دوسرے کمیونسٹ گرفتار ہوئے اور سزا ملی۔

(۴)

جنگ کے بعد سوویٹ روس کے مطالبوں کی مزاحمت میں ترکی کو بڑا سہارا ملا جب امریکا نے اپنی بحری طاقت کا مشرقی بحر روم میں مظاہرہ کیا۔ ترکی مغربی اتحاد سے اور قریب آگیا، روس

نے ترکی کے ردعمل کا غلط اندازہ کیا اور مئی ۱۹۵۳ء میں اسٹالن کی وفات کے فوراً بعد سوویٹ حکومت نے سرکاری طور پر ۱۹۴۵ء کے مطالبہ کو واپس لے لیا۔

یکم اگست ۱۹۵۰ء کو ترکی نے نیٹو (NATO) میں شرکت کی درخواست کی، ستمبر میں نیٹو کی کونسل کی میٹنگ ہوئی تو ناروے اور ڈنمارک نے ترکی اور یونان کی شرکت پر شدید اعتراض کیا، برطانوی اور فرانسیسی حکومتیں، بالخصوص ثانی الذکر، ترکی کی شرکت کو اس لیے پسند نہیں کرتی تھیں کہ ایک ایسے ملک کی ضمانت کرنا جو روس کی دہلیز سے ملا ہو، مصلحت کے خلاف تھا اور اس کے لیے جواز یہ تلاش کیا گیا کہ ترکی شمالی اٹلانٹک ممالک میں کسی لحاظ سے شامل نہیں ہے۔ ۱۸ر فروری ۱۹۵۲ء کو ترکی کو بالآخر نیٹو کا ممبر بنالیا گیا اور اسے مغربی طاقتوں سے اس کی ضمانت مل گئی کہ اگر کسی نے اس پر حملہ کیا تو اس کی مدافعت کی جائے گی، یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب ترکی نے کوریا کی جنگ میں اپنی بیس ہزار کی فوج بھیج کر اپنی مغرب دوستی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

ازمیر کی ترکی بندرگاہ کو نیٹو کا جنوب مشرقی لینڈ کمانڈ کے صدر دفتر کے لیے انتخاب کیا گیا، ۹ر اگست ۱۹۵۴ء کو بلیڈ میں ترکی، یونان اور یگوسلاویہ کے درمیان فوجی معاہدہ ہوا، اسی سال ۲ر اپریل کو ترکی اور پاکستان میں باہمی دوستی کا معاہدہ ہوا تھا، اس نے ترکی عراق کے معاہدۂ ۱۹۵۵ء کے لئے جو معاہدۂ بغداد کے نام سے مشہور ہوا، راہ ہموار کی۔ ان تمام معاہدوں کی پشت پر امریکا تھا، مگر جب اس میں برطانیہ، پاکستان اور ایران شامل ہوگئے، تو وہ اس میں شریک نہیں ہوا، اگرچہ بعد میں اس نے نیٹو کی مختلف کمیٹیوں کی ممبری قبول کرلی۔

اسٹالن کی وفات کے فوراً بعد، ۳۰ر مئی ۱۹۵۳ء کو روس نے اپنے ۱۹۴۵ء کے مطالبے واپس لے لئے اور ترکی سے اچھے تعلقات کی خواہش کی، اس وقت سے سوویٹ یونین اور دوسرے کمیونسٹ ممالک ترکی حکومت کو اپنا طرفدار بنانے کی برابر کوشش میں ہیں۔ چنانچہ سوویٹ یونین نے ترکی کی صنعتی ترقی کے لیے فنی اور مالی امداد کی پیش کش کی، شروع میں تو ترکی نے اس طرف توجہ نہیں کی، ۱۹۶۰ء میں ترکی وزیراعظم مندریس نے ماسکو جانے کا فیصلہ کیا، مگر ۲۷ر مئی ۱۹۶۰ء

کو فوج نے ان کو اقتدار سے محروم کر دیا، جس کی وجہ سے شمال کے ہمسایے سے اچھے تعلقات پیدا کرنے کی ذمہ داری ان کے جانشین پر آپڑی۔

۱۹۶۴ء میں روس اور ترکی کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ پر دستخط ہوئے، جس میں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں مزید اضافے کئے گئے۔ بعض صنعتی منصوبوں کے لئے روس نے قرضے دئے اور اپنے ماہر کارندے بھیجے، سب سے بڑا قدم مارچ ۱۹۶۸ء میں اٹھایا گیا اور ایک معاہدہ کے مطابق ترکی کے مختلف علاقوں میں دو سو ملین ڈالر کے خرچ سے روس صنعتی کارخانے قائم کرے گا، جن سے مال کی برآمد ۱۹۷۲ء میں شروع ہو جائے گی۔ ترکی وزیراعظم اورگپ لو (Urguplu) ۱۹۶۶ء میں ماسکو گئے اور روس کے وزیراعظم کوسی گن ۱۹۶۶ء میں انقرہ آئے۔ موجودہ ترکی وزیراعظم دیمرل بھی ستمبر ۱۹۶۷ء میں ماسکو گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان ملاقاتوں سے سائپرس کے معاملے میں ترکی کو روس سے تقویت پہنچی ہے، لیکن ترکی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ روس میکاریوس کو جنگی سامان سے مدد کر رہا ہے، اس لیے وہ امریکا کی دوستی اور مالی امداد کو جاری رکھنا چاہتا ہے۔

ترکی نے اپنا دوسرا پنج سالہ منصوبہ شروع کیا ہے، جس میں بھاری صنعتوں کی ترقی پر زور دیا گیا ہے اور اس کی ریڑھ کی ہڈی فولاد اور بجلی ہے۔ اس منصوبہ میں جو سرمایہ لگایا جائے گا اس کا ۴۳ فیصدی صنعت کاری پر صرف ہوگا۔ منصوبے کی کامیابی کے لیے ترکی حکومت نے روس سے متعدد صنعتی منصوبوں کے قیام میں مدد کے لیے درخواست کی ہے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۷ء کو دونوں ملکوں کے درمیان معاہدہ ہوا ہے کہ سوویٹ روس سات بڑے کارخانوں کی تعمیر و ترقی میں شرکت کرے گا: فولاد کا کارخانہ، تیل کی صفائی کا کارخانہ، الومنیم کا کارخانہ اور چار دوسرے منصوبے۔ مشینوں کی خریداری اور ماہرین کی خدمات کے لیے سوویٹ یونین نے آسان شرائط پر قرضے منظور کئے جو روئی، اون، تمباکو، پھل اور نئی قومی صنعت کی پیداوار کے ذریعہ ادا کیا جائے گا، اس طرح ترکی نے نہ صرف یہ کہ اپنے بیرونی زر مبادلہ کو بچالیا، جس کی اس کے

یہاں کافی کمی تھی، بلکہ اپنے مال کی کھپت کے لیے وسیع بازار پیدا کرلیا۔

ان نئے منصوبوں کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ المونیم اور فولاد کے کارخانوں کے قیام کے بعد ترکی درآمدی ملک کے بجائے المونیم اور فولاد کے معاملے میں برآمدی ملک بن جائے گا اور ہر سال کوئی پانچ لاکھ ٹن لوہا اور فولاد برآمد کرسکے گا۔ اسی طرح جب تیل صاف کرنے کا کارخانہ کام کرنے لگے گا تو ترکی پٹرولیم سے متعلق ضمنی اشیاء کے معاملے میں بیرونی ممالک کا محتاج نہیں رہے گا اور بیرونی زرمبادلہ کو خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، ترکی اور روس کے باہمی تعاون سے بیرونی تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ ابھی حال میں سوویٹ روس اور ترکی کے درمیان براہ راست ریل اور ہوائی سفر اور ٹیلیفونی رسل و رسائل قائم ہوئے ہیں اور سرحدی دریائے اغوریان پر ڈیم کی مشترک تعمیر کا سمجھوتہ ہوا۔

دو ملکوں کے درمیان، جہاں دو مختلف سماجی نظام قائم ہوں، پرامن بقائے باہم کے اصول پر ۱۹۲۰ء کے عشرہ میں لینن اور مصطفیٰ کمال عمل کرچکے تھے۔ ترکی اور سوویٹ یونین کے ہمسائگی کے اچھے تعلقات کی بنیاد اعتماد، آزادی اور علاقائی سالمیت کے باہمی احترام اور گھریلو معاملات میں عدم مداخلت کے اصول پر تھی۔ یہ سوویٹ روس تھا، جس نے اس پالیسی کی خلاف ورزی کی۔ اگر سوویٹ یونین پھر سے اس پر عمل کرنا چاہتا ہے تو مذکورہ بالا اصولوں کے مطابق ترکی اس کے لیے بالکل تیار ہے۔

عتیق صدیقی

واگست

(عتیق صدیقی صاحب ایک خاص رنگ میں اپنی زندگی کے تجربات قلمبند کر رہے ہیں، اس کا ایک حصہ انھوں نے ماہنامہ جامعہ میں اشاعت کے لئے عنایت کیا ہے، ہم اس کے وہ ٹکڑے جو عام دلچسپی کے ہیں شائع کر رہے ہیں ——————— "مدیر")

دن کے دو بجے تھے۔ میں دفتر میں تنہا بیٹھا سہ پہر کو نشر کیا جانے والا پروگرام مرتب کر رہا تھا کہ آفت ناگہانی کی طرح مجید کمرے میں داخل ہوئے۔ ۲۸-۱۹۲۷ء میں بہ سلسلہ تعلیم یہ لکھنؤ میں تھے، اور وہیں پہلی بار ہم ملے تھے۔ ملک کے اور نوجوانوں کی طرح انھیں بھی سیاست سے خاصی دلچسپی تھی، لیکن بیشتر طالب علموں کی طرح عملی سیاست سے ان کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ ۱۹۲۹ء کے اوایل میں اینگلو ایرانین آیل کمپنی میں انھیں ملازمت مل گئی اور وہ ایران چلے گئے۔ میرے تہران پہنچنے کے تیسرے یا چوتھے دن کتابوں کی ایک دوکان میں ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں اس وقت تک ایران میں "غریبِ شہر" تھا، اور اپنے دفتری ماحول سے بھی مانوس نہ ہوا تھا، اس لئے یہ اتفاقی ملاقات خداداد نعمت معلوم ہوئی، اور لکھنؤ کی شناسائی نے جلد ہی دوستی کا رنگ اختیار کر لیا۔ مجید کا دفتر تو آبادان میں تھا، لیکن دسویں پندرھویں انھیں تہران بھی آنا پڑتا۔ اس طرح مہینے میں آٹھ دس دن وہ تہران ہی میں رہتے، اور ان دنوں میں، دفتری اوقات کے علاوہ بیشتر

وقت ہم ایک ساتھ گزارتے۔

"آج تم بہت برے وقت پر آئے ہو مجید" صاحب سلامت کے بعد میں نے کہا "آج بہت کام کرنا ہے مجھے"

"کیے جاؤ کام" مجید نے لاپروائی سے کہا "تمہیں بیل کی طرح کام میں جُتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی"

میں الماری سے فرمائشی گانوں کے وہ ری کارڈ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا رہا، جو آج کے پروگرام میں سنانے تھے، اور مجید ٹہل ٹہل کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ کبھی کبھی اس کی کسی بات کا میں جواب بھی دے دیتا۔ ٹہلتے ٹہلتے ایک بڑے سے کلینڈر کے سامنے وہ کھڑا ہو گیا۔

"آج نویں اگست ہے" تاریخ کے خانے میں انگلی رکھتے ہوئے مجید نے کہا "۹ اگست ۱۹۴۲ کی تیسری سال گرہ!"

"ہاں آج ۹ اگست ہے" چند لمحوں تک مجید کی بات پر غور کرنے کے بعد میں نے جواب دیا "تم ٹھیک کہتے ہو آج ۹ اگست ۴۲ ۱۹ کی تیسری سال گرہ ہے"۔

"میں ہمیشہ ٹھیک بات کہتا ہوں" مجید نے سینہ تان کر کہا "اس یادگار دن کو تو منانا چاہئے"

"معلوم ہوتا ہے کہ آج تمہاری قومیت کی رگ یکایک بیدار ہو گئی ہے۔"

"میری قومیت کی رگ خوابیدہ کبھی نہیں رہتی" اس نے فخریہ لہجے میں جواب دیا "میری تجویز ہے کہ آج شام کو تم میرے ہوٹل آجاؤ، وہیں اطمینان سے ۹ اگست منائیں گے۔ اچھا میں جاتا ہوں، مجھے بھی کچھ ضروری کام ہیں۔"

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کمرے سے نکل گیا۔

"آؤ" مجھے دیکھتے ہی مجید نے کہا۔ آج خلاف معمول وہ ہندستانی لباس میں، ہندستانی وضع سے فرش پر ٹانگیں پھیلائے، تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔

"آج تو تم بالکل نئے آدمی معلوم ہو رہے ہو۔" میں نے بھی فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ابھی بیٹھو نہیں" تحکمانہ لہجے میں مجید نے کہا "آج تم بھی اس لعنت کو اتار پھینکو، غسل خانے میں جاؤ وہاں کرتا پاجامہ تمہارے لیے بھی رکھا ہے، آج تم بھی نئے آدمی بن جاؤ"

مجھے یہ ساری باتیں کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں، لیکن ان میں تصنع یا بناوٹ کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" میں نے کچھ حیرانی سے سوال کیا۔

"۹ اگست ہو گیا ہے" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا، پھر شاعرانہ انداز میں کہنا شروع کیا "کتنی رومانیت، کتنی جاذبیت کتنی کشش ہے اس تاریخ میں۔ حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد دنیا کی تاریخ میں یہی دن ۱۹۴۱ بار آچکا تھا، لیکن ۱۹۴۲ کے عیسوی سال کی نویں اگست کا دن ہماری ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے۔ ہمارے ملک نے ـــــ دنیا کے ایک غلام اور مجبور و محکوم ملک نے ـــــ دنیا کی وسیع ترین سلطنت کی مالک قوم کو للکار کر کہا 'ہندستان چھوڑ دو'، ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم آزاد ہوں گے، ہم نے عزم کیا ہے کہ اپنی غلامی کی بیڑیاں کاٹ کر پھینک دیں گے۔ کتنی رومانیت، کتنی جاذبیت، کتنی کشش ہے ۹ اگست کی تاریخ میں"

مجید کی باتیں میں دل چسپی سے سن رہا تھا۔ یوں تو ساغر و مینا کو دیکھتے ہی وہ ہمیشہ باغ و بہار بن جاتا تھا اور اس کی گل افشانیِ گفتار قابل دید و شنید ہوتی تھی۔ لیکن آج اس پر سرخوشی و سرمستی سے زیادہ وجد کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کوہ دماوند کی بلند و بالا چوٹیوں کی اوٹ سے ابھرتے ہوئے چاند نے، جس کی ہلکی و خنک روشنی براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، اس کے جام کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

"۹ اگست ۱۹۴۲ء کو میں ہندستان میں نہیں تھا" گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے مجید نے کہا "میرے پیروں میں تو ملازمت کی بیڑیاں پڑی تھیں، اور میں وطن سے ہزاروں میل دور تھا، لیکن میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ اسی ۹ اگست کو:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق"

"نوجوان ہی نہیں جو من چلے اور عاشق کے پتلے ہوتے ہیں، بلکہ ہندستان کے بچے اور بوڑھے بھی اس آتش نمرود میں بے خطر کود پڑے تھے۔ مجھے لوگوں نے بتلایا ہے کہ اس وقت ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اک آگ سی لگی تھی۔ بیسویں صدی کی دوسری جنگ عظیم بھی ان دنوں شباب پر تھی، اور اپنے آغاز کا تیسرا سال ختم کر کے ایک فیصلہ کن منزل میں داخل ہونے والی تھی۔ مغرب میں جرمنی اور اٹلی کی فاشسٹ فوجیں ایک طرف افریقہ کو اور دوسری طرف مشرقی یورپ اور سوویٹ روس کو تاراج کرتی ہوئی مغربی ایشیا کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ مشرق میں فاشسٹ جاپان کی فوجیں دکھنی پوربی ایشیا کو روندتی ہوئی ہندستان کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں ـــ اور ہندستان میں داخلی بغاوت کے طوفان اٹھ رہے تھے۔ دکھنی پوربی ایشیا اور ہندستان کو فاشستی درندوں سے بچانے کے لیے ہندستان کی سرزمین برطانوی اور امریکی فوجیوں سے پٹی پڑی تھی۔ ان ایشیائی ملکوں کو بچانا اس لئے ضرور تھا کہ برطانیہ کی سامراجی سرحدیں رودبار انگلستان سے نہیں بلکہ ہندستان اور دکھنی پوربی ایشیا سے شروع ہوتی ہیں۔ ایشیا کے یہ حصے اگر نکل جائیں تو انگلستان کی بھی خیر نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ برطانوی فوجیں جو ہندستان ہی کی حفاظت کے لئے ہندستان میں ڈیرے ڈالے تھیں، نہتے ہندستانیوں کے مقابلے میں صف آرا کر دی گئی تھیں لیکن "ہندستان چھوڑ دو" کے طوفان کو وہ بھی نہ روک سکیں۔ ملک کے گوشے گوشے سے "ہندستان چھوڑ دو" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، اور ان کی صدائے بازگشت انگلستان اور امریکا کے سرکاری ایوانوں میں بھی گونج رہی تھیں۔ برطانوی سپاہی رات کو "ہندستان چھوڑ دو" کے خواب دیکھتے تھے اور نیند میں بھی وہ اسی کی صدائیں سنتے تھے۔"

مجید بولتے بولتے یکایک خاموش ہو گیا، جیسے تھک گیا ہو یا اس کی قوت گویائی اس کے جذبات کی رو کا ساتھ دینے سے قاصر ہو۔ اس کے چہرے کی تمتماہٹ، آنکھوں کی سرخی، اور رگوں کا تناؤ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔ آنکھیں بند کر کے تکیہ کے سہارے وہ نیم دراز ہو گیا۔ میں بھی اس کے سینے کا سہارا لے کر لیٹ گیا۔ کمرے میں ایسا مکمل سکوت طاری

تھا کہ مجید کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

"یار یہ بتاؤ" کچھ دیر بعد لیٹے ہی لیٹے اس نے سوال کیا "تم تو کانگرسی تھے، تم اس آگ میں کیوں نہیں کودے؟"

اس بار مجید کی آواز میں نرمی و گھلاوٹ تھی، جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا اعصابی تناؤ کچھ کم ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے اس سوال نے، جو میرے لئے بالکل غیر متوقع تھا، میری دکھتی ہوئی رگ کو اس طرح دبوچا تھا، جیسے شکاری کتا کسی خرگوش کو گردن سے جا لیتا ہے۔

"تمہارا سوال درست ہے" تلملا کر میں نے جواب دیا "میں آج بھی کانگرسی ہوں"

"لیکن تمہارے اس جواب میں کچھ تضاد ضرور ہے" مجید نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اس تضاد کو سمجھنے کے لیے تمہیں کانگرس کی تاریخ پر نظر ڈالنی ہوگی" میں نے جواب دیا "تمہیں یہ بات ذہن نشین کرنی ہوگی کہ کانگرس خود مجموعۂ اضداد ہے"

"یہ تو فلسفۂ تاریخ کا بالکل نیا نظریہ تم پیش کر رہے ہو" مجید نے کچھ ناک بھوں چڑھا کر کہا "تم اپنی بزدلی کو اس نئے فلسفے سے شاید ڈھکنے کی کوشش کر رہے ہو"

"تمہارا یہ بے رحمانہ خیال صحیح نہیں ہے" میری آواز غیر ارادی طور پر کچھ تیز ہو گئی۔ "اپنی قوم پرستی کا اظہار کر کے میری قوم پرستی کی توہین کرنے کا جواز تم پیدا نہیں کر سکتے"۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو" مجید نے کچھ نرم لہجے میں سوال کیا "کانگرس کے مجموعہ اضداد ہونے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"کانگرس اپنے ابتدائی دور ہی سے سیاسی پارٹی سے زیادہ سیاسی پلیٹ فارم رہی ہے" میں نے اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی۔ "۱۹۲۴ء تک اس میں صرف دو متضاد عناصر رہے۔ ایک متحدہ قومیت کا ماننے والا تھا، اور دوسرا ہندو راشٹر کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ۱۹۲۴ء کے بعد اس میں کم از کم دو اور متضاد عناصر شامل ہو گئے ——— ہندستانی سرمایہ داری کے ایجنٹ اور کمیونسٹ، جو ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ ان تمام متضاد عناصر کو انگریز دشمنی کے مشترک جذبے نے کانگرس

کے دھاگے میں پرو دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے کو کانگرسی کہتا تھا، اور دوسرے کے کانگرسی ہونے کا بھی منکر نہیں تھا۔ اسی لیے کانگرس کو میں نے مجموعۂ اضداد کہا ہے۔"

"اچھا تو تمھارا تعلق ان میں سے کس تضاد سے تھا؟" مجید نے طنزاً مزید سوال کیا۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے" مجید کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے سنجیدگی سے جواب دیا "تو مجھے قوم پرستی وراثۃً ملی ہے۔ میرے باپ کٹر نیشنلسٹ تھے۔ مرتے وقت بھی انھوں نے وصیت کی تھی کہ کھدر میں انھیں کفنایا جائے۔ ۱۹۳۷ء میں کانگرس کی سرگرمیوں میں جب میں نے عملی حصہ لینا شروع کیا تو کانگرس کے کمیونسٹ گروپ میں مجھے زیادہ کشش محسوس ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ کانگرس کا باضابطہ ممبر بننے سے پہلے سوشلزم کی مبادیات سے میرا ذہن آشنا ہو چکا تھا۔ چناں چہ جلد ہی میں بڑی حد تک تو کمیونسٹ بن گیا، لیکن میرا ذہن بنیادی طور پر کانگرسی ہی رہا۔ ایک زمانے میں مجھے اپنے متعلق یہ شبہ بھی ہو چلا تھا کہ کمیونزم نے میری کانگرسی رگ کو دبا لیا ہے، لیکن آگے چل کر میرا یہ گمان غلط ثابت ہوا۔

"ابتدائی دور ہی میں کمیونسٹوں کے طریق کار نے ایک موقع پر مجھے غیر محسوس طور پر متزلزل بھی کیا، لیکن یہ جھٹکا اتنا شدید نہیں تھا کہ میرے پیر اکھڑ جاتے۔ یہ قصہ ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء کا ہے۔ اس وقت یوپی کانگرس دو غیر واضح گروہوں میں بٹی تھی۔ ایک رفیع احمد صاحب قدوائی کا گروہ تھا، اور دوسرا آچاریہ نرندر دیو کا، جو پکے سوشلسٹ تھے۔ سوشلسٹ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی کا اگرچہ الگ الگ وجود تھا، لیکن کانگرس کے اندر ان دونوں میں مکمل اتحاد تھا۔ اس سال یوپی کانگرس کی صدارت کے لیے سوشلسٹ پارٹی نے دمودر سروپ سیٹھ کو اور ان کے مقابلے میں قدوائی صاحب نے موہن لال سکسینہ کو کھڑا کیا۔ الکشن سے ایک روز پہلے قدوائی صاحب نے کمیونسٹوں کو، یہ وعدہ کر کے، توڑ لیا کہ وہ اگر موہن لال سکسینہ کو ووٹ دیں، تو نئی ایگزیکٹو کمیٹی میں دو تین کمیونسٹوں کو بھی وہ لے لیں گے۔ یوپی، پراونشل کانگرس کمیٹی کے بیشتر مسلمان ممبر مولانا حفظ الرحمٰن کی قیادت میں بالعموم سوشلسٹوں کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ آچاریہ نرندر دیو کو یقین تھا کہ اس موقع پر بھی کمیونسٹ اور مسلمان ان ہی کے امیدوار کو ووٹ دیں گے۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ جمعہ کا دن تھا، اور تین بجے الکشن ہونے والا تھا۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب وہاں سے آئے تھے، لیکن جمعہ کی نماز کے بعد انھیں جلسے میں پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ الکشن مقررہ وقت پر شروع ہوا تو کمیونسٹوں نے موہن لال سکسینہ کو ووٹ دیا اور مسلمانوں نے بھی ان کی تقلید کی۔ دمودر سروپ بری طرح ہارے۔ اسی دن شام کو موہن لال سکسینہ نے ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبوں کے ناموں کا اعلان کیا تو قدوائی صاحب کے وعدے کے مطابق، اس میں دو تین کمیونسٹوں کے بھی نام تھے، اور دو سوشلسٹوں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ دوسرے دن نئی ایگزیکٹو کمیٹی کا جلسہ تھا۔ میں ان دنوں پراونشل کانگرس کمیٹی کے دفتر ہی میں کام کرتا تھا۔ جلسے سے کچھ دیر پہلے ہمارے کمیونسٹ دوست وہاں تشریف لائے۔"

"کون کون تھے؟" مجید نے سوال کیا۔

"سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف، محمود الظفر اور شاید بھردواج بھی تھے۔ اس وقت تک انھیں اس کا پتہ نہیں تھا کہ سوشلسٹ پارٹی کے ممبر موہن لال سکسینہ کی نئی ایگزیکٹو کمیٹی میں شریک ہوں گے یا نہیں۔ اس کی ٹوہ لینے کے لیے انھوں نے مجھے پکڑا۔ دفتر کے باہر لان پر کچھ دیر آپس میں صلاح مشورے کے بعد سجاد ظہیر میرے پاس آئے، اور مجھ سے کہا کہ میں جا کر آچاریہ نرندر دیو سے کہوں کہ سوشلسٹ پارٹی اگر نئی ایگزیکٹو کمیٹی میں شریک نہ ہوگی تو کمیونسٹ ممبر بھی اس کا بائیکاٹ کریں گے۔ ان دنوں پراونشل کانگرس کمیٹی کا دفتر اسٹیشن روڈ پر تھا، اور اس کے قریب ہی کونسلرس رزیڈنس میں آچاریہ نرندر دیو رہتے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو ان کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میرے کھٹکھٹانے پر دروازہ کھلا، تو سامنے موہن لال گوتم کھڑے تھے۔

"آچاریہ جی تشریف رکھتے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں ہیں، آیئے" گوتم نے جواب میں کہا۔ آچاریہ جی اس وقت بغل کے کمرے میں پلنگ پر لیٹے تھے۔

"کہیے، کیسے تشریف لائے؟" میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے لیٹے ہی لیٹے انھوں نے

کہا "معاف کیجیے، میری طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے لیٹ گیا ہوں"۔

"مزاج پرسی کے بعد میں نے پیغام سنایا، جسے سنتے ہی ان کا چہرہ سرخ ہو گیا، اور وہ اٹھ بیٹھے۔ ان کو غصہ بہت کم آیا تھا، اور ان کی سنجیدگی و بردباری ضرب المثل تھی۔ لیکن اس وقت وہ آپے سے باہر تھے۔ ان کے منہ میں جو آیا، کہہ ڈالا۔

"میں تو پیام بر ہوں، میں نے کہا "اور مشرقی روایات کے مطابق پیام بر کی گردن نہیں ماری جاتی۔"
یہ سن کر آچاریہ جی کا غصہ کچھ کم ہوا۔

"یہ باتیں میں نے آپ کو نہیں سنائی ہیں" اچاریہ جی نے معذرت کے لہجے میں کہا "میرے مخاطب تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپ کو یہاں بھیجا ہے۔ میں نے جو باتیں کہی ہیں، وہ سب آپ ان کو میری طرف سے سنا دیجیے، اور یہ بھی کہہ دیجیے کہ مجھے معلوم ہے کہ سوشلسٹوں کے بائیکاٹ کے باوجود کمیونسٹ موہن لال سکسینہ کی بنائی ہوئی ایگزیکٹو کمیٹی میں ضرور شریک ہوں گے"۔

اور یہی ہوا۔ اس کے بعد سوشلسٹ اور کمیونسٹ کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آسکے۔

"میرا گمان ہے" مجید نے کہا "تم اگر کمیونسٹ نہیں تو ان کے شریکِ سفر ضرور تھے، اور ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو بھی تم یہی تھے، اور آج بھی یہی ہو، ورنہ تمھارے جسم پر یہ مکروہ برطانوی فوجی وردی نہ ہوتی۔"

"تمھارا فیصلہ بہ ظاہر جتنا صحیح معلوم ہوتا ہے، اتنا صحیح ہے نہیں" مجید کی تردید کرتے ہوئے میں نے کہا "۹ اگست ۱۹۴۲ء کا دن ہماری تاریخ میں کئی اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی ۹ اگست کو میرے جیسے لاکھوں نوجوانوں نے ـــــ جو کانگرسی بھی تھے اور کمیونسٹ بھی ـــــ پہلی بار اس حقیقت کو واضح طور پر محسوس کیا کہ ہمارے وجود کی گہرائیوں میں دو دھارے متوازی بہہ رہے ہیں، جن میں اشتراک نہیں بلکہ تضاد ہے۔ ان میں سے ایک دھارا قوم پرستی کا ہے اور دوسرا کمیونزم کا۔ عین اس زمانے میں جب ملک کے کونے کونے سے 'ہندستان چھوڑ دو' کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، میرے جیسے لاکھوں نوجوان آتش نمرود میں بے خطر کود نے' کی آرزو لیے

دم بخود کھڑے تھے۔ ہمارے وجود کی اتھاہ گہرائیوں میں کشمکش تھی، جنگ تھی، ایک طرف دل تھا اور دوسری طرف عقل تھی۔ دل کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ سارا ملک جل رہا ہے، اور شعلے بلند سے بلندتر ہوتے جا رہے ہیں۔ عقل کہہ رہی تھی کہ ملک ہی نہیں بلکہ ساری دنیا جل رہی ہے۔ ملک ہی کی فکر کی تو ساری دنیا بھسم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی وطن عزیز بھی جل کر راکھ ہو جائے گا۔"

"یہ فریب تھا عقل فتنہ پرور کا" مجید نے حقارت اور غصے کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

"مگر سوچو تو!" میں نے پسپائی کے لہجے میں جواب دیا "یہ اگر فریب تھا عقل فتنہ پرور کا، تو کتنا حسین فریب تھا یہ!"

"حسن اور فریب میں تو چولی دامن کا ساتھ ہے" مجید نے بڑے تیکھے انداز میں کہا "اور اس کا منتہائے کمال یہ تھا کہ تم انڈین آرمی پبلک ریلیشنز میں جا پھنسے۔"

"نہیں، میں پہلے انڈین ایرفورس میں پھنسا" میں نے جواب دیا "اور وہاں سے اچھل کر انڈین آرمی پبلک ریلیشنز میں آیا۔"

یہ داستان بھی دلچسپ ہے۔ جنوری ۱۹۴۰ء میں میں ایک ہڑتال کے سلسلہ میں گرفتار ہوا اور جیل بھیج دیا گیا۔ گرفتاری کے وقت میرے ہاتھ میں ایک فلسطینی عیسائی جارج انتونیس کی کتاب 'عرب اویکننگ' تھی، جو اسی روز میرے ہاتھ آئی تھی۔ جیل کی فرصت سے فائدہ اٹھا کر میں نے اس کی تلخیص کر ڈالی، جو جیل سے باہر آنے کے بعد نگار میں بالاقساط شائع ہوئی۔ اس نے میرے اندر بڑی خود اعتمادی پیدا کی۔ کیوں کہ نگار اردو کا چوٹی کا رسالہ تھا، اور اس میں کسی نو وارد بساط ادب کا داخل ہونا آسان نہیں تھا۔ نیاز صاحب نے بھی میری بہت ہمت افزائی کی۔ چناں چہ میں نے نگار میں پابندی سے لکھنا شروع کیا، اور دو ڈھائی سال تک مسلسل لکھتا رہا۔ اس دور میں نگار کے وہ ہی چار شمارے ایسے ہوں گے جن میں میرا کوئی مضمون نہ ہو۔ بعض شمارے تو ایسے بھی ہیں، جن میں میرے دو دو تین تین مضامین ہیں ـــــــ ایک میرے نام سے اور باقی ادارے کے یا کسی فرضی نام سے۔"

"یار! نیاز صاحب بھی خوب آدمی ہیں" مجید نے بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ لکھنؤ میں اتنے دنوں رہنے کے باوجود ان سے کبھی نہیں ملا۔ اب جب بھی گیا، ان سے ضرور ملوں گا۔"

"ضرور ملنا" میں نے کہا "نیاز صاحب کچھ دیر آشنا ہیں لیکن خوب آدمی ہیں۔"

"میں نے بعض لوگوں سے ان کے متعلق عجیب عجیب باتیں سنی ہیں" مجید نے سوال کیا "تمہاری کیا رائے ہے ان کے متعلق؟"

"میں تو اپنی رائے بیان کر چکا ہوں" میں نے جواب دیا "نیاز صاحب بہرحال انسان ہیں، ان میں کچھ خامیاں بھی ضرور ہوں گی، لیکن مجھے خامیوں سے زیادہ ان میں خوبیاں نظر آتی ہیں۔

"میں نے بھی نیاز صاحب کے متعلق طرح طرح کی باتیں سن تھیں، اس لیے پہلے پہل ڈرتے ڈرتے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ قصہ اوائل اپریل ۱۹۴۶ء کا ہے۔ صدر دروازے کی کنڈی میں نے کھٹکھٹائی، جو اٹکایا ہوا تھا۔ اس کے جواب میں کسی نے اندر آنے کے لیے کہا۔ دروازہ کھولا تو میرے سامنے ایک چھوٹا سا صحن، اور اس کی بغل میں ایک برآمدہ تھا، جہاں ایک کونے میں تخت پر ایک کاتب بیٹھا کتابت کر رہا تھا۔

"نیاز صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔ جواب میں کاتب نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا، جس کے دروازے پر چق پڑی تھی۔ میں نے چق اٹھائی۔

"تشریف لائیے" ایک بزرگ نے فرمایا۔

میں سمجھ گیا کہ یہی نیاز صاحب ہیں، کیوں کہ اس کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ ایک لمبی سی میز کے سامنے کرسی پر وہ بیٹھے تھے۔ میز پر کتابوں کا انبار لگا تھا۔ میز ہی پر ایک بجلی کا لیمپ رکھا تھا جس کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے کی تاریکی دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ سلام کے بعد میز کے قریب پہنچا تو سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ بلا کسی تمہید کے اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے اس کی بھی میں نے وضاحت کر دی کہ لکھنے پڑھنے کو پیٹ بھرنے کا مشغلہ نہیں، بلکہ پیٹ بھرنے کا ذریعہ بنانا چاہتا ہوں۔ نیاز صاحب نے میری بات غور سے سنی۔

"اچھی بات ہے،" مسودے کو میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے نیاز صاحب نے جواب دیا "کل ہی شام کو اس کا جواب آپ کو مل جائے گا۔"

"تو شام کو میں حاضر ہوں؟" میں نے سوال کیا۔

"آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے"، انھوں نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا "میرا آدمی صدیق بک ڈپو میں خط دے آئے گا۔ وہیں کا پتہ آپ نے لکھا ہے نا؟"

"شام کو صدیق بک ڈپو گیا، تو میرے نام کا ایک خط وہاں رکھا تھا۔ میں نے بے تابی سے کھولا تو حسب توقع نیاز صاحب ہی کی تحریر تھی ـــــ کاروباری انداز کی ایک مختصر سی تحریر، جس میں مضمون کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ بس اتنا لکھا تھا کہ مضمون بالاقساط نگار میں شائع ہو جائے گا۔ معاوضہ فی الحال آٹھ آنے فی صفحہ دیا جا سکے گا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی تھی کہ منظور ہو تو اس کی اطلاع دوسرے دن گیارہ بجے تک دے دی جائے، تاکہ اگلے مہینے کے شمارے میں پہلی قسط شائع ہو سکے۔

"معاوضہ میری توقع سے کم تھا، مگر فیصلہ کرنے میں مجھے دیر نہ لگی۔ دوسرے دن مقررہ وقت پر میں پہنچا، اور بے چون وچرا ان کی تجویز مان لی۔ اسی وقت انھوں نے کاتب کو بلایا، اور مسودہ کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا کہ یہ کتنے صفحے کا ہوگا۔ مسودے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے اور سطروں کا حساب لگانے کے بعد اس نے ساٹھ صفحات کا تخمینہ بتایا۔ نیاز صاحب نے چیک بک نکالی، اور تیس روپے کا چیک لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ یہ تھا نیاز صاحب سے میرا پہلا سابقہ یا پہلا معاملہ۔ اس کے بعد بھی ان کا یہی دستور رہا کہ جب بھی میں نے کوئی مضمون ان کی خدمت میں پیش کیا، معاوضے کا چیک انھوں نے اسی وقت کاٹ دیا۔ نقد پیسے کبھی نہیں دئے۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد نیاز صاحب کو جب میرے ذہنی رجحانات کا اندازہ ہو گیا تو کھل کر مختلف مسائل پر باتیں بھی کرنے لگے۔ اکثر خود ہی موضوع کا تعین کر کے مضمون لکھنے کی فرمائش بھی کرتے۔

"اسے اپنا لیجیے،" کسی انگریزی رسالے کا ایک تراشا میرے حوالے کرتے ہوئے انھوں نے

فرمایا۔

"یہ فن مجھے نہیں آتا" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو آپ اس کا ترجمہ کر دیجیے"

دو مہینے بعد وہی مضمون نگار میں شایع ہوا، تو اس کا انداز بیان اس درجہ بدلا ہوا تھا کہ پڑھتے وقت میں یہ محسوس نہ کر سکا کہ یہ وہی مضمون ہے، جس کا میں نے ترجمہ کیا تھا۔ اس فن میں نیاز صاحب کا جواب نہیں تھا۔

"نیاز صاحب کی ہدایت کے مطابق، یا ان کے مشورے سے، میں نے بعض طویل مضامین ایسے بھی لکھے، جنھیں کسی مصلحت کی بنا پر وہ شایع نہ کر سکے، یا اس کا کچھ حصہ ہی شایع کیا، لیکن ایسے مضامین کا معاوضہ بھی انھوں نے پورا پورا ادا کیا۔"

"یار یہ تو بڑی قابل تعریف بات ہے" مجید نے کہا

"ہاں یقیناً قابل تعریف ہے" میں نے مجید کی تائید کی "میرے تجربے کے مطابق تو نیاز صاحب معاملے کے بہت کھرے ہیں۔ جنگ شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے روس اور برطانیہ کے تعلقات سے متعلق برطانوی پارلی منٹ کے ایک لیبر ممبر زیلیاکس کی کتاب 'لائٹ آن ماسکو' آئی، جس میں برطانیہ کی خارجہ پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ نیاز صاحب کی اجازت سے میں نے اس کی تلخیص کر ڈالی، جو نگار کے، کم و بیش، اسی پچاسی صفحات کی تھی۔ مسودہ میں نے نیاز صاحب کے حوالے کیا اور انھوں نے حسب دستور اس کا معاوضہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد اتفاقاً میں لکھنؤ سے باہر چلا گیا، اور واپسی تین چار مہینے بعد ہوئی۔ نگار کا تازہ شمارہ جب ملا تو اس میں مضمون کی پہلی قسط 'اہم سیاسی انکشافات' کے عنوان سے، میرے نام سے نہیں بلکہ، ادارے کے نام سے تھی[1]۔ لیکن اسی کی دوسری قسط جب آئی تو وہ میرے نام سے تھی، اور نیاز صاحب نے کمال یہ کیا کہ پہلی قسط کے بعد

---

[1] نگار، جولائی و ستمبر ۱۹۴۴ء

رمسودہ بچا، اور جو کم وبیش ساٹھ پینسٹھ صفحات کا رہا ہوگا، اسے کاٹ چھانٹ کر نو صفحات میں سمو دیا۔
س سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ مضمون کے آخر میں ایک طویل نوٹ کا بھی انھوں نے اضافہ
یا، جس میں کتاب کی تنقیص کی گئی تھی۔

"نیاز صاحب! آپ نے تو غضب ہی کر دیا" لکھنو لوٹنے کے بعد احتجاجاً میں نے کہا "میرے
مضمون کا تو بھرکس ہی نکال دیا آپ نے، اور رہی سہی کسر آپ کے نوٹ نے پوری کر دی۔"

"کیا کرتا" بے بسی کے ساتھ انھوں نے جواب دیا "حکومت ہند کا عتاب نامہ آگیا تھا۔"

نیاز صاحب کا یہ بیان یقیناً صحیح تھا۔ اس وقت جنگ اپنے شباب پر تھی، اور حکومت ہندستانی
پریس پر کڑی نگاہ رکھتی تھی۔ میرا ایک طویل مضمون بھی حکومت کی اسی پالیسی کی نذر ہو گیا، جس کی صرف
پہلی ہی قسط 'روسی نظام حکومت پر تبصرہ' کے عنوان سے شائع ہو سکی[1]۔ جنگ کے ذکر کے ساتھ
ہی ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ جولائی ۱۹۴۱ء میں نیاز صاحب نے جنگ نمبر شائع کرنے کا ارادہ
کیا اور اس کے لیے ایک طویل مضمون لکھنے کی مجھ سے فرمائش کی جس میں پہلی عالمگیر جنگ کے اختتام
سے لے کر دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک کے بین الاقوامی حالات کا سیر حاصل تبصرہ ہو۔ ان
کی یہ فرمائش سن کر میں نے کہا کہ یہ تو خاصا بڑا کام ہے اور مضمون بھی کافی طویل ہوگا۔

"اس کی فکر آپ نہ کیجیے" انھوں نے جواب دیا "جتنا بھی طویل ہو، چھپ جائے گا اور معاوضہ
بھی آپ کو دونا ملے گا۔ مگر مضمون پندرہ دن کے اندر تیار ہو جانا چاہیے۔"

رات دن ایک کر کے مضمون معینہ مدت کے اندر میں نے نیاز صاحب کی خدمت میں پیش
کر دیا۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے اس مضمون سے بھی بہت مدد ملی جو 'عربوں کی سیاسی بیداری' کے
عنوان سے نگار ہی میں بالاقساط شایع ہو چکا تھا۔ اس کے بعض کام کے طویل اقتباسات بھی
میں نے اس مضمون میں شامل کیے اور وہ مضمون بھی چوں کہ میرا ہی تھا اس لیے ان اقتباسات

---

[1] نگار، جولائی ۱۹۴۱ء

کا حوالہ دینا میں نے غیر ضروری سمجھا۔ اسی نمبر کے لیے ایک مضمون اور نیاز صاحب نے مجھ سے لکھوایا لیکن جب یہ نمبر آیا تو پہلا طویل مضمون، بہ طور مقدمہ کے ملاحظات کی جگہ پر[۱]، ادارہ کے نام سے تھا۔ دوسرے مضمون کا بھی یہی حشر ہوا[۲]۔ لیکن سب سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اسی نمبر میں ایک مضمون میرے نام سے بھی تھا، جو میرا لکھا ہوا نہیں تھا[۳]۔"

"اچھا یہ تو بتلاؤ" نگار کی داستان سے اکتا کر مجید نے گفتگو کا موضوع بدلا "انڈین ایرفورس سے چھلانگ لگا کر انڈین آرمی پبلک ریلیشنز میں تم کیسے پہنچے؟"

میں نے یہ قصہ تفصیل سے بیان کرنا شروع کیا، لیکن ابھی تمہید ہی تھی کہ دیکھتا کیا ہوں کہ مجید فرش پر لیٹے لیٹے خراٹے لے رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی میں نے بھی خاموشی اختیار کر کے مجید ہی کی تقلید کی۔ دوسرے دن صبح کو آنکھ کھلی تو سات بج چکے تھے۔ مجید بدستور سو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی معصومانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جیسے بچوں کی طرح پرستان کے خواب دیکھ رہا ہو۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا، اور جلدی جلدی غسل کر کے دفتر کی راہ لی، جو آٹھ بجے سے شروع ہوتا تھا۔

دفتر پہنچنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ آج میرے ایک رفیق بیمار ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ پر مجھے تہران سے باہر ایک کیمپ تک جانا ہے جہاں سالانہ تقریب کے موقع پر کھیل کے مقابلے اور دوسرے تفریحی پروگرام ہیں خیال تھا کہ اسی دن لوٹ آؤں گا، لیکن وہاں سے واپسی دوسرے دن ہوئی۔ شام کو مجید کے ہوٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ ۱۰ اگست ہی کو آبادان چلا گیا۔ چند روز کے بعد مجید کا ایک خط ملا جس میں اس نے اطلاع دی تھی کہ ملازمت سے اس نے استعفا دے دیا ہے، اور وطن واپس جا رہا ہے۔

---

[۱] داستانِ جنگ۔ نگار اگست ۱۹۴۱ء

[۲] نازی حکومت اور مزدور۔ نگار۔ اگست ۱۹۴۱ء

[۳] سائنس اور جنگ۔ نگار۔ اگست ۱۹۴۱ء

صلاح الدین نیّر

شرافت کا پھول

(نذرِ ذاکر حسین)

اب، ایک ترو تازہ زندگی کا گلاب
ہک رہا تھا جو دلی کے سبزہ زاروں میں
ہک رہا تھا جو کل لکھنؤ کی گلیوں میں
لن کی سانولی شاموں میں جن کی خوشبو تھی
ہک رہا تھا جو کشمیر کی فضاؤں میں
اودھ کی شام، بنارس کی صبح ساتھ لئے
کہاں کہاں نہ گیا عظمتِ وطن کے لئے
مگر اک ایسی ہوا آئی صحنِ گلشن میں
چمن کی گود میں وہ پھول گر گیا یارو!

○

گلاب، ایک ترو تازہ زندگی کا گلاب
مہک تھی جس کی دلوں کے دبیز پردوں میں
مہک تھی جس کی نگاہوں کے آبشاروں میں
بسی ہوئی تھی مہک جس کی طرحداروں میں
مہک رہا تھا جو کٹیا میں اور محلوں میں
مہک کسانوں میں مزدور کے پسینوں میں
مہک تھی جس کی مشینوں میں کارخانوں میں
نہ کچھ کہا نہ سنا سب کو یوں ہی چھوڑ دیا
تمام عمر کے رشتوں کو یوں ہی توڑ دیا

○

تھکی تھکی سی ہے کیوں آج موجِ گنگ و جمن
نہ جانے تاج کی پلکوں پہ یہ نمی کیوں ہے
ایلورہ، تاج، اجنتا جو بولتے تھے کبھی
وہ آج سر بہ گریباں ہیں زندگی کے لئے

○

نگاہ دارِ ادب، علم و فن کا شیدائی
روایتوں کا امیں، عصرِ نو کا دلدادہ
کرم کا باب، شرافت کی بولتی تصویر
دیارِ فکر و نظر کا وہ قیمتی ورثہ
تمام عمر سلگتا رہا وطن کے لئے
لہو دیا تو چراغوں کو انجمن کے لئے

○

بہار آتی رہے گی چمن چمن کے لئے
بہت سی کلیاں گلوں کا لباس پہنیں گی
مگر وہ پھول جو کل آبروئے گلشن تھا
وہ پھول جس کی تھی خوشبو صبا کے دامن میں
وہ پھول جس کی مہک علم و فن کے سینے میں
وہ پھول جس کے تبسم سے کانپتی تھی خزاں
خزاں کی لہر سے مرجھا گیا تو ہے لیکن
گلابِ تازہ کی ہر وقت یاد آئے گی
جہاں میں خوشبو شرافت کی پھیل جائے گی

○

وکٹر ہیوگو
مترجم: اخیار احمد

غروب آفتاب

.... آج شام سورج بادلوں کے پیچھے روپوش ہو گیا ہے
کل طوفان آئے گا ، شام ہوگی ، رات ہوگی ——
پھر ہوگا سویرا —— اپنی مدہم غبار آلود روشنی کے ساتھ
یونہی رات اور دن ہوں گے —— وقت نہیں تھمے گا!

یہ دن یونہی گذریں گے ، گذرتے رہیں گے
سمندر کے آگے ، پہاڑوں کے سامنے ،
آب سیمیں پر ، جنگلوں میں ، —— اور گردش کرتے ہیں
مردہ روحوں کے گیتوں کی طرح —— جن سے ہمیں پیار ہے

آبشاروں کے چہرے ، پہاڑوں کی پیشانیاں
شکن آلود مگر تابناک ۔ اور پرانے سدابہار درخت ،
پھر جوان ہو جائیں گے ۔ اور گرد و نواح کے دریا
ان پہاڑوں سے وہ مسلسل روانی پائیں گے جو انھیں سمندر کی آغوش میں
لے جاتی ہے

مگر میں ، ہر روز ، اپنا سر بے حد نیچا کیے
چلتا ہوں ۔ اور ۔ اس مسکراتے سورج کے نیچے ٹھٹھرتا ہوا ،
آخرکار جا ہی پہنچوں گا ، میلے کے درمیان
اس وسیع اور روشن دنیا سے کچھ کھوئے بغیر !

(فرانسیسی سے ترجمہ)

ڈاکٹر سیفی پریمی

محتسب ــــ ایک شعری کردار

اردو غزل میں ناصح، واعظ، شیخ، زاہد اور محتسب بڑے جاندار کردار ہیں، ان کرداروں کی اپنی ایک شعری و ادبی فضا ہے، ایک تاریخ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اردو غزل پر تصوف کا گہرا اثر رہا ہے، تصوف اور شریعت کا مفہوم، فکر و عمل کے مختلف نشیب و فراز سے گذر کر، الگ الگ چند ایسی اصطلاحوں میں مقید ہو گیا کہ عبد و معبود اور طالب و مطلوب کے رشتے کو سمجھنے اور حقیقت کبریٰ تک پہونچنے کی یہ دو راہیں تسلیم کر لی گئیں۔ میر دردؔ ایک صوفی شاعر تھے اور اس سلسلے میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے، ان کا یہ شعر مشہور ہے:

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا، ہم کنشتِ دل میں ہیں
دردؔ منزل ایک تھی، کچھ راہ ہی کا پھیر تھا

راہ کا یہ پھیر درحقیقت یہ تھا کہ تصوف کسی اور چیز پر زور دیتا تھا اور شریعت کسی اور چیز پر، صوفیا نے محض رسوم و ظواہر کی پابندی کو کبھی اصلِ مذہب تصور نہیں کیا، وہ اسے ظاہر داری تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب دل ٹھیک اور نیت پاک نہ ہو قربِ الٰہی میسر نہیں آسکتا۔ اسی لئے علماء ظاہر ان کی نگاہوں میں کبھی نہ جچے۔ خوف اور انعام، سزا اور جزا کے تصور سے اگر عبادت کی جائے تو یہ عبادت بے کیف ہے۔ مجبوری کا زہد اور ترک علائق ایک گزو قسم کا زہد اور ترک ہے، اصل ترک وہ ہے کہ قدرت کے باوجود لذات دنیوی سے منہ موڑ دیا جائے:

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں

تصوف نے دنیا میں ہوتے ہوئے بھی دنیوی جاہ و حشم سے اپنے آپ کو الگ رکھنے کی کوشش کی، ہاں اُس نے انسان کو بحیثیت انسان کے کبھی فراموش نہیں کیا، اسی لئے اس میں عفو و درگذر، محبت و الفت، انسان دوستی اور رواداری کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ تصوف نے انسان کی اصلاح کو اپنا مطمح نظر بنایا لیکن شریعت نے سماج کی اصلاح کو اولین جگہ دی، اور یہی وجہ ہے کہ شریعت نے حکومت اور حکومت نے شریعت کا سہارا ڈھونڈا۔ شعر و ادب میں بھی سماج کا آئینہ ہوتے ہیں تصوف اور شریعت نے مختلف علامتوں کے ذریعہ اپنے مقصد و منہاج کی نشاندہی کی، مثلاً روحانی کیف و مستی نے جب مادی اصلاح کا جامہ پہنا تو 'رندی' کی اصطلاح ظہور میں آئی اور اس کے مقابلہ میں شریعت نے احتساب اور محتسب کی اصطلاحیں دیں، اسی طرح صوفیانہ شاعری میں بادہ و ساغر، جام و مینا وغیرہ کی اصطلاحیں ہیں اور ان کے مقابلہ میں واعظ، شیخ اور فقیہ وغیرہ۔

صوفیوں کے یہاں جو اصطلاحیں ملتی ہیں وہ معنی و مفہوم کے لحاظ سے تمام کی تمام عشق، محبوب کی طلب اور اس کی منزل سے متعلق ہیں، مثلاً میکدہ یا میخانہ سے حلقۂ مردانِ خدا مراد ہوتا ہے۔ میکش سے سالک اور مئے و بادہ سے کیفیاتِ قلبی، مینا سے وہ اذکار و اشغال مراد ہیں جو سالکانِ طریقت کے ذوق و شوق کو بڑھاتے ہیں۔

دو الگ راہوں کی حیثیت سے تصوف اور شریعت کے فرق کی روایت اردو غزل کو فارسی شاعری سے ملی اور اس میں خالص عجمی ذہن کی کارفرمائی رہی ہے۔ اردو غزل گوئی میں محبوب کی ذات کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔ یہ درحقیقت تصوف ہی کا اثر ہے۔ وؔلی اورنگ آبادی نے کہا ہے:

عزیزو باغ میں جانا نپٹ دشوار ہے مجھ کو
گلی گلرو کی پائی ہے مجھے گلشن سے کیا مطلب

شریعت اور طریقت کے اختلاف کا نتیجہ ہی تھا کہ شاعروں نے شیخ اور محتسب پر طنز کرنے سے بہت پہلے یہاں تک کہنے کی جرات کی کہ بقول میر:

عام ہے یار کی تجلی میر
خاص موسیٰ و کوہِ طور نہیں

ں کے بعد معرفت کے مضامین میں شراب کے لوازم کا بھرپور استعمال ملنے لگا۔
میر ہی کا شعر ہے:

قربان پیالۂ مۓ ناب
جس سے کہ ترا حجاب نکلا

آتش کے نزدیک زندگی ہی شراب ہے اب بیچارے محتسب کی تقدیر کو کیا کہیے گا۔

خم خانۂ موروث میں مستِ قدیم ہوں
طفلی میں مجھ کو نشۂ مے شیر سے ہوا

جگر مراد آبادی نے بھی محتسب کو یہ کہکر حیرانی میں ڈال دیا:

پہلے شراب زیست تھی، اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے پیے جا رہا ہوں میں

رندی و احتساب کی کش مکش میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شیخ اور واعظ کے کردار کی عظمت ہمارے اخلاق اور سماج کی دین ہے لیکن محتسب کی بلند و بالا شخصیت در اصل اقتدار کا عطیہ ہے اس لیے سماج میں اس کی ذات سے ہیبت پیدا ہونے لگی اور اس کے خلاف جذبات کے اظہار میں احتیاط کو مد نظر رکھا گیا چنانچہ اردو غزل میں سماج کے اس موڑ کا اثر نمایاں ہے۔ شیخ، واعظ اور زاہد پر طنز کرنے اور مضحکہ اڑانے کا چلن ملتا ہے مگر محتسب کے معاملے میں دبی زبان ہی سے کچھ کہنے کا دستور رہا ہے۔ اردو غزل کے مطالعہ سے صاف پتا چلتا ہے کہ محتسب اقتدار کا سخت گیر اور جابر نمائندہ ہے پھر بھی اس کے سامنے بات تو کہی جاتی ہے مگر ذرا سنبھل کر اس محتاط انداز سے

یہ تعلق ثابت ہو جاتا ہے کہ عوامی ذہن اپنے اعمال پر اس احتساب کے لیے تیار نہیں ہے وہ اپنے مشرب میں آزادی کا خواہاں ہے اور اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوا ہے مثلاً میخانہ کی بقا کا تصور تمام رندوں کے سامنے رہا ہے۔ میرؔ نے میکدہ کے استحکام اور محتسب کی سخت گیری کا اظہار کیا ہے:

کیا خرابی ہے میکدے کی سہل
محتسب اک جہان جاتا ہے

محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں   دل نہ تھا کوئی جو شیشے کی طرح چور نہ تھا

آگے چل کر محتسب کے کردار میں دو رنگوں کی آمیزش بھی ملتی ہے۔ ایک طرف وہ فرضِ منصبی کی بجا آوری میں دل آزار رہے مگر در پردہ میخانہ سے ساز باز بھی رکھتا ہے۔ ذوقؔ نے کہا ہے:

محتسب گرچہ دل آزار ہے میخواروں کا   دیجیے اک جام، تو ہے یار ابھی یاروں کا

اس سے برسراقتدار طبقے کے کردار کی پستی اور عام کرپشن پر روشنی پڑتی ہے لیکن محتسب اپنی سخت گیری سے یارانِ میکدہ کے جذبات کو بری طرح مجروح کرتا رہتا ہے اس کے احتساب میں بادہ نوشی پر پابندی کے ساتھ میخانہ کی بےحرمتی بھی شامل ہے جس پر رندوں کو بھی کافی غم و غصہ ہے اس کا اظہار داغؔ دہلوی کے یہاں ملتا ہے:

ستیاناس محتسب کا ہو   شیشہ پھینکا کہیں، گلاس کہیں

شعرائے متاخرین کے یہاں بھی محتسب کا یہ کردار باقی رہتا ہے لیکن ان شاعروں نے داغؔ دہلوی کی طرح محتسب کو مخاطب کرنے میں حد سے گزری ہوئی بیباکی اختیار نہیں کی اگرچہ میخوار کے جذبات، شراب کی حرمت، دل کی لہک مہک اور نشیلی فضا، سب کچھ داغؔ کے دور کی یادگار ہیں۔ جگرؔ مرادآبادی نے محتسب کو یوں مخاطب کیا ہے:

اے محتسب نہ پھینک، مرے محتسب نہ پھینک   ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

ترقی پسند شعراء کے یہاں محتسب کے رویّے سے اس طرح کی جھلاہٹ نہیں ملتی جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا۔ ان کے یہاں محتسب کے کردار میں اقتدار کے جبر اور اس کے فلسفہ کی آگاہی ملتی ہے اقتدار اور عوامی ذہن کی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک سچائی ہے کہ عوامی تحریک کو دبانے سے اس تحریک میں اور جان پڑتی ہے۔ فیض احمد فیض نے محتسب کے کردار کو اسی نفسیاتی پس منظر میں پیش کیا ہے:

محتسب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خُم کا، پیمانے کا نام

محتسب کا نہایت واضح کردار ریاض خیرآبادی کے یہاں نظر آتا ہے۔ اردو غزل گوئی میں محتسب کی سخت گیری، احتساب، حد اور ہیبت کی تصویریں ریاض سے زیادہ کسی شاعر نے پیش نہیں کیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

محتسب آیا تو میں خُم پر گرا　　خُم گرا، مینا گرا، ساغر گرا

اس شعر میں صرف ایک رند کی حالت کا بیان ملتا ہے لیکن پورے میخانہ کی ہل چل، ابتری اور سراسیمگی کا عالم دیکھنے کے لیے یہ شعر سُنیے:

آیا جو محتسب، تو بنی رزم بزم مے　　مجروح خُم، شہید ہمارا سبو ہوا

محتسب کے جاہ و جلال اور ہیبت کے اثرات کو ریاض نے ایک نئے خیال میں پیش کیا ہے اور پیرایۂ اظہار بھی اچھوتا ہے:

تیرے آتے ہی ہو گئی پانی　　اُڑ گیا، محتسب! شراب کا رنگ

اس تخیلی انداز کے بعد براہ راست سیدھے سادے اور سچے انداز میں محتسب سے مخاطبت کا منظر دیکھیے:

پی ہوئی مے نہ مرے ہونٹ پہ آجائے کہیں　　محتسب ڈر سے ترے روح فنا ہوتی ہے

محتسب کے کردار میں رندوں پر جبر کے علاوہ دُختِ رز کی فروخت پر بھی پابندی کا بیان

ہے یہاں شاعر کے اظہار میں نہ تو شکوہ شکایت کا پہلو ہے نہ جھلاہٹ کی نمود۔ چونکہ یہ معاملہ براہ راست رند کی ذات سے متعلق نہیں بلکہ دوسروں کا ہے اس لیے اس میں صفائی کی نوعیت ہے۔ وکالت کا رویہ ہے اور مے فروشی کو ناجائز کسب معاش کی بجائے ایک فطری عمل قرار دیا ہے۔ داغ نے اس خیال کو نہایت خوبصورتی اور بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے:

تقصیر مے فروش کی اسے محتسب نہیں   یہ چیز اُڑ کے جاتی ہے میخوار کی طرف

جگر مراد آبادی نے محتسب کے کردار کو صرف اقتدار کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ اس کی شخصیت کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالی ہے۔ محتسب کا منصب جس کو تفویض کیا جاتا تھا اس کی انتظامی صلاحیت ہی اصل معیار نہ تھی بلکہ اس کی زندگی میں اعلیٰ قدروں کا پایا جانا بھی ضروری تھا مثلاً مزاج کی نفاست اور ذہنی سطح کی بلندی ــــ بعض شاعروں نے رندانہ جھلاہٹ میں اس طرف توجہ نہیں کی۔ جگر نے محتسب کی شخصیت کے اس رخ کو بھی پیش کیا ہے۔ جگر کی نظر میں محتسب ایک باشعور انسان ہے مگر اس کے یہاں زندگی کے وسیع تجربوں کی کمی ضرور ہے۔ یہ شعر سُنیے:

مانا کہ محتسب بھی بڑا باشعور ہے   لیکن اُسے نزاکتِ غم کی خبر کہاں

جگر کے یہاں محتسب کے کردار میں کسی قدر نرمی کا بھی پتا چلتا ہے۔ انھوں نے محتسب کو بھی دعوتِ میکشی دینے کی کوشش کی ہے:

یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں، یہ فضائیں، یہ بہار   محتسب! آج تو شغلِ مے و میخانہ بھی

ریاض کے یہاں ایک مثال ایسی بھی ہے جس میں اقتدار اور عوامی ذہن کی آزادی کا ٹکراؤ مکمل ہو جاتا ہے اور رند اس جسارت پر آمادہ ہے:

یہ موج مے ابھی تو جسم میں پیوست ہو جائے   دکھا دوں محتسب کو درۂ تعزیرِ میخانہ

قومی انحطاط کے باعث معاشرے میں کردار کی بلندی قائم نہ رہ سکی اور اس کا اثر اقتدار، اخلاق اور مذہب کے نمائندہ کرداروں پر بھی پڑا۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کا کردار بھی اور کھوکھلا

بن گیا اس لیے محتسب کے سامنے دشواری پیدا ہوئی۔ رندوں نے اقتدار پر طنز کی اور شیخ کی مثال پیش کر کے اجتنابِ شراب کو بے معنی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً ریاضؔ کا کہنا:

اے محتسب نہ غلہ کے اس میں نہ آس میں پہلا   جو دو شیخ کا ہے یہ مجھ خاکسار کا

عدمؔ نے ایک شعر میں شیخ کو بنیاد بنا کر معاشرے پر بھرپور طنز کی ہے:

سبو گم ہو گیا تھا رات میخانے میں اک ساقی
سحر کو محتسب نے شیخ کی جامہ تلاشی لی

غرض دورِ حاضر میں اربابِ اقتدار اور رندوں کے کردار میں کوئی حدِ فاصل باقی نہیں رہی۔ محتسب، جو اقتدار کا نہایت خشک، سخت گیر اور جابر نمائندہ تھا وہ اپنے تمام ذاتی وصفاتی جوہر کھو بیٹھا۔ فیضؔ کے یہاں اس کا بیان ملتا ہے:

تمھیں کہو رند و محتسب میں ہے آج شب کون فرق ایسا
یہ آکے بیٹھے ہیں میکدے میں، وہ اُٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

اس باعث ریاضؔ نے محتسب کے کردار پر نکتہ چینی کی ہے۔ وہ اب اخلاقی قوت نہیں ہے نہ اجتناب کا انصاف پسند اور نڈر نمائندہ ـــــ احساسِ فرض کی جگہ اس کے مزاج میں سیاسی حکمتِ عملی کو دخل ہے، وہ اب رندوں میں پھوٹ ڈالنے کی مہم میں معروف ہے۔ محتسب کے اس عمل کو ریاضؔ نے لطیف طنز میں پیش کیا ہے:

پھوٹ سے پھوٹ پڑی رات کو میخواروں میں
محتسب خوب چلی، خوب چھنی یاروں میں

'خوب چلی' اور 'خوب چھنی' میں معنیٔ قریب اور معنیٔ بعید دونوں کا اظہار ہے مگر اصل مقصود بے پناہ مے نوشی ہی ہے۔

اس مقام پر محتسب اور رند کا رشتہ ایک نئی شکل اختیار کر لیتا ہے رند کو اپنے ضمیر اور باطنی طہارت کے ادعا کا موقع مل جاتا ہے۔ وہ محتسب کے اجتناب کو لایعنی سمجھتا ہے

ریاضؔ کی زبان سے رندوں کا دعویٰ سُنیے :

اے محتسب ریاضؔ تو اُن میکشوں میں ہے
سو غوطے کھائے حوض میں دامن بھی تر نہ ہو

اردو غزل گوئی میں محتسب کے کردار کے سہارے ہمیں اپنے سماج، قوم اور ملک کی اقتصادی، اخلاقی، سماجی اور انتظامی کیفیتوں کا پتا چلتا ہے۔ دورِ حاضر میں اشیاء کی نایابی کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ اقتدار کے نمائندے اس علم و احساس کے باوجود کہ بازاروں میں انسانی ضروریات کی اشیا ناپید ہیں، کساد بازاری عام ہے، مگر وہ اپنے منصب کی بقا و شادابی کے لیے اور عوام میں اپنا بھرم باقی رکھنے کے لیے، چہل پہل، دیکھ بھال، دوڑ دھوپ کی مہم جاری کرتے ہیں۔ ریاضؔ نے ہمارے معاشرے کے اِس رُخ کی تصویر پیش کی ہے :

یہ محتسب ہے عبث گھر کو سونگھتا پھرتا
کہ بوند بھر بھی مے مشکبو نہیں باقی

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

اردو میں وہابی ادب   از خواجہ احمد فاروقی

۲۲ × ۱۸ / ۸ ، حجم: اصل مضمون ۴۱ صفحات ، مآخذ کی وضاحتی فہرست ۱۰ صفحات ، کل ۵۱ صفحات ۔ مجلد ، قیمت : دو روپے ۔ تاریخ اشاعت : اگست ۱۹۶۹ء ۔ ناشر : شعبۂ اردو ، دہلی یونیورسٹی ، دہلی

زیر تبصرہ کتاب ، نہ تو کتاب ہے اور نہ کتابچہ ہی ، بلکہ ۴۱ صفحے کا ایک مضمون ہے ، جو مستشرقین ین الاقوامی کانگریس منعقدہ اگست ۱۹۶۷ء کے لیے انگریزی میں لکھا گیا تھا ، اس کے بعد اس کا ہ "نذر مقبول" میں شائع ہوا اور اب شعبۂ اردو دلّی یونیورسٹی کی طرف سے کتابی صورت میں ئع کیا گیا ہے ۔ موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے فاضل مضمون نگار نے بالکل شروع میں لکھا ہے:

> "میرے مقالے کا موضوع انیسویں صدی کے مجاہدین کی تحریک ہے جس کو عرف عام میں وہابی تحریک کہا جاتا ہے ، لیکن جس کا سرچشمہ در اصل شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات ہیں ، اس لیے اسے ولی اللٰہی تحریک بھی کہا جاتا ہے ۔ میں نے اس کے خط و خال کو اس کے ادب اور اس کے معاصرین کی تحریروں میں دیکھا ہے ۔"

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اردو زبان کو آسان بنانے اور سلیس اسلوب تحریر دینے کا سہرا سرسید کے سر ہے ، لیکن خواجہ صاحب کو اس سے اتفاق نہیں ہے ، ان کے خیال میں اس کی ابتدا وہابی تحریک سے ہوئی ہے ، لکھتے ہیں :

"ہمارے عام ادبی مورخوں نے وہابی ادب پر بہت کم توجہ کی ہے، لیکن سچ پوچھیے تو وہابیوں کی عسکری شکست کے باوجود، ان کا اسلوب تحریر خاصا مقبول رہا ہے، اس لیے کہ اس کی سرحدیں مستقبل سے مل گئی ہیں۔ یہ خیال کہ عوام تک پہنچانے کے لیے سادہ آسان طرز کی ابتدا سرسید احمد خاں نے کی، تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں۔ وہابی ادب کو موجودہ اردو نثر کے ارتقا میں ایک اہم مقام حاصل ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو دہلی کالج کی نثر اور سرسید احمد خاں کی تصانیف معرض وجود میں نہ آتیں۔ میں یہ بھی عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ سادہ و آسان نثر انگریزوں کی دین ہے، جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے، اس کی ابتدا بھی وہابی مصنفین کی بدولت ہو چکی تھی۔" (صفحہ ۳۸)

بلاشبہ یہ مقالہ خلوص اور محنت سے لکھا گیا ہے، لیکن اردو میں کتابی صورت میں چھپنے کے لیے اسی قدر کافی نہیں ہے، نظر ثانی کر کے اسے مزید مفید اور مدلل بنایا جانا چاہیے تھا اور اس میں اس کی کافی گنجائش تھی۔ مثلاً وہابی تحریک کو فروغ دینے کے لیے جو نیم مذہبی اور نیم سیاسی کتابیں لکھی گئیں، ان کے بارے میں فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "وہ عوام کے فائدے کے لیے صاف اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہیں، اس لیے ان سے اردو کو تقویت پہنچی اور اس سے جدید نثر کے لیے زمین ہموار ہو گئی۔" (صفحہ ۳۹) یا اس سے پہلے موصوف نے لکھا ہے کہ "اس ادبی لٹریچر میں چند ان ادبی محاسن نہیں، تاہم اردو نثر کی تاریخ میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ وہابی مصنفین اور اہل قلم نے اردو نثر کے پر تکلف اسلوب کو بالکل بدل دیا۔" (صفحہ ۳۷) یہ دعوے یقیناً صحیح ہوں گے، مگر جب تک ثبوت نہ دیے جائیں محض دعوے ہی دعوے ہیں۔ مقالے میں تو تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں رہی ہو گی، کتاب میں یہ کمی یقیناً بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ یہاں ان تمام کتابوں کا تفصیل سے جائزہ لینے کی اور اس نثر کے نمونے پیش کرنے کی ضرورت تھی، جو وہابی تحریک کے سلسلے میں لکھی گئیں اور جن کی بدولت اردو نثر کا رنگ بدلا۔

ایک جگہ خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ "یہ بات بھی اہم ہے کہ اس وہابی ادب کی اشاعت

ہندوستان کی پوری [illegible] میں [illegible] شریک ہیں (صفحہ [illegible]) مگر خواجہ صاحب
خود اسی کے آگے صفحہ ۲۲ پر یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے بیٹے حضرت شاہ رفیع الدین نے
ایک مشہور کتاب فارسی میں لکھی ہے، اس کا نام ہے "تنبیہ الغافلین"۔ اس کا ترجمہ اردو میں [illegible]
نے کیا ہے۔" (صفحہ ۲۲) ظاہر ہے محض یہ ثبوت اتنے بڑے دعوے کے لیے کہ وہابی ادب کے
فروغ میں ہندو بھی شریک ہیں۔ بہت کمزور اور ناکافی ہے۔

اس طرح وہابی تحریک کی ناکامی پر بحث کرتے ہوئے صرف ڈیڑھ پونے دو صفحے لکھے گئے ہیں۔
خواجہ صاحب نے لکھا ہے: "یہاں وہابی تحریک کی ناکامی کے اسباب کے متعلق چند جملے لکھنا ضروری ہیں۔"
(صفحہ ۳۸) میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی بڑی تحریک کی ناکامی کے اسباب چند جملوں میں کیسے بیان کئے
جا سکتے ہیں۔ اگر خواجہ صاحب شاعر ہوتے تو میں سمجھتا کہ وہ ایک مصرع میں بات کہنے کے عادی
ہو گئے ہیں، مگر انھوں نے تو "میر تقی میر" جیسی ضخیم کتاب لکھی ہے، انھیں تو پر دعویٰ اور بحث کا حق
ادا کرنا چاہئے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ اور اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے ناکامی کا پہلا سبب یہ
بیان کیا ہے کہ "یہ تحریک جو توہمات کے خلاف وجود میں آئی تھی وہ خود اپنے ہی توہمات کا شکار ہو گئی۔"
(صفحہ ۳۸) اس کے لئے خواجہ صاحب نے صرف ایک رسالہ کا حوالہ دیا ہے، میرے خیال میں مجاہدین
کی اس مقدس تحریک کے لیے، جس کا سرچشمہ بقول خواجہ صاحب در اصل شاہ ولی اللہ کے افکار
و خیالات ہیں، محض ایک رسالہ کا حوالہ کافی نہیں ہے اور یہ تو خواجہ صاحب کی بہت زیادتی ہے کہ
انھوں نے جس رسالہ کا حوالہ دیا ہے خود انھیں کے بقول اس کا مصنف گم نام ہے۔ ممکن ہے کچھ
ایسے لوگ بھی ہوں جو سید صاحب کو ابھی زندہ سمجھتے ہوں اور ان کا یہ عقیدہ ہو کہ وہ مہدی موعود
کی حیثیت سے ظہور فرمائیں گے، مگر پوری تحریک پر یہ الزام لگانے کے لیے کہ خود اپنے ہی توہمات
کا شکار ہو گئی، وزنی حوالوں اور ناقابل انکار دلائل کی ضرورت ہے۔

خواجہ صاحب ایک منجھے ہوئے اور سینیئر مصنف ہیں، یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی
زبان کے بارے میں کچھ کہا جائے، مگر ان کی سنجیدگی ہی کی وجہ سے عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان

ے ایک [illegible]

کے لیے وہ پابندیاں لکھیں گے۔ اس مقالے میں ایسی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ مثلاً ذہبی بجز عسکری"، رسالہ کے لیے مجلہ یا انبیاء کے بجائے نبی۔ مگر میں ان الفاظ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کی صحت کے بارے میں مجھے شبہ ہے، مثلاً ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے: "ان خوارق و کرامات اور شرک ..." (صفحہ ۱۱) خواجہ صاحب نے جس مقصد کے لیے "خارق" کا لفظ استعمال کیا ہے، میرے خیال میں تنہا یہ لفظ کافی نہیں ہے، اس کے ساتھ "عادات" کا اضافہ کرنا چاہیے، یعنی خارق عادات ہونا چاہیے۔ معاشرت، مفاہمت اور مساوات جیسے الفاظ میں "باہمی" کا مفہوم موجود ہوتا ہے، ان کے ساتھ "باہمی" کا استعمال زائد از ضرورت ہے، مگر خواجہ صاحب نے ہر جگہ ان کے ساتھ "باہمی" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ جہاد کرنے والے کو "مجاہد" کہتے ہیں، خواجہ صاحب نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے، مگر ایک دو جگہ "جہادی" بھی لکھا ہے۔ صفحہ ۲۰ کے آخر میں ہے:

"... اخلاقی اور اقتصادی اصلاح کے ذریعے ایک ایسا منضبط معاشرہ قائم کیا جائے جو قرآنی تعلیم، تقرب الی اللہ، ایثار و عمل، خدمت خلق، عدل و انصاف اور تربیت نفس کے ذریعے اجتماعی بیماریوں کا علاج کر سکے۔"

اولاً میں "منضبط معاشرہ" کا مطلب نہیں سمجھ سکا، دوسرے جب لفظ "معاشرہ" کے بعد اس کی وضاحت یا تعریف کے لیے بہت سے اسمائے صفات استعمال کیے گئے ہیں تو اس سے پہلے لفظ "منضبط" استعمال کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔

افعال ناقصہ کے بارے میں اردو میں کوئی اچھا طریقہ رائج نہیں ہے، کوئی مبتدا کے مطابق فعل لاتا ہے اور کوئی خبر کے مطابق۔ اگرچہ مولوی عبدالحق مرحوم نے لکھا ہے کہ فعل مبتدا کے مطابق ہونا چاہیے (قواعد اردو صفحہ ۲۴۳) مگر استعمال میں دونوں طریقے رائج ہیں، لیکن غالباً اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ ایک ہی شخص —— اور ایک ہی تحریر میں —— دونوں طریقوں پر عمل کرے۔ خواجہ صاحب نے ایسا ہی کیا ہے۔ کتاب کے بالکل شروع میں لکھتے ہیں: "... جن کا سرچشمہ خدا اصل

شاہ عالم کے اکابر خوانین پر ہے [illegible] کے مطابق ہے حالانکہ مبتدا کے لحاظ سے [illegible]
سے فعل نہیں ہے۔ "اکابر خوانین" کے مطابق ہے۔ مگر سطر ۲۲ پہلا حصہ کے برعکس ہے۔ یعنی فعل کے مطابق ہو سکتی ہے۔

"تماشبینوں کی سانس تک اکتا رہے، بے توجہی اور تماشا صرف ملاقاتیوں کی کارفرمائی سے بے اعتنائی بھی تحریک کی ناکامی کا سبب تھی۔"

یہاں فعل "سبب" کے لحاظ سے نہیں ہے۔ "بے توجہی" اور "بے اعتنائی" کے لحاظ سے ہے۔ یعنی ایک جگہ فعل خبر کے لحاظ سے ہے اور دوسری جگہ مبتدا کے مطابق۔ "نثر کرہ" کی یہ مثال کسی منجھے ہوئے ادیب کے یہاں نہیں ہونی چاہیے۔

تبصرہ خاصا طویل ہو گیا، مگر ایک گزارش اس کتابچے کی قیمت کے بارے میں بھی کرنی چاہتا ہوں۔ آج کل اردو کتابوں کی نکاسی کی شکایتیں بہت عام ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ایک رجحان یہ ہے کہ ایک کتاب کی جو مناسب قیمت ہونی چاہیے اس سے تین گنی چار گنی مقرر کی جاتی ہے۔ افراد سے شاید ہم اس سلسلے میں کچھ نہ کہہ سکیں، لیکن جن اداروں کو حکومت سے امداد ملتی ہے، ان سے یہ شکایت ضرور کی جا سکتی ہے۔ زیر تبصرہ کتابچے کی قیمت زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ ہونی چاہیے تھی، لیکن چونکہ حکومت کی امداد سے شائع کیا گیا ہے، اس لیے اس کی قیمت پچاس پیسے مقرر کرنی چاہیے تھی۔ دو روپیہ قیمت تو کسی لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔ ادھر حال میں شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی کی بعض کتابوں پر نظر پڑی تو ان کی قیمتیں بھی معمول سے زیادہ تھیں۔ خواجہ صاحب سے درخواست ہے کہ غریب اردو زبان کی خاطر وہ اس پر مزید غور فرمائیں۔

نثر کا حسن —— میرے عہد کے صاحب طرز نثرنگار (حصہ دوم)

مرتبہ: ڈاکٹر عابد رضا بیدار

سائز [illegible]، حجم [illegible] صفحات، مجلد مع گردپوش، قیمت دس روپے، سال اشاعت: [illegible]
ناشر: [illegible] انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ۱۸۰۴۔ [illegible] دہلی ۶

[illegible] کے نقطۂ نظر کے مطابق اردو میں جو صاحب طرز ادیب ہیں، ان کی تحریریں

[illegible]

[illegible] کے عنوان کے تحت کتاب [illegible] حصہ [illegible]

مرتب کے عہد کے صاحب طرز نثر نگاروں کے نمونے ہیں ۔ چونکہ اس انتخاب میں صرف ذاتی پسند [illegible]

کو معیار بنایا گیا ہے اس لیے ان میں ایک دو ایسے نثر نگار بھی نظر آئیں گے جن کا بہت سے لوگوں نے

نام بھی نہیں سنا ہوگا اور کچھ ایسے لوگ ہیں جو معروف تو ہیں مگر انھیں صاحب طرز [illegible] ۔ اس

حصے میں حسب ذیل ادیبوں اور صحافیوں کے نثری نمونے شامل ہیں :

(۱) مجنوں گورکھپوری (۲) عبدالماجد دریا آبادی (۳) محمد عثمان فارقلیط (۴) عبدالباری (۵) حبیب احمد

صدیقی (۶) عامر عثمانی (۷) فکر تونسوی (۸) م یوسف (۹) قرۃ العین حیدر (۱۰) [illegible] الدین احمد

مذکورہ بالا نثر نگاروں کا بہت اختصار کے ساتھ حاشیے میں تعارف کرایا گیا ہے اور جس طرح بعض

انتخابات میں فیاضی سے کام لیا گیا ہے ، اسی طرح تعارف میں بھی کہیں کہیں بہت بہت مبالغے سے کام

لیا گیا ہے ۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان تمام تعارفوں کی کتابت خود فاضل مرتب نے کی ہے ، اور

کے علاوہ قرۃ العین حیدر کی پوری تحریر بھی ، جو ۹ صفحات میں آئی ہے مرتب کے قلم سے ہے :

فروغ اردو ــــ محسن کاکوروی نمبر   مرتبہ : محمد حسین شمس علوی

سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ ، حجم ۱۹۷ صفحات ، غیر مجلد ، اس نمبر کی قیمت : تین روپے

سال اشاعت : اپریل ۔ جون ۱۹۷۵ء   پتہ : ۳۷ ۔ امین آباد پارک ، لکھنؤ (یوپی)

ماہنامہ فروغ اردو نے بہت سے مفید خاص نمبر نکالے ہیں ، ان میں سے بعض بہت ضخیم ہیں ، یہ

تیسو نمبر بہت ضخیم تو نہیں ہے ، مگر اس کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے ۔

حضرت محسن کاکوروی (۱۸۲۷ ــ ۱۹۰۵) ایک خوش فکر اور خوش گو شاعر تھے ، مگر نعت

میں انھوں نے امتیاز حاصل کیا ، بقول فاضل مرتب " ایسا شاید ہی ہے کہ اردو شعرا میں محسن کو نعت گوئی میں [illegible]

[illegible]

[illegible] کی اس تحریر سے ہوتا ہے [illegible] (جہانِ نو) [illegible] موصوف کی شخصیت اور فن کے بارے میں مشہور ادیبوں کے مضامین اور بیانات شامل ہیں۔ (عبداللطیف اعظمی)

ہِم کماری از صالحہ عابد حسین

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۹۲ صفحات، سال اشاعت: ۱۹۷۰ء۔ غیر مجلد قیمت: دو روپے

ملنے کا پتہ: ایس۔ ایم بکڈپو۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔

اس چھوٹی سی کتاب کے جاذبِ نظر سرورق پر آپ کی نگاہ ضرور ٹھہرے گی مگر ممکن ہے کہ مصورانہ مناظر اور اپنے انوکھے پن کی وجہ سے عنوان سمجھنے میں توقف ہو۔ پھر آپ کتاب کھولیں گے تو گمان ہے کہ نام کے بارے میں کچھ سوچنے لگیں۔ لیکن پیش لفظ کی چند ابتدائی سطریں پڑھتے ہی یقین ہو کہ آپ نام کی معنویت مزید محسوس کریں گے اور شاید پھر پلٹ کر سرورق دیکھیں اور محظوظ ہوں۔ پیش لفظ کے ابتدائی جملے یہ ہیں:

"سنو فلیک" انگریزی کے مشہور مصنف پال گیلیکو کی مشہور کتاب ہے۔ بڑی دلکش اور پُرتاثیر۔ ہِم کماری کا خیال اسی کتاب سے مستعار لیا گیا ہے۔ "سنو فلیک" داستان ہے انگلستان کے ایک قطرۂ ابر کی جس میں مصنف نے اس کی زبانی سے اپنے وطن کی زندگی کی کامیاب تصویر کشی کی ہے اور ساتھ ہی برف کے اس ننھے سے ٹکڑے کی داستانِ حیات اس حسن و خوبی اور انوکھے انداز میں بیان کی ہے کہ وہ صرف اسی کی ہی نہیں بلکہ ساری مخلوق کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔"

یہاں "ہِم کماری" کا جنم ہمالیہ کے دامن میں ہوا ہے اور وادیٔ کشمیر سے اس کے سفرِ حیات کا آغاز ہوتا ہے۔ اس داستان میں کشمیر کی زندگی کی بڑی حقیقی اور پُرلطف جھلکیاں ملتی ہیں۔ پھر میدانی علاقے کے مناظر سامنے آتے ہیں اور شہری گہما گہمی کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔ اس دریائی سفر کا قدرتی بحرِ ناپیدا کنار کی آغوش میں [illegible] ہِم کماری [illegible] کے بارے میں ہمیں بتایا تھا کہ "سخت سردی کے ایک

[illegible] وں، جانے زمین سے کتنے میل اوپر، آسمان کی بلندیوں میں جا کر ختم ہوا۔ لیکن ایک [illegible]
[illegible] ئی بادل کے سینے سے جب برفانی ہوائیں ادھر ادھر اڑاتی پھرتی تھیں، میں وجود میں آ گئی تھی [illegible]
ریح ہم کاری" کی زبانی ہی اس کا انجام بھی سنیے: "اب سمندر میرے نیچے تھا۔ بڑھتے ہوئے سورج نے
ب مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں اب سوکھ رہی ہوں، سکڑ رہی ہوں، تھوڑی دیر بعد مجھ کو بھاپ
۔ بس بھاپ کا ایک ننھا سا پر آسمان پر تیرتا نظر آئے گا ۔۔۔ میرے اوپر بہت بلندی پر ایک سفید بادل
تیر رہا ہے۔ کیا یہی ہے میری منزلِ مقصود؟ اور اب مجھے یاد آیا کہ میں پیدا بھی ایک بادل ہی کے
سینے میں ہوئی تھی۔"

اس حیاتِ استعار کا سارا بیان نہ صرف پرکیف ہے بلکہ جغرافیائی اور سماجی حالات کی صحیح تصویر بھی ہے۔ صرف ایک جگہ معصوم سا سہو ہوا ہے۔ وادئ کشمیر میں عید کی دھوم دھام کے ساتھ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "مسجد کے مینار سے ایک پروقار آواز بلند ہوئی ۔۔ اذان کی آواز" (۲۳) لیکن عید کی نماز میں اذان نہیں ہوتی ہے! مگر یہ سہو معصوم اس لیے کہلانے کا مستحق ہے کہ ہماری سماجی زندگی میں خواتین کو عید کی نماز سے سروکار نہیں ہے۔ ایک جگہ یہ لکھا گیا ہے کہ "یہ وہی ماسٹر جی ہیں جن کا ہم شبیہ بچوں نے بنا کر کھڑا کیا ہے" (۲۴) یہاں اگرچہ ہم شبیہ مفہوم کے اعتبار سے بالکل درست ہے لیکن اس سے ترجمے کی کچھ غرابت ٹپکتی ہے۔ عموماً ایسے موقعوں پر 'پتلا' استعمال کرتے ہیں۔

"ہم کاری" کی زندگی ہمارے سامنے یہ سوال کھڑا کر دیتی ہے کہ "ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا؟" مگر ساتھ ہی ساتھ یہ جواب بھی مل جاتا ہے کہ "جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!"۔ اور اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ مقصدِ ہستی کی نشان دہی بڑے لطیف انداز میں ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کے آخری چند جملے یہ ہیں:

"اور اس سے پہلے کہ تم اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کرے، اس نے جو آخری چیز محسوس کی وہ یہ تھی کہ اس کے چاروں طرف ہوا، آسمان، ہر چیز سے ایک دلکش روشنی، نرم اور پیاری [illegible] [illegible]

"شاباش بہن — شاباش — تم نے اپنا کام بہت اچھی طرح انجام دیا۔ آؤ واپس آؤ —
گھر آجاؤ"

آخر یہ 'شاباش' کس بات کی ہے؟ محبت اور خدمت کی! اب یہ ایک برف پارے کی زندگی ہو یا ہماری اور آپ کی۔ بات اتنی ہی ہے۔

محترمہ صالحہ عابد حسین نے اس داستان میں ہم کلامی کی بڑی مؤثر مثال پیش کی ہے۔ یہ ایک کامیاب تمثیل نگاری کا نمونہ بھی کہلائی جا سکتی ہے۔ وہ ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ سوانح نگار کہلانے کا بھی حق رکھتی ہیں اور بچوں کے لیے بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ 'ہم کلامی' میں اُن کی ان تمام صفات کی نمود ملتی ہے۔ اُن کی تحریریں نہ صرف زبان کا لحاظ اور 'پاسِ وضع' کا احترام ملتا ہے بلکہ اقدار کی آبیاری بھی پائی جاتی ہے۔ 'ہم کلامی' ان سب باتوں کا ایک ننھا سا نمونہ کہلانے کی مستحق ہے۔ یہاں ثانوی مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کو اس چھوٹی سی کتاب میں عام سائنس اور معلومات عامہ والی بات، لطافتِ زبان اور پیامِ عمل کے ساتھ ملے گی لیکن بڑوں کی دلکش نثر اور حسین منظر کشی کی لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ حیات اور مقصدِ حیات کا ادراک بھی ہو سکے گا۔ (عبداللہ ولی بخش قادری)

ماہنامہ جامعہ

کا

خاص نمبر

ماہنامہ جامعہ کا اگلا شمارہ خاص نمبر ہوگا، جو جامعہ ملیہ کے جشن زریں کے موقع پر ۲۹ر اکتوبر کو شائع ہوگا اور خریداروں کو مقررہ تاریخ کے مطابق ۲ نومبر کو روانہ کیا جائے گا۔ یہ شمارہ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔ خریداروں اور مضمون نگاروں کو اور تبادلے میں یہ شمارہ انڈر سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ بھیجا جائے گا۔ اگر اتفاق سے کسی کو یہ شمارہ نہیں ملا تو ہمارے لئے دوبارہ بھیجنا مشکل ہوگا، اس لیے اگر کوئی صاحب چاہیں کہ ان کا رسالہ بذریعہ رجسٹری بھیجا جائے تو براہ کرم وہ رجسٹری کا خرچ ایک روپیہ بھیجدیں۔

منیجر ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

جامعہ

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

جلد ۶۲ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۷۰ء شمارہ ۴

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی ۲۵

شذرات

تاریخ ساز شخصیتوں کی طرح تاریخی اہمیت کے اداروں کی زندگی بھی جو تعلیم وتربیت کی نئی زمینیں توڑنے کا حوصلہ کرتے ہیں اور جنھیں ہمیشہ نئی جولانگاہوں کی تلاش رہتی ہے، ایسے نشیب و فراز اور پُر پیچ راہوں سے گذرتی ہے کہ اکثر بند ذہنوں کو ان کی رفتار ترقی کا صحیح صحیح اندازہ لگانے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ جسے قائم ہوئے ۲۹؍اکتوبر ۱۹۷۰ء کو پچاس برس ہو جائیں گے، اسی طرح کا ایک تعلیمی و تہذیبی ادارہ ہے، اور آغاز کار ہی سے قوم اور ملت نے سختی سے اس کا احتساب کیا ہے، ہماری جماعت میں جو تقلید اور شخصیت پرستی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں، شاہراہ عام سے ہٹ کر کام کرنے والوں پر جتنی سخت نکتہ چینی کی جاتی ہے، اتنی کسی اور پر نہیں ہوتی، اس طرح کی نکتہ چینی کرنے والے عملی زندگی کی آزمائشوں سے دور رہتے ہیں اور ایک طرح کے "راہب" بن کر دنیا کی آلودگیوں سے الگ ہونے کے بجائے عمل کی دنیا سے الگ رہ کر کام کرنے والوں پر طنز و تشنیع کے تیر برساتے ہیں اور اس خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں کہ جہاد باللسان کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔

آزادی سے پہلے ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جشن سیمیں منایا گیا تھا، آزادی کے بعد امسال جشن زریں منایا جا رہا ہے، پہلی ربع صدی سخت آزمائشوں کا دور تھا، کبھی دل ٹوٹ جاتا تھا کہ معلوم نہیں جامعہ زندہ رہ پائے گی یا نہیں، کبھی یہ آس بندھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ جس نے اپنے بندوں سے کہہ دیا ہے کہ میری رحمت سے کبھی مایوس

ر، محنت وجانفشانی اور ایثار وقربانی کا انعام ضرور دے گا، جامعہ کا کام بڑھے گا اور اس
، اساتذہ وطلبار اخلاقی قدروں کے خادم اور دکھی دلوں کا مرہم قرار پائیں گے، اور اس
ے میں اسلام اور اسلامی تہذیب کے سچے ترجمان سمجھے جائیں گے۔ ۱۹۴۷ء کا سال جو ہماری
زادی کا سال ہے، جامعہ کی زندگی کا بہت کڑا سال تھا، یہ ادارہ پوری طرح خطرات کے نرغے
ں تھا، معلوم ہوتا تھا کہ یہ چھوٹی سی تعلیمی بستی برباد کر دی جائے گی اور یہ جماعت منتشر ہو جائے
، لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی قیادت میں سب نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم مر جائیں گے لیکن اس دیار
زیز کو چھوڑ کر نہ جائیں گے، خدا خدا کرکے قتل وغارت گری کا خونیں بادل چھٹا اور جامعہ
ں پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھی بچے اور بڑے آئے، اُن کی تعلیم کا انتظام کیا
ا، اُن کے دُکھ درد کو سمجھا گیا اور اُن کو محبت اور پیار سے رکھا گیا، شروع میں تو وہ
برائے گھبرائے رہے کہ یہ بھی اسی طرح کے مسلمان نہ ہوں جنھوں نے انھیں گھر
ے بے گھر کیا تھا، لیکن جلد ہی انھیں یقین ہو گیا کہ مسلمانوں میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں،
را خیال ہے کہ اس وقت کے ماحول میں جامعہ کی یہی ایک خدمت ایسی ہے جو اس کی
ریخ کا زرین باب کہی جاسکتی ہے۔

آزادی کے بعد سے اب تک جامعہ کی توسیع وترقی اس نہج پر ہوئی ہے کہ اس
نے ہر منزل میں اپنے تہذیبی منصب کو یاد رکھا ہے اور اپنے تہذیبی موقف پر جمے رہنے
ا عزم کیا ہے، اقلیتی اداروں کو ہمیشہ اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ان کی تہذیبی انفرادیت
تی رہے اور اس کے ساتھ وہ ملک کی تعلیمی وتہذیبی سرگرمیوں میں دوسروں کے ساتھ برابر
کے شریک بھی رہیں، یہ کام خاصا مشکل ہوتا ہے لیکن بہرحال ایسا کام ہے کہ اس پر جامعہ جیسے
داروں کی زندگی اور موت منحصر ہے، یہ بات اطمینان کی ہے کہ جامعہ کے اساتذہ وطلبار،
واہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، جامعہ کے تعلیمی مقصد اور تہذیبی موقف کا شعور رکھتے

ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جو اس کی قوت کا سرچشمہ اور ایک تعلیمی و تہذیبی ادارہ کی حیثیت سے اس کے منصب کی محافظ ہے۔ آج بھی ہماری جامعہ میں ایسے مخلصین نکتہ چیں کی کمی نہیں ہے جو ہمیں ٹوکتے رہتے ہیں اور اگرچہ وہ ہمارے نزدیک 'سبک ساران ساحل' میں سے ہیں، پھر بھی ہم اُن کے ممنون ہیں کہ وہ ہم پر اور ہمارے کاموں پر نظر رکھتے ہیں، تعلق خاطر کی ایک قسم یہ بھی ہے جو افراتفری کے اس دور میں روز بروز کمیاب ہوتی جا رہی ہے۔

(ضیاءالحسن فاروقی)

حضرت عیسیٰ نے ایک حکایت بیان کی ہے کہ بونے والے نے بیج بکھیرے، جن میں سے کچھ پتھریلی زمین میں گرے اور انھیں چڑیوں نے چگ لیا، کچھ کانٹوں میں گرے اور جب وہ پھوٹے اور ان میں سے پودے نکلے تو کانٹوں نے انھیں پنپنے نہ دیا، کچھ زرخیز زمین میں گرے اور ان سے تندرست پودے نکلے۔ تعلیمی حوصلوں کے بیج قومی زندگی کی زمین میں بکھیرے جاتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی یہی پیش آتا ہے۔ جامعہ کی ابتدا کسی ایک حوصلے سے نہیں ہوئی، یہ شروع ہی سے حوصلوں کا ایک مجموعہ تھی اور قومی زندگی کی بڑی زمین کے جس ٹکڑے میں اس کے بیج بکھیرے گئے، اس میں بھی پتھر تھے اور کانٹے اور زرخیز حصے۔ اس وقت آپ جامعہ میں جو کچھ دیکھ رہے ہیں، وہ انھیں زرخیز حصوں کی پیداوار ہے۔ ہم اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، مگر سوچتے بھی رہتے ہیں کہ یہ پیداوار کافی ہے یا نہیں اور اپنی قسم کی دوسری جگہوں کی پیداوار سے لگا کھاتی ہے یا نہیں۔

(پروفیسر محمد مجیب کے ایک خطبہ سے اقتباس)

جامعہ کا جشن زریں

۱۹۲۰ ——————— ۱۹۷۰

ماہنامہ جامعہ کے پچھلے شمارے میں اعلان کیا جا چکا ہے کہ جامعہ کے جشن زریں کے موقع
اہنامہ جامعہ کا اگلا شمارہ خاص نمبر ہوگا، جو اکتوبر اور نومبر کے شماروں پر مشتمل ہوگا۔ اس اعلان
ے بعد ہمیں یقین ہے کہ قارئین جامعہ کو اکتوبر کے شمارے کا، انتظار نہیں ہوگا، مگر ڈاکخانہ کے قاعدے
ے مطابق ہر ماہ رسالہ کو شائع کرنا ضروری ہے، اس لیے ہم ایک مختصر سا شمارہ شائع کر رہے
یں، اس سے جہاں ضابطے کی تعمیل ہو گی، وہاں قارئین جامعہ سے باتیں کرنے، اور جشن
ریں کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچانے کا موقع بھی مل جائے گا۔

ند اہم پروگرام

پچھلے شمارے میں یہ تو ہم عرض کر چکے ہیں کہ اس موقع پر صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ
ور وزیر اعظم تشریف لا رہی ہیں۔ ۲۸ر اکتوبر کو صبح کے وقت نائب صدر جمہوریہ جناب گوپال
سروپ پاٹھک جشن زریں کا افتتاح فرمائیں گے۔ ۲۹ر اکتوبر کو جامعہ کی بنیاد رکھی گئی تھی،
س لیے یوم تاسیس کا جلسہ اسی تاریخ کو رکھا گیا تھا اور جلسے کو خطاب کرنے کے لیے
زیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے درخواست کی گئی تھی، مگر اُس دن دیوالی ہے، جس کی وجہ
سے وزیر اعظم کے لیے وقت نکالنا مشکل تھا، لہٰذا اب یوم تاسیس کا جلسہ ۳۰ر اکتوبر کو

صبح کے وقت ہوگا، اسی روز شام کو تقسیم اسناد کا جلسہ ہوگا، جس میں صدر جمہوریہ، عالی:
وی وی گری خطبہ پڑھیں گے۔

ان کے علاوہ تین سیمینار ہوں گے، ایک استادوں کے مدرسہ کی طرف سے، جس کا:
ہے: "اردو کی تدریس کے مسائل"۔ دوسرا جامعہ کالج کی طرف سے ہے، جس کا عنوان ہے
تہذیبی قدروں کی ترقی و اشاعت میں یونیورسٹیوں کا رول"۔ تیسرا اسکول آف سوشل ورک کی طرف سے ہے، جو
عنوان ہے: "مسلمانوں کے سوشل ویلفیر کے مسائل"۔ ان سیمیناروں میں شرکت کے لئے:
کے ممتاز دانشوروں اور مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو دعوت دی جا رہی ہے، بعد میں ان
رپورٹ بھی شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

جامعہ کے متعدد ادارے مختلف قسم کی نمائشوں کی تیاری کر رہے ہیں، ان میں
ایک نمائش کا عنوان ہے: "ہندوستان کی تہذیبی زندگی میں مسلمانوں کا حصہ"

ملت اسلامی کے سامنے جائزہ

جامعہ کے جشن سیمیں کے موقع پر، مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی طرف سے جا
کے ہمدردوں اور علم دوست حضرات کو جو خطوط بھیجے گئے تھے، اس کا پہلا پیراگراف ہم
میں درج کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوگا، جامعہ کے لوگ جب جوبلی مناتے ہیں، تو ا
سامنے کونسا مقصد پیش نظر ہوتا ہے، ذاکر صاحب نے لکھا تھا:

برادرم، السلام علیکم

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کا وہ منظر آپ کی چشم تصور کے سامنے ہوگا جب خدا کے ایک برگزیدہ
بندے نے خانۂ خدا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح کیا تھا۔ اس واقعہ کو چوتھائی
صدی گذر گئی۔ مسلمانوں کی قومی تحریک نے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ بہت
سے سیاسی اور تعلیمی ادارے بنے اور بگڑے۔ لیکن جامعہ ملیہ سخت مشکلوں اور

آزمائشوں کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی زندگی میں آہستہ آہستہ جڑ پکڑتی رہی۔ اب اس نے اتنی قوت حاصل کر لی ہے کہ اس کی شاخیں دور دور تک پھیلیں اور سارے ملک پر چھا جائیں۔ مگر اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جامعہ ملت اسلامی کے سامنے جائزہ دے کہ اس نے اب تک کیا کیا ہے۔

ہماری درخواست کی پذیرائی

کافی عرصہ ہوا، جشن زریں کا اعلان کرتے وقت ماہنامہ جامعہ کے شذرات میں قوم سے امداد کی درخواست کی گئی تھی، جس کے جواب میں ایک صاحب نے علی گڑھ سے فوراً ایک رقم بھیج دی تھی۔ اب ہم نے پچھلے شمارہ میں جب دوبارہ اپیل کی تو بنگلور کے ایک نوجوان مسلمان نے، جو جامعہ کے مستقل خریدار ہیں اور ایک کرسچین کالج میں سائنس کے لکچرر ہیں، وظائف فنڈ کے لئے فوراً پچاس روپے کا ایک چیک بھیج دیا۔ افسوس کہ انھوں نے اپنا نام ظاہر کرنے سے منع کر دیا ہے، ورنہ ایسے مخلصوں کے نام لکھنے میں ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔

مدیر الفرقان (لکھنؤ) مولانا عتیق الرحمان سنبھلی صاحب کا ابھی ابھی راقم الحروف کو خط ملا، جس میں موصوف نے لکھا ہے کہ

"جامعہ کے اس شمارے سے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ مسجد کی تعمیر کے لئے مالی اعانت کی اپیل کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ اگر گنجائش نکلی تو اکتوبر کے "الفرقان" میں چند سطریں لکھ کر میں بھی اس کار خیر میں شریک ہوں گا۔ جامعہ کی یہ کمی تو پوری ہونی ہی چاہیے۔"

امید ہے کہ دوسرے قارئین جامعہ بھی ہماری اس اپیل کی طرف توجہ کریں گے اور چار مدوں میں سے جس مد کے لئے وہ مناسب سمجھیں، امداد فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ ان چار مدوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) مسجد کی تعمیر (۲) وظائف فنڈ (۳) اسکول کی عمارت کی تکمیل (۴) جوبلی فنڈ

جشن زریں کی تاریخوں میں تبدیلی

رمضان المبارک کی وجہ سے جشن زریں کی تاریخوں میں تھوڑی سی تبدیلی کی گئی ہے۔ اب یہ جشن پانچ روز کے بجائے صرف چار روز منایا جائے گا اور ۲۸ اکتوبر کی بجائے ۲۷ اکتوبر کو اس کے پروگرام شروع ہوں گے اور ۳۰ اکتوبر کی شام کو ختم ہو جائیں گے۔

طلبائے قدیم کا جلسہ

اس موقع پر طلبائے قدیم کا بھی جلسہ منعقد ہوگا، جس کی صدارت کے لئے جناب حاجی معین الدین حارث، مدیر روزنامہ اجمل بمبئی سے درخواست کی گئی ہے، امید ہے کہ وہ اسے ضرور قبول فرمائیں گے اور اپنی مادر علمی اور ملک و قوم کی تعلیم کی خدمت کے لئے طلبائے قدیم پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان پر وہ اپنے خطبے میں روشنی ڈالیں گے۔

(عبداللطیف اعظمی)

ہم سیاست سے الگ رہ کر تہذیب پر بھروسہ کرتے رہے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ آج نہیں تو کل انسانیت ان طاقتوں پر فتح پائے گی جو اسے اقتدار، دولت اور ظاہری کامیابی پر قربان کرنا چاہتی ہیں۔ ہمارے ملک کے سیاسی حالات جو نیا رنگ اختیار کر چکے ہیں، ان میں اور بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے عقیدے پر عمل کرتے رہیں۔ ہمارا مذہب انسانیت کے رنگ میں رنگا ہو، ہماری تہذیب عقل اور حس کی ایک دلکش آمیزش ہو اور ایسے مذہب اور تہذیب کی مدد سے ہم تعلیم کی ایک سیاست مرتب کریں جس کا مقصد یہ ہو کہ حق شناس افراد کے ذریعہ ہماری قوم میں حق اور حسن کا چرچا کیا جائے

(پروفیسر محمد مجیب)

مطبوعہ:۔ یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۶ پرنٹر پبلشر۔ عبداللطیف اعظمی

سالانہ چندہ
آٹھ روپے

جامعہ

اس شمارے کی قیمت
دو روپے

جلد ۶۲ | بابت نومبر سنہ ۱۹۷۰ء | شمارہ ۵

فہرست مضامین

تعلیمی ادارے

امیرِ جامعہ

شیخ الجامعہ

چند مرحوم اساتذہ

شذرات

آج ۲۹ اکتوبر ہے، آج ہی کے دن ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ ایم۔ اے۔ او کالج (جواب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے) کی مسجد جامع میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے مقدس ہاتھوں نے اس کی نیو رکھی تھی۔ اس واقعہ پر پچاس برس گزر گئے، اس وقت کے کچھ لوگ ابھی باقی ہیں اور اس موقع پر موجود تھے، انھیں تو یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہوگی، اور ویسے بھی قوموں کی زندگی میں پچاس برس کچھ زیادہ نہیں، بس سمجھ لیجیے کہ ایک لمحہ، لیکن کبھی کبھی ایک لمحہ بھی صدیوں پر بھاری ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ کی یہ زندگی جو نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے، اسی طرح کا ایک لمحہ ہے جو اپنے اندر تعمیر و حسرتِ تعمیر، امیدوں اور ناامیدیوں، حوصلہ مندیوں اور درماندگیوں کی ایک دنیا رکھتا ہے، کیسے کیسے پاک سیرت و پاک نظر انسان تھے جنھوں نے جامعہ کے سخت دنوں میں اسے زندہ رکھا، پھر قومی تعلیم کے کام کا ایک نقشہ بنایا اور لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا؛ انجذاب توجہ و نظر کی یہ نوعیت ایسی تھی جیسے بوریہ نشین درویشوں کی طرف شاہوں اور منعموں کی احترام کی نظر اٹھتی ہے یا جیسے رات کا سناٹا ہو اور کہیں دور سے جنوں کی آواز آ رہی ہو، اس آواز میں اتنی تاثیر ہو کہ لوگ دیر تک اسے سنتے رہیں اور محسوس کریں کہ یہ ان کے دلِ گم گشتہ ہی کی پکار ہے جو صحرا سے آ رہی ہے اور عزم سفر کی دعوت دے رہی ہے، کامل پچیس پچیس سال تک، جامعہ ملک کے سیاسی ہنگاموں سے الگ رہ کر (حالانکہ سیاست اور سیاست کاروں کے اس دور میں کسی کے لیے اپنا دامن بچائے رکھنا بہت مشکل تھا) ایک ویرانے میں چمن بندی کرتی رہی، اس کا یہ کام چھوٹا ہے یا بڑا، اسے دیوانگی پر محمول کیا جائے یا فرزانگی کا ایک معجزہ تصور کیا جائے، یہ ارباب نظر کا کام ہے کہ اسے کیا اہمیت دیتے ہیں۔

جامعہ والے باغبانیِ صحرا کا قانون رقم کرتے رہے، یا یوں کہیے کہ جنوں کی حکایات خونچکاں

لکھتے رہے اور اس قبیلے کی آنکھ کا تارا وہ مردِ خدا تھا جس کی مدت العمر کی بے قراریوں کو ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو ہمیشہ کے لیے قرار آگیا اور جو اب جامعہ ہی میں آسودۂ خاک ہے، ہماری مراد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے ہے جن سے اسی ہفتے ہم لوگ جشنِ زرّیں کے سلسلے میں مشورہ لینے جانے والے تھے، اور اس بات پر بہت خوش تھے کہ اگرچہ جوہر و اجمل و انصاری، مولانا آزاد اور گاندھی جی اب ہم میں نہیں رہے لیکن کم از کم ایک شخص تو ہے جس کا شمار جامعہ کے بانیوں میں ہے اور جس کی زندگی کے بہترین ماہ و سال اس چمن کو اپنے خونِ جگر سے سینچنے میں صرف ہوئے، حقیقت یہ ہے کہ اگر ذاکر صاحب نہ ہوتے تو شاید جامعہ کا قیام عمل میں نہ آتا، اور قائم ہو جانے کے بعد مرحوم نے اگر اپنی تمام ذہنی و روحانی صلاحیتوں کو اس کے لیے وقف نہ کر دیا ہوتا، تو غالباً آج یہ باقی نہ ہوتی۔ مبدا، فیاض سے ذاکر صاحب کو بہت کچھ ملا تھا، انھوں نے وہ سب کچھ جامعہ کی نذر کر دیا اور آج اسی کا نتیجہ ہے کہ جامعہ نگر کی تعلیمی بستی دنیائے علم و ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے اور گو ذاکر صاحب نہیں ہیں لیکن ان کے افکار و خیالات زندہ رہیں گے اور جامعہ والوں کو ان سے انسپریشن ملتا رہے گا۔

گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جامِ آتشیں رات دن گردش میں رندوں کی بھری محفل میں ہے

آج ذاکر صاحب کے ساتھ ہمیں اُن کے اُن ساتھیوں کی خدمات بھی یاد آ رہی ہیں جنھوں نے جامعہ کو قائم رکھنے اور تعلیم و تعلم اور علم و ادب کے میدان میں نئے تجربے اور نئی کاوشیں کرنے کی دُھن میں اپنے آرام و راحت کا خیال نہیں کیا، جن کے بیوی بچے اچھے کپڑے اور اچھی غذا کو ترستے رہے لیکن وہ خود قوم کے بچوں کی دیکھ بھال، اور تعلیم و تربیت میں لگے رہے، ہماری قوم میں اجتماعی طور پر تعلیمی کام کے لیے ایثار و قربانی مسلسل برسوں، مشکلوں تکلیفوں اور آزمائشوں کو جھیلنے کی مثالیں کم ملتی ہیں اور کیسے کہ پیشانی پر شکن نہیں، ہر وقت ایک پُر کیف سرمستی و سرشاری کی کیفیت جو اچھے کام میں لگے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کے ان ساتھیوں میں جو درجہ،

ہر حیثیت اور ہر طرح کی صلاحیت کے لوگ تھے اور ہر شخص کا کام اپنی جگہ اہم اور ضروری تھا، ڈاکر صاحب جامعہ کے سردار کی حیثیت سے سب کے دلوں میں اُمید اور یقین کی شمع روشن رکھتے، اور جب سب یہ دیکھتے کہ ڈاکر صاحب خود جو ایثار و قربانی، اخلاقی فضائل، ذہنی صلاحیت، خاندانی شرافت میں کسی سے کم نہیں ہیں، چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں تو ان کا یقین جامعہ کے بلند نصب العین پر اور بھی زیادہ پختہ اور ان کا عزم اس کے حصول کے لیے اور زیادہ مستحکم ہو جاتا۔ ایسے تمام لوگوں کا قوم پر احسان ہے اور قوم کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان کی بے لوث خدمات کے سہارے جامعہ، باوجود صد ہا دشواریوں کے، نہ صرف یہ کہ زندہ رہی بلکہ اس نے اپنے مختلف تعلیمی و علمی و ادبی کاموں سے ہندوستان میں بالعموم اور خاص طور سے مسلمانوں میں ایک نئی ذہنی بیداری پیدا کی اور آج بھی "جاگو اور جگاؤ" کا پیغمبرانہ کام صدقہ جاریہ کی طرح جاری ہے۔

جشنِ سیمیں (۱۹۴۶ء) کے موقع پر جن منصوبوں کو عمل میں لانے کا نقشہ پیش کیا گیا تھا ان میں سے کئی ایک عمل میں لائے گئے، البتہ کتب خانہ جامعہ کی عمارت اور مسجد ابھی تک نہیں بن سکی تھیں، علوم اسلامیہ کے تحقیقاتی ادارے "بیت الحکمت" کا کام آگے نہیں بڑھ سکا اور یہ خواب، خواب ہی رہا۔ جامعہ والوں کو ان تینوں منصوبوں کے ملتوی ہوتے رہنے پر سخت تشویش تھی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کتب خانہ علوم شرقیہ کے نقطۂ نظر سے ایک اہم اور بیش قیمت کتب خانہ ہے۔ کتابوں کی تعداد اس وقت تقریباً ساٹھ ہزار ہے۔ اس میں جامعہ کالج، ٹیچرز کالج، دوسرے انسٹی ٹیوٹ اور اداروں کے کتب خانوں کی کتابیں شامل نہیں ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت جامعہ کے کتب خانے کی شاندار عمارت کا کافی حصہ بن چکا ہے اور دو تین مہینے میں کتابوں اور قدیم ادبی و علمی رسائل کا قیمتی ذخیرہ جو اس وقت کئی عمارتوں میں پھیلا ہوا ہے، اس نئی عمارت میں منتقل ہو کر یکجا ہو جائے گا اور اس کی افادیت بہت بڑھ جائے گی کہ اس سے بڑے پیمانے پر آسانی کے ساتھ طلبا، اساتذہ اور ریسرچ اسکالر فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ مسجد بھی بن رہی ہے لیکن چونکہ یہ حکومت کے پیسے سے نہیں بلکہ قوم کے پیسے سے بننا ہے،

اس لیے اس کی تعمیر کی رفتار تیز نہیں ہے، اب تک اس پر تقریباً اسّی ہزار روپے خرچ ہو چکے ہیں، اس وقت کوئی بیس پچیس ہزار کی رقم موجود ہے لیکن جیسا کہ اخباروں میں اعلان کیا جا چکا ہے، اس پر پانچ لاکھ روپے صرف ہوں گے، سردست تو کم از کم پچاس ہزار روپے فوراً مطلوب ہیں تاکہ مسقف حصے کی چھت ڈالی جاسکے۔ خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ یہ نیک کام پورا ہو کر رہے گا؛ کیا عجب کہ چند اشخاص غیب سے سامنے آجائیں اور جامعہ کی یہ آرزو، یہ خواب جلد ہی پورا ہو جائے۔

بیت الحکمت کا ذکر آتا ہے تو بے اختیار مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم یاد آجاتے ہیں اور اسی کے ساتھ اُس گہرے معنوی تعلق کے نقوش بھی اُبھر آتے ہیں جو جامعہ کو مولانا اور مولانا کے بزرگوں سے رہا ہے۔ چوبیس سال تک جلاوطنی کی زندگی گزار کر جب مولانا مرحوم وطن لوٹنے کی بابت سوچ رہے تھے تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ جامعہ ملیہ ہی میں وہ آزادی کے ساتھ اپنے خیال کی اشاعت کر سکتے ہیں، چنانچہ انھوں نے ذاکر صاحب کو ایک خط لکھا، اپنے اصلاحی افکار و خیالات سے انھیں باخبر کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر جامعہ کا کوئی استاد مکۂ معظمہ میں ان کے پاس پہنچ جائے تو اُسے وہ اپنی باتیں سنائیں۔ ذاکر صاحب نے اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے پروفیسر محمد سرور صاحب کو اُن کی خدمت میں بھیجا۔ مولانا مرحوم مارچ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان پہنچے اور سندھ میں اپنے عزیزوں سے ملنے کے بعد جامعہ تشریف لائے اور ۱۹۴۴ء تک جو ان کی وفات کا سال ہے، جامعہ ہی ان کا مستقر اور مرکز رہی، وہ اکثر سفر میں رہتے اور لوٹتے تو جامعہ ہی لوٹتے، جامعہ کو دیکھ کر اُن پر جو اثر ہوا تھا اُسے انھوں نے یوں بیان کیا ہے:

> "ہم ایک طویل زمانہ دوسری قوموں کی ترقی کے سامان دیکھتے دیکھتے پہلے حسرت اور پھر وحشت کے غلبے سے پریشان ہو گئے تھے۔ اگر چند روز اور اسی طرح رہتے تو ممکن تھا کہ ہم اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے ..... جب ہم جامعہ نگر پہنچے تو سب سے پہلے جامعہ کی شاندار عمارت سے ہم متاثر ہوئے ہم نے استانبول میں باسفورس کے کنارے کالج دیکھے ہیں، ہمیں وہی لطف جمنا کی اس وادی

میں نظر آیا۔ جب ہم اسے اپنی چیز سمجھتے ہیں تو دماغ کی گہرائیوں تک سرور محسوس ہوتا ہے ..... ہماری طبیعت جب سے ہم وطن میں آئے سبزہ اور بچوں کو دیکھ کر فی الجملہ سرور حاصل کرتی رہی۔ الحمد للہ کہ جامعہ نگر میں ہمیں دونوں چیزیں ملیں ۔

یہ جھاڑیاں چمن کی یہ میرا آشیانہ

جامعہ کے اساتذہ اور منتظمین کو جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، وہ اس تحریک کی ہمدردی سے معمور ہیں، ہم اسے اللہ رب العزت کی ایک بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں "

مولانا عبید اللہ سندھی کی وفات کے بعد جامعہ والوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مرحوم نے جن بلند مقاصد کے لیے بیت الحکمت کی بنا رکھی تھی، ان کے حصول کے لیے پوری جد و جہد کریں گے اور بیت الحکمت کے کام کو آگے بڑھائیں گے۔ ۱۹۴۶ء میں جشنِ سیمیں کے موقع پر ذاکر صاحب نے اس عزم کو پھر دہرایا تھا لیکن اس کے بعد جو حالات پیش آئے انھوں نے سارے منصوبوں کی تیلیاں بکھیر کر رکھ دیں،

اب ٹھیک ۲۴ سال بعد کہ اتنے ہی عرصہ مولانا سندھی جلاوطن رہے، بیت الحکمت کا خیال آوارہ پھرنے کے بعد ذاکر حسین سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز کی صورت میں متشکل ہو کر سامنے آیا ہے، ذاکر حسین میموریل کمیٹی نے اس سنٹر کے لیے بطور ابتدائی گرانٹ تین لاکھ روپے کی منظوری فرمائی ہے، یہ سنٹر مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جائے اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے ساتھ صحیح اسلامی فکر کی اشاعت کا وسیلہ بن جائے تو ہم سمجھیں گے کہ جامعہ کے اُس کام میں وسعت اور استحکام پیدا ہو گیا ہے جسے جامعہ سچی مذہبیت اور تہذیبی قدروں کی خدمت سے تعبیر کرتی ہے اور جسے گذشتہ پچاس برس میں اُس نے مختلف طریقوں سے انجام دیا ہے۔

بہکھ لوگ کہتے ہیں کہ جامعہ ویسی نہیں رہی جیسی کہ اسے ہونا چاہیے تھا، کچھ لوگوں کا الزام ہے کہ جامعہ نے اپنا وظیفۂ بنیادی فراموش کر دیا، بہت سے ایسے ہیں جو اس کی توسیع و

ترقی سے مطمئن نہیں ہیں، کئی لوگ اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ جامعہ والے روز بروز مطمئن ہوتے جارہے ہیں، جامعہ کے بارے میں شروع ہی سے کچھ نہ کچھ کہا جاتا رہا ہے اور جامعہ والے سُنتے سب کی اور کرتے اپنے من کی رہے ہیں، ہاں، یہ ضرور ہے کہ ہمیں اپنے فرضِ منصبی، اپنے تعلیمی و تہذیبی مشن کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے، ذاکر صاحب مرحوم اور ان کے ساتھیوں کی بتائی ہوئی اسی راہ پر ہمیں چلنا ہے، یہی راہ عزیمت کی راہ ہے، پہلے عوام کے چندے سے جامعہ چلتی تھی لیکن عوام کو اپنا رہنما ہم نے نہیں بنایا، اب حکومت کی گرانٹ سے چلتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم کاسہ لیسی کی زندگی اختیار کریں اور اپنی آزادی و خودداری سے اپنے آپ کو محروم کریں اور حکومت کا ہم سے یہ مطالبہ بھی نہیں بلکہ وہ تو یہ چاہتی ہے کہ جامعہ کی تعلیمی شخصیت، تہذیبی کردار اور اس کی وہ تمام خصوصیات باقی رہیں جن کی وجہ سے یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے بازو نہ سمیٹیں اور ہر لمحہ ایک نئی پرواز کے لیے تیار رہیں۔

جامعہ کے پچاس سال

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پچاس سالہ زندگی میں بہت سے انتظامی اور تعلیمی دور آئے اور ہر دور جامعہ کے کارکنوں کے لئے نئے مقاصد، نئی ذمہ داریاں، نیا حوصلہ اور نیا ولولہ لایا۔ ہم ان اوراق میں اختصار کے ساتھ جامعہ کی زندگی کے ان مختلف ادوار کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، مگر اس سے پہلے ہم اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتے ہیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کسی خاص تعلیمی تقاضے کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک سیاسی ہنگامے کی پیداوار ہے۔ اس کے آغاز کو محض ایک وقتی ہیجان اور ہنگامی جوش وخروش کا رہین منت سمجھنا مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ کسی دورِ انقلاب میں جو خیالات عملی شکل اختیار کر لیتے ہیں وہ درحقیقت زمانہ انقلاب کی پیداوار نہیں بلکہ قوم کی ان بنیادی ضروریات کا مظہر ہوتے ہیں جنھیں وہ بہت پہلے سے محسوس کرتی آئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تخیل نے عمل کا جامہ ایک انقلابی دور میں پہنا مگر اس کی ضرورت ایک عرصہ سے مسلمانوں کے دلوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی، اس تخیل کی ابتدا انگریزوں کے اقتدار کی تاریخ میں تلاش کی جا سکتی ہے۔

ہندوستانی مسلمان اور سرکاری تعلیم

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے ابتدائی زمانے سے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں

کے نظام تعلیم کی عمارت منہدم ہونا شروع ہوگئی ۔ اجنبی حکومت نے اس برباد شدہ عمارت کی بنیادوں پر ایک نئے تعلیمی نظام کی عمارت کھڑی کرنا ضروری سمجھا۔ اس نے پڑھے لکھے ملازم تیار کرنے کے لئے ہندوستانیوں میں ایک نئی قسم کی تعلیم کو رواج دینا شروع کر دیا۔ وارن ہشٹینگز کی پالیسی میں قدیم مشرقی تعلیم کو عصر جدید کے رنگ میں رنگ کر اور ضروریات زمانہ کے مطابق بنا کر قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ۔ لیکن بعد میں یہ خیال ترک کر دیا گیا اور عام طور سے مکالے کا یہ نظریہ کہ ہندوستان کی نجات خالص مغربی تعلیم ہی سے ہو سکتی ہے، مقبول ہو گیا۔ مسلمان اس تعلیم سے جو ان کی مذہبی اور تہذیبی روایات سے بالکل بے تعلق تھی اس قدر بدظن تھے کہ اپنے بچوں کو جاہل رکھنا ان کو انگریزی مدرسوں میں پڑھانے سے بہتر سمجھتے تھے، وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے پرانے قسم کے عربی مدرسوں کو کافی جانتے تھے اور اس سے آگے قدم بڑھانے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ مدرسے اول تو بڑی خستہ حالت میں اور بہت تھوڑی تعداد میں باقی رہ گئے تھے، دوسرے ہندستانی مسلمانوں کے لیے ان مدرسوں کی چہار دیواری میں اس طرح قلعہ بند ہو کر رہنا کہ انھیں دوسری قوموں کے جدید علمی کارناموں سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے، خودکشی کے مترادف تھا۔ اجنبی اقتدار کی نظر میں ایسی تعلیم کی وقعت روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی ۔ اگر مسلمان کچھ دن اور اس نئے نظامِ تعلیم سے اسی طرح بے توجہی برتتے تو وہ ہندوستان کے انتظامی اور دوسرے معاشی شعبوں سے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال دئے جاتے اور انھیں پھر شاید صدیوں تک سر اٹھانے کا موقع نہ ملتا۔ ان معاشی اور عملی مصلحتوں سے مجبور ہو کر انھیں ایک مدت کے بعد مصالحت کی راہ اختیار کرنا پڑی ۔ سرسید کی قیادت میں ایک تعلیمی تحریک شروع ہوئی جس نے مغربی دنیوی تعلیم کو مسلمانوں کے لئے قابل قبول بنانے کی غرض سے اس کے ساتھ کسی قدر دینی تعلیم دینا شروع کر دی۔ یہ تعلیمی نقشہ جو ہنگامی ضرورت سے کھینچا گیا تھا، حقیقت میں مسلمانوں کے ملی نصب العین کے مطابق

نہ تھا۔ خود سر سید مرحوم نے مسلمانوں کی آئیڈیل تعلیم کے جو خاکے قلمبند کئے ہیں وہ اس سے کہیں بلند تھے۔ انھوں نے محمڈن کالج کھول کر مسلمانوں کی ایک وقتی ضرورت کو پورا کر دیا تھا لیکن وہ اسے مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ کا مکمل حل نہ سمجھتے تھے۔ اس کے لئے ان کے نزدیک ایک آزاد یونیورسٹی کا قیام ضروری تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کی تعلیم گورنمنٹ کی مداخلت سے کلیۃً آزاد اور خود مسلمانوں کے اپنے ہاتھ میں نہ ہوگی، قوم وملت کو پورا فائدہ نہ پہنچ سکے گا۔ سر سید نے سید محمود سے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق جو اسکیم تیار کرائی تھی، اس میں کہا گیا ہے:

"یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ برطانوی حکومت ہماری ان حاجتوں کو جو تعلیم وتربیت سے تعلق رکھتی ہیں پورا پورا سمجھے یا ان کا کامل طور سے بندوبست کر سکے۔ اگر ہم کو کچھ روپے کی مدد حکومت دے تو ہمیں اس کی نگرانی پر کچھ عذر نہ ہوگا۔ بشرطیکہ ہمارے انتظام میں کچھ مداخلت نہ ہو۔"

اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اس نصب العین کو سر سید مرحوم نے ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشنل کمیشن کے سامنے بیان کیا تھا:

"جب تک لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں۔ پس ملک کے لئے یہ زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔"

آزاد تعلیم کا یہ تصور مسلمانوں کی اس ذہنیت کے عین مطابق تھا جس نے ان کو کئی سو سال کے دور اقتدار میں تشکیل پائی تھی۔ مسلمانوں کی تعلیم خود ان کے اقتدار کے زمانہ میں بھی حکومت کی دست اندازیوں سے آزاد تھی۔ اور ان کے تمام تعلیمی ادارے حکومت کی مداخلت سے محفوظ رہ کر ملک وملت کی خدمت میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ بغداد میں جب مدرسہ نظامیہ

کی بنیاد اسلامی حکومت کے ہاتھوں سے رکھی گئی تو اس دن علماء نے جمع ہو کر ماتم کیا کہ افسوس آج علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لئے پڑھایا جائے گا۔ اسلامی ہند میں مسلمان بادشاہ مدارس کو مالی امداد تو دیتے لیکن ان کے انتظامی اور تعلیمی نظام میں کبھی دخل نہ دیتے تھے۔ امریکہ اور یورپ میں بھی جہاں جمہوریت کا دور دورہ ہے آزاد تعلیم کے اسی تصور کو پسند کیا جاتا ہے۔

علی گڑھ کالج اور آزادانہ تعلیمی نظام کی کوششیں

سرسید ایک آزاد مسلم یونیورسٹی کے قیام کو اس لئے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ حکومت کے جاری کردہ نظام تعلیم میں صرف ایسے اشخاص کا لحاظ رکھا گیا تھا جو زمانہ تعلیم کے بعد گورنمنٹ کے سررشتہ جات میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں۔ حکومت کی ملازمت زندگی کے ہمہ گیر پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو ہے، جو لوگ اپنی زندگی کو جماعتی تنظیم کے کسی دوسرے شعبے کے لئے وقف کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے حکومت کے اس جاری کردہ نظام تعلیم میں کوئی جگہ نہ تھی۔ اجنبی حکومت کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ ہندوستانیوں کے لیے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کرے جس میں ملازمت کے علاوہ دوسرے شعبہ جاتِ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا سامان ہو۔ یہ خود ہندوستانیوں کا کام تھا۔ اور صرف وہی اسے انجام دے سکتے تھے۔ سرسید کا نصب العین کسی قلیل مدت میں تکمیل نہ پا سکتا تھا۔ وہ شاید اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان کے قائم کردہ تعلیمی ادارے کو قدرت کے قانونِ ارتقاء کے ماتحت اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے بہت سے مدارج سے گزرنا پڑے گا۔ ان کی زندگی ہی میں علی گڑھ کالج کو حکومت نے اپنے سیاسی اغراض کا آلۂ کار بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان کے بعد تو یہ حقیقت بہت واضح طور پر لوگوں کے سامنے آ گئی، لیکن سرسید کے جانشین اس دن کا انتظار کر رہے تھے جب علی گڑھ کالج اس منزل تک پہنچ جائے

جہاں اسے ایک آزاد یونیورسٹی میں تبدیل کیا جا سکے۔ یہ منزل جوں جوں قریب آتی گئی، کالج کے ہندستانی کارکنوں اور انگریزی اسٹاف کے درمیان جو کالج میں اجنبی حکومت کے ایجنٹ کے فرائض انجام دے رہے تھے، کشاکش بڑھتی گئی۔

جس زمانہ میں وقار الملک نے علی گڑھ کالج کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، اس وقت تک کالج کو یونیورسٹی بنانے کے امکانات قریب تر ہو گئے تھے۔ وقار الملک کا تدبر اور انتظامی قابلیت مسلم ہے، وہ یہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ انگریزی اسٹاف نے کالج کی زندگی میں جو اقتدار حاصل کر لیا ہے اور جس کی وجہ سے آنریری سکریٹری اور ٹرسٹیز کی جماعت برائے نام رہ گئی ہے، اس سے اندیشہ ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی بھی حکومت کی دست اندازیوں سے محفوظ نہ رہ سکے گی۔ انگریزی اسٹاف کے طرز عمل کی گذشتہ تاریخ سرسید کے زمانے سے اب تک ان کے پیش نظر تھی، اور وہ خوب جانتے تھے کہ اسٹاف کو ارکان حکومت اور سررشتۂ تعلیم کے اعلیٰ عہدہ داروں پر پورا اعتماد ہے کہ وہ ہر موقع پر ان کی حمایت کریں گے۔ انھوں نے نہایت احتیاط اور تدبر کے ساتھ کالج کو ان لوگوں کے مضر اقتدار سے محفوظ رکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ ۱۹۰۹ء تک وہ اپنی اس جدوجہد میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ اس کے بعد کالج کو یونیورسٹی بنانے کی کوششیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہو گئیں۔ سب سے پہلے روپے کی ضرورت تھی۔ چندہ ہوا، علی برادران اور اس زمانے کے دوسرے رہنماؤں کی مدد سے بہت جلد مجوزہ رقم جمع ہو گئی اور یہ طے پایا کہ ملک معظم کی تاجپوشی کے موقع پر مجوزہ یونیورسٹی کا آغاز کر دیا جائے۔ کانسٹی ٹیوشن بنانے اور حکومت سے اسکیم منظور کرانے کا کام مختلف کمیٹیوں کے ذمہ کر دیا گیا۔ حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ یونیورسٹی کو اسلامی کالجوں اور اسکولوں کے الحاق کا اختیار دیدے۔ گورنر جنرل چانسلر کی حیثیت سے یونیورسٹی کی عام نگرانی کرے لیکن باقی سب اختیارات قوم کے نمائندوں کے ہاتھ میں

رہی۔ اس اسکیم میں حکومت کی نگرانی کو ایک حد تک تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن بڑی حد تک اسے آزاد اور خود مختار رکھنے کی تجویز کی گئی تھی۔ حکومت نے مسلمانوں کے اس قومی مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ نہ مجوزہ یونیورسٹی کو الحاق کا اختیار دینا منظور کیا اور نہ گورنر جنرل کو چانسلر بنانے کی تجویز منظور کی، بلکہ اس کے برعکس یہ طے کیا کہ یونیورسٹی کے تمام معاملات گورنر جنرل باجلاس کونسل کے ذریعہ انجام پائیں، اپنے تعلیمی نظام میں مسلمان، حکومت کی اس حد تک دست اندازی کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ حکومت کے اس فیصلہ کی وجہ سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں ناراضگی اور بددلی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مولانا شبلی مرحوم نے اسی زمانہ میں اپنی ایک مشہور نظم میں مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے :

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد ۔۔۔ کہ ایں سررشتۂ تعلیم با در دست ما باشد
علوم تازہ را با شرع و حکمت باہم آمیزیم ۔۔۔ الٰہی با ریاضی و طبیعی آشنا باشد

نواب وقار الملک اگرچہ کالج کی سکریٹری شپ سے علیحدہ ہو گئے تھے، لیکن ان کی رائے اب بھی کالج کے کارپردازوں کے حلقہ میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ انھوں نے یونیورسٹی کے متعلق ایک مفصل اسکیم تیار کی جس میں حکومت کی تجاویز پر سخت تنقید کی گئی تھی اور انھیں مسلمانوں کے لئے مضر قرار دیا گیا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ اگر کافی غور و بحث اور کوشش کے بعد بھی گورنمنٹ سے معاملہ طے نہ ہو اور حکومت کی نگرانی میں آزاد یونیورسٹی کا قیام ناممکن نظر آئے تو یونیورسٹی کے لئے جو روپیہ جمع ہوا ہے اس کو ایک ایسے جامعہ اسلامیہ کے قیام پر خرچ کرنا چاہیئے جو گورنمنٹ کے چارٹر کا منت کش نہ ہو۔ اس اسکیم میں وہ کہتے ہیں:

"میں چند ماہ پہلے تک جب تک کہ چارٹر کا مل جانا بہت کچھ ممکن تھا۔ اس سوال کو حتی الامکان بایں خیال ٹالتا رہا کہ اس قسم کے مباحثات شروع ہونے کے بعد نفس مطلب سے لوگوں کی توجہ ہٹ جائے گی اور روپیہ کے جمع ہونے میں خلل واقع ہوگا، لیکن گورنمنٹ کے پریس کمیونک اور سر ہارکورٹ بٹلر بالقابہ کے مراسلہ

مورخہ ۱۹ اگست کے مشتہر ہونے کے بعد اب بحث کا ٹالنا ناممکن ہے، جن لوگوں نے بانی کالج کی اسکیم کو پڑھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سرسید مرحوم و مغفور کا منشا ر کالج قائم کرنے سے صرف یہ نہیں تھا کہ چند امیدواران ملازمت اُس کے ذریعے سے ڈگریاں حاصل کریں اور گورنمنٹ کی ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں؛ بلکہ ان کا مقصد اس سے بہت اعلیٰ و ارفع تھا.....

چونکہ گورنمنٹ کی طرف سے ہم کو یونیورسٹی کے ملنے میں دقت پیش آئی ہے، لہٰذا میری یہ رائے ہے کہ اب ہم کو اپنی تعلیم کا پروگرام بدل دینا چاہیئے۔ یعنی اب تک جو یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج ترقی کر کے آل انڈیا مسلم یونیورسٹی بن جائے گا اور اس یونیورسٹی کے ذریعہ سے ہم اپنی ہر قسم کی قومی تعلیمات کا انتظام کریں گے، اس کی جگہ اب ہم کو یہ کرنا چاہیئے کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے واسطے اپنی ایک علیحدہ 'جامعہ اسلامیہ' (قومی دارالعلوم) خود قائم کریں اور جو سرمایہ مسلم یونیورسٹی کے واسطے جمع ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ اس 'جامعہ اسلامیہ' کے سپرد کر دیا جائے جو باستثنائے ضروری اخراجات متعلق تعمیرات کے باقی فنڈ کا صرف منافع خرچ کرنے کی مجاز ہو اور اصل فنڈ کو محفوظ رکھے۔"

اس اسکیم میں جامعہ اسلامیہ کی ضرورت، خصوصیات اور طرز تعلیم پر تفصیل اور وضاحت سے گفتگو کی گئی ہے، اسکیم میں کہا گیا ہے کہ جامعہ اسلامیہ میں تمام علوم کی تعلیم اردو زبان میں ہو اور انگریزی زبان کو ثانوی حیثیت دی جائے۔ نواب وقار الملک اس اسکیم میں فرماتے ہیں کہ:

"ہمارے وہ بچے جو آئندہ ملازمت کا طوق اپنی گردن میں ڈالنے والے نہیں ہیں وہ کیوں ریاضیات انگریزی میں پڑھیں؟ کیوں جغرافیہ انگریزی میں حفظ کریں؟ کیوں تاریخ انگریزی میں پڑھنے کی زحمت برداشت کریں؟

سائنس کے غریب آلات ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ان کا استعمال صرف یورپ کی زبانوں کے ذریعہ سکھایا جاسکتا ہے۔ وہ بسروچشم اس کے لئے حاضر ہیں کہ مسلمان ان کا استعمال اپنی مادری زبان کے ذریعہ سے سیکھیں۔"

نواب وقار الملک کی اس اسکیم کے شائع ہونے کے بعد یونیورسٹی کی فاؤنڈیشن کمیٹی کا دسمبر ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں ایک عام جلسہ ہوا اور اس میں حکومت کی عائد کردہ عام شرائط کی روشنی میں چارٹر کو قبول کرنے کے مسئلے پر غور وفکر کیا گیا۔ جلسے میں یہ طے ہوا کہ مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لئے گورنر جنرل کی خدمت میں ایک ڈیپوٹیشن بھیجا جائے، لیکن آپس میں اس قدر شدید اختلافات رونما ہو گئے تھے کہ اس فیصلہ پر عمل نہیں کیا جاسکا۔ ڈیپوٹیشن کے اختیارات کے بارے میں لوگ کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے اور یہ معاملہ برابر ملتوی ہوتا رہا، فاؤنڈیشن کمیٹی میں یہ معاملہ جولائی ۱۹۱۳ء میں دوبارہ پیش ہوا۔ اس موقع پر نواب وقار الملک نے کمیٹی کے ممبران کو ایک پیام میں یہ مشورہ دیا کہ:

"اختیارات کا مسئلہ بھی جانِ سخن ہے اور جو کچھ فاؤنڈیشن کمیٹی اس کے متعلق تجویز کرے، اس کی ترمیم کا اختیار بھی ڈیپوٹیشن کو فاؤنڈیشن کمیٹی کی منظوری کے بغیر نہ ہونا چاہیئے، اور امید ہے کہ فاؤنڈیشن کمیٹی اس بات کو ملحوظ رکھے گی کہ گورنمنٹ کی یونیورسٹی کے اندرونی انتظام میں بہت زیادہ اختیارات کا حاصل ہونا جناب سرسید صاحب مرحوم ومغفور اور آنریبل سید محمود صاحب مرحوم ومغفور کے اصول کے بالکل منافی ہے اور فی نفسہٖ بھی یونیورسٹی کے انتظام میں مخل ہوگا۔

اور اسی اختیارات کی بحث میں قطعی طور پر اس بات کو صاف کر دینا چاہیئے کہ چانسلر کے اختیارات گورنر جنرل باجلاس کونسل کو کسی حالت میں تفویض نہ کئے جائیں۔"

فاؤنڈیشن کمیٹی نے نواب صاحب کے مشوروں کو قبول کر لیا اور ان کی تعمیل کرنا ایسوسی

ازمن قرار دیا گیا، لیکن ۱۹۱۲ء کی لڑائی چھڑ جانے کے بعد جب علی برادران اور ملک کے دوسرے سربرآوردہ رہنماؤں کو نظر بند کر دیا گیا تو فاؤنڈیشن کمیٹی کے ان ممبران نے جو حکومت کی تجویز منظور کرنے کے حق میں تھے اس بات کی کوشش شروع کر دی کہ مسلمان حکومت کی شرائط کو قبول کر لیں اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہندوؤں نے ان شرائط کو قبول کر لیا ہے اور وہ حکومت کے چارٹر کے ماتحت بنارس یونیورسٹی بنا رہے ہیں، اگر مسلمانوں نے ان شرائط کے قبول کرنے میں دیر کی تو وہ تعلیمی میدان میں ہندوؤں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر ضیاء الدین مخالف فریق کے لیڈروں کی نظربندی سے فائدہ اٹھا کر اس اسکیم کو منظور کرا لینے کے درپے ہو گئے، پھر بھی حکومت سے گفت و شنید میں کئی سال لگ گئے۔ آخر ان حضرات نے ۱۹۲۰ء میں مسلمانوں کی طرف سے حکومت کی شرائط کو تسلیم کر لیا اور انھیں یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا۔

۱۹۱۵ء میں مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کے جلسے کے بعد علی گڑھ کے بہت سے بہی خواہوں کو یقین ہو گیا کہ حکومت علی گڑھ کالج کو ایک آزاد یونیورسٹی نہیں بننے دے گی چنانچہ وہ علی گڑھ کالج سے علیحدہ ہو گئے اور انھوں نے نواب وقار الملک کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری اور ان کے ساتھیوں نے بیگم بھوپال کی سرپرستی میں 'سلطانیہ کالج' کے نام سے ایک ادارہ کھولنے کی تیاری شروع کر دی اور طے پایا کہ یہ کالج دہرہ دون جیسے پر فضا مقام پر قائم کیا جائے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جیسا جامعہ کے ابتدائی دور کے ایک طالب علم کے الفاظ میں، "علی گڑھ کے حلقوں میں اس بات پر غصہ تھا کہ برطانوی حکومت نے مسلم یونیورسٹی کے متفقہ مطالبہ کو ٹھکرا کر ملت کی توہین کی ہے اور اس کے طلبہ اس بات پر بحث کرتے تھے کہ اب کچھ کرنا چاہیے، اور اگر کچھ نہ ہو سکے تو پھر ہجرت کرنا چاہیے۔ کالج کے بعض حلقوں میں یہ خبر مشہور تھی کہ والیٔ بھوپال کی سرپرستی میں عنقریب سلطانیہ کالج کے نام سے ایک آزاد دارالعلوم دہرہ دون میں بننے والا ہے اور علی گڑھ کالج کے اکثر طلبہ یہ سوچ رہے تھے کہ بس اب ہم

ہوں گے اور سلطانیہ کالج کی تعلیم اور سامراج دشمنی کی فضا۔ سلطانیہ کالج کے قیام کے لئے کوششیں کی گئیں، وہ ان لوگوں کی طرف سے تھیں جن کا سیاست کی ہنگامہ خیز زندگی سے کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ان کی کوششیں اگرچہ کامیاب نہ ہوسکیں لیکن ان سے یہ بات اچھی واضح ہوگئی کہ مسلمانوں میں آزاد تعلیمی ادارہ کا تصور روز بروز مقبول ہو رہا تھا۔

تحریکِ خلافت اور علی گڑھ کالج

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر جب ہندوستان کے رہنما جیل کی چار دیواری سے باہر نکلے تو ۔۔ کے تمام مسلمان ایک دورِ انتشار سے گذر رہے تھے۔ اتحادی ممالک سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے درپے تھے۔ ترکی خلافت' کے ذریعہ مسلمانوں کی شیرازہ بندی کا فرض اگرچہ برائے نام سہی صدیوں سے انجام دے رہا تھا۔ دنیا کے تمام مسلمانوں کے دلوں میں اس کے لئے عقیدت و احترام کے جذبات موجزن تھے۔ جو حکومتیں ترکی اور دوسرے ممالک اسلامیہ کی آزادی چھیننے کی فکر میں سرگرمِ عمل تھیں، مسلمانوں کی نظر میں وہ اسلام کی کھلی ہوئی دشمن تھیں۔ انگریز اس شرمناک جدوجہد میں سب سے پیش پیش تھے۔ اس لئے مسلمانوں میں ان کے خلاف غصہ اور نفرت کی لہر دوڑنا ناگزیر تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی حکومت برطانیہ کے اس رویہ کی وجہ سے ہل چل مچ گئی۔ انھوں نے ملک کے چپّہ چپّہ میں حکومت کے خلاف جلسے کئے اور بالآخر اسلامی ممالک اور منصبِ خلافت کی حفاظت کے لئے ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کمیٹی کے نام سے ایک مستقل جماعت قائم ہوگئی۔ اس جماعت نے برطانوی حکومت کا مقابلہ کرنے اور اسلامی ممالک اور خلافت کی حفاظت کرنے کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو منظم کرنا شروع کردیا۔ کام کچھ اس جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا کہ بڑی قلیل مدت میں ہندوستان کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک سیاسی بیداری کی ایک زبردست لہر اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ معلوم ہونے لگا کہ یہ لہر حکومت برطانیہ کے اقتدار کی سوسالہ تعمیر کو بہت جلد

ہا کر لے جائے گی۔

مسلمانوں کے وہ رہنما جو برسوں سے علی گڑھ کالج کو ایک آزاد یونیورسٹی کی شکل میں دیکھنے کے لئے بے تاب تھے اور جن کے علی الرغم علی گڑھ کالج کے چند کارپرداز ایک غلام یونیورسٹی کا پروانہ حاصل کرنے کی فکر میں تھے، اسے کسی طرح گوارا نہ کر سکتے تھے کہ مسلمان بچوں کی تعلیم ایک ایسی حکومت کے سپرد کر دی جائے جو اسلام کی کھلی دشمن ثابت ہو رہی ہے۔ انھوں نے علی برادران کی قیادت میں علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں اور مجوزہ یونیورسٹی کی فاؤنڈیشن کمیٹی سے یہ مطالبہ کیا کہ حکومت برطانیہ اسلام کی کھلی دشمن ہے، نہ اس کا دیا ہوا چارٹر قبول کیا جائے نہ اس کا روپیہ، نہ اس کے بدلے اُسے وہ اختیارات دئے جائیں جو ہمیں اس کا غلام بنا دیتے ہیں۔" اس کا جواب ان لوگوں کی طرف سے جو مسلمان عوام کے خیالات اور جذبات سے بے پرواہ ہو کر یونیورسٹی کا چارٹر قبول کرنے کی تیاری کر رہے تھے اور اس پر بہت خوش تھے یہ ملا کہ "بھلا تم اتنا سرمایہ کہاں سے جمع کر کے لا سکتے ہو، جس کی سالانہ آمدنی حکومت کی سالانہ گرانٹ کے برابر ہو سکے، پہلے روپیہ جمع کر کے لاؤ، پھر ہم بھی گورنمنٹ کو جواب دیدیں گے۔" مجوزہ یونیورسٹی کے کارپردازوں نے دینے کو تو یہ جواب دیدیا لیکن انھیں یہ خبر نہ تھی کہ مسلمان عوام میں اجنبی حکومت کے خلاف سیاسی بیداری کی جو لہر دوڑ گئی ہے وہ علی گڑھ کالج کے کارکنوں اور طلبا میں بھی پھیل سکتی ہے۔ مسلمان قوم کے مطالبات اور ان کے جذبات و خیالات سے وہ تو کنارہ کش ہو سکتے ہیں لیکن نوجوان طلبہ جو وقت کے اہم تقاضوں کو محسوس کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے، اپنی قوم اور اس کے جائز مطالبات سے ہرگز ناتا نہیں توڑ سکتے۔ وہ باہمت جماعت جس کو ساتھ لے کر مسلمان رہنما آزاد جامعہ کے تصور کو عملی شکل دے سکے، علی گڑھ کالج کے ہونہار طالب علموں ہی پر مشتمل تھی۔

جنوری ۱۹۲۰ء تک ہندوستان کے سیاسی حالات ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیش خیمہ

بن چکے تھے۔ خلافت کمیٹی نے مسلمانوں کے سامنے ترک موالات کا فوری پروگرام پیش کر دیا تھا اور کانگریس نان کوآپریشن کا فیصلہ کر کے ہندوستانیوں سے قربانی ایثار اور عمل کے بے پناہ مظاہروں کا مطالبہ کر رہی تھی۔ ایک طرف علی برادران اور دوسری طرف گاندھی جی ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ ملک کے کونے کونے میں جوش کی لہر دوڑ گئی اور ہندوستانی مسلمان ہوں یا ہندو بلا امتیاز مذہب و ملت سرکاری اداروں سے تعلق قطع کرنے لگے اور انھوں نے برطانوی مال کا بائیکاٹ شروع کر دیا۔ علی گڑھ کالج کے لڑکوں میں خلافت تحریک سے بہت دلچسپی تھی اور وہ نظری طور پر علی برادران کے ہمنوا تھے مگر رجعت پسندوں نے انھیں عملی قدم اٹھانے کے قابل نہ رکھا تھا، وہ شش و پنج میں تھے کہ جن سیاسی اور تعلیمی نظریوں کو وہ صحیح سمجھتے ہیں انھیں عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے کونسا قدم اٹھائیں۔ بعض جوشیلے طالب علم مولانا محمد علی کے پاس پہنچے اور انھیں دعوت دی کہ وہ علی گڑھ آکر طلبہ کو ترک موالات کا پیام دیں اور ان سے مطالبہ کریں کہ وہ علی گڑھ کالج اور مجوزہ یونیورسٹی سے قطع تعلق کر کے وقت کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دیں۔ مولانا محمد علی تو خود ہی چاہتے تھے کہ پھر کوئی ایسی سبیل نکلے کہ وہ علی گڑھ کالج کو رجعت پسندوں کے قبضہ سے نکال سکیں اور اسے ایسی یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل ہونے سے بچائیں جسے اغیار کی عائد کردہ پابندیوں میں رہ کر کبھی پنپنے کا موقع نہ ملے۔ انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ "سرکاری تعلیمی اداروں سے تعلقات قطع کرنے کا کام ہم کو علی گڑھ سے شروع کرنے دیں" اور وہ گاندھی جی کو ساتھ لے کر علی گڑھ جا پہنچے۔ طلبائے کالج کا جلسہ ہوا، تقریروں میں علی برادران اور گاندھی جی نے طلبہ کو ترک موالات کا پیام دیا، کالج کے کارپردازوں نے پہلے ہی سے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ جلسہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے پائے، کچھ لوگ الٹے سیدھے سوالات کرنے پر اور کچھ مقررین پر فقرے کسنے پر متعین کئے گئے تھے انھوں نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا اور طلبہ اپنے رہنماؤں کی دعوت پر

لبیک نہ کہہ سکے۔ یہ کام بڑا مشکل تھا جس کا فیصلہ وہ اس وقت کر سکتے تھے جب اپنے آپ کو ہر قسم کی قربانی اور ایثار کے لئے آمادہ پائیں اور ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے تیار ہوجائیں۔

جن طلبہ کے جوش و خروش نے علی برادران کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی تھی ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ملک کے اس مطالبہ سے علی گڑھ کی اس بے اعتنائی اور بے تعلقی کو دیکھ کر جن طلبہ کو افسوس ہوا اور ان کے سر غیرت سے جھک گئے وہ تھے جنھوں نے پہلے نہ جوش کے نعرے لگائے تھے اور نہ مولانا محمد علی کو علی گڑھ میں ترکِ موالات کی دعوت دینے کے لئے آمادہ کیا تھا، یہ سب ہونہار طالب علم تھے، قوم کے مطالبوں سے انھیں دل لگاؤ تھا لیکن چاہتے تھے کہ اپنی تعلیم ختم کرلیں اور پھر یکسو ہو کر قومی تحریک میں شریک ہو جائیں، لیکن اب جبکہ طبلِ جنگ بج چکا تھا، سالارِ قافلہ کی طرف سے کوچ کا اعلان ہو گیا تھا وہ یہ کیسے دیکھتے کہ قوم و ملت کا قافلہ قربانی اور ایثار کی کٹھن راہوں اور تکلیف و مصیبت کی دشوار گذار وادیوں کی طرف روانہ ہو اور مسلمانوں کے اس عظیم الشان علمی مرکز سے معدودے چند آدمی بھی راہِ سفر کی دشواریوں کو جھیلنے کے لئے آمادہ نہ ہوں، ان کی تحریک پر یونین میں طلبا کا ایک جلسہ پھر ہوا، اس کا رنگ پہلے جلسہ سے کچھ مختلف ہی تھا، طلبا میں جوش و خروش پھیلا ہوا تھا اور یہ نظر آتا تھا کہ وہ پہلے دن کے واقعہ پر نادم ہیں اور اس کی مکافات میں بڑی سے بڑی تکلیف اٹھانے کے لئے تیار ہیں، جوشیلی تقریریں ہو رہی تھیں اور فلک شگاف نعرے لگ رہے تھے کہ اتنے میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی ہال میں داخل ہوئے، جو لوگ اس وقت جلسہ میں موجود تھے وہ ساری عمر اس کو نہ بھولیں گے۔ دونوں بھائیوں نے بس دو دو چار چار منٹ تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ علی گڑھ ہمارا روحانی گھر تھا، ہم یہاں بڑے ارمان لے کر آئے تھے بہت دل شکستہ جاتے ہیں۔ خدا حافظ، ہزاروں نوجوانوں کا مجمع چلا چلا کر رو رہا تھا، بہتوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ ایک کہرام تھا، دل پگھل پگھل کر آنکھوں سے نکلے پڑتے تھے۔ اس عالم

میں علی برادران ہال سے چلے گئے، مگر یہ چند منٹ بہتوں کے لئے زندگی کے فیصلہ کن منٹ
گئے، یہ مولانا محمد علی کے جانے کے بعد بڑی جوشیلی تقریریں ہوئیں اور مجمع کا یہ رنگ تھا کہ
طالب علم نے جب یہ کہا کہ "ہمیں بے شک اس ادارہ کو چھوڑنا چاہیے، جو لوگ ہمیں یہاں سے
کی دعوت دے رہے ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ اس سے بہتر تعلیم کے انتظام کی ذمہ دار
تو چاروں طرف سے لوگ اس معقولیت پسند مقرر پر برس پڑے اور کہنے لگے یہ بے ایمان۔
ہمیں صراطِ مستقیم سے ہٹانا چاہتا ہے، یہ چاہتا ہے کہ ہمارے جوش کو ٹھنڈا کر دے، یہ د!
ہے۔ اسے ڈاکٹر ضیاء الدین نے ملازم رکھا ہے" ابن حسن صاحب اور ذاکر حسین صاحب
لوگوں کو اس تجویز کی معقولیت لاکھ سمجھائی مگر جوش میں کسے یہ خیال رہتا ہے کہ کونسی بات
ہے اور کونسی نامعقول، یہ دونوں حضرات بھی طعن و تشنیع کا ہدف بن گئے، کیونکہ وہ دونو
کے آخری سال میں تھے، اور حال ہی میں اسسٹنٹ لکچرر مقرر ہوئے تھے، اعتراضات کا
ان کی یہی حیثیت تھی۔ ذاکر صاحب آخری مرتبہ پھر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔
دفعہ ان کی تقریر نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا، اس لئے نہیں کہ اس مرتبہ انھوں نے
سے بہتر دلیلیں دی تھیں بلکہ اس لئے کہ انھوں نے کہا کہ "میں اپنی لکچراری سے مستعفی ہوتا
ذاکر صاحب کے اس بروقت اقدام نے لوگوں کو ان کے خلوص کا یقین دلا دیا، اب کہ
لوگ کھڑے ہو ہو کر خلوص و صداقت کا امتحان دینے لگے، وظیفہ لینے والوں نے وظیفہ
لینے کا اعلان کیا اور جن کا تعلق علی گڑھ کالج سے کسی حد تک ملازمت کا تھا انھوں نے استعفے
اب یہ تجویز بھی منظور کر لی گئی کہ کالج سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ سرکاری تعلق کو چھوڑ
اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو قوم نوجوانوں کی تعلیم کا دوسرا انتظام کرے، ایک نئی تعلیم
خیال نے اس طرح پھر قوت پائی۔ علی برادران، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مو
ابو الکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی اور مسلمانوں کے دوسرے اہل فکر اور سیاست
کرنے والوں نے طلبہ کے اس مطالبہ پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور سب نے

کہ اگر علی گڑھ مسلمانوں کے مطالبہ کو ٹھکراتا ہے تو مسلمانوں کو اپنے نوجوانوں کا مطالبہ ماننا ہوگا۔"

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جمعہ کے دن جوشیلے طلبہ اور اساتذہ علی گڑھ کالج کی مسجد میں جمع ہوئے مولانا محمد علی نے دلوں کو گرمانے والی تقریر کی۔ آخر میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کا خطبہ تاسیس پڑھ کر سنایا گیا۔ اس طرح ان رہنماؤں کے مقدس ہاتھوں سے "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی رسم افتتاح ادا ہوئی اور برسوں کے انتظار کے بعد مولانا محمد علی اور حضرت شیخ الہند کے ذریعہ اس نئے تعلیمی ادارے کی شکل میں دیوبند اور علی گڑھ کا سنگم ہوگیا جو اس بات کا اعلان تھا کہ مسلمان ایک طرف تو اپنی صدیوں کی ذہنی اور روحانی کمائی کو آئندہ نسل کی طرف منتقل کر کے اپنے تئیں تباہی سے بچائیں گے اور دوسری طرف اس نئی نسل میں یہ قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ بزرگوں سے پائے ہوئے تمدنی خزانہ میں خود اپنی جد وجہد سے اضافہ کرسکے۔

حضرت شیخ الہند اپنے افتتاحی خطبۂ صدارت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔

کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور

مجھ کو میرے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں، لیکن اہلِ نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔"

علی گڑھ کالج کے منتظمین نے جب یہ دیکھا کہ ان کا اقتدار خطرہ میں ہے، جوشیلے طلبہ اور اساتذہ سے اپنی بات منوانا تو درکنار وہ ان کے سامنے اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تو انھوں نے پوشیدہ طور پر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ حکومت کے حکام سے مشورہ کئے گئے، ان کے ہوا خواہ ملک کے گوشہ گوشہ سے اپنے سرکاری اور غیر سرکاری فرائض سے چھٹیاں لے کر علی گڑھ کو بچانے کے لئے، نکل کھڑے ہوئے۔ طلبہ سے اپنی بات نہ منوا سکے تو ان کے والدین کو لکھا کہ "تمھارے لڑکے کی جان خطرہ میں ہے اُسے آکر لے جاؤ۔" حکومت سے کہا کہ "لڑکے باغی ہو گئے ہیں پولیس اور فوج بھیجئے تاکہ ان پر قابو حاصل کیا جائے۔" طلبہ سے علیحدہ علیحدہ چھپ چھپ کر ملے اور انھیں ولایت کے وظیفوں کا لالچ دے کر اور نوکری کے سبز باغ دکھا کر ورغلانے کی کوشش کی۔ غرض ہر طرح علی گڑھ کے طلبہ کو منتشر کرنے کی تدبیر کرتے رہے، لیکن پھر بھی کوئی تین سو لڑکے رہ گئے، ڈائننگ ہال سے کھانا بند کر دیا گیا تو طلبہ نے کھانے کا اپنا انتظام کر لیا۔ ملک کے بڑے بڑے رہنما اولڈ بوائز کی عمارت میں مقیم رہے، وہ اور طلبہ سب وہاں جمع ہوتے اور آئندہ کے لئے پروگرام بناتے، مختلف تجویزیں تھیں، کوئی کہتا اس کالج کو چھوڑ کر دوسرا ادارہ بنایا جائے، بعض کی رائے تھی کہ قوم ہمارے ساتھ ہے، طلبہ ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔ علی گڑھ کالج ہی کو رجعت پسند عناصر سے آزاد کرانا چاہیئے اور اس کے ذریعہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی اسکیم کو پورا کیا جائے اور کالج کی چار دیواری سے اس وقت تک نہ نکلنا چاہیئے جب تک جبراً نہ نکالا جائے۔ کالج کے کارپردازوں کی جب یہ تمام کوششیں اکارت گئیں تو انھوں نے پولیس کی مداخلت کے ذریعہ اپنے اقتدار کو سنبھالنے کی آخری مرتبہ ایک اور کوشش کی۔" ایک دن صبح سویرے کالج کے چاروں طرف پولیس نے گھیرا ڈال لیا، پولیس کا ایک افسر

مولانا محمد علی کے نام حکم لے کر پہنچا کر طلبہ کے ساتھ نکل جائیے، وہ قافلہ جب اس تعلیم گاہ سے نکلا ہے، جسے وہ اپنے گھر سے زیادہ عزیز رکھتا تھا تو دیکھنے والوں کے دل ہل گئے۔ اِدھر اُدھر فوج کے سپاہی سنگینیں لئے ہوئے، بیچ میں طالب علموں کی قطار، سامنے ایک نوجوان ایک ہرا جھنڈا لئے تھا جس پر کلمۂ طیبہ لکھا تھا، ساتھ ساتھ مولانا محمد علی اور دوسرے اکابر تھے، نواب محمد اسمٰعیل خاں نے کہیں سے خیموں کا انتظام کیا تھا، قافلہ جا کر ان خیموں میں اترا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی تھی، کھانے پکانے کی کسے سدھ تھی اور کیسے ہوتے۔ ابھی اپنی چھاؤنی میں پہنچے بھی نہ تھے کہ شہر کے لوگ دیگچوں میں پکا ہوا کھانا ٹھیلوں پر لادے پولیس کے گھیرے سے بچتے بچاتے پہنچ گئے۔ شام کو بھی کھانا شہر سے آیا۔ رہنے سہنے کی خاص تکلیف تھی، فوج کے سے انتظامات تھے۔ پر فوج کا ساز و سامان نہ تھا، مگر جن لوگوں نے وہ تکلیف جھیلی تھی وہ سب کہتے ہیں کہ ایسا لطف کا زمانہ عمر بھر نصیب نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ تعلیمی نظم قائم ہو گیا۔ مولانا محمد علی پہلے شیخ الجامعہ تھے۔ اونچے درجے کے طلبا میں سے بعض درس کے لئے مقرر ہوئے۔ ذاکر حسین صاحب، نور اللہ صاحب، سید محمد صاحب، رؤف پاشا صاحب وغیرہ۔ علی گڑھ کے استادوں میں سے مولانا اسلم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب، حافظ فیاض احمد صاحب اور عبد الکریم صاحب فاروقی ترک موالات کر کے ان لڑکوں ہی کے ساتھ چلے آئے۔" اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کی پہلی آزاد تعلیمی درس گاہ نے آزاد فضا میں اپنا کام شروع کر دیا۔

جامعہ نے ایک قومی سیاسی تحریک کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ اس لئے اس کی پرورش اور نگہبانی کا فرض ابتدا میں سیاسی رہنماؤں ہی کو انجام دینا پڑا۔ نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی فاؤنڈیشن کمیٹی، خلافت تحریک کے سرگرم کارکنوں ہی پر مشتمل تھی اور اس کمیٹی نے ۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء کو جو جماعت انتظامیہ تشکیل دی اس میں بھی یہی لوگ تھے۔ جامعہ کے اخراجات کا تمام بار اس زمانہ میں مرکزی خلافت کمیٹی ہی پر تھا۔ جامعہ کے قیام سے ایک سال تک کا زمانہ سیاسی ہنگاموں اور مذہبی جوش و خروش کا زمانہ تھا۔ اس وقت ایک قومی تعلیمی درس گاہ

کے لئے سیاسی تنظیم سے علیحدہ رہنا ممکن بھی نہ تھا، لیکن جامعہ کے کارکنوں کے سامنے پہلے ہی یہ حقیقت تھی کہ تعلیم کو سیاست سے آزاد رکھنا چاہئے۔ وہ خلافت کمیٹی کی امداد کے باوجود جامعہ کو خلافت کمیٹی کا تابع بنانا نہیں چاہتے تھے، چنانچہ مرکزی خلافت کمیٹی نے نومبر ۱۹۲۰ء کو اپنے ایک جلسہ میں یہ تجویز پاس کر دی تھی کہ جامعہ ایک آزاد ادارہ ہے اور کسی دوسری جماعت کے سامنے جوابدہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی اس کے تعلیمی کام کرنے والے یہ سمجھتے تھے کہ جب تک جامعہ کے پاس مرکزی خلافت کمیٹی کی امداد کے علاوہ ایک آزاد فنڈ نہ ہوگا، اسے صحیح معنوں میں ایک خالص تعلیمی ادارہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ۱۹۲۲ء کے آخر میں ڈاکٹر انصاری مرحوم نے ملک و قوم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور لوگوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ایک خالص تعلیمی ادارہ کی حیثیت میں قائم اور باقی رکھنے کے لئے فنڈ جمع کرنے کی مہم شروع کر دی اور یہ ان کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ مرکزی خلافت کمیٹی کے بے جان ہونے کے بعد بھی اپنے تعلیمی کاموں کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھ سکی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اگرچہ ۱۹۲۳ء کے شروع ہی میں خلافت کمیٹی کے اثرات سے آزادی حاصل کرنا شروع کر دی تھی اور اس کے میزانئے منظوری کے لئے خلافت کمیٹی میں جانا بند ہو گئے تھے، لیکن در اصل جامعہ کا وہ انتظامی دور جسے خلافت کمیٹی کے دور سے یاد کیا جا سکتا ہے، اس وقت ختم ہوتا ہے جب جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کیا گیا۔

جامعہ ملیہ دہلی میں

۱۹۲۴ء جامعہ کے استادوں کے لیے آزمائش کا سال تھا۔ خلافت تحریک بے جان پڑ گئی تھی اس کی طرف سے جامعہ کو جو امداد مل رہی تھی وہ بند ہو گئی۔ سیاسی جوش و خروش ٹھنڈا پڑ چکا تھا وہ سیاسی رہنما جنھوں نے ۱۹۲۰ء کے سیاسی ہیجان اور ملی جوش سے متاثر ہو کر تعلیمی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے اور ایک نئے نظام تعلیم کا باغ لگانے کی تیاری کی تھی، یکے بعد دیگرے انقلاب

کے نتائج کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے مشکل کام سے کنارہ کش ہو رہے تھے۔ ایسے لوگ بہت ہی کم تھے جو قومی تعلیم گاہوں کے قیام کو زمانہ انقلاب کا سب سے اہم واقعہ سمجھتے تھے۔ انقلابی جد و جہد کی ناکامی نے مسلمان رہنماؤں کے حوصلے پست کر دیئے تھے اور وہ ایک آزاد تعلیمی درس گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو چلانے کی ذمہ داری لیتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ لوگ جو اس تعلیمی انقلاب میں میر کارواں کی حیثیت رکھتے تھے، انھوں نے جامعہ ملیہ کی تعمیر کا کبھی اس طرح ارادہ ہی نہ کیا تھا کہ وہ علی گڑھ کالج سے علیحدہ رہ کر پھلے پھولے۔ وہ جامعہ کی آبادی کو ایسے مہاجرین اور انصار کی جماعت سمجھتے تھے جو فتح مکہ کی منتظر رہے، ان کا اصلی قلعہ تو علی گڑھ کالج تھا اور ان کے دلوں میں اس پر قبضہ کرنے اور جامعہ کا پرچم لہرانے کی حسرت تھی، ناکامی اور مایوسی نے انھیں اس طرح بے بس کر دیا تھا کہ وہ اتنا نہ سمجھ سکتے تھے کہ دوسرے قلعہ کو فتح کرنے سے پہلے اپنے قلعہ کو مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ غرض بعض لوگ یہ طے کئے بیٹھے تھے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بند کر دیا جائے۔ ایک ایسے آزاد قومی ادارہ کو چلانے کی ذمہ داری لینے سے جسے حکومت کی طرف سے مدد لینا عار معلوم ہوتا ہو، ان لوگوں کو یہی آسان نظر آیا کہ اسے بند کر دیا جائے۔

ایسی نازک حالت میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ناسازگار حالات سے مایوس نہ تھے اور وہ اپنے خون سے سینچی ہوئی کھیتی کو اس طرح ضائع ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ یہ جامعہ کے طلبہ، اساتذہ اور کارکنوں کی وہ جماعت تھی جس نے جامعہ کو چلانے کی ذمہ داری لی تھی اور اس راہ میں ہر قسم کی مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار تھی، ان کا ایک ساتھی (ذاکر حسین) اس وقت اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ گیا ہوا تھا اور خیال یہ تھا کہ وہ واپسی پر جامعہ کو چلانے میں ان کا ہاتھ بٹا سکے گا۔ ان لوگوں نے انھیں تار دیا کہ مجلس امناء کے اراکین جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بند کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں کیا مشورہ ہے؟ ذاکر صاحب نے جواب میں لکھا کہ "میں اور میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کے لئے تیار ہیں، ہمارے آنے تک جامعہ ملیہ کو بند نہ ہونے دیا

جائے۔" جامعہ کے تاریخ التحصیل طلبہ کا ایک وفد دہلی میں حکیم اجمل خاں صاحب سے ملا۔ ان ہی دنوں جامعہ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے دلی میں مجلس امنا کا جلسہ ہونے والا تھا۔ وفد کے اراکین نے حکیم صاحب سے درخواست کی کہ وہ ذاکر صاحب کے آنے تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیں۔ انھوں نے حکیم صاحب کو یہ یقین دلایا کہ وہ جامعہ کے لئے ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ حکیم صاحب نے کہا "میں جامعہ ملیہ کو دہلی لے آؤں تو تم لوگ اس کے لئے کس قدر قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہو۔" وفد کے اراکین نے بالاتفاق کہا کہ "ہم جامعہ کو قائم رکھنے کی خاطر بلا کسی معاوضہ کے کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔" حکیم نے انھیں اطمینان دلا کر ... واپس بھیجدیا۔ مجلس امنا کے اجلاس میں جامعہ کو جاری رکھنے اور بند کرنے کے مسئلے پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ حکیم صاحب نے مجلس امنا سے یہ تجویز پاس کرائی کہ جامعہ کو دہلی منتقل کر دیا جائے اور اسے چلانے کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے اوپر لے لی۔ یہ وقت جامعہ کے لئے بہت نازک تھا۔ عام قومی فضا سے مایوسی تھی۔ ڈر تھا کہ علی گڑھ سے دہلی لے جانے میں جامعہ ختم نہ ہو جائے۔ خیر خواہ بھی جامعہ کو بند کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ مالی امداد کی صورت کہیں سے نظر نہ آتی تھی۔

حکیم اجمل خاں نے جب ان چیزوں کا ذکر اپنے رفیق مہاتما گاندھی سے کیا اور کچھ مایوسی ظاہر کی تو گاندھی جی نے فرمایا کہ جامعہ کو تو چلانا ہی ہوگا، آپ کو روپیہ کی دقت ہے تو میں بھیک مانگ لوں گا۔ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ اس سے میری ہمت بندھی اور میں نے تہیہ کر لیا کہ جامعہ کے کام کو ہرگز بند نہ ہونے دیا جائے۔ جامعہ کو دہلی لانے کا فیصلہ مارچ ۱۹۲۵ء میں ہوا تھا۔ مئی جون کی چھٹیوں میں جامعہ کا سامان دہلی منتقل ہونے لگا اور جامعہ کا چھٹا تعلیمی سال جولائی ۱۹۲۵ء کو دہلی میں شروع ہوا۔

جامعہ کے دہلی منتقل ہونے پر بہت سے لوگ اس کی خدمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ جامعہ کو علی گڑھ ہی میں رہنا چاہئے۔ اور بعض سرے سے اس کے

جاری رکھنے ہی کے مخالف تھے، مگر پھر بھی بہت سے ایسے باہمت لوگ تھے جن کی وجہ سے جامعہ کا کام جاری رہا۔ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم جب تک زندہ رہے وہ ماہ بماہ جامعہ کے خرچ کا انتظام کرتے رہے۔ مولانا محمد علی کے الفاظ میں "طبیہ کالج حکیم صاحب مرحوم کی جوانی کی اولاد ہے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ بڑھاپے کی۔" اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ مرحوم ان دونوں اداروں کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ جامعہ کے دہلی آنے پر ڈاکٹر انصاری مرحوم نے مہتمم کے فرائض اپنے ذمہ لے لئے۔ وہ بھی جامعہ کے کاموں میں حکیم صاحب مرحوم کی مدد فرمانے لگے۔ اس زمانے میں اور بھی بہت سی انتظامی تبدیلیاں ہوئیں۔ عبدالمجید خواجہ صاحب نے جامعہ کی بنیادوں کو ایک تعلیم گاہ کی حیثیت سے استوار کرنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، اس کے احسان سے جامعہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اپنی قابلیت، اپنے وقت اور اپنے مال سب سے اس کمزور پودے کی آبیاری کی تھی، لیکن گوناگوں مجبوریوں سے وہ شیخ الجامعہ کے کام سے علیحدہ ہونا چاہتے تھے۔ فروری ۱۹۲۶ء میں وہ جامعہ سے تشریف لے گئے۔ حسن ہدیات صاحب جو کئی سال سے جامعہ کے مسجل تھے، دہلی نہ آسکے۔ ان دونوں حضرات کی جگہ طاہر الیس محمدی صاحب اور رشید اظہر صاحب کام کرتے رہے۔ عبدالمجید خواجہ صاحب کے سامنے ہی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب یورپ سے واپس تشریف لے آئے۔ وہ اپنے دو ساتھیو ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور محمد مجیب صاحب کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب مسجل مقرر ہوئے۔ یہ دونوں جامعہ کے دوسرے کارکنوں کے ساتھ مل کر کچھ تجویزیں تیار کرنے میں لگ گئے۔ حکیم اجمل خاں صاحب تو ماہ بماہ جامعہ کے اخراجات کے لئے روپیہ دیا ہی کرتے تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی رہنمائی میں جامعہ کے کارکنوں نے بھی بڑے پیمانے پر چندہ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا۔ کام ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں صاحب دنیا سے رحلت فرما گئے۔ جس وقت ان کا انتقال ہوا تو جامعہ مقروض تھی۔ حکیم صاحب زندہ ہوتے تو اس کی ادائگی

کا کوئی نہ کوئی انتظام کرتے۔ جامعہ کے کام کرنے والے پریشان تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں! کسی کے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ ڈاکٹر انصاری نے جامعہ کی سرپرستی کا فرض اپنے ذمہ لے لیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے اپنے ساتھیوں کی ہمت بڑھائی۔ تب جاکر جامعہ کی کشتی مالی دشواریوں کے بھنور سے نکلی۔

جامعہ اپنے کارکنوں کی سرپرستی میں

فروری ۱۹۲۸ء میں جامعہ کے ہمدردوں اور حکیم اجمل خاں کے عقیدت مندوں کا دہلی میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ جس میں طے پایا کہ حکیم اجمل خاں کی یادگار جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے 'اجمل جامعہ فنڈ' قائم کیا جائے اور اس فنڈ میں آٹھ لاکھ روپے جمع ہو جائیں تو جامعہ کے لئے عمارتیں بنوائی جائیں۔ جلسہ میں تو چودہ ہزار روپے کے وعدے ہوئے، لیکن بعد میں اس فنڈ میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ جامعہ میں چھٹیاں تھیں اور یہ سوال سامنے تھا کہ جامعہ کو بند کر دیا جائے یا جاری رکھا جائے۔ اگر کام جاری رکھیں تو قرضہ کا بوجھ اتارنے اور ایک سال کے اخراجات کا بار اٹھانے کے لئے ۵۵ ہزار روپے کی ضرورت ہے، یہ رقم کہاں سے لائی جائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے جامعہ کی تمام مالی کیفیت ایک خط کے ذریعہ محن وعن امیر الجامعہ جناب ڈاکٹر انصاری مرحوم کی خدمت میں پیش کی اور ان سے یہ کہا کہ :

> "مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت کو دیکھتے ہوئے اسے جلد از جلد حل کرنے کی ضرورت ہے۔ اُسے حل کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو ابنائے جامعہ غیر معمولی سعی وکوشش سے مطلوبہ رقم فراہم کر دیں یا اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو اپنی طرف سے جامعہ کو بند کر دیں اور اس کے کام سے دستکش ہو جائیں۔ لیکن اس کو بند کرنے سے پہلے قوم کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ اگر اس کام کو مفید سمجھتی ہے تو کوئی اور جماعت

اسے اپنے ہاتھ میں لے لے اور اسے چلائے۔ جامعہ کے اساتذہ میں کچھ لوگ ایسے یقیناً ہیں جنھوں نے اپنی عمر قومی تعلیم کے کام میں وقف کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ یہ لوگ شاید ملک کے با اثر اور دولت مند اشخاص میں کچھ ایسے لوگ تلاش کر سکیں جو اُن کے ارادوں سے محض ہمدردی ہی نہ رکھتے ہوں بلکہ ان کی تکمیل میں عملی حصہ لینے کو بھی تیار ہوں۔ امناء جامعہ اس کام کو ان لوگوں کے ہاتھوں میں دیدیں تاکہ وہ آسے اپنی خواہش اور بساط کے مطابق جہاں تک چلا سکیں چلائیں۔"

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے امناء جامعہ کے پاس ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا خط اور جامعہ کے مفصل حالات لکھ بھیجے۔ اپنے خط میں انھوں نے یہ تحریر کیا کہ : ع

"میں سمجھتا ہوں کہ ہم آئندہ سال کے مصارف اور پچھلے قرض کی ادائیگی کے لئے ۵۵ ہزار روپیہ جمع نہیں کر سکتے۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو پھر ہم کیوں نہ صاف طریقے پر اس کا اعلان کر دیں کہ ہم جامعہ کو چلانے سے قاصر ہیں۔ ہمارا یہ اعلان کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو لیکن دیانت پر مبنی ہوگا۔ اور اگر ہم اس وقت ایسا نہ کریں گے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہمیں مجبوراً ایسی کرنا ہوگا۔ ہر وہ شخص جو جامعہ کو ایک اہم قومی تحریک سمجھتا ہے اور جسے اس مفید کام سے کچھ قلبی تعلق ہے یہ اعلان نہ کرنا چاہے گا کہ جامعہ بند ہو گئی۔ میرا خود بھی جذبہ ہے میں ہرگز اس وقت کا خیال بھی کرنا نہیں چاہتا جب جامعہ نہ رہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارے دستکش ہو جانے سے جامعہ کی موت لازم نہیں آتی بلکہ ممکن ہے اسی سے ہماری اس عزیز درس گاہ کے لئے نئی زندگی کا سامان ہو سکے۔ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین سے اس بارے میں مفصل گفتگو کی ہے کہ اگر ہم امناء جامعہ سے دست کش ہو گئے تو وہ کیا کریں گے۔ انھوں نے اپنے ارادوں کا جو خاکہ میرے سامنے پیش کیا ہے،

وہ عزم و استقلال کی قابل ستائش مثال ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اپنے ساتھیوں میں سے
انجمن تعلیم ملی کے نام سے ان لوگوں کی ایک جماعت بنائیں جو ہر صورت میں قومی تعلیم کے
کام کرتے رہنے کا عہد کرے۔ یہ جماعت اپنے اوپر دولت کا دروازہ بند کر لے
اور صرف اس قدر اجرت پر جو اس کی زندگی کے لئے ضروری ہو ملی تعلیم کے کام کو
انجام دے۔ یہ لوگ عہد لینا چاہتے ہیں کہ ایک مقررہ رقم سے زائد کبھی مشاہرہ نہ لیں
گے۔ اور ان کا ارادہ یہاں تک ہے کہ جب تک جامعہ کے آئندہ مالی انتظامات نہ ہو جائیں
یہ بالکل بلا معاوضہ کام کریں تاکہ جامعہ پر قرض کا بار نہ بڑھتا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ
یہ لوگ اپنے خلوص اور ہمت سے بہت سے ساتھی اور مددگار پیدا کر لیں گے۔ اس
لئے ہم اطمینان کے ساتھ جامعہ کے مستقبل کو ان کے ہاتھوں میں دے سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اس تحریر میں یہ بھی لکھا کہ:

"میں نے ۱۵ر جولائی ۱۹۲۸ء کو انسار کا ایک غیر معمولی جلسہ بلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ براہِ
کرم کل معاملہ پر اچھی طرح غور فرمالیجئے اور جلسہ میں شرکت فرماکر اپنی رائے سے فیصلہ
میں مدد دیجئے اور شرکت نہ کر سکنے کی صورت میں تحریری رائے ضرور جلسہ سے قبل
بھیج دیجئے۔"

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے یہ خطوط ملت کے اکابرین کے نام روانہ کئے اور ادھر ڈاکٹر
ذاکر حسین صاحب نے اپنے ساتھیوں کو جو چھٹیوں میں اپنے اپنے وطن گئے ہوئے تھے ایک
ایک خط لکھا اور انہیں تمام حالات بتائے کہ "جامعہ مقروض ہے، روپیہ مفقود ہے، جامعہ کے
بند کرنے کا سوال درپیش ہے، آپ اس کام کو یا اس کے کسی حصہ کو بچانا چاہتے ہیں یا نہیں۔
کام کو جاری اسی وقت رکھا جا سکتا ہے جب کہ آپ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلنے اور مشکلات سہنے کے
لئے تیار ہوں۔" اکابر ملت اور جامعہ کے کارکنوں کے پاس یہ خط ساتھ ہی ساتھ بھیجے گئے تھے۔ انسار
کی جماعت میں سے اکثر نے جواب ہی نہ دیا اور جنھوں نے جواب بھی دیا تو یہی کہ "کام چلنے والا

نہیں ہے، ہم کچھ نہیں کر سکتے، اسے بند کر دو۔" اُن نوجوانوں نے جو جامعہ میں کام کرتے تھے یہی لکھا کہ ہم جامعہ کے کام کو جاری رکھیں گے اور جامعہ کی چلانے والی جماعت کا ہر شرط پر ممبر بننے کے لئے تیار ہیں۔ انسارِ جامعہ کا جلسہ ہوا اور یہ طے پایا کہ جامعہ ملیہ کو اس کے کارکنوں کے سپرد کر دیا جائے۔

جامعہ کے نوجوان کارکنوں نے "انجمن تعلیم ملی" کے نام سے جامعہ کو چلانے کے لئے ایک سوسائٹی تشکیل کی، جس کے اراکین نے یہ عہد کیا کہ وہ ۲۰ سال تک جامعہ کی خدمت کریں گے اور ایک سو پچاس ۱۵۰ روپے ماہوار سے زیادہ مشاہرہ طلب نہ کریں گے۔ پہلی دفعہ جن حضرات نے اس عہدنامۂ رکنیت پر دستخط کئے ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (۲) پروفیسر محمد مجیب (۳) مولانا اسلم جیراج پوری (۴) مولانا خواجہ عبدالحی (۵) حافظ فیاض احمد (۶) ارشاد الحق (۷) برکت علی (۸) سعدالدین انصاری (۹) سعید انصاری (۱۰) شفیق الرحمٰن (۱۱) حامد علی خاں

عہدنامہ پر دستخط کرنے والوں کے علاوہ دوسرے اساتذہ نے بھی اپنی تنخواہیں کم کرالیں تاکہ جامعہ کا خرچ کم ہو جائے اور اس کے مالی انتظامات میں زیادہ دشواری نہ ہو۔ خدا نے ان جواں ہمت نوجوانوں کے کام میں برکت دی، ان کی راہ میں مشکلات تھیں، انھوں نے عسرت و تنگی میں دن گذارے، مگر رفتہ رفتہ حالات بدلے قوم نے توجہ کی اور انھیں مالی اور اخلاقی مدد ملنے لگی۔ جامعہ کو والیانِ ملک اور مخیر لوگوں سے غیر مشروط طور پر خاصی بڑی رقمیں ملیں، لیکن اس کا سب سے بڑا سہارا وہ چھوٹی رقمیں تھیں جو ہمدردانِ جامعہ سے وصول ہوتی تھیں، ان ہمدردوں کی تعداد آٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی، ان میں امیر بھی تھے اور غریب بھی، یہ لوگ جامعہ کی مدد اس وجہ سے کرتے تھے کہ ان کے دل میں جامعہ اور اس کے ملی اور تعلیمی مقاصد کی قدر تھی۔

قرولباغ سے جامعہ نگر

علی گڑھ سے جامعہ دہلی آئی تو قرولباغ میں کرایہ کی عمارتوں میں تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا۔ لیکن ظاہر ہے ایک اچھی اور ترقی پذیر تعلیم گاہ کے لیے کرایہ کی عمارتیں نہ تو کافی ہو سکتی ہیں اور نہ شہر کی گنجان آبادی میں تعلیم و تربیت کے لحاظ سے کسی یونیورسٹی کا قیام مناسب ہو سکتا ہے، اس لیے جامعہ کے ارباب حل و عقد نے جامعہ کو شہر کے ہنگاموں سے دور ایسی جگہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا، جہاں ترقی و توسیع کے لئے زیادہ سے زیادہ امکانات ہوں۔ اس لئے امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین، وغیرہ نے بہت غور و خوض کے بعد دہلی سے ۸، ۹ میل کے فاصلہ پر جنوب کی جانب دریائے جمنا کے قریب، اوکھلا گاؤں سے متصل ایک غیر آباد علاقے کو پسند کیا اور ایک قطعہ زمین خرید لیا گیا۔ یکم مارچ ۱۹۲۵ء کو ایک عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ جامعہ نے اپنے کاموں اور منصوبوں میں ہمیشہ جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس موقع پر بھی عام رواج اور روایت کے برعکس عمارت کی بنیاد جامعہ کے سب سے چھوٹے بچے نے اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے رکھی اور جلسے میں دلی کے معززین نے بہت بڑی تعداد میں شرکت کی، اس موقع پر مولانا اسلم جیراجپوری کی ایک نظم پڑھی گئی جس کا ہر لفظ دل سے نکلا تھا اور دل میں بیٹھ گیا، شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے تقریر کی، جس میں سچائی تھی درد میں ڈوبی ہوئی، جوش تھا متانت میں سمویا ہوا، عزم تھا عجز میں ملا ہوا، جامعہ کی مختصر تاریخ تھی، بانیان جامعہ کی یاد تھی، اہل جامعہ کو نصیحت تھی، ہمدردان جامعہ کا شکریہ تھا، سننے والوں کی آنکھیں اشک آلود تھیں۔ امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو جوش گریہ گلوگیر تھا۔ امیر جامعہ نے جن الفاظ میں جامعہ کے استادوں اور کارکنوں کا ذکر کیا، وہ کسی افسر نے اپنے ماتحتوں کے متعلق، کسی جنرل نے اپنے سپاہیوں کے متعلق کم کہے ہوں گے۔ اعتراف، قدر دانی، ہمت افزائی، محبت، شفقت

کہ یہ کلمے ملک وملت کے ایک قائد جلیل کی زبان سے نکل رہے تھے اور جامعہ والے ادب، نیاز، ندامت، مسرت اور فخر کے جذبات دل میں لئے سر جھکائے سن رہے تھے۔ اس جلسے میں ترکی کی مشہور مجاہد خاتون خالدہ ادیب خانم بھی شریک تھیں، جو جامعہ میں "ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش" کے عنوان پر خطبہ دینے کے لئے تشریف لائی تھیں۔ انھوں نے بھی تقریر کی، "جامعہ کے مستقبل کی وہ تصویر دکھائی کہ تصور میں مشاہدے کا لطف آگیا اور سننے والوں پر وجد کا عالم طاری ہوگیا، جس آواز نے سقاریہ کے میدان جنگ میں کڑک کر ترک سپاہیوں کو للکارا تھا وہ آج اوکھلے میں گونج کر جامعہ کے طلبہ کو ہمت اور جوش دلا رہی تھی کہ جامعہ کے نام اور اس کے پیام کی لاج رکھ لیں۔"

"قائدین ملک وملت کے ہمدردی کے پیام پڑھے گئے، مہاتما گاندھی، سر محمد اقبال، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر بھگوان داس کی مبارکباد اور دعائیں، اسمبلی کے کل ممبروں کی اپیل، دوسرے بزرگوں کی تہنیت اور تبریک۔ آخر میں چندوں کا اعلان شروع ہوا جن کی میزان ۴۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کے علاوہ ۵۰ ہزار کی مالیت کے ایک وقف کی خوش خبری سنائی گئی۔[1]"

اگلے سال، ۱۹۳۶ء میں نیا تعلیمی سال شروع ہوا تو مدرسہ ابتدائی، جامعہ نگر کی اس نئی عمارت میں جو اگرچہ ابھی پوری طرح تیار نہیں تھی، منتقل ہوگیا۔

اس کے بعد ۲۱ مارچ ۱۹۳۹ء کو طلبائے قدیم کی عمارت کی بنیاد رکھی گئی اور ڈاکٹر ذاکرحسین صاحب نے پہلے قدیم طالب علم کی حیثیت سے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر انھوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"جب بھی جامعہ میں کسی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جاتا ہے تو میرا دل تھرتھراتا ہے۔

---

[1] ماہنامہ جامعہ بابت ۱۰ فروری ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۹۰

ایسے موقعوں سے فائدہ اٹھا کر میں اہل جامعہ کو یاد دلاتا ہوں کہ عمارتوں کی کثرت کسی ادارے کے لیے قابل فخر نہیں ہے، اکثر عمارتیں یا تو مقبرے ثابت ہوتی ہیں یا قید خانے۔ اگر عمارت میں رہنے والے اصل مقصد کو بھول جائیں تو وہ عمارتیں ان کے مقاصد اور ارادوں کا مقبرہ بن جاتی ہیں، اگر عمارتیں ہی مقصود بالذات بن جائیں تو وہ جیل خانہ ہیں، جن سے حوصلوں، امنگوں اور ولولوں کو نکلنے کی راہ نہیں ملتی۔ جامعہ کی پہلی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے وقت میں نے کہا تھا کہ کہیں ہم لوگ عظیم الشان اور فلک بوس عمارتوں میں بیٹھ کر اپنے مقاصد کو نہ بھول جائیں، اگر ہم ایسا کریں تو آئندہ آنے والی نسلوں کو یہ حق ہوگا کہ ہم کو ان عمارتوں سے دھکا دیکر نکال دیں اور ہمارے مقاصد اور ارادوں کے ان مقبروں کو گرا دیں۔ مجھے امید ہے کہ جامعہ والے اس مقصد کو نہ بھولیں گے۔"

اس کے بعد ، مئی ۱۹۳۹ء کو جامعہ نگر میں استادوں کے مدرسے کے لئے ایک عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، سنگ بنیاد سے پہلے پروفیسر محمد مجیب صاحب نے قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ایک تقریر کی۔ آپ نے فرمایا:

"جامعہ کی تعلیمی بستی کی ایک عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جانے کو ہے اور جامعہ والوں کے لیے یہ بڑی خوشی کا موقع ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت میں آپ کے سامنے یہ بیان کروں کہ جامعہ والے جامعہ کا خیال دل میں لیے کہاں کہاں اور کس کس طرح رہے یا آپ کی نظر کو امید کا فریب دے کر بتاؤں کہ اس زمین پر جسے آپ ادھر اُدھر دیکھ رہے ہیں، جامعہ کی بستی کس طرح بسائی جائے گی اور کیسی عمارتوں کے نقشے ہمارے ذہن میں ہیں، آپ کو یہ سمجھاؤں کہ وہ مقصد کیا تھا جس کی خاطر جامعہ قائم کی گئی اور اس کی داستان سناؤں کہ یہ مقصد کس طرح اپنی صورت بدلتا مگر ہمیشہ ہمارے دلوں میں آباد رہا، یا یہ بتاؤں کہ جامعہ اپنی نئی بستی میں آباد ہوگی تو پھر جامعہ

کا مقصد اس بستی کو کس طرح رونق دے گا اور ہم اپنے اس نئے میدان عمل کو کیسے منصوبوں اور کارناموں سے سنواریں گے۔ جامعہ ایک ادارہ ہے اور اس حیثیت سے کوئی قدر رکھتی ہے تو وہ ایک ایسا خیال بھی ہے جو کہ بڑے سے بڑے ادارے میں سما نہیں سکتا اور جسے اپنی تخلیقی قوت دکھلانے کے لئے قومی اور ملکی زندگی کا پورا میدان چاہئے، جامعہ والے ایک چھوٹی سی جماعت ہیں، مگر اس جماعت کی ساری محنت اور سارا کام بیکار ہو جائے گا اگر وہ اپنی ملت میں فنا ہو کر اپنے نصب العین کو ہندوستان کے مسلمانوں کا نصب العین نہ بنا سکی۔ اس خوشی کے موقع پر یہ ساری باتیں یاد آجاتی ہیں اور جی چاہتا ہے کہ خوشی منانے کی جگہ خدا کے کرم نے جو کچھ عطا کیا ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہم خدمت کا کوئی نیا ارادہ کریں۔ دنیا میں سبھی آرام کے لیے یا کام کے لیے عمارتیں بنواتے ہیں اور سب کی طرح ہمیں بھی نئی عمارت بننے پر خوشی ہوتی ہے، لیکن ہمیں اس کی بھی فکر کرنا ہے کہ ان عمارتوں میں کہیں ہم کو اتنا آرام نہ ملنے لگے کہ یہ قید خانہ بن جائیں، ان میں رہ کر ہم کہیں یہ نہ بھول جائیں کہ عمارت کام کے لیے بنتی ہے اور ہمیں اپنا کام اس طرح بڑھانا ہے کہ اس کے لیے کوئی عمارت کافی نہ ہو.....

اگست میں نیا تعلیمی سال شروع ہوا تو اگرچہ یہ عمارت ابھی تک مکمل نہیں ہوئی تھی، مگر استادوں کا مدرسہ قرول باغ سے اس نئی عمارت میں اٹھ آیا اور دارالاقامہ اور تعلیم کے لیے دو عمارتیں کرایہ پر لے لی گئیں۔

اب جامعہ کے لوگوں کو اس نئی بستی کو جلد سے جلد آباد کرنے کی فکر ہوئی۔ موجودہ شکل میں، جبکہ جامعہ کے دو ادارے جامعہ نگر منتقل ہو گئے اور باقی ادارے قرول باغ میں تھے، بڑی دقتیں تھیں، اس کے علاوہ کرایہ کی عمارتوں کا بار بھی بہت کھل رہا تھا اس لیے اور عمارتیں بنوانے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کی گئی تاکہ دوسرے ادارے بھی جامعہ نگر

میں منتقل کر دئے جائیں۔ شفیق الرحمان قدوائی صاحب کی کوششوں سے جامعہ کے ہمدردوں کا
پورے ملک میں جال سا بچھ گیا تھا اور ریاست حیدر آباد میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بہت
دوست تھے جن کی کوششوں سے ۱۹۲۰ء میں ریاست حیدر آباد سے ۵۰ ہزار کی یکمشت
اور ایک ہزار ماہانہ کی گرانٹ جاری ہوئی تھی۔ یہ لوگ اب مزید امداد کی کوشش کر رہے تھے۔
بالآخر کارکنان جامعہ کا صبر اور ایثار اور ان ہمدردوں کی کوششیں بار آور ہوئیں او
۱۹۳۹ء کے وسط میں نظام حیدر آباد نے ایک لاکھ کا گراں قدر عطیہ دینے کا اعلان کیا۔
۳۵ء، ۳۶ء میں جو عمارت بنوائی گئی تھی اور جو مدرسہ ابتدائی کے استعمال میں تھی با
ویسی ہی اس کے مقابل میں دوسری عمارت بنوانے کی تجویز تھی، جس میں مدرسہ ثانوی کو
منتقل کرنے کا پروگرام تھا۔ اس عمارت کے لیے نظام حیدر آباد کا ایک لاکھ کا یہ عطیہ کا ف
نہیں تھا، مگر ستمبر ۱۹۳۹ء میں مجلس حاملہ نے اللہ کا نام لے کر تیسری عمارت کی تعمیر کی اجاز
دیدی اور بہت جلد اس کا کام شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صحت قابل اطمینان نہ
تھی، خاص طور پر بائیں آنکھ میں تکلیف رہ رہ کر اٹھا کرتی اور بڑی تکلیف دہ صورت اخ
کر لیتی۔ سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں جب اس میں بڑی شدید تکلیف ہوئی تو دہلی کے ڈاکٹ
کے مشورے پر آپ بمبئی تشریف لے گئے اور مشہور ماہر امراض چشم ڈاکٹر کیپ (Kenne) کا ع
کرایا۔ اس نے آپریشن کیا، دو ڈھائی ماہ کے علاج کے بعد شیخ الجامعہ صاحب واپس آ
تو آنکھ کی تکلیف جاتی رہی تھی، چنانچہ ۱۵ر مارچ (۱۹۳۷ء) سے آپ نے باقاعدہ دفتری معمو
شروع کر دئے، لیکن ایک ہی سال کے بعد پھر تکلیف شروع ہو گئی، اور جولائی ۱۹۳۸ء میں آ
دوبارہ بمبئی تشریف لے گئے اور دوسری مرتبہ آپریشن کیا گیا۔ اگر چہ یہ آپریشن بھی پچھلے آپریشن کی ط
ڈاکٹروں کی اصطلاح میں کامیاب رہا، مگر تکلیف تھی کہ رہ رہ کر اٹھا کرتی، اس لئے اگلے سا
جون میں علاج کے لیے وی آنا تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے اپنے رفیق

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کو جو خط لکھا وہ بہت دلچسپ ہے۔ ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو:

"۳ر جولائی کو وینس پہنچا، شہر پسند آیا، وہیں رہ پڑا، دو دن کی جگہ دس دن وہاں رہ گیا، بہانہ یہ تراشا کہ اطالوی زبان سیکھ رہا ہوں، واقعی سیکھتا بھی تھا، لیکن سیکھنے میں جتنی دیر لگی بھلانے میں اس سے بہت کم لگے گی۔ ۱۸ر جولائی کو وی آنا پہنچا......
ڈاکٹروں نے وہ معائنے کئے کہ معاذ اللہ! در گفتن نمی آید۔ قرار یہ پایا کہ آنکھیں اب جو کچھ ہیں ٹھیک ہیں، احتیاط رہے تو کام چلتا رہے گا۔ آنتیں البتہ بہت خراب ہیں، پرانی ہیچش ہے اور غوب ہے، اس کی وجہ سے جگر بھی خراب ہے اور گردے بھی متاثر ہو چلے ہیں، زیادہ ڈھیل کی گنجائش نہیں، قاعدے سے تو حالت خراب ہونی چاہئے تھی، لیکن چونکہ یہاں سب کچھ بے قاعدہ رہا ہے اس لیے ابھی موقع ہے، علاج ہو سکتا ہے، خون کی جو حالت ہونی چاہئے تھی اس سے بہتر ہے، اس لیے علاج میں سہولت ہے۔ قلب بھی (ستم ظریفی ملاحظہ ہو) پرچا ہے۔ دماغ کا معائنہ نہیں ہوا ورنہ شاید کچھ دلچسپ نتیجہ برآمد ہوتا......"

مگر بدقسمتی سے دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور بہ دقت تمام وہ ہندوستان واپس آئے۔ ۱۷ر نومبر کو بغیر کسی اطلاع کے جامعہ نگر پہنچے اور جامعہ کے لوگوں کو اس وقت اطلاع ملی جب وہ دوسرے روز دفتر تشریف لائے۔

۱۹۳۶ء کے بعد ملک کے سیاسی حالات میں کافی تبدیلی آگئی تھی اور ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی کی رہنمائی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم تیار ہوئی تو اس کی وجہ سے جہاں مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقے نے جامعہ پر شدید اعتراضات کئے، وہاں ملک میں جامعہ کی شہرت بھی بڑھی اور اس کی حیثیت بھی قائم ہوئی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ بعض صوبجاتی حکومتوں نے جامعہ کی سندیں دوسری منظور شدہ سندوں کے مساوی تسلیم کرلیں۔ جنوری ۱۹۳۹ء میں یوپی کی حکومت نے جامعہ جونیر، سینیر اور سندی کی ڈگریوں کو حسب ترتیب

میٹرک، ایف اے اور بی اے کے مساوی تسلیم کرلیا، اسی سال جولائی میں حکومت بہار نے بھی جامعہ کی ڈگریوں کو تسلیم کرلیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس کے کئی برس بعد صرف جامعہ جونیر کو میٹرک کے مساوی تسلیم کیا۔

مدرسہ ثانوی کی عمارت تیار ہو گئی تو ۱۹۴۴ء میں تمام تعلیمی ادارے قرولباغ سے جامعہ نگر میں منتقل ہو گئے، قرولباغ میں صرف کتب خانہ، ادارۂ تعلیم و ترقی اور مکتبہ جامعہ رہ گئے۔ ان کے علاوہ ایک مدرسہ ابتدائی بھی تھا، مگر یہ جامعہ کی اپنی عمارت میں تھا اور یہ غیر مقیم طلبا کے لئے شروع کیا گیا تھا، اس لیے اس کو قرولباغ سے منتقل کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، لیکن جب ستمبر ۱۹۴۷ء میں دلی میں فساد ہوا تو مکتبہ جامعہ کو جلا دیا گیا، مرکزی کتب خانہ اور ادارۂ تعلیم و ترقی لوٹ لیے گئے، اس لیے یہ ادارے بھی جامعہ نگر آ گئے اور قرولباغ سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ ایک ابتدائی اسکول جو غیر مقیم طلبہ کے لیے بنایا گیا تھا، ناساز گار حالات کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

جشنِ سیمیں

۱۹۴۵ء میں جامعہ کے پچیس سال پورے ہو رہے تھے، اس لیے یکم مارچ ۱۹۴۴ء کو جشنِ سیمیں (سلور جوبلی) منانے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ فیصلہ ایسی حالت میں کیا گیا تھا جب کہ جامعہ کے پاس نہ پیسے تھے، نہ سامان تھا، اور نہ مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے معقول جگہ تھی مگر لگن تھی، خلوص تھا، ایثار اور دوڑ دھوپ کرنے کا جذبہ تھا، مشکل سے مشکل مہم کو سر کرنے کا حوصلہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ذاکر صاحب کی شخصیت تھی جس کا اثر غیر محدود تھا اور ان کے کچھ ساتھی تھے جو مایوس ہونا اور تھکنا جانتے ہی نہیں تھے اور چٹیل میدان کو گلزار بنانے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔ ان ہی وسائل پر بھروسہ کر کے جوبلی کا اعلان کر دیا گیا۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جامعہ میں اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

"خدا کا احسان ہے کہ جامعہ کی عمر چند ماہ میں ۲۵ سال ہو جائے گی۔ دس پندرہ سال پہلے کسے امید تھی کہ ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوگا، اپنے کاموں کا جائزہ لینے اور انھیں آگے بڑھانے کے لئے انشاء اللہ مارچ ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی جوبلی منائی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ جامعہ کے سب کارکن اور طالب علم اسی وقت سے اس جشن کی تیاری میں لگ جائیں گے، جو کام تکمیل کے منتظر ہیں انھیں محنت سے مکمل کرلیں گے اور نئے کام جو شروع کرنے ہیں، انھیں اچھی طرح سوچ کر شروع کرنے کے منصوبے تیار کریں گے۔ خدا کرے یہ جشن جامعہ کے لیے ایک نئی زندگی کا پیام لائے۔"

اس کے بعد قوم کے نام خط لکھا:

"۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کا وہ منظر آپ کی چشم تصور کے سامنے ہوگا جب خدا کے ایک برگزیدہ بندے نے خانۂ خدا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح کیا تھا۔ اس واقعے کو چوتھائی صدی گذر گئی، مسلمانوں کی قومی تحریک نے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے، بہت سے سیاسی اور تعلیمی ادارے بنے اور بگڑے، لیکن جامعہ ملیہ سخت مشکلوں اور آزمائشوں کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی زندگی میں آہستہ آہستہ جڑ پکڑتی رہی، اب اس نے اتنی قوت حاصل کرلی ہے کہ اس کی شاخیں دور دور تک پھیلیں اور سارے ملک پر چھا جائیں، مگر اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جامعہ ملتِ اسلامی کے سامنے جائزہ دے کہ اس نے اب تک کیا کیا ہے اور اس سے ہدایت لے کہ آیندہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

"چنانچہ مجلس جامعہ ملیہ نے طے کیا ہے کہ آیندہ سال مارچ ۱۹۴۶ء میں جامعہ سلور جوبلی کے نام سے ایک جشن کیا جائے، جامعہ کے قدیم طلبا، ہمدردانِ جامعہ اور وہ سب حضرات جو تعلیمی اور قومی کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں جمع ہو کر جامعہ کے موجودہ اداروں اور شعبوں کا معائنہ کریں اور ان کی اصلاح اور ترقی

کی تدبیریں بتائیں اور ان کی ان تجویزوں پر جو جامعہ کے کام کی توسیع کے لیے پیش کی جارہی ہیں، غور فرمائیں، کچھ کام جو ہو رہے ہیں انھیں مکمل کیا جائے اور کچھ جو کرنے ہیں انھیں شروع کیا جائے۔ اس سلسلے میں خیال ہے کہ علوم اسلامی کا ایک تحقیقاتی ادارہ بیت الحکمۃ کے نام سے قائم کیا جائے، ایک کتب خانہ کے قیام کا انتظام ہو جس میں اسلام اور ہندوستان سے متعلق تمام ضروری کتب کا ذخیرہ ہو، اعلیٰ پیمانہ پر ایک صنعتی مدرسہ کا کام شروع کیا جائے اور ایک لڑکیوں کے مدرسہ کی بنا ڈالی جائے، ان نئے اداروں کی عمارت کے علاوہ جامعہ کی نوآبادی کے لیے ایک جامع مسجد کی تعمیر نیز ایک شفاخانہ کا قیام ازبس ضروری ہے۔ کاش یہ سب کام جوبلی کے سلسلے میں کم سے کم شروع تو ہو جائیں، آپ کی توجہ سے کیا عجب ہے کہ ہم سال بھر کے اندر اتنا سرمایہ فراہم کرلیں کہ ان کاموں کا آغاز ہو سکے۔"

پہلے مارچ ۱۹۴۶ء میں جشن سیمیں منانے کا فیصلہ کیا گیا تھا، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس زمانے میں عام انتخابات ہوں گے، اس لیے مارچ کے بجائے نومبر میں ۱۵ سے ۸ا تک منانے کا فیصلہ کیا گیا۔

یہ جوبلی جن نازک حالات میں ہوئی اور جس شان کے ساتھ منائی گئی وہ جامعہ سے تعلق رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ ملک کی سیاسی فضا اور فرقہ وارانہ تعلقات انتہائی خراب تھے، مگر پھر بھی جوبلی کی تقریبات بہت کامیابی کے ساتھ منائی گئیں اور بقول پروفیسر محمد مجیب صاحب "ذاکر حسین صاحب، کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو ایک جگہ جمع کر کے ان سے کہلوا سکے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ صحیح معنوں میں قومی سنستھا ہے۔" اس موقع پر شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جو خطبہ پڑھا اس کا حاضرین پر بہت گہرا اثر ہوا، لوگوں کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا اور بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، خود ذاکر صاحب کی آواز گلوگیر تھی (یہ خطبہ اس مضمون کے بعد ہی شائع کیا جارہا ہے)

...ل کی آزادی اور حکومت کی امداد

جامعہ کے بانیوں نے آزاد تعلیم کا بیج بویا تھا، جب یہ بیج بویا گیا تھا تو زمین شور تھی اور موسم ناموافق۔ خون پسینہ ایک کرکے اس کی آبیاری کی گئی تو بیج نے پودے کی شکل اختیار کی، مگر کمزور تھا اور بڑھوتی کی رفتار کافی سست تھی۔ جامعہ کے کارکن اس امید پر اس پودے کی دیکھ بھال کر رہے تھے کہ ملک کی آزادی کے بعد موافق فضا ملے گی اور یہ کمزور پودا بہت جلد تناور درخت کی صورت اختیار کرے گا، مگر ملک کی آزادی ایسی شکل میں آئی، جس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ جامعہ کی آمدنی کا قابل اعتماد ذریعہ عوام کے چندے تھے اور تقسیم کی وجہ سے عوامی زندگی ایسی اتھل پتھل ہوگئی کہ یہ ذریعہ مکمل طور پر ختم ہوگیا۔ اب جامعہ کے اخراجات اس سرمایے سے پورے کیے جا رہے تھے جو جوبلی کے موقع پر عوام، والیان ریاست اور حکومت سے ملا تھا۔ مگر تا بکے؟ اب جامعہ کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی شکل باقی نہیں رہ گئی تھی سوائے اس کے کہ حکومت سے امداد لی جائے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جامعہ نے حکومت سے امداد نہ لینے کا فیصلہ کیا تھا، اس لیے حکومت سے کسی قسم کی امداد لینا اس فیصلے کی خلاف ورزی ہوگی۔ اس کے برعکس دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ ہم نے بیرونی حکومت سے امداد نہ لینے کا فیصلہ کیا تھا، یہ قومی حکومت ہے، خود ہماری بنائی ہوئی، اس سے امداد لینے میں کسی قسم کا کوئی خلو نہیں۔ پھر اس کے علاوہ جامعہ کو اگر زندہ رکھنا اور ترقی دینا ہے تو اس کے علاوہ کوئی اور شکل نہیں ہے۔ دوسری طرف ملک کے محبوب رہنما اور حکومت کے ہردلعزیز وزیراعظم پنڈت نہرو نے نہ صرف امداد کی پیش کش کی بلکہ اس کو قبول کرنے پر اصرار بھی کیا۔ چنانچہ انجمن جامعہ ملیہ نے بہت غور و خوض کے بعد اس کو قبول کرنے کی اجازت دی۔ اجازت مل گئی اور حکومت سے امداد بھی ملنے لگی مگر اس سلسلے میں جو دلچسپ تجربے ہوئے، اس کا ایک ہلکا سا اندازہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے خطبۂ جشن زریں سے کیا جاسکتا ہے، جو اسی اشاعت میں

درج ہے۔

جامعہ کے نئے رہنما، پروفیسر محمد مجیب صاحب

ملک کی آزادی کے بعد جامعہ کو نئے حالات اور نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا ابھی ان پر پوری طرح قابو حاصل نہیں ہوا تھا کہ نومبر ۱۹۴۸ء میں، وزیر اعظم پنڈت جواہر نہرو اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے اصرار اور جامعہ کی اجازت سے ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ تشریف لے گئے اور پروفیسر محمد مجیب صاحب، جو اس وقت نائب شیخ الجامعہ حیثیت سے کام کر رہے تھے، شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی وجہ سے کارکنان جامعہ کو بڑا اطمینان تھا، وہ یہ سو بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے بغیر جامعہ چل سکے گی، مگر ذاکر صاحب کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کو ایسے لائق اور ایثار پسند ساتھی ملے تھے، جن پر انھیں پورا اعتماد تھا کہ جامعہ ان کی رہنمائی میں ترقی کرے گی اور قوم و ملک کی بہتر طور پر خدمت کر سکے گی۔

مجیب صاحب کے دور میں سب سے بڑی آسانی یہ رہی کہ انھیں جامعہ چلانے کے لئے چندے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ حکومت کی امداد اور جامعہ کی ڈگریوں کی منظوری کے بعد اس کی ترقی کے دروازے کھل گئے اور جامعہ کو جو ابھی تک صحیح معنی میں یونیورسٹی نہیں تھی، ۱۹۶۲ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی دفعہ ۳ کے تحت باقاعدہ یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اب یہاں اداروں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے، پہلے صرف مدرسہ ابتدائی، مدرسہ ثانوی، کالج اور استادوں کا مدرسہ تھے، اور اب ان کے علاوہ نرسری اسکول، بالک ماتا سنٹر، شعبۂ انجینئرنگ اور اسکول آف سوشل ورک کھل گئے ہیں اور ایک عرصے سے کام کر رہے ہیں، بی ایس سی، ایم اے، ایم ایڈ اور پی ایچ ڈی کے نصابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ پہلے صرف تین بڑی عمارتیں تھیں، مدرسہ ابتدائی، مدرسہ ثانوی اور استادوں کے مدرسہ کی،

اب یہاں دنیا ہی بدل گئی ہے، استادوں کا مدرسہ، کالج اور لڑکیوں کے لئے ہوسٹل بن گئے ہیں، آرٹس انسٹی ٹیوٹ کے لئے ایک عمارت بنوائی گئی ہے، جس میں تعلیم بھی ہوتی ہے اور طالب علم بھی رہتے ہیں، کالج کے لئے، ہوسٹل کے علاوہ، دو عمارتیں بنی ہیں، ایک میں تعلیم ہوتی ہے اور ایک میں دفتر، لائبریری اور لیبوریٹری ہے، ایک اور عمارت ہے جس میں مدرسہ ثانوی اور مدرسہ ابتدائی کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس کی صرف ایک منزل تیار ہوئی، دوسری منزل باقی ہے۔ اسی طرح مرکزی دفاتر کے لئے ایک دو منزلہ عمارت ہے۔ ان کے علاوہ ایک اوپن ایر تھیٹر ہے، ایک ورکشاپ ہے، اسٹاف کے لئے بہت سے کوارٹرز ہیں اور شعبۂ انجینیرنگ اور اسکول آف سوشل ورک کی تعلیم کے لئے اور طلباء اور اسٹاف کے رہنے کے لئے الگ عمارتیں ہیں۔ اس وقت دو عمارتیں اور ایک مسجد زیر تعمیر ہیں۔ مرکزی کتب خانہ کے لئے بڑی شاندار عمارت بن رہی ہے جو قریب قریب مکمل ہو چکی ہے، جشن زریں کے زمانے میں اس کے کچھ حصے استعمال کے لئے مل جائیں گے، دوسرے جامعہ کالج کے سائنس بلاک کی عمارت زیر تعمیر ہے، دیواریں کافی اونچائی تک بن گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ پچاس سال سے جامعہ میں کوئی مسجد نہیں تھی جشن سیمیں کے موقع پر اس کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا تھا، مگر ظاہر ہے یہ صرف مسلمانوں کے عطیوں سے بنائی جا سکتی ہے اور بدقسمتی سے انھوں نے جامعہ کی اس اپیل کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی تھی۔ اس مرتبہ اللہ کا نام لے کر اس کی تعمیر کا کام شروع کرا دیا گیا اور خدا کا شکر ہے کہ چھت تک اس کی دیواریں تیار ہو گئی ہیں، کوشش جاری ہے کہ جلد ہی چھت بھی پڑ جائے۔

یہ تو تصویر کا ایک رُخ ہوا جو حقیقتاً بڑا شاندار ہے، مگر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کا دور تکلیفوں اور مشکلوں سے خالی ہے۔ اس کی دشواریوں کی نوعیت مختلف ضرور ہے، مگر یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ پریشانیوں سے چھٹکارا مل گیا ہے اور اب اطمینان قلب حاصل ہو گیا ہے۔ پہلے وہی اساتذہ اور کارکن آتے تھے جن کو جامعہ سے قلبی لگاؤ اور اس کے مقاصد سے اتفاق اور ہمدردی ہو، کیونکہ یہاں جو کچھ ملتا تھا وہ برائے نام

تھا اور محنت بہت کرنی پڑتی تھی، مگر اب مرکزی یونیورسٹیوں کے مطابق تنخواہیں ملتی ہیں اور اساتذہ وکارکنوں کو رائج قاعدوں کے مطابق منتخب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بازار میں اس کا ڈگریوں کی وہی مانگ ہے جو دوسری یونیورسٹیوں کی ہے، اس لئے ایسے طالب علم زیادہ آتے ہیں، جنھیں علم اور تہذیب سے زیادہ ڈگریوں کی طلب ہوتی ہے۔ اب مجیب صاحب کا کام یہ ہے کہ ان اساتذہ اور طلبار کو جامعہ کے مخصوص ماحول کے مطابق بنائیں، ان میں یہ احساس پیدا کریں کہ صرف پیٹ ہی نہیں ہے، ملک وقوم کی خدمت بھی ایک اہم کام ہے، صرف کسی طرح زندگی گذار دینا ہی کافی نہیں ہے، جو زندگی شرافت، انسانیت، رکھ رکھاؤ اور تہذیب سے خالی ہو، وہ کوئی زندگی نہیں۔ یہ کام بہ ظاہر آسان معلوم ہوتا ہے، نصیحت کرنا، اپدیش دینا کوئی مشکل کام ہے، لیکن جس کے پیش نظر ایک خاص مطمح نظر ہو، ایک مشن ہو اور جو اعلیٰ اقدار کا پرستار ہو، موجودہ دور میں اس کے دل کی کیفیت کیا ہوگی، اس کا اندازہ ہر شخص نہیں کرسکتا۔

شیخ الجامعہ صاحب کی وہ تقریریں اور رپورٹیں میرے سامنے ہیں جو یوم تاسیس کے جلسوں، انجمن کے جلسوں اور تقسیم اسناد کے جلسوں میں انھوں نے پڑھی ہیں۔ اگر اس مضمون کے طویل ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ان کے متعدد ایسے اقتباسات پیش کرتا، جن سے معلوم ہوتا کہ ان کا مشن کتنا مشکل اور کتنا اہم ہے، اس لئے صرف ۵۸-۱۹۵۷ء کی رپورٹ سے جو انجمن جامعہ میں انھوں نے پیش کی تھی، دو اقتباسات پیش کرتا ہوں:

"ملک کی تعلیم کو اس وقت دو باتوں سے بہت نقصان پہنچ رہا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ استاد کو اس ادارے سے لگاؤ نہیں ہوتا جس میں وہ کام کرتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ طالب علم اور استاد اور طالب علم اور ادارے کے درمیان خیرخواہی اور محبت کا رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ استاد سمجھتے ہیں کہ انھیں ان کی خدمات کے بدلے میں تنخواہ ملتی ہے اور اگر انھیں انفرادی یا اجتماعی طور پر خیال ہو جائے کہ انھیں تنخواہ کم ملتی ہے یا وہ ملازمت کے کسی حق سے محروم کئے گئے ہیں تو وہ کام میں جی لگانا چھوڑ دیتے

ہیں یا ان کی ساری توجہ تنخواہ بڑھوانے یا حق کو وصول کرنے میں صرف ہونے لگتی ہے۔ طالب علموں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، استاد کچھ اس تعداد کی وجہ سے ذاتی واقفیت پیدا کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں، کچھ بے پروائی بھی برتتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تعلیم کی حیثیت ایک معمول کی سی ہو گئی ہے جسے پورا کرنا کافی سمجھا جاتا ہے اور علم حاصل کرنے کے شوق سے اسے کچھ زیادہ نسبت نہیں رہ گئی ہے۔"

"جامعہ کے اساتذہ کے لیے مصلحت اندیشی اور یکجہتی اس وجہ سے اور بھی لازمی ہوگئی ہے کہ بیشتر نوجوان جو اب تعلیم کے لیے آتے ہیں ان کا جامعہ کے تہذیبی نصب العین سے کوئی روایتی تعلق نہیں ہے، ہم جس تہذیبی ورثے کو ملک کے نوجوانوں تک پہنچانا چاہتے ہیں، ان کی قدر پہچاننے کے لیے ہمارے اخلاق اور ہمارے ذوق و شوق کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا ہے اور اگر ہماری جماعت کے اندر مخالفتیں پیدا ہو گئیں یا ہم نے اپنے طرز عمل سے ظاہر کیا کہ ہم اعلیٰ اصولوں کی پابندی کرنے کی توفیق نہیں رکھتے تو یہ سمجھ لیا جائے گا کہ ہم میں بھی اتنی ہی کھوٹ ہے جتنی کہ رائج سکے میں ہوا کرتی ہے اور کوئی ہمیں پرکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرے گا۔"

جشن چہل سالہ

۱۹۶۰ء میں جامعہ کا جشن چہل سالہ منایا گیا۔ جشن چہل سالہ کی رسم تاریخ میں بالکل نئی بات ہے۔ روایتوں کے مطابق جشن سیمیں (سلور جوبلی) منایا جاتا ہے، جشن زریں (گولڈن جوبلی) منایا جاتا ہے اور جشن الماس (ڈائمنڈ جوبلی) منایا جاتا ہے، مگر جامعہ میں کوئی کام اس لیے نہیں کیا جاتا کہ ایسا لوگ کرتے ہیں، اس کے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے، بڑا مقصد، عظیم مقصد۔ جشن چہل سالہ کا بڑا مقصد یہ تھا کہ حکومت اور ملک و قوم کو جامعہ کی ضروریات کی طرف متوجہ کیا جائے اور اس کے بعض نامکمل منصوبے پورے

کئے جائیں۔ اس موقع پر شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب نے تین خطبے پڑھے تھے، ایک جلسۂ افتتاح میں جس میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم ڈاکٹر شریمالی نے شرکت کی تھی، دوسرا اس وقت پڑھا گیا جب پرنس مکرم جاہ نے نمائش کا افتتاح کیا تھا اور تیسرا جلسۂ خاص میں پڑھ گیا تھا، جس کی صدارت پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کی تھی۔ تیسرے خطبے کے دو طویل اقتباسات ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں، جن سے جشن چہل سالہ کے مقصد کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے:

"جامعہ کی بنیاد چالیس برس ہوئے، اس یقین کے ساتھ رکھی گئی تھی کہ ہندوستان آزاد ہوگا اور سچی قومی تعلیم ہماری جنتا میں ایک نئی جان ڈال دے گی۔ ہماری امیدیں پوری ہوگئی ہیں، ہندوستان آزاد ہے، ہماری تعلیم بالکل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ آج ہم جامعہ ملیہ کے کام کرنے والے، جامعہ کی چالیسویں سال گرہ منا رہے ہیں، ہمارے راشٹرپتی، جن سے ہمارا بہت پرانا تعلق ہے، ہم میں تشریف رکھتے ہیں، ہم میں ایسے لوگ ہیں جو جامعہ کی خدمت اس وقت سے کر رہے ہیں جبکہ وہ قائم ہوئی تھی ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ یہاں گذارا ہے، ہم میں بہت سے لوگ نئے حوصلے لیکر شامل ہوئے ہیں۔ جامعہ بڑھتی رہی ہے، بدلتی رہی ہے، اس کے مقاصد پر اب بھی بحث ہو رہی ہے۔ یہ بحث اس کی علامت ہے کہ وہ لوگ جو خود اس کے مختلف کاموں کو انجام دے رہے ہیں اور وہ جو کسی نہ کسی طریقے پر ان میں شریک ہوتے رہتے ہیں، جامعہ کے مقاصد سے صحیح قسم کی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بے شک یہ ہمارے لئے خوشی اور شکر گذاری کا موقع ہے۔

"جامعہ کے بہت سے بانی تھے، مولانا محمود الحسن، مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں، مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی۔ ہم کو اس پر فخر کرنا چاہئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جامعہ کا وجود بہت سے عقیدوں اور تمناؤں کا سنگم، ممتاز

نگروں اور ملک کے رہنماؤں کے درمیان قدر مشترک تھا۔ جو اسے نام دیا گیا اس نے اس کے منصب کے تین پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، یعنی یہ کہ جامعہ ایک آزاد تعلیم گاہ ہوگی وہ شہریت کے نصب العین کو طرح طرح سے سامنے لاتی رہے گی اور وہ اعلیٰ دینی اور روحانی سرچشموں سے ہدایت حاصل کرے گی، ہم نے جامعہ کے منصب کے تینوں پہلوؤں کو ایک عملی، محسوس شکل دینے کی کوشش کی ہے، ہم آزاد رہے، شہریت کے تصور کو واضح کرتے رہے اور دین کی پیروی کے معنی سمجھتے اور سمجھاتے رہے۔ مہاتما گاندھی نے سب سے پہلے ہندوستان کی تعلیم میں آزادی کو معیار قرار دیا اور انھیں کو اس پر بہت اصرار تھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک اسلامی ادارہ ہو، ہمارے لیے یہ ایک جذباتی مسئلہ تھا، وہ اسے خالص عقلی نقطۂ نظر سے صحیح مانتے تھے، ہم نے یہ تو مان لیا کہ جامعہ کو نام اور منصب کے لحاظ سے ایک اسلامی ادارہ ہونا چاہیے، مگر ہمیں اپنے دلوں سے اس تنگ نظری اور تعصب کو نکالنے میں دشواریاں پیش آئیں جو ہمارے ملک میں ایک وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا، دین کے خالص سرچشموں سے ہدایت، ہمت اور خود اعتمادی حاصل کرنے اور اپنے کام اور اپنے معاملوں میں اس کی ترجمانی کرنے میں بھی ہماری بڑی سخت آزمائش ہوئی۔ ہمارا ہر قدم صحیح نہیں پڑا، ہم بالکل سیدھے آگے نہیں بڑھ سکے، لیکن منزل کبھی ہمارے دل سے دور اور نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی۔ اس خیال نے ہمیں بہت سہارا ملا کہ گاندھی جی ہم کو اور ہمارے کاموں کو محبت اور اعتماد کے ساتھ دیکھ رہے ہیں، وہ ہماری غلطیوں کو مسکرا کر معاف کر دیں گے اور انھیں امید رہے گی کہ جو کچھ ہم آج نہیں کر سکے وہ کل ضرور کر لیں گے۔ دو مرتبہ انھوں نے ہمیں ڈوبتے سے بچایا، کبھی ہم نے ٹھوکر کھائی، کبھی راستے سے جھٹک گئے، مگر جو جھنڈا انھوں نے ہمارے ہاتھ میں دیا تھا اسے ہم آج بھی لہرا رہے ہیں۔"

اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ جامعہ جس مقصد سے قائم کی گئی تھی، اس نے جو تعلیمی کام کیا

ہے اور اب بھی کر رہی ہے، ہنر اور استعداد کے جس تصور کا اس نے پرچار کیا ہے، اس کا وہ مسلک جس نے اسے ملک میں دوستی اور یگانگت کی علامت بنا دیا ہے، اسے اس کا مستحق کر دیتا ہے یا نہیں کہ اسے مختلف درجوں کی اعلیٰ تعلیم کا بڑے پیمانے پر انتظام کرنے کے لیے وسائل دے جائیں۔ تعلیم کا بہرحال یہ مقصد ہوتا ہے کہ نوجوانوں کو کام اور روزگار کے لیے تیار کرے اور یہ بات اچھی ہو یا نہ ہو، ملازمت اسی کو ملتی ہے جس کے پاس مناسب ڈگری ہو۔ جامعہ اپنے وسائل سے فائدہ نہ اٹھا سکے گی جب تک کہ اسے پارلیمنٹ قانون کے ذریعہ ڈگری دینے کا اختیار عطا نہ کرے۔ ایک اور سوال اس زمانے میں اٹھا ہے کہ جامعہ کو یونیورسٹیوں کی طرح ہر مضمون کی تعلیم دینا چاہیے یا اعلیٰ تعلیم میں اپنے لیے کچھ مضمون مخصوص کر لینا چاہیے۔ ایک کمیٹی نے، جس کے صدر جسٹس ایس آر داس تھے، یہ سفارش کی ہے کہ جامعہ کا کام محدود نہ ہو، کیونکہ کام محدود ہو جانے پر بہت سے طالب علم جو روزگار کے لیے تعلیم حاصل کرتے ہیں، یہاں نہ آسکیں گے اور جامعہ تعلیمی دنیا سے کٹ کر الگ ہو جائے گی۔ گویا کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ جامعہ قومی اہمیت رکھنے والا ادارہ بننے کی خاطر اپنے دستور اور مقاصد میں تبدیلیاں کرے اور یہ بات مناسب ہے، کیونکہ سماج سے الگ رہنے کی خواہش ہمیں نہ پہلے کبھی تھی اور نہ اب ہے۔ جامعہ میں استاد اس وجہ سے آئے کہ وہ اپنے آپ کو آزادی اور مساوات کی حوصلہ پرور فضا میں تعلیم کے اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے اور اگر تنخواہیں بڑھ گئیں اور وسائل مہیا ہو گئے تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ جو مقاصد ہمیں اب دل سے عزیز ہیں وہ بے اثر ہو جائیں، آزادی اور مساوات کے وہ نشے جو ہماری طبیعتوں میں سرایت کر گئے ہیں خمار کی طرح دور ہو جائیں۔ اب بھی ہم بیدار دل ہیں، اب بھی ہم احتیاط کی وضع کو چھوڑ کر، نقصان اٹھانے کے لیے تیار ہو کر نئے کام شروع کرتے ہیں۔ آپ جس طرف بھی

دیکھئے اور خاص طور سے دل کی ان وسعتوں میں جہاں اب تک محبت اور مروت کی صدائیں نہیں گونجی ہیں، ہمیں آپ آگے بڑھتے دیکھیں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ جامعہ کا علم اسلامی ہے اور سیرت اسلامی تو اس سے مراد یہی سب کچھ ہوتا ہے، ہم اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر کسی حق کا مطالبہ نہیں کرتے ہیں، ہم تو اس کا اعلان کرتے ہیں کہ جو ضروری اور مفید کام کوئی اور نہ کرے وہ ہم کریں گے۔ دل کی گہرائیوں سے جو موتی دوسرے نہ نکال سکتے ہوں، انہیں ہم نکال لائیں گے، ہم مذہب اور تہذیب کے ذریعے وہ رشتے قائم کریں گے جو ایک دوسرے کا مزاج شناس، ہمدرد اور دوست بنا دیتے ہیں اور احترام، خلوص، سچائی کے نغموں سے لطف اور محبت کی فضا پیدا کریں گے جس میں ہنر پرورش پائے، اخلاق کا حسن اپنے جلوے دکھائے اور ہندوستان کے مستقبل کی روشنی آنکھوں کا نور بن جائے۔"

جشن زریں

جشن چہل سالہ کے دس سال کے بعد اب جامعہ کا جشن زریں (گولڈن جوبلی) منایا جارہا ہے۔ پچھلے دس برسوں میں ملک کے حالات اور تعلیم کے میدان میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں، کچھ مسائل حل ہوئے ہیں تو کچھ نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں اور کچھ مسائل سر اٹھا رہے ہیں۔ ضرورت تھی کہ ملک کے سربرآوردہ اشخاص اور جامعہ کے ہمدرد اکٹھا ہوں، جامعہ کی ترقی اور کاموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور مشکلات کی کہانی کو اس شخص کی زبانی سنیں جس کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بعد جامعہ کی رہنمائی سپرد کی گئی تھی اور جو ذاکر صاحب کے قدیم ساتھیوں میں سے ہے۔

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حکومت کی امداد سے جامعہ میں بہت کافی توسیع ہوئی اور ترقی و توسیع کے بہت سے منصوبے اس وقت سامنے ہیں، ان میں سے سب سے اہم منصوبہ علوم اسلامی کے سنٹر کا قیام ہے، جو مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی یادگار کے

طور پر قائم کیا جائے گا اور ابتدائی اور ضروری اخراجات کے لیے حکومت نے تین لاکھ کی رقم منظور بھی کردی ہے۔ اس سنٹر کے قیام سے جامعہ کے لیے ایک خاص میدان میں کام کرنے کے بہترین مواقع ملیں گے۔ مگر اس کو نہیں بھولنا چاہیے کہ حکومت کی امداد کا ایک خاص نہج ہوتا ہے اور وہ آسانی سے اپنی ڈگر سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتی، ملت اسلامیہ اگر چاہتی ہے کہ جامعہ ایسے کام بھی کرے، جن کا خاص طور پر صرف مذہب اسلام اور ملت اسلامیہ سے تعلق ہے تو اس کی ذمہ داریوں میں اسے بھی شرکت کرنی ہوگی اور اگر پورا نہیں تو کچھ بوجھ اسے بھی اٹھانا چاہیے۔ امید ہے کہ جشن زریں کی وجہ سے اس قسم کے مسائل اور امور پر غور کرنے اور مشورہ کرنے کا بہترین موقع ملے گا۔

اس مضمون کے صفحہ ۳۲ تک کے حالات اور واقعات جامعہ کی تاریخ سے لیے گئے ہیں، جو جشن سیمیں کے موقع پر کتابی صورت میں شائع کی گئی تھی۔ اس کے بعد کے حالات و واقعات راقم الحروف نے لکھے ہیں، جن کی صحت اور الفاظ و بیان کی ذمہ داری صرف مجھ پر ہے، اس لیے اگر کوئی واقعہ ذکر سے رہ گیا ہو تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

عبداللطیف اعظمی

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

تقریر شیخ الجامعہ

(بہ تقریب جشن سیمیں منعقدہ ۳۰ نومبر ۱۹۴۶ء)

یہ تقریر جامعہ کے جشن سیمیں کے خاص جلسے

میں، جو ۱۷ نومبر ۱۹۴۶ء کو زیر صدارت

اعلیٰ حضرت جناب نواب صاحب بھوپال منعقد

ہوا، پڑھی گئی۔

اعلیٰ حضرت، محترم امیر جامعہ، خواتین اور حضرات!

آج مجھے آپ کی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پچیس سالہ رودادکا خلاصہ پیش کرنا ہے۔ پچیس سال اور کیسے پچیس سال! یہ کام جب شروع ہوا تھا تو کتنے تھے جن کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اس پر پچیس سال بھی گذر جائیں گے؟ خاصی طویل مدت ہوتی ہے پچیس سال کی، اور پھر قوموں کی زندگی میں یہی پچیس سال ایک لمحہ سے بھی کم ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اپنی طوالت کے یہ زمانہ بے رنگ مرور کا مرادف بھی ہو سکتا ہے، اور حیات قومی کا یہی ایک لمحہ ایک تخلیقی لمحہ ہونے کی وجہ سے صدیوں پر بھاری بھی ہو سکتا ہے۔ ان گذرے ہوئے پچیس سال کی روداد کس اسلوب سے پیش کروں؟ اس مدت میں عزائم اور فسخ عزائم، ولولوں اور پژمردگیوں، مشقتوں اور سہل انگاریوں، دل بستگیوں اور دل شکستگیوں، شبہوں اور اعتمادوں، امیدوں اور مایوسیوں، تھپکیوں اور گھڑکیوں، حوصلہ مندیوں اور

وسائلیوں کی کیسی کیسی مثالیں سامنے آئی ہیں؟ اور یہ سب لفظ جو میں نے بولے یہ صرف بطائے گفتنی نہیں، ان میں سے سب کی مثالیں اس وقت میرے ذہن میں موجود ہیں۔ اگر تفصیل میں ان کا ذکر کروں تو داستان بہت طویل ہو جائے گی، خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اگر خدمت کا کوئی کام نیک نیتی سے، خدا کا کام سمجھ کر کیا جائے تو ہر چند کہ دشواریوں اور آزمائشوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن جس کا کام ہوتا ہے وہ دست گیری فرماتا ہے، متزلزل قدموں کو ثبات عطا ہوتا ہے، دل توڑا بھی جاتا ہے مگر پھر جوڑا بھی جاتا ہے۔

دل شکستہ در آں کوئے می کنند درست
چناں کہ خود نہ شناسی کہ از کجا بشکست

فان مع العسر یسرا، ان مع العسر یسرا، شرط یہ ہے کہ عسر کو اس کی رضا جوئی میں جھیلا جائے اور یسر کو اسی کی راہ میں پیش قدمی کے لئے سہولت اور مرحمت جانا جائے۔

اس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کر دوں۔ آپ سب کو یاد ہوگا، اس لئے کہ باوجود حافظہ کی معروف ناپائیداری کے وہ آسانی سے بھلا سکنے کی بات نہیں، کہ کوئی دس سال کی انتہائی ہیجانی اور تلاطمی بےچینی کے بعد ۱۹۲۰ء میں مسلمانان ہند کی ایک عمومی حرکت نے تحریک خلافت کی شکل اختیار کی۔ ساری دنیا میں ملت اسلامی پر جو گذر رہی تھی اس سے ہندوستان کے مسلمان بے خبر اور غیر متاثر نہ تھے، اپنی جماعتی حالت کی زبوں سے بھی، باوجود صد غفلت، یہ آنکھیں بند نہ کر سکتے تھے، مایوسی بھی تھی، غصہ بھی تھا، اور بے ہاتھ پاؤں مارے اپنے خاتمہ کا خیر مقدم کرنے کو بھی یہ تیار نہ تھے، کہ جسم جماعتی میں ابھی کہیں زندگی کی رمق باقی تھی، اور جس طرح کسی شدید مرض کے حملے میں جسم اپنی ساری قوتوں کو سمیٹ کر ایک بار دفع مرض کی جان توڑ کوشش کرتا ہے اسی طرح ملت اسلامیہ ہندیہ نے اپنی ساری ناتواں توانائیوں کو مجتمع کر کے صورت حال کے مقابلہ کا تہیہ کیا تھا۔ جس طرح جسم کے سارے

نظام ہائے اعضا، اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اس کی اس مصیبت میں آخری معرکے کے لئے کربستہ ہو کر، کتابوں اور حکیموں کے اندازوں سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ اپنا عمل کرتے ہیں اسی طرح جسم اجتماعی کا حال ہوتا ہے۔ اس تلاطم کے زمانے میں مسلمانان ہند نے اسی قسم کی ایک کوشش کی تھی۔ تعلیمی نظام اعضاء کے فعل کا نتیجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔

تعلیم کے کام کا پرسکون دھیما پن اور ایک انقلاب انگیز سیاسی ہنگامہ آرائی کا یہ تعلق بادی النظر میں کچھ انوکھا سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس دور انقلاب میں جامعہ کے نام سے ان تمام نیم شعوری اور تحت شعور تعلیمی منصوبوں نے ایک شکل اختیار کی جو ایک عرصے سے مسلمانوں کے اہل فکر وعمل کو ایک صحیح قومی تعلیمی نظام کے ترتیب دینے پر اکسا رہے تھے۔ اس میں محمد قاسم کی تمناؤں، سید احمد خاں کی آرزوؤں، سید محمود کی تجویزوں، وقار الملک کے ارادوں، اعلیٰ حضرت کی سلطانیہ کالج جیسی اسکیموں، غرض خدمت اور احیاء ملت کی بہت سی چھوٹی بڑی کوششوں کا پرتو ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قوم اپنے وجود کے وظیفۂ بنیادی سے غافل نہیں ہے، اور جب بھی اپنی زندگی کے باقی رکھنے اور ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اُسے تعلیم، صحیح تعلیم، ہی کی راہ پر گامزن ہونے کا خیال ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہماری قومی زندگی کا شیرازہ، جو خود ہمارے ہاتھوں بہت بوسیدہ ہو چکا تھا، بکھرا تو ہم نے دیوبند اور علی گڑھ میں اسے پھر سے جوڑنے کی سعی شروع کی۔ اس صدی کے ربع اول میں مسلمان جس عالمگیر ابتلا میں رہے، اس میں انھوں نے جامعہ ملیہ قائم کی۔ یہ قوم میں صحیح زندگی کے ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن بس رمق زندگی کا۔ یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جب صحت کا کچھ شائبہ بھی جسم جماعتی میں ہو تو وہ اپنے ہیجانات کا اظہار ہسٹریا جیسے تشنجی ہنگاموں میں نہیں کرتی بلکہ اس بحرانی قوت کو دھیمے دھیمے مگر منزل مقصود کی طرف یقینی طور پر چلنے والے ارادوں کا خزینۂ توانائی بنا دیتی ہے۔ یہ سبق ہے ہماری قوم کو کہ وہ اپنے جوش وخروش کو گھنٹوں اور دنوں کے اندر خالی نعروں اور جلسوں میں منتشر نہ کر دے بلکہ صبر طلب وصبر آزما تعمیری مساعی میں لے

برسوں، قرنوں بلکہ صدیوں پر پھیلانا سیکھے۔ میں نے کہا یہ جامعہ ثبوت ہے اور سبق۔ البتہ بہت ہی کمزور سا ثبوت اور بہت ہی روکھا پھیکا سبق۔ کیا عجب ہے کہ تائید ایزدی ہو تو کام کرنے والوں کی استقامت اور قوم کی پذیرائی اس ثبوت کو بہت قوی اور اس سبق کو بہت دل نشیں بنادے۔

ہاں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ اس جامعہ میں احیار ملی کی بہت سی تعلیمی تجویزوں کا سنگ بنیاد اسی حقیقت کا اظہار تھا ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو دیوبند کے سردار شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم مغفور کے ہاتھوں سید احمد خاں کے دارالعلوم کی مسجد جامع میں اس کام کا افتتاح۔ عجب زمانہ تھا وہ، صاحبو۔ نشہ جوانی کے سرمست نوجوانوں پر پہلی بار وہ مخلصانہ دینی کیفیت طاری تھی جس کا ایک لمحہ کبھی کبھی ساری زندگی کا رنگ بدل دیتا ہے۔ یہ جوانوں کے ڈر سے نمازیں پڑھنے والے زانوں کو روتے اور گڑگڑاتے سنائی دیتے تھے۔ خود غرضیوں کی ہر وقت جکڑے رکھنے والی زنجیریں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈھیلی ہو رہی ہیں، ٹوٹ رہی ہیں۔ ملازمتوں کے متلاشی سفارشوں کے لئے سرگرداں، اپنے پیٹ کے علاوہ اور سب حقیقتوں سے ناآشنا نوجوان بیتاب تھے کہ اپنے وجود کو وجود ملی میں گم کر دیں اور اپنی ساری قوتوں کو اس کی خدمت کے لئے وقف کر دیں لیکن عمر بھر خود غرضی کی بیگار سے بے غرض کاموں کی مشق تو نہیں ہوتی۔ اس بے غرضی کا رخ بھی جاذب توجہ ہنگاموں کی طرف، گلوں میں جھولیاں ڈال کر نکل کھڑے ہونے کی طرف، تقریروں کی طرف، نئی نئی وضع کے لباسوں کی طرف ہی جاتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ چند نوجوانوں کے اصرار پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے اس وقت اس جوش اور اس خلوص کو ایک پائدار کام میں لگانے کا فیصلہ کیا اور مجھے وہ وقت یاد ہے، اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی، جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں ایک وجود مقدس، قید، جلاوطنی، علالت اور تفکرات ملی نے جس کی ہڈیاں پگھلادی تھیں، جس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا ہے، لیکن جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی

کر رہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مدد خداوندی سے بہت کچھ بن سکتا ہے۔ یہ وجود مقدس دیوار کا سہارا لئے بیٹھا ہے، ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کرسکتا اور اس کا پیام اس کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سناتے ہیں۔ صاحبو، یاد رہے کہ وہ جس دیوار کا سہارا لئے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی، وہ ایمان محکم اور اس ایمان کے نتیجہ یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی اور وہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب نہ فرمار ہے تھے جو ان کے سامنے تھے، ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا، کسی عمارت کا افتتاح نہ ہوسکتا تھا، چندوں کا اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سروسامان چھوڑ کر بے سروسامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا، یہ وقتی فائدوں کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا، اسے عاجلہ کے مقابلہ میں آخرہ زیادہ عزیز تھی، وہ محنت اور مشقت کا عزم لے کر تعمیر نو کے لئے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا۔ یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا تھا، ۲۹ر اکتوبر، ۲۰ء کو۔

اس کام کے ساتھ مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے وابستہ رہے: حکیم اجمل خاں مرحوم اس کے پہلے امیر جامعہ مقرر ہوئے، اور مولانا محمد علی مرحوم پہلے شیخ الجامعہ۔ حکیم صاحب مرحوم نے ہم نوجوانوں کو متانت، رواداری، خاموش خدمت کا سبق دیا۔ حکیم صاحب کی ذہنی جڑیں مسلمانوں کے علمی اور فنی ماضی میں بہت گہری پیوست تھیں، اور ان کی نظر حال کی ترقیوں کے امکانات کو اس طرح صاف دیکھتی تھی جیسے شاید ہی کوئی نام نہاد جدید تعلیم یافتہ دیکھ سکتا ہو۔ ہم نے ان سے قدیم اور جدید کے ہم آہنگ بنانے اور سمونے کا سبق سیکھا۔ حکیم صاحب اپنے دلی کرب کو اپنے دلفریب تبسم کے پردے میں یوں چھپانا جانتے تھے جیسے صرف ایک ہم آہنگ شخصیت جانتی ہے تکلیف میں مسکراتے رہنے کی عادت بھی ہم نے ان سے سیکھی۔

پھر مولانا محمد علی اس عہد کی ان غیر معمولی شخصیتوں میں تھے جنھیں قدرت ذہنی قوتوں کے ساتھ قلب و روح کی بیتابی بھی ارزانی فرماتی ہے ، ان کا ذہن انھیں فرزانوں کا فرزانہ اور ان کا دل انھیں دیوانوں کا دیوانہ بنا دیتا ہے ۔ جامعہ کے ابتدائی کام کرنے والوں کو اس دیوانہ فرزانہ کی شاگردی اور ہم رکابی کا شرف بھی حاصل ہوا جس نے ہماری قومی زندگی کے بہت سے اجارے توڑے اور بہت سے شیشہ گروں کی دکانیں درہم برہم کر دیں ۔ جامعہ والوں کو ان سے وہ گرمیِ قلب ملی جو مایوسیوں میں امیدوار ، اور تہی دستی میں غنی رکھ سکتی ہے ، اور اگرچہ بےسروسامانی میں ہمارے منصوبوں کی آہٹ پاکر بسا اوقات نیک دل ہمدردوں نے ہم پر ترس کھایا اور زبان حال سے فرمایا :

به سادگی تو رحم آدم در این بازار
که تنگ دستی و امیدوار می گزری

لیکن محمد علی کی تربیت نے ہمیں دلِ شکستہ و ویران کی قدر کرنا سکھا دیا تھا ، اور ہم بھی عرفی ہی کے الفاظ میں اپنے نیک دل ہمدردوں سے کہہ دیتے تھے کہ :

عرفی دل آباد به یک جو نه خرد عشق
من هم دل ویران به دو عالم نه فروشم

لیکن مولانا محمد علی زیادہ دن جامعہ میں نہ رہ سکے تھے کہ سیاست نے انھیں پھر طلب کیا ، اور ہمارے ملک میں تو سیاست کا انعام اکثر قید و بند اور دار و رسن کی شکل میں ہی ملتا رہا ہے ۔ کراچی کے مشہور مقدمہ کے بعد مولانا قید کر لئے گئے اور ہمارے کام کی باگ عبد المجید خواجہ صاحب نے سنبھالی ۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ خواجہ صاحب امیر جامعہ کی حیثیت سے آج ہم میں موجود ہیں ، اور میں جامعہ کے تمام کارکنوں کی طرف سے ان کی خدمت میں مبارکباد کے ساتھ ساتھ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ ان کی رہنمائی نے جامعہ کو اس ڈھنگ پر چلا دیا جس پر وہ آج تک چلتی رہی ہے ۔ خواجہ صاحب نے جامعہ کے خالص تعلیمی مشن کو سب سیاسی کام کرنے والوں

سے منوایا، اور جامعہ نے تہیہ کیا کہ وہ تعلیمی کام کو تعلیمی کام کی حیثیت سے کرے گی، اور اس میں تعلیمی آزادی کو بطور اصول بنیادی کے ہمیشہ پیش نظر رکھے گی۔ اس دور کی سب سے اہم بات یہی ہے کہ جامعہ نے جو پہلے دن سے سرکاری اثر سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکی تھی یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کی تابع بھی نہیں ہے۔ ذہنی کام کی آزادی اور خود مختاری کا اصول، سیاست کی دھوپ چھاؤں سے بے تعلق، آنی اور وقتی منصوبوں اور پائدار اور دیر طلب کاموں میں موخر الذکر کی اہمیت کا اقرار، یہ ہمیشہ کے لئے جامعہ کی زندگی میں راسخ ہو گئے۔ اور اگرچہ بسا اوقات اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں لیکن یکسوئی سے اس پر قائم رہ کر ہم نے نکتہ چینوں کو بھی، ان کی نکتہ چینی کا قیمتی حق چھینے بغیر، مطمئن کر دیا کہ سیاست سے ہماری یہ دامن کشی نہ بزدلی ہے نہ بے ایمانی بلکہ ایک صبر طلب تعمیری کام کے تقریباً منطقی تقاضوں میں سے ہے۔ سیاست، خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالا ہے، آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اتر جاتا ہے، تعلیمی کام ایک دھیمے دھیمے بہنے والا میدانی دریا ہے جو برسات ہی میں نہیں بہتا، گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کرتا ہے۔ سیاست استحکام وجود قومی کی تمنا ہے، نظرتاً بیتاب؛ تعلیم اقدار مطلقہ کی عاشق ہے، لازماً صبر طلب، تعلیم ان اعلیٰ اقدار کو تازہ اور شاداب رکھتی اور پیدا کرتی ہے، سیاست ان کی تنظیم کرتی ہے اور حفاظت؛ اس لئے وہ مخدوم ہے اور یہ خادم۔ سیاست شدت چاہتی ہے، تعلیم مدت۔ سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں، تعلیم کا پہلا منصوبہ ہی اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لئے نہیں ہے راہ رو کا رخ متعین کرتی ہے؛

طلال عالیاں دم بدم دگرگوں است
منم کہ مدت عمرم بیک طلال گذشت

بہرحال جامعہ نے اب تک کی اپنی زندگی میں تعلیم کو تمام غیر تعلیمی خارجی اثرات سے جو تعلیمی آزادی

میں حائل ہوں محفوظ رکھنے کو اپنا اصول جانتا ہے اور امید ہے کہ آنے والے دور میں، کہ شاید تنگ دستی کی جگہ وسائل کی فراوانی کا دور ہو، اور رک رک کر آگے بڑھنے کی جگہ جلد جلد قدم اٹھانے کا موقع ملے، جامعہ کے کارکن اس اصول کو اپنے ہاتھ سے نہ دیں گے۔

غرض قومی زندگی میں تعلیم کی مرکزی حیثیت اور اس اہم وظیفہ کو کما حقہ ادا کرنے کے لئے آزادی کی ضرورت ہم پہ آغاز کار ہی میں روشن ہو گئی تھی۔ اس وظیفہ کو ادا کرنے اور اس آزادی کو خالی منفی آزادی نہیں بلکہ عمل کی مثبت آزادی میں منتقل کرنے کا کام بڑا دشوار تھا۔ اس دشواری میں اور بھی اضافہ ہو گیا جب بعض مجبوریوں کے باعث خواجہ صاحب شیخ الجامعہ کے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے، اور پھر کچھ عرصہ بعد حکیم اجمل خاں کا سایہ ہمارے سر سے ہٹ گیا۔ اس جگہ جامعہ کی زندگی کے ایک خاص واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا، اس سے جامعہ کے کام کی روح اور اس کے اسلوب کار پر روشنی پڑتی ہے۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری ہمارے امیر مقرر ہوئے، ان کی محبت اور شفقت، ان کی فراخ دلی اور انسانی ہمدردی، ان کی برائی سے بیزاری اور نیکی کی ہر رنگ میں اعانت کا جذبہ ہم کارکنوں کی تربیت میں اپنا اثر چھوڑ گیا ہے اور ہم شکر گزاری کے ساتھ ہمیشہ اسے یاد رکھیں گے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے امارت جامعہ کا کام جب سنبھالا تو ہماری مالی حالت بہت سقیم تھی۔ شروع شروع میں جامعہ کے تمام مصارف کا بار جمعیۃ خلافت اٹھاتی تھی لیکن سیاسی دریا کے اتار نے اس صورت کو ممکن نہ رکھا۔ حکیم صاحب تنہا اپنی ذاتی کوشش سے جامعہ کے کام کے لئے وسائل فراہم کرتے تھے۔ آخری زمانے میں مسلسل علالت اور غیر معمولی مصروفیت کے باعث ماہ بماہ فراہمی زر کے کام میں خلل پڑتا رہا، اور جب حکیم صاحب سدھارے تو جامعہ پر خاصہ قرض تھا۔ ہم کارکنوں کو، حتیٰ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم تک کو یہ علم نہ تھا کہ حکیم صاحب کہاں سے ہمارے لئے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ جب وہ رخصت ہو گئے تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے خود ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مشورے سے ان کی خدمت میں ایک مراسلہ بھیجا کہ جامعہ

لے کام کو جاری رکھنے کا قصد ہو تو فراہمی زر کی طرف امنائے جامعہ توجہ فرمائیں یا اس کے بند کرنے فیصلہ کریں تو مجھے اس فیصلہ کے اعلان سے کچھ پہلے آگاہ فرما دیں تاکہ اگر اپنے ساتھ کام کرنے الوں کی مدد سے میں اس ادارہ کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی قائم رکھ سکوں تو اس کی کوشش کروں۔

ڈاکٹر صاحب نے میرا یہ مراسلہ امنا کی خدمت میں بھیجا اور انھیں فیصلے کی فوری ضرورت کی ف توجہ فرمایا۔ زمانہ بہت برا تھا، سیاسی ردعمل نے ساری امنگیں دبا دی تھیں، ایک عام انتشاری لت تھی۔ تعلیم کے ایک ایسے کام کے لئے جسے حکومت وقت بھی تسلیم نہ کرتی ہو، جو اپنی بے سروسامانی کے باعث خود بھی ظاہر بیں نظروں کو اپنی طرف متوجہ نہ کرسکے، کون روپیہ دینے پر تیار نظر آتا، چنانچہ ہمارے امنا کی بہت بڑی اکثریت نے بلکہ پانچ چھ کو چھوڑ کر سب نے جواب دیا کہ جامعہ کو بند کر دینا چاہیے، روپیہ فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ اور بہت سوں نے کہ شخصی طور پر میرے اور میرے ساتھیوں کے ہمدرد اور بہی خواہ تھے یہ مشورہ دیا کہ اس کے کسی حصہ کو زندہ رکھنے کا خیال قابل تعریف تو ہے مگر قابل عمل نہیں، اس خیال کو چھوڑ دو، کوئی اور مفید کام کرو۔ اس فیصلہ اور اس مشورہ میں تجربہ، زمانہ شناسی، مصلحت اور احتیاط کتنی بھی ہو یقین اور جرأت کی کمی ضرور تھی۔ لیکن یہ چیزیں الحمد للہ کہ قوم کے نوجوانوں میں موجود تھیں۔ میں نے اس خط کے ساتھ جس کا ذکر کیا، ایک خط اپنے ساتھیوں کو بھی لکھا تھا جو جامعہ میں کام کیا کرتے تھے۔ انھیں بتایا تھا کہ غالباً امنا کا فیصلہ یہی ہوگا کہ جامعہ کو بند کر دو، کیا آپ ہم مل کر اس کے کسی حصے کو بچا لیں؟ روپیہ نہیں ہے، قرض ہے، جلد روپیہ ملنے کی کوئی توقع بھی بظاہر نہیں ہے، مکان کرائے کے ہیں، بچوں کو بلا کر کم سے کم سال تعلیمی کے ختم سے پہلے واپس کرنا بہت بیجا ہوگا، کہیے کیا رائے ہے؟ ان کا جواب آیا —— سب کا، بلا استثنا سب کا، کہ کام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، روپیہ نہ ہوگا، بلا معاوضہ کام کریں گے، ایک دوسرے کو سہلا دیں گے، لیکن ایک بار کوشش کر کے ضرور دیکھیں گے۔ اس باہمت جواب کے بعد بے یقینی کا جو درجہ کام کو بند کرنے کے لئے ضرور تھا وہ میں نے اپنے اندر نہیں پایا، لہٰذا کام جاری رہا۔ ان ساتھیوں کی ہمت کا امتحان

خوب خوب ہوا، مہینوں کسی کو ایک پیسہ معاوضہ کا نہ دیا جاسکا، لیکن ہم نے جامعہ کے انتظام میں ایک بنیادی تبدیلی کرلی۔ سب وہ جن کا تعلق رسمی تھا اس سے الگ ہوگئے، سب وہ جن کے دل کو لگی تھی اس کام کے ذمہ دار بن گئے۔ ایک انجمن، انجمن تعلیم ملی کے نام سے، قائم کی گئی، جس میں چند بنیادی ارکان کے علاوہ جو ہمارے شریک رہنے پر آمادہ تھے، ۱۱ ساتھیوں نے حیاتی رکن بننا قبول کیا، اس شرط پر کہ وہ بیس سال تک، یا تا حیات، اگر زندگی بیس سال سے پہلے ختم ہوجائے جامعہ کی خدمت کریں گے، اور اپنی خدمت کا صلہ کبھی ۱۵۰ روپے سے زیادہ طلب نہ کریں گے۔ حالات نے آج تک کسی حیاتی رکن کو یہ معاوضہ بھی نہیں لینے دیا ہے۔ اب اس انجمن میں ۴۴ اراکین ہیں اور ہمارے دوسرے ساتھی جو ابھی رکن نہیں ہیں وہ بھی اراکین ہی کی سی پابندیوں کے ساتھ جامعہ کے کام کو ایک اچھا عبادت کا کام سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔ بہت مشکل تھا اس انجمن کا ابتدائی زمانہ مگر ہمارے محترم مولانا ابوالکلام آزاد نے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ہمراہ مدراس کا دورہ فرمایا اور ان کے اثر اور سیٹھ جمال محمد کی فیاضی سے وہ سخت وقت بھی گذر گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس انجمن کا قیام ہماری تعلیمی تاریخ میں ایک قابل توجہ واقعہ ہے۔ اس نے اس زر پرستی کے زمانے میں تعلیمی، تہذیبی، دینی کام کو نیک کام کی حیثیت سے کرنے کی طرح ڈالی ہے اور اسے ایسا کام بنانا چاہا ہے جس کا اصل انعام خود کام میں ہوتا ہے۔ ہمارے ماضی کی ساری شاندار روایات اسی طرز عمل کی رہین منت ہیں۔ ہمارے مستقبل کے لئے اس نئے طرز خدمت کا رواج ایک فال نیک ہے۔

دوسرے اس انجمن کے قیام سے غیر سرکاری تعلیمی کام کے لئے ایک نئی راہ نکلی ہے تعلیمی آزادی کا وہ خیال، جو پہلے دن سے جامعہ کی جان ہے، اس انجمن کے قیام سے اور واضح ہوگیا ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ تعلیم حکومت کے اثر سے آزاد ہو، سیاسی جماعتوں کے اثر سے آزاد ہو، بلکہ ناواقف شخصیتوں اور غیر تعلیمی رجحانات رکھنے والی ٹولیوں کے اثر سے بھی پاک ہو غیر سرکاری

مدارس کی انتظامی جماعتوں اور اس کے ملازموں، یعنی واقعی کام کرنے والوں کی روز کی کشاکش، وکیلوں اور تاجروں اور عہدہ داروں کے انمل بے جوڑ، منصوں کو جو استادوں کو خریدتے ہیں اور زرخرید چیز کی طرح برتتے ہیں اور ان استادوں کو جو اپنے کو جنس بازار کی طرح بیچتے ہیں، تعلیم گاہوں میں یکجا کر کے ہم صحیح تہذیبی تعلیمی مرکز کیسے بن سکتے ہیں؟ تعلیم کا کام صرف انھیں کرنا چاہئے جو اسے اپنا حقیقی کام سمجھتے ہوں، جو اس کے بغیر بے چین رہیں، جو اس کی انجام دہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھیں اور جو اس کام کی اہمیت اور اپنی اس کے ساتھ وابستگی کے باعث خود اپنا احترام کرتے ہوں اور آزاد ہوں کہ اپنے کام کو اپنی بصیرت کے مطابق بہترین طریق پر انجام دیں۔ میرا خیال ہے کہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں میں اس قسم کی پہلی انجمن ہے، اور میری دعا ہے کہ ایسی متعدد انجمنیں جلد وجود میں آئیں اور ہمارا تعلیم کا کام کرانے کے کام کی بجائے عبادت کی ایک شکل بن جائے۔

آزادی اور خود مختاری کی یہ تدریجی نشوونما بے حقیقت ہوتی اگر اپنے مالی وسائل کی فراہمی میں جامعہ اس کے مناسب حال طریقہ اختیار نہ کرتی۔ چنانچہ جامعہ نے یہ کیا۔ ہماری جدید تعلیم گاہیں معمولاً سرکاری گرانٹ اور امرا کی امداد سے چلتی ہیں، اور اس طرح کہ ان کا وجود انہی پر منحصر ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر کوئی تعلیمی جماعت اپنے کام کے شرف کا احساس رکھ کر آزادی کی خواہش بھی رکھتی ہو تو وہ آزادی خالی دکھاوے کی آزادی ہو سکتی ہے۔ جامعہ کا کام جب سے اس کے واقعی کام کرنے والوں نے انجمن جامعہ ملیہ کی شکل میں اپنے ہاتھ میں لیا تو انھوں نے مالی وسائل کی فراہمی کا بھی ایک نیا ڈھنگ ڈالا۔ سرکاری امداد کا تو سوال ہی نہ تھا، متمول طبقہ کی مدد کمیاب تھی، اہل ثروت سرکاری بے اعتنائی بلکہ مخالفت کی صورت میں ایک تعلیم گاہ کو جس کے کام نے ابھی ابھی اپنی ساکھ پیدا نہ کی تھی کیسے اپناتے؟ اور ہم کہ اپنی آزادی کی قدر شروع سے کرنا چاہ رہے تھے اپنے وجود اور اپنے طرز کار کو کیسے اس قسم کی مدد پر منحصر کرنے پر راضی ہو جاتے؟ ہم نے چند خواص کی بجائے جمہور ملت کو اپنا مددگار بنانا چاہا اور ۳۲ء میں ہمدردانِ

جامعہ کے نام سے ایک حلقے کی تنظیم شروع کی جس میں ہوتے ہوتے دس ہزار ہمدرد ہو گئے ہیں جو ہمیں ماہانہ یا سالانہ چھوٹی چھوٹی رقمیں مرحمت فرماتے ہیں، لیکن ایک بار نہیں بلکہ برابر مرحمت فرماتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے کام سے ناخوش ہوتے ہیں تو اپنی مدد بند کر دیتے ہیں، خوش ہوتے ہیں تو اور دوسرے دوستوں کو بھی اس حلقے میں شامل کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق دو چار صاحبان ثروت سے نہیں بلکہ ہزاروں ہمدردوں سے بندھا رہتا ہے اور ہمیں یہ ڈر نہیں ہوتا کہ کسی ایک آدمی کے ناخوش ہونے سے ہمارا کام رک جائے گا، بلکہ ہماری مدد صرف اس وقت بند ہوگی جب ہم اتنے برے ہوں کہ جمہور امت ہم سے متفقہ طور پر ناخوش ہو جائے اس وقت بیشک یہ مدد بند ہو بھی جانی چاہیے اور ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم کیوں اپنے ہمدردوں کی ہمدردی قائم نہ رکھ سکے۔

۳۲ء میں اس حلقے سے ۵ ہزار روپے جمع ہوئے تھے، ۳۷ء میں اس نے ۲۲ ہزار فراہم کیے، ۴۲ء میں ۳۴ ہزار، ۴۴ء۔۴۵ء میں ۴۱ ہزار اور ۴۵ء۔۴۶ء میں جوبلی کے خاص چندے کے علاوہ جو اسی حلقے کی معرفت جمع کیا گیا ہے، اور جس میں اس نے اب تک دو لاکھ اڑتیس ہزار روپیہ فراہم کیا ہے، اپنے معمول کے طور پر اڑتالیس ہزار روپے جمع کیے۔ اس عمومی امداد سے ہمیں پتہ چلتا رہتا ہے کہ ہماری قوم ہمارے کام کے متعلق کیا سمجھتی ہے؟ پچھلے تیرہ سال کا اندازہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس حلقے نے ۵ ہزار سے بڑھا کر ہماری گرانٹ ۴۸ ہزار روپے کر دی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ زمانہ کیسے ہیجان کا زمانہ رہا ہے؟ اس میں لوگ ہم سے ناخوش بھی ہوئے ہیں، ہم پر نکتہ چینی بھی ہوئی ہے، ہم نے صحیح تنقید سے سبق لیا ہے، غلط کو صبر سے سنا اور سہا ہے اور قوم نے ہمیں اس سال میں اڑتالیس ہزار چھوٹے چھوٹے چندوں کی شکل میں عطا فرمائے ہیں۔

پھر قوم کے عوام کے ساتھ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں اہل ثروت کا اعتماد حاصل ہوا، اعلیٰ حضرت حضور نظام نے، اعلیٰ حضرت فرماں روائے بھوپال نے، اعلیٰ حضرت نواب

صاحب رامپور نے، ریاست کشمیر نے، پھر دہلی میونسپلٹی نے ہمارے کام کے لئے مستقل امدادیں عطا فرمائیں اور وہ کام جو رک رک کر ہوتا، مگر ہوتا، ذرا آسانی سے انجام پا سکا۔

قوم کی مدد سے، اس کے متوسلین اور امرا دونوں کی مدد سے، یہ کام رفتہ رفتہ بڑھا، جامعہ کے پاس جس نے پچیس سال پہلے بغیر ایک چپہ زمین کے، اور بغیر عمارت کی ایک اینٹ کے، اور بغیر سرمایہ کے ایک پیسہ کے، کام شروع کیا تھا، آج اوسط قیمتوں کے لحاظ سے ۱۵ لاکھ سے اوپر کا اثاثہ ہے، موجودہ قیمتوں میں تقریباً ۲۰۔۲۵ لاکھ کا، اس کے کام کو تعلیمی حلقوں میں، اس ملک میں، اور اس ملک کے باہر بھی کچھ نہ کچھ پسند کیا گیا۔ اس کی مثال نے اور اس کے کام کرنے والوں کے اثر نے قوم میں تعلیمی کام کے اصولوں کو کم سے کم فکری طور پر ضرور متاثر کیا ہے۔ اس کی مقبولیت بڑھی ہے، اس سال اس کے مدرسہ ابتدائی میں ایک ہزار سے اوپر داخلے کی درخواستوں میں سے صرف چالیس بچوں کی درخواستیں منظور کی جا سکی ہیں۔ جو ہم پر شبہ کرتے تھے، اور ہمارے تعلیمی کام کو اور کاموں کے لئے بس ایک آڑ سمجھتے تھے وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ حکومت ہند نے دو سال ہوئے ایک بڑی مستند کمیٹی سے ہمارا کام دکھوایا اور اس کمیٹی نے ہمارے تمام امتحانوں کے سرکاری طور پر تسلیم کئے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ ہمارا جامعہ جونیر کا امتحان سرکاری طور پر مسلمہ میٹرک یا اسکول فائنل کے مساوی تسلیم کر لیا گیا اور ہمارے استادوں کے صداقت نامے کو بنیادی مدرسوں کی معلمی کے لئے مستند مانا گیا۔ حکومت ہند نے اپنے ساٹھ منتخب اساتذہ کو ہمارے استادوں کے مدرسہ میں تربیت کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

آج جامعہ ایک چھوٹا سا اقامتی کالج چلا رہی ہے، جس کے متعدد فارغ جامعہ کے کام میں اپنی ساری قوتیں وقف کر رہے ہیں اور ملک کے مختلف گوشوں میں علمی، تعلیمی، صحافتی، تجارتی، سیاسی کاموں میں نیک نامی کے ساتھ مصروف ہیں۔ اس نے ایک چھوٹا سا، کوئی پچیس ہزار مجلدات پر مشتمل کتب خانہ جمع کر لیا ہے، ایک اقامتی مدرسہ ثانوی، ایک اقامتی مدرسہ ابتدائی چلا رہی ہے، جن میں جدید طریقہ ہائے تعلیم پر تجربے کئے جا رہے ہیں، اور انھیں اپنی قومی ضرورتوں کے لئے

مفید بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایک ادارہ تعلیمی مرکز کے نام سے شہر دہلی میں چل رہا ہے، جو ایک ماڈل اسکول، ایک عمومی دارالمطالعہ، عام اجتماعات کے لئے ایک ہال، پڑوس کے شہریوں کے لئے ایک کلب پر مشتمل ہے، اور اپنا کام بڑی خوبی سے انجام دے رہا ہے۔ تعلیم بالغاں کے طریقوں پر تجربہ حاصل کرنے کے لئے ادارہ تعلیم وترقی کے زیر اہتمام ایک تجربی مرکز قائم ہے، اور دوسرے کام کرنے والوں کے لئے طریق کار سے متعلق لٹریچر شائع کرنے کے علاوہ اس نے بالغ مبتدیوں کے لئے ڈیڑھ سو سے اوپر رسالے شائع کئے ہیں۔ ایک استادوں کا مدرسہ ہے جس میں بنیادی مدرسوں کے استادوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہے۔ اردو میں اشاعت کا کام وسیع پیمانے پر مکتبہ جامعہ انجام دے رہا ہے، اور آج اردو کے خادموں کی صف اول میں اپنے لئے ایک اچھی جگہ پیدا کرچکا ہے۔ ایک چھوٹا سا شعبہ مصنوعات جامعہ کے مدرسہ ثانوی کے معمل سائنس سے متعلق ہے، اور روزمرہ کے استعمال کی بہت سی چیزیں تیار کرتا ہے۔ ان مختلف اداروں کے کچھ کام کا اندازہ آپ کو جوبلی کی نمائش کے ملاحظہ سے ہوسکے گا۔

غرض خاصا پھیلا ہوا کام ہے اور اس پر ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں۔ لیکن سب چھوٹا چھوٹا کام ہے، ابتدائی حالت میں ہے، ہر پہلو سے اصلاح وترقی کا پیاسا ہے، اور بلا کسی بیجا انکسار کے نہایت خلوص کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ان کاموں کی تفصیل بیان کرنے میں فخر کا شائبہ بھی نہیں کہ شرم سے آنکھیں اٹھانے کا بھی یارا نہیں۔ پچیس سال کی قومی سعی اور اتنا حقیر سا نتیجہ! پچیس سال کی کوہ کنی اور یہ جوئے کم آب!! جانتا ہوں کہ بے صبری کا حق نہیں، جانتا ہوں کہ کام کی ماہیت میں سوختہ کام کی طرح سست رفتاری ہے، جانتا ہوں کہ تعلیمی، تربیتی کام میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی، جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پل مارنے میں پھیل جائے، اور سارے ماحول کو خاکستر بنا دے، چمن بندی ہے، مادی وسائل کی نہروں سے مدت تک اسے سینچنا ہوتا ہے، دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک بار نہیں روز اس میں ملانا ہوتا ہے، اور یہاں خون جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر یہ آرزو بے چین کرے کہ وسائل کی نہر کچھ کشادہ ہوتی،

پسینہ بہانے کی آمادگی بھی فدا زیادہ لوگوں میں پائی جاتی اور خون جگر کا بھی عمل نہ ہوتا تو کیا یہ بے صبری اور ناشکری ہے ؟ اگر یہ تمنا ستاتی ہے کہ قومی سعی کے تعمیری نتائج قومی شان کے شایان ہوتے تو کیا یہ جلدبازی ہے ؟ اگر عمر کے ان تھوڑے سے دنوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں اٹھے جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں، دیکھ کر سیکھ سکیں، برت کر اپنا سکیں اور سنوار سکیں، جہاں ان کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے، جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا جواب دے سکیں، جہاں شخصیت کی نشوونما کا سامان ہو، جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل درس اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پرورش پائے اور رحمۃ للعالمین کے چمن کے نونہال بارآور اور سایہ دار درخت بنیں، یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا ماحول مستفیض ہو، وہ ہر جگہ سے حکمت کو لیں کہ ان کا کھویا ہوا مال ہے۔ ور ہر طرف اپنی تحقیق اور اپنی اچھی زندگی کے موتی بکھیریں کہ یہ دولت لٹانے ہی سے بڑھتی ہے۔ اعلیٰ حضرت، اکابر قوم، اور بلند ہمت دوستو اور عزیزو، اگر یہ ارادہ ہم ناچیز کارکنان جامعہ کے دل میں پیدا ہو تو کیا وہ ایک خواب ہوگا جس کی تعبیر نہ ہو سکے گی ؟ اس سوال کا ایک جواب ہم کارکن دیں گے اور وہ یہ ہے کہ اللہ چاہے گا تو یہ ارادہ پورا ہو کر رہے گا، لیکن اس کا ایک جواب آپ سب کے ذمے بھی ہے۔

جیسا کہ آپ صاحبان اعلیٰ حضرت کی زبان مبارک سے ابھی سن چکے ہیں، اس منصوبے کو ایک قدم اور آگے بڑھانے کے لئے ہم نے اگلے چند سال میں بعض کام شروع کرنے کا قصد کر ہی لیا ہے۔ طالب علموں اور استادوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ہوسٹل اور مکان فوراً بنوانے ہیں، چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک اچھا کنڈرگارٹن بنانا ہے، ثانوی تعلیم میں ضروری تنوع پیدا کرنے کے لئے صنعتی اور تجارتی مدرسہ قائم کرنا ہے، لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک اقامتی درس گاہ قائم کرنی ہے، علمی تحقیق کے ادارے قائم کرنے ہیں جن میں

سب سے پہلے اسلامی علوم کے تحقیقاتی ادارہ بیت الحکمۃ کو صحیح اور مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا ہے، اپنے مرحوم امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی یادگار کے طور پر ایک شفاخانہ بنانا ہے، کتب خانہ کے لئے عمارت بنانی ہے اور اس میں خصوصاً اسلام اور ہندوستان سے متعلق کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ فراہم کرنا ہے اور اس نوآبادی کے مرکز میں اس کے قلب کی حیثیت سے ایک مسجد تعمیر کرانی ہے۔ ان کاموں کے لئے میں نے اپنی ناتجربہ کاری میں دس لاکھ کا اندازہ کیا تھا، اس امید پر کہ جنگ کے بعد قیمتیں کچھ تو اپنی سابقہ حالت کے قریب آئیں گی، لیکن یہ خیال غلط نکلا، اور اب اس کام کے لئے تقریباً تیس لاکھ کا اندازہ کیا جارہا ہے۔ ہم نے جوبلی کے موقعہ پر قوم سے دس لاکھ روپیہ مانگا، دس لاکھ سے زیادہ تقریباً بارہ لاکھ روپیہ فراہم کرنے کا انتظام قوم نے کر دیا ہے، لیکن اب ان اٹھارہ لاکھ کا انتظام بھی تو اسی کو کرنا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ انتظام بھی ہو ہی جائے گا، لیکن جلد ہو یا دیر میں، ہم نے کام شروع کرتے وقت کب پہلے روپیہ جمع ہو جانے کا انتظار کیا تھا کہ اب اس کے منتظر رہیں گے۔ یہ کام تو خدا نے چاہا تو ہو گا ہی، اگر یہ اچھا کام ہے تو خدا آپ سب کو اس کی تکمیل کی سعادت میں شرکت کی توفیق عطا فرمائے۔

میں نے جامعہ کی پچھلی روداد اور اس کے اگلے منصوبوں کا ایک مختصر سا، ذرا منتشر سا، خاکہ پیش کر دیا ہے، اب اپنے سچے جذبات تشکر کا اظہار باقی ہے۔ سب سے پہلے اعلیٰ حضرت کا، اس عزت افزائی اور ہمت افزائی پر شکریہ، جو حضور نے یہاں تشریف فرما ہو کر، اور اس جلسہ کی صدارت فرما کر ہم کارکنان جامعہ کی کی ہے۔ حضور، یہ عزت افزائی اس لئے بھی ہے کہ خدا نے آپ کو اپنی زمین کے ایک حصے اور اپنی مخلوق کی ایک معتدبہ آبادی کی پاسبانی سپرد فرمائی ہے، آپ کو دولت و اقتدار عطا فرمایا ہے۔ آپ نے، کہ بادشاہوں کی محفل کے لئے زینت ہیں، ہم فقیروں کی مجلس میں تشریف لانا قبول فرمایا۔ لیکن اعلیٰ حضرت سے زیادہ کس پر روشن ہوگا، اس لئے کہ آپ دونوں کے محرم ہیں کہ اچھی دنیا میں مادی اقتدار کو ذہنی اقتدار کے سامنے، اور دولت کو فقر کے سامنے جھکنا چاہیئے۔ مادی اقتدار اور دولت کے لئے یہ بڑی

٠٠

ٔادت ہے کہ ذہنی اقدار اور فقر اسے اپنی خدمت میں قبول فرمالیں ۔ حضور کی تشریف آوری ہے ہماری حقیقی عزت افزائی اور بہت افزائی ، آپ کے دولت و اقتدار ہی کے باعث نہیں ہے بلکہ اس فقر کی وجہ سے ہے جس کا اس لباس خسروی میں نباہ لے جانا ظاہری فقیروں کے فقر سے کہیں مشکل تر اور اس لئے بہت زیادہ واجب الاحترام ہے ۔ ہم فقیروں کی عزت افزائی ، اس درویش خسروی ، اس شاہ فقر شعار ، اس امانت دار دولت و اقتدار کی تشریف آوری سے ہے جس کی سروری خدمت گری ہے ، اور بادشاہت عبدیت کی ذمہ داریوں کو کماحقہ انجام دینے کا موقع ۔ اعلیٰ حضرت ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں ۔

پھر قائد اعظم محمد علی جناح اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا تہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اس جشن میں شرکت فرماکر ہمیں مفتخر فرمایا ۔ آپ کی قوم کے چند بوڑھوں اور نوجوانوں نے خاموش تعلیمی کام کا ایک نمونہ اس جامعہ میں پیش کرنا چاہا ہے ۔ آپ سے بہتر کون جا سکتا ہے کہ قومی وجود اور قومی تہذیب کا تحفظ صرف اسے بگڑنے سے بچاکر نہیں ہو سکتا ، بلکہ اسے بنانے رہنے کا طالب ہوتا ہے ، آزادی ہو یا نمو پذیر حیات تمدنی ، یا اقدار عالیہ مطلقہ ، ۔ ایک بار حاصل کرنے اور سونپ کر رکھ دینے کی چیزیں نہیں ہیں ۔ یہ انھیں کو ملتی ہیں اور انھیں کے پاس رہ سکتی ہیں جو ہر دم ان کے از سر نو حصول اور ہر دم از سر نو تخلیق کی دشواریاں انگیز کرنے پر تیار ہوں ۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے ، لیکن ہم ہندوستانی مسلمانوں میں اسی تخلیقی عمل کے نمائندے بننا چاہتے ہیں ، ہمیں امید ہے کہ آپ ہمارے کام کو پسند فرمائیں گے ، آپ کی پسند ہماری محنتوں کا بڑا انعام ہوگی ۔

پھر پنڈت جواہر لال نہرو ، اور دیگر وزرائے حکومت ہند کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اپنی گوناگوں معروفیتوں کے باوجود انھوں نے ہماری اس تقریب میں شرکت کے لئے وقت نکالا ۔ آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں ، لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے ، آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھاکر میں تعلیمی کام کرنے والوں

کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج تک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے دور دورہ میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس نئے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لئے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے۔ ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھئے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے، اسے بجھائیے۔ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لئے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجئے۔

پھر ان سب بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ہمارے جشن میں شرکت فرما کر اس کو رونق بخشی اور ہماری خوشی میں شریک ہو کر ہمارا دل بڑھایا، اس بدامنی کے زمانے میں سفر کی صعوبتیں برداشت فرمائیں۔ ہم شرمندہ ہیں کہ ان کے آرام و آسائش کا پورا انتظام نہ کر سکے، لیکن ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری ان فروگذاشتوں کو معاف فرمادیں گے۔

ان کارکنوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، خصوصاً عہدہ داران ریاست رامپور کا جن کی مدد کے بغیر ہم اپنے مہمانوں کو اتنا آرام بھی نہ پہنچا سکتے، ان دوستوں نے ہمارے ساتھ اس طرح کام کیا کہ گویا یہ ان ہی کا کام تھا، اور سچ یہ ہے کہ ان کا کام اسی قدر تھا جتنا کہ ہمارا، ہم ان کی اس عنایت کو کبھی نہ بھولیں گے

آخر میں اعلیٰ حضرت، میں چند لمحوں کے لئے اپنے کو جامعہ کے کارکنوں کی صف سے الگ کے اپنی قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کا۔ حضور والا اپنے ارشادات صدارت میں مجھ ناچیز کے متعلق جو فرمایا ہے اس کا شکریہ کیسے ادا کروں، کاش اس کا مستحق ہوتا۔ حضور، جامعہ میں اگر کوئی تعریف کا مستحق ہے تو وہ میں بالکل نہیں ہوں، رے وہ ساتھی ہیں جو اپنا نام کسی کو نہیں بتاتے اور دن رات اس ادارے کی خدمت میں ی جان کھپاتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے کسی ادارے کو نصیب وں گے۔ انھوں نے اس پچیس سال میں بہت کچھ سختیاں اٹھائی ہیں اور کبھی حرف شکایت بان پر نہیں لائے، یہ قوم کے بچوں کے لئے اپنی جانیں کھپاتے رہے ہیں اور خود ان کے بچے ھی غذا اور اچھے لباس کے لئے ترسے ہیں، یہ قوم کی ذہنی زندگی کے لئے اپنا سب کچھ تج چکے یں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا ٹھیک انتظام نہیں ہو سکتا، یہ کتابوں کو ترستے ہیں، تحقیق سائل کو ترستے ہیں، انھیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے اور پھر کہیں سے روپیہ آجاتا ہے تو یہ پہلے جامعہ کے لئے زمین خرید وا دیتے ہیں، اور اپنے مطالبات کو موخر کر دیتے ہیں، یہ ہماری قوم کے مستقبل کے لئے ایک فال نیک ہیں، انھوں نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں لیکن تکلیفیں اٹھا کر قومی ترقی کے راستے کو صاف کر دیا ہے۔

آغشتہ اند ہر سر خارے بخون دل
قانون باغبانی صحرا نوشتہ اند

میں قوم کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پروفیسر محمد مجیب

تقریر شیخ الجامعہ

(بہ تقریب جشن زریں منعقدہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۰ء)

ذیل کی تقریر جامعہ کے جشن زریں کے موقع پر، ۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۰ء کو جلسۂ یوم تاسیس میں پڑھی گئی، جشن میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت کی۔

محترمہ مسز اندرا گاندھی!

میں بہت شکر گذار ہوں کہ آج آپ نے یہاں تشریف لاکر جامعہ کی برادری اور اس کے ہمدردوں کو مخاطب کرنا منظور فرمایا۔ شاید ہماری طرح آپ خود بھی محسوس کر رہی ہوں گی کہ اس وقت، جامعہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر، آپ گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور ان تمام رہنماؤں کی نمائندگی کر رہی ہیں جنھوں نے ملک کو آزاد کیا اور ہم تعلیم کا کام کرنے والوں کو ہمت دلائی کہ کچھ بھی ہو، اپنا فرض ادا کرتے رہیں۔ آپ کی تشریف آوری نے بہت سی یادوں کو تازہ کر دیا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں اسی جگہ جہاں یہ شامیانے لگے ہیں، جامعہ کی سلور جوبلی کا جلسہ ہوا تھا، تب شامیانے نہیں تھے، رام پور سے مانگ کر ایک بڑا خیمہ آیا تھا اور اس کے بیٹھنے والوں میں کانگریس اور مسلم لیگ کے تمام چوٹی کے لوگ تھے جنھیں ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کی کشش نے ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ سب نے اس کا اعتراف کیا کہ

جامعہ صحیح معنوں میں ایک قومی تعلیم گاہ ہے۔ اب چالیس برس بعد ہم کہتے ہیں اور لوگ اسے مانتے ہیں کہ جامعہ ایک قومی تعلیم گاہ ہے، لیکن پہلے اس کا مطلب کچھ اور تھا، اب کچھ اور ہے اور یہ ایک بڑی دلچسپ اور سبق آموز داستان ہے کہ مطلب کا یہ فرق کیسے پیدا ہوا۔ میں اسے اس لیے بھی سنانا چاہتا ہوں کہ یہ صرف جامعہ کی داستان نہیں ہے، ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک عکس بھی ہے۔

آزادی کے بعد جامعہ کی عزت اور حیثیت بہت بڑھ گئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ تھے اور گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا آزاد کے بہت قریب تھے، خود مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت ہند کے سارے انتظامی کام میرے دوستوں اور ساتھیوں کے ہاتھ میں ہیں اس لیے کہ ہر منسٹری میں ایسے لوگ اونچے عہدوں پر تھے جو میرے زمانے میں اوکسفرڈ یا کیمبرج میں پڑھتے تھے، تعلیم کے کئی میدانوں میں جامعہ کا بہت دخل تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہندستانی تعلیمی سنگھ کے قریب دس سال سے صدر تھے اور بنیادی تعلیم کے پرچار میں گاندھی جی کے ساتھ انھیں کا نام آتا تھا۔ ہمارا استادوں کا مدرسہ ۱۹۳۸ء میں قائم ہوا تھا اور اس کے ذریعے ہندستان کے کئی صوبوں میں بنیادی تعلیم کی طرح ڈالی گئی تھی۔ شفیق الرحمان قدوائی صاحب نے نمونے کے سوشل اور کمیونٹی اور یوتھ ایجوکیشن سنٹر قائم کیے تھے اور نو آموز بالغوں کے لیے پوسٹر اور چھوٹی چھوٹی کتابوں کا قریب ڈیڑھ سو کا سٹ تیار کیا تھا۔ ایڈلٹ اور سوشل ایجوکیشن کے رہنما اور روح رواں وہی مانے جاتے تھے۔

جامعہ کا ایک نمونے کا پرائمری اسکول تھا جس میں بینک اور دکان، کھیتی اور پولٹری فارم جیسے پروجکٹس کے ذریعے تعلیم دینے کے بہت مفید تجربے کیے گئے۔ آزادی ملنے پر ان کاموں کو فروغ دینے اور جامعہ کو ایک تعلیمی تحریک کا مرکز بنانے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا گیا اور شفیق الرحمان قدوائی صاحب کو پہلے یونسکو اور پھر دہلی کی حکومت نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ جامعہ مجبور ہوگئی کہ ان کے بغیر اپنی گاڑی

چلائے۔ اس کی گاڑی رکی نہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس طرح چلی اور کس رستے چلائی۔

جامعہ کو اپنا خرچ پورا کرنے اور اپنے کاموں کو ترقی دینے کے لیے سالانہ امداد کی ضرورت تھی۔ وزارت تعلیم میں اس کے جو ہمدرد تھے اور اس میں شک نہیں کہ وہ واقعی ہمدرد تھے، انھیں کوئی ایسا بنا بنایا، یعنی انگریزی حکومت کا بنایا ہوا قاعدہ قانون نہیں ملا جس کے مطابق جامعہ کو گرانٹ دی جا سکے۔ مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ان سرکاری ہمدردوں کی پست ہمتی پر ایسے خفا اور مایوس تھے کہ ایک مرتبہ جب انھیں ایجوکیشن سکریٹری نے کسی سلسلے میں فون کیا تو انھوں نے فون اٹھا کر مجھے دیدیا اور کہا کہ آپ ہی ان سے بات کیجئے، میں نہیں کروں گا، اسی زمانے میں انھوں نے کہا کہ میں گرانٹ کی کسی درخواست پر دستخط نہیں کروں گا، آپ کو جو کچھ کرنا ہو خود کیجئے۔ میں نے ایک درخواست تیار کی تھی، وہ میں نے وزیر تعلیم کو بھیجدی، ان کے دفتر سے یہ نیچے اترتے اترتے سکشن آفیسر کے پاس پہنچی، سکشن آفیسر ایک سندی شرنارتھی تھے، انھوں نے اس پر ایک نوٹ لکھا جو میری درخواست سے کہیں بہتر تھا اور پھر یہ فائل اوپر چڑھتے چڑھتے وزیر تعلیم کے پاس پہنچی ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں تو انھوں نے اسے سکریٹری کے پاس بھیجدیا، سکریٹری نے مجھے بلایا اور ایسے سوال کئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے درخواست کو پڑھا نہیں ہے، پھر ڈپٹی سکریٹری ایل آر سیلٹی کو بلایا، انھوں نے سمجھانا چاہا کہ جامعہ کو قاعدے کے اندر گرانٹ دی جا سکتی ہے تو فائل انھیں کے سپرد کر دیا اس انداز سے کہ اگر وہ سکریٹری کے پاس دوبارہ نہ آئے تو بہتر ہے۔ مجھے درخواست کا کوئی جواب نہ ملا، پھر ہمارے مالاباری استاد ای بے کیلاٹ، بغیر کسی سے مشورہ کئے ڈپٹی فنانشل ایڈوائزر کے پاس پہنچے، جن سے ان کی اچھی ملاقات تھی، اپنا پھٹا کوٹ اور اپنی پھٹی قمیص دکھائی اور کہا کہ لعنت ہو تمھارے اوپر جو یہاں اس عہدے پر بیٹھے ہو اور میرا یہ حال ہو گیا ہے۔ ڈپٹی فنانشل ایڈوائزر بھلے آدمی تھے، انھوں نے جامعہ کا فائل، جس نے سفر کرتے کرتے ان کے یہاں دم لیا تھا، منگوایا اور سفارش کر دی کہ جامعہ کو تنخواہیں بڑھانے کے لئے ہر سال ۳۸ ہزار روپے دیدئے جایا کریں۔ اس کے

بعد ہم نے وہی کیا جواب تک ضد میں نہیں کیا تھا، پرائم منسٹر کے پاس گئے اور مدد کا مطالبہ کیا اس پر ایک لاکھ سالانہ کی منظوری ملی، یہ رقم کافی نہ تھی، دو سال بعد پھر مطالبہ کیا، اس پر طے ہوا کہ جامعہ کی آمدنی وضع کرنے کے بعد جو خرچ نکلتا ہو وہ گرانٹ کے طور پر دیا جائے۔ مجھے یاد ہے اسی زمانے میں اسکول کے بچوں نے اصرار کیا کہ ہم پنڈت جی کو جامعہ بلائیں گے، ان سے ملاقات کا وقت مقرر کیا گیا اور میں بچوں کو لیکر پارلیمنٹ ہاؤس میں پرائم منسٹر کے دفتر میں پہنچا۔ جب بچے ملنے کے لیے بلائے گئے تو میں نے ان کو اندر بھیجدیا، خود سکریٹری کے کمرے میں بیٹھا رہا، اس خیال سے کہ کہیں پنڈت جی یہ نہ سمجھیں کہ میں بچوں کی ملاقات کو بہانہ بنا کر خود ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اتفاق سے جب وہ بچوں کو رخصت کرنے لگے تو ان کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئے اور مجھے دیکھ لیا۔ مسکرائے اور کہا کہ "اچھا یہاں چھپ کر بیٹھے ہو"۔ آپ سمجھئے کہ یہی قریب ہوتے ہوئے چھپے رہنا ہمارا طریقہ تھا، ٹھیک ہو یا غلط۔

ہمارے تعلیمی کاموں میں مدد ملنے کی صورت بھی عجیب تھی۔ میں شفیق الرحمان قدوائی صاحب کے ساتھ تھا جب ہم مولانا آزاد سے ملنے گئے اور انھیں اپنی کتابوں کا سٹ، جس کے لیے ایک خوبصورت اور سستا لکڑی کا کیس بھی بنایا گیا تھا، دکھایا۔ مولانا نے اسے پسند کیا، مگر پسند کر کے رہ گئے۔ کئی مہینے بعد منسٹری کے ایک انڈر سکریٹری سردار سوہن سنگھ نے شفیق صاحب سے مشورہ کر کے ایسی ہی کتابوں کو تیار کر کے ملک میں تقسیم کرنے کی اسکیم بنائی، اسے ڈپٹی سکریٹری اور سکریٹری سے منظور کرایا اور پھر اسے مولانا آزاد کے سامنے پیش کیا۔ معلوم نہیں دفتر کے قاعدے اس کی اجازت دیتے ہیں کہ نہیں لیکن میں نے سنا ہے کہ وہ مولانا کے پاس سے نہیں ہٹے جب تک کہ انھیں اسکیم پر عمل کرنے کا حکم نہیں مل گیا۔ جامعہ کو یہ کتابیں لکھنے اور چھپوانے کے لئے گرانٹ ملی اور ہم نے قریب تین سو کتابیں چھاپیں، مگر یہ صرف ٹھیکے کا کام تھا، اس کا نہ ماضی سے تعلق تھا نہ مستقبل سے، جب یہ ختم ہو گیا تو حکومت سے ہمارا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ اسی طرح کا کام گیان سرور کی تیاری تھی، جو بہت مقبول ہوئی۔

[illegible]ء، [illegible]ء میں ہم نے شمالی ہندوستان کی ریاستوں کا جائزہ لیا، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کرڈ لیس کے پروگراموں کا کیا اثر ہوا ہے، جب جائزے سے ثابت ہوا کہ اثر بہت کم ہوا ہے تو ہم نے ایڈلٹ اسکولز کی اسکیم تیار کی، جو بڑی مشکل سے دو سال کے لیے منظور ہوئی۔ ہمیں تھوڑے ہی دنوں میں اندازہ ہوگیا کہ یہ اسکیم بہت مفید ثابت ہوگی، مگر اسی دوران میں منسٹری نے اپنی رائے بدل دی، گرانٹ کی قسطیں آنا بند ہوگئیں اور ہم ایسی مصیبت میں پڑ گئے کہ اس کے بعد والنٹری ایجنسی کے طور پر کام کرنے سے توبہ کرلی۔

شاید سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ کہانی ہے کہ ہمیں یونیورسٹیوں کی برادری میں کیسے شامل کیا گیا۔ ۴۳ء میں علی گڑھ میں ڈاکٹر ضیاء الدین کے مخالفوں نے یہ سوال اٹھایا کہ جامعہ ملیہ کی ڈگریوں کو کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے اس وقت کی حکومت ہند سے پوچھا کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔ اس بنا پر سرجون سارجنٹ نے، جو اس زمانے میں ایجوکیشن کمشنر تھے، ہم سے پوچھا کہ ہم کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا اگر اس مسئلے میں مناسب سفارش کرنے کے لئے ایک سرکاری کمیٹی ہمارے سلیبس اور نظام تعلیم کا معائنہ کرے۔ ہم نے کہا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا تو ایک سرکاری کمیٹی معائنے کے لیے آئی اور اس نے سفارش کی کہ ہماری تمام ڈگریاں کو تسلیم کرلیا جائے۔ کچھ کانا پھوسی کے بعد حکومت ہند نے طے کیا کہ ہمارے میٹریکولیشن سرٹیفکیٹ کو یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے کافی سمجھا جائے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اسکول کے اچھے طالب علم سب مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لینے لگے اور ہمارا اپنا کالج خالی ہوگیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے علی گڑھ چلے جانے کے بعد ایجوکیشن منسٹری میں جو ہمارے ہمدرد تھے ان میں سے بعض مشورہ دینے لگے کہ جامعہ کو کسی طریقے سے مسلم یونیورسٹی سے ملا دیا جائے۔ ہم نے ان کی رائے نہیں مانی۔ ۵۶ء میں جب یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم ہوا تو ہم نے رکگنیشن کے لیے درخواست دی، جس کے دو برس کے بعد دو سطروں کا جواب آیا کہ ہماری درخواست منظور نہیں کی جاسکتی۔ جب ڈاکٹر کوٹھاری صاحب یو جی سی کے چیرمین مقرر ہوئے تو ان کی تدبیر نے ہماری تقدیر

کو بدل دیا۔ جون ۱۹۶۲ء سے جامعہ ملیہ یونیورسٹی نہیں مگر یونیورسٹی جیسی اعلیٰ تعلیم کی سنستھا مان لی گئی ہے اور اب ہمارے لئے ترقی کے وہ راستے کھل گئے ہیں جو سرکاری امداد کی بدولت کھل سکتے ہیں۔

اب جامعہ آباد ہے، طالب علم ہیں، استاذ ہیں، عمارتیں ہیں، لیکن کیا ہمارا اصل مقصد یونیورسٹیوں جیسی ایک اور یونیورسٹی بننا تھا؟ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں جامعہ کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ مذہب، تہذیب، اخلاق، سیاست کو تعلیم کے ذریعے ایک جسم، ایک جان بنایا جاسکتا ہے اور خود ایک نمونہ بن کر ملک میں اس کا چرچا کرنا تھا۔ خود جامعہ کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی شخصیت دینی، تہذیبی اور سیاسی قدروں کی صحیح آمیزش کا نمونہ تھی۔ جامعہ نے اپنے بس بھر جو کیا جاسکتا تھا کیا، انگریزی حکومت کے زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ حکومت کی مدد کے بغیر تعلیم کا کام نہیں کیا جاسکتا، ہم نے حکومت کی مدد کے بغیر اپنا کام چلایا، پھر جب یہ کہا جانے لگا کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں دو قومیں ہیں جن کے مذہب، تہذیب اور اخلاق میں بنیادی تضاد ہے، تب ہم اس پر اڑے رہے کہ سچے مذہب، سچی تہذیب، سچے اخلاق سے اتحاد پیدا ہوتا ہے، اختلاف پیدا نہیں ہوتا، لیکن آزادی کے بعد معلوم ہوتا ہے ہمارے ہمدردوں اور دوستوں کی رائے کچھ یہ ہوگئی کہ جامعہ والے خود تو اچھے لوگ ہیں، مگر جو کام وہ کر رہے ہیں اس کی اب ضرورت نہیں ہے اور جامعہ کی حیثیت قومی تحریک کی ایک یادگار کی سی ہوگئی۔ ہمارے وہ رہنما جو ہر معاملے میں جرأت اور فراست سے کام لیتے تھے نہ جانے کیوں جامعہ کے معاملے میں اعتراضات سے ڈرتے رہے، انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ہماری تاریخ اور ہماری خاص صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ہم سے ایسے کام لئے جاسکتے ہیں جو تعلیم اور سماج کے رشتے کو مضبوط کرسکتے ہیں اور جن کے لئے عام کالج اور یونیورسٹیاں ہماری طرح کا تجربہ نہیں رکھتی ہیں، بلکہ ہمیں یہ دکھانے پر مجبور کیا کہ دراصل ہم عام سرکاری تعلیم گاہوں سے مختلف نہیں ہیں۔

جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں، اب ہمیں ہر طرح کا اطمینان ہے، لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب

کہتے رہتے تھے کہ یہی اطمینان سب سے بڑا خطرہ ہے، کہ یہ فردعات کی اہمیت کو بڑھا کر خیال اور عمل کے میدان کو تنگ اور ضمیر کو غافل کر دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی رائے بھی یہی ہوگی اور آپ ہی ہمیں تعلیم کے اس راستے کو چھوڑ کر جس پر چلنے والوں نے اتنی گرد اڑائی ہے کہ منزل مقصود نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے، نئی راہیں اختیار کرنے کا موقع دے سکتی ہیں۔ جامعہ کی طرف سے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہمارا مذہب اب بھی اس سچے استاد کا مذہب ہے جو ظاہری باتوں سے گذر کر ہر انسان کی انسانیت کو اجاگر کرتا ہے، اخلاقی شعور کو بیدار کرتا ہے، بھائی چارہ کے آداب کو خدا کے احکامات سمجھ کر برتتا ہے، ہماری تہذیب اب بھی وہ تہذیب ہے جو ہر انسان میں خیال اور عمل کے حسن کو تلاش کرتی ہے، جس میں کسی انسان کی انسانیت کی قدر نہ کرسکنا ایک ایسا عیب، کسی کا دل دکھانا ایسا ظلم مانا جاتا ہے کہ اس سے ہر حال میں پرہیز کرنا چاہیئے۔ ہمارے یہاں اب بھی ایسے سر پھرے لوگ موجود ہیں جو کام کی اہمیت کو دیکھتے ہیں، معاوضے کو نہیں دیکھتے، جن کا شوق ہر طرح کی آزمائش کا منتظر رہتا ہے۔ آپ نے ذاکر حسین سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز قائم کر کے ہمارے لیے تہذیبی خدمت کی ایک نئی راہ نکالی ہے۔ ہمیں اس کا بھی موقع دیجئے کہ شمالی ہندوستان کی اس تہذیب میں جس کا علم بردار آپ کا اپنا خاندان بھی رہا ہے اور جس کی اب تک دلوں پر حکومت ہے، چاہے زبانیں اس سے بغاوت کر چکی ہوں، مشاعرے کی سی کشش پیدا کرسکیں۔ ہمارے پرائمری اور سکنڈری اسکول ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے لاڈلے تھے۔ ہم نے ان اداروں میں ایک بہت اچھی نرسری کا اضافہ کیا ہے اور ہم ان کی یہ خواہش کہ انھیں ایک تعلیمی لیبوریٹری بنایا جائے، اب بھی پوری کرسکتے ہیں اگر ہمیں ذرا سا سہارا مل جائے۔ ہم کو ناموافق حالات کا مقابلہ کرنے کی عادت ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں ناموافق حالات سے لڑتے لڑتے نقصان نہیں ہوا ہے۔ اب ہم ستانا نہیں چاہتے، پچاس سال کی محنت کا معاوضہ نہیں مانگتے، ہم آگے بڑھنے کا شوق اور اس شوق کو آزمانے کی ہمت رکھتے ہیں، بس آپ یہ کہہ دیجئے کہ ہاں آگے بڑھو، میں

رانا جنگ بہادر سنگھ

جامعہ — ابتدا میں انتہا

اسی صدی کی بات ہے۔ آزادی کی تمنا کا اس ملک میں ایسا طوفان آیا تھا کہ اس نے دلوں اور دماغوں کو ان کی جڑوں تک جھک جھور ڈالا تھا۔ انقلابی روحوں نے عوام کو جگا کر ایسے جذبات اور خیالات سے مسلح کر دیا جس سے وہ ودیشی ہتھکڑی بیڑی کاٹ کر اپنی قسمت کو بدل ڈالنے میں کامیاب ہو سکیں۔ میرا یہ مختصر مضمون اور کچھ نہیں ہے، انھیں دنوں کی ان گنت غیر معمولی تواریخی کہانیوں میں سے ایک چھوٹی سی کہانی ہے، جب خواب سچا ہو کر بھی، بنیادی نقطۂ خیال سے جھوٹا ہو جاتا ہے، تب پریشان مَن اپنے کو بہلانے کے لئے، ایسی ہی پُرانی پیاری کہانیوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔

اُس وقت کی ایک بات کا ذکر کرنے جا رہا ہوں، جب کالے قانون رولٹ ایکٹ کی چوٹ کھا کر قوم نے کروٹ بدلی تھی۔ تب میں میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔ عمر کچی تھی، علم کی ابھی اُنگلی ہی پکڑی تھی اور تجربہ نہیں کے برابر تھا، اُمنگ ایسی آئی کہ امتحان ابھی چل ہی رہا تھا کہ میں قومی جدوجہد میں شامل ہو گیا، میٹرک پاس تو ہو گیا لیکن اسکول سے رسٹی کیٹ کر دیا گیا، پھر کسی طرح ذہنی داؤ پیچ کے بل پر لکھنؤ کے کیننگ کالج میں داخلہ حاصل کر لیا۔ کتنے دن تک کورس کی کتابوں کے نیچے اپنا سیاسی رنگ چھپائے رکھ سکتا تھا؟ ایک دن انگریز پرنسپل کیمرن صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا کہ "اگر آپ شرافت سے چلے جائیں گے تو میں آپ کو اچھے چال چلن کی سند دیدوں گا۔ ورنہ ...." شرافت ہی میں میں نے خیریت سمجھی اور لکھنؤ

سے الہ آباد کے لئے ٹکٹ کٹا لیا۔ کیرن صاحب کی دی ہوئی سند پیش کر کے کائستھ پاٹھ شالا کالج میں داخلہ حاصل کر لیا۔ میں نے اس بار احتیاط برتی، پھر دھکا کھانے سے بچنے کے لئے، پہلے ہی سے ڈاکٹر تارا چند کو، جو پاٹھ شالا کے پرنسپل تھے اپنا کچا چٹھا بتا دیا، یہ ۱۹۱۹ء کی بات ہے۔

اس کے بعد ہی تو گاندھی جی کی تحریک نے، جس کو شاعری کی زبان کے استاد اکبر نے آندھی بتایا تھا، اتنا زور پکڑا کہ بڑھاپا، جوانی، بچپن، سبھی اس کی پکڑ میں آ کر اس کی رفتار سے اس کے ساتھ چل پڑے۔ میں دو مرتبہ اپنے جنون کی منہ زوری کا خاصا مزا لے چکا تھا، اس لئے میں نے لگام کس رکھی تھی، لیکن ۱۹۲۲ء میں بڑے پیمانے پر والنٹیروں اور لیڈروں کی گرفتاریاں اور پولیس کی زیادتیوں کے بعد، مجھ پر دیوانگی کا پھر ایسا عالم طاری ہوا کہ میں کتابوں کو ایک کنارے رکھ کر آزادی کی لڑائی کے میدان میں بے تحاشہ کود پڑا۔

ان دنوں طالب علموں کو ــــ وہی تو قومی شباب کی رنگین قوت تھے ــــ تحریک میں لانے کے لئے یہ نعرہ بلند کیا گیا تھا کہ "سرکاری یونیورسٹیاں اور کالج غلام خانے ہیں اس لئے ان کو چھوڑ دو" ــ میں نے خود تو اس نعرہ کی معقولیت کو قبول ہی کیا، الہ آباد یونیورسٹی میں گھوم گھوم کر اس کو سارے احاطہ میں مقبول بنانے کی انتھک کوشش کی اور بہت سے ساتھیوں کو اس پر عمل کرنے کے لئے مائل بھی کر لیا۔ پھر بدیسیوں کے چالو اور لاگو کئے ہوئے قانون پر قانون توڑے، ہر طرف اور ہر طریقے سے مار کرنے والی دفعہ ۱۴۴ ــ جو ابھی تک نہ دفن ہوئی ہے اور نہ دفع ــــ کی گھڑکیوں کا مذاق اڑاتے ہوئے والنٹیر بھرتی کئے، جلوس نکالے، تقریریں کیں اور مانچسٹر کے بنے کپڑے کی دوکانوں پر دھرنے دئے، پھر جب چوری چورا کے واقعات کے بعد، گاندھی جی نے ڈبل مارچ کے دوران ایک دم پالٹ بولدیا، تب گہرے صدمے کے باوجود میں الہ آباد یونیورسٹی عرف غلام خانہ کی گود میں واپس نہیں گیا۔

پھر پہونچا کہاں؟ جامعہ۔ اس کے متعلق کچھ عرض کرنے کے لئے اتنی بڑی تمہید

رچ ڈالی ہے ۔ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ یہ تمہید اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی میری کوئی باریک سی چتر ترکیب ہے، اس کی غرض محض یہ ہے کہ اس وقت کی انقلابی فضا، اُصول اور نصب العین کے عجیب وغریب اثر کا آپ کو کچھ اندازہ ہو سکے ۔ وہ ایک طرح کا جادو ہی تھا جس نے میرے ایسے ہزاروں خاکساروں کی زندگی کا رُخ حب الوطنی اور انسانیت پرستی کی طرف پھیر کر ان کی شخصیت کو طوفان بنا دیا تھا۔

میں جامعہ کاشی ودیاپیٹھ کا چکر لگاتا ہوا پہونچا۔ مجھے ودیاپیٹھ میں کئی ہم عمر ساتھیوں کا رنگ ڈھنگ دقیانوسی لگا ــــ سب کا نہیں ــــ اس لئے میرا وہاں جی نہیں لگا۔ یہ نہیں کہ مجھے جسمانی سادگی اور روحانی ورزش سے چڑ ہے ۔ مجھے دونوں ہی کافی پسند ہیں۔ لیکن ہونی چاہئیں وہ بیسویں صدی کے مارکہ کی۔ جامعہ (یونیورسٹی) کا جامہ سرکاری یونیورسٹیوں (غلام خانوں) کی پوشاک سے مختلف ہوتا ہوا بھی گئے گذرے زمانے کا نہیں، نئے نکھرتے زمانے کا تھا۔ اس میں اس کی قومی تہذیب کا حسن اور انسانی تمدن کا جلال ایسا دل کش لگتا تھا کہ جس نے بھی تعصب کے کے پردے کو ہٹا کر دیکھا نہال ہو گیا، بہت دن ہوئے میں نے جامعہ کے ایک رسالے میں انقلابی طوفان کی دین اس مرکز تعلیم کی بے نظیر صنعتوں کا اور اس کی بے جوڑ ہستی کے کرشموں کا، جو میری طالب علمی کے زمانے کے تجربوں کا بہترین حصہ ہیں، سرسری طور سے ذکر کیا تھا، ٹھیک یاد نہیں کیا لکھا تھا۔ حتی الامکان ان باتوں کو دہرا کر بور کرنے کی غلطی سے بچنے کے لئے، نئی پٹری پکڑوں گا اور جامعہ کی وضع قطع اور ادا کے کچھ ابھرے ہوئے من موہک پہلوؤں کی چرچا چلا کر "فقط" لکھ دوں گا۔

حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین ایسے عظیم الشان قومی رہنماؤں نے، جن کی پاک ہستیوں پر فرقہ وارانہ بغض و کینہ تک کوئی تہمت لگانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اور جن کا نظریہ اتنا وسیع تھا جتنا کہ یہ عالم اور جن کی ذہنیت اتنی بلند تھی جتنی کہ انسانیت جامعہ کو بنا کر اس میں جان ڈالی اور اس کو تاریک گوشوں میں روشنی پھیلانے کو ہنر سکھایا۔

حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کے گذر جانے کے بعد، مشکلات کے پہاڑ کے نیچے دب کر جامعہ دم توڑنے لگا، اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین کی مسیحائی نے اس کی جان ہی نہیں بچائی بلکہ اس کو صحیح روشنی پھیلانے والی اور صحیح حرارت پیدا کرنے والی تعلیمی مشعل کی شکل دی۔ محبت ڈاکٹر ذاکر حسین کا مذہب تھا، اور خلوص ان کا لباس۔ ایک فرشتہ اپنے بھولے پن میں آسمان سے زمین پر اتر آیا تھا، اور ہم گمراہوں اور گناہگاروں کے بیچ آ بسا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس کے بھولے پن نے ایسی سادگی اور پاکیزگی کا روپ رنگ اختیار کیا جس کی مثال ہی ہماری غلطیوں کا سدھار اور ہمارے گناہوں کا کفارہ کرنے کے لئے کافی تھی۔ ان کی سادگی اور پاکیزگی ان کی شان و شوکت تھی، وہ تب بھی بے داغ ہی رہی جب وہ ہندوستان کے پریسیڈنٹ بن گئے۔ جب کبھی میں پریسیڈنٹ ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملا، نہ مجھے ان کی پریسیڈنٹی کا تاج نظر آیا اور نہ ڈاکٹری کا گاؤن۔ انھیں سدا ہی پرانے سادے ذاکری لباس میں اپنے دلارے عقیدوں اور اصولوں کو پالتے پوستے دیکھا۔ وہ جن کے لئے "ذاکر صاحب" تھے ان کے لئے ہمیشہ "ذاکر صاحب" ہی بنے رہے۔ ساتھیوں کا پیار اور ادب اتنے برسوں سے انھیں اس طرح پکارتا آرہا تھا کہ یہ دو لفظ ان کے من کو مگن کرنے کے لئے کافی تھے۔ ان کی طرف سے ان میں کوئی اضافہ ان کے لئے سخت ناگوار تھا۔ جن چند خوش نصیب ہستیوں کا ان کے ساتھ دانت کاٹی روٹی کا رشتہ تھا ان کے لئے تو وہ دو لفظ بھی نہیں محض تین حرف تھے۔ ذاکر۔ یہی "ذاکر" جامعہ کی جان تھے، ظاہر ہے کہ "ذاکری" جامعہ جو تعلیم دیتا ہے اس میں اصولاً کسی بھی بنیادی نقص کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

۲۳۔ ۱۹۲۲ء میں جب میں جامعہ کی بی اے کلاس میں پڑھ رہا تھا تب ڈاکٹر ذاکر حسین جرمنی پہونچے ہوئے تھے۔ مولانا محمد علی شیخ الجامعہ تھے اور خواجہ عبدالمجید پرنسپل۔ جامعہ کا جنم انقلابی طوفان سے ہوا تھا، قدرتاً اس کی صورت طوفانی تھی اور رغبت انقلابی۔ جامعہ میں اس وقت تقریباً آدھے درجن پروفیسر ایسے تھے جن کے دل و دماغ نے لندن،

آکسفورڈ اور کیمبرج کی آب و ہوائیں ـــــ جن میں نہ تو خیالات کی گھٹن تھی اور نہ مذہبی جہالت کا زہر ـــ پرورش پائی تھی۔ وطن کی محبت، آزادی کی لگن اور ملک کی بیدار و بے قرار جوانی کو صحیح راستہ دکھانے کی دھن میں ان کو جامعہ میں لا جمع کیا تھا۔ جامعہ کے اور پروفیسر بھی ہم پرواز ہی تھے، ورنہ کہیں اور اڑتے پھرتے۔ پروفیسروں میں مسلمان، ہندو، عیسائی، پارسی، اینگلو انڈین سبھی تھے۔ مسلمان اور ہندو پروفیسروں کے نام گناؤں گا تو کئی چھوٹ جائیں گے۔ ان کی تعداد خاصی تھی نا۔ کچھ اوروں کے نام جو یاد آرہے ہیں لکھے دیتا ہوں۔ پروفیسر کیلاٹ، پروفیسر ماسٹر، پروفیسر البن۔ پروفیسر کیلاٹ عیسائی تھے جو انتھراپولوجی پڑھاتے تھے۔ انتھراپولوجی دیومالائی حماقتوں کو ظاہر کرنے والا مضمون ہے۔ یہ اور ایسے ہی مضمون، جو عقل کی راہ روشن کرتے ہیں پڑھاتے ہوئے کیلاٹ صاحب نے اپنی ساری زندگی جامعہ میں بتادی۔ ان کی عیسائیت کی ایک ایک سانس کا ـــ آخری سانس تک پیغام تھا پریم۔ پروفیسر ماسٹر پارسی تھے جو پروفیسر البن کی جن کا اینگلو انڈین فرقہ سے تعلق تھا، جرنلزم کی کلاس میں مدد کیا کرتے تھے۔ البن صاحب صرف قلم کی کاریگری ہی نہیں سکھایا کرتے تھے بلکہ اس کا صحیح استعمال بھی بتایا کرتے تھے، میرا خیال ہے کہ اخبار نویسی کی باقاعدہ تعلیم سب سے پہلے جامعہ میں دی گئی۔ اور وہ دی بھی گئی اس طرح جس طرح دی جانی چاہیے تھی۔ میں نے جامعہ میں جرنلزم کی تعلیم پاکر پہلے مولانا محمد علی کے "کامریڈ" اخبار میں کام کیا ـــ مولانا صاحب مجھے اپنے خلوص و محبت کا قیدی بنا کر جامعہ سے اپنے ساتھ لے گئے ـــ پھر اور اخباروں میں۔ جامعہ نے مجھے، میرے اخبار نویسی کی کلاس کے اور ساتھیوں کی طرح، یہ فن آزادی کے شیدائیوں کو تقویت پہونچانے کے لئے، اور آزادی کے حاصل ہونے پر انسانیت کا پیغام ہر دل عزیز کرنے کے لئے سکھایا تھا۔ ہمیں پیشہ ور نہیں مشنری بنایا گیا تھا۔ میرا یہ دعویٰ کہ میں نے، لاہور کے "ٹریبون" کے اڈیٹر اور پھر دلی کے ٹائمز آف انڈیا کے اڈیٹر کی حیثیت سے، اخباری دنیا میں ترقی کی چوٹی پر پہونچ کر بھی جامعہ کے سکھائے ہوئے سبق کو نظر انداز نہیں کیا، جامعہ کی تعلیمی عظمت پر محمول کر جانے

کے برابر ہے۔ وہ قلم کیا جو نیلامی پر چڑھے۔ قلم تو وہ ہے جس کی قیمت نہ لگ سکے۔

جامعہ میں، پروفیسروں کے گلدستہ کی طرح، طالب علموں کا گلدستہ بھی ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے رنگ برنگ کے پھولوں کا بنا ہوا تھا۔ ان میں بھی مختلف مذہبوں اور فرقوں کے لوگ تھے، لیکن نہ خوشبوؤں میں جنگ تھی اور نہ رنگوں میں رسہ کشی۔ پڑھائی کے مقصد اور طور طریقے سے عقل کو تخت طاؤس پر بٹھا کر، بھائی چارے کا راج قائم کیا تھا، اکثر مختلف مذاہب والے طالب علم ہم نوالہ وہم پیالہ ہوتے تھے۔ اور ہمراہ تو ہمیشہ ہی۔ نوجوان سرکاری نوکری کرنے کیلئے اور ادھم مچانے کے لئے تیار نہیں کئے جا رہے تھے بلکہ ملک کی خدمت کرنے کے لئے اور انسانیت کا پرچار۔ نوجوان کو، ایک نئے سانچے میں ڈھال کر، ایک نیا انسان بنانے کی سرگرم کوشش کی جا رہی تھی۔ جمہوری خلوص اس حد تک بڑھا تھا کہ ہم اپنے کچن میں کام کرنے والے ملازموں کے گاؤں میں جا کر ان کے مہمان بنا کرتے تھے اور اور ان کے ساتھ پک نک کا مزہ لیا کرتے تھے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ایسی ہی ایک پک نک میں گنے کے رس میں بنی ہوئی کھیر کھانے کا لطف حاصل ہوا تھا جس کا ذائقہ مجھے اب تک یاد ہے۔

شریف، سائنس اور سچے مذہب میں کسی طرح کا بھید نہیں ہے، اور بنیادی مذہبی اصولوں میں چاہے وہ کتنے ہی مختلف رنگوں کے ہوں دور کی بھی دشمنی نہیں ہو سکتی۔ اس امر کی بنا پر جامعہ میں سائنٹیفک تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ میں یہ کبھی نہیں بھول سکتا کہ اور سبھی ہندو طالب علموں کے ساتھ مجھے بھی لوک مانیہ تلک کی لکھی ہوئی گیتا رہسیہ نام کی بڑی موٹی کتاب شروع سے آخر تک پروفیسر سنگل نے پڑھائی تھی، مجھے اس مضمون میں امتحان دے کر کامیاب ہونا پڑا تھا، ورنہ بی اے کی ڈگری سے محروم رہتا۔ ایک طرف سر پی سی رائے اور ان کے شاگرد الہ آباد یونیورسٹی کے کیمسٹری کے پروفیسر امتحان لینے آتے تھے تو دوسری طرف پنڈت اور مولوی۔ میرے جامعہ کے مسلمان ساتھیوں کو

حدیث کے متعلق پرچوں کا ٹھیک جواب دے کر کامیابی حاصل کرنی پڑتی تھی، لیکن ہم کو
دوسرے کا سر پھوڑنے کا پرکٹیکل امتحان دینا نہیں پڑا۔ اس طرح کا امتحان فسادکر
کی ڈاکٹریٹ حاصل کرنے والے لوگ وہ ایمان کی حرارت والے حضرات ہیں جو ایک
مسجد تو بنا دیتے ہیں لیکن جن کا پاپی من برسوں میں بھی نمازی نہیں بن پاتا اور وہ
منھ میں تو رام ہوتا ہے لیکن بغل میں چھری۔ ایسے مذہب اور دھرم کے علماء اور
کی آبادی تو آج کل بے تحاشا بڑھ رہی ہے۔ نوجوان اکثر کتاب اور قلم کے
پتھر اور خنجر لئے گھومتے نظر آتے ہیں۔ جامعہ کے طالب علموں کے ہاتھ میں جب کتاب
نہیں ہوتے تھے تب عوام کی خدمت کرنے کا ساز و سامان ہوتا تھا، گرمی کی چھٹیوں
قصبوں اور گانوؤں میں جاکر دکھی لوگوں کی سیوا کیا کرتے تھے۔

میرے وقت کے جامعہ کے رنگ روپ اور آج کل کے جامعہ کے روپ رنگ میں
سمان کا فرق ہے۔ وہ جامعہ کچی پکی دیواروں اور پھوس کی چھتوں والے مکانوں میں
۔ یہ جامعہ اینٹ پتھر کی دیواروں اور لنٹل کی چھتوں والی عمارتوں میں بستی ہے۔
س کے بدلے ہوئے قالب کے اندر میں نے جو جھانک کر دیکھا تو روح تو وہی پرانی نظر
یب صاحب ایسے تعلیمی دنیا کے فرشتوں اور فاروقی صاحب ایسے کردار کے غازیوں
شش لیکن یہ ایک دن دقتوں اور مصیبتوں کو ضرور پچھاڑ دیں گی۔ یہ ٹھیک ہے
جامعہ کی انقلابی روح دفتری لال فیتے سے بری طرح بندھی ہوئی ہے اور ہم نے انگریز
نے کی نوکر شاہی سے جو اگر علم بجذم طور طریقہ وراثت میں پایا ہے اس کے ذلیل بوجھ کے
لبی سے دبی ہوئی ہے، لیکن اس کے کرتا دھرتا اور مخلص دوستوں کے کامیاب ہوتے ہی وہ
لی خوب ابھرے گی اور بہت چمکے گی۔ اس وقت وہ حسین انتہا دیکھنے کو ملے گی جس کا میرے
جامعہ کے اولڈ بوائز کو انتظار ہے۔

فی الحال تو مجھے یہ گستاخی بھری بات کہنے کی اجازت دیجئے کہ وہ حسین انتہا میں دیکھ چکا ہوں
جامعہ کی حسین ابتدا میں ہی پنہاں تھی۔

مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم

جامعہ

زندگی ناز و نیاز و سوز و سازِ دل میں ہے
ہائے وہ زندہ کہ جو مدفون آب و گِل میں ہے
بُو پریشاں ہو کے نکلی غنچۂ گلزار سے
کب سبک روحوں کو آسائش کسی منزل میں ہے
بادیہ گردی ہے مجنوں کے لئے سامانِ زیست
ایک جانِ تازہ ہر نظّارۂ محمل میں ہے
پوچھ آسانی پسندوں سے ہر آسانی کہاں؟
جو نہیں مشکل میں ہے وہ بھی بڑی مشکل میں ہے
عشرتِ شاہی میں بھی حاصل نہیں پرویز کو
وہ مزا جو کوہ کن کی سعیِ لاحاصل میں ہے
شیخ ہند و اجمل و جوہر کی روحِ انقلاب
جامعہ ملیہ کے سر میں، جگر میں، دل میں ہے
گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جامِ آتشیں
رات دن گردش میں رندوں کی بھری محفل میں ہے

تعلیمی ادارے

۱۔ جامعہ کالج		
۲۔ ہائر سکنڈری اسکول	سنہ قیام	۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء
۳۔ مدرسہ ابتدائی		
۴۔ استادوں کا مدرسہ	"	یکم اگست ۱۹۳۸ء
۵۔ بالک ماتا سنٹر	"	۱۹۵۲ء
۶۔ نرسری اسکول	"	۱۹۵۵ء
۷۔ شعبۂ انجینئرنگ	"	۱۹۵۶ء
۸۔ اسکول آف سوشل ورک	"	۱۹۶۷ء

ہوسٹل جامعہ کالج



ضیاء الحسن فاروقی

جامعہ کالج

۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ علی گڑھ میں قائم ہوئی تو جامعہ کالج ہی اس کا خاص شعبہ تھا، اس طرح جامعہ کی بنیاد ہی ایک اعلیٰ تعلیم کے ادارہ کی حیثیت سے پڑی، اور اس کی یہ حیثیت اس وقت سے لے کر اب تک نہ صرف باقی ہے بلکہ آزادی کے بعد تو اور مستحکم ہوگئی ہے۔ جب خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کا زور تھا تو جامعہ کالج کے طلباء رضا کار بن کر تحریک آزادی کا پیغام دور دور تک پہونچاتے تھے، وہ ایک خاص جذبے سے شہر شہر اور قریہ قریہ پھرتے اور ملک وقوم کو برطانوی سامراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دیتے۔ لیکن بعض رہنما ایسے تھے جو چاہتے تھے کہ جامعہ جلد از جلد ایک ایسا تعلیمی ادارہ بن جائے جس کی تعلیمی حیثیت بھی مسلّم اور مستند ہوجائے، چنانچہ اس کا نصاب تعلیم مرتب ہوا اور سیاسی جوش وخروش کے کم ہوتے ہی اس کی تعلیمی ہیئت ابھرنے لگی، لیکن اب بہت سے ذہنوں میں، جن میں بزرگ بھی تھے اور نوجوان بھی، یہ سوال اٹھنے لگا کہ جامعہ کالج میں پڑھنے سے، جس کی سندیں حکومت تسلیم نہیں کرتی، دنیوی اعتبار سے کیا فائدہ ہوگا، اس پر مستزاد سیاسی اُبال کے دبنے کے ساتھ جامعہ کی مالی حالت بھی کمزور ہوگئی، اب تک اس کا زیادہ خرچ خلافت کمیٹی برداشت کرتی تھی، ۱۹۲۴ء میں جب مصطفےٰ کمال نے خلافت کے ادارہ کو ختم کردیا تو خلافت کمیٹی کا وجود بھی خطرہ میں پڑگیا، اور خود اس کی مالی حالت کمزور ہوگئی، ان حالات میں جامعہ کے ٹرسٹیز کی اکثریت اس نتیجہ پر پہونچی کہ جامعہ کو بند کردینا چاہیے۔ لیکن استادوں اور جامعہ کالج کے طالب علموں کی ایک پرجوش جماعت

نے اس فیصلہ سے اتفاق نہیں کیا اور جرمنی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنے عزائم اور ٹرسٹیز کے خیالات سے مطلع کیا، انھوں نے جواب میں لکھا کہ ہمارے آنے کا انتظار کیا جائے، جامعہ بند نہ کی جائے، ہیں اور میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کو تیار ہیں۔

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جامعہ کالج نے جو شروع کے دو تین سال کے علاوہ عرصہ تک ترقی و توسیع سے محروم رہا، اور اس کے معقول اسباب تھے، نہ صرف ابتدائی دور کی آزمائشوں میں جامعہ کو زندہ رکھا بلکہ بعد میں بھی جامعہ کے مختلف اداروں کو اسی سے اچھے کارکن اور استاد ملے اور جو کچھ بھی علمی کام (تصنیف و تالیف و ترجمہ) جامعہ میں اب تک ہوا ہے، اور یہ کام ملک کے دانشوروں کے نزدیک قابل قدر، وقیع، مستند اور معیاری ہے، وہ سب جامعہ کالج کے استادوں اور لائق طالب علموں ہی کا کام ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ جامعہ کالج کے اساتذہ اپنے فن میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے، اس وقت کی وہ کسی یونیورسٹی یا دارالعلوم میں ہوتے، ان کی شخصیت و قابلیت توجہ کا مرکز بن جاتی، مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد عاقل معاشیات پڑھاتے تھے، پروفیسر محمد مجیب تاریخ کے پروفیسر تھے (مجیب صاحب تو آج بھی کالج میں ایم اے کی کلاسیں لیتے ہیں)، کیلاٹ صاحب انگریزی کے اور ڈاکٹر سید عابد حسین اردو ادب کے استاد تھے، مولانا اسلم جیراجپوری اور مولانا خواجہ عبدالحئ صاحب قرآن و حدیث و تاریخ اسلام کا درس دیتے تھے اور مولانا سید محمد سورتی عربی ادب پڑھاتے تھے۔ جامعہ کالج کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اساتذہ اپنے طالب علموں .... میں اعلیٰ تہذیبی اقدار کی محبت کا بیج بوتے تھے، انھیں ان اقدار کی چاکری کے لئے تیار کرتے تھے، سادہ زندگی، خلوص اور جذبۂ ایثار کی عملی شکل بن کر اپنے نوجوان طالب علموں کو فکر و عمل کی دعوت دیتے تھے، اکثر طالب علم، کالج سے فارغ ہوکر، اپنے استادوں کی رہنمائی میں جامعہ کی خدمت کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیتے تھے، اور جو یہاں سے چلے جاتے تھے وہ اپنے اپنے حلقہ میں، تجارت، صحافت، تعلیمی، سوشل ورک یا سیاسی کام جو کچھ بھی وہ کر رہے ہوتے، تہذیب

شرافت کا ایک معیار قائم رکھتے اور کوشش کرتے کہ اپنے کام سے مادرِ علمی کا نام اونچا کریں۔
ذاکر صاحب اور شفیق صاحب کو جامعہ چلانے کے لئے سرمایے کی ضرورت رہتی تھی، جامعہ کالج کے ذمہ دار طلبار جو ملک کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، وہ ان بزرگوں کی مدد کرتے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک جامعہ کو جامعہ کالج ہی نے اعلیٰ تعلیم کا ادارہ بنائے رکھا، اور قائل ہونا پڑتا ہے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور ان کے ساتھیوں کی بصیرت اور دور اندیشی کا کہ انھوں نے کسی منزل میں بھی، اس وقت بھی جب جامعہ کالج میں طالب علموں کی تعداد بیس پچیس ہی ہوتی تھی، کالج کو بند نہیں ہونے دیا۔ اگر کالج نہ ہوتا تو آج یو. جی. سی ایکٹ کے سیکشن ۳ کے تحت یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر کے جامعہ کے لئے توسیع و ترقی کا کوئی امکان نہ ہوتا۔

شروع میں تو جامعہ کالج میں بی اے آنرز اور ایم اے تک تعلیم ہوتی تھی، سائنس کی آنرز کلاسیں بھی تھیں، لیکن رفتہ رفتہ حالات کی دشواریوں کے سبب بی اے تک کی تعلیم رہ گئی، کالج کا نصاب چار سال کا تھا، دو سال جامعہ سینیر (انٹرمیڈیٹ) اور دو سال جامعہ سندی (بی اے) کے، لیکن انگریزی، اردو و ادب، اسلامیات یا ہندو اخلاقیات، ہندی اور سماجی علوم (معاشیات، سیاسیات، تاریخ وغیرہ) کا ایک ایسا مربوط و معقول نصاب جامعہ نے تیار کیا تھا کہ جامعہ کے گریجویٹ کا معیارِ تعلیم اس وقت کی سرکاری یونیورسٹیوں کے بی اے سے کہیں زیادہ اونچا تھا، اس کے علاوہ کالج میں تفویضی کام (Assignments) کا تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا تھا، بی اے کے طالب علموں کے مقالے اپنے معیار کے اعتبار سے بہت اچھے ہوتے تھے، بعض مقالے تو کتابی شکل میں شائع ہوئے اور تبصرہ نگاروں نے انھیں علم و ادب میں قابلِ قدر اضافہ تصور کیا۔ یہ جامعہ کی اپنی خصوصیت تھی جسے ملک میں بہت بعد میں قابلِ توجہ سمجھا اور اپنایا گیا اور وہ بھی ادھورے طور پر، جامعہ کالج میں ۱۹۵۵ء تک مقالوں کا معیار اچھا رہا، بعد میں جوں جوں طلبار کی تعداد بڑھنے لگی، معیار قائم رکھنا مشکل ہوگیا، اس لئے کہ کالج کے یہ طویل مقالے کم و بیش اس معیار کے ہوتے تھے جیسے آج کل بی۔ اے آنرز اور ایم اے کے [illegible] ہوتے ہیں، لیکن اب

جبکہ کالج میں ۱۹۶۸ء سے آنرز کے کورس جاری ہو گئے ہیں جن میں طالب علموں کی ایک محدود تعداد داخل کی جاتی ہے، طویل مقالہ ایک پرچے کے طور پر شامل نصاب کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس سے متعلقہ طالب علموں کے مطالعہ میں وسعت پیدا ہوگی اور تعلیمی معیار اونچا ہوگا، اس سے کالج میں جو علمی فضا بنے گی اُس سے بی، اے اور بی ایس سی کی سطح کے مضامین کی تدریس پر بھی اچھا اور مفید اثر پڑے گا۔ یوں تو کالج کی ہر کلاس کا ہر سال یونیورسٹی امتحان ہوتا ہے، لیکن طالب علموں کے لئے کسی امتحان کے پاس کرنے کے واسطے ضروری ہوتا ہے کہ وہ انٹرنل ایسسمنٹ (Internal Assessment) میں جو چھوٹے بڑے تفویضی کاموں اور کلاس ٹسٹ وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے کم از کم ۳۳ فیصدی نمبر حاصل کریں۔ عام طور پر ہر مضمون کے مجموعی نمبروں کے ۲۰ فیصدی نمبر اس کے لئے متعین ہیں۔ سنتے ہیں کہ اب دوسری یونیورسٹیاں بھی اس پر عمل پیرا ہو رہی ہیں اور بعض نے تو اس نظام کو اپنا لیا ہے۔

جامعہ کالج میں کیلاٹ صاحب مرحوم کے زمانے میں کھیلوں کا معیار بہت اچھا تھا، وہ خود بہت زیادہ دلچسپی لیتے، طالب علموں کے ساتھ کھیل میں شریک رہتے، اُن کی ہمت افزائی کرتے، جو کوئی تساہل سے کام لیتا، اُسے چاق چوبند اور مستعد بنانے کے جتن کرتے۔ شاید یہ انہیں کی ڈالی ہوئی روایت ہے کہ جامعہ کالج میں فٹ بال، ہاکی، کرکٹ اور والی بال کی ٹیمیں آج بھی اچھی خاصی ہیں، ہمارے کھلاڑی کئی سال سے انٹر ورسٹی میچوں میں شریک ہوتے ہیں اور جہاں جاتے ہیں اپنے کھیل کے ساتھ تہذیب اور بھلمنساہت کا گہرا اثر چھوڑ آتے ہیں۔ جامعہ کالج میں ہر مذہب کے طالب علم اور طالبات پڑھتی ہیں، اور کبھی کوئی ایسی صورت نہیں پیدا ہوتی جس سے جامعہ کی حب الوطنی اور متوازن مذہبیت پر کوئی اثر پڑے۔ ۱۹۶۷ء میں باہر کے بعض سیاسی عناصر نے جامعہ کالج میں گڑبڑ کرانے کی کوشش کی تھی لیکن اس میں انہیں کچھ زیادہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی، اس لحاظ سے دوسری یونیورسٹیوں کے طالب علموں کے مقابلہ میں ہمارے طلبہ کسی قدر قدامت پسند ہیں، آج کے حالات میں یہ قدامت پسندی لائق ستائش ہے۔

جامعہ کالج میں طالب علموں کی یونین کو انجمن اتحاد کہتے ہیں، اس انجمن کی عمر بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ جامعہ کی، انجمن اتحاد کا ایک آرگن بھی ہے جسے جوہر کہتے ہیں، گذشتہ پچاس سال میں اس انجمن نے جامعہ کی قدر و قیمت بڑھانے میں نمایاں کام انجام دئے ہیں، اس کے پاس ایک اچھی خاصی لائبریری تھی، جوہر کے کئی خاص نمبر چھپے اور علمی و ادبی دنیا میں مقبول ہوئے، اس کے قلمی شمارے بھی خاصے کی چیز ہوا کرتے تھے، انجمن کے پلیٹ فارم سے ملک و ملت کی اہم شخصیتوں نے جامعہ کے استادوں اور طالب علموں کو خطاب کیا ہے۔ یہ انجمن اب بھی ہے اور اس کے اراکین کی تعداد پہلے کے مقابلہ میں دس بارہ گنی زیادہ ہے، لیکن اب اس میں وہ بات نہیں جو پہلے تھی، جس طرح قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں انحطاط نمایاں ہے، انجمن بھی اس کی زد میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یونیورسٹیوں اور دارالعلوموں میں وہ روایتیں ختم ہو گئیں جنھیں انجمن اتحاد کی طرز کی اسٹوڈنٹس یونینوں نے ایک عرصہ کی کاوشوں کے بعد قائم کی تھیں۔

جامعہ کالج میں، جامعہ کے دوسرے اداروں کی طرح کہ یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا بنیادی اصول رہا ہے، شروع ہی سے ذریعہ تعلیم اردو ہے، غلامی کے دور میں اسے پسماندگی کی ایک علامت تصور کیا جاتا تھا اور جتنی بھی سرکاری یونیورسٹیاں تھیں انگریزی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھیں، لیکن ماہرین تعلیم اُس وقت بھی کہتے تھے کہ صحیح طریقہ یہی ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم اُن کی اپنی مادری زبان ہی میں ہونی چاہئے کہ اس سے ان کی ذہنی بالیدگی اور صلاحیتوں کی ترقی میں مدد ملتی ہے، آزادی کے بعد بھی جب رفتہ رفتہ اس اصول کو عملی شکل دینے کی کوشش ہوئی اور یہ کہا جانے لگا کہ یونیورسٹیوں میں بھی ذریعہ تعلیم علاقائی زبانیں ہونی چاہئیں تب بھی جامعہ میں اردو ذریعہ تعلیم رہی اور آج بھی ہے، اور یو، جی، سی اور حکومت نے جامعہ کے اس موقف کو مان لیا اور اب تو ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں نے جامعہ کی سندوں اور سرٹیفکٹوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ ہاں دکھ اس بات کا ہے کہ خود اردو والوں نے اردو کو چھوڑ دیا ہے اور کالج میں مختلف صوبوں سے اُردو جاننے والے طلبہ کی تعداد کم آتی ہے، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا

چاہئے کہ جامعہ میں آن طالب علموں کو کوئی دقت ہوتی ہو جو اپنا medium of Examination یعنی امتحان کی زبان اُردو کے بجائے ہندی یا انگریزی رکھنا چاہتے ہیں، جامعہ کے قاعدوں میں اس کی پوری گنجائش ہے۔ آزادی کے بہت پہلے سے جامعہ میں سہ لسانی فارمولے پر عمل ہو رہا ہے، یہاں کسی زبان کو کسی زبان سے بیر نہیں ہے، ذریعۂ تعلیم چونکہ اردو زبان ہے اس لئے تمام غیر اردو والوں کو کالج میں ایک خاص معیار تک اردو کی تعلیم دی جاتی ہے، اس طرح بھی جامعہ اپنے تہذیبی مقاصد کی خدمت میں لگی ہوئی ہے

مزید برآں جامعہ کالج کے تحت دہلی کی چار بستیوں میں اردو مرکز قائم ہیں، ان میں سے تین بستیاں تو خاص اس قسم کی ہیں کہ ان میں پاکستان سے آئے ہوئے ہمارے بھائی آباد ہیں، ان مرکزوں میں ایک ایک کتب خانہ ہے جس کی رکنیت کی کوئی فیس نہیں، کوئی زرضمانت نہیں، لوگ اپنے شوق سے آتے ہیں، بیٹھتے ہیں، کتابیں دیکھتے ہیں اور پھر جاری کر کے اپنی پسند کی کتابیں لے جاتے ہیں، دو مرکزوں میں اردو کی تعلیم بھی ہوتی ہے، یہ تجربہ بہت کامیاب ہے، اور اس سے اردو زبان اور اردو تہذیب کی اشاعت کے نئے نئے گوشے سامنے آئے ہیں، اردو مرکز ۱۹۷۰ء میں حکومت کشمیر کی ایک مخصوص گرانٹ سے قائم کئے گئے تھے، پھر حکومت ہند سے ان کے لئے گرانٹ ملنے لگی اور ان کا بجٹ جامعہ کالج کے بجٹ کا ایک حصہ بن گیا۔

مذہبی تعلیم اس وقت بھی کالج کے نصاب کا ایک لازمی جزو تھی جب جامعہ میں مدرسہ ابتدائی وغیرہ کی جماعتیں نہیں تھیں، جامعہ کے تعلیمی مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہاں سے ایسے نوجوان نکلیں جو ذمہ دار شہری ثابت ہوں، اچھے محب وطن ہوں، اگر مسلمان ہوں تو سچے مسلمان ہوں اور ہندو ہوں تو سچے ہندو ہوں، اسی لئے مذہبی تعلیم پر جو اچھی اخلاقی تعلیم کی بنیاد ہے، جامعہ میں پوری توجہ دی جاتی تھی، نوجوانوں کی ذہنی صلاحیت اپنی بالیدگی اور آبیاری کے لئے اپنے تہذیبی سرچشمے ہی کی طرف دیکھتی ہے، جامعہ چلانے والوں کے سامنے ہمیشہ سے یہ بات

رہی ہے، اس لئے مسلمان طالب علموں کے لئے اسلام کی اور ہندو طالب علموں کے لیے ہندو اخلاقیات کی تعلیم لازمی تھی، لیکن ۱۹۴۹ء میں جب آزاد ہندوستان کا سیکولر دستور نافذ ہوا اور جب جامعہ نے یہ طے کیا کہ اب اپنی حکومت سے گرانٹ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تو مذہبی تعلیم لازمی نہیں رہ سکتی تھی، پھر بھی اب تک عملاً صورت حال یہ ہے کہ کالج میں طلبا کی تقریباً ۹۵ فیصدی تعداد اسلامیات یا ہندو اخلاقیات کا کورس پڑھتی ہے۔

اس وقت کالج میں جن کورسز اور مضامین کی تعلیم ہوتی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

کورسز: (۱) پری یونیورسٹی کورس (۲) بی اے (سہ سالہ کورس) (۳) بی اے آنرز (ہندی، معاشیات، سیاسیات اور تاریخ) (۴) بی ایس سی (سہ سالہ کورس: گروپ اے یعنی فزکس، کیمسٹری، ریاضی) (۵) ایم، اے (تاریخ) (۶) پی، ایچ، ڈی (تاریخ)۔

مضامین: (۱) اسلامیات (۲) ہندو اخلاقیات (۳) ہندوستان کے مذاہب اور تہذیب (۴) اردو (ابتدائی کورس) (۵) اردو زبان (۶) جنرل ایجوکیشن (۷) انگریزی عام (۸) اردو ادب (۹) ہندی ادب (۱۰) انگریزی ادب (۱۱) عربی (۱۲) فارسی (۱۳) تاریخ (۱۴) معاشیات (۱۵) جغرافیہ (۱۶) سیاسیات (۱۷) علوم اسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) (۱۸) عام سائنس (برائے پری یونیورسٹی کورس) (۱۹) فزکس (۲۰) کیمسٹری (۲۱) ریاضی۔

امسال جون کے مہینے میں کالج کی طرف سے یو، جی، سی کو لکھا گیا تھا کہ وہ کالج میں کچھ اور مضامین میں آنرز اور ایم، اے کورسز شروع کرنے کی اجازت دیں، معلوم ہوا ہے کہ یو، جی، سی نے مندرجہ ذیل نئے کورسوں کے شروع کرنے کی اجازت دے دی ہے، انشاء اللہ آئندہ تعلیمی سال سے یہ کورس شروع کر دئے جائیں گے۔

(۱) ایم، اے (اردو ادب) (۲) بی، اے آنرز (جغرافیہ) (۳) بی، اے آنرز (عربی) (۴) بی، اے آنرز (فارسی) (۵) بی، اے آنرز (انگریزی ادب) (۶) بی ایس سی آنرز (فزکس) (۷) بی ایس سی آنرز (کیمسٹری) (۸) بی ایس سی آنرز (ریاضی)۔

کالج میں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرتی ہیں، پرانے خیال کے مطابق یہ یہ ایک بدعت ہے لیکن اسے اب عام طور پر ہماری جماعت نے تسلیم کرلیا ہے، لیکن اس سے کالج کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں، خوشی ہوتی ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم ماں باپ جامعہ میں اپنی لڑکیوں کو بھیج کر مطمئن ہوجاتے ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کالج کے استادوں کی ذمہ داری کتنی بڑی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اگر طلبار اور طالبات خود اسے محسوس کریں کہ ان کے حدود کیا ہیں اور آزادی کا مطلب یہ ہے کہ بہت سی پابندیاں آپ اپنے اوپر عاید کرلی جائیں تو استاد کا کام بہت ہلکا ہوجاتا ہے، جامعہ میں ایسی ہی ذمہ داری کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ طالب علموں اور استادوں میں بڑا قریبی رشتہ ہو، کالج میں طالب علموں کی تعداد بڑھنے کے بعد بھی یہ رشتہ قائم ہے، اور کالج چاہتا ہے کہ ایک خاص حد سے زیادہ تعداد نہ بڑھے تاکہ کالج میں وہ ماحول قائم رہے جس کی بنا پر استاد، طلبہ اور طالبات، سب لوگ اس ادارہ کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور یہاں کی زندگی کو ایک خاندان کی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔

عبدالحق خاں

ہائر سکنڈری اسکول

جامعہ کے قیام کے ساتھ ہی مدرسہ ثانوی قائم ہوا تھا، جس میں دسویں کلاس تک تعلیم دی جاتی تھی، اگرچہ شروع ہی سے مدرسہ ثانوی کا نصاب تعلیم اور طریق تعلیم دوسرے ہائی اسکولوں سے کافی مختلف اور جدید تعلیمی نظریات پر مبنی تھا، چنانچہ ایک زمانے تک یہاں تفویضی طریقہ رائج تھا اور یہ کوشش کی گئی کہ مدرسے کا پورا نظام ڈالٹن اصول پر آجائے، مگر حالات کی تبدیلی اور زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے نصاب تعلیم اور طریق تعلیم میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اب ۱۹۵۶ء سے اس میں گیارہویں کلاس تک تعلیم دی جانے لگی ہے اور نصاب تعلیم میں بہت سے مضامین کا اضافہ کر دیا گیا یعنی جدید اصطلاح میں جسے متنوع نصاب (DIVERSIFIED COURSE) کہتے ہیں، وہ آج کل جاری ہے اور مدرسہ ثانوی کو اب ہائر سکنڈری اسکول کہتے ہیں۔

ایک سال کی توسیع اس وجہ سے مناسب تھی کہ میٹرک کا دو سال کا نصاب طلبار کے مزاج کی مناسبت سے تعلیم کے صحیح نتائج برآمد کرنے کے لئے کافی نہیں تھا۔ ہم نے ہائر سکنڈری تعلیم کی تمام مدت پر اس لئے نظرثانی کی اور اس کی ہیئت کو اس لئے بدلا تاکہ طلبار کو اچھی تربیت دی جا سکے، وہ اپنی صلاحیتوں کا اچھا استعمال سیکھ سکیں، انھیں اپنی تعلیمی کاوشوں کا اچھا پھل ملے اور وہ مستقبل کے لئے اپنے آپ کو بہتر طریقہ پر تیار کر سکیں۔

متنوع نصاب

ہمارے ثانوی مدرسوں کا یہ طریقہ کہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علم کا صرف ایک ہی میدان ہو جس میں تمام طلباء کم و بیش ایک نصاب کے مطابق کام کریں تمام طلباء کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ اس لئے ایک مدرسہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مختلف النوع نصاب کا انتظام کرے اور ایسے مشاغل کا انتظام کرے جو تمام طلباء کے مزاج، صلاحیتوں اور دلچسپیوں کے مطابق ہوں اور انھیں پروان چڑھائیں۔ اسی لئے جامعہ ہائر سکنڈری اسکول میں متنوع نصاب جاری کیا گیا۔ ہائر سکنڈری کلاسوں میں مضامین کے دو گروپ ہیں، ایک آرٹس گروپ اور دوسرا سائنس گروپ۔ آرٹس اور سائنس گروپ کے مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ـــ حصہ اول اور حصہ دوم ـــ حصہ اول کا امتحان دسویں کلاس کے بعد اور حصہ دوم کا امتحان گیارہویں کلاس کے بعد ہوتا ہے۔ جامعہ ہائر سکنڈری امتحان کو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں نے داخلے کے لئے تسلیم کرلیا ہے۔

تعلیمی مشورے (ایجوکیشنل گائڈنس)

ہمارے موجودہ تعلیمی نظام کی ایک اہم خرابی یہ بھی ہے کہ بچوں کی انفرادی صلاحیتوں سے مناسب کام نہیں لیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ عظیم قومی نقصان کی صورت میں نکلتا ہے۔ تعلیم کے دو اہم مقاصد یعنی سماجی اور پیشہ وری کو ابھارنا ہے اس کے لئے ہر بچہ پر مناسب انفرادی توجہ دینی چاہئے۔ بچوں کی صلاحیتیں اسی وقت ابھر سکتی ہیں اور نشو و نما پاسکتی ہیں جب اسے مواقع فراہم کئے جائیں کہ وہ ان کا اظہار کرسکیں۔ ان مقاصد کو مختلف منازل میں مندرجہ ذیل مناسب مشورے دیکر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(الف) کلاس میں مناسب مضامین اور ان سے متعلق مختلف مضامین چننا۔

(ب) اسکول چھوڑنے کی کلاس میں پیشے کا چننا اور ایک خاص ذریعہ معاش کو پسند کرنا اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ اس کی اپنی صلاحیتیں اور حالات کیا ہیں۔

ہم نے پہلے اسٹیج پر مشورہ دینے یعنی گائڈنس کا کام شروع کیا ہے جس میں امتحان کے نتائج، اساتذہ کی رائے اور والدین کی خواہش کے پیش نظر طلباء کو اپنے اپنے گروپ منتخب کرنے میں مدد دی جاتی ہے۔

امتحان کا نظام

امتحان کے طریقے کو بہتر بنانے کے لئے ہم نے ایک طریقہ کی ابتدا کی ہے اور امتحان کی اس طرح تنظیم کی ہے کہ ایک طالب علم کے تمام سال کے کام کو مناسب طریقے پر جانچا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ صرف ایک سالانہ امتحان کے بوجھ کو طلباء کے ناتواں کاندھے برداشت نہیں کر سکتے اس لئے اس بوجھ کو اس طرح اٹھانے کے قابل بنایا گیا ہے کہ ایک امتحان کے بجائے سال میں کئی امتحانات رکھے گئے ہیں۔ ماہانہ جانچ اور ریکارڈ کا طریقہ جاری کیا گیا ہے۔

اساتذہ کے جلسے اور تبادلۂ خیال

کسی بھی ادارے کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اس کے نگران کو اساتذہ کا کتنا تعاون حاصل ہے اور تعاون کا سرچشمہ درحقیقت وہ تعلیمی آزادی اور آزاد تبادلۂ خیال ہے جو ادارے اور ادارے کے مسائل سے متعلق عام طور پر ہوتا رہتا ہے۔

اسکول میں انجمن اساتذہ ہے، تعلیمی مسائل پر اس انجمن میں بحث ہوتی ہے، اس کے علاوہ ماہانہ جانچ کے بعد مضامین کے اساتذہ کی کانفرنس بھی بلائی جاتی ہے تاکہ فرداً فرداً مختلف طلباء کے مسائل پر غور کیا جا سکے۔

سائنس کی تجربہ گاہیں

وزارتِ تعلیم نے مدرسہ کو پچاس ہزار روپے کی گرانٹ دی تھی تاکہ سائنس کی تجربہ گاہوں کو بہتر بنایا جا سکے۔ مدرسہ میں فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی کی تجربہ گاہیں تمام ضروری سامان سے آراستہ ہیں۔

تعلیمی کلب

ہمارے طلبار کے مشاغل بلاواسطہ مختلف مضامین کے کلبوں سے متعلق ہیں اور یہ کلب ہمارے ادارے میں بہت مقبول ہیں، ایک طالب علم بیک وقت دو کلبوں کا ممبر ہو سکتا ہے۔ کلب کے جلسے ہفتے میں ایک دفعہ اوقات تدریس کے بعد ہوتے ہیں۔ پروجیکٹ اور دیگر غیر نصابی مشاغل انہی کلبوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔

انجمن طلبار

آج کی ثانوی تعلیم پر طلبار کو جمہوریت اور تعاون کا سبق دینے کی زبردست ذمہ داری ہے اور اسکول کی حکومت طلبار میں شہریت کی تربیت کا ایک موثر ذریعہ ہے ہمارے اسکول میں ایک انجمن طلبار ہے جو اسکول کے تمام مشاغل کی تنظیم کرتی ہے۔ یہ انجمن ان انجمنوں کے مقابلے میں زیادہ دلچسپی سے کام کرتی ہے اور زیادہ اختیارات رکھتی ہے جو عام طور سے مختلف اسکولوں میں ہوتی ہیں۔

اس انجمن کی نگرانی میں مدرسہ کا ایک دن کا مدرسہ" اور "سالانہ دن" بہت اہتمام سے منایا جاتا ہے۔

کھیل اور اسپورٹس

کھیل کمیٹی اسکول میں کھیلوں اور اسپورٹس کا انتظام کرتی ہے۔ فٹ بال، ہاکی،

کرکٹ، والی بال اور باسکٹ بال کے کھیل کا معقول انتظام ہے۔ چھٹی اور فرصت کے اوقات میں کامن روم میں اِن ڈور کھیلوں کا انتظام ہے۔ مدرسے میں کھیل کا معیار کافی بلند ہے۔

"تعلیم کی تین رسمی تقسیموں یعنی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ میں ثانوی تعلیم کا تعلق تمدنی زندگی اور اس کے مقاصد سے بہت ہی گہرا ہے، اس لیے کہ ابتدائی تعلیم تو بچے کو اس عمر میں دی جاتی ہے جبکہ اس کا شعور مقابلتہً بہت محدود ہوتا ہے اور اس کی ترکیب نفسی میں وحدت ہوتی ہے، وہ تمدن کی تحلیل مختلف اجزاء میں نہیں کر سکتا، نہ اس پر تنقیدی نظر ڈال سکتا ہے، وہ تو زیادہ تر اپنے ماحول کی زندگی سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے، اس لیے اس منزل میں معلم کا کام بہت کچھ یہ ہوتا ہے کہ بچے کے لیے ایسا مفید تعلیمی ماحول مہیا کرے جس میں اس کی جسمانی اور ذہنی قوتیں مجموعی طور پر ابھر سکیں.....

ثانوی تعلیم کی منزل اس لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں تمدن کی تفسیر اور ترجمانی کا کام جو معلم کو ہر منزل میں کرنا پڑتا ہے، خاص طور پر مشکل ہو جاتا ہے، یہاں معلم کا کام یہ ہے کہ تمدنی زندگی کو مختلف اجزاء میں تحلیل کر سکے، نوجوان کی تنقیدی قوت کو بھی ابھارے، مگر صحیح راہ سے بھٹکنے بھی نہ دے، اس کی انفرادیت کا احترام بھی کرے اور اسے جماعتی زندگی سے ربط دینے کی کوشش بھی۔ غرض یوں تو تعلیم کی ہر منزل میں تمدنی نصب العین کا رکھنا ضروری ہے، لیکن ثانوی منزل میں معلم کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اس نصب العین کا واضح تصور اور اس سے دلی لگاؤ رکھتا ہو اور اس کی تفسیر و ترجمانی بخوبی کر سکے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین

آزاد ہندوستان

مدرسہ ابتدائی

(۱۹۴۸ء تا ۱۹۷۰ء)

سلور جوبلی کے بعد جب مدرسہ کھلا تو ملک تقسیم ہو چکا تھا اور حالات بدل چکے تھے۔ اعلیٰ متوسط طبقہ جس کے بچے جامعہ میں تعلیم پاتے تھے ہندوستان کو خیرباد کہہ کر جا چکا تھا۔ پورے مدرسے میں مقیم طلبا کی تعداد پچاس، پچپن کے قریب رہ گئی تھی البتہ کالکا کیمپ کے بچوں کی وجہ سے غیر مقیم طلبا کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مدرسے کے اقامتی کردار کو باقی رکھنے کے لئے سب سے پہلے یہ کوشش کی گئی کہ کسی طرح مقیم طلبا کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اساتذہ کے مختلف وفود ملک کے مختلف حصوں میں بھیجے گئے اور سرپرستوں کو اطمینان دلایا گیا کہ اب حالات بہتر ہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ جوں جوں ملک کے حالات اطمینان بخش ہوتے گئے مدرسے میں مقیم طلبا کی تعداد بڑھتی رہی اور چند ہی سال کی کوشش سے اچھی خاصی تعداد ہو گئی۔ رفتہ رفتہ مدرسے میں پھر سے مختلف مشاغل پر کام شروع ہو گیا۔ کئی نئے مشاغل شروع ہوئے جیسے ایک دن کا مدرسہ، کھُلی ہوا کا مدرسہ، خوانچہ، تقسیم انعامات کے موقع پر سالانہ جلسہ اور بچوں کی حکومت وغیرہ۔ پرانے مشاغل کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ وسیع پیمانے پر اور پچھلے تجربوں کی روشنی میں زیادہ بہتر طریقے پر چلایا گیا لیکن ترقی کی رفتار کا اندازہ لگانے میں تھوڑی سی دشواری یہ ہوتی ہے کہ لوگ نئے کاموں اور ان کی تعداد کو سامنے رکھ کر ترقی کا اندازہ لگاتے ہیں۔ جاری کاموں کو بہتر اور عمدہ طریقے سے کرنے کو ترقی نہیں سمجھتے۔ بے شک نیا کام شروع کرنا بڑی ہمت اور جانفشانی کا کام

ہے لیکن پرانے کام کو جاری رکھنا اور اس میں برابر گہرائی اور وسعت پیدا کرتے رہنا اس سے بھی زیادہ محنت طلب اور صبر آزما ہے۔ بہر صورت جوبلی کے بعد جب حالات ساز گار ہوگئے، طلبار کی تعداد خاصی ہوگئی اور پژمردہ دلوں میں کچھ جان سی آئی تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن کر علی گڑھ چلے گئے اور ان کی جگہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی رہنمائی میں نئے عزم اور حوصلہ کے ساتھ کام شروع ہوا۔ سب سے پہلے ضرورت اس امر کی تھی کہ بدلے ہوئے حالات میں نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی جائے۔ اچھے نصاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اساتذہ کی سوجھ بوجھ اور ان کے تجربوں کا بھی دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں ہر جماعت کے استاد درجہ سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ اپنی جماعت کا نصاب تیار کرے۔ ہمارے ملک میں تعلیم کی ترقی کے میدان میں یہ ایک نیا قدم تھا۔ نصاب تعلیم میں کچھ کمیاں ضرور رہ گئیں لیکن یہ تجربہ اپنی مثال آپ ہے۔ نصاب تعلیم بناتے وقت استادوں کے ذہن میں یہ بات رہی کہ نصاب تعلیم بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہے، کوشش ہونی چاہیے کہ اس کے ذریعے بچوں میں غور و فکر اور تحقیق و تجسس کا جذبہ پیدا ہو تاکہ وہ بڑے ہو کر اپنے ملک کے ذمہ دار شہری اور بنی نوع انسان کے سچے خادم بن سکیں۔ نصاب میں طریقۂ تعلیم سے متعلق بھی مناسب ہدایات دی گئیں کہ جہاں تک ممکن ہو کسی مشغلے یا حرفے سے مربوط کر کے نصاب کو پورا کرانے کی کوشش کی جائے۔ اچھے نصاب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ حالات اور ضروریات کے پیش نظر اس میں مسلسل تبدیلی ہوتی رہے۔ اس بنا پر ۱۹۶۵ء میں استادوں کی مدد سے نصاب تعلیم پر پھر سے نظر ثانی کی گئی۔ تعلیمی معیار میں اضافہ کے خیال سے ریکارڈ کے نمبروں کی تعداد تھا اتنی ہی رکھی گئی البتہ اس کی تقسیم اس طرح کر دی گئی کہ ۸۰ نمبر ماہانہ جانچ کے رکھے گئے اور ۲۰ نمبر وقت کی پابندی، کام کی صحت اور صفائی ستھرائی کے۔ سماجی علوم کے امتحان کے پرچے objective ٹائپ کے بنائے جانے لگے۔

شروع میں اجتماعی منصوبوں پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، پورے مدرسے میں ایک

آدھ استاد اپنے درجہ میں کوئی جماعتی منصوبہ چلا لیتا تھا سلور جوبلی کے موقع پر کوشش کی گئی
جماعت میں کوئی نہ کوئی پروجیکٹ چلایا جائے اور اس کی نمائش ہو۔ جوبلی کے بعد رفتہ ر
جب کام معمول پر آگیا تب بھی ہر سال ہر جماعت میں کوئی نہ کوئی وقتی پروجیکٹ چلانا لاز
سا ہو گیا۔ استاد اور طلبار نئے نئے منصوبوں کا پلان بناتے رہتے۔ مدرسے میں ج
پروجیکٹ چلتے تو چاروں طرف زندگی اور چہل پہل نظر آتی۔ طلبار اور اساتذہ دن را
لگ کر مقررہ مدت میں اپنے کام کو پورا کرتے۔ تعلیمی میلے کے موقع پر اس کی نمائش کرتے۔
تو مدرسے میں وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی پروجیکٹ کے کام کی نمائش شروع ہی سے ہوتی رہی لیکن
ادھر پچھلے دس پندرہ برس سے مدرسے میں جو میلے کے موقع پر نمائش ہوتی ہے اس
خصوصیت یہ ہے کہ ہر سال بیس پچیس پروجیکٹ کی نمائش ایک ساتھ ہوتی ہے۔ نمائش کے
ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی ڈرامہ وغیرہ بھی پیش کیا جاتا ہے اور ٹی اسٹال بھی لگایا جاتا ہے
ایک ساتھ اتنے سارے کام کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ استاد مہینے دو مہینے دن رات
میں لگے رہتے تب کہیں جا کر تمام کاموں کی وقت پر تکمیل ہو پاتی۔ جب کام ختم ہوتا تو اسا
اپنے کام کو دیکھ کر خود ہی خوش ہو لیتے اور سمجھتے کہ کام اپنا انعام آپ ہے۔ ۱۹۵۶ء میں
وزارت تعلیم کی خواہش پر یہ معلوم کرنے کی غرض سے کہ گاندھی جی کی تعلیمات کو کس درجہ سے
شروع کیا جا سکتا ہے پنجم میں گاندھی جی پروجیکٹ چلایا گیا۔ تجربہ سے یہ نتیجہ نکلا کہ پانچویں جما
سے گاندھی جی کی تعلیمات کو شروع کیا جا سکتا ہے اور عمل درآمد کے خیال سے پروجیکٹ
رپورٹ کی ایک ایک نقل مختلف ریاستوں میں بھجوائی گئی۔ پروجیکٹ کے کاموں کی مقبولی
کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۱ء میں وزارت تعلیم کی خواہش پر آدمی پروجیک
تہوار پروجیکٹ اور ہمالیہ کی مہمیں پروجیکٹ، ہالینڈ، اٹلی اور جاپان میں نمائش کے لئے
بھیجے گئے۔

جہاں تک مستقل کاروباری شعبوں کا تعلق ہے ۱۹۴۸ء کے بعد ان کا کام بہت پھیل گ

اس لیے ان کے حسابات کو ٹھیک طرح سے رکھنے کی غرض سے باقاعدہ ایک محرّر کا تقرر کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک مستقل شعبہ چڑیا خانہ کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۲ء سے پہلے مدرسے میں خوانچہ برائے نام تھا بعد میں مدرسے کی ضرورت کے پیش نظر خوانچے کے کام کو ذرا باقاعدگی سے شروع کیا گیا اور سوم کے بجائے یہ کام پنجم جماعت کے طلبار کے سپرد کیا گیا۔ روزمرہ کے کام کے علاوہ سال میں تعلیمی میلہ اور عید بقرعید کے موقع پر خوانچے کی طرف سے پابندی سے ٹی اسٹال لگتا۔ بچے بہت سلیقے سے اس کا انتظام کرتے۔ بعض دفعہ اتنا منافع ہو جاتا کہ اس رقم سے طلبار کو آگرے وغیرہ کی تعلیمی سیر کا موقع مل جاتا، جب خوانچے کا کام اور بھی زیادہ پھیل گیا تو اس کے لئے الگ سے ایک مستقل جگہ کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ کئی سال سے بچوں کی دوکان اور خوانچے کا منافع جمع تھا اس رقم سے بچوں کے لیے ایک خوب صورت سا کینٹین بنوایا گیا۔ کینٹین کے بن جانے سے مدرسے کی ایک اہم ضرورت پوری ہو گئی اور طلبار کو کھانے پینے کی تمام چیزیں صاف ستھری، اچھی اور مدرسے کے احاطے کے اندر ہی ملنے لگیں۔ سلور جوبلی سے ایک سال قبل مدرسے میں مرغی خانے کی بنیاد پڑی اور رفتہ رفتہ اس کا کام خاصا پھیل گیا لیکن بچوں کے لیے اس کو منافع بخش طریقے پر چلانا ذرا مشکل تھا اس لئے مجبوراً ۱۹۶۴ء میں مرغی خانہ ختم کر دیا گیا۔

سلور جوبلی کے موقع پر تعلیمی نمائش میں کچھ سانپ اور دوسرے کیڑے وغیرہ رکھے گئے۔ ان چیزوں کو بعد میں ایک کمرے میں رکھ کر مدرسے میں ایک شعبہ یعنی میوزیم کی بنیاد ڈالی گئی تاکہ بچوں میں سائنٹفک رجحان پیدا کرنے میں مدد ملے۔ رفتہ رفتہ میوزیم میں طلبار کی جمع کی ہوئی اور بازار سے خریدی ہوئی چیزوں کا خاصا اضافہ ہو گیا۔ ۱۹۶۴ء میں میوزیم کو نیچر اسٹڈی روم میں بدل دیا گیا اور تھوڑے دنوں میں کافی سامان جمع کر لیا گیا۔

میوزیم کی طرح سلور جوبلی سے ایک سال قبل مدرسے کے قریب ایک بڑے سے ٹیلے پر جہاں آج کل ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کا مزار ہے، سورج کا خاندان، چاندنی

مختلف شکلیں، موسم کی تبدیلی اور اسی قسم کے دوسرے ماڈل بنائے گئے اور ایک نئے شعبے رصدگاہ کی بنیاد پڑی۔ یہ کام بہت مفید تھا لیکن ہر سال بارش میں تمام ماڈل خراب ہو جاتے اتنا روپیہ نہیں تھا کہ باقاعدہ رصدگاہ بنائی جاسکے اس لیے چند ہی سال میں یہ شعبہ ختم کر دیا گیا۔

مدرسے میں بچوں کا کتب خانہ شروع ہی سے ہے۔ کسی ایک استاد کی نگرانی میں شعبہ چلتا تھا۔ باقاعدہ الگ سے لائبریرین نہ ہونے کی وجہ سے بڑی دشواری پیش آتی تھی طلباء اور اساتذہ اس سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کر پاتے تھے، اس لیے ۱۹۶۷ء سے ایک باقاعدہ لائبریرین کا تقرر کیا گیا تاکہ کتب خانہ مدرسے کے پورے اوقات میں کھلا رہے اور طلباء اور اساتذہ اس سے بیش از بیش فائدہ اٹھا سکیں۔

تعلیمی مرکز قرول باغ میں کاغذ سازی، ابری گتہ اور باغبانی کا کام حرفے کے طور پر کرایا جاتا تھا۔ مدرسہ ابتدائی (اوکھلا) میں ان کے علاوہ تکلی کا کام بھی ہوتا تھا لیکن اس کے لئے الگ سے کوئی استاد نہ تھا۔ ۱۹۵۳ء سے مدرسے میں حرفے کے ایک استاد کا تقرر کیا گیا اور حرفے کا باقاعدہ نصاب بنایا گیا جس میں کاغذ گتہ اور لکڑی کا کام شامل ہے۔ جہاں تک باغبانی کے حرفے کا تعلق ہے شروع میں تمام جماعتیں باغبانی کا کام نہیں کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ہر جماعت کے لئے باغبانی کا حرفہ لازمی قرار دیا گیا۔ چوں کہ باغبانی کا آدھا منافع بچوں کو ملتا تھا اس لئے بچے شوق اور انہماک سے باغبانی میں کام کرتے۔ ۱۹۵۶ء میں ششم جماعت کے طلباء کو آلو اور ٹماٹر کی پیداوار سے ڈیڑھ سو روپے کا منافع ہوا۔ اس رقم کو طلباء نے مدرسے کو تحفے کے طور پر پیش کر دیا جس سے محمد علی ہال کے لئے فریم بنوا کر ان میں چارٹ لگائے گئے اور دینیات کی تعلیم کو زیادہ موثر اور بہتر بنانے میں مدد لی گئی۔

دینیات کی تعلیم کا تعلق رسمی تعلیم سے کم اور طبیعت کے میلان سے زیادہ ہے، اس لئے ۱۹۵۶ء کے بعد محمد علی ہال میں جہاں اسلامیات کی کلاس ہوتی ہے چارٹس وغیرہ

آویزاں کرکے، بزرگانِ دین کی کہانیاں سناکر، جلسے کرکے، ترانے میں طلبار سے قرآن اور حدیث کے خوب نکلے پڑھواکر اور دیواری اخبار وغیرہ نکال کر دینی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ بچوں میں بھی دیانتداری پیدا ہو سکے۔ اس کے علاوہ جو نئے طریقے دوسرے مضامین کی تدریس میں استعمال ہوتے تھے انھیں اسلامیات کی تدریس میں بھی اپنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ بغیر کسی سختی کے بچے خود بخود شوق سے دینی معلومات کو ذہن نشین کرنے لگے اور دعائیں وغیرہ یاد ہونے لگیں۔

بچوں کی شخصیت کی صحیح نشوونما اسی وقت ممکن ہے جب کہ ذہن کے ساتھ ساتھ جذبات کی بھی صحیح تربیت ہو۔ اس غرض سے مدرسے میں شروع ہی سے ایسے مشاغل کا انتظام کیا گیا جن کے ذریعہ بچوں کے اظہارِ خودی کے جذبے کی تسکین ہو سکے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد مدرسے میں ایسے مشاغل کا خاص اہتمام کیا گیا اور پہلی بار مختلف "ہوبیز" کی باقاعدہ تنظیم کی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں ششم کے طلبار نے ہوبیز کے سلسلے کی ایک نمائش کی جس میں ہوبیز سے متعلق بیس قسم کے مختلف کام پیش کئے گئے۔ اس نمائش کی خاص بات یہ تھی کہ طلبار کو بھی ساتھ ساتھ کام کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس قسم کی یہ پہلی نمائش تھی۔ لوگوں نے نمائش بہت پسند کی۔ آل انڈیا ریڈیو کے بچوں کے پروگرام میں بھی طلبار بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے اور ایسے اچھے پروگرام پیش کئے جو دوسرے اسکولوں کے لئے نمونے کا کام دیتے رہے۔ چوں کہ تعلیمی میلہ جامعہ کا ہر سال کا ایک مستقل پروگرام بن گیا تھا اس لئے بچوں کو اظہارِ خودی کا خوب موقع ملتا۔ اس موقع پر پیش کرنے کے لئے کسی ایسے ڈرامے یا پروگرام کا انتخاب کیا جاتا جس میں مدرسے کے زیادہ سے زیادہ بچے حصہ لے سکتے۔ ۱۹۵۶ء میں اسٹیج پر جو پروگرام پیش کیا گیا اس میں ایک ساتھ تقریباً ڈیڑھ سو طلبار نے حصہ لیا۔ میلے کے موقع پر مدرسے کی طرف سے جو ڈرامے یا پروگرام پیش کئے گئے ان کے حسن اور خوبی کا صحیح اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو چھوٹی عمر کے بچوں میں تعلیم کے کام کا تجربہ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں جو عملی دشواریاں پیش آتی ہیں ان سے بخوبی واقف ہیں۔

مدرسے میں بچوں کی مجلس تو پہلے سے تھی ۱۹۵۲ء میں بچوں کی مجلس کو ختم کرکے بچوں کی حکومت قائم کی گئی تاکہ مدرسہ اور دارالاقامہ کی زندگی میں نظم کو قائم رکھنے میں طلبا ر اپنے اساتذہ کے برابر کے شریک ہو سکیں، صدر اور چیف جسٹس کے علاوہ ۹ وزیروں پر مشتمل بچوں کی حکومت کی ایک کابینہ ہے جو مدرسے میں ہر طرح کے نظم و نسق کی ذمے دار ہے۔ عام انتخاب صرف صدر کا ہوتا ہے۔ بچوں کی حکومت کی مسند نشینی کا جلسہ بھی اپنی نوعیت کی خاص تقریب ہے جس میں صدر اور وزرا، باقاعدہ جلوس کی شکل میں آتے ہیں اور حلفِ وفاداری اٹھاتے ہیں۔ پھر صدر اپنا خطبہ پڑھتا ہے۔ بچوں کی حکومت کی مقبولیت اور افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں سے اساتذہ بچوں کی حکومت کا لٹریچر منگواتے رہتے ہیں تاکہ اس کے نمونے پر اپنے مدرسے میں بھی حکومت قائم کرسکیں۔ مدرسے میں آئے دن مہمان آتے رہتے ہیں، ان کو بچوں کی کے عہدے دار ہی مدرسہ دکھاتے ہیں۔ اس طرح بچوں کو بڑوں سے بے جھجک ملنے اور بات کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ۱۴ نومبر کو جب چاچا نہرو کی سالگرہ منائی جاتی اور اسٹیڈیم میں طلبار کا اجتماع ہوتا تو مدرسہ ابتدائی کا بچّہ ہی اس تقریب کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتا، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مشاغل کے ذریعہ تعلیم سے مدرسے کے بچّوں کی شخصیت پر کتنا اثر پڑتا ہے۔ بچوں کی حکومت کے زیرِ اہتمام سال میں ایک دن اسکول کا پورا انتظام بچّوں کے سپرد کردیا جاتا ہے تاکہ اس بات کی جانچ ہوسکے کہ بچّوں میں کس حد تک ذمّہ داری کا احساس پیدا ہوا ہے۔ مدرسے کے تمام استاد پکنک کے لئے کہیں چلے جاتے ہیں اور اس دن بچے ہی استاد ہوتے ہیں اور بچّے ہی شاگرد۔ بچّوں کی حکومت کا صدر نگرانِ مدرسہ کے فرائض انجام دیتا ہے، باقی استادوں اور دوسرے کارکنان کا انتخاب بچّے آپس میں خود ہی کرتے ہیں۔ اس دن معمول کے مطابق پڑھائی کے علاوہ دارالاقامہ کی آرائش کا مقابلہ اور رات کے کیمپ فائر کا پروگرام خاص اہمیت رکھتے

ہیں۔ بچے بہت شوق اور انہماک سے اپنی طبیعت اور اپج کے مطابق اپنے اپنے دلدالا قاعہ کی آرائش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ رات میں کیمپ فائر کا پروگرام بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں تمام جماعتیں بڑی تیاری اور اہتمام سے حصہ لیتی ہیں۔ یہ تجربہ ۱۹۴۸ء کے بعد شروع کیا گیا۔ تجربہ بہت کامیاب ہے۔

تعلیمی سیروں کا پروگرام مدرسے کے پروگرام میں شروع سے داخل رہا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد طلباء نے نہ صرف آگرہ تک بلکہ دارجلنگ، کلکتہ، مدراس، میسور، بنگلور اور بمبئی تک کی تعلیمی سیر کے پروگرام بنائے اور مدرسے میں جو سالانہ پکنک ہوتی تھی اس کی جگہ ہر جماعت کا باری باری سے دہلی کی تاریخی عمارتوں اور نمائشوں کی تعلیمی سیر کے لئے جانا مدرسے کے مستقل پروگرام میں داخل ہو گیا۔

۱۹۵۸ء سے قبل مدرسے میں اسکاؤٹنگ کا انتظام تھا اور بڑی جماعتوں کے بچے فریدآباد کے قریب کیمپ کے لئے جایا کرتے تھے۔ بعد میں کھلی ہوا کے مدرسے کے نام سے اس پروگرام کو ایک خاص شکل دی گئی۔ مدرسہ ابتدائی کے کھلی ہوا کے مدرسے کو تعلیم کی نئی ٹیکنیک میں ایک نیا قدم کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اس پروگرام کے لئے دہلی کے قرب وجوار میں ایسی جگہ تلاش کی جاتی، جہاں کا قدرتی ماحول اچھا ہوتا اور دو تین میل کے اردگرد اتنی کافی تعداد میں مختلف نوعیت کی چیزیں ہوتیں، جو ان دنوں کی تعلیم کے لیے نصاب کا مواد فراہم کر سکتیں۔ کیمپنگ، اسکاؤٹنگ اور کیمپ فائر بھی پروگرام کا لازمی حصہ ہوتے۔ دس دن کے لیے چار سو پانچ سو بچوں کا اس طرح خیموں میں زندگی گذارنا اور پروگرام کے مطابق تمام کام انجام پانا کوئی آسان بات نہیں۔ مدرسے کا یہ منصوبہ بہت بڑا اور امتیازی منصوبہ ہے۔ ان دس دنوں میں استاد اور طلباء کے مل جل کر ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے سے کام کی جو فضا پیدا ہوتی اور استاد اور طلباء جس محنت، شوق اور لگن سے کام کرتے اس کی مثال ہمارے ملک میں ذرا مشکل ہی سے ملے گی۔ ہمارے ملک کے بچوں میں جان جوکھوں میں ڈالنے

کے جذبے کی بہت کمی ہے۔ کھلی ہوا کے مدرسے میں قدم قدم پر اس جذبے کو پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ دس دن کے بعد جب بچے واپس آتے تو واقعی اپنے کو زیادہ تندرست اور ہم محسوس کرتے۔ حوض خاص، سورج کنڈ اور مہرولی میں کھلی ہوا کے مدرسے کے جو پروگرام ہوئے وہ بہت کامیاب رہے۔

۱۹۴۸ء سے پہلے جوہر ٹرافی کے مقابلوں میں مضمون نویسی اور کہانی کے مقابلوں کے علا کھیل کود اور کیمپنگ کے مقابلے بھی شامل تھے۔ بعد میں کچھ سالوں تک مقابلے نہ ہو سکے اس لئے کہ ٹرافی قرول باغ میں فسادات کی نذر ہو گئی تھی۔ کوشش کر کے ۱۹۵۲ء میں نئی ٹرافی بنوائی گئی دوبارہ مقابلے شروع کرائے گئے ۱۹۵۲ء میں ٹرافی کے جو مقابلے ہوئے وہ اپنی مثال آپ تھے دہلی کے بیس اسکولوں نے اس میں حصہ لیا تھا جہاں بچوں کے کیمپ تھے وہاں ایسا معلوم ہوتا جیسے بچوں کا ایک شہر آباد ہو گیا ہے۔ چند سال بعد مختلف انتظامی دشواریوں کے پیش نظر کیمپنگ اور کھیل کود کے آئیٹم مقابلے سے نکال دیئے گئے۔ البتہ اسٹیج کے آئیٹمس میں اضا کر دیا گیا۔ ان مقابلوں سے دہلی کے دوسرے اسکولوں کے اساتذہ اور طلبا سے قریب آنے کا بہت اچھا موقع ملتا رہا۔

۱۹۴۸ء سے قبل مدرسے میں کھیل اور اسپورٹس کے انتظام کے لئے استادوں ہی میں سے کوئی استاد ناظم کھیل کے فرائض انجام دیتا۔ ۱۹۵۴ء میں مدرسے میں باقاعدہ پی۔ ٹی۔ آئی کا تقرر عمل میں آیا۔ کھیلوں کا انتظام بہت عمدہ طریقے سے ہونے لگا۔ جمنیزیم کے میدان کو ٹھیک کیا گیا اور کئی نئے قسم کے جھولے وغیرہ لگوائے گئے۔ سالانہ اسپورٹس کے بعد تقسیم انعامات کے موقع پر جو سالانہ جلسہ ہوتا وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ جمنیزیم اور ہلکے پھلکے کھیلوں کے اچھے اچھے پروگرام پیش کئے جاتے، طلبا اور سرپرستوں کو اس پروگرام کا بے چینی سے انتظار رہتا۔ اسپورٹس میں نہ صرف پوزیشن لانے والے بلکہ ہر اس طالب علم کو جو اسپورٹس میں حصہ لیتا انعام دیا جاتا اور اس بات پر زور دیا جاتا کہ مقابلے کا مقصد کسی دوسرے سے بازی لے جانا

نہیں ہے بلکہ خود اپنے سابقہ ریکارڈ کو توڑ کر نیا ریکارڈ قائم کرنا ہے اور اپنے آپ سے بازی لے جانا ہے۔

جہاں تک طلبار کے تربیتی پہلو کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ تعلیم کے میدان میں سیرت کی تعمیر کا کام سب سے زیادہ مشکل اور صبر آزما کام ہے اس کے لیے کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں ہے لفظی اور رسمی ہدایات اس راہ میں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتیں، اس کا اصل انحصار اتالیق کے کردار اور اس کی سوجھ بوجھ پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت جیسے اتالیق ہوتے ویسا ہی تربیت کا کام ہوتا اور معیار گھٹتا بڑھتا رہتا۔ انتظامی طلبے اس سلسلے میں کئی تجربے کیے گئے، شروع میں ہر دارالاقامہ میں ایک استاد اتالیق کے ساتھ ایک کل وقت اتالیق رکھنے کا تجربہ کیا گیا، جو زیادہ کامیاب نہیں ہوا، اس کے بعد کالج کے اچھے طلبار سے مددگار اتالیق کی حیثیت سے کام لینے کی کوشش کی گئی۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ ہر دارالاقامہ میں دعوت افطار اور سالانہ دعوت کا خاص اہتمام ہونے لگا۔ دعوت کے ساتھ طلبار جلسہ کرتے اور کوئی ہلکا پھلکا پروگرام بھی پیش کرتے۔

غرض اس دور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی رہنمائی میں مدرسے میں غیر معمولی تعلیمی کام ہوا اور خوب ہوا اور مدرسہ ابتدائی ایک نمونے کا کام کا مدرسہ (Activity School) بن گیا۔ مدرسہ میں جس نہج پر کام ہوا اور اس کے جو نتائج نکلے، استادوں نے جس اسپرٹ کا ثبوت دیا اور طلبار و اساتذہ میں محبت اور خلوص کا جو رشتہ پیدا ہوا وہ اپنی مثال آپ ہے، اگر اسی طرح کا کام اور تجربے کسی باہر کے ترقی یافتہ ملک میں ہوتے تو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ استادوں کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی ہوتی اور جو کام اور تجربے مفید سمجھے جاتے ان کو دوسرے اسکولوں میں بھی رائج کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن افسوس یہاں یہ ریت نہیں۔

عبداللہ ولی بخش قادری

استادوں کا مدرسہ

موجودہ چوتھے پنج سالہ قومی منصوبے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیمی اداروں کی پوری گنجائش کے مطابق وسعت دی جائے۔ ایک ترقی پذیر ملک کے لئے یہ ضروری ہے موجودہ وسائل کا کما حقہٗ استعمال کیا جائے اور جو تعلیمی سہولتیں میسّر ہوں اُن سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یہاں صرف اثاثے اور مادّی ساز و سامان مثلاً عمارت، فرنیچر، کتب خانہ، تجر وغیرہ کی ہی بات نہیں ہے بلکہ ادارے کے انسانی وسائل مثلاً عملہ، اساتذہ وغیرہ سے زیادہ زیادہ طلبہ کو مستفید کرانے کا معاملہ بھی ہے۔ تب ہی یہ ممکن ہے کہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی روز افزوں تشنگیٔ علم کو مناسب طور پر کسی قدر آسودہ کیا جا سکے۔ اِسی احساس کا اظہار تیسرے پنج سالہ قومی منصوبے کے دوران، اساتذہ کی تربیت کے سلسلے میں "جامع تربیتی ادارو (Comprehensive Training colleges) کے تصور کی صورت میں کیا جا چکا۔ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ایسے ادارے کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جہاں مختلف مدا اور نوعیتوں کے اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیا جا سکے۔ مثلاً نہ صرف ابتدائی اور ثانوی مدرسو کے لیے اساتذہ تیار کیے جائیں بلکہ مخصوص مہارتوں اور فنون مثلاً آرٹ اور حرفے کے اسا کو بھی درس و تدریس کے مسائل سے آشنا کیا جا سکے۔ ایسے اداروں میں تربیت کے تنوع کے علاوہ، طلبہ کی تعداد بھی عام تربیتی مدارس کے مقابلے میں کئی گنا ہو سکتی ہے۔ ماہرین تعلیم کی جس گ نے اِس تصور کو پیش کیا، اُسے ہمارے مدرسے میں اپنے خواب کی ایک تعبیر نظر آئی اور مخ

کے طور پر ہمارا نام لیا گیا۔ اس وقت ہمارے یہاں مندرجہ ذیل نصاب جاری ہیں:

۱۔ صداقت نامۂ معلمی (ڈپلوما آف بیسک ٹریننگ)

۲۔ جونیر ڈپلوما اِن ٹیچنگ آف آرٹ اینڈ کرافٹ

۳۔ سندِ معلمی (بی۔ ایڈ)

۴۔ بی۔ ایڈ (آرٹ)

۵۔ ایم۔ ایڈ

۶۔ پی۔ ایچ ڈی (ایجوکیشن)

پہلے نصاب کے ذریعے ابتدائی مدارس کے لیے اساتذہ تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ دوسالہ نصاب ہے، اس نصاب میں اصولِ تعلیم، تعلیمی نفسیات اور تدریس کے طریقوں سے آگاہ کرنے کے علاوہ، موادِ تعلیم یعنی مدرسے کے درسی مضامین کی واقفیت پر بھی پوری توجہ دی جاتی ہے تاکہ طلبہ مضامین اور درسِ مضامین دونوں اعتبار سے کافی استعداد حاصل کرسکیں۔ 'آرٹ' اور 'کرافٹ' کا دوسالہ 'ڈپلوما' حاصل کرنے کے بعد، طلبہ آٹھویں بلکہ دسویں جماعت تک 'آرٹ' اور 'کرافٹ' کی تعلیم دینے کے لائق تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہ نصاب اپنی آپ مثال ہے۔ اس کے ذریعے 'آرٹ' اور 'کرافٹ' کی نہ صرف مہارت بہم پہنچائی جاتی ہے بلکہ طلبہ کو 'اصولِ تعلیم'، تعلیمی نفسیات اور تدریس کے طور طریقوں سے بھی آشنا کیا جاتا ہے۔ 'آرٹ' اور 'کرافٹ' کے اساتذہ کی تربیت میں ہمارے مدرسے نے اس ملک میں پیش قدمی کی ہے۔ اس کے بعد "نیشنل کالج آف ایجوکیشن" کے نام سے ملک میں چار ادارے قائم کیے گئے۔ ہماری اِن کوششوں نے نہ صرف 'آرٹ' کے اساتذہ کا مقام بلند کیا ہے بلکہ دیس کے تعلیمی حلقوں میں اُن کی تربیت کی طرف کچھ نہ کچھ توجہ بھی دلائی ہے۔ سندِ معلمی کے نصاب کی مدت ایک سال ہے جو ثانوی مدارس کے لیے اساتذہ تیار کرتا ہے۔ بی۔ ایڈ (آرٹ) کا نصاب، سندِ معلمی کے نصاب کے مساوی، "آرٹ" کے اساتذہ تیار کرنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ یہ نصاب

بھی ایک نمونے کی حیثیت رکھتا ہے جو ثانوی مدارس میں 'آرٹ' کی تعلیم اور 'آرٹ' کے اساتذ
کی تربیت کے سلسلے میں ایک اہم اور جرأت مندانہ قدم کہلانے کا مستحق ہے۔ ایم۔ ایڈ۔
نصاب کو ایک سال کی مدت میں بھی پورا کیا جا سکتا ہے اور جزو وقتی نصاب کے طور پر اس کی تکمیل
دو سال میں بھی ہوتی ہے۔ اس نصاب کی تشکیل میں نہ صرف جدید تعلیمی میلانات کا خیال رکھا گ
ہے بلکہ 'آرٹ' اور 'کرافٹ' سے متعلق مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں جن کی طرف اس اعلیٰ تعلیم
پر ابھی تک ملک کے کسی اور ادارے میں توجہ نہیں دی گئی ہے۔ اگرچہ باضابطہ طور پر پی۔ ایچ۔ ڈ
کی ڈگری امسال شروع کی گئی ہے لیکن تعلیمی تحقیق کا کام ایک عرصے سے جاری ہے اور مدرسے میں
وقتاً فوقتاً تحقیقی کام کرنے کے لئے طلبہ کو داخل کیا جاتا رہا ہے۔

جامعہ کے جشن زریں کے موقعے پر اِس مدرسے کی عمر ۳۲ سال ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے
یہ ادارہ، جامعہ کی تاسیسی عمر سے ۱۸ سال چھوٹا ہے۔ لیکن اِس کا آغاز اِن محرکات کی دین ہے
جو جامعہ کے وجود کا باعث ہیں اور اس کی توسیع و ترقی میں وہی جذبہ اور حوصلہ کار فرما رہا ہے جو
جامعہ کا سرمایۂ حیات ہے۔ جامعہ، ملک کی آزادی کی تحریک کا ایک حصہ ہے۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات
رہنمایان قوم میں گاندھی جی، علی برادران، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے نام سرِفہرست
آتے ہیں جنھوں نے جامعہ کا پودا علی گڑھ میں لگایا۔ اس کی آبیاری کرنے والے نوجوان سرفروشوں
کے رہنما ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ ہمارا 'استادوں کا مدرسہ' ۱۹۳۸ء میں قائم ہوا۔ قومی تعلیم کی تاریخ
میں یہ زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ گاندھی جی نے ۱۹۳۷ء میں دیس کے سامنے 'بنیادی قومی
تعلیم' کا تصوّر پیش کیا اور 'ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی' نے اُن کے اس تصوّر کو تعلیمی اسکیم بنا دیا۔ دیس
کے اُن صوبوں میں 'بنیادی قومی تعلیم' شروع ہو رہی تھی جہاں کانگریس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ
ڈور آ گئی تھی، بنیادی مدرسوں کے لیے اساتذہ کی فراہمی کا مسئلہ درپیش تھا، اس فوری ضرورت
کو پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے دو جگہ انتظام ہوا۔ گاندھی جی کے سیوا گرام میں اور ذاکر
صاحب کی جامعہ میں۔ اس طرح ۱۹۳۸ء میں اس مدرسے کو گاندھی جی کی نیک خواہشات اور

ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی مالی امداد سے شروع کیا گیا۔

آغازِ کار کے وقت بے سروسامانی کا عالم تھا۔ نہ عمارت تھی، نہ کتابیں نہ دیگر وسائل اور نہ اساتذہ۔ لیکن شوق کی بلندی نے کسی بات کی پروا نہ کی رنجی عمارت میں کام شروع ہوا۔ جامعہ کے تجربہ کار معلمین نے اساتذہ کی نئی نسل تیار کرنے کی ذمہ داری قبول کی اور ذاکر صاحب نے اپنے وجود سے علمی قیادت کا دیا روشن کیا۔ وہ جرمن تعلیمی مفکر کرشنسٹائنر (Kerschensteiner) کے تعلیمی خیالات سے خاص طور پر متاثر تھے۔ مغربی ممالک میں 'ترقی پسند تعلیم' (Progressive Education) کی تحریک کا علم رکھتے تھے اور بنیادی تعلیم کے اَمین و مُعین کہلانے کا پورا حق بھی اُن ہی کو پہنچتا تھا۔ اُن کے زیرِ اثر جامعہ کے اس مدرسے میں حرفے کی تعلیم کا ایک ایسا تصور پروا چڑھا جو بنیادی تعلیم کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں حرفے کی تعلیمی حیثیت کو پورے طور پر اُبھارنے کی کوشش کی گئی۔ اسے اساتذہ کی تربیت کا لازمی جزو قرار دیا گیا اور شخصیت کی تعمیر میں اس کی اہمیت پورے طور پر تسلیم کی گئی لیکن اس کے ساتھ کسی قسم کی مذہبی عقیدت اور تجارتی منفعت کی آمیزش کو روا نہیں رکھا گیا۔ ذاکر صاحب شروع سے ہی ہاتھ کے کام کی عظمت کے معترف تھے اور جامعہ کے ابتدائی مدرسے میں چھوٹے چھوٹے مشاغل کی شکل میں بچوں کو کام کے ذریعے سیکھنے کے مواقع فراہم کیے جاتے رہے تھے۔ 'استادوں کا مدرسہ' آج بھی اپنی اِس خصوصیت کو برقرار رکھتا ہے۔ یہاں ابتدائی مدرسے اور ثانوی مدرسے کے لیے اساتذہ کی تیاری میں حرفے کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے اور جیسا اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ ایم۔ ایڈ کے نصاب میں بھی حرفے سے متعلق مضامین کی تعلیم کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔

شروع شروع میں "استادوں کا مدرسہ" میں صرف ایک ہی نصاب کا انتظام تھا۔ ۱۹۵۲ء میں ابتدائی اور ثانوی مدارس کے اساتذہ کے لیے الگ الگ نصاب جاری کیے گئے۔ ملک کی مختلف ریاستوں نے اپنے اساتذہ کو تربیت کے لیے یہاں بھیجا اور یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ نے اپنی اپنی ریاستوں میں بنیادی تعلیم کے اساتذہ کے مرکز قائم کرنے میں ہراول دستے کا کام

انجام دیا۔ اس طور چراغ سے چراغ روشن ہوتے رہے اور دیس کے مختلف حصوں میں بنیاد تعلیم کا کام مستحکم ہوگیا۔ اب ریاستوں کو ایسی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ لیک اساتذہ کی تیاری میں اس مدرسے کو قومی ذمہ داری کی ادائیگی میں شرف قبولیت بدستور حاص ہے۔ اب بھی امیدواروں کی تعداد ہر سال اتنی زائد ہوتی ہے کہ اوسطاً دس میں سے ایک کو داخلہ مل پاتا ہے۔

اس مدرسے میں شروع سے ہی مروجہ طریقہ امتحان کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا تعلیمی مقاصد کے حصول میں اسے رکاوٹ خیال کیا گیا۔ ایک سالانہ امتحان کے بجائے دوران سال میں طلبہ کی کارگزاری پر زور دیا گیا اور انھیں لگن کے ساتھ پوری مدت اپنے تعلیمی مشا میں معروف رہنے کی راہ دکھائی گئی۔ اب طریقہ امتحان میں اصلاح کا کام قومی پیمانے پر کیا جا ہے۔ استادوں کا مدرسہ اس باب میں اپنی مساعی پر اظہار اطمینان کرسکتا ہے کہ تعلیمی جائزے تصور کو ملک میں اپنایا جارہا ہے۔ اس وقت نظری مضامین میں دوران سال کی کارگزاری جانچ اور تفویض کا حصہ، سالانہ امتحان کے برابر ہے۔ اس منزل پر ابھی شاذ ہی ہمارے دیس ادارے آپائے ہیں۔ عملی مضامین میں سالانہ امتحان کو یک سر موقوف ہی کردیا گیا ہے۔ تعلیمی، تہذیبی اور تفریحی سب ہی مشاغل میں طلبہ کی کارگزاری کو ان کے تعلیمی جائزے کا لاز جزو قرار دے دیا گیا ہے۔

استادوں کا مدرسہ، اردو کے ذریعہ تعلیم دینے والے اساتذہ کی تربیت کا خصوصیت کے ساتھ اہتمام کرتا ہے، ایسے طلبہ کے لیے نشستوں کا تحفظ کیا گیا ہے۔ مزید برآں اردو کا تدریس کا باضابطہ انتظام ہے اور غیر اردو داں طلبہ کو ابتدائی اردو سکھانے کا بندوبست ک جاتا ہے۔ طلبہ، امتحانات میں اپنے جوابات اردو میں لکھ سکتے ہیں، لیکن یہ ادارہ زبان کے استبداد سے پاک ہے، مادری زبان کا فرق طلبہ کی کسی تفریق کا باعث نہیں ہے۔ یہاں بلا امتیا زبان و مذہب طلبہ آتے ہیں، اساتذہ کا بھی یہی حال ہے۔ روز بروز طالبات کی تعدا

بڑھتی جارہی ہے۔ آج کل ان کا حصّہ نصف سے زائد ہے۔ طلبہ کے لیے اقامتی زندگی لازمی ہے۔ طالبات کے لیے اگرچہ اقامت گاہ کا انتظام ہے لیکن انھیں اپنے گھر پر رہنے کی سہولت بھی حاصل ہے۔ اس وقت مدرسے کے مختلف نصابوں میں طلبہ کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ مدرسہ ایک "جامع تربیتی ادارے" کا ایک مختصر نمونہ پیش کرتا ہے۔ فی الحال طلبہ کی تعداد کے لحاظ سے اس کا دامن وسیع نہیں ہے، لیکن اسے کسی وقت بھی خاطر خواہ طور پر پھیلایا جا سکتا ہے۔ تعداد کے اضافے کے علاوہ، نئے نئے نصاب تعلیم بآسانی جاری کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً تین برس سے چھ برس تک کے بچوں کی تربیت کرنے والی استانیوں کی تیاری یا جسمانی تعلیم کے اساتذہ کی تربیت۔ قومی نظام تعلیم میں جس وقت "جامع تربیتی ادارے" قائم کرنے کے لئے قدم بڑھایا جائے گا، ہمارے اس چھوٹے سے تجربے اور نمونے سے مثال کا کام بخوبی لیا جا سکے گا اور جب بھی ملک کی ضروریات متقاضی ہوں گی، بلا دقت اور بلا زحمت اس نمونے کو پورے پیمانے پر پہنچایا جا سکے گا۔

بالک ماتا سنٹر

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ نے ۱۹۵۲ء میں مٹیا محل دہلی کے علاقے میں غریب اور متوسط طبقے کے بچوں کے لیے ایک نئی اسکیم کے تحت بالک ماتا سنٹر کی بنیاد ڈالی۔ اس کا مقصد صرف بچوں کے لیے نرسری اسکول قائم کرنا ہی نہ تھا بلکہ یہ بھی تھا کہ اس تصور کو بچوں کے گھروں تک بھی پہنچایا جائے اور بچوں کے وسیلے سے ان کی ماؤں کی بھی تربیت کی جائے۔ یہ تجربہ اتنا کامیاب ہوا کہ دلی کے مختلف علاقوں میں اور سنٹر قائم ہوئے اور اس وقت تین سنٹر کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

ہمارا طریق کار اس لحاظ سے دوسروں سے مختلف ہے کہ ہم اپنی نرسریوں میں اتنا قیمتی ساز و سامان نہیں رکھتے جو اس طبقے کی معاشی حالت کے مطابق نہیں ہے، تاکہ بچہ نرسری میں آکر اجنبیت محسوس نہ کرے۔ ہمارا مقصد در اصل یہ ہے کہ غریب اور متوسط گھرانوں میں ان ذرائع کا بہتر استعمال سکھایا جائے جو ان کے پاس اس وقت موجود ہیں۔ ان نرسریوں کی استانیاں اکثر ان بچوں کے گھروں پر جاتی ہیں اور ان کے حالات اور خاندان کے مختلف ممبروں کے باہمی تعلقات سے واقفیت حاصل کرتی ہیں اور ان کی ماؤں اور بڑی بہنوں کو خصوصیت کے ساتھ سنٹر آنے کی دعوت دیتی ہیں اور بچوں کے مزاج کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں، انھیں بتاتی ہیں کہ ان کے بچوں کی مخصوص عادتوں کے اسباب کیا ہیں اور کس طرح وہ اپنے بچوں کی بہتر طور پر دیکھ بھال کریں۔ عام طور پر غریب اور متوسط طبقے کی ماؤں کے لئے اس قسم کے مشوروں کی بہت ضرورت ہوتی ہے، خصوصاً غذا، حفظانِ صحت اور جذباتی معاملات میں اس قسم کی مدد اور مشورے اور زیادہ ضروری ہیں۔

مشیر فاطمہ

نرسری اسکول

جامعہ کے قیام کے پورے ۲۵ سال بعد جامعہ میں نرسری اسکول کھلا۔ ذاکر صاحب جہاں جرمنی کی پرائمری ایجوکیشن (ابتدائی تعلیم) سے بہت متاثر تھے وہاں وہ جرمن کنڈر گارٹن کے بھی بڑے مداح تھے۔ مس گرڈا فلپسبورن (جرمن آپا جان) نے یہ کام شروع کر دیا تھا۔ اول جماعت کی تعلیم و تربیت کے لئے وہ فروبل اور مونٹوسری کا سامان استعمال کرتی تھیں۔ جشن سیمیں کے موقع پر کنڈر گارٹن کے قیام اور اس کی عمارت کی بھی تجویز تھی۔ لیکن سیاسی حالات کے نشیب و فراز کی وجہ سے اس منصوبے کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔

۱۹۵۲ء میں جب میں ڈپلوما کرنے کے لیے لندن جا رہی تھی تو پروفیسر محمد مجیب صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ لندن کے کنڈر گارٹن اور ان کی اقامت گاہوں کا اچھی طرح سے مطالعہ کرنا تاکہ جامعہ میں اس کام کو شروع کیا جا سکے۔

میں نے دسمبر ۱۹۴۵ء میں مونٹوسری کی آل انڈیا کانفرنس میں شرکت کی تھی اور مارچ سے جولائی ۱۹۴۶ء میں میڈم مونٹوسری کی قیادت میں ٹیچرز ٹریننگ حاصل کی۔ اس وجہ سے مجھے چھوٹے بچوں کی تعلیم سے بہت دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس ٹریننگ سے جب واپس آئی تو مجھے مجیب صاحب سے پہلی بار ملنے کا موقع ملا۔ موصوف نے میڈم مونٹوسری اور ان کے طریقۂ تعلیم سے متعلق کئی دلچسپ سوالات کئے۔ مجیب صاحب ان پر اعتراض کرتے اور میں اپنی محبوب استاد کی حمایت کرتی۔ اس وقت میں جامعہ میں کام نہیں کرتی تھی لیکن جامعہ میں کام کرنے کے لئے یہ میرا پہلا

اور آخری انٹرویو تھا۔

اس زمانے میں بنیادی تعلیم کے حامی میڈم مونٹوسری پر بہت اعتراض کر رہے تھے اور میڈم مونٹوسری اور ان کے حامیوں کی خواہش تھی کہ آزاد ہندوستان میں بنیادی تعلیم کے ساتھ ابتدائی سے پہلے کی تعلیم میں مونٹوسری طریقۂ تعلیم رائج کیا جائے۔ لیکن ذاکر صاحب چونکہ Progressive education کے قائل تھے اس لئے مونٹوسری طریقہ تعلیم کو پسند نہیں کرتے تھے۔

لندن میں ڈپلوما کرنے کے بعد میں نے دو مہینے تک وہاں کے نرسری اسکولوں کا اس طرح مشاہدہ کیا کہ ایک یا دو ہفتے کے لئے کسی نرسری اسکول میں مددگار کی حیثیت سے کام کرتی۔ اس طرح مجھے اسکول کے طریقۂ تعلیم، پروگرام اور تعلیمی سامان سے متعلق معلومات ہوگئیں۔

۱۹۵۵ء میں مجلس تعلیمی نے نرسری اسکول کھولنے کی منظوری دے دی۔ عمارت کے لئے ایک دو کمروں کا مکان اور اس کے سامنے کی بیلے کی کیاریاں دی گئیں۔ اسٹاف میں ایک نگراں ایک استانی، ایک چپراسی ایک جز وقتی مہتر۔ اور تعلیمی سامان کے لئے پانچ سو روپے منظور ہوئے۔ عمارت کو ٹھیک کرانے اور اس کے ساتھ لان وغیرہ بنوانے کی ذمہ داری شعبہ تعمیر کی تھی۔

اس طرح ۱۶ر اگست ۵۵ء کو نرسری اسکول میں داخلے شروع ہوگئے۔ آصفہ خاتون کا دوسری استانی کی حیثیت سے تقرر ہوگیا اور چپراسی باغبانی کی دیکھ بھال بھی کرتا۔ اس وقت اسکول کی حالت کو دیکھ کر شاید کوئی یہ نہ کہتا کہ پندرہ سال بعد جامعہ نرسری اسکول کا دہلی کے بہترین اسکولوں میں شمار ہوگا اور دہلی اور باہر کے اکثر اسکول اس کے طریقۂ تعلیم اور تعلیمی سامان اپنانے کی کوشش کریں گے۔ سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ نے ملک کی پائلٹ (Pilot) بالواڑی کے لئے نرسری اسکول کے تعلیمی سامان کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے، اس کامیابی کے لئے نرسری اسکول کے کارکنان سے زیادہ ہمارے شیخ الجامعہ جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب

مبارکباد کے مستحق ہیں۔ موصوف نے ہم کو کام کرنے کی آزادی دی تھی اور کام کو بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن مدد کی۔

جامعہ نرسری اسکول کا مقصد بچے کی جسمانی، ذہنی، سماجی اور جذباتی نشوونما میں مدد کرنا اور ابتدائی مدرسہ کی باقاعدہ تعلیم کے لئے تیار کرنا ہے۔ جامعہ میں کام کرنے والوں کو اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنا طریقہ کار خود متعین کریں۔ جامعہ کے کچھ بنیادی اصول ہیں جن کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ یہاں روایتی طریقۂ تعلیم کے بجائے ترقی پسند طریقۂ تعلیم کو رائج کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اسی لئے نرسری اسکول میں مونٹوسری یا فروبل کے طریقۂ تعلیم کو رائج کرنے کے بجائے بچے کی ضرورتوں اور کھیلوں پر مبنی طریقۂ تعلیم کو رائج کیا گیا۔ بچے کی کیا ضروریات ہیں؟ بچے کو گھر کے محفوظ ماحول سے نکل کر اسکول کے آزاد ماحول میں داخل ہونا ہے، اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے، اپنی ضروریات آپ پوری کرنی ہیں۔ تین سال کا بچہ جسے ابھی دوڑنا بھاگنا نہیں آتا، اپنی ضروریات کا اندازہ نہیں کرسکتا، جو اپنی بات پوری طرح سے کہہ نہیں سکتا دوسروں کی بات سمجھ نہیں سکتا، اس بچے کو نرسری اسکول کے تین سال میں اس قابل ہونا ہے کہ وہ اکیلے اسکول آجائے۔ دوسروں کی بات سمجھ سکے، اپنی بات کہہ سکے، جو زبان وہ ابھی بولنا نہیں جانتا اسے لکھ پڑھ سکے، گنتی گن سکے، حساب لگا سکے۔

اس عمر میں بچے کی جسمانی نشوونما میں مدد کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ بچے کے بڑھتے ہوئے جسم کے لئے کھلی اور آزاد فضا کی ضرورت ہے جہاں وہ بھاگ دوڑ سکے، اتر چڑھ سکے، کود پھاند سکے۔ اسکول میں سائیکل اور گاڑیاں چلانے کے لئے پکا فرش ہے، چڑھنے اترنے اور پھسلنے کے لئے درختوں کے سائے میں سلائیڈ اور ریت ہے، بڑے لان میں جھولے، جنگل جم، مختلف قسم کے پائپ کے فریم ہیں جن پر بچے چڑھتے ہیں، کرتب دکھاتے ہیں اور کودتے ہیں، اس طرح ان کو اپنے ہاتھ پیر استعمال کرنے اور ان پر قابو پانے کا موقعہ ملتا ہے۔

مختلف قسم اور سائز کے لکڑی کے بلاکس ہیں جن سے بچے طرح طرح کی چیزیں [illegible] تعلیمی سرا[illegible]

کا بچہ دو تین بلاکس ایک دوسرے پر رکھ لیتا ہے۔ کوئی قطب مینار بناتا ہے، کوئی انڈیا گیٹ، ...
کے کمرے، غسل خانے، پاخانے اور چبوترے بنتے ہیں۔ چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں بنتی ہیں
بلاکس کو رکھنے اور اٹھانے میں اپنی انگلیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ سیڑھیاں بنانے کے لئے
ایک سے دس تک گنتی گنتے ہیں۔ گیٹ بنانے کے لئے دو اور دو چار گٹوں کی ضرورت ہے
سڑک بناتے ہیں جو اوکھلے سے فوارے جاتی ہے۔ راستے میں اوکھلا موڑ، ریل کا پل، د
گیٹ اور فوارے کے بس اسٹاپ ہیں۔ سڑک کے کنارے ہولی فیملی، جامع مسجد اور لال
ہے، چوراہے پر پولیس ہے، ٹریفک لائٹ ہے، لال لائٹ پر سب سواریاں رک جاتی ہیں
گڑیا کے کمرے میں گھر کے سامان کی مختلف چیزیں ہیں۔ اماں کا پلنگ ہے، بچے کا جھولا
سنگار میز ہے، ابا کے پڑھنے کی میز کرسی ہے، باورچی خانے کی الماری ہے، کھانا پکانے کے برتن
چائے کا سیٹ ہے، گھر گھر کھیل ہوتا ہے، اماں کھانا پکاتی ہیں، ابا سامان لاتے ہیں، چھوٹا بھیا بیمار
ہے تو بڑی بہن اُسے کھلاتی ہے، عید کی تیاری ہوتی ہے، گھر صاف کیا جاتا ہے، سب کے لئے
نئے کپڑے بنتے ہیں، لوگ ملنے آتے ہیں تو ان کو مٹھائی کھلائی جاتی ہے۔ کبھی گڑیا گڈے کی شا
ہوتی ہے، چھیم چھیم بارات آتی ہے، لڑکیاں سہرا گاتی ہیں، لڑکے باجا بجاتے ہیں۔ کبھی گڑ
بیمار ہو جاتی ہے تو ڈاکٹر آلہ لگا کر آتا ہے، نرس انجکشن لگاتی ہے، اماں دوا پلاتی ہیں۔
سب بچوں کے بے معنی کھیل نہیں ہیں، بچہ تو اسی سے سیکھتا ہے، اپنے ماحول کو سمجھتا ہے، ا
جذبات پر قابو پاتا ہے، وہ آپس میں بات چیت کر کے نئے الفاظ سیکھتے ہیں، ان کے معنی
سمجھتے ہیں اور ان کو موقع سے استعمال کرتے ہیں۔ اسی ذخیرۂ الفاظ سے وہ اپنی اول جماعت
کی کتاب کو سمجھ کر پڑھ سکیں گے اپنی بات ساتھیوں اور استاد کو سمجھا سکیں گے۔

بچوں کو آرٹ اور کرافٹ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے وہ ہفتے کے ہر روز نئی چیز بناتے
ہیں، پنسل سے ڈرائنگ بناتے ہیں، برش اور انگلیوں سے پینٹنگ کرتے ہیں، لکڑی کے
چھاپے سے چھاپتے ہیں، رنگ برنگ کے کاغذ کے ٹکڑوں، اسپنج کے پھولوں، ٹین کے

ستاروں، اون اور لچکے کے بیکار ٹکڑوں سے طرح طرح کی چیزیں بناتے ہیں۔

کہانیاں سنتے ہیں، گانا گاتے ہیں۔ لہنگے، دوپٹے، کوٹ اور ٹوپیاں پہن کر ان کہانیوں اور گانوں کے ڈرامے کرتے ہیں۔ بچوں کے کھیل ان کی زندگی ہے۔ دنیا اور مافیہا سے بے خبر اپنے آپ میں مست نئے نئے کھیل کھیلتے ہیں۔ ان کو کھیل کی آزادی ملنا ان کے لئے سب سے بڑی نعمت ہے۔ ان کے شوق کے مطابق ان کو کھیل کا موقعہ فراہم کرنا نرسری اسکول کا فرض ہے۔ یہ بے فکری کا زمانہ پھر لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ہم ان کو گنتی کے چکر اور اردو کتابوں کے بوجھ سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

پستالوزی نے کہا تھا کہ آپ کا بچہ سیپ کا موتی ہے، موتی بننے کے بعد وہ خود باہر آجائے گا۔ آپ اس کے موتی بننے کا انتظار کیجئے۔

شعبۂ انجینرنگ

۱۹۵۶ء میں حکومت ہند نے ملک کے مختلف حصوں میں ۱۴ رورل انسٹی ٹیوٹ قائم کئے، ان میں سے ایک جامعہ ملیہ کے حصے میں آیا۔ اس میں دو قسم کے نصاب جاری کئے گئے، ایک سول انجینئرنگ کا سہ سالہ نصاب اور دوسرا رورل سروسز کا سہ سالہ نصاب۔ ان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد جو ڈپلوما دیا جاتا ہے، ان کی حیثیت وہی ہے، جو مختلف اسٹیٹ بورڈ کی طرف سے دئے جاتے ہیں۔ انجینرنگ کے نصاب میں رورل کے جزو کو برقرار رکھا گیا ہے اور چند مخصوص مضامین کا اضافہ بھی کیا گیا ہے، جو ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر اہم اور ضروری ہیں۔

شعبۂ انجینرنگ کا صرف انتظام جامعہ ملیہ کے ہاتھ میں تھا، ملک کے دوسرے رورل انسٹی ٹیوٹ کی طرح، مالی اور تعلیمی نگرانی آل انڈیا نیشنل کونسل فار رورل ہائر ایجوکیشن (وزارت تعلیمات) کے سپرد تھی، مگر یہ شعبہ مکمل طور پر جامعہ ملیہ سے ملا دیا گیا ہے اور اب جامعہ کا باقاعدہ شعبہ ہے، البتہ چونکہ اس کی تعلیم ٹکنیکل ہے، اس لیے بورڈ آف ٹکنیکل ایجوکیشن (دہلی) سے الحاق کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس صورت میں توقع ہے کہ اس شعبے میں مزید توسیع ہو سکے گی اور بعض دوسرے ٹکنیکل نصاب جاری کئے جاسکیں گے۔

اسکول آف سوشل ورک

رورل انسٹی ٹیوٹ کے دوسرے شعبے، رورل سروسز کا ڈپلوما کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا۔ شروع میں خیال تھا کہ ملک میں دیہی ڈیولپمنٹ کے جو کام ہو رہے ہیں، اس کے فارغ التحصیل طلبا اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے اور جو لوگ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہیں، ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ بھی پیش نہیں آئے گی، مگر بیشتر یونیورسٹیوں نے اس کے ڈپلوما کو تسلیم نہیں کیا اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ منسٹری نے ملازمتیں نہیں دیں، اس لیے جب رورل انسٹی ٹیوٹ کا وزارت تعلیمات سے تعلق باقی نہیں رہا اور وہ کلی طور پر جامعہ کے ہاتھ میں آ گیا تو ۱۹۶۷ء میں شعبۂ رورل سروسز کا نام بدل کر جامعہ اسکول آف سوشل ورک کر دیا گیا۔ اس میں سہ سالہ کورس جاری کیا گیا ہے اور سوشل ورک میں بی اے آنرز کی ڈگری دی جاتی ہے۔

اس ادارہ میں انڈر گریجویٹ طالب علموں کے لیے سماجی علوم کی بنیادی معلومات اور سوشل ورک کی نظری تعلیم کے علاوہ اس کے مواقع بھی فراہم کیے جاتے ہیں کہ وہ اپنے نظریاتی علم کو سماجی تعلقات کے میدان میں عملی طور پر آزما سکیں۔ اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ فارغ التحصیل طلبا کے لیے ترقی کے زیادہ سے زیادہ دروازے کھلے رہیں، ایک طرف ان کے سوشل ویلفیر کے اداروں میں ملازمت کے امکانات ہیں تو دوسری طرف وہ سوشل ویلفیر میں ایم اے بھی کر سکیں گے، اس کے علاوہ وہ سوشل سائنس کے کسی مضمون میں بھی ایم اے کرنے کے مستحق ہوں گے۔

سوشل ورک میں ایم اے کا نصاب تعلیم ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں میں رائج ہے،

مگر بی اے کی سطح پر ابھی تک سوشل ورک کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام نہیں ہے، جس کی وجہ سے سوشل ورک کے میدان میں درمیانی درجہ کی آسامیوں کے لیے مستند یافتہ کارکن نہیں ملتے۔ جامعہ کے اس ادارے سے ملک کی یہ ضرورت پوری ہو سکے گی۔

سماجی فلاح و بہبود کے کام اسی وقت صحیح طور پر انجام پا سکتے ہیں، جب صاحب صلاحیت نوجوان اس کام کی طرف متوجہ ہوں اور اس فن میں تربیت حاصل کریں۔ اس میں زیادہ سے زیادہ ہونہار طالب علموں کو شریک کرنے کے لیے ایک اسکیم تیار کی گئی ہے، اس اسکیم کے تحت محدود تعداد میں وظیفے دیے جا سکتے ہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ ہونہار ضرورت مند طلباء کو اس سے بڑا سہارا ملا ہے اور اس طرح ادارے میں ذہین طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔

امیر جامعہ

۱۔ پہلے امیر جامعہ ——— حکیم اجمل خاں ۱۹۲۰—۹۲۷

۲۔ دوسرے امیر جامعہ ——— ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۱۹۲۸—۱۹۳۶

۳۔ تیسرے امیر جامعہ ——— عبدالمجید خواجہ ۱۹۳۷—۱۹۶۲

۴۔ چوتھے امیر جامعہ ——— ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۶۳—۱۹۶۹

۵۔ پانچویں امیر جامعہ ——— چیف جسٹس محمد ہدایت اللہ ۱۹۶۹۔

(یہ دور ابھی جاری.

پہلے امیرِ جامعہ — حکیم اجمل خاں



۱۹۲۰ — ۱۹۲۷ء

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

پہلے امیر جامعہ ـــــ حکیم اجمل خاں

۱۹۲۰ء ـــــ ۱۹۲۷ء

گیارہ سال سے اوپر ہوتے ہیں[1]، علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا اور ہندوستانی تعلیم گاہوں میں طلبہ کی جو تقسیم "کھیلنے والوں" اور "پڑھنے والوں" میں کی گئی ہے، اس کے مطابق "پڑھنے والوں" میں تھا۔ صحت ظاہر ہے ہمیشہ خراب رہتی تھی۔ طب جدید کی توجہات جب کچھ مدد نہ کر سکیں تو خیال ہوا کہ یونانی علاج کرایا جائے اور یونانی علاج کے لیے اس کے سوا اور کوئی کیا مشورہ دیتا کہ اس فن کے امام بلکہ اس کے مسیحا کے پاس جاکر درماں طلبی کی جائے۔ حکیم صاحب (اس حکیم ملت کے لیے بس یہی لقب کافی تھا) کے پاس جانے کا ارادہ تو کر لیا، لیکن بتایا گیا کہ بے سفارش نہ جانا، بڑا دربار ہے، توجہ نہ ہوگی۔ تیاری میں کئی ہفتے گذر گئے، بالآخر میرے مخدوم بشیر الدین صاحب کو معلوم ہوا تو وہ خود اپنے ہمراہ مجھے دہلی لائے، مطب میں پہنچے، مریضوں کا ہجوم تھا، ۱۱-۱۲ بجے تک مطب ہوتا رہا، جب اٹھے تو مولوی بشیر الدین صاحب سے ملاقات ہوئی، انھیں سہ پہر کو چائے پر بلایا، میں بھی پہنچ گیا، لیکن کچھ اور لوگ بھی تھے، نبض دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرے روز مطب میں بلایا، پھر وہی اژدہام تھا، کوئی ۱۱ بجے نوبت آئی، نسخہ مل گیا اور میں علی گڑھ واپس آگیا۔ سفارش کے باوجود دو روز تک انتظار

---

[1] حکیم صاحب کے انتقال پر ۱۹۲۷ء میں یہ مضمون لکھا گیا۔ (اعظمی)

کرنے سے طبیعت بالکل مکدر نہ ہوئی، بلکہ مریضوں کی کثرت، ہر کونے ہر گوشے میں دردمان
کا ہجوم، مکان کے دروازے تک موٹر میں بیٹھنے کے بعد تک نبض دکھانے والوں کا ہاتھ،
یہ سب باتیں دیکھکر اس بڑے آدمی کی بڑائی دل میں اور بڑھتی تھی، لیکن یہی عظمت کہ بڑا
ہے، بڑوں ہی کا یہاں گذر ہے، بلا وسیلہ و سفارش حکیم صاحب سے علاج کرانا مشکل۔

لیکن گیارہ سال بعد جب جامعہ کے کاموں کی وجہ سے میں تقریبًا اپنا تمام وقت جو
سے بچتا تھا، اسی دربار میں گذارنے لگا تو معلوم ہوا کہ یہ خیال ٹھیک نہ تھا، سفارش والے
سب پیچھے رہتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ تنگ و تاریک گلیوں میں میں ساتھ گیا ہوں، کسی ٹو
مکان کے دروازے پر کھڑا رہا ہوں اور دنیا کا یہ سب سے بڑا طبیب، نوابوں کا نواب
بڑھیا کو دیکھنے اندر گیا ہے، جس کی عسرت کا یہ حال ہے کہ مجھ ہمراہی کے لیے بیٹھنے کی کوئی
نہیں نکل سکتی تھی، جب گھر سے نکلتے تو مسکراتے ہوئے کہتے کہ آپ کو بہت دیر ٹھہرنا

۱۷ دسمبر کی شب میں جب تین چار روز تک درد کی وجہ سے بستر پر لیٹے لیٹے مشکل سے
کر بیٹھے اور دوسرے روز صبح باوجود اس تکلیف کے بمبئی کے سفر کا قصد تھا تاکہ شاہ افغان
کی خدمت میں جامعہ کا ایڈریس پیش کر سکیں تو میں بھی پاس بیٹھا تھا۔ رات ہو چکی تھی، لیکن مریض
نسخے لے رہے تھے، جب سب جا چکے تو اپنے ایک شاگرد کو بلاکر فرمایا کہ کل کچھ لوگ نبض
آئے تھے اور آج صبح بھی انتظار کرتے رہے، میں نہ دیکھ سکا، بیچارے غریب لوگ ہیں
وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ بمبئی کی طرف سے آئے ہوں گے، ذرا جاکر قریب کے ہوٹلوں
تلاش کرو اور مل جائیں تو لے آؤ اور ان کے لیے بھی نسخہ تجویز کر دوں۔ یہ اور اس قسم
سیکڑوں واقعات اس وقت میرے ذہن میں ہیں، جو صاف ظاہر کرتے ہیں کہ یہ نواب، غر
لاوارثوں، بے وسیلوں کا عاشق تھا اور یہ خیال بالکل غلط تھا کہ اس کے دربار میں بے
رسائی نہیں۔

میں نے ان واقعات کا اس لئے ذکر کیا کہ حکیم صاحب کی عظمت اور بڑائی قریب۔

دیکھنے پر اور بڑھتی تھی اور دور سے دیکھنے والے جس وجہ سے انھیں بڑا سمجھتے تھے، قریب والے بالکل دوسری وجہ سے انھیں اس سے زیادہ بڑا جانتے تھے۔ بڑے لوگوں کو اپنی بڑائی قائم رکھنے کے لئے دنیا میں اکثر چھوٹوں سے الگ چھپا ہوا، کھنچا ہوا رہنا پڑتا ہے اور ٹھیک بھی ہے، قریب سے دیکھنے والے پر بہت سی وہ چھوٹی چھوٹی خامیاں ظاہر ہوجاتی ہیں جو دور والے کو نظر نہیں آتیں۔ حکیم اجمل خاں ان بڑوں میں تھے جو قریب سے اور بڑے ہوجاتے ہیں، دور سے دیکھنے والے جن کی عزت کرتے ہیں اور قریب سے دیکھنے والے جن پر عاشق ہوجاتے ہیں۔

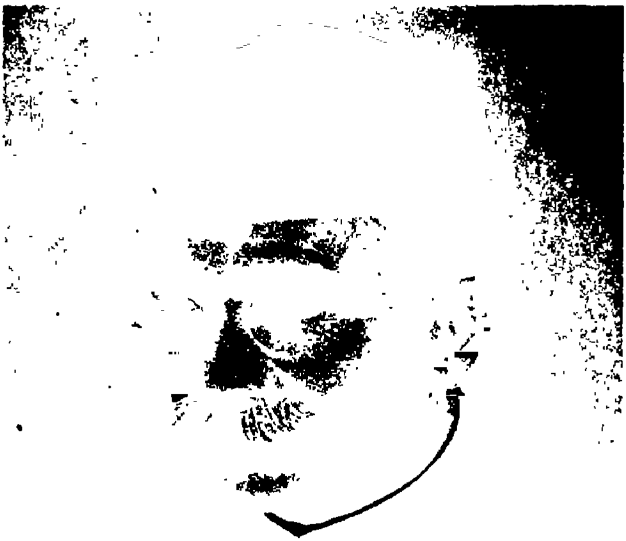
یہ نادر وصف صرف ان بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے جو صرف بڑے نہیں ہوتے بلکہ آدمی بھی ہوتے ہیں۔ یہ انسانیت کی صفت مرحوم میں جس درجہ موجود تھی میں نے اور کسی میں نہیں پائی۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھی جس کے ہر جزو میں وہ تناسب اور ہمواری تھی جو اگر کسی ایک جزو میں حاصل ہوجائے تو آدمی کو بڑا بنا دیتی ہے، جس تمدن میں انسان زندگی بسر کرتا ہے اس کے کسی ایک شعبے کا بھی کمال اگر اس کی ذات میں موجود ہو تو وہ اپنی جماعت کے لیے باعث فخر ہوتا ہے، لیکن یہ ایک ذات تھی جس میں ہندی اسلامی تمدن کے ہر شعبے کا کامل نمونہ موجود تھا، اور یہ بھی نہیں کہ جدید تمدن کے اچھے اثرات موجود نہ ہوں۔ قدیم تمدن کی گہرائی اور پختگی اور جدید کی بیداری اس ایک ذات میں آکر مل گئی تھیں اور افسوس کہ دوسروں میں اس اتحاد کو آنکھیں بے سود تلاش کرتی ہیں کہ پرانوں میں قدامت بے حسی و موت بن گئی ہے۔ نیوں میں جدت نے سطحیت اور اتھلے پن کی شکل اختیار کی ہے، پرانے تمدن کی جڑیں ہماری زندگیوں میں اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سخت چٹان پر پہنچ گئی ہیں جس سے وہ غذا حاصل نہیں کرسکتیں، ہمارے نئے تمدن کی مثال خوشنما پھولوں کے اس گلدستے کی سی ہے جو درخت سے توڑ لئے گئے ہیں اور اگرچہ ابھی بہت شاداب نظر آتے ہیں، لیکن ان میں جڑیں نہیں، اس لیے ان میں ثبات بھی نہیں۔

کے لیے سفارش کے خواہاں تھے، جنھیں کسی عزیز کی شادی کے لیے روپیہ درکار تھا، جس بیوہ کی روٹی مرحوم کی پوشیدہ توجہ سے چلتی تھی، جس یتیم کی تعلیم کے لیے اس کے خزانے سے روپیہ آتا تھا اور اس کی تعداد سیکڑوں ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہے تو افسوس ہزار افسوس کہ اُن سے اجمل خاں ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے، لیکن طب قدیم کا مجدد اور مسیحا، معاشرتی اصلاح و مذہبی رواداری کا علم بردار، قومی تعلیم کا راہ نما اجمل خاں زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ اجمل خاں جو ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا[1]، اتنا بڑا تھا کہ زمانہ اب مشکل سے اُس کی مثال پیدا کر سکے گا، لیکن اجمل خاں زندہ ہے، وہ اس سے بھی کہیں بڑا ہے اور آج لوگ اس کی بڑائی کا اندازہ بھی مشکل سے کر سکتے ہیں۔

---

[1] ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کی صبح کو ۲ بجکر ۵ امنٹ پر انتقال فرمایا۔ (اعظمی)

دوسرے امیر جامعہ ـــ ڈاکٹر مختار احمد انصاری



۱۹۲۸ ـــ ۱۹۳۶ء

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

دوسرے امیر جامعہ — ڈاکٹر مختار احمد انصاری

۱۹۲۸ء —— ۱۹۳۶ء

کل رات کو کوئی ڈیڑھ بجے ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ابھی پرسوں کسی کام سے مسوری تشریف لے گئے تھے، وہاں سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں دل کی حرکت بند ہوگئی اور یہ بے شمار کاموں اور ان گنت قدر دانوں کو، اس دلیس کو جس کی خدمت میں ساری عمر گذار کر ان کا برا ہی سنا، ان ہندو مسلمانوں کو جن میں میل ملاپ اور محبت پیدا کرنے کے لیے خون پسینہ ایک کیا، ان مریضوں کو جن کی آخری امیدوں کا سہارا ان کا مطب تھا، اس جامعہ ملیہ کو جس کے بچوں کو دیکھ کر ان کا خون چلوؤں بڑھتا تھا، ور جن سے انھیں یہ امید تھی کہ ان کی زندگی میں وہ آرزوئیں پوری ہوسکیں گی جو اس وقت بس ارمان ہی ارمان ہیں؛ ہاں گھر بار کو، بال بچوں کو، عزیزوں کو، دوستوں کو، سب کو چھوڑ کر نہ جانے جی میں کیا آئی کہ آدھی رات گئے اس راہ پر چل پڑے جس پر چلنے والے پھر منہ موڑ کر نہیں دیکھتے۔ ان کی زندگی کا چراغ گل ہونے سے ایک ان کے اپنے گھر میں اندھیرا نہیں ہوا، اس دلیس کے ہر بچے کے دل میں اس غم کی اندھیاری چھائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات فیض کا ایک چشمہ تھی اور یہ اپنے پرائے سب کے لیے بہتا تھا، ان کی شخصیت ایک سہارا تھی جو وقت پڑے سب کے

لے ۱۰ رمئی ۱۹۳۶ء (اعظمی)

کام آتا تھا، ان کا دل ایک ٹھکانا تھا جہاں پہ دکھی دل کو پناہ ملتی تھی ۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جس دن سے دنیا کے میدان عمل میں قدم رکھا ان کی شخصیت نے سب کا من موہ لیا، اس لیے کہ وہ نیک تھے، سچے تھے، مخلص تھے، فیاض تھے، ساتھیوں کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم جانتے تھے۔ اس سے پہلے کہ ان کی سیاسی خدمات انھیں مشہور کریں، ہزاروں آدمی انھیں اپنا سمجھنے لگے تھے۔ ان کی سوجھ بوجھ، تدبر، خلوص اور ایثار نے بہتیروں کو ان کا گرویدہ بنایا، لیکن ان کی محبت اور ہمدردی نے کہیں زیادہ .... لوگوں پر اپنا جادو کیا۔ اس وقت ان سب کی نظروں میں ان کی پریم بھری آنکھیں، ان کا مسکراتا ہوا چہرہ پھر رہا ہوگا اور ان کی محبت کی یاد سے دل میں رہ رہ کر درد اٹھتا ہوگا۔ پھر سوچئے کہ اس سانحہ سے ان لوگوں کے دلوں پر کیسی چوٹ لگی ہوگی جو ڈاکٹر صاحب کے خاندان یا جامعہ ملیہ کے بچوں اور استادوں کی طرح خاص ان کے سایہ میں رہتے تھے۔ موت کی گھڑی سب کے لیے آتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب تو ابھی چھپن سال کے تھے، ان کے لیے تو وہ زمانہ آرہا تھا کہ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کو پھلتے پھولتے دیکھتے اور جب وہ نہ ٹلنے والی گھڑی آتی تو انھیں کچھ نصیحت، کچھ وصیت کرکے اطمینان سے آنکھیں موند لیتے۔ پر یہ سب خدا کو منظور نہ تھا اور ہوتا تو وہی ہے جو اسے منظور ہو۔ وہ اکیلے چل دئے اور ہمیں اکیلا چھوڑ گئے ۔

ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی میں سچ پوچھئے تو ان کے خاندان کی روایتوں کا رنگ جھلکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے وطن یوسف پور کے انصار حضرت ایوب انصاری کی اولاد ہیں جن کے گھر مکہ سے مدینہ ہجرت کرکے قافلے کے سردار نے جاکر قیام فرمایا تھا۔ اس وقت جب مخالف اس کی حق کی پکار کو اپنے شور سے دبا دینا اور اس کی تعلیم کے چراغ کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے تھے، پر جس کی للکار سے سوتی دنیا چونک اٹھی اور دکھیا انسانیت نے بڑی ہی راحت پائی، اسی وقت سے سچائی کی مدد، مہماں نوازی، فیاضی اس خاندان کا حصہ رہا ہے۔ ڈاکٹر

صاحب ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تو ان کے خاندان کا ستارہ ذرا گردش میں تھا لیکن بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں بلندی کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۸۸۷ء میں جب انھوں نے اپنے وطن کا مڈل اسکول چھوڑا اس وقت تک جب وہ انگلستان میں تعلیم سے فارغ ہوکر ہندوستان واپس آئے یہ اپنی محنت اور ذہانت سے ہمیشہ تعلیمی وظیفے حاصل کرتے رہے اور ان وظیفوں سے اکثر چھپ چھپ کر اپنے کسی عزیز کو تعلیم دلاتے رہے۔ کامیابی کے ساتھ ساتھ ان کا یہ مبارک شوق بھی بڑھتا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں جب انھوں نے دہلی میں فتحپوری پر اپنا مطلب کھولا تو ان کی غیر معمولی طبی لیاقت کے ساتھ ان کی مہمان نوازی اور دریا دلی بھی مشہور ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ٹرکش میڈیکل مشن کی رہبری کے لیے اپنی پریکٹس چھوڑ دی، گھر میں جو کچھ بک سکتا تھا بیچ ڈالا اور زخمی ترکوں کی مرہم پٹی کرنے کے لئے روانہ ہو گئے وہاں سے واپس ہوئے تو خالی ہاتھ۔ پھر پریکٹس شروع کی۔ ذرا اطمینان ہو چلا تھا کہ خلافت کی تحریک شروع ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے پھر اپنا وقت اور روپیہ قوم پر نثار کر ڈالا۔ ۱۹۲۰ء میں جب وہ خلافت کا ڈیپوٹیشن لے کر انگلستان گئے تو موٹر بیچ کر، جب واپس آئے تو ملک میں ایک تہلکہ تھا، اس وقت کوئی خدمت ایسی نہ تھی جسے انجام دینے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم جھجکے ہوں، وہ کونسا دن تھا جو اس سر میں نہ تھا، نہ دن چین سے گذرتے تھے اور نہ راتیں، ان کا حوصلہ تھا کہ بڑھتا جاتا تھا اور ہمت تھی کہ مہمیز لگائے جاتی تھی۔

۱۹۲۲ء کے بعد ملک میں کچھ سکون سا تھا پر اس سکون میں وہ کچھ اور بے چین تھے، کیونکہ مسلمانوں میں میل جسے وہ جان سے عزیز رکھتے تھے اس وقت فنا ہوتا نظر آتا تھا اور وطن کے دو لنوں بیٹوں میں پریم اور محبت کا رشتہ قائم کرنے کی خاطر کم لوگ ہیں جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طرح اپنی عزت، شہرت، اپنے سکھ اپنے چین کو داؤں پر لگایا ہو۔ اس پاک کوشش میں انھیں جو دکھ پہنچے، ان کا ذکر اس وقت کیا کروں، انھوں نے اس پاک طینت، نیک نفس انسان کا دل چھلنی کر دیا تھا۔ آج جب وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا، ہم سب کو

ہندو مسلمانوں کو اس پاک کوشش میں اس کی ناکامی پر شرم سے سر اٹھانے کا موقع نہیں ہے اور اس شرم کو بس آنسوؤں کی دو بوندیں نہیں دھو سکتیں، اس کے لئے ساری عمر اسی کام میں سر کا پسینہ ایڑیوں تک بہانا ہوگا جب بھی شاید نہ دھلے گی۔ اس کام کی خاطر، ہاں جاننے والے جانتے ہیں کہ اسی کام کی خاطر انھوں نے اپنی تمام پریشانیوں اور دشواریوں کو بھلا کر کانگریس کی صدارت ۱۹۲۷ میں منظور کر لی، اسی کی خاطر جامعہ ملیہ کے کمزور پودے کی آبیاری اپنے ذمہ لی[1]، اسی لیے کہ ملک کا رنگ اور ملک والوں کے ڈھنگ دیکھ کر ان کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ نئے ہندوستان کے لیے نئے آدمیوں کی ضرورت ہے، ایسے آدمیوں کی جو اپنی اچھی چیزوں پر بھروسہ رکھیں، انھیں برتیں، انھیں ترقی دیں؛ تاکہ دوسروں کی اچھی باتوں کو سمجھیں اور ان کی عزت کریں، خود مضبوط ہوں اور دوسروں کی مضبوطی سے ڈریں نہیں، مانگیں ہی نہیں دینے کو کچھ رکھتے ہوں اور دینے کی کچھ ہمت بھی رکھتے ہوں۔ مسلمانوں میں ایسے آدمی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی امیدیں اس تعلیم گاہ سے باندھی تھیں اور اس کی ترقی کو وہ ملک کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔ آج سہ پہر کے وقت جامعہ ملیہ والوں نے اپنے سرپرست کو اپنی نئی بستی کے پہلو میں جا کر دفنایا ہے۔ خدا انھیں توفیق دے کہ وہ اس آرزو کو بھی پورا کر سکیں جو ڈاکٹر صاحب کا دکھا ہوا زخمی دل اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اب اس مدرسے کے بچوں کے سر پر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ نہ پھرے گا، اس کے کام کرنے والوں سے کوئی آ آ کر شرما شرما کر یہ نہ کہے گا کہ وہ تمہارے لیے کچھ کام نہیں کر سکا، تم سے آنکھیں ملانے کی مجھ میں ہمت نہیں، وہ اپنے لڑکپن میں اب کس سے روٹھیں گے اور کون انھیں آ کر منائے گا۔ ہاں کوئی نہیں پر اس کے دکھی دل کا دکھ ہمیں یاد رہے گا اور ہم میں کچھ ہے تو ہم سے کرائے گا بھی۔ ہمارا کام بڑھے گا، پھیلے گا، ہمیں ہزاروں دولتیں ملیں گی پر ڈاکٹر انصاری کا سا دل نہیں ملے گا۔

---

[1] ۲۹ اپریل ۱۹۲۸ء کو ڈاکٹر صاحب جامعہ کی مجلس امناء کے صدر منتخب ہوئے۔ (اعظمی)

تیسرے امیر جامعہ ـــــ عبدالمجید خواجہ



۱۹۳۷ ـــــ ۱۹۶۲ء

عبداللطیف اعظمی

تیسرے امیر جامعہ ـــــ عبدالمجید خواجہ

۱۹۳۷ء ـــــ ۱۹۶۲ء

امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ صاحب کے انتقال کی منحوس خبر ۲؍دسمبر (۱۹۶۲ء) کو موصول ہوئی، اس وقت جامعہ کے تمام ادارے بند ہو گئے اور ہر طرف رنج و غم کی فضا چھا گئی۔

خواجہ صاحب کا جامعہ سے تعلق روز اول سے رہا ہے، مشکل اوقات میں اس کو ہمیشہ اور ہر طرح کا سہارا دیا اور خون دل سے اس کی آبیاری کی۔ اگرچہ جامعہ کے بانیوں میں ان کا شمار نہیں ہوتا، مگر ان کی خدمات بانیوں سے کم نہیں ہیں۔ مرحوم دوسرے شیخ الجامعہ تھے، جن کا مولانا محمد علی مرحوم کے بعد ۲۹؍اپریل ۱۹۲۱ء کو انتخاب ہوا اور پہلے شخص ہیں جنھوں نے جامعہ کو سیاست کی ڈگر سے ہٹاکر تعلیم کی شاہراہ پر ڈالا۔ ان کے دور میں نازک سے نازک وقت آیا، مگر ہراساں اور مایوس ہو کر اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش نہیں ہوئے اور اس وقت تک جامعہ کو کسی نہ کسی طرح چلاتے رہے۔ جب تک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ان کے دو ساتھی ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب جامعہ نہیں آگئے۔ ۵؍مارچ ۱۹۲۶ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ منتخب ہوئے، تو خواجہ صاحب کو جامعہ کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ اب جامعہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے، جو اس کو کبھی بند ہونے نہیں دیں گے۔ خواجہ صاحب اکثر فخر اور غرور کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ میں جامعہ کو ایسے جاں نثار خدمت گذاروں کے ہاتھوں میں دے کر الگ

ہوا، جو جامعہ کو بہتر طور پر چلا سکتے تھے اور جو تعلیم کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار تھے
زمانے نے ثابت کر دیا کہ خواجہ صاحب کا خیال کس قدر صحیح تھا۔

خواجہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کی مجھے عزت نصیب ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا،
کے خلاف کچھ شورش پسندوں نے مختلف اخبارات میں مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ یہ لوگ
خواجہ صاحب سے ملتے، ان کو خط لکھتے اور طرح طرح کی باتیں پہنچاتے۔ خواجہ صاحب نے خواہش
ظاہر کی کہ جامعہ سے کوئی شخص ہر ہفتہ ان کے یہاں جایا کرے، تاکہ وہ جامعہ کے صحیح حالات سے
واقف ہو سکیں اور جامعہ کے متعلق ان کو جو خطوط موصول ہوتے ہیں، ان کے جوابات لکھوا سکیں
یہ خدمت میرے سپرد ہوئی، ایک عرصے تک میں ان کی خدمت میں پابندی سے جاتا رہا۔ ان موا
پر مجھے ان کی خلوت و جلوت سے آگاہی ہوئی، ان کے رجحانات کو سمجھنے اور ان کے خیالات
جائزہ لینے کا موقع ملا۔ مجھے محسوس ہوا کہ انھیں جامعہ سے بے انتہا محبت اور خلوص ہے۔ ا
مولانا محمد علی مرحوم سے اس لئے خفا تھے کہ وہ جامعہ کی انفرادیت کو نہیں مانتے تھے اور چاہتے
تھے کہ حالات سازگار ہوں تو مسلم یونیورسٹی میں اسے مدغم کر دیا جائے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ
جامعہ اور مسلم یونیورسٹی کے معاملات اور مسائل میں فرق کرتے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے اخبا
کو ایک بیان دیا، جس میں انھوں نے مسلم یونیورسٹی کی مذہبیت پر سختی سے نکتہ چینی کی۔ ایک صاحب
اس سے فائدہ اٹھا کر انھیں جامعہ کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے جواب میں انھوں نے مجھ سے جو
لکھوایا تھا، اس میں جامعہ کی پوری حمایت اور مدافعت کی تھی، میں سنتا آیا تھا کہ وہ اپنی رایوں
میں انتہائی بے لاگ اور بیباک ہیں۔ ان ملاقاتوں میں اکثر اس کے مشاہدے کا موقع ملا۔ باوجود اس
کے کہ وہ کٹر نیشنلسٹ اور سچے کانگریسی تھے، مگر میں نے دیکھا ہے کہ کانگریسی رہنماؤں کی موجودگی
میں کانگریس کے کاموں اور حکومت کی پالیسی پر سختی سے نکتہ چینی کرتے، اس طرح وہ مذہبی اقدار کے
سخت حامی تھے، مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا ہے کہ "ایمان کے
مضبوط اور عبادات کے پابند ہمیشہ تھے یہ مگر جماعت اسلامی، کے ہمدردوں اور حامیوں کے

سامنے بعض ایسے عقائد اور مذہبی رسوم پر جنھیں بہت سے لوگ اسلامی سمجھتے ہیں سخت اعتراض کرتے۔ انھیں اس کا احساس تھا کہ ان کی قومی خدمات کی صحیح قدر نہیں کی گئی، مگر پھر بھی قومی کاموں میں ہر قسم کی خدمت کے لئے پیش پیش ہوتے۔

خواجہ صاحب ان چند لوگوں میں ہیں جو لڑ بھڑ کر جامعہ کو علی گڑھ سے دلی لائے۔ وہ مجھ سے فرماتے تھے کہ دلی لے جانے کی کیسے کیسے اور کس کس طرح لوگوں نے مخالفت کی، میں نے کن کن مشکلات میں اور کس کس طرح جامعہ کا تمام اساسہ دلی پہنچایا اور وہاں کی بے سر سامانی میں ایک ایک چیز کی کس کس جتن سے حفاظت کی۔ دلی آنے کے بعد صحیح معنی میں جامعہ کا تعلیمی دور شروع ہوا اور حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور خواجہ صاحب کی مشترکہ کوششوں سے جامعہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے اس پوری کیفیت کو بڑے دلکش انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں :

"... مجھے یاد ہے جب علی گڑھ میں، کبھی تصدق مرحوم کے گھر میں، خواجہ کی کوٹھی میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کے یہ تینوں بانی اور معمار جمع ہوتے تھے۔ محمد علی کا مجاہدانہ جوش مصر تھا کہ نہیں جامعہ کو تو قومی تحریک کے لئے رضا کاروں کے تیار کرنے کا ایک مرکز بنایا جائے اور اجمل خاں اور انصاری کہتے تھے کہ تعلیم کے قدیم سرکاری مسلک سے یہ انحراف جس نے جامعہ کی صورت اختیار کی ہے مستقل اور پائدار ہونا چاہئے۔ کیا کیا مباحثے اور فریقین کے استدلال کی کیا کیا کشمکش ہفتوں اور مہینوں میں جاری رہی۔ بالآخر مسلم نوجوانوں کی ایک نئی نسل کا یہ سانچہ تیار ہوا اور پہلے ہی دن سے حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب نے اس کشتی کے پتوار اپنے ہاتھوں میں لئے۔ کاغذ کی کشتی ـــــ ارادوں اور تمناؤں کی یہ ناؤ جو اس زمانے کے طوفانی سمندر میں ڈالی گئی ـــــ رفتہ رفتہ لکڑی اور لوہے کی کشتی بن گئی، اس کے ٹوٹے ہوئے پتواروں اور بادبانوں کے بجائے رفتہ رفتہ نئے بادبان اور نئے پتوار اس ناؤ کو میسر آئے اور تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کی کشاکش سے نکل کر بالآخر نوجوان ملاحوں کا قافلہ ایک ایسے بندرگاہ تک پہنچ گیا، جہاں سے ہر سال مسلمانوں کی ایک نئی نسل علم و عمل کا پیام لے کر ملک کے گوشے

گوشے میں پھیل رہی ہے۔"

خواجہ صاحب نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے بڑی سرگرمی اور جوش کے ساتھ جامعہ کے کاموں میں دلچسپی لی، مگر ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء کو وہ امیر جامعہ منتخب ہوئے تو جامعہ کے معاملات سے بڑی حد تک بے تعلق رہے، انھوں نے یہاں کے کام کرنے والوں پر تمام تر بھروسہ کیا اور صرف خاص خاص اور اہم مواقع پر اپنے مشوروں سے نوازتے اور ضرورت ہوتی تو اپنی بے لوث خدمات پیش فرما دیتے۔ مگر آخری دور میں انھیں بہت اصرار تھا کہ ان کی ضعیفی اور صحت کی خرابی کے پیش نظر انھیں امیر جامعہ کی ذمہ داریوں سے بری کر دیا جائے۔ ۱۹۵۳ء میں جب ان کی مدت کار ختم ہوئی تو انھوں نے معتمد انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کو لکھ کر بھیجا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو امیر جامعہ اور پروفیسر محمد مجیب صاحب کو شیخ الجامعہ منتخب کر لیا جائے۔ اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ جا چکے تھے اور پروفیسر محمد مجیب صاحب نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مگر ڈاکٹر ذاکر صاحب نے اصرار کر کے انھیں امیر جامعہ رہنے پر راضی کر لیا، چنانچہ وہ حسب سابق امیر جامعہ منتخب ہوئے اور پروفیسر محمد مجیب صاحب شیخ الجامعہ۔ نومبر ۶۰ء میں جامعہ کا جشن چہل سالہ منایا گیا، تو خواجہ صاحب نے جلسۂ خاص میں اعلان فرمایا کہ انھوں نے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے، اب کسی اور کو امیر جامعہ منتخب کر لینا چاہیے۔ مگر شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور جامعہ کے دوسرے بزرگوں نے ان سے اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ جامعہ کو جلد ہی یونیورسٹی کا درجہ ملنے والا ہے۔ انھیں بڑی خوشی ہوگی، اگر خواجہ صاحب کی سرپرستی میں جامعہ کو یہ اعزاز حاصل ہو۔ اگرچہ ان کا اصرار باقی رہا، مگر خدا کو منظور تھا کہ ان ہی کے دور میں جامعہ کو یونیورسٹی کی حیثیت حاصل ہو اور جامعہ سے ۱۹۲۱ء میں ان کا جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ آخر دم تک باقی رہا۔

ابھی تک میں نے خواجہ صاحب کی زندگی کا صرف وہ رخ پیش کیا ہے، جس کا تعلق جامعہ

سے ہے، مگر قومی اور علمی خدمات بھی ان کی کچھ کم نہیں ہیں۔ جامعہ میں مرحوم کی یاد میں جو تعزیتی جلسہ ہوا تھا، اس میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ان کی قومی خدمات کو بہت تفصیل سے بیان فرمایا تھا۔ موصوف نے خواجہ صاحب کی خدمات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "خواجہ صاحب پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ تھے، پنڈت جی کی طرح خواجہ صاحب بھی ایسے باپ کے بیٹے تھے، جنھوں نے بڑی دولت چھوڑی تھی، خواجہ صاحب نے اپنی یہ دولت آزادی پر نچھاور کر دی۔ مسلم لیگ کا اس زمانے میں مسلمانوں پر جادو چل گیا تھا، خواجہ صاحب ان میں سے تھے جو سمجھتے تھے کہ اس سے ملک کی تحریک آزادی کو نقصان پہنچے گا اور ملک کی تقسیم مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہوگی، اس لئے وہ تقسیم کی مخالفت کرتے تھے، خواجہ صاحب نے مسلم مجلس قائم کی مسلمانوں کے بہت سے لیڈر مسلم لیگ کی مخالفت کیا کرتے تھے مگر احتیاط کے ساتھ، لیکن خواجہ صاحب ان میں سے تھے جو احتیاط کو جانتے ہی نہیں، بے دھڑک اور بے لاگ کہتے تھے، ان کی تنقیدوں میں جوش اور غصہ نہیں ہوتا تھا، مگر بے لاگ ہوتی تھیں۔" آخر میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "خواجہ صاحب کی خدمات میں جو زندہ رہیں گی، ان میں جامعہ ملیہ ہے، جو ان کے خلوص اور ایثار کی ایک جیتی جاگتی زندہ مثال ہے۔"

خواجہ صاحب کے انتقال پر اخبارات میں جو تعزیتی اداریئے لکھے گئے ہیں، ان میں مرحوم کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا گیا ہے اور ان کی زندگی کے ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں، اس لئے ذیل میں ان کے اہم حصے پیش کئے جاتے ہیں:

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ان کے حالات زندگی کے متعلق لکھتے ہیں: علی گڑھ سے اخلاص ترکے میں پایا تھا، ان کے والد محمود یوسف مرحوم سرسید کے مخلصوں میں تھے۔ شادی نواب محمد سمیع اللہ خاں مرحوم کی پوتی سے ہوئی۔ یہ سمیع اللہ خاں وہی ہیں جو ابتدائے تحریک علی گڑھ میں سرسید کے مخلص ترین رفیق ہی نہیں، بلکہ کہنا چاہیئے کہ برابر کے سہیم و شریک تھے۔ علی گڑھ میں پڑھ کر ولایت گئے، کیمبرج سے بی اے کیا، لندن رہ کر بیرسٹر ہوئے، واپسی پر بیرسٹری پہلے پٹنہ میں شروع کی، پھر علی گڑھ میں اس کے بعد الہ آباد ہائی کورٹ میں۔ آخر میں سالہا سال سے پھر علی گڑھ آگئے تھے اور سارا وقت

قومیات کی نذر کرنے لگے تھے۔ اخیر میں بیرسٹری سے بالکل ہی دست بردار ہو گئے تھے، قومی اور ملی دلچسپیاں آخر تک نہ چھوڑیں بلکہ اب ان مشغلوں سے انہماک، صحت خراب رہنے کے باوجود بڑھ ہی گیا تھا۔ روزنامہ قومی آواز (لکھنؤ) نے لکھا ہے کہ "خواجہ صاحب بہت پکے مسلمان تھے اور اتنے ہی پکے قوم پرور بھی تھے۔ وہ اس زمانے کی بہت سی اصلاحوں اور آزادیوں کے خلاف تھے اور پرانی روایات اور اقدار کے زبردست حامی تھے۔ مذہبی پابندیوں کی وہ قدر کرتے تھے اور نئی نسل کو اسی راہ پر تربیت دینا چاہتے تھے۔" ہفتہ وار ندائے ملت (لکھنؤ) اپنی ۱۵ دسمبر کی اشاعت میں خواجہ صاحب کے بارے میں لکھتا ہے: "...... تحریک خلافت کے علاوہ جنگ بلقان و طرابلس میں ترکوں کی حمایت کی تحریک اور آزادی کی جملہ تحریک میں ہمیشہ پیش پیش رہے، جیل بھی گئے اور دوسری قربانیوں کے میدان میں بھی آگے آگے رہے، خلافت کمیٹی اور کانگریس کمیٹی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، ایک زمانے میں تو کانگریس کے سکریٹری بھی رہے ہیں۔ آپ کی کوٹھی سیمع منزل ہمیشہ سیاسی اور علمی و ادبی مجلسوں کا مرکز رہی ہے۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۷۷ برس تھی۔

لہ تاریخ پیدائش: ۵ اکتوبر ۱۸۸۵ء

مالویہ جلسہ میں موجود تھے۔ علی گڑھ میں کوئی بات آداب کے خلاف جلسے میں تو نہیں ہوئی، البتہ جلسے کے بعد مہاتما جی کا بہت مذاق اڑایا گیا۔ ذاکر صاحب علی گڑھ اسٹیشن پر اترے تو مذاق اڑانے کا سلسلہ جاری تھا اور اس میں ان کے اپنے دوست بھی شریک تھے۔

ذاکر صاحب کو اس وقت تک مہاتما گاندھی سے کوئی خاص عقیدت نہیں تھی۔ مہاتما جی ن اپنی اخلاقی حکومت رفتہ رفتہ قائم کی، پہلے ان کے ماننے والے بہت کم تھے، وقت کے ساتھ بڑھتے گئے۔ مسلمان تقریروں میں جس انداز بیان کو پسند کرتے تھے اسے دیکھتے ہوئے اس کا امکان بہت کم تھا کہ مسلمانوں میں وہ اپنے قوت بیان کی وجہ سے اثر پیدا کریں، اور ہمیں علی گڑھ کے ان طالب علموں کو قصوروار نہیں ٹھہرانا چاہئے جنھیں ان کی تقریر سننے کے بعد ان سے عقیدت پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن تمسخر اور تحقیر کے جس انداز سے مہاتما جی کی تقریر اور ان کے مقصد پر فقرے چست کئے گئے اس سے ذاکر صاحب کو بہت تکلیف ہوئی۔ ایسی فضا میں جیسی کہ اس وقت علی گڑھ میں تھی اعتراض یا نصیحت کرنا یا سیاست اور تہذیب کا دوسرا رُ پیش کرنا بیکار تھا، پھر بھی ذاکر صاحب اگلے دن اس جلسے میں گئے جس میں طالب علم مہاتما جی کی اس تحریک پر بحث کرنے والے تھے کہ استاد اور طالب علم سرکاری درس گاہوں کو چھوڑ دیں۔ انھیں بخار تھا اور وہ بحث میں حصہ نہیں لینا چاہتے تھے، مگر اس فریق کی تا کئے بغیر نہ رہ سکے جو مہاتما گاندھی کی تحریک کے موافق تھا۔ اس فریق کی مخالفت میں کسی طعنہ کے انداز میں کہا کہ جو لوگ موجودہ درسگاہوں کو چھوڑنے کی تلقین کر رہے ہیں انھی یہ بھی بتانا چاہئے کہ ان درسگاہوں کو چھوڑنے والے جائیں کہاں۔ یہ علی گڑھ کے مقاب میں ایک قومی درسگاہ قائم کرنے کا چیلنج تھا جسے ذاکر صاحب نے دل میں قبول کیا۔ وہ د آئے اور حکیم اجمل خاں مرحوم اور دوسرے لیڈروں سے مل کر انھیں یقین دلایا کہ علی گ میں ایک قومی درسگاہ قائم کی جاسکتی ہے اگر قوم کے رہنما ان دوستوں اور طالب علموں کو ہم دیں جو اس میں تعلیم دینے اور تعلیم پانے کے لئے تیار ہیں۔ قومی لیڈر بغاوت کے ایسے

آثار کے منتظر تھے۔ انھوں نے بہت جوش کے ساتھ ایک قومی درسگاہ قائم کرنے کی تجویز کو اپنا لیا اور ۲۹ر اکتوبر ۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ وجود میں آگئی۔

جامعہ میں ذاکر صاحب کا کام فروری مارچ ۲۶ء سے شروع ہوا۔ اس وقت خواجہ عبدالمجید صاحب مرحوم شیخ الجامعہ تھے، اور جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کیا جا چکا تھا۔ اکتوبر ۲۰ء سے اس وقت تک یہ بات رفتہ رفتہ ظاہر ہو گئی تھی کہ جامعہ میں کون بغیر کسی شرط کے کام کرنے پر تیار ہے کون نہیں ہے، اور ان شرطوں میں جن کے بغیر کام کرنا شرط تھا ایک یہ بھی تھی کہ چاہے جامعہ کے مقصد پر گفتگو اور بحث کی جائے، اس کے کاموں کو لاحاصل قرار دیکر اسے چھوڑا نہ جائے۔ غالبًا یہ اکتوبر ۲۰ء اور ستمبر ۲۳ء کے درمیان سمجھ لیا گیا تھا کہ جامعہ کی غیر مشروط خدمت کرنے والوں میں سب سے زیادہ صلاحیت ذاکر صاحب میں ہے اور انھوں نے جرمنی سے واپسی پر شیخ الجامعہ کے فرائض اس طرح انجام دینا شروع کر دیا کہ گویا وہ رخصت سے واپس آئے ہیں۔

جامعہ میں اس وقت تھا کیا؟ اسکولوں اور کالج کو ملا کر قریب ۸۰ طالب علم، اور پچیس تیس استاد جن میں ہر ایک کی اپنی جداگانہ شخصیت اور نفسیاتی مسائل تھے۔ ایک بیرک نما عمارت ہوسٹل اور بیشتر استادوں کی رہائش کے لئے تھی، اور کتب خانہ، دفتروں اور کلاسوں کے لئے تین اور کرائے کی عمارتیں، جن میں سے دو کے ساتھ چند کوٹھریاں تھیں۔ مہاتما جی جامعہ کے علی گڑھ سے منتقل ہوتے وقت ایک سال کا خرچ دے چکے تھے، اس کے بعد سے جامعہ کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنا امیر جامعہ حکیم اجمل خاں مرحوم نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ طالب علموں کی تعداد ایک معمولی مدرسہ سے بھی کم تھی، مگر ۲۶ء کے شروع کے طالب علموں میں سے بیشتر اور استادوں کارکنوں میں سے تقریبًا سب ایسے تھے جو اس وقت جب علی گڑھ میں جامعہ کو بند کرنے کا معاملہ زیر غور تھا اس کا اعلان کر چکے تھے کہ وہ جامعہ کو بند نہ ہونے دیں

گے، چاہے لیڈروں میں سے کوئی ان کا سرپرست اور مددگار بننے پر تیار نہ ہو۔ یہی ارادہ جامعہ کا اصل سرمایہ تھا۔ اسی کے بل پر اپنے آپ کو اور دوسروں کو یقین دلاتا تھا کہ جامعہ ملیہ آزاد قومی تعلیم کا نمونہ اور تعلیم کی ایک نئی تحریک کا پیش خیمہ ہے۔

کسی تاریخی شخصیت کے عمل کو سمجھنے کے لئے سب سے مناسب طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس کی جگہ پر تصور کریں اور تمام حالات اور تمام لوگوں کو نظر میں رکھ کر سوچیں کہ ہم ہوتے تو کیا کرتے۔ اپنے آپ کو اس "مسند" پر تصور کیجئے جس پر ذاکر صاحب صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے سے سہ پہر کو ساڑھے چار پانچ بجے تک بیٹھتے تھے۔ بعض استادوں کا دستور رہے کہ گھنٹہ خالی ہو تو آکر شیخ الجامعہ کے دفتر میں بیٹھ جائیں اور ادھر ادھر کی باتیں، یعنی گپ کریں۔ یہ بزرگ ہیں، ان کا لحاظ کرنا ضروری ہے، خود ان سے کام کی بات کی نہیں جا سکتی، ان کی موجودگی میں وہی باتیں ہو سکتی ہیں جن سے ان کو دلچسپی ہو۔ ان کے علاوہ جو لوگ ملنے آتے ہیں وہ یا تو ضرورت بیان کرکے روپے کا مطالبہ یا ساتھیوں میں سے کسی کی شکایت کرتے ہیں۔ آمدنی کا ذریعہ بس یہ ہے کہ کسی فرض شناس باپ نے بیٹے کی فیس بھیجدی یا مکتبہ کی کچھ کتابیں بک گئیں۔ حکیم اجمل خاں مرحوم کو جامعہ کی خراب مالی حالت کا بڑا دکھ ہے، مگر ان سے اصرار کے ساتھ کہا بھی نہیں جا سکتا کہ جو کچھ کرنا ہے جلد کیجئے۔ وہ خود سوچتے رہتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیئے، کس سے، کس وقت اور کہاں ملنا چاہیئے، اصول اور عقیدے کی خلاف ورزی کئے بغیر جامعہ کی قوم پرستی اور حکومت دشمنی سے کس طرح نظر اور توجہ ہٹا کر جامعہ کی اہمیت کو واضح کرنا چاہیئے، جامعہ کی نازک مالی حالت پر پردہ ڈال کر کس طرح دینے والے کو یقین دلانا چاہیئے کہ اس کا روپیہ ایک ترقی پذیر کام میں صرف ہوگا۔ ان سب باتوں کے بارے میں غور کرنے کے لئے ملاقات کی ضرورت ہے، اور اس وقت بڑے آدمیوں سے ملنے کی یہی صورت ہے کہ ان کی مصاحبت کی جائے۔ حکیم صاحب جب کبھی بلا بھیجتے ہیں تو امید بندھتی ہے کہ روپے کا کچھ انتظام کیا جائے گا، مگر اکثر یہ ہوتا ہے کہ مشورہ کے لئے وقت نہیں ملا اس لئے کہ حکیم صاحب کی ذمہ داریاں

اور مجبوریاں بہت ہیں، اور جانے آنے میں اپنی جیب سے کچھ خرچ ہو گیا۔ حکیم صاحب جن لوگوں سے روپیہ حاصل کرنے کے خیال سے ملاتے ہیں ان کے پاس غریب بن کر جائیے تو ان کی نظروں سے گر جائیں گے اور بے غرض بن کر خودداری سے ملئے تو انھیں جامعہ کی ضرورتوں کا احساس نہ ہوگا۔ اگر کسی کو جامعہ بلانا اور جامعہ کا کام دکھانا ہو تو کیا کیجئے گا، جامعہ میں دکھائیے گا تو کیا دکھائیے گا، اور جلسے اور نمائش میں کچھ خرچ کرنا ہوا تو وہ کہاں سے آئے گا۔ پھر لوگ ہیں کہ وقت بیوقت تقاضا کرتے رہتے ہیں کہ کہیں سے کچھ لائیے تو کام چلے، گویا جامعہ وہ ہیں اور ان کی ضرورتیں۔ کبھی مشورہ کیجئے کہ جامعہ کو ترقی دینے کے لئے کیا کرنا چاہیے تو سب کہتے ہیں کہ یہ باتیں تو آپ ہم سے بہتر سوچ سکتے ہیں، ایک دو ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں اور جوش آجاتا ہے تو کہہ بھی دیتے ہیں کہ جامعہ کے کاموں کو ترقی دی جا سکتی ہے، روپیہ مل سکتا ہے اگر چندہ جمع کرنے کی سکیم بنائی جائے اور شیخ الجامعہ صاحب کے دفتر میں بیٹھے رہنے کے بجائے چندہ جمع کرنے میں اپنا وقت صرف کریں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ سہی، مگر جامعہ کا ایک اعلیٰ دینی اور قومی مقصد بھی تو تھا جس کی خاطر ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کی جا سکتی تھیں۔

جامعہ کو قائم کرنے کا ایک مقصد علم کو دین کے رنگ میں رنگنا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بنیادی شرط یہ تھی کہ دین کا تصور واضح ہو اور فن تعلیم کے ایسے ماہر موجود ہوں جو علم کو دین کا اور دین کو علم کا رنگ دے سکتے ہوں۔ دین کا تصور واضح کرنے کا حوصلہ کون کر سکتا تھا؟ عربی اور دینیات کے استادوں میں سے ایک وہابی خیال کے تھے، وہ پنج وقتہ نماز اور روزے کی پابندی کے علاوہ سر منڈا رکھنا، مونچھیں کتروانا اور ٹخنے سے اونچا پائجامہ پہننا لازمی سمجھتے تھے اور نامحرم عورتوں کی طرف دیکھنا یا ان سے ہاتھ ملانا اتنا برا مانتے تھے کہ ایک موقع پر مسز نائیڈو انتہائی کوشش کے باوجود انھیں آمادہ نہ کر سکیں کہ ان کی طرف دیکھیں اور ایک مرتبہ جلسے میں جب مرحومہ بیگم بھوپال سے ان کا تعارف کرایا گیا اور بیگم صاحبہ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے یہ کہہ کر مصافحہ سے انکار کیا کہ میں

ہے کہ ایسے خیال مسلسل ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ تو جو بھی ملتا ہے اس سے اپنے خیال کو بیان کرتا ہوں، اسے دعوت دیتا ہوں کہ اس خیال کو عمل میں لائے یا مجھے مشورہ دے کہ اسے کس طرح عمل میں لایا جائے۔ دراصل میں یہ اس لئے کرتا ہوں کہ اپنی طبیعت سے مجبور ہوں، اور اس کا حساب نہیں رکھتا کہ کتنے خیال بیان ہو کر بھلا دئے گئے، مگر اس کا مجموعی اثر جامعہ والوں پہ یہ پڑتا ہے کہ ہر ایک جامعہ کے کاموں کو ترقی دینے کی فکر میں الجھا رہتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اگر وہ فکرمند نہ رہا تو جامعہ نہ چل سکے گی۔ اگر جامعہ والوں میں سے کوئی اپنے شوق سے کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو میں اس کی ہمت افزائی کرتا ہوں، اس لئے کہ کوئی کام بھی جم جائے تو اس سے مفید نتیجے نکل سکتے ہیں، اور اگر کوئی ارادہ غلط ہو تو بہتر ہے کہ ارادہ کرنے والا خود اپنی غلطی کو محسوس کرے۔

"جامعہ والے مجھ سے آکر ایک دوسرے کی شکایت کرتے ہیں، اور صاحب کے طریق کار سے سب بیزار ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے، جس انداز سے کوئی بات شروع کرتا ہے میں بھانپ لیتا ہوں کہ اس کا اصل مدعا کیا ہے، لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جامعہ میں جیسے لوگ ہیں بہت غنیمت ہیں۔ ان کو جامعہ سے محبت ہے، ان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے کہ جامعہ کو کبھی نہ چھوڑیں گے، اور تھوڑی سی ہمدردی اور ہمت افزائی انھیں ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کرنے پہ آمادہ کر سکتی ہے۔ اب یہ میرا فرض ہے کہ جس میں جیسی صلاحیت ہے ویسا اس سے کام لوں، اور جس میں کوئی صلاحیت نہ ہو اسے بھی معروف رکھوں....

"یہ لوگ بہت پریشان ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے اور مجھ سے پوچھنے لگتے ہیں کہ جامعہ کا مقصد کیا ہے۔ میں موقع کی مناسبت سے کوئی جواب دیدیتا ہوں، یا مقصد طے کرنے کی ذمہ داری انھیں پر ڈال دیتا ہوں۔ خدا نے ذہانت دی ہے، بیان کی قوت دی ہے، مجھے یقین ہے کہ جامعہ رفتہ رفتہ ترقی کرتی رہے گی، اور یقین اتنا پختہ ہے کہ اپنے اوپر ہنس لیتا ہوں اور جب دل بھر آتا ہے تو دوسروں کو رلا سکتا ہوں۔ خوب ہے جامعہ کی زندگی، کہ اس میں

ستر فاقہ کا مزہ بھی ہے اور ستر عبادت کا بھی .....

جس شخص نے بیس برس سے زیادہ ایک ادارہ کی رہنمائی کی ہو، اس کے علاوہ بنیادی تعلیم کو بڑے پیمانے پر رواج دیا ہو اور غالباً بلا استثنار ہر ایک کو جو اس سے ملا اپنی قابلیت سے متاثر کیا ہو خود اس کی مردم شناسی پر شبہ کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر بہت سے لوگوں پر جنھوں نے اپنی شخصیت اور قابلیت کی بنا پر غیر معمولی امتیاز حاصل کیا ایسا ہی شبہ کیا جاتا ہے۔ شاید بات یہ ہے کہ مردم شناسی کی کمی کا الزام لگانے والے خود مردم شناس نہیں ہوتے، یا قابلیت اور دوسری خوبیوں میں اپنے آپ کو کسی سے کم نہیں سمجھتے، اس لئے انتخاب کی نظر چاہے جس پر پڑے، وہ کہتے ہیں کہ غلط شخص پر نظر پڑی۔ پھر وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ انتخاب کرنے والے کو آزادی کتنی ہے، اور انتخاب کے لئے ایسے آدمی کتنے ملتے ہیں۔ ذاکر صاحب سے اس رائے میں جامعہ والے سب اتفاق کرتے تھے کہ جامعہ کے تمام شعبوں اور تمام کاموں کو بڑھنا اور اس طرح ترقی کرنا چاہئے کہ وہ قوم کی نظروں کے سامنے آئیں اور قوم کو جامعہ کی طرف متوجہ کریں، لیکن وسائل اتنے نہیں تھے کہ ہر شعبے کی ترقی کے لئے ایک ساتھ انتظام کیا جا سکے، اور یہ طے کرنا ضروری تھا کہ ترقی کی کوشش کہاں سے شروع کی جائے۔ کوشش کو محدود کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وسائل جتنے بھی تھے بیشتر اسی میں لگائے جائیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ اس خاص شخص کے مطالبوں کو جس کے سپرد کوئی نیا کام کیا گیا ہو دوسروں کے مطالبوں پر ترجیح دی جائے۔ یہ بات ظاہر ہے ان لوگوں کو گراں گذرتی تھی جن کو وسائل کی کمی کے سبب سے پہلے بھی کافی نہیں ملتا تھا۔

ذاکر صاحب کی ایک ابتدائی تجویز یہ تھی کہ بچوں کے لئے کتابچے لکھے جائیں، اس غرض سے مکتبہ کو روپیہ دیا جائے اور اس کا کام جامعہ کے دفتر سے الگ کیا جائے۔ مکتبہ کو کاروباری طریقے پر چلانے کے لئے حامد علی خاں مرحوم سے زیادہ موزوں اس وقت جامعہ میں کوئی نہیں تھا، لیکن جامعہ کی ساری جماعت کی [illegible]

اگرچہ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ مکتبہ کسی اور طریقے پر کامیابی کے ساتھ چلایا نہیں جا سکتا تھا۔ ذاکر صاحب کی اس دور کی دوسری تجویز یہ تھی کہ مدرسہ ابتدائی کو نمونہ کا مدرسہ بنایا جائے۔ اس کے لئے کسی استاد کو کسی اچھے استادوں کے مدرسے میں تربیت کے لئے بھیجنے اور اس کے بعد مدرسہ کو اس کے سپرد کرنے کی ضرورت تھی۔ ذاکر صاحب کی نظر انتخاب عبدالغفار مدھولوی صاحب پر پڑی، جنھیں شاید اور کوئی شخص بھی اس فریضہ کے لائق نہ سمجھتا۔ لیکن اس سے بہتر انتخاب کیا نہیں جا سکتا تھا۔ عبدالغفار صاحب موگا بھیجے گئے، وہاں انھوں نے مدرسے کے استادوں کو اپنی محنت اور شوق کی وجہ سے حیرت میں ڈال دیا، اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ مدرسہ ابتدائی کے نگراں مقرر ہوئے تو ان کے شوق اور انہماک نے مدرسے کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ لیکن ایک استاد پورا مدرسہ نہیں بن سکتا، استادوں کا بہرحال ضرورت تھی۔ مدرسہ ثانوی کے ایک استاد سے کہا گیا کہ وہ ابتدائی میں بھی پڑھایا کریں تو انھوں نے اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھا اور ان کی ضد میں خود ذاکر صاحب نے ابتدائی کے ایک کلاس کو پڑھانا شروع کر دیا۔ دوسری طرف عبدالغفار صاحب کی باضابطگی ایسی تھی کہ کوئی استاد ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ ایک مرتبہ ذاکر صاحب کسی جلسے کی صدارت کے لئے چند منٹ دیر سے پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ جلسہ شروع ہو گیا ہے اور اس کی صدارت کوئی اور کر رہا ہے۔ ذاکر صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے اور عبدالغفار صاحب کی قدر ان کی نظروں میں بہت بڑھ گئی، مگر جامعہ میں مروت اور رعایت کی جو فضا تھی اس میں عبدالغفار صاحب کی باضابطگی کو سراہنے والے بہت کم تھے۔ عبدالغفار صاحب چند سال بعد نگرانی سے علیحدہ ہو گئے، ایک استاد کی طرح پہلی یا دوسری جماعت کو پڑھاتے رہے۔ ابتدائی مدرسے کی حالت کبھی بگڑی کبھی سدھر گئی، مگر جو جان عبدالغفار صاحب نے اس میں ڈال دی تھی وہ اب تک باقی ہے۔ تیسرا نمایاں کام جو اس ابتدائی دور میں ہوا ایک شعبہ کا قیام تھا جو ہمدردانِ جامعہ کہلاتا تھا اور جس کا مقصد جامعہ کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ معلوم نہیں تجویز ذاکر صاحب کی تھی یا مرحوم شفیق الرحمٰن قدوائی کی۔ یہ بہت کامیاب ہوئی اور رو

جمع ہونے کے علاوہ اس شعبے کی بدولت جامعہ کا سارے ملک میں چرچا ہو گیا۔ مگر اس کے لئے ضروری تھا کہ جامعہ کے استاد چندہ جمع کرنے کے کام میں شریک ہوں۔ مرحوم شفیق صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ وہ سب سے اپنا کام کرا لیتے تھے، پھر بھی یہ سوال ہر وقت اٹھتا رہتا تھا کہ استاد چندہ جمع کرنے کے کام میں لگے رہیں یا تعلیم کا کام کریں۔ غالباً خود ذاکر صاحب کو وہ دوڑ دھوپ پسند نہ تھی جو بہت سے لوگوں سے چھوٹی چھوٹی رقمیں جمع کرنے کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ اس میں اصل آزمائش صبر اور استقلال اور "پاے رو پیا" کی ہوتی ہے، شخصیت کے اثر کی نہیں ہوتی۔ جامعہ کا کام سیٹھ جمال محمد مرحوم کے عطیہ اور حیدر آباد کی گرانٹ کی بدولت چلا۔ عطیہ اس تعلق کی وجہ سے دیا گیا جو سیٹھ صاحب کو حکیم صاحب مرحوم سے تھا، حیدر آباد کی گرانٹ منظور کرانا اور ایک مرتبہ بند ہو جانے کے بعد پھر جاری کرانا تنہا ذاکر صاحب کا کام تھا۔ اس کے بعد بھی جو بڑی رقمیں ملیں وہ بھی انھیں کے اثر، موقع شناسی اور مصلحت اندیشی کی بدولت ملیں۔ اس معاملے میں بھی شخص اور موقع کا انتخاب انھوں نے اپنی صواب دید کے مطابق کیا، اور جامعہ والوں کی یہ شکایت سنتے رہے کہ وہ چاہیں تو بہت روپیہ جمع کر سکتے ہیں، نہ معلوم کیوں نہیں کرتے۔

دراصل اس میں جامعہ والوں کا ہی قصور نہیں تھا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کا کچھ ایسا اثر تھا، مشوروں اور بحثوں میں وہ اس طرح حاوی رہتے کہ سب کا میلان خود بخود اس طرف ہو گیا کہ ہر مشکل کو حل کرنے کا اہل اور اس لئے اس کا ذمہ دار انھیں کو بنا دیں۔ جب رفتہ رفتہ جامعہ کے اپنے مفاد کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ ایسے کاموں میں لگیں جو جامعہ کے کام نہیں کہے جا سکتے تھے تو ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ ذاکر صاحب کو علی گڑھ کے معاملات سے دلچسپی تھی، اس کی وجہ سے ان کے خاص لوگوں سے تعلقات بڑھے اور ان کی مصلحت اندیشی، حاضر جوابی اور ذاتی اوصاف کا ایسے حلقوں میں چرچا ہوا جہاں شاید جامعہ کا کسی اور سلسلے سے ذکر نہ آتا۔ ۳۴ء میں وہ استادوں کی ایک کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اور ان کے خطبۂ صدارت نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ان سے ملاقات کرنے اور ان سے تقریروں کی فرمائش کرنے والوں کی تعداد

بہت بڑھنے لگی۔ اکتوبر ۳۷ء میں وردھا میں وہ کانفرنس ہوئی جس میں مہاتما گاندھی نے بنیادی قومی تعلیم کی تجویز پیش کی۔ ذاکر صاحب بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور ان کے جوہر دیکھ کر مہاتما جی نے تجویز کو مرتب شکل دینے کا کام ان کے سپرد کیا اور پھر انھیں ہندوستانی تعلیمی سنگھ کا صدر بنا دیا۔ بنیادی تعلیم کے سلسلے میں ذاکر صاحب ان تمام صوبوں میں بلائے جانے لگے جہاں حکومت کانگریسی تھی اور بنیادی تعلیم کا کسی شکل میں تجربہ کرنا چاہتی تھی۔ اسی زمانے میں مسلم لیگ نے کانگریس کی مخالفت کے ساتھ بنیادی تعلیم کی بھی مخالفت شروع کر دی اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس سے ظاہر ہے ذاکر صاحب الگ نہیں رہ سکتے تھے۔ کچھ لوگ جامعہ سے اس بنا پر خفا ہو گئے کہ ذاکر صاحب شیخ الجامعہ تھے اور بنیادی تعلیم کا پرچار بھی کر رہے تھے، لیکن مصلحت اندیشی کا یہ کمال تھا کہ جامعہ سیاسی عداوتوں کی لپیٹ میں نہیں آئی، اور مدرسہ ابتدائی میں، جس پر شبہ کیا جا سکتا تھا کہ بنیادی تعلیم کا نمونہ بن گیا ہے، طالب علموں کی تعداد بڑھتی رہی۔ یہ البتہ تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ جامعہ نے مدرسہ ابتدائی میں بنیادی تعلیم کا تجربہ نہیں کیا، صرف بنیادی تعلیم کے استادوں کی تربیت کے لئے استادوں کا مدرسہ قائم کیا۔ دراصل اب قوم کے لیڈر، جن کا یہ ایک عقیدہ ہو گیا تھا کہ بنیادی تعلیم ہی سچی تعلیم کہلانے کی مستحق ہے ذاکر صاحب کو اتنی مہلت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی نگرانی میں یکسوئی کے ساتھ تجربے کرائیں اور جامعہ والے بنیادی تعلیم کے اصولوں کو اس طرح سمجھ نہ سکے تھے کہ ذاکر صاحب کی رہنمائی کے بغیر کامیابی کے ساتھ بنیادی تعلیم کے طریقے کو اختیار کریں۔

مسلمانوں میں بنیادی تعلیم کی جو مخالفت ہو رہی تھی اس سے جامعہ کو کوئی خاص صدمہ اس وجہ سے نہیں پہنچا کہ مرحوم شفیق الرحمٰن قدوائی نے اسی زمانے میں بالغوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اس کے ابتدائی منصوبوں میں سے ایک یہ تھا کہ قرآن کی آیتیں اور مشہور حدیثیں ترجمے کے ساتھ پوسٹروں کی شکل میں شایع کی جائیں۔ یہ منصوبہ بہت کامیاب ہوا، اس لئے کہ اس کا رسمی مذہب سے تو یہی تعلق تھا، مگر مسلمانوں کو جو غلط فہمیاں بنیادی

تعلیم کے بارے میں تھیں وہ بھی قائم رہیں، اور اس ملت میں جس کی کسی زمانے میں ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ اس میں دستکاری کا ہنر جاننے والے کی بڑی قدر تھی ایسے طریق کار کو برا سمجھا جاتا رہا جس کی بنیاد اور جان دستکاری تھی۔ لیکن ملک بھی بنیادی تعلیم کی اسکیم سے کوئی خاص فائدہ نہ اٹھا سکا۔ مہاتما جی کو ایک طرف بنیادی تعلیم کا نصاب تیار کرانے کی اتنی جلدی تھی کہ جو نصاب تیار ہوا اس میں خامیاں رہ گئیں، اور دوسری طرف وہ سوت کی کتائی کو اتنی اہمیت دیتے رہے کہ باقی تمام حرفے نظر انداز کر دیئے گئے، اگرچہ رسمی طور پر ان کا ذکر ہوتا رہا۔ خود ذاکر صاحب نے بعد کے خطبات میں "کام" کی جو تعریف کی، اس کے جو اصول بتائے، اور جس طرح اس حقیقت کی وضاحت کی کہ تہذیبی قدریں "کام" کے ذریعے ایک نسل سے دوسری میں منتقل ہوتی ہیں وہ بنیادی تعلیم کی رپورٹ اور نصاب میں نہیں پائی جاتی، اور اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ نصاب کو مرتب کرنے والے ذاکر صاحب کے خیالات کو سمجھ نہ سکے تھے۔ جامعہ والوں نے ان اعتراضات سے جو بنیادی تعلیم پر کئے جا رہے تھے اتنا اثر لیا کہ اس کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کا ایک طریقہ جو قومی زندگی کی تعمیر میں بہت مددگار ہو سکتا تھا ایک سرکاری ڈھونگ بن کر رہ گیا۔

جنگ کے زمانے میں برطانوی حکومت ایک طرف ہر ایسی تحریک اور ہر ایسے شخص کو بے اثر کر دینا چاہتی تھی جس سے جنگ کی کارروائیوں میں خلل پڑ سکتا تھا اور دوسری طرف، خاص طور سے ۱۹۴۲ کے بعد، اس الزام سے بچنا چاہتی تھی کہ اسے ہندوستان کی بہبودی سے کوئی مطلب نہیں۔ اسی سلسلے میں تعلیم کے محکمے کی حیثیت بدلی اور بڑھائی گئی، اور یہ ایک بہت قابل اور مخلص ماہر تعلیم جون سارجنٹ کے سپرد کیا گیا۔ سارجنٹ کی تحریک پر جامعہ کی طرف سے درخواست بھیجی گئی کہ اس کی سندیں تسلیم کر لی جائیں، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سرکاری کمیٹی نے جامعہ کا معائنہ کرنے کے بعد سفارش کی کہ جامعہ کی تمام سندوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ جامعہ میں اس وقت تک تعلیم کے میدان میں صرف مدرسہ ابتدائی نے امتیاز حاصل کیا تھا، اور

بنیادی تعلیم کے لئے استاد تیار کرنے میں استادوں کے مدرسے نے، حکومت کی طرف سے جو پذیرائی اور سندیں تسلیم کی گئیں اس سے سمجھنا چاہئے کہ ذاکر صاحب کی تعلیمی خدمات کا اعتراف مقصود تھا۔ اسی زمانہ میں جامعہ کے جشن سیمیں کو اہتمام سے منانے کا ارادہ کیا گیا اور موقع سے فائدہ اٹھا کر جامعہ کی توسیع کے لئے روپیہ جمع کرنے کا کام شروع ہوا۔ اس سلسلے میں جتنی بڑی رقمیں وصول ہوئیں وہ جامعہ کو نہیں بلکہ ذاکر صاحب کو دی گئیں۔ ذاکر صاحب ہی اس کا حوصلہ کر سکتے تھے کہ جامعہ کے جشن سیمیں کو قومی ہم آہنگی کا یادگار واقعہ بنائیں جب کہ شمالی ہندوستان میں دشمنی اور کشت وخون کا بازار گرم ہو رہا تھا۔ ان کی کوشش سے جشن سیمیں کے موقع پر کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور سب نے جامعہ کی قومی اور تعلیمی حیثیت کا اعتراف کیا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت نے اس سے بڑھ کر کوئی اور کرشمہ نہیں دکھایا، اور یہ ہمت اور حکمت عملی کا ایک کارنامہ تھا جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

جامعہ نے اپنے تعلیمی کاموں کے سلسلے میں آس پاس کے تمام گانووں کے لوگوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے تھے، اور اس کا اندیشہ کم تھا کہ قتل وغارت کی وبا سے اثر لے کر یہ لوگ جامعہ پر حملہ کریں گے۔ لیکن فساد کرنے والے باہر کے لوگ تھے، اور اگرچہ جامعہ پر براہ راست حملہ نہیں ہوا تھا، یہاں اتنے مسلمان گانووں سے بھاگ بھاگ کر پناہ گزیں ہوئے تھے کہ حالت بہت خطرناک ہو گئی۔ اس وقت وہ محبت جو مہاتما جی کو ذاکر صاحب اور جامعہ سے تھی کام آئی۔ ۸ر ستمبر کو جب وہ دہلی پہنچے تو سب سے پہلے انھوں نے ذاکر صاحب اور جامعہ کی خیریت دریافت کی، اور دوسرے دن خود حالات معلوم کرنے کے لئے تشریف لائے۔ ان کی اس توجہ نے حکومت کو بھی اپنے فرض کا احساس دلایا، وزیر صحت، وزیر اعظم، کمانڈر ان چیف سب آئے اور حال دیکھ گئے، اور کمانڈر ان چیف نے ایک فوجی دستہ جامعہ والوں کی حفاظت کے لئے تعینات کر دیا۔ اس احسان کو ذاکر صاحب نے اس طرح اتارا کہ ۱ر جنوری کو بارہ ہنڈولے میں ایک جلسہ کرایا جس میں رفوجی اور مسلمان اپنے بچوں کو ساتھ لے کر آئے، بڑے آپس میں

گلے ملے، بچوں نے ساتھ کھیلا اور مٹھائی کھائی۔

جامعہ میں ذاکر صاحب کے آخری دو سال افسردگی اور مایوسی میں گذرے۔ جشن سیمیں کے بعد جامعہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہونا چاہئے تھا، مگر ایک طرف ملک میں فساد کی آگ بھڑکتی اور پھیلتی رہی، اور معلوم ہوتا تھا کہ اسے بجھانا درکنار اس کے شعلوں کی لپک کو کم کرنا بھی کسی کے بس میں نہیں ہے، دوسری طرف، سوائے سماجی تعلیم کے اس کام کے جو مرحوم شفیق صاحب شہر میں کر رہے تھے اور کتابوں کی اشاعت کے جو منصوبے مرحوم حامد علی خاں نے بنائے تھے، جامعہ والوں میں نئے ولولوں اور حوصلوں کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ معمول کا کام، معمول کے جھگڑے، چھوٹی سی دنیا کے حقیر ہنگامے، وہی جن سے پیچھا چھڑانے کے لئے جشن سیمیں کا اہتمام کیا گیا تھا، گلے کا طوق بنے رہے۔ ذاکر صاحب کی صحت بھی خراب ہوتی جارہی تھی، اور اس کا بھی کوئی لحاظ نہیں کرتا تھا۔ انھیں شاید سب سے زیادہ دکھ اس کا تھا کہ حکومت ہند، اگرچہ ایک آزاد ملک کی حکومت تھی، پرانے قاعدوں کی غلامی اپنا حصہ سمجھتی رہی۔ ذاکر صاحب حیدرآباد میں امداد مانگنے گئے تو سر مرزا اسمٰعیل نے انھیں لنچ کی دعوت دی، اور کھانے کے بعد پانچ لاکھ کا چک بطور عطیہ پیش کر دیا۔ سر مرزا اسمٰعیل غالباً جامعہ سے واقف بھی نہ تھے، صرف ذاکر صاحب سے ملے تھے۔ حکومت ہند کے رہنما جامعہ سے اور اس کے کاموں سے واقف تھے، ذاکر صاحب کو بھی اچھی طرح جانتے اور بظاہر ان کی بہت قدر کرتے تھے، لیکن انھوں نے عطیہ کے طور پر چار لاکھ نوے ہزار کی جو رقم دی اس کے لئے حسب قاعدہ پیروی کرنے کی ضرورت پڑی۔ اس کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ حکومت اپنا فرض ادا کر چکی ہے، اب جامعہ کو سالانہ خرچ کے لئے جو کچھ ملے گا وہ سرکاری قاعدے کے مطابق اور تمام شرطیں پوری کرنے کے بعد ملے گا۔ سرکاری قاعدہ وہی تھا جو برطانوی حکومت کے زمانے میں، اس لئے درخواستیں دینے اور ان کی پیروی کرنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اور آخر میں ذاکر صاحب نے کہدیا کہ جس کو مانگنا ہو وہ مانگے، اب میں کسی درخواست پر دستخط نہ کروں گا۔

ذاکر صاحب کی بعض خوبیوں کا احساس اس وقت ہوا جب وہ ۱۹۴۸ء کے آخر میں علی گڑھ چلے گئے۔ آدمی کو انھیں خطروں کا علم ہوتا ہے جو اسے پیش آتے ہیں، مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ جو خطرے پیش نہیں آئے انھیں بھی ذہن میں رکھا جائے۔ جامعہ کے بند ہو جانے کا خطرہ تھا، اس کا خطرہ تھا کہ اس کے سارے منصوبے دلوں کا سرور بن کر رہ جائیں گے، جامعہ لاوارث ہو سکتی تھی، ایک یتیم ادارہ جس کے چلانے والے دربدر پھرتے اور خیرات کے بدلے دعائیں دیتے۔ لیکن جامعہ، اس ابتدائی مذہبی جوش میں جو اس کے قیام کے زمانے میں پھیلا ہوا تھا ایسا ادارہ بھی بن سکتی تھی جس کا مذہب بدلتے بدلتے مولانا محمد علی مرحوم کی سیاست کا رنگ اختیار کر لیتا، یا وہ قومی تعلیم کی ایسی مثال بن سکتی تھی جو نہ مسلمان کے دل کو لگتی نہ ہندو کے۔ وسائل کی کمی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جامعہ والے اس دنیا کو حقیر اور گمراہ سمجھنے لگیں جو ان کے کام کی اور ان کی قدر نہیں کرتی تھی، خود ستائی اور ریاکاری کے فریب میں آجائیں، غریبی کی پابندیوں اور مجبوریوں کو اپنا مذہب بنا لیں۔ ان سب خطروں سے جامعہ کو ذاکر صاحب کی طبیعت نے بچایا، جو صرف آزاد نہیں تھی بلکہ کسی طرح سے کسی کی گرفت میں نہیں آئی تھی۔ انھوں نے نصیحت نہیں کی، براہ راست رہنمائی نہیں کی، بس عقدہ کشا عقل کا امتحان لیتے رہے، اخلاق اور علم کی ایک مثال بنے رہے جس کا حسن ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا تھا، اور جو ہر دیکھنے والے کو اس سوچ میں ڈال دیتی تھی کہ سراب کا جلوہ حقیقت ہے یا حقیقت سراب کا جلوہ۔

شیخ الجامعہ

۱۔ پہلے شیخ الجامعہ ــــــــ مولانا محمد علی ۱۹۲۰ــــ۱۹۲۱

۲۔ دوسرے شیخ الجامعہ ــــــــ عبدالمجید خواجہ ۱۹۲۱ــــ۹۲۶

۳۔ تیسرے شیخ الجامعہ ــــــــ ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۲۶ــــ۹۴۸

(مذکورہ بالا دونوں شیخ الجامعہ پر امیر جامعہ کے تحت مضامین شائع ہو چکے ہیں۔)

۴۔ چوتھے شیخ الجامعہ ــــــــ پروفیسر محمد مجیب ۱۹۴۸ــــ

(یہ دور ابھی جاری ہے)

پہلے شیخ الجامعہ ــــ مولانا محمد علی



۱۹۲۰ــــ ۱۹۲۱ء

ڈاکٹر عبدالحمید زبیری

پہلے شیخ الجامعہ ـــــ مولانا محمد علی

۱۹۲۰ء ـــــ ۱۹۲۱ء

مولانا محمد علی مرحوم مسلمانان ہند کی ان چند ممتاز ہستیوں میں سے ایک ہیں، جنھوں نے زندگی کے تقریباً ہر شعبے پر ایک گہرا نقش ثبت کیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی سیاست، شاعری، علم و ادب، صحافت اور تعلیم پر وہ کافی اثر انداز ہوئے ہیں۔ مولانا محمد علی فطرت کے اُن چند منتخب افراد میں سے تھے جنھیں وہ غیر معمولی دل و دماغ کی صلاحیتیں دیتی ہے۔ وہ جس شعبۂ زندگی میں بھی رہے ایک کامیاب انسان رہے اور وہ جہاں بھی رہتے ان کی عظیم الشان شخصیت سب پر حاوی ہو جاتی، لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اُن کا دل اُن کے دماغ پر غالب آتا گیا، حتیٰ کہ ملت اسلامیہ کے عشق میں اُن کی حالت مجنوں کی سی ہو گئی۔ اس جنون کے باعث انھوں نے زمانے سے ایک لڑائی مول لی، وہ حق کے لئے سینہ سپر ہو کر ہر کسی کے خلاف ڈٹ گئے، انتہائی علالت کی حالت میں وہ کشاں کشاں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے، وہاں ہندوستان کی آزادی کا رندانہ نعرہ بلند کیا اور بالآخر عالم اسلام کا یہ عظیم مجاہد بیت المقدس کی روحانی خاک میں ہمیشہ کے لئے مدفون ہو کر اپنے رب کے قریب ہو گیا۔

ہر بڑا انسان اپنے قومی تمدنی ورثہ سے وہ سب کچھ حاصل کر سکتا ہے جو اس میں موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے اسلامی تمدن سے اس کے بہترین عناصر کو اخذ کیا۔ ان کی تعلیم مغربی

ماحول میں ہوئی تھی، لیکن انھوں نے اپنے شوق سے قرآن، تفسیر، حدیث، تاریخ اسلامی، علم الکلام
وغیرہ جیسے اسلامی علوم پر بہت جلد عبور حاصل کرلیا۔ پھر انھوں نے اس تمدنی ورثہ کے اکتساب
پر ہی قناعت نہ کی بلکہ اُسے پرکھا اور اس خس و خاشاک کو جو اس میں امتدادِ زمانہ کے باعث
جمع ہوگیا تھا دور کرنے کی کوشش کی۔ مولانا محمد علی نہ صرف جذباتی حیثیت سے بلکہ عقل غور و فکر
کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اسلام انسانیت کی نشو و نما کے لئے سب سے بہترین نسخہ ہے،
اسی پر عمل کرکے نہ صرف مسلمانان عالم بلکہ تمام دنیا اپنی مادی اور روحانی نجات حاصل کرسکتی ہے
چنانچہ انھوں نے نہایت خلوص اور جوش کے ساتھ اس پیغام کو تمام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مولانا کی
آخری زندگی کی مذہبی کیفیت کو دیکھ کر لوگ انھیں ملّا کہنے لگے تھے، لیکن وہ اس پر فخر کرتے تھے کیونکہ
ان کے نزدیک یہی طرز فکر اور طرز زندگی سب سے بہتر تھا۔ اسلامی تمدن سے وابستگی کے لئے آخری عمر
میں انھوں نے عربی لباس بھی اختیار کرلیا تھا۔ اس طرح مولانا باطنی اور ظاہری دونوں لحاظ سے تمدن
اسلامی کے بہترین مظہر بن گئے تھے۔

دین و دنیا کی ہم آہنگ نشو و نما

جن اصولوں کی بنیاد پر تمدن انسانی کی بقاء، اصلاح اور نشو و نما چاہتے تھے، ان ہی اصولوں کو
وہ انسانی تعلیم کا مقصد قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے اس قرآنی دعا کو تعلیم کا مقصد قرار دیا کہ

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً

دنیا و دین کی فلاح، مادہ اور روح کی ہم آہنگی، جسمانی اور روحانی قویٰ کی نشو و نما چنانچہ تعلیم کا مقصد
قرار پایا، لیکن دنیا کا حصول اس طرح ہو کہ وہ مقصد کل یعنی دینی مقصد کے ماتحت ہو، جزو ہمیشہ
کل کا تابع رہے۔ انسان کی ابدی زندگی اس کی مخالف زندگی کے مقصد کو متعین کرے۔ چنانچہ
تعلیم کا مقصد ہوا کہ:

از کلید دیں در دنیا کشاد

مذہبی تعلیم کو غرضکہ ہر تعلیم کی اساس ہونا چاہیئے۔ خصوصاً ملت اسلامیہ کی آئندہ نسلوں کی تعلیم تو روحانی اساس کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

لیکن مذہبیت اور روحانیت کے معنی ترک دنیا کے نہیں ہیں بلکہ یہ ہیں کہ اس روح کو بہتر طریقہ پر دنیاوی امور میں کارفرما کیا جائے چنانچہ دنیاوی امور کی تعلیم ضروری ہے۔ خاندانی، وطنی، ملی اور انسانی فرائض کی ادائیگی کا احساس تعلیم کا لازمی جزو ہونا چاہیئے۔

اس کے ساتھ ہی انفرادی مادی زندگی کی بقا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ معاش کا مسئلہ تعلیم میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ کسب حلال انسان کے لئے ضروری ہے اور تعلیم کا یہ مقصد بھی ہونا چاہیئے کہ وہ طالب علموں کو اس کے لئے تیار کرے۔

مولانا محمد علی محدود معنی میں ایک مدرس نہ تھے، لیکن وہ ایک عظیم الشان مفکر تھے، اس لئے ایک انسانی معلم بھی تھے۔ ان کے پیش نظر انسانی تعلیم کے یہ تینوں ضروری عناصر موجود تھے۔ انھوں نے شروع میں کوشش کی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جہاں کی وہ تخلیق تھے اور جس سے انھیں انتہا محبت تھی، ان مقاصد تعلیم کو قبول کرے اور ان کی روشنی میں خود کی زندگی میں انقلاب پیدا کرے۔ لیکن رجعت پسند طاقتوں کے مقابلے میں انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی، چنانچہ بالآخر ایک نئی اسلامی جامعہ کا مولانا شیخ الہند مرحوم کے ہاتھوں علی گڑھ کی جامع مسجد میں افتتاح کرایا گیا اور اس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذریعہ مولانا محمد علی مرحوم اور دیگر اکابر اسلام مسلمانان ہند کا ملی اور اسلامی احیا چاہتے تھے چنانچہ شروع ہی میں ان مقاصد کو نہ صرف مولانا محمد علی مرحوم نے بلکہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے واضح کردیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مقاصد

چنانچہ مولانا محمد علی مرحوم ہمدرد کے ایک مقالۂ افتتاحیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"جامعہ کا ہمیشہ سے ایک خاص معین مقصد ہے اور وہ خود اس قدر جامع اور صاف ہے کہ اس کی تشریح وتاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ جامعہ نے ابتدا ہی سے اپنے پیش نظر جو مقصد رکھا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سے بچے خدا پرست مسلمان اور وطن پرور ہندوستانی پیدا ہوں۔"

مولانا مزید تحریر فرماتے ہیں کہ

"جامعہ نے تعلیم کے متعلق صحیح نظریہ قائم کیا اور تلامذہ کے قوائے داخلی کو ترقی دینے کا کام اپنے ذمے لیا اور اس کو ہرگز پسند نہ کیا، خواہ تعلیم دنیوی ہو یا دینی اس کی مثال مثل الحمار ہو جائے، اس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست و خدا پرست مسلمان بنایا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان کو وطن دوست اور حریت پرور ہندستانی بنایا جائے۔"

فطری نشوونما کا اصول

مولانا محمد علی کو اس کا پورا احساس تھا کہ تعلیم کا مقصد انسانی ذہن میں اشیا کے علم کا ٹھونسنا نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی داخلی، امکانی قوی کی تدریج نشوونما ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

"نباتات اور انسان جمادات کی طرح غیر ذی روح نہیں ہیں، جس کا ارتقا رخارجی ہوتا ہے یعنی ترقی نہیں ہوتی، محض از دیاد یا بڑھوتری ممکن ہے۔ خلاق عالم نے نباتات اور حیوانات میں خود نمو کا انتظام فرما دیا ہے اور داخلی ترقی کا سامان خود ان میں فراہم کر دیا ہے۔"

اس بنا پر مولانا مرحوم طلبا میں جامد تقلید کا مادہ پیدا نہ کرنا چاہتے تھے بلکہ چاہتے تھے کہ وہ خود قرآن اور حدیث کا علم حاصل کریں۔ اور اسلام کے روحانی سرچشموں سے خود بلا واسطہ فیضیاب ہوں، وہ تقلید جامد کو مسلمانوں کے ذہنی اور علمی زوال کا سبب خیال کرتے تھے اور عام مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دلا کر ان کو اس ذہنی غلامی سے نجات دلانے کے قائل تھے۔

اسلام کی تعلیمات کو مولانا چونکہ تمام تعلیم انسانی کی اساس سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نصاب میں اسلامی مذہبی تعلیم کو اساس قرار دیا اور قرآن و حدیث، ضروری فقہ

اور قدرے عربی زبان کی تعلیم کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ابتدائی جماعتوں سے لے کر جامعہ کی اعلیٰ تعلیم تک ایک لازمی مضمون قرار دیا۔

سائنس اور پیشہ کی تعلیم کی ضرورت

جامعہ کے تعلیمی نصاب میں مولانا نے دنیاوی ضروریات کے لئے دیگر مضامین کو شامل کرنا بھی ضروری سمجھا، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"جامعہ کی تعلیم میں دوسری طرف مسلمانوں کی دنیوی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مسلمان یا تو مسجد کے ملا ہوتے تھے یا سرکاری دفتر کے کلرک۔ جامعہ ملیہ کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے تلامذہ حصہ لے سکیں اور دنیا کا کوئی دروازہ ان پر بند نہ ہو۔ ادب اور تاریخ، فلسفہ اور سائنس کے ذریعہ وہ سارے عالم کو اپنا جولانگاہ بنا سکیں۔"

جامعہ کی تعلیم کا مقصد مسلمان طلبا کو اپنی روزی کمانے کے لائق بھی بنانا ہے، چنانچہ مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"طلبا نے مذہبی تعلیم حاصل کر لی، ذہنی اور دماغی نشو و نما بھی ہو گیا۔ ساتھ ساتھ یہ خیال بھی پیش نظر رکھا گیا تھا کہ وہ اپنی روزی خالص دماغی کام کے ذریعہ ہی سے کمانے پر مجبور نہ ہوں۔ کوئی پیشہ ایسا بھی اختیار کر سکیں جس میں محض جسمانی محنت سے روزی کمائی جا سکے اور جس میں بڑے سرمایے کی حاجت نہ ہو، مثلاً نجاری، قفل سازی، پارچہ بافی وغیرہ۔"

غرضیکہ مولانا محمد علی مرحوم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی نصب العین کو جن عناصر سے ترکیب دیا تھا، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلام اور اس سے وابستہ مذہبی علوم کی تعلیم خصوصاً قرآن پاک کی تعلیم۔

(۲) آزادیٔ وطن کے پاک جذبے کی تربیت اور نشو و نما۔

(۳) علوم وفنون، تاریخ، فلسفہ، ہیئت اور سائنس کی تعلیم۔
(۴) معاش کے لئے ضروری فن کی تعلیم۔

مادری زبان میں تعلیم

مولانا طالب علموں کی اچھی تعلیم کے لئے یہ ضروری خیال کرتے تھے کہ ذریعۂ تعلیم ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ جماعتوں تک مادری زبان ہو، چنانچہ وہ اس مسئلے پر نہایت جوش سے لکھتے ہیں کہ

"ہماری غلامانہ ذہنیت کسی چیز سے اس قدر ثابت نہیں ہوتی جس قدر ایک غیر زبان میں تحصیل علوم کی مشقت رائگاں سے ثابت ہوتی ہے۔ ہم مشرقی تو وحشی لوگ ہیں اور بربریت میں مبتلا ہیں، لیکن خود تہذیب یافتہ مغربیوں کا کیا شعار ہے؟ کیا کوئی انگریز اپنے بچے کو تاریخ یا سائنس فرانسیسی یا جرمن زبان میں پڑھواتا ہے؟ کیا کوئی فرانسیسی یا اطالوی اپنے بچے کو جغرافیہ یا ریاضی، انگریزی یا روسی زبان میں سکھواتا ہے؟ لیکن ہماری غلامی اور اب ہماری غلامانہ ذہنیت کو دیکھ کر ہمارے اسکول اور کالجوں کے ہندوستانی اساتذہ بھی جو اکثر انگریزی زبان کو خود بھی اس طرح نہیں جانتے ہیں جس طرح کہ انگریز جانتے ہیں، ہندوستانی بچوں کو تاریخ اور سائنس، جغرافیہ اور ریاضی، انگریزی زبان میں سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

مولانا نے شروع ہی سے اردو کو جامعہ کے تمام درجوں میں ذریعۂ تعلیم قرار دیا، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا جامعہ کے طلبا نے بہتر طریقہ پر مضامین کو اخذ بھی کیا اور اس تعلیم کے لئے ان کو وقت بھی نسبتاً کم صرف کرنا پڑا۔

نظریہ اور عمل

مولانا محمد علی ایک انتہائی باعمل انسان تھے۔ چنانچہ صرف نظریوں سے انھیں دلچسپی نہ تھی بلکہ تعلیم میں بجا طور پر عمل پر زور دیتے تھے۔ اخلاقی تعلیم کا بہترین طریقہ یہ نہیں ہے کہ اخلاقی خوبیوں

کیے جائیں بلکہ اساتذہ خود ان اخلاق اوصاف سے متصف ہوں، وہ اپنی اخلاقی اور روحانی زندگی سے مدرسے کے ماحول کو اخلاقی اور روحانی بنا دیں تاکہ اس ماحول میں زندگی گذارنے ہی سے طلباء با اخلاق خدا پرست، ملت پرور اور وطن دوست ہو جائیں۔ مولانا محمد علی کی خود زندگی سراپا عمل تھی، وہ خود بذاتہ ان تمام خوبیوں کے بدرجۂ اتم حامل تھے، جو وہ اپنے طالب علموں میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جس کسی نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا وہ خود بہت حد تک ان خوبیوں کا حامل ہو گیا۔

اُن ہی کی تربیت یافتہ ایک جماعت نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسلام کی صحیح روح پھونکی، اور اہل ملک کو جہاد آزادی کے لئے آمادہ کیا، انھوں نے علی گڑھ کے فیشن پرستوں کو موٹے گاڑھے کا عاشق بنا دیا، مذہب اور آزادی کے لئے ہر قسم کی مالی اور جانی قربانی کا جذبہ انھوں نے اپنے ساتھیوں میں بدرجۂ اتم پیدا کر دیا، ان ہی کی تربیت یافتہ دوسری جماعت نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بقاء اور نشو ونما کے کام کو اپنے ذمے لے لیا اور بالآخر اس کو مسلمانوں کی ایک عظیم الشان درسگاہ بنا دیا۔

مولانا محمد علی آخر عمر میں اپنے دیگر ملی اور قومی کاموں کے باعث جامعہ ملیہ اسلامیہ کے روزمرہ کے کاموں میں حصہ نہ لے سکے اور ان کے جیسے عظیم مفکر وسیع الخیال اور وسیع الحزم سیاستداں کے لئے یہ ممکن بھی نہ تھا کہ وہ صرف خود کو ایک تعلیمی درسگاہ میں محدود کر دیتا۔ ان کی جولانگاہ وسیع تھی ان کو نہ صرف ہندستان کے کروڑوں مسلمانوں کی قیادت کا فرض ادا کرنا تھا بلکہ غیر مسلموں کی بھی جہاد آزادی میں راہ نمائی کرنی تھی۔ وہ ان فرائض کو آخر وقت تک نہایت جانسوزی، بے باکی اور خلوص سے انجام دیتے رہے، حتی کہ انھیں فرائض کی ادائیگی نے ان کی صحت کو تباہ کر دیا اور بالآخر وہ غم قوم و ملت میں گھل گھل کر شہید ہو گئے۔ خدا ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

انھوں نے دنیا کو سبق دیا کہ تعلیم کا اصل معنی عمل ہے، سوز زندگی ہے، عشق ملت اور انسانیت ہے۔ وہ اس شعر کی زندہ تفسیر تھے:

چہ باید مرد را طبع بلندے مشربے نابے ۔۔۔ دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بے تابے

مولانا محمد علی مرحوم انسانیت کے لئے عمل کا سب سے بہتر نمونہ حضور اکرم صلعم کی ذات بابرکات کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایمان راسخ تھا کہ صحیح تعلیم وہ ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے اور صحیح اسوۂ حسنہ وہ ہے جو محمد رسول اللہ کا اسوہ ہے، چنانچہ ان کا ایک شعر ہے:

ہو محمد کیوں نہ قرآں اور بھی ہم کو عزیز
اس میں خود تیری جو جیتی جاگتی تصویر ہے

(جوہر)

مولانا محمد علی نے مغربی تہذیب و تمدن کی گود میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن اپنی ذہانت اور طباعی سے اسلامی تمدن اور تعلیم کی تہہ تک پہنچ گئے اور بالآخر اسے انھوں نے تمام دنیا کے لئے بہترین تعلیمی نسخہ قرار دیا۔ ان میں احساس کمتری نام کو بھی نہ تھا بلکہ انھیں اپنی ملی روایات پر فخر تھا۔ وہ ایک بہادر انسان تھے، اس لئے بہادروں جیسی زندگی انھوں نے گذاری۔ وہ مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود اور اس کی بقا اور نشوونما کے قائل تھے چنانچہ تمام عمر اس کے لئے جدوجہد کی لیکن وہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے بھی مخالف نہ تھے بلکہ چاہتے تھے کہ جہادِ آزادی میں ہم سفر ہوں۔

غرضیکہ مولانا محمد علی نے اپنی تحریر و تقریر اور اپنے عمل سے اور مسلمانانِ ہند کے سامنے نہ صرف ایک صحیح تمدنی و تعلیمی نصب العین پیش کیا بلکہ اپنی اخلاقی خوبیوں اور مسلسل قربانیوں سے اس نصب العین کو ایک زندگی بھی بخش دی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بہت حد تک ان خوبیوں کو باقی رکھا ہے۔

چند مرحوم اساتذہ

۱۔ آپاجان ــــ مس گرڈ فلپس بورن	تاریخ وفات	۱۴ر اپریل ۱۹۴۳ء
۲۔ شفیق الرحمٰن قدوائی	״	۲ر اپریل ۱۹۵۳ء
۳۔ مولانا محمد اسلم جیراجپوری		۲۷ر دسمبر ۱۹۵۷ء
۴۔ حامد علی خاں	״	۵ر دسمبر ۱۹۶۳ء
۵۔ اختر حسن فاروقی	״	۱۵ر جولائی ۱۹۶۵ء

پروفیسر محمد مجیب

آپا جان ـــــــ مس گرڈ افلپس بورن

جہاں تک مجھے یاد ہے مس فلپس بورن سے ذاکر صاحب، عابد صاحب کی اور میری پہلی ملاقات ایک دعوت میں ہوئی، جو برلن میں مسز نائیڈو کی سب سے چھوٹی بہن مسز نمبیار کے مکان پر ہوئی تھی۔ یہ دعوت کھانے پینے کی نہیں تھی، اس کا مقصد ہندوستانیوں اور مہذب خوش اخلاق جرمنوں کے درمیان میل جول کے موقعے فراہم کرنا تھا۔ دعوت کی تاریخ کیا یاد رہتی سال کا بھی خیال نہیں، غالباً ۱۹۲۳ء تھا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد دو ایک مرتبہ اور ایسی محفلوں میں ملنا ہوا۔ پھر مسز نمبیار کسی بات پر خفا ہوگئیں اور دعوتوں کا سلسلہ بند ہوگیا۔

گھر پر ایک روز ذاکر صاحب نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا کہ "جب سے وہ دعوتیں بند ہوگئی ہیں نئے لوگوں سے ملنے کی نوبت ہی نہیں آئی" شائد انہیں اس معاملے کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا جس کی مجھے خبر نہیں تھی۔

"شائد لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارا معقول لوگوں سے ملنا انہیں کی عنایت سے ہو سکتا ہے۔"

"پھر کچھ کیجئے نا؟"

"کیا کروں؟"

"مس فلپس بورن ہی کو ٹیلیفون کیجئے۔"

"آپ نے اچھا یاد دلایا ابھی کرتا ہوں۔"

ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی تو میں پاس کھڑا تھا، چار کی دعوت میں، میں بھی بلایا گیا۔ ہم لوگ

پہنچے تو مس فلپس بورن گھر پر نہیں تھیں، ماں باپ پریشان تھے، انھیں نئے زمانے کا یہ طریقہ بالکل پسند نہ تھا کہ مہمان آجائیں اور میزبان گھر پر موجود نہ ہو، لیکن وہ اس ذرا سی بات کی کیا شکایت کرتے، جب نئے زمانے کی لڑکیاں خود مختاری کا دم بھر رہی تھیں، گھریلو زندگی بسر کرنے اور شادی کرنے سے انکار کر رہی تھیں، جس سے جی چاہتا ملتیں، جہاں جی چاہتا جاتیں، جب جی چاہتا گھر واپس آتیں، نہ کھانے کی فکر کرتیں نہ کپڑے کی، نہ انھیں اس کی پروا ہوتی کہ ماں باپ کا سایہ سر پہ نہ رہے گا تو کیا کریں گی۔ مس فلپس بورن کی بڑی بہن ڈاکٹر کارل مائیر دق کے ایک ماہر کے یہاں کام کرتی تھیں۔ میں ڈاکٹر مائیر سے اپنا معائنہ کرانے گیا تو وہ مجھے دیکھ کر اس طرح مسکرائیں گویا برسوں سے جانتی ہیں۔ انھیں سے معلوم ہوا کہ مس فلپس بورن کی بڑی بہن ہیں۔ اس کے بعد پھر کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی اور ہوتی کیسے وہ کسی کام، کسی مقام کی پابند نہ تھیں۔ ڈاکٹر مائیر کے یہاں کچھ دنوں کام کرنے کے بعد وہ جرمنی سے چلی گئیں۔ چند سال ہسپانیہ میں گذارے اب شاید جنوبی امریکہ میں ہیں۔ ماں باپ کو جو ذرا تسلی رہی وہ چھوٹی لڑکی کی ذات سے۔ انھوں نے ایک خوش حال تاجر سے شادی کی تھی ان کا گھر بار تھا، بچے تھے، اطمینان سے زندگی بسر ہوتی تھی، یہ اور بات ہے کہ قسمت نے ان کے گھر کو بڑی بے دردی سے اجاڑا، ان کی دولت لٹ گئی اور اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ آسٹریلیا میں ہیں، ان کے بچے متحدہ ریاستوں میں دوسرے عزیزوں کے ساتھ۔ مس فلپس بورن کے ماں باپ کے آخری دن بڑی مصیبت میں گزرے، ان پر ایک طرف نازی حکومت کی مار پڑ رہی تھی، دوسری طرف اولاد سے جدائی کا صدمہ تھا۔

مس فلپس بورن اپنی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور ہنر مند تھیں، ان کی طبیعت میں ویسی ہی بے قراری تھی جیسی کہ بڑی بہن میں، لیکن ہنر کا سہارا ملنا بڑی بات ہے۔ انھیں یقین تھا کہ جو کچھ کرنا چاہیں گی وہ کر سکیں گی۔ مہذب لوگوں میں ان کی قدر رہے گی۔ انھوں نے میونخ کے مشہور اسکول میں گانا سیکھا تھا، وہ اس فن کو جسے جرمنی میں بڑی عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے، برتتی رہتیں تو خاصی مشہور ہو جاتیں، ان کی معقول آمدنی ہوتی اور وہ اپنی زندگی

آرام سے گذارتیں، لیکن اطمینان سے رہنا انھیں گوارا نہ تھا، شاید اسی لئے انھوں نے خاندانی زندگی کی پابندیاں قبول نہیں کیں۔ وہ ایسا کرتیں تو شاید ان جذبات کو جنھیں قدرت نے عورت کے حصے میں رکھا ہے معمولی طریقے پر تسلی ہو جاتی، لیکن معمولی طریقوں کو پسند نہ کرنے سے قدرت کا نظام نہیں بدل جاتا۔ دنیا کو مرد نے بنایا ہے تو اس کی پرورش عورت کی گود میں ہوئی ہے اور یہی عورت کو تسلی نصیب ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ نسوانیت کے عالمگیر منصوبے میں کسی نہ کسی طرح سے شریک نہ ہو۔ مس فلپس بورن کی حساس اور قدرشناس طبیعت پرورش اور پرداخت کے کسی ادنیٰ منصوبے کو عمر بھر کے لئے کافی نہیں سمجھ سکتی تھی، انھوں نے نہ جانے کتنے لوگوں کی رنج اور پریشانیاں، فکریں اور الجھنیں، امیدیں اور حوصلے اپنا لئے، کیونکہ یہ لوگ ایسی ہمدردی کے مستحق معلوم ہوتے تھے۔ اس سے کہیں بڑھ کر یہ بات تھی کہ ان کے دل میں پرورش کرنے کا جو جذبہ تھا وہ انھیں غیر شخصی مقاصد میں مصروف اور مسرور رکھ سکتا تھا اور یہ ایک خصوصیت تھی جس نے ان کی اعلیٰ طبیعت کو اعلیٰ تر بنا دیا۔ برلن میں لاوارث یہودی بچوں کے لئے ایک تربیت گاہ قائم کرنا تجویز ہوا، مس فلپس بورن خوشی سے اچھل پڑیں اور ایک مدت تک اس تربیت گاہ کے سوا اور کسی چیز کا خیال ان کے دل میں نہ آیا۔ اس کے لئے انھوں نے چندہ جمع کیا، گھر گھر مانگ کر اس کے لئے ضروری سامان اکٹھا کیا اور سامان کو مزدوروں کی طرح برلن کی سڑکوں پر ٹھیلوں میں لے گئیں۔ تربیت گاہ کا کوئی سرپرست نہ تھا، مس فلپس بورن اس کی والی وارث بن گئیں۔ ہندوستان آتے ہوئے وہ چند مہینے فلسطین میں ٹھہری تھیں۔ یہاں کا سارا کام شروع سے شروع کیا جا رہا تھا اور اس سے ان کو ایک لگاؤ ہو گیا جو جامعہ کی محبت کے باوجود قائم رہا۔ جامعہ کی بے سروسامانی نے ان کی ہمت پست کرنے کی بجائے ان کے شوق کو دوبالا کر دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جامعہ والوں کے حوصلے بڑھتے رہے، روپیہ ملتا رہا، عمارتیں بنیں، لیکن بے سروسامانی کا احساس بھی پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہوتا گیا۔ مس فلپس بورن صفر سے عدد بناتی رہیں، ان کا سلیقہ ہماری مفلسی میں رونق پیدا کرتا رہا، جامعہ کی خدمت ان

کی زندگی کا آخری منصوبہ تھا اور اس میں اس طرح لگ گئیں کہ اب کوئی ان کو اس سے الگ نہیں کر سکتا۔

مس فلپس بورن کو سب سے زیادہ مرغوب وہ کام تھے جو نئے ہوں، مشکل ہوں، جنھیں کرنے والے کم ہوں مگر جو انسانیت یا اخلاق کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہوں۔ لوگ ایسے کاموں کی ذمہ داری لینے سے بچتے ہیں اس لئے کہ اس میں جان کھپانا پڑتی ہے اور ان سے روحانی تسکین کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مس فلپس بورن کے لئے ان کی سب سے بڑی کشش یہی تھی۔ یورپ میں ایسے بہت سے کام کئے جا سکتے ہیں اور کئے جاتے ہیں، لیکن وہاں قومی مقاصد افراد اور چھوٹی جماعتوں کے مقاصد پر اس طرح چھا گئے ہیں، زندگی کا دھارا اتنی تیزی سے بہتا ہے، افراد کی شخصیتیں، ریاست کی ہمہ گیر شخصیت میں اس طرح گم ہو گئی ہیں کہ جب تک قومیت کا جذبہ انھیں سہارا نہ دے اور تقویت نہ پہنچائے افراد اور چھوٹی جماعتیں سماجی خدمت کے کام کرنے کے لائق معلوم ہی نہیں ہوتے۔ ہم سب اپنے آپ سے پوچھتے رہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں آخر کیوں کرتے ہیں اور اگر ہم اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکیں تو ہمارا جی چھوٹ جاتا ہے۔ یورپ میں خدا کی خدمت نہیں کی جا سکتی، کیونکہ وہ لوگ جو سماجی کاموں کو پرکھتے ہیں اور جن کی ہمت افزائی شوق کو بڑھاتی ہے، خدا کو جانتے ہوں، تب بھی مانتے نہیں۔ خلق کی خدمت کی جا سکتی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ خلق اپنی قوم ہی ہو۔ مس فلپس بورن یہودی تھیں۔ جرمن قوم ان کی قوم بن نہیں سکتی تھی، یہودیوں کو ایک قوم بنانا خدا کو منظور نہیں، وہ کرتیں تو کیا کرتیں۔ اس سات سال کی مدت میں جو ہماری پہلی ملاقات اور ان کے جامعہ آنے کے درمیان گزری، یورپی زندگی سے ان کا رشتہ کمزور ہوتا گیا۔ ان کا دل آزاد تھا کہ جہاں چاہتا اپنا ٹھکانا بنا سکتا تھا۔ جامعہ میں آ کر وہ جامعہ کی ہو گئیں۔ انھوں نے ہندوستان کو اپنا ملک مسلمانوں کو اپنی قوم اور ہوتے ہوتے اسلام کو اپنا مذہب بنا لیا۔ اس طرح جامعہ کو ایک بے لوث خادم مل گیا اور مس فلپس بورن کو اپنے حوصلے پورے کرنے کے لئے ایک دنیا جو نئی تھی اور

ان کی اپنی تھی۔

مس فلپس بورن نے اپنے طریقہ پر جامعہ کی خدمت اسی زمانے میں شروع کر دی تھی جب کہ ہم لوگ برلن میں تھے، انھیں ہمارے ہر کام سے اور ہر شوق سے دلچسپی تھی، ہماری ذات سے لگاؤ تھا جیسا کسی بہن کو ہو سکتا ہے جو دوست بھی ہو۔ اس وقت میرے کئی مشغلے تھے جنھیں یاد کر کے اب ہنسی آتی ہے لیکن ان کی وجہ سے مس فلپس بورن کو خیال ہوا کہ میں یورپی تہذیب کے لطیف پہلو سے واقف ہوں۔ ذاکر صاحب مجھ سے زیادہ ہی جانتے اور سمجھتے تھے لیکن وہ انجان بننا بھی جانتے تھے۔ وہ بدیہی باتوں کی تردید، پسندیدہ چیزوں کی مذمت، تہذیب اور فن کے مانے ہوئے اصولوں کی مخالفت بڑے دلچسپ انداز اور شاید تفریح کی خاطر کیا کرتے تھے، اس لئے مس فلپس بورن نے ان کے مذاق کو تربیت دینا ضروری سمجھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئیں مگر اس کا انھیں یقین ہو گیا کہ اگر وہ ہندوستان آئیں اور جامعہ کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تو تہذیب کی اعلیٰ قدریں ان کی نظر سے چھپ نہ جائیں گی۔ آدمیت کو فروغ آدمی سے ہوتا ہے، مقاصد کا اندازہ ان کے خادموں سے کیا جاتا ہے۔ مس فلپس بورن کو ہندوستان نہ کسی کی شخصیت ہی کھینچ کر لائی نہ محض ایک مقصد بلکہ شخصیت اور مقصد کی وہ ہم آہنگی اور مناسبت جو دل میں اعتماد پیدا کرتی ہے اور کامیابی کی امید۔ یہ تو مس فلپس بورن ہی جانتی ہوں گی کہ جرمنی سے انھوں نے ہندوستان آ کر کیا کھویا اور کیا پایا۔ اس کا مجھے یقین ہے کہ وہ کسی کام میں اور کام کرنے والوں کی کسی جماعت میں اس طرح کھپ نہیں سکتی تھیں جیسے کہ جامعہ اور جامعہ کے خادموں میں۔

ہمارے اور ان کے درمیان کسی قسم کی غیریت یا بیگانگی کبھی تھی ہی نہیں۔ ہم انھیں کوئی آرام نہیں پہنچا سکے۔ ان کی رہائش میں جو انقلاب ان کے ماحول میں جو بنیادی تبدیلی ہوئی تھی اس صدمے کو ہم ہلکا نہیں کر سکے۔ ہماری اس کوتاہی کی شکایت انھوں نے کبھی کبھی کی مگر ان کا منشا کچھ اور ہوتا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ تکلیف اٹھائے بغیر کام کا حق ادا نہیں ہو سکتا ہے اور انھیں کام پسند ہوتا تو اس کی خاطر تکلیف اٹھانے میں بھی مزا آتا تھا۔ اس وجہ سے اگر کبھی جامعہ کے عام دستور کے خلاف

انھیں آرام پہنچانے کی کوئی کوشش کی جاتی تو وہ اس پر ناراض ہوتی تھیں، انھوں نے جلدی زندگی کے آداب کو خوشی سے سیکھا اور قبول کیا اور ہمیشہ اس کا خیال رکھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو ہمیں خلاف معمول یا نامناسب معلوم ہو۔ وہ جامعہ کی، جامعہ کے تمام ہمدردوں اور سرپرستوں کی، بچوں کی اور بڑوں کی "آپا جان" بن گئیں، اس طرح کہ ان کے عورت ہونے کا احساس بالکل مٹ گیا اور اپنے سلیقے اور استعداد سے جو فائدہ وہ جامعہ کو پہنچا سکتی تھیں وہ پورا پورا حاصل ہوا۔

آپا جان کبھی بے فکر اور بے کار نہیں رہ سکتی تھیں۔ کام کے خیال کو اپنے دل سے نکال نہیں سکتی تھیں۔ محنت کرنے والے تھکتے ہیں اور تھکن کو دور کرنے کے لئے ستانا چاہتے ہیں، آپا جان کو ستانا بھی گراں گزرتا۔ اگر کبھی ان کے سپرد کوئی ایسا کام نہ ہوتا جس میں وہ منہمک رہ سکیں تو وہ رنجیدہ اور پریشان ہو جاتیں، سمجھنے لگتیں کہ جامعہ کو ان کی ضرورت نہیں رہی۔ اگر انھیں اتنے کام دے دئے جائیں کہ جنھیں معمولاً تین چار آدمی کرتے ہیں تو ان کی خوشی، چہرے کی رونق اور رفتار کی تیزی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ بیماری کے زمانے میں ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا کہ میری طبیعت ہر کام سے تھوڑے دنوں میں ہٹ جاتی ہے، جی چاہتا ہے کہ کوئی اور نیا کام شروع کروں۔ آپا جان کی طبیعت میں استقلال نہیں تھا اور اس میں شک نہیں کہ پکا کام وہی ہوتا ہے جس میں شوق اور سلیقہ اور استقلال تینوں شریک ہوں، لیکن آپا جان کا منصب یہ نہیں تھا کہ ایک دو کام پابندی سے کرتی رہیں۔ جامعہ جس دور سے گذر رہی ہے اس میں یہ مفید نہیں ہے کہ اس کے خادم اپنے مقررہ فرائض انجام دیتے رہیں اور نئی ضرورتوں اور مصلحتوں کا خیال نہ کریں۔ آپا جان ہر وقت نئے کاموں کے لئے بے قرار رہتی تھیں اور ان کی اس بے قراری کے سبب سے جامعہ کے کئی چھوٹے بڑے کام ہو گئے ہیں، جن کے لئے قاعدے سے چلنے والے شاید فرصت ہی نہ نکال سکتے۔ آپا جان کی طبیعت میں صبر اور استقلال کی جو کمی تھی اس پر ان کے شوق کی شدت اور سلیقہ کی چال آخر نے ایک خوش نما پردہ ڈال دیا۔ ہم ان کے کاموں کی خوبی کو دیکھتے رہے

اس پر خوش ہوتے رہے کہ ان کی توجہ سے ایک ہی کام نہیں بہت سے کام خوش اسلوبی سے انجام پاتے ہیں لیکن ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ آپاجان خود بڑی کشمکش میں رہتی ہیں، انھیں ان کا شوق ایک طرف لے جانا چاہتا ہے تو یہ احساس کہ معمول کی پابندی کرنا چاہیئے دوسری طرف، ایک کام کو کرتے وقت انھیں دس اور کاموں کی فکر ستاتی رہتی، پھر بھی جتنے نمونے کے کام آپاجان نے کئے، جامعہ میں اور کسی سے نہ کئے ہوں گے۔ ان کا اٹھنا اور بیٹھنا، کھانا اور پینا، ان کے دل کا ابلا، ان کی زندگی کا ماحصل ان کے یہی کام تھے۔ انھوں نے جامعہ کی بستی اور اس کے کاروبار کو اپنے دل میں بسا لیا تھا، جیسے ماں اپنے بچے کو گود میں بٹھا لیتی ہے، اسے وہ بھول سکتی تھیں نہ چھوڑ سکتی تھیں، جو کچھ وہ کرتیں اسی کے لئے کرتیں۔ جامعہ کے کام بہت تھے آپاجان کو جامعہ سے محبت بہت تھی، وہ کاموں کا انتخاب نہیں کر سکیں، ان کو ترتیب نہیں دے سکیں، اس کے لئے جو ذرا سی بے تعلقی ضروری ہے اسے بھی ان کی طبیعت گوارا نہ کر سکی۔

کاروبار بڑے سے بڑا ہو سکتا ہے مگر آدمی کے دل کو اس سے بھی بڑا ہونا چاہیئے۔ جامعہ کو سب کچھ دے دینے کے بعد بھی آپاجان کے دل میں بہت جگہ رہ گئی۔ اپنے اور کاموں کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں کی سرپرستی اور مدد کرنے کے موقعے تلاش کرتی رہیں۔ لاوارث یہودی مردوں اور عورتوں کے خط آخر تک ان کے پاس آتے رہے، ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان تمام یہودیوں کو جو جرمنی سے بھاگ کر آئے تھے جانتی ہیں اور اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتی ہیں کہ جس کا ٹھکانا نہ ہوا سے ٹھکانے سے لگائیں۔ جامعہ میں عورتوں اور بچوں کا علاج اور تیمارداری ان کے نزدیک ان کا خاص فرض تھا اور انھیں بڑا دکھ ہوتا اگر ان کی مصروفیتوں کی وجہ سے کوئی بیمار ان کی توجہ سے محروم رہتا اور تمام معاملات میں بھی ان کی انسانی ہمدردی ہر وقت مشورے اور مدد کے لئے حاضر رہتی۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرتی تھیں کہ کوئی ان سے مشورہ لے یا مدد مانگے، خود ہی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے پہنچ جاتیں۔ ہندوستانی عورتیں تیمارداری اور بچوں کی تربیت کے متعلق بہت سی باتیں نہیں جانتی ہیں، آپاجان کو اس کی وجہ سے بڑی فکر رہتی اور

وہ چاہتی تھیں کہ جس طرح بھی ہو سکے دوسری عورتوں کو جلدی سے وہ سب کچھ سکھادیں۔ جو خود انھیں آتا ہے۔ انھیں اس کی بھی بڑی آرزو تھی کہ مسلمان عورتوں میں کام کرنے کا سلیقہ اور خدمت کا شوق عام ہو جائے۔ ان کی بہلندی اور محبت جہاں تک بیداری پھیلا سکتی تھی پھیلاتی رہی۔

عورتوں ہی کے لئے نہیں مردوں کے لئے بھی آپا جان ایک مثال تھیں کام کی دشواریاں ان کے جوش کو کبھی ٹھنڈا نہ کر سکیں۔ جامعہ کی بے مائگی سے ان کے حوصلے کبھی پست نہیں ہوئے، اپنے ساتھیوں کے شوق اور ان کی استعداد پر انھیں ہمیشہ اعتبار رہا، ایسا اعتبار دوسروں میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور بارہا ایسا ہوا کہ آپا جان کی ہمت افزائی نے وہ کام کرا دئے جن کے انجام پا سکنے کی کسی کو امید نہ تھی۔ ان کی سمجھ میں جیسے یہ نہ آتا تھا کہ کام کے ہوتے ہوئے لوگ مطمئن کیسے رہ سکتے ہیں۔ ویسے ہی وہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ وہ مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ امید تو امید کہلانے کی مستحق تب ہی ہوتی ہے جب وہ قرائن اور استدلال کی پروا نہ کرے، یاس شرپی کی منطق کو اپنے اندر سے اسی طرح گذر جانے دے جیسے کوئی مضبوط درخت گرم ہوا کے جھونکے کو۔ آپا جان کو جامعہ ہمیشہ پھولتی پھلتی، آسمان کی طرف بڑھتی، زمین پر اپنا سایہ پھیلاتی نظر آئی اور انھیں یقین تھا کہ اس کے خلاف کسی کو کچھ دکھائی دیتا ہے تو وہ نظر کا فریب ہے، آپا جان کو سمجھانا اور قائل کرنا آسان نہ تھا۔ آخر میں ہم ہی کو ماننا پڑتا کہ ہمارے اندیشے غلط ہیں، مایوسی بے بنیاد۔ آپا جان کے دل میں امیدوں کی جو روشنی تھی وہ ہماری آنکھوں کا نور بن جاتی۔

بیماری کی بے بسی انسان کا بڑا سخت امتحان لیتی ہے، بیمار کا کوئی فرض نہیں ہوتا حق ہی ہوتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہ حق اسے پورا پورا ملے۔ آپا جان کو اصرار تھا کہ انھیں کم سے کم دیا جائے، انھیں برابر اس کی فکر رہتی تھی کہ ان کی وجہ سے جامعہ کے کسی کام کا ہرج نہ ہو۔ آپریشن کے بعد کچھ دن ان کی طبیعت اچھی رہی۔ لوگ ان سے ملنے جاتے تھے تو جامعہ کا ہی ذکر رہتا تھا۔ ان کی حالت بگڑ گئی تب بھی جو دو چار جملے وہ بول سکتی تھیں وہ جامعہ کی نذر ہو جاتے۔ ۲۸ اپریل ۴۳ء کو ان کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ انھیں دیکھنے کے لئے معمول سے زیادہ لوگ چلے گئے، کئی گھنٹے

بعد انھیں ذرا سا ہوش آیا اور انھوں نے چار پانچ لوگوں کو پلنگ کے گرد کھڑا پایا تو کہا "آج جامعہ میں جلسہ نہ ہوگا، آپ سب یہاں آگئے ہیں؟" ہم نے انھیں یقین دلایا کہ "قومی ہفتہ" کا جلسہ ایک دن پہلے ہو چکا ہے تو انھیں اطمینان ہوگیا اور انھوں نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جامعہ کی فکر کے ساتھ انھیں آخر وقت تک اس پاس کے لوگوں کا بھی خیال تھا۔ ہسپتال کے جس مریض کو ضرورت ہوتی اس کے پاس وہ اپنی دوا اور غذا اور نرس کو ضد کرکے بھیجتیں، مریضوں کا حال دریافت کرتی رہتیں، ان کی تکلیف کو اپنا دکھ درد بنا لیتیں۔ انتقال سے ایک دن پہلے جب ان کی طبیعت ذرا دیر کے لئے سنبھلی تو انھوں نے ایک بچے کو جو قریب کے وارڈ میں رہتا تھا روتے سنا، انھوں نے نوڑا نرس کو بھیج کر اپنے پاس بلوایا، بسکٹ کھلائے، پیار کیا اپنے پاس لٹایا اور تھپک کر سلا دیا۔ یہ ان کی آخری محبت کا کرشمہ ان کی نسوانیت کی معراج تھا۔

یہ سب کچھ میں نے دیکھا یا سنا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہ کہنا چاہیئے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں بے ادبی نہ ہو جائے مگر دل نہیں مانتا۔ آپا جان جامعہ کو ایک بہت بڑے احسان سے شرمندہ کرکے گئی ہیں۔ انھوں نے زندگی کے جو بارہ سال ہمارے ساتھ گذارے ان میں وہ برابر تکلیف اٹھاتی رہیں اور آخر وقت میں بھی وہ جامعہ کی خاطر ایک ایسے حق سے دست بردار ہوگئیں جس کو وہ اپنا حق سمجھتی تھیں۔ انھوں نے دل کی تنہائی قبول کی، عشق کو صبر کا کڑوا گھونٹ پلایا، وعدے کو امید، امید کو حسرت، حسرت کو موت بن جانے دیا اور کہتی رہیں کہ یہی مناسب ہے، ان کی قربانی بارآور ہوئی، ان کی سانس اکھڑی تو جامعہ والوں کو مبارکباد دے کر اکھڑی، بس اور کچھ نہ کہوں گا۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں مجھے قدم رکھنے کی تاب نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ جامعہ والوں میں سے دو ایک بھی اس مقام تک پہنچ جائیں تو ہماری خدمت خدا کے حضور میں پیش کرنے کے لائق ہو جائے گی۔

پروفیسر محمد مجیب

شفیق الرحمٰن قدوائی

۱۹۰۱ء ——— ۱۹۵۳ء

میں سمجھتا ہوں کہ دوستی سے زیادہ پاک، آدمی کو بنانے والا اور آدمیت کو چمکانے والا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ زندگیاں جنہیں دوستی نے ملا دیا ہو، کسی طرح سے جدا نہیں کی جا سکتی ہیں۔ اسی وجہ سے کوئی اپنے دوست کا ذکر کرتا ہے تو اپنا ذکر کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ آپ معاف کیجئے اگر مرحوم شفیق صاحب کے ساتھ میں کہیں اپنا ذکر بھی کرتا رہوں۔ اگر آپ لوگوں میں سے، جنہیں شفیق صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا تو آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ وہ دوستوں ہی کے نہیں بلکہ ہر شخص کے دوست تھے اور میرا ان کا تو چھبیس ۲۶ سال ساتھ رہا۔ ان کی قبر میں میری زندگی کا بڑا قیمتی حصہ دفن ہو گیا ہے۔ انہیں یاد کروں اور اپنا تذکرہ کروں......... تو محبت اور دوستی کی بات نہ ہو سکے گی اور مضمون نگاری اس وقت میرا مقصد نہیں ہے۔

شفیق صاحب کی سیاسی تربیت ۱۹۲۰ء کی ستیہ گرہ کی تحریک سے شروع ہوئی میں اس زمانے میں انگلستان میں تھا۔ مجھے حالات کا صحیح علم نہیں۔ شری راج گوپال اچاریہ ۱۹۲۲ء میں ان کے ساتھ ویلور جیل میں تھے۔ ان دونوں میں بڑی محبت ہو گئی۔ راجہ جی نے اپنے تعزیت کے خط میں وہ عبارت نقل کی ہے جو انہوں نے شفیق صاحب سے ملنے کے بعد اپنی ڈائری میں لکھی تھی کہ "آج علی گڑھ کے ایک نوجوان شفیق الرحمٰن قدوائی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنی عمر میں ایسا شائستہ، شریف، صداقت پرست، خدا سے ڈرنے والا نوجوان نہیں دیکھا ہے" راجہ جی اس وقت شفیق صاحب کی ایک ادھ صفت ہی کی

شفیق صاحب بڑا گاؤں (ضلع بارہ بنکی) میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے اور ۲ اپریل ۱۹۵۳ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ جامعہ نگر میں دفن کئے گئے۔ (اعظمی)

مستقل مزاجی کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بارے میں جامعہ والوں سے پوچھیے۔ شفیق صاحب اُن جوشیلے نوجوانوں میں سے تھے جنھوں نے جامعہ کو قائم کیا اور ان گنتی کے چند آدمیوں میں جنھوں نے جامعہ کو قائم رکھا۔ ہو سکتا تھا کہ جامعہ ایک سیاسی چال بن کر رہ جائے۔ ایسا نہیں ہونے پایا۔ جامعہ ایک تعلیمی ادارہ، قومی تعلیم کی نئی تحریک کا ایک نمونہ، قوم پرست مسلمانوں کی آبرو بن گئی۔ ۱۹۲۶ء میں جب میرا نام جامعہ کے خادموں میں لکھا گیا یہ بنیادی بات طے ہو گئی تھی کہ جامعہ قائم رہے گی اور تعلیم کا کام کرے گی۔ شفیق صاحب اس وقت کالج میں پڑھاتے تھے۔ ہاکی کے خاصے مشہور کھلاڑی تھے۔ ہر طرح سے اس بات کو چھپاتے تھے کہ جامعہ والوں کی ہمتیں بڑھانے میں اُن کا کتنا ہاتھ ہے۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں صاحب کے انتقال کے بعد جامعہ بالکل لاوارث ہو گئی اور ہم لوگوں نے طے کیا کہ لیڈروں کا سہارا نہ ڈھونڈیں گے، اپنا بوجھ خود اُٹھائیں گے۔ میں بغیر سوچے سمجھے ذاکر صاحب کے ساتھ جامعہ چلا آیا تھا اور ایسے ہی بغیر سوچے سمجھے میں نے ایک عہد نامے پر دستخط کر دیے کہ بیس سال تک جامعہ کی خدمت کروں گا۔ اس کی تدبیریں کرنا کہ جامعہ کا کام کیسے چلے، ذاکر صاحب اور شفیق صاحب جیسے لوگوں کی ذمے داری تھی۔ بڑی مشکل سے ریاست حیدرآباد سے ایک ہزار روپیہ مہینہ کی امداد منظور کرائی گئی۔ لیکن جب ۱۹۳۰ء کی تحریک شروع ہوئی تو شفیق صاحب اس میں شریک ہو گئے اور دہلی کے چیف کمشنر نے گرانٹ کو بند کرا دیا۔ اس سے جو مایوسی ہوئی، اس کے مقابلے میں وہ کارنامے تھے جو شفیق صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے دہلی میں کر دکھائے اور شفیق صاحب جیل سے نکل آئے تو گرانٹ کو دوبارہ جاری کرانے کا بندوبست بھی ہو گیا۔

۱۹۳۱ء میں میں اورنگ آباد میں ایک کتاب لکھنے میں مصروف تھا۔ جامعہ کی خبریں بس کبھی کبھی سننے میں آتی تھیں۔ شفیق صاحب ایک ساتھی تھے جن کی کارگزاریوں کی داستان سُن کر خوشی ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ جیل سے نکلنے کے بعد انھوں نے چندہ جمع کرنے کا پروگرام بنایا اور مجھے اس میں شامل کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس کام کے لئے بالکل موزوں نہیں ہوں مگر شفیق صاحب کوئی بات طے کر لیتے تھے چاہے وہ اپنے لئے ہو یا دوسروں کے لئے تو آسے منسوخ کرنا ہی

پڑتا تھا۔ مجھے کچھ ایسا لگتا تھا کہ مجھے محبت، خلوص اور میٹھی باتوں کی ایک نرم گدگدی چادر میں لپیٹ لیتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے اسے مان لیا کرتا تھا چاہے میری رائے کچھ اور ہوتی۔ انھوں نے طے کیا تھا کہ مجھے ساتھ لے کر دہلی سے بمبئی جائیں گے۔ بمبئی میں سفر خرچ جمع کر کے کولمبو پہنچیں گے اور وہاں چندہ مانگیں گے۔ وہ میری طبیعت سے واقف نہیں تھے۔ بعد کو انھیں سے معلوم ہوا کہ انھوں نے سوچا تھا کہ بھگتنا پڑا تو بھگت لیں گے۔ سفر میں جتنا کوئی دوسرے کے لئے کر سکتا ہے وہ انھوں نے میرے لئے کیا۔ جب ہم کسی کے پاس چندہ مانگنے جاتے تو وہ مجھے آگے رکھتے تھے اور باتیں خود کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ آدمی کو اور موقع کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ کوشش زیادہ سے زیادہ کرتے ہیں۔ اُمید بہت کم کی رکھتے ہیں۔ گفتگو جذباتی ہوتی ہے، فیصلے ٹھنڈے دل سے کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چندہ مانگنے کے کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

جب کوششوں کے نتیجے پر غور کرنے کا وقت آیا تو میری یہ رائے تھی کہ چندہ مانگنے میں محنت اور وقت بہت صرف ہوگا اور حاصل بہت کم ہوگا اور میں بہر حال ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جس کے ساتھ لگنے سے کسی کو کوئی مدد مل سکے۔ شفیق صاحب نے طے کیا کہ چندہ بہت بڑے پیمانے پر منظم طریقے سے جمع کرنا چاہیے۔ مگر ہر دینے والے سے اتنا ہی مانگنا چاہیے جتنا کہ وہ آسانی سے دے سکے۔ اس پلان کے مطابق انھوں نے جامعہ کے ہمدردوں کا ایک حلقہ بنایا۔ کسی نے دو آنے یا چار آنے دینے کا وعدہ کیا تو اُسے بھی قبول کیا۔ اور چندہ وصول کرنے لگے۔ اس کام میں وہ پانچ چھ برس تک لگے رہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو کس طرح دل و جان سے اس کام کے لئے وقف کر دیا ہے۔ انھوں نے اعداد و شمار جمع کئے، چارٹ بنائے، گراف بنائے۔ کسی کو سمجھاتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک تحریک کے رہنما ہیں اور ہر بات کی ہر وقت خبر رکھتے ہیں۔ آخر میں جب جامعہ کے ہمدرد دس ہزار سے زیادہ ہو گئے اور خالص ڈیڑھ ہزار ماہوار ہو گئی تو انھوں نے اس نئے بنائے کام کو دوسروں کے سپرد کر دیا۔ کام کو ترقی دے کر چھوڑ سکنا، اس کے لئے جو محنت کی تھی اُسے بھول جانا اس سے جو عزت اور حیثیت حاصل ہوئی تھی اُسے خوشی کے ساتھ دوسرے کی نذر کر دینا اسی کے لئے ممکن تھا۔

جس کا عمل بہت بڑا ہو شفیق صاحب چاہتے تو جامعہ کے اُن داتا بنے رہتے۔ ان کو شوق خدمت کا تھا اس لئے پروا نہیں تھی کہ اُن کی محنت کی کمائی کو کون وصول کرتا ہے۔ انھوں نے چندہ جمع کرنا چھوڑ دیا ایک نئے کام میں لگ گئے جس کو بالکل شروع سے شروع کرنا تھا۔

یہ نیا کام بالغوں کی تعلیم کا تھا۔ اس کا انھیں ذرا بھی تجربہ نہیں تھا اور جامعہ سے انھیں نہ کوئی سرمایہ ملا نہ کوئی سامان۔ خود انھوں نے اس کا ارادہ کیا تھا کہ اپنا کام خود چلائیں گے اور جامعہ پر کسی طرح کا بار نہ ڈالیں گے۔ انھوں نے مختلف طریقے آزمائے۔ مسجد، محفل، گھر، بازار سب کو تجربے کا میدان بنایا اور تھوڑے ہی دنوں میں اپنے لئے ایک راہ نکال لی۔ اُن کی گفتگو میں ہمیشہ زور اور جوش ہوتا تھا لیکن وہ اپنے کام کو بڑی سختی سے جانچتے بھی تھے۔ میں اُن کی باتیں سنتا تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ بالغوں کی تعلیم کے لئے صحیح طریقے کی نہیں حق کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ اور شاید یہی بات تھی جس سے اس میدان کے تمام کام کرنے والوں میں ان کی ایک خاص حیثیت ہو گئی۔ انھوں نے جامعہ کے صرف ایک شعبے کو ترقی نہیں دی بلکہ سماجی تعلیم کا شوق رکھنے والوں کو مجاہدوں کی ایک جماعت بنا دیا۔

شفیق صاحب کی وضع داری ایسی تھی کہ کام کو بدلنے سے ان کے تعلقات میں کبھی فرق نہیں پیدا ہوا۔ جو لوگ سیاسی تحریکوں میں اُن کے ساتھ تھے وہ چندہ جمع کرنے میں اُن کی مدد کرتے رہے۔ جنھوں نے چندہ جمع کرنے میں ان کی مدد کی تھی، انھیں بالغوں کی تعلیم سے دل چسپی ہو گئی۔ ان کی صداقت، ان کے خلوص، ان کی دوست مزاجی کا اتنے لوگوں پر اثر تھا کہ جب آزادی کے بعد نیا انتخاب ہوا تو دوستوں نے اصرار کیا کہ شفیق صاحب سیاست کے میدان میں آجائیں۔ وہ خود انڈونیشیا میں تھے اور کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں دہلی میں ان کی طرف سے ساری کارروائیاں ہو گئیں اور وہ اپنے حلقے میں منہ دکھائے بغیر منتخب ہو گئے۔

آپ نے اکثر یہ شکایت سنی ہو گی کہ آزادی ملنے کے بعد ہماری حکومت کا طریقہ بہت کم بدلا ہے۔ یہ شکایت سب اپنے اپنے مطلب سے کرتے ہیں۔ مجھے جو بات نظر آتی ہے وہ یہ ہے

کہ جن لوگوں نے حکومت کو سنبھالا وہ سیاسی کاموں کو انجام دینے میں اور اپنے عہدوں کا حق ادا کرنے میں اس طرح مصروف ہو گئے کہ ان کا معمول اُن کے اور جنتا کے درمیان ایک اوٹ سا ہو گیا۔ دراصل یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ لیکن شفیق صاحب کو یہ گوارہ نہیں تھا کہ اُن کا وزیر ہونا کسی کو محسوس ہو۔ اُن کے اخلاق میں کچھ اور وسعت، اُن کے انکسار میں کچھ اور شدت پیدا ہو گئی۔ حکومت کا کام اُن کے لئے دلجوئی کا ایک عظیم الشان منصوبہ بن گیا۔ وہی شائستگی، شرافت اور خدا ترسی جو راجہ جی کو ۲۲ء میں جیل کے نوجوان ساتھی میں نظر آئی تھی، ایک نئے مقام پر پہنچ کر اور زیادہ چمکنے لگی اور دیکھتے دیکھتے بجھ گئی۔ اب تاریکی اور سنّاٹے میں شفیق صاحب کی ہمت، اُن کا دوست کو سمجھانا، مخالف کو راضی رکھنا، ارادے کی مضبوطی کو ہنس ہنس کر چھپانا، صرف خدا کے حق کو مانتے ہوئے ہر ایک آدمی کا حق ادا کرنا، یہ سب بہت یاد آتا ہے۔ دنیا کا کام تو بہرحال چلتا رہے گا لیکن دوست کو تسلی دوست سے ہی ہو سکتی ہے۔

ضیاءالحسن فاروقی

مولانا محمد اسلم جیراجپوری

۱۸۸۲ء ——— ۱۹۵۷ء

مولانا محمد اسلم جیراجپوری کے نام سے پہلے پہل میں اس وقت آشنا ہوا جب میں نے ان کی "تاریخ الامت" دیکھی۔ طالب علمی کے ابتدائی دَور میں جب میں تاریخِ اسلام کا مطالعہ کررہا تھا میرے ایک کرم فرمانے "تاریخ الامت" کے مطالعے کا مشورہ دیا۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے پوچھا: "کیا تم نے وہ کتاب دیکھی؟" میں نے کہا: "جی ہاں۔" کہنے لگے "مصنف کو بھی دیکھا ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا "کیا وہ زندہ ہیں؟" اس تعجب میں اپنی لاعلمی بھی شامل تھی اور وہ تاثر بھی پوشیدہ تھا جو "تاریخ الامت" کے پڑھنے کے بعد دل و دماغ پر طاری تھا۔

اب اسے حُسنِ اتفاق کہوں یا امتدادِ زمانہ کا احسان کہ اِس وقت میں جامعہ کالج میں اُن کے ایک ادنیٰ ساتھی کی حیثیت سے درس دیتا ہوں۔ پہلے دن جب میں کالج پہنچا تو ایک مردِ بزرگ٭ کی طرف اشارہ کرکے ایک صاحب نے فرمایا: "یہ مولانا اسلم جیراجپوری ہیں۔" میں نے بڑھ کر سلام اور مصافحہ کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ خوش ہوئے اور فرمایا: "اچھا ہوا آپ یہاں آگئے۔" بس، اس دن سے لے کر آج تک، کہ ایک سال سے زیادہ کی مدت گزری، میں اُن کو بہت قریب سے، چلتے ہوئے، بیٹھتے ہوئے، نماز کے لئے مسجد جاتے ہوئے، پڑھتے ہوئے، پڑھاتے ہوئے، حقہ پیتے ہوئے، دوسروں کو حقہ پیش کرتے ہوئے ——— غرض مختلف انداز میں بڑے غور سے دیکھتا رہا ہوں۔

٭یہ مضمون ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کے تقریباً دو سال بعد مولانا کا ۱۹۵۷ء میں انتقال ہوگیا۔

مولانا محمد اسلم جیراجپوری ۱۸۸۱ء میں اپنے وطن موضع جیراجپور (ضلع اعظم گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد مولانا سلامت اللہ مرحوم حج کو گئے ہوئے تھے۔ جب وہ خانہ کعبہ کی زیارت سے واپس آئے تو ان کو نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے بلاکر مدرسۂ وقفیہ (بھوپال) کا صدر مدرس بنا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ مدرسۂ سلیمانیہ کے نائب مہتمم اور پھر اس کے بعد ریاست بھوپال کے صیغۂ تعلیمات کے مہتمم ہوگئے۔ نواب صاحب علم وفضل کے قدردان تھے عربی وفارسی پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کی عربی کی تصانیف کی شہرت ممالک اسلامیہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ وہاں کھنچ کر پہنچتے تھے۔ عراق، شام اور نجد وغیرہ کے علما اور طلبا بھی کبھی کبھی وہاں آتے رہتے تھے۔ مولانا سلامت اللہ صاحب مرحوم چونکہ سلیقۂ گفتگو میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے اور عربی نہایت صاف اور بے تکلف بولتے تھے، اس لئے عرب مہمانوں سے گفتگو کے لئے بیشتر وہی بلائے جاتے تھے۔

اُس زمانے میں بھوپال علماء وفضلاء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ عربی زبان و ادب، حدیث وقرآن اور منقولات ومعقولات کا ایک سے ایک جید عالم وہاں موجود تھا۔ قاضی عبدالحق صاحب صدر، شیخ حسین عرب اور مولوی بشیر احمد صاحب سہسوانی جیسے علماء جہاں جمع ہوں اُس شہر کا "عیار ستانِ بازارِ علم" میں کیا درجہ ہوگا، اسے جاننے والے خوب جانتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے وقت کا امام تھا۔ اس قسم کے لوگ اب اس زمانے کی مٹی سے نہیں ڈھالے جاسکتے۔ ان کا ذکر میں نے اس لئے ضروری سمجھا کہ بھوپال کے اس علمی ماحول میں مولانا اسلم کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ مولانا کا کہنا ہے کہ انھوں نے ان سب فضلا کے روزگار کو دیکھا ہے۔

مولانا اسلم چھ سال کے تھے کہ ان کے والد انھیں بھوپال لے گئے اور ابھی ان کی عمر کا نواں سال ہی تھا کہ انھوں نے قرآن شریف حفظ کرلیا۔ اب اس کے بعد فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"حفظِ قرآن کی بدولت محنت کی عادت پڑگئی تھی اور حافظہ قوی ہوگیا تھا، جو کچھ پڑھتا تھا

چند بار دہرانے سے ازبر ہوجاتا تھا۔یہاں تک کہ گلستان اور بوستان دونوں کتابیں پوری پوری یاد کرڈالیں ..... قواعد کی مشق لکھا کر کرائی گئی۔چنانچہ اس نوشتہ کو قواعد اسلمیہ کے نام سے میں نے اسی زمانے میں سرکاری مطبع میں طبع کرادیا تھا۔ایک جزو کا مختصر رسالہ سلیس فارسی زبان میں ہے۔

فارسی کا کل مرحلہ چار سال میں ختم ہوگیا۔اسی کے ساتھ ساتھ ریاضی بھی۔پھر ایک ماسٹر صاحب سے انگریزی پڑھی۔اس کے بعد عربی کا سلسلہ شروع ہوا۔صرف ونحو، فقہ و اصولِ فقہ، منطق و فلسفہ، ادب، حدیث و قرآن کی پوری تعلیم مولانا نے مولوی فتح اللہ صاحب اور اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔مولانا سلم کے بھی دو استاد تھے جن کے قدموں میں بیٹھ کر مولانا نے علومِ دینیہ کی تکمیل کی۔مولوی فتح اللہ صاحب ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور صرف ونحو اور فقہ و اصولِ فقہ کے اچھے استاد مانے جاتے تھے۔ہمارے یہاں یہ بات اصول کی حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کسی عالم نے کسی عربی مدرسے سے دستارِ فضیلت نہیں حاصل کی ہے تو اُسے عالم نہیں مانتے اور اس کے علم کو ناقص جانتے ہیں۔

بہتوں پر آج تک یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور مولویوں کا ایک بڑا طبقہ مذہب کے معاملے میں ان کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی اسی قسم کی باتیں کہی جاتی ہیں ـــــ اور مولانا اسلم تو ساری عمر اسی چیرہ دستی کا شکار رہے ہیں۔اب ان معترضین کو کون بتلائے کہ مدرسہ وخانقاہ کے باہر بھی علم ہے اور اپنی تمام پہنائیوں کے ساتھ دعوتِ اصلاح و جہاد دیتا رہتا ہے۔

اکیس سال کی عمر میں مولانا محمد اسلم جیراجپوری اپنی تعلیم وتربیت کے دَور سے گزر چکے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور پیسہ اخبار (لاہور) میں مترجم کی حیثیت سے کام شروع کیا۔لیکن دوسرے سال ہی والد کی بیماری نے انھیں بھوپال بُلا لیا۔چند روز کے بعد ان کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔پھر مولانا لاہور نہیں گئے۔ ۱۹۰۶ء میں وہ علی گڑھ پہنچے۔ وہاں کالجیٹ اسکول میں عربی اور فارسی کا درس دینے لگے۔چھ سال کے بعد کالج کی لٹن

لائبریری میں مشرقی کتابوں کا شعبہ ان کے سپرد ہوا۔ وہاں انھوں نے کتابوں کی فہرست مرتب کی جو اپنی جگہ خود ایک بڑی علمی خدمت ہے۔ پھر وہ کالج میں آگئے اور عربی اور فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ سنہ ۱۹۲۰ء تک کالج سے وابستہ رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہماری قومی زندگی کا دھارا بہت تیز بہنے لگا تھا اور ایک عمومی حرکت نے ملک و قوم کے سامنے شاندار مستقبل کی راہیں کھول دی تھیں۔ تحریکِ خلافت، ترکِ موالات اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام سے کون ناواقف ہے۔ در حقیقت ہماری قومی زندگی "لذتِ کام و دہن" کی آزمائش سے گزر چکی تھی۔ اس کی رگ و پے میں اب ایک دوسرے غم کا زہر اُتر چکا تھا۔ اب ہم اس منزل پر تھے جہاں دار و رسن کی آزمائش تھی۔ مولانا اسلم نے اس منزل پر وطن اور ملت کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جب وقت آیا تو انھوں نے علی گڑھ کالج کو خیر باد کہہ دیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ یہ گویا مادی سکون و اطمینان کو تیاگ کر بے سر و سامانی کو اوڑھنا بچھونا بنانا تھا۔ مولانا نے اسبابِ عیش سے محروم ہو جانا اور قوم کی آبرو کا محافظ بننا پسند کیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک جامعہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور باوجود پیرانہ سالی کے شاہانہ وقار کے ساتھ تعلیم و تعلم کا کام کر رہے ہیں کہ بوریائے علم کے سامنے تخت و تاج بھی سر جھکاتے ہیں۔

مولانا عالمِ دین ہیں۔ حافظِ قرآن ہیں۔ کتابِ الٰہی کے اسرار و رموز پر نظر رکھتے ہیں۔ مؤرخ ہیں۔ شاعر ہیں اور اعلیٰ درجے کے ادیب دانش پرداز ہیں۔ مولانا اسلم تاریخِ اسلام کے اچھے عالم ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی دو مشہور کتابیں علمی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ تاریخ الامت (آٹھ جلدوں میں) اور تاریخ نجد۔ فاتح مصر عمرو ابن العاص کی سیرت اور حالاتِ وجاتی کے حالاتِ زندگی اور ان کی شاعری پر تبصرہ کر کے مولانا نے سیرت نگاری اور سوانح کے میدان کو بھی نہیں چھوڑا۔ ان کتابوں کے ماخذ عربی و فارسی کی مستند کتابیں ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا نے قدیم کتبِ تاریخ سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ میرے نزدیک کوئی جرم نہیں ہے۔ تاریخ مستند ماخذوں کے سہارے ہی پڑھی اور مرتب کی جاتی ہے۔

میں مولانا کو مورخ اس لئے مانتا ہوں کہ تاریخ اسلام کو انھوں کو کھنگالا ہے، واقعات کے اسباب وعلل اوران کے نتائج کو تنقیدی نظر سے جانچا ہے۔ زمانے کی اسپرٹ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اوراسی آئینے میں سلطنتوں کے عروج و زوال کی تصویریں دیکھی ہیں۔

آپ ان سے گفتگو کیجئے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی نگاہ کتنی دُور تک پہنچتی ہے، البتہ تاریخ الامت میں ایک چیز کی کمی مجھے نظر آئی اور وہ یہ کہ معاشی حالات کا جو اثر معاشرتی نظام پر پڑتا ہے اور یہ اثر کافی گہرا پڑتا ہے، اسے مولانا نے نظرانداز کردیا ہے۔ اس سلسلے میں مَیں نے مولانا سے گفتگو کی۔ وہ تہذیب وتمدن کی تاریخ میں معاشی عناصر کو اہمیت دیتے ہیں۔ پھر نہ معلوم کیوں تاریخ اسلام کو انھوں نے اس نقطۂ نظر سے نہیں پرکھا۔

مولانا اسلم نے شاعری بھی کی ہے اور فارسی اور اُردو میں اچھے شعر کہے ہیں مگر یہ مشغلہ زیادہ دنوں تک نہیں چلا۔ اسے موانع کار میں سے سمجھ کر انھوں نے ترک کردیا۔ مولانا کے اشہب قلم کی جولانی اور بحر تخیّل کی پہنائی دیکھنا ہو تو ان کے ادبی وتنقیدی مضامین پڑھیئے۔ ان کی تحریروں میں آپ طنز و مزاح بھی پائیں گے اور توازن اور تعمیری پہلو بھی۔ وہ آجکل کے بعض خودساختہ نقادوں کی طرح تنقید برائے تنقید کے قائل نہیں۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی مثنوی اسرارِ خودی جب پہلی بار شائع ہوئی تو تصوّف کی بحث میں حکیم افلاطون یونانی اور خواجہ حافظ شیرازی کے متعلق علامہ کے خیالات پر بعض لوگوں نے احتجاج کیا۔ جب بڑی گہماگہمی ہوئی اور مخالفین وموافقین کی طرف سے بے معنی تحریروں کا ایک طومار بندھ گیا تو مولانا نے قلم اُٹھایا اور اپنے خاص انداز میں ایک متوازن رائے پیش کردی۔ اس سلسلے میں "تصوّف اسلام" پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کا شمار انشاپردازی کے بہترین نمونوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"...... جب تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے اور چنگیز اور ہلاکو نے ایک قیامت صغریٰ برپا کی تو اُن کی ہولناک خونریزیوں سے اُمّت کے فاتحانہ جذبات بٹ گئے، دنیا کی طرف سے ان کے

دل سرد ہو گئے۔ طبیعتوں کا جوش اور ولولہ جاتا رہا، حوصلے پست اور ہمتیں شکست ہو گئیں۔ زوال و فنا کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میلانِ خاطر زہد و ترکِ دنیا کی طرف بڑھ گیا اور سرمایۂ توکل و قناعت کو لے کر گوشۂ عافیت میں بیٹھنا پسند آیا۔ عالمِ فانی کے جاہ و جلال کی وقعت نگاہوں میں نہ رہی۔ بوریائے فقر سریرِ سلطنت سے زیادہ عزیز ہو گیا ...... ذوقِ عمل طبائع سے یہاں تک مسلوب ہو گیا کہ "شیوۂ قلندری" کے مقابلے میں "رہ و رسمِ پارسائی" دور دور از نظر آنے لگی۔ عالمِ ذوق میں "حلقۂ یاراں" میں "خلوت در انجمن" ہونے لگی اور سجادے ہی پر "سفر در وطن" کی کڑی منزلیں طے کی جانے لگیں ...... یہ اثرات اگر صرف ایک ہی جماعت تک محدود ہوتے تو نقصان نہ ہوتا، لیکن شاعری کے ساز پر یہ ترانہ کچھ اس انداز سے چھیڑا گیا کہ تمام بلاد اس صدا سے گونج اٹھا اور ادبیاتِ اسلامیہ میں ایک قسم کے جمود اور رہبانیت کا اثر طاری ہو گیا۔"

مولانا کی انشا پردازی سے متعلق ان کے مضامین سے اس قسم کے بہت سے پُر زور اور رنگارنگ ٹکڑے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ کسی صاحب کو اگر مطالعے کا شوق ہو تو وہ "نوادرات" پڑھیں۔ مولانا کے مضامین کا یہ گراں بہا مجموعہ ادارۂ طلوعِ اسلام (کراچی) نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا ہے۔

مذہب، سیاست، معیشت و معاشرت غرض زندگی کے کسی شعبے میں مولانا کی طبیعت کورانہ تقلید اور جمود و تعطلِ فکر و نظر کو برداشت نہیں کر سکی۔ مذہب کے معاملے میں مولانا آرتھوڈاکس مکتبِ خیال سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ قرآن کو اسلام سمجھتے ہیں اور حدیث کو حجت نہیں گردانتے۔ ملوکیت اور کلیسائی نظام کے سخت مخالف، جمہوریت کے شیدائی اور استبداد کے دشمن اور کہتے ہیں کہ "شوکتِ اسلام کے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ جمہوریت جو اسلام لے کر آیا تھا اور جس نے ہر مسلمان کو آزاد اور خود مختار بنا دیا تھا مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتی

مولانا کی شخصیت کی انفرادیت مسلّم ہے۔ اس کے ثبوت میں یہی ایک بات کافی ہے

مولانا نے جس ماحول میں پرورش پائی اور ابتدائی تعلیم و تربیت نے جس منصب کے لئے انھیں تیار کیا تھا، اگر وہ چاہتے تو اس سے فائدہ اُٹھاتے اور دنیا کماتے۔ ہزاروں ایسے مل جاتے جو ہاتھ چومتے اور ایک نگاہِ کرم کے منتظر رہتے۔ نفسِ انسانی بڑا مفسد ہے۔ اچھے اچھوں کے قدم میں لغزش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن مولانا نے اپنا کام سمجھ لیا تھا۔ اور اپنی راہ متعین کرلی تھی۔ علم و تدبر کو انھوں نے اپنا پیشوا بنایا اور قبائے مشیخت اور جُبۂ پیشوائیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس راہ میں انھیں دشوار گزار مراحل سے گزرنا بھی پڑا لیکن وہ ان سب سے آسان گزر گئے اور اس کی پرواہ نہیں کی کہ مذہبی دنیا انھیں کیا کہتی ہے ؎

اُس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جُدا
اس کے احوال کے محرم نہیں پیرانِ طریق

عبداللطیف اعظمی

حامد علی خاں

۱۹۰۵ء —— ۱۹۶۳ء

حامد علی خاں صاحب جامعہ کے ابتدائی دور کے گریجویٹ اور اس کے حیاتی رکن تھے تعلیم کے بعد شروع سے جامعہ سے وابستہ رہے اور اپنی غیر معمولی صلاحیت، ان تھک محنت اور بے لوث خدمت کے ذریعہ اُردو کی تصنیفی اور اشاعتی دنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ مکتبہ جامعہ غالباً اُردو کا واحد اشاعتی ادارہ ہے جس نے محض اپنی کتابوں کی آمدنی پر اتنی ترقی کی کہ اُردو کے ممتاز ترین اداروں میں سمجھا جانے لگا اور پہلا ادارہ ہے جس نے ہر لحاظ سے — خواہ کتابوں کی ظاہری شکل و صورت ہو یا زبان، اسلوب بیان اور معیار کا معاملہ ہو — اُردو ادب کو جدید طرز اور نئے انداز سے آشنا کیا اور بچوں کے ادب کو، جس کی طرف نئے تقاضوں کے مطابق بالکل توجہ نہیں کی گئی تھی قابل لحاظ ترقی دی۔ مکتبہ جامعہ کے یہ کارنامے تمام تر مرہون منت ہیں جناب حامد علی خاں صاحب کی مساعی اور صلاحیتوں کے۔

حامد صاحب نے ۱۹۲۶ء میں جامعہ کی اعلیٰ تعلیم سے فراغت حاصل کی اور مئی ۱۹۲۷ء میں جامعہ میں کام شروع کیا اور ۱۹۲۸ء میں تاحیات یا کم سے کم بیس سال تک جامعہ کی خدمت کا عہد کیا۔ مکتبہ جامعہ کی ترقی کا سہرا حامد صاحب کے سر ہے۔ آزادیٔ وطن سے قبل جامعہ کے تمام شعبوں میں انتہائی تنگی ترشی سے زندگی گزرتی تھی۔ مکتبہ کی زندگی بھی نامساعد حالات اور کٹھن مشکلات سے بھری ہوئی تھی، مگر حامد صاحب کبھی دل شکستہ نہیں ہوئے اور اپنے ساتھیوں کے سہارے اردو زبان و ادب کی خدمت میں برابر لگے رہے۔

حامد صاحب کی رہنمائی اور نگرانی میں مکتبہ نے اُردو کے معیاری ادب میں بھی اور عام پسند

حامد صاحب قائم گنج میں ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے اور ۵ دسمبر ۱۹۶۳ء کو پیرس میں انتقال کیا۔ جامعہ نگر میں دفن کیے گئے

کتابوں میں بھی بیش از بیش اضافے کئے اور جب ملک کی کشتی ساحلِ آزادی سے قریب پہنچی اور ۱۹۳۸ء میں مختلف صوبوں میں قوم پرستوں کی حکومت قائم ہوئی، تو بعض صوبوں نے اسکولوں کے لئے ملکی ضروریات اور قومی مفاد کے پیشِ نظر نئی ریڈریں تیار کروانے اور اُن کو شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اہم اور ضروری کام کو انجام دینے کے لئے مکتبہ نے اپنی خدمات پیش کیں اور حامد صاحب کے تدبّر ادراں کی سُوجھ بُوجھ کی وجہ سے مکتبہ کو کامیابی اور شہرت نصیب ہوئی۔

۱۹۴۷ء کے فساد میں مکتبہ جامعہ کی چوتھائی صدی کا سرمایہ جب جل کر تباہ و برباد ہو گیا تو حامد صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، ڈاکٹر عابد حسین صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے مشورے اور مدد سے از سرِ نو مکتبہ کو قائم کیا تو بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر اس مرتبہ لیمیٹڈ کمپنی کی شکل دی گئی۔ حامد صاحب کے لئے یہ تجربہ بالکل نیا تھا مگر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے اس مرحلے سے بھی کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔

۱۹۵۷ء میں حامد صاحب کو زیادہ وسیع میدانِ عمل ملا۔ اب تک انھوں نے صرف اُردو زبان و ادب کی خدمت کی تھی اور ان کی جولانگاہ صرف اپنے ملک تک محدود تھی، مگر یونسکو نے اُن کو دوسری زبانوں اور دوسرے ملکوں کی خدمت کا بھی موقع دیا۔ پہلی مرتبہ صرف تین سال کے لئے تقرر عمل میں آیا تھا مگر ان کے وسیع تجربے، ان کی غیر معمولی صلاحیت اور اُن کے حُسنِ خدمات اور احساسِ ذمہ داری کی وجہ سے یہ تقرر مستقل کر دیا گیا۔ موصوف نے سات سال کی اس مختصر مدت میں اپنے ملک اور اپنی مادرِ علمی کے نام کو بڑا روشن کیا، مگر افسوس کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے انھیں ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا کر دیا، جس کی وجہ سے اُردو ایک صاحب ذوق اور حوصلہ مند ناشر سے، جامعہ ایک قدیم حیاتی رکن سے اور یونسکو ایک مخلص اور آزمودہ کار ہندوستانی ماہرِ نشر و اشاعت سے محروم ہو گئی۔ حامد صاحب اب ہم میں نہیں رہے، مگر جامعہ کے در و دیوار پر اور اُردو کتابوں کی نشر و اشاعت کے جدید طرز اور گیٹ اپ پر اپنا گہرا اور پائدار نقش چھوڑ گئے ہیں، اُن کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی، حامد صاحب کا ذکر ضرور آئے گا۔

پروفیسر محمد مجیب

اختر حسن فاروقی

۱۹۰۱ء ــــــــــــــــ ۱۹۶۵ء

ہر ادارے کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کارکن اور خیر خواہ اپنا اور اپنے کام کا جائزہ لیتے رہیں اور ٹھنڈے دل سے غور کرتے رہیں کہ ان میں کونسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے ادارے کو ترقی کرنے میں مدد ملی ہے اور ان خصوصیات کو کس طرح اور زیادہ مستحکم اور موثر بنایا جا سکتا ہے۔ جامعہ میں اس طرح کا جائزہ لینے کا کوئی مقرر طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے، لیکن ہم اپنے ممتاز کارکنوں کی یاد میں اپنی خصوصیات کا ذکر کرتے رہے ہیں اور اس تنقید سے بچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو اعتراض کر کے ختم ہو جاتی ہے اور آگے چلنے کا رستہ نہیں دکھلاتی۔ جناب اختر حسن فاروقی کے تعزیتی جلسے میں جو تقریریں ہوئیں انھوں نے جامعہ کے کارکنوں کی خصوصیات کا جائزہ لینے کی خواہش پیدا کی اور میں چاہتا ہوں کہ ایک دوست اور ساتھی کی یاد تازہ کرنے کے ساتھ انھوں نے جامعہ کی جس طریقے سے خدمت کی اسے نمایاں کروں۔

اس وقت جو لوگ جامعہ میں ہیں وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ۱۹۲۶ء میں جب اختر صاحب مرحوم جامعہ میں آئے تھے، تو یہاں کیا کیفیت تھی اور جامعہ کو لوگ کن نظروں سے دیکھتے تھے۔ ہماری سوسائٹی میں کچھ لوگ تھے جو جامعہ کے مقاصد کو کسی حد تک سمجھتے تھے، جو جامعہ والوں سے ہمدردی کرتے تھے ان کے جوش کی داد دیتے تھے اور ان کے کام کی تعریف کرتے تھے، مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو جامعہ کو قائم کرنے اور چلانے کی کوشش کو بے حاصل اور بے کار سمجھتی تھی کیونکہ جامعہ کے کوئی اپنے وسائل نہیں تھے، حکومت وقت اس کے خلاف تھی اور اس کے کام کے بڑھنے کا کوئی

اختر حسن فاروقی مرحوم کا اصل وطن فرخ آباد (یوپی) تھا، ۵ویں مارچ ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے، انکی نشوونما اور تعلیم لکھنؤ میں ہوئی اور بعد کو اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ ۸ جولائی ۱۹۶۵ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ (اصلی)

امکان نظر نہیں آتا تھا۔ جامعہ کے مستقبل کے لیے زیادہ اہم ان لوگوں کی نیت اور ان کا حوصلہ تھا جنھوں نے جامعہ میں رہ کر کام کرنے کا ارادہ کیا تھا، ان میں سے بعض ایسے تھے جو جامعہ کے مقاصد کو اصولی بحث کرکے طے کرنا چاہتے تھے اور جو جامعہ کے وجود کو اسلام کی تعلیمات اور ہندستانی مسلمانوں کے فرائض کے ایک اصولی اور منطقی نقشے کا ایک حصہ بنانا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کے طرز بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ اصولی طور پر جامعہ کے مقاصد صحیح نہ رہے تو جامعہ کا وجود بے کار ہو جائے گا۔ قوم کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا اور خود قوم بھی گمراہ ہو جائے گی۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ اصولی بحث کرنے والے کسی خاص نتیجے پر پہنچے، لیکن ان کی بحث سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ بہت سے لوگ خاموش ہو گئے اور ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ جامعہ کو قائم رکھنے کے لئے صبر سے کام کرتے رہنے اور بہتر حالات کا انتظار کرنے کی ضرورت ہے۔ شفیق الرحمان قدوائی مرحوم میں یہ غیر معمولی صفت تھی کہ وہ بحث کرنے والوں سے بحث کر سکتے تھے اور خاموش کام کرنے والوں کی طرح کام بھی کر سکتے تھے، اختر صاحب مرحوم بحث کرنے کا شوق نہیں رکھتے تھے، لیکن اصولی بحث کا ان کے اوپر اثر ہوتا تھا اور جب کبھی ان کے دل میں مایوسی پیدا ہوتی تو وہ کام کرنے والوں کی طرف جن میں وہ خود بھی بہت پیش پیش تھے دیکھتے اور ان کی آنکھیں یہ سوال کرتیں کہ بتلائیے اب کیا ہوگا۔ کبھی کبھی ان پر ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے، انھوں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ جامعہ کے مقاصد ان کی سمجھ میں آگئے ہیں اور کبھی وہ اس طرح ہمت کر کے آگے نہیں بڑھے کہ دوسرے ان کے پیچھے چل سکیں۔ وہ دراصل ان لوگوں میں سے تھے کہ جن کی محبت کسی دلیل کی دست نگر نہیں ہوتی، جن کے شوق کو ابھارنے کے لئے کسی خارجی اثر کی ضرورت نہیں ہوتی، جو گویا غیر مشروط خدمت کا نمونہ بن جاتے ہیں، اس لیے کہ ان کی طبیعت یہی چاہتی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی۔

اختر صاحب مرحوم اچھے استاد تھے، مگر ان کی فنی صلاحیتوں سے کہیں زیادہ نمایاں ان کی محبت تھی، اسی محبت کو انھوں نے تربیت کا ذریعہ بنایا اور اسی کے سایے میں بہت سے نوجوانوں کی صلاحیتوں نے پرورش پائی، لیکن ان کی کارگزاری یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، جامعہ کی برادری میں انھیں

امتیاز حاصل کرنے کی خواہش نہیں تھی اور اس کی انھوں نے کبھی کوشش نہیں کی، لیکن جامعہ سے انھیں جو محبت تھی وہ دوسرے کے شوق اور جوش کو بڑھانے کا ایک ذریعہ بن گئی۔ انھوں نے مجھ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ جامعہ کی خدمت اس طرح سے یا اس طرح سے کرنا چاہئے، کبھی یہ نہیں پوچھا کہ فلاں کام جو ہونا چاہیے کیوں نہیں ہوا، لیکن ان کی ہر بات سے اور ہر کیفیت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جامعہ کی ترقی اور جامعہ کے ہر چھوٹے بڑے کارکن کی بھلائی چاہتے ہیں اور جو شدت ان کی اس خواہش میں ہے وہ ہر ایک میں ہونا چاہئے۔ یہ استعارہ کئی لحاظ سے موزوں نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے جو بات اس کے ذریعہ کہی جا سکتی ہے وہ کسی اور طریقہ سے نہیں کہی جا سکتی ——— اختر صاحب مرحوم کو جامعہ سے ویسی ہی محبت تھی جیسے ماں کو اپنے بچے سے ہوتی ہے، ماں کی جبلی محبت اختر صاحب مرحوم میں توفیق کا مرتبہ رکھتی تھی اور یہ توفیق جس طرح انھیں عطا ہوئی تھی جامعہ میں شاید کسی اور کو عطا نہیں ہوئی۔

جامعہ میں نئے لوگ آتے رہتے ہیں اور پرانے ساتھی ایک ایک کر کے جدا ہو رہے ہیں۔ اختر صاحب مرحوم کی صحبت میں رہنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ میں دیکھتا رہتا ہوں کہ جو لوگ جامعہ میں رہنا چاہتے ہیں۔ اب ہم میں شاید ایک دو ایسے ہوں گے جو اصولی بحث کرتے ہیں اور اسلام اور قومی خدمت کے ایک خود ساختہ معیار کے مطابق ہر خیال اور ہر فیصلے کو جانچتے ہیں۔ بعض لوگ غصہ میں کہہ جاتے ہیں کہ اب جامعہ سے ان کا رشتہ ملازمت کا رشتہ ہے اور اس میں کوئی اور جذبہ شامل نہیں ہے، بعض لوگ ایسے ہی غصے میں ثابت کرتے ہیں کہ دوسروں میں کیا کیا عیب ہیں، لیکن ان خامیوں کے ساتھ مجھے اختر صاحب مرحوم کی طبیعت کا سایہ بھی پھیلا ہوا نظر آتا ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جامعہ والوں کا جامعہ سے محبت کا رشتہ بھی ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ محبت وقت کے ساتھ دلیل کی محتاج نہ رہے گی اور اختر صاحب مرحوم کی مثال ہم میں اس طرف مائل کرتی رہے گی کہ اس محبت میں وہی شان پیدا کریں جو اختر صاحب مرحوم کی محبت میں تھی۔

روش صدیقی

شعلۂ ایماں

(جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن زریں کے افتتاحیہ جلسے
میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو پڑھی گئی۔)

شکرِ معبود کہ یہ نصف صدی بیت گئی
علم و تہذیب کے تخلیق طلب میداں میں
ہمت آبلہ پائی نے بڑا کام کیا
جذبۂ شوق کے صحرائے جنوں ساماں میں

افق افروز ہوا سوزِ دلِ شیخ الہند
ظلمتِ شب سے ہوئی صبحِ درخشاں پیدا
سینہ چاکانِ جنوں مائل تعمیر ہوئے
دشتِ ویراں میں ہوا رنگِ گلستاں پیدا

جو ہر و اجمل و ذاکر کی جگر کاوی سے
خشک صحرا میں ہوئی جوئے خراماں پیدا
جلوۂ مذہب و تہذیب کی یکجائی سے
ہو چلا خواب کی تعبیر کا امکاں پیدا
جامعہ، معجزۂ خونِ جگر کی تخلیق
جیسے ظلمت میں ہو اک بامِ چراغاں پیدا

آج اس شمعِ دل افروز کے پروانوں میں
کچھ لگن بھی ہے لگاوٹ بھی ہے کچھ لاگ بھی ہے
دل میں پیوست ہے اک نشترِ خودداری بھی
وقت گاتا ہے جسے لب پہ وہی راگ بھی ہے
سوزِ پنہاں بھی ہے اور سازِ سکوت افشاں بھی
جس سے افکار پگھل جاتے ہیں وہ آگ بھی ہے
کاش اس آگ سے ہو شعلۂ ایماں پیدا

جامعہ

سالانہ چندہ — قیمت فی پرچہ
چھ روپے — پچاس پیسے

جلد ۶۲	بابت ماہ دسمبر ۱۹۷۰ء	شمارہ ۶

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی	مطبوعہ: یونین پریس دہلی	ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

بمبئی کے ایک مخصوص حلقے کی یہ آواز کئی ماہ ہوئے دہلی میں سُنی گئی تھی کہ اردو کا رسم خط بدل دیا جائے اور اس کے لئے دیوناگری رسم خط اختیار کیا جائے، لیکن آج کل اس کا چرچا کچھ زیادہ ہے، افریشیائی ادیبوں کی حالیہ کانفرنس (نئی دہلی) کے موقع پر بعض ایسے ادیبوں کے خلاف جو اردو کے لئے دیوناگری رسم خط کے مبلغ ہیں مظاہرہ بھی ہوا، اور اس مظاہرے کو خاصی اور مناسب پبلسٹی بھی ملی۔ اردو کے جن ادیبوں نے اس کے رسم خط کے بدلنے کی بات کہی ہے، اُن میں سے ہمارے نزدیک کوئی بھی سنجیدہ نہیں ہے، تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح لوگ ایسی غیر سنجیدہ باتیں کہہ دیتے ہیں۔ لیکن، بہرحال، کہتے ہیں اور چند روز تک خاصی ہماہمی رہتی ہے۔

مذکورہ افریشیائی کانفرنس کے موقع پر جن لوگوں نے مظاہرہ کیا، انھوں نے خواہ مخواہ اس کی زحمت کی اور اپنے اعصاب کو جذباتی تشنج میں مبتلا کیا، جن کے خلاف یہ مظاہرہ ہوا تھا اُن میں سے ایک صاحب نے دسمبر ۱۹۷۹ء میں اردو کے فارسی رسم خط کے باقی رکھنے کے لئے وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی کی عدالت میں ہزاروں کے مجمع میں اردو کا مقدمہ دائر کیا تھا، باقی لوگ اردو کے ادیب تو ہیں مگر اردو زبان کی لسانی خصوصیات، اس کی تاریخ و روایات وغیرہ کو وہ علمی سطح پر دیکھنے اور پرکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، ایسے چند لوگوں کے خلاف، جو نہ معلوم کب کس مصلحت اور کون سے مفاد کے پیش نظر، کیا کہہ جائیں اور کر جائیں، مظاہرہ کرنا تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہیں، اردو کی تحریک میں ان کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں، اور بقول مدیر قومی آواز (لکھنؤ) ان کے خلاف مظاہرہ کرنا "ویسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مچھر کا مقابلہ کرنے کو توپ لے آئے۔"

کچھ لوگ ہیں جو سنجیدگی سے یہ سوچتے اور کہتے رہتے ہیں کہ اردو کا رسم خط رومن ہو جائے، لیکن وہ اس مسئلہ کو علمی و لسانی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، انھیں ایسا کرنے کی آزادی ہے، لیکن یہ بات طے ہے کہ اردو

والے اردو کا رسم خط بدلنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اس کا تعلق جذباتیت سے قطعی نہیں، بلکہ بعض ٹھوس حقیقتیں ہیں جن کی بنا پر اردو والوں کا یہ موقف ہے۔ اب اس دلیل میں کوئی وزن نہیں رہا کہ اردو کو رومن یا دیوناگری میں لکھا جائے تو اس کے مخالفوں کی مخالفت ختم ہو جائے گی، سوال ہے کہ رسم خط بدلنے سے مخالفوں کا عناد کیسے ختم ہوگا؟ مخالفت یا عناد اس بنا پر نہیں ہے کہ اردو کا رسم خط فارسی ہے، بلکہ اس کی بنیاد ہی کچھ اور ہے، یہ ایک خاص نقطۂ نظر اور رجحان ہے جو ہندستان کی تہذیب کو 'شدھ' کرنے کا حامی ہے، راشٹریہ کرن کے نعرہ سے اس رجحان کے تمام گوشوں کی بخوبی ترجمانی ہو جاتی ہے، اردو ہو یا تاج محل، قوالی ہو یا قطب مینار، کھانے کے برتن ہوں یا پہننے کے لباس، سب اس کی زد میں ہیں، اس لئے یہ سمجھنا کہ اردو کو دیوناگری میں لکھنے سے اردو کا مسئلہ حل ہو جائے گا، محض ایک خیال ہے۔

اس مسئلہ کے مالہٗ وماعلیہ پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اس پر مزید خامہ فرسائی بیکار ہے، بس یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اردو کے رسم خط بدلنے کی تحریک قابل عمل نہیں ہے، اُدھر سندھی زبان کے فارسی رسم خط بدلنے کا مطالبہ بھی کچھ لوگ کر رہے ہیں، جو لوگ اس مطالبہ کے حق میں ہیں ان میں کاکا کالیلکر صاحب بھی ہیں، انھوں نے ابھی حال میں اس سلسلہ میں بلائی گئی ایک کانفرنس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے وہی بات کہی جو بعض لوگ اردو کے بارے میں کہتے ہیں۔ انھوں نے مشورہ دیا ہے کہ 'سندھی بھاشا کی لپی دیوناگری کر دی جائے، تب ہی یہ زندہ رہ سکتی ہے ورنہ اس کا کوئی بھوشیہ نہیں..... سندھی کے خلاف جو سب سے بڑی بات کام کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسے علاقہ سے سمبندھت ہے جو آج ہندوستان کا حصہ نہیں، اس لئے سندھی کو ہندوستانی بھاشا سمجھتے وقت دماغ پر ذرا بوجھ پڑتا ہے'۔ 'راشٹریہ کرن' کے حامی ایک معاصر نے شری کاکا کالیلکر کے سجھاؤ کا پرزور سواگت اور سمرتھن کیا ہے اور لکھا ہے کہ 'فارسی لپی کی سندھی بھاشا کے لئے اب اس دیش میں کوئی گنجائش نہیں ہے.... فارسی رسم الخط کے سمرتھکوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ جب اردو جیسی بھاشا کا بھوشیہ انشچت (غیر یقینی) ہو رہا ہے تو سندھی کا بھوشیہ کتنا سرکشچت (محفوظ) اور نشچت (یقینی) ہو سکتا ہے'۔

سندھی کے ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت کا کہنا ہے کہ کچھ سیاستداں اور بیوپاری ہیں جو سندھی زبان کا رسم خط بدلنے کی بات کرتے ہیں، ادیبوں اور شاعروں اور عام سندھی بولنے والوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں، ۲۰ر نومبر کو افریشیائی مصنفوں کی کانفرنس کے سلسلہ میں آئے ہوئے روسی ادیبوں سے تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے سندھی زبان کے ایک ادیب نے سندھی کے لئے فارسی کی جگہ دیوناگری رسم خط کو استعمال کرنے کی مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ ناگری رسم خط سندھیوں کو اس لئے قبول نہیں ہوسکتا کہ سندھی زبان کی کچھ آوازوں کو ادا کرنے والے حروف ناگری میں نہیں ہیں، نہ ناگری میں ان آوازوں کو ادا کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسن خاں صاحب کا بہت ہی دلچسپ مضمون بعنوان 'میرا صفحہ' ۱۵ر نومبر ۱۹۷۵ء کے 'ہماری زبان' میں ملاحظہ کیجئے۔ مسعود صاحب لکھتے ہیں "کہ تقسیم ہند سے قبل ہندی کتب میں عربی فارسی سے ماخوذ آوازوں کے لئے مختلف حروف کے نیچے نقطے لگا کر ان کے تلفظ کو ظاہر کیا جاتا تھا... تقسیم ہند کے بعد ہندی ساہتیہ سمیلن جیسی انجمنوں نے یک لخت محسوس کیا کہ ہندی کو ان آوازوں سے 'شدھ' کرنا اس کو 'بھارتی' (وہ نام جو ہندی کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔) بنانے کے لئے ضروری ہے.... چنانچہ نقطے لگانے کا طریقہ ختم کر دیا گیا... وہ بچے بھی جن کی مادری زبان اردو ہے ان آوازوں کو صحیح مخرج سے نہیں نکال پاتے... چنانچہ جب کبھی یہ تجویز میرے سامنے آتی ہے کہ اردو کے لئے دیوناگری رسم خط اختیار کر لیا جائے تو میں بے اختیار اردو کے پسندیدہ اشعار کو اس رسم خط میں لکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور پھر انھیں بے نقط ہندی کے لہجہ میں گنگنا کر عبرتناک مزہ کا لطف لیتا ہوں": مثلاً

کیسے کھبر کہ ہجاروں مکام رکھتا ہے — وہ بھکر جس میں ہے بے پردہ روج گرآنی
کید میں ہے ترے وحشی کو وہی جلپھ کی یاد — ہاں کچھ اک رنج گراں باریٔ جنجیر بھی تھا
نہیں کہ مجھ کو کیامت کا اعتکاد نہیں — شب پھراک سے رو بج جا جیا د نہیں
ٹھہرت کاروبار شوک کیسے — جوک نجارۂ جمال نہیں

۸ نومبر کو مولانا محمد ابراہیم الوری کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قارئین جامعہ میں کم ایسے ہوں گے جنھیں مولانا مرحوم کے مجاہدانہ کارناموں کا علم ہو، لیکن دہلی، نواح دہلی، میوات اور راجستھان کے خاصے بڑے علاقے میں ان کی بے لوث خدمت گزاری، غیرت ایمانی اور جرأت وبیباکی کی دھوم تھی، تقسیم ملک سے پہلے وہ جنگ آزادی میں پیش پیش تھے، کئی بار جیل گئے، ان کا پیر توڑا گیا اور طرح طرح کی اذیتیں پہونچائی گئیں، لیکن آزادی کے اس متوالے کے پائے ثبات میں کبھی کوئی لغزش نہیں ہوئی، تقسیم کے موقع پر بھرت پور اور الور میں مسلمانوں پر جو قیامت گذری وہ معلوم ہے۔ بے شمار مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر ادھر اُدھر منتشر ہو گئے، کچھ انگریزی علاقے میں پناہ گزیں ہوئے اور ہزاروں پاکستان چلے گئے اس سے کہیں زیادہ مرتد ہو گئے، سیکڑوں مسجدیں ویران اور تباہ ہو گئیں اور اُن پر دوسروں نے قبضہ کر لیا، چھوڑی ہوئی جائدادیں بھی نکل گئیں اور اُن پر پاکستان سے آئے ہوئے برباد و تباہ حال شرنارتھیوں کا قبضہ ہو گیا ـــــــ اس قیامت کی افراتفری میں مولانا محمد ابراہیم مرحوم نے اس علاقہ میں وہی کام کیا جو مرحوم مولانا حفظ الرحمن صاحب نے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دہلی میں کیا تھا۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب غریب تھے لیکن دل بہت بڑا رکھتے تھے طبیعت میں بہت سادگی تھی لیکن اپنے علاقے کے مسائل کو خوب سمجھتے تھے، لباس بہت سادہ تھا، بس شرعی پاجامہ، موٹا کھدر کا کرتا اور سر پر مولویانہ ٹوپی، لیکن بڑے سے بڑے شخص، وزیر اور عہدہ دار سے وہ خودداری اور ایک خاص بانکپن سے ملتے تھے، آج وہ نہیں ہیں تو ان کی ایک ایک بات یاد آتی ہے، بڑی خوبیاں تھیں مرحوم میں، ان کے سارے اکابر ان کی قدر اور عزت کرتے تھے، انھوں نے مدرسۂ امینیہ (دہلی) سے سند فراغت حاصل کی تھی، بہت اچھے حافظ تھے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے مراتب بلند کرے اور میوات کے دوسرے کارکنوں کو اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔

معین الدین حارث

خطبۂ صدارت

طلبائے قدیم کے لئے دعوتِ فکر و عمل

"جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن زریں کے موقع پر ۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۰ء کو جامعہ کے طلبائے قدیم کا ایک جلسہ ہوا، جلسے کی صدارت جناب معین الدین حارث صاحب، ایڈیٹر روزنامہ آجل (بمبئی) نے کی۔ اس موقع پر انھوں نے جو خطبہ پڑھا وہ درج ذیل ہے:"

برادران جامعہ، بزرگو اور دوستو!

ہماری مادر تعلیمی جامعہ ملیہ اسلامیہ جس کی شفقت بھری گود میں ہمیں تربیت پانے کا موقع حاصل ہوا اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کرکے اپنا جشن زریں منارہی ہے۔ ہم سب کے لئے یہ موقع غیر معمولی مسرت وانبساط کا موقع ہے۔ اس مبارک ومسعود موقع پر جامعہ کے طلبائے قدیم کے اس اجتماع کی صدارت کا اعزاز آپ نے مجھے بخشا اس پر میں انجمن طلبائے قدیم جامعہ ملیہ کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے مجھ سے کہیں زیادہ موزوں رفقاء اس اجتماع میں موجود ہیں اور انھیں اپنے سامنے موجود پاکر میں یک گونہ مسرت محسوس کرتا ہوں۔ بہتر ہوتا کہ آپ یہ ذمہ داری میری بجائے ان میں سے کسی اور ایسے ساتھی کو سونپتے جو میرے مقابلے میں جامعہ کے ابتدائی دور میں اس سے زیادہ

قریب رہے ہیں اور جو سَابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں بعض رفقاء ایسے بھی ہیں جنھوں نے جامعہ میں اپنی طالب علمی کا دور ختم کرنے کے بعد اپنی پوری زندگی جامعہ ہی میں گذاری ہے۔ ہمیں جن مسائل پر غور کرنا ہے ان پر وہ میرے مقابلے میں کہیں زیادہ روشنی ڈالنے کے اہل ہیں مگر غالباً آپ کی نظر انتخاب مجھ پر اس وجہ سے پڑی ہے کہ جامعہ کے گذشتہ نصف صدی کے کام اور موجودہ ہندوستان میں اس کے رول پر ابتداءً کچھ عرض کرنے کے لئے ان لوگوں میں سے کسی کو ترجیح دی جائے جو جامعہ سے بہت زیادہ قریب نہ رہے ہوں تاکہ وہ جامعہ کے کام کا جائزہ زیادہ غیر جانبداری سے لے سکیں۔ میری دشواری یہ ہے کہ جامعہ سے ہزار بارہ سو کیلو میٹر کے جغرافیائی بُعد کے باوجود اپنی طالب علمی کے دور کو ختم کرنے کے بعد میں جامعہ سے بہت دور یا قطعاً غیر متعلق نہیں رہا ہوں اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ جامعہ کے باب میں میرا حصہ صرف دور کا جلوہ رہا ہے۔ نہ معلوم میں اس کام کو کس حد تک غیر جانبداری سے انجام دے سکوں پھر بھی کوشش اسی کی کروں گا۔

یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ میں نے آپ کی مشفقانہ دعوت اس لئے منظور کی کہ مجھے اس بات کا علم تھا کہ اس اجلاس کی صدارت بڑی حد تک رسمی اور خانہ پُری کی بات ہوگی اور اس صحبت میں ہمیں غور و فکر کے۔ ممکن ہو سکے تو اس مختصر وقت میں جامعہ کے کام کا سرسری جائزہ لینے کے۔ اور اس کے مستقبل کے متعلق اپنے خیالات کی صفائی کے جن مراحل سے گذرنا ہے اس کام میں آپ سب میرے شریک سفر ہیں اور مجھے علم ہے کہ میرے علاوہ اور متعدد ساتھی بھی اسی موضوع پر اظہار خیال کرنے والے ہیں۔

برادرانِ جامعہ! قبل اس کے کہ میں اس موضوع کے متعلق کچھ عرض کروں مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے ان بزرگوں کو یاد کروں جنھوں نے وطن عزیز کی تحریک آزادی کے پر آشوب دور میں جسے تاریخی اعتبار سے تحریک خلافت یا عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک کا دور کہا جاتا ہے جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی۔ انہی کے ساتھ جامعہ کے اس ابتدائی دور کے جس سے میرا بحیثیت ایک طالب علم کے تعلق رہا ان شفیق اور محترم اساتذہ کرام کو یاد کروں جنھوں

نے ہمیں زیورِ علم سے آراستہ کیا ہمارے ذہنوں کو جلا بخشی اور ہمارے کردار کی پختگی میں حصہ لیا اپنے ان ساتھیوں اور ہم سبق دوستوں کو بھی یاد کروں جن کی رفاقت نے ان کاموں میں مدد دی اور پوری زندگی پر ایسا اثر ڈالا جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ ایک اچھی اور بامقصد اور بلند مقصد قائم درس گاہ کی گود میں ہم نے جو مدت گذاری وہ آج اس موقع کی مناسبت سے ہمیں خصوصیت کے ساتھ یاد آ رہی ہے۔ اس طویل مدت میں ان میں سے بہت سے ہم سے جدا ہو گئے اور اپنے اپنے مقررہ وقت پر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی روحوں کو سکون عطا کرے اور ہم میں سے جو باقی ہیں ان سب کا انجام بخیر کرے۔

ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں جو یاد زیادہ شدت سے آتی ہے وہ جامعہ کے تعلیمی قافلے کے سالار استاد محترم ذاکر صاحب مرحوم ہیں جن پر علامہ اقبال مرحوم کی ع "نگہ بلند سخن دلنواز جاں بیتاب" والی تعریف سو فی صدی صادق آتی ہے اور اسی رخت سفر کی فراوانی کے ساتھ وہ جامعہ کے میرِ کارواں کے فرائض زندگی بھر انجام دیتے رہے۔ ذاکر صاحب کی جدائی کا غم ہم سب کے لئے ہنوز تازہ ہے اور یہ خیال مزید تکلیف و رنج کا باعث کہ اس مبارک اور تاریخی موقع پر وہ ہم میں نہیں ہیں ان کا سایہ ہمارے سر سے اٹھ جانے سے ہم نے اپنے آپ کو یتیم محسوس کیا اور ایک لحاظ سے جامعہ بھی یتیم ہو گئی۔ مگر میں نے انہی کی زبانی سنا تھا کہ یتیمی گو بہت بڑی مصیبت ہوتی ہے مگر ان کے لئے جو صبر سے کام لیتے ہیں یہ چیز رحمت بن جایا کرتی ہے۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ تاریخ اسلام پر نظر ڈالی جائے تو ایسے باکمال بزرگوں کی ایک فہرست تیار کی جا سکتی ہے جنھوں نے یتیمی کا داغ سہا تھا مگر شاید یہی صدمہ ان کے لئے جان لیوا ثابت ہونے کی بجائے جان نواز بن گیا۔

فرد کی زندگی میں یتیمی کا تعلق بچپن یا سنِ شعور سے پہلے سایۂ پدری کھونے سے ہوتا ہے اداروں کے ایسے سرپرست اور کھیون ہار جنھوں نے زندگی بھر ان کی نگرانی کی ہو جب نہ جاتے ہیں تو اس پورے ادارے پر یتیمی طاری ہو جاتی ہے۔ جامعہ پر اور ہم سب پر

پار سال یہی صدمہ عظیم گذرا اس لحاظ سے ذاکر صاحب مرحوم کی جدائی ہم سب پر شاق ہے مگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ وہ اپنی زندگی بھر کی کوشش اور ان تھک محنت سے جامعہ کو ایسا بنا گئے ہیں اور ہم سب کو ۔۔۔ انھیں بھی جنھیں ان سے قریب ہونے کا شرف حاصل رہا اور انھیں بھی جنھیں اس شرف سے کم حصہ ملا ۔ اتنا کچھ دے گئے ہیں کہ اگر ہم اسے محفوظ رکھیں اور جن مختلف مراحل سے ہمیں ابھی گذرنا ہے ان میں انہی کے اُسوۂ حسنہ کو اپنے لئے نمونہ بنائیں تو ہم اپنی تمام مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں ۔ میری دعا ہے کہ ربّ کریم انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے اس عالم جاودانی میں ان کے درجات اور بلند کرے اور جس جامعہ کی خاک میں وہ اب ابدی نیند سو رہے ہیں اس کے کارکنوں اور متعلقین کو یہ توفیق نصیب ہو کہ وہ ان کے فیض سے استفادہ حاصل کرتے رہیں ۔ ذاکر صاحب ضرور ہم سے جدا ہو گئے مگر جامعہ والوں کے لئے وہ بڑا لازوال سرمایہ چھوڑ گئے ہیں جو ہر مشکل وقت میں ان کی مشکل کشائی کا باعث بن سکتا ہے ۔

گذرے ہوئے تمام بزرگوں اور دوستوں کو نام بنام یاد کرنا تو مشکل ہوگا کیونکہ نصف صدی کی اس طویل مدت کی طرح یہ فہرست بھی کافی طویل ہو گی مگر بلا ان میں کسی فرق کے خیال کے جامعہ کے اس ابتدائی دور سے جو ہم میں سے بہت سوں کی جامعہ میں طالب علمی کا زمانہ تھا اپنے اس دور کے اساتذہ میں سے خواجہ عبدالمجید مرحوم ، مولانا محمد اسلم جیراجپوری مرحوم ، مولانا محمد اسورتی مرحوم ، خواجہ عبدالحی فاروقی مرحوم ، مولانا سید شرف الدین مومن مرحوم ، پروفیسر طاہر الیس محوی مرحوم ، پروفیسر ای ، جے ، کیلاٹ مرحوم ، حافظ فیاض احمد صاحب پانی پتی مرحوم ، آپا جان فلپسبورن مرحوم خصوصیت سے یاد آتے ہیں ۔ جب اپنے ہم سبق ساتھیوں کی یاد آتی ہے تو برادر محترم شفیق الرحمان قدوائی مرحوم کی دلآویز شخصیت آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور انہی کے ساتھ مولانا اسعد ندوی مرحوم ، ڈاکٹر کے ، ایم اشرف مرحوم ، اختر حسن صاحب فاروقی مرحوم ، اکبر علی صاحب مرحوم اور ناظم مکتبہ جامعہ حامد علی خاں مرحوم یاد آتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ

ان سب کو اور ہمارے ان تمام ساتھیوں کو جو ہم سے جدا ہو چکے ہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

اس دور کے اور طلبائے قدیم بھی یاد آتے ہیں، جو جامعہ میں طلبا کی تعداد بمقابلہ اور یونیورسٹیوں کے کم ہوتے ہوئے بھی ملک کے مختلف گوشوں سے آئے تھے اور حافظے پر تھوڑا سا بھی زور ڈالا جائے تو کشمیر کے سعید رضا، سرحد کے عبدالکریم، پنجاب کے نذیر نیازی، محمد علی، عبدالقادر سیالکوٹی، اتر پردیش کے حافظ منظور اور عبدالقادر جونپوری، بہار کے عبدالباقی صاحب مرحوم، مولوی منظورالحق، قاضی سعید، مدھیہ پردیش کے حبیب داد خاں، گجرات کے اسمٰعیل احمد، سندھ کے احمد سندھی اور عبدالواحد، میسور کے عبدالقدوس صاحب، حیدر آباد یا آندھرا کے محمود علی صاحب، اکبر علی صاحب اور انور خاں صاحب، آسام کے محبوب صاحب اور کیرالا کے محمد صاحب اور مہاراشٹر کے ڈاکٹر عبدالحمید زبیری مرحوم یاد آتے ہیں۔

موجودہ جامعہ میں مختلف مذہبی عقائد کے طلبا پائے جاتے ہیں مگر یہ خیال نہ ہو کہ جامعہ کا ابتدائی دور اس خصوصیت سے خالی تھا یا یہ کوئی بعد میں پیدا شدہ بات ہے۔ اس پرانے دور کے اپنے ساتھیوں میں سے جن میں سے بعض ناموں کا میں نے ابھی ذکر کیا اتنی ہی آسانی سے میں چندر بھان جوہری مرحوم، ڈاکٹر کیلاش ناتھ ٹوپا، سی۔ کے۔ نایر ان کے بھائی ہرچرن نایر، کنک چندر ڈیکا اور جنگ بہادر سنگھ کے نام لے سکتا ہوں۔

پھر سوال صرف ان ناموں کے یاد آنے کا نہیں بلکہ اس ملی جلی، مہذب اور کئی لحاظ سے مثالی زندگی کا ہے جو ہم نے ان دنوں جامعہ میں گذاری اور جس نے حصول علم کے ساتھ ہم میں ہندوستان کی متحدہ قومیت کے جذبے کو بھی بیدار کیا اور تقویت بخشی جس جذبے نے ہمارا زندگی بھر ساتھ دیا۔

کسی تعلیمی ادارے کی کامیابی کو ناپنے اور تولنے کا ایک ذریعہ اگر اس کے فارغ التحصیل طلبا کی زندگیوں پر نظر ڈالنا ہو اور اس لحاظ سے جامعہ کے اس ابتدائی دور کے طلبا کا جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کی جامعہ نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے لئے نمایاں مقام پیدا

کرنے والے طلبا اور گریجوایٹ پیدا کئے۔ ان ناموں کی فہرست بھی خاصی طویل ہوگی۔ بطور نمونہ اس ضمن میں ذاکر صاحب مرحوم کے دونوں بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اور ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب، ڈاکٹر کے۔ایم۔ اشرف، ڈاکٹر عبدالعلیم انصاری، سید محمد جعفری، ڈاکٹر محمد سرور انصاری، پٹنہ کے ڈاکٹر قاضی سعید، سعید انصاری صاحب، ڈاکٹر ثریا، جنگ بہادر سنگھ اور دوسرے بھی نام لئے جاسکتے ہیں جن میں سے بعض نے یورپ و امریکہ جاکر وہاں کی شہرہ آفاق جامعات کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں اور جنھیں یہ موقع نہ مل سکا انھوں نے اندرون ملک ہی جامعہ کی تعلیم اور اپنے حاصل کردہ تجربے سے اپنا اپنا مقام پیدا کیا کسی نے معلمی کے پیشے میں کسی نے صحافت میں اور بعض نے سیاست میں، اگر یہ بھی اضافہ کردوں تو اچھا ہوگا کہ اس دور کے جن جامعی طلبا نے سیاست میں حصہ لیا ان کی سیاست اصولی سیاست تھی اس میں موجودہ دور کی بے اصولی کے داغ دھبے نظر نہیں آتے اور ان کی اس اصول پروری اور استقامت میں جس کا ان میں سے اکثر نے ثبوت دیا اس تعلیم و تربیت کو ضرور دخل تھا جو انھوں نے جامعہ میں حاصل کی تھی۔

برادران گرامی! نصف صدی یا پورے پچاس سال کی مدت خاصی طویل ہوتی ہے۔ انسانی عمر کے لحاظ سے تو یہ مدت ایک پوری زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔ آزادی سے پہلے ہمارے ملک میں اوسط عمر اس مدت کا بمشکل نصف تھا اور اب آزادی کے بعد کی ربع صدی میں اس میں معتدبہ اضافہ ہونے کے باوجود اب بھی ایک ہندوستانی کی اوسط عمر پچاس سال سے کم ہی ہے۔ مگر جہاں تک اداروں کی زندگی کا تعلق ہے یہ مدت بھی بہت زیادہ طویل نہیں کہی جاسکتی۔ کیونکہ اداروں کی عمر اگر وہ جاندار اور اچھے ادارے ہوں اور اوائل عمر ہی میں موت کا شکار نہ ہوگئے ہوں تو ان کی عمر کئی کئی انسانی زندگیوں کے برابر ہوجاتی ہے۔ خود ہمارے ملک میں سیاسی، غیر سیاسی، تعلیمی اور سماجی کام کرنے والے ایسے ادارے ہیں جو اپنی زندگی کی ایک صدی پوری کرچکے ہیں اور اب بھی ان کا مفید کام جاری ہے۔ قدیم طرز کی مذہبی درسگاہوں

میں دارالعلوم دیوبند کا نام لیا جاسکتا ہے اور جدید مغربی طرز کی کم از کم تین نامور یونیورسٹیاں کلکتہ، بمبئی اور مدراس ایسی ہیں جو اپنی زندگی کی پہلی صدی پوری کر کے دوسری صدی کی پہلی دہائی بھی ختم کر چکی ہیں۔ باہر کی دنیا میں تو ایسی جامعات کی مثالیں موجود ہیں جن کی عمر کئی کئی صدیوں میں شمار ہوتی ہے اور قاہرہ کی جامعۂ ازہر تو اپنی زندگی کے ہزار سال پورے کر کے اس کا جشن بھی منا چکی ہے۔

مگر اداروں اور خاصکر تعلیمی اداروں کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ محض ان کی قدامت سے نہیں کیا جانا چاہیئے۔ یہ اندازہ ان کے کردار اور کام ہی سے کرنا صحیح ہوسکتا ہے۔ اسی لئے بعض نسبتاً کم عمر ادارے بھی ایسے پائے جاتے ہیں جن کی سماج کو یا اس فن کو جس کی ترقی کے لئے وہ کام کرتے ہیں دین بہت بڑی ہوتی ہے۔ ہم سب کے لئے یہ امر باعثِ طمانیت ہونا چاہیئے کہ ہماری مادرِ تعلیمی نے اپنی کم عمری میں بھی ملک کے تعلیمی اداروں میں اپنے لئے ممتاز مقام پیدا کیا۔ اب تو پچیس سال اور بیت گئے مگر جب ۱۹۴۶ء میں اسی جگہ جامعہ کا پچیس سالہ جشنِ سیمیں منایا گیا تھا اس وقت بھی جامعہ کی اس خصوصیت کو عام طور پر تسلیم کیا جاچکا تھا۔

جامعہ کی بنا جیسا کہ میں نے عرض کیا ایک پُر آشوب دور میں پڑی۔ علی گڑھ میں اپنا پنج سالہ عہدِ طفولیت گذارنے کے بعد جامعہ دہلی منتقل ہوگئی کچھ مدت اس نے قرول باغ میں گذاری اور اب تقریباً پینتیس ۳۵ سال سے اوکھلے کی اس تعلیمی بستی میں اس کا قیام ہے۔ جامعہ کی بنیاد جن مقاصد کی تکمیل کے لئے پڑی تھی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم نے جامعہ کا افتتاح کرتے ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی کی مسجد میں جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس کے بعد جامعہ کے دوسرے بزرگوں مثلاً مولانا محمد علی مرحوم، حکیم اجمل خاں مرحوم، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم نے وقتاً فوقتاً اس کے مقاصد کی جو تشریح کی اس کے دہرانے کی اس وجہ سے ضرورت نہیں کہ ہم سب ان سے واقف ہیں۔ ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ جامعہ کی اس نصف صدی کی زندگی کو تقریباً برابر برابر حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک اس کے آغاز سے لے کر ۱۹۴۶ء کے

جشن سیمیں یا اس کے سال بھر بعد ملک کی آزادی حاصل ہونے تک کا دور اور دوسرا اس کے بعد کا آزادی کے اب تک گذرے ہوئے تقریباً چوبیس سال کا دور۔ جامعہ کے ان دونوں دوروں میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ابتدائی پچیس سال کا دور بلا کسی سرکاری امداد کے جس کے دروازے جامعہ نے قصداً اپنے اوپر بند کر لئے تھے جامعہ کے قائم رہنے اور کام کرنے کا دور تھا۔ اس کے بعد وہ دوسرا دور شروع ہوا جس میں ملک کی مرکزی حکومت اور یو، جی، سی کی مالی امداد کے دروازے ملک کے بعض اور قومی اداروں کی طرح جامعہ پر بھی کھل گئے۔

جہاں تک مختلف تعلیمی کاموں کے شعبوں اور ان کے لئے عمارتوں کا تعلق ہے جامعہ کا ابتدائی دور عسرت و تنگی اور ظاہری ساز و سامان کی کمی کا دور تھا۔ اب جامعہ جس دور ثانی سے گذر رہی ہے وہ ایسا دور ہے جس میں مرکزی حکومت سے ملنے والی سرکاری مالی امداد کی وجہ سے وہ پہلی سی عسرت و تنگی اور اتنی مالی دشواریاں باقی نہیں ہیں، مگر اس ابتدائی دور کی جامعہ ہو جو چھوٹی تھی یا جس کے کام کا دائرہ محدود تھا اس وقت بھی جامعہ اینٹ پتھر یا چونے گارے کی عمارتوں کا نام نہ تھا بلکہ اپنے متعین تعلیمی مقاصد کے حصول کے لئے کوشش اور نت نئے تعلیمی تجربوں کا نام تھا اور اب جبکہ جامعہ کی کافی توسیع ہو چکی ہے اس کے شعبوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے کئی مستقل انسٹی ٹیوٹ اس میں قائم ہیں اور ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کمیٹی کے تازہ فیصلے کے مطابق ایک اور انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز بھی جو ذاکر صاحب کے بیت الحکمت والے خواب کی تعبیر ہوگا جامعہ ہی میں قائم ہونے والا ہے۔ جامعہ کی عمارتوں میں بھی تقریباً ہر سال کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر موجودہ جامعہ بھی محض شاندار عمارتوں اور اعلیٰ ساز و سامان کا نام نہیں ہے بلکہ انہی بلند تعلیمی مقاصد کو سامنے رکھئے جن کے لئے جامعہ کی بنیاد پڑی تھی، جن کا ذکر جامعہ کے بانیوں نے مختلف مواقع پر کیا تھا اور جن کی عملی تفسیر ذاکر صاحب مرحوم اور ان کے رفقائے کار نے اپنی زندگی بھر کی کوششوں سے پیش کی تھی انہی مقاصد کو پیش نظر رکھنے اور انہی کی خاطر کام کرتے رہنے کا نام اب بھی جامعہ ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جامعہ ہی کے ایک اجتماع میں جب جامعہ کی عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا ڈاکر صاحب مرحوم کی زبانی یہ بلیغ جملہ سنا تھا کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اداروں کی شاندار عمارتیں مقبروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں جن میں دور دور تک کہیں زندگی کا نشان نہیں ملتا اور انہوں نے یہ اضافہ بھی کیا تھا کہ خدا نہ کرے اور ہمیں اس وقت سے ڈرنا چاہئے جب خدانخواستہ جامعہ ملیہ پر اس قسم کی آفت نازل ہو۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جامعہ اب تک اس آفت سے محفوظ رہی ہے آیئے ہم سب دعا کریں کہ جامعہ اس آفت سے ہمیشہ محفوظ رہے، اس کی عمارتوں میں نہ صرف زندگی کے آثار ہر وقت موجود رہیں بلکہ ان کے سائے تلے برابر ایسے علمی اور تعلیمی کام انجام پاتے رہیں جو قوموں کو زندگی بخشنے کا باعث ہوا کرتے ہیں۔

موجودہ ہندوستان میں جامعہ کا کردار یا رول کیا ہو یہ مسئلہ بلاشبہ کارکنان جامعہ، جامعہ کے موجودہ طلباء اور جامعہ کے کام سے دلچسپی اور تعلق رکھنے والوں کی اولین اور گہری توجہ کا مستحق ہے اور یہی ہماری آج کی گفتگو کا موضوع بھی ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ موجودہ دور بڑا مشکل دور ہے صرف ہمارے ملک کے لئے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لئے۔ پورا انسانی سماج ایک عجیب بحران سے گذر رہا ہے۔ نوجوانوں اور خاصکر طلبا میں شدید بے چینی پائی جاتی ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے والوں کا بیان ہے کہ اس کے محرکات مختلف ملکوں میں مختلف ہو سکتے ہیں اور ہیں بھی مگر جو بات ان میں مشترک ہے وہ یہ کہ موجودہ نظام جہاں کہیں اور جیسا بھی ہے اس سے ان لوگوں کی جو اس نظام میں اپنے آپ کو بندھا ہوا پاتے ہیں تسلی نہیں ہوتی۔ وہ کسی نئی چیز کی اور نئی راہ کی کھوج میں ہیں۔ ان کی بے چینی کبھی کبھی مظاہروں اور بعض اوقات ایسے طریقہائے کار اختیار کرنے میں ہوتی ہے جن کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے اور افسوس اور پریشانی کی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں تشدد کے استعمال کی وبا بھی عام ہوتی نظر آتی ہے۔ ہمارے ملک کے تقریباً سبھی تعلیمی ادارے اس بحران سے گذر رہے ہیں اور جامعہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی گو یہ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ یہاں اس بے چینی کے ویسے مکروہ مظاہرے نہیں ہوتے جیسے اور جگہ دیکھے جاتے ہیں

مگر یہ ظاہری فرق پوری طمانیت کا سبب نہ بننا چاہئے اور کسی بھی مسئلے سے غفلت تو کسی
میں بھی جائز نہیں ہر چند کہ اس قسم کے مسائل جامعہ میں موجود نہ ہوں یا ان کی شدت کا درجہ کم ہو
اس کے باوجود ان مسائل پر نظر رکھنا، ان کا جائزہ لینا، ان کے اسباب اور گہرائی کا پتہ لگانا ا
خرابیوں کے مستقل علاج تلاش کرنا بہت ضروری کام ہے اور ملک کے اور تعلیمی اداروں کو
جامعہ والوں کو بھی یہ کام کرنا چاہئے۔ جب جگہ جگہ اس قسم کی کوششیں ہوں گی تو اس بات کا ا
امکان ہے کہ صحیح علاج معلوم کرنے میں آسانیاں اور سہولتیں پیدا ہوں اور ہمارے تعلیمی اد
آج نہیں تو کل ان مسائل کا حل پیش کر سکیں۔ میری رائے میں جامعہ کو اس کام میں جو کسی ایک ا
کا نہیں بلکہ مستقل قومی مسئلہ ہے اپنا حصہ ادا کرنا چاہئے۔

بیرونی دنیا سے تھوڑی دیر کے لئے نظر ہٹا کر جب ہم صرف اپنے ہی ملک پر نظر ڈالتے ہیں ت
اثر یہ ہوتا ہے خواہ اس کا تسلیم کرنا کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے کہ موجودہ دور دور انحطاط کا
دیتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں معیاروں کی پستی انتہا کو پہنچی نظر آتی ہے۔ تعلیمی ادارے بھی ا
سے مستثنیٰ نہیں ہیں گو اس خرابی کا سہرا اگر اسے سہرا کہنا جائز ہو ان لوگوں کے سر ہے جن کا تعلق
سیاسی زندگی سے ہے چونکہ اس طبقے کو حکومت میں دخل ہوتا ہے اور الناس علیٰ دین ملو
والی بات اب بھی سچ ہے اس لئے جمہوری دور کے اپنے ان عارضی حکمرانوں کی جو آج ہیں اور
نہ ہوں گے عام لوگ عادتاً نقل کرتے ہیں اور اپنی بہت سی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے
انھیں موردِ الزام قرار دے کر خود اپنے لئے راہِ فرار تلاش کرتے ہیں۔

ان ملکی حالات کے اسباب و وجوہ کا مطالعہ جاری ہے۔ ہمیں اس وسیع میدان پر نظر ڈا
کی اس وقت مہلت نہیں البتہ تعلیمی اداروں تک اپنے آپ کو محدود رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ
کے بعد تعلیم کی توسیع نے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ صدیوں سے دبے ہوئے
کو آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملتے ہی ان کی توقعات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے بعض
اصحاب نظر اسے انقلاب خواہشات Revolution of expectation بھی کہ

ہیں۔ انسان کی خواہشات جب پوری نہیں ہوتیں۔ ان کے جائز یا ناجائز ہونے کی بحث الگ ہے۔ تو اس میں مایوسی، غصہ، نفرت اور نہ معلوم اور کتنے سفلی جذبات ابھرتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ہم اس وقت اپنے اردگرد افراتفری کا جو عالم پاتے ہیں اس کی اصل وجہ یہی ہو۔ کم از کم یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ان جذبات کے دخل سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک عوام کی خواہشات کا تعلق ہے اس میں ایک بڑی اچھی نیک اور قابل قدر خواہش تعلیم حاصل کرنے کی ہے بلاشبہ یہ خواہش قابل ستائش ہے اور ہندوستانی قوم کی بڑی ہی خوش نصیبی ہوگی کہ ہمارے عوام کی یہ خواہش ملک پوری کر سکے۔ یہ صحیح ہے کہ گذرے ہوئے برسوں میں تعلیمی توسیع تو بہت ہوئی ہے مگر اس کے ساتھ ہی معیار کی پستی کا احساس بھی عام ہے اور وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ عین ممکن ہے کہ طلبا کی، اور نوجوانوں کی بے چینی کی وجہ محض یہ نہ ہو کہ انھیں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی کام نہیں ملتا اور بیکاری اور بے روزگاری کا شکار ہونا پڑتا ہے بلکہ یہ ہو کہ تعلیم پانے کے بعد وہ حالی مرحوم کے الفاظ میں خود بھی یہ محسوس کرتے ہوں ؏

وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

ظاہر ہے کہ اس حالت کو جاری رہنے دینا بڑی خطرناک بات ہوگی۔ یہ بات نہیں ہے کہ ارباب نظر اور ارباب اقتدار کی ان باتوں پر سرے سے نظر نہیں ہے۔ ابھی حال ہی میں کوٹھاری تعلیمی کمیشن ملک کی ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ اور مابعد سندی تعلیم کا جائزہ لے کر اپنی مبسوط رپورٹ پیش کر چکی ہے اس نے بہت سی خرابیوں کے [illegible] تعلیمی معیار کی پستی کو بدلنے کے علاج بھی بتائے ہیں گو یہ کہنا دشوار ہے کہ ان پر عمل ہوگا یا نہیں اور ہوگا تو کب کیونکہ ہمارے ہاں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اکثر وہ کام جو ہونے چاہئیں، بالآخر ہوتے ہیں مگر بعد از خرابیٔ بسیار۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ سلسلہ اس معاملے میں بھی جاری نہ رہے۔

مجھے یہ کہنے میں خوشی ہوتی ہے کہ کم از کم اس صوبے نے جس سے میرا تعلق ہے یعنی مہاراشٹرہ کی حکومت نے کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کا ایسا نوٹس لیا ہے جیسا لیا جانا چاہئے۔ مہاراشٹرہ پہلی ریاست

تھی جس نے اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد اس کی روشنی میں اپنے صوبے کے تعلیمی مسائل پر ایک قرطاس ابیض شائع کیا۔ غالباً ملک بھر میں اپنے طرز کی پہلی کوشش تھی۔ ابھی یہ دستاویز زیر بحث ہے اور حکومت نے اپنے اس ارادے کا بھی اعلان کیا ہے کہ اس بحث کی روشنی میں ایک تعلیمی قانون مرتب کیا جائے" جو کم از کم آنے والی چند دہائیوں کے لئے اس صوبے کی حد تک تعلیم کا خاکہ، اس کے حاصل کرنے کے اسباب و ذرائع اور کام کا نقشہ پیش کرے گا۔ ویسے ہمارے ہاں بھی اس کام میں دیر ہو رہی ہے مگر یہ کیا کم غنیمت ہے کہ اس ضرورت کا احساس موجود ہے اور چند قدم ہلکے ہلکے ہی سہی مگر اٹھ تو رہے ہیں کیونکہ تصویر کا دوسرا رخ یہ بتایا جاتا ہے کہ ملک کے بعض اور صوبے ایسے بھی ہیں جنھوں نے کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ سے اتنی دلچسپی نہیں لی ہے جتنی لی جانی چاہیئے اور جو شاید یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ماضی کی اور بہت سی سرکاری رپورٹوں کی طرح یہ رپورٹ بھی گلدستۂ طاق نسیاں بن جائے گی اور ممکن ہے کہ دس پندرہ سال بعد پھر از سر نو کسی کمیشن کے تقرر کا خیال سامنے آجائے۔

میں نہیں جانتا کہ جامعہ میں اس رپورٹ پر کتنا غور ہوا اور کم از کم اپنی حد تک جامعہ نے اس کے کن حصوں کو قابل قبول اور نظری اعتبار سے قابل قبول ماننے کے علاوہ قابل عمل قرار دیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کمیشن کی کہی ہوئی ہر بات حرف آخر نہ ہو غالباً کمیشن خود بھی یہ دعویٰ نہیں کرے گا مگر اس نے اپنی محنت و عرق ریزی سے ایک بہت اچھی رپورٹ پیش کر کے غور و فکر کی جو نئی راہیں سمجھائی ہیں ان سے مستفید ہونا ہر تعلیمی ادارے کا خاصکر ہماری یونیورسٹیوں کا فرض ہے۔ میرا خیال ہے کہ جامعہ اس کام میں مفید اور قابل قدر امداد دے سکتی ہے کیونکہ جامعہ کی تعلیمی بستی میں خواہ وہ چھوٹی ہی سہی اور تعداد کے لحاظ سے کسی بھی تعلیمی بستی کا چھوٹا ہونا کوئی عیب نہیں بلکہ اس دور میں بڑی خوبی ہے، بیک وقت ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام موجود ہے۔ مختلف ایسے شعبے ہیں جن میں مخصوص علوم و فنون کی تعلیم پر خاص توجہ کی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ استادوں کی ٹریننگ کا بھی انتظام موجود ہے جو کسی بھی تعلیمی نظام اور تجربے کے لئے سب سے زیادہ اہم کام کہا جا سکتا ہے۔

جامعہ نے اپنے ابتدائی دور یا اپنی اب تک کی زندگی کے نصف اول میں مختلف تعلیمی تجربے کئے
ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں اور ثانوی تعلیم میں بھی۔ یہ کام اس دوسرے دور میں بھی جاری رہنا چاہئے بلکہ
اس کی رفتار میں تیزی پیدا کرنا ممکن ہو تو وہ تیزی بھی پیدا کرنی چاہئے۔ ویسے تو یہ کام ملک کی سبھی جامعات
کرنا چاہئے لیکن جامعہ کا جو ماضی رہا ہے اس کی روایات میں یہ چیز شامل ہے۔ اپنی اس دیرینہ
روایت کو قائم رکھ کر جامعہ خود اپنے لئے اور ملک کے اور تعلیمی اداروں کے لئے اس باب میں مفید
ن سکتی ہے۔

بات کچھ طویل ہو رہی ہے پھر بھی چند الفاظ جامعہ کے نام ہی میں ملیہ کے ساتھ جو اسلامیہ کا جز
ہے اس کی بابت بھی عرض کرنا ضروری ہے۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ موجودہ حالات میں بعض
ہنوں میں یہ شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ کیا جدید ہندوستان میں جامعہ کا یہ کیریکٹر یعنی اسکا اسلامیہ
ہنا باقی رہ سکتا ہے؟ ممکن ہے یہ شبہات اس وجہ سے بھی پیدا ہوئے ہوں کہ ملک کے دو اور
بڑی اور نامور تعلیمی اداروں کے نام میں سے لفظ مسلم اور ہندو حذف کرنے کا خیال سامنے آچکا
ہے گو اسے عام تائید حاصل نہیں ہوئی ہے نہ اس کے امکانات نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے نام پر زیادہ
ث اس لئے بھی ہوتی ہو کہ کام پر بحث کرنے کو جی نہ چاہتا ہو اور ارادتاً نام کی بحث کو اتنا طویل کر دیا
تا ہو کہ کام پر بحث کا موقع ہی نہ آئے۔ بہرحال جو شکوک و شبہات ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں انھیں
بلا وجہ نہیں کہا جا سکتا اور جب اس قسم کے شبہات پیدا ہوں تو ان کی بابت کم از کم اپنے ذہن کی
الی کر لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس باب میں میرا خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق جو تاریخی بات بہت واضح طریقے
مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنے رام گڑھ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں کہی تھی وہ ہندوستانی
نوں کو عام طور پر اور جامعہ جیسے تعلیمی اداروں کو خاص طور پر ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے۔ ہندوستانی
ن کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ہندوستانی ہونے کے ساتھ اپنے مسلمان ہونے کا
اعلان کرے اور ان دونوں حیثیتوں میں کسی باہمی تضاد کو تسلیم نہ کرے تو اسے یہ بات بھی صاف

طریقہ سے کہہ دینا چاہیے کہ جامعہ اگر علیہ ہے تو اس کے ساتھ اسلامیہ بھی ہے اور رہے گی اس کے طلی کیریکٹر کے ساتھ اس کا اسلامی کیریکٹر بھی ایک تاریخی اور زندہ حقیقت ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا نہ نظرانداز کئے جانے کی اجازت دی جاسکتی ہے البتہ یہ کیریکٹر ویسا نہیں ہوسکتا جیسا سیاسی مزہبی رکھنے والے یا الیکشنی مزہدتوں کے مارے ہوئے اصحاب تصور کرتے ہیں بلکہ یہ وہ اسلامی کیریکٹر رہا ہے اور رہے گا جس کا ہندوستان کی ایکتا اور قومیت کے جذبے سے کسی طرح ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی ان دونوں حیثیتوں کو ایک دوسرے میں ملاکر وہ ایک ایسی خوشنما اور حسین تصویر پیش کرتا ہے جو آزاد جمہوری اور سیکولر ہندوستان کے جاذب نظر نقشے میں اپنا خاص مقام رکھتی ہے اور اسے اپنی جگہ سے ہٹانے کی کوشش غلط ہوگی اور اس پورے نقشے کے حسن کو بگاڑ دے گی۔ خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو اور اگر کبھی اس کا خطرہ ہو تو ہر صاحب نظر ہندوستانی کو بلا لحاظ مذہب و ملت اس کے سدباب کی کوشش کرنی چاہئے۔

جامعہ جیسے ادارے کو قوم سے اپنا براہ راست تعلق صرف ان نوجوانوں کی تعلیم کے ذریعہ نہیں جو اس مقصد کے لئے یہاں آتے ہیں ملک کے اور حصوں میں تعلیمی کام کرنے والے اور عام طور پر تعلیمی مسائل اور جامعہ کے تعلیمی تجربات سے دلچسپی رکھنے والوں کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس قسم کا تعلق کسی بھی ادارے کے لئے بڑی تقویت کا باعث ہوسکتا ہے۔ ماضی میں جامعہ نے اس کی ضرورت برابر محسوس کی اور جب تک ہمارے شفیق ساتھی شفیق الرحمان قدوائی مرحوم جامعہ میں رہے اس کام میں ان کی خصوصی توجہ سے بہت اچھے نتائج پیدا ہوتے رہے۔ بدقسمتی سے ان کے بعد یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ میری رائے میں اگر اس سلسلے کو پھر شروع کیا جاسکے اور جگہ جگہ ہمدردان جامعہ کے حلقے قائم کئے جاسکیں تو یہ مفید کام ہوگا۔ اس سلسلے میں طلبائے قدیم سے توقع قابل قدر امداد و حاصل کی جاسکتی ہے بشرطیکہ پہلے انجمن طلبائے قدیم کا انتظام درست کرلیا جائے۔

کسی بھی نظام کے لئے مالی ذرائع نظرانداز نہیں کئے جاسکتے اس سلسلے میں جی چاہتا ہے کہ ایک عملی تجویز آپ کے سامنے پیش کروں جو اسی جشن زریں کے سلسلے میں مسلمانوں میں سماجی اصلاح

کے کاموں کے مسائل پر غور کرنے کے لئے جو سیمینار ہوا اس میں ملک کے نامور ماہر معاشیات اور دہلی یونیورسٹی کے اسکول آف اکنامکس کے پروفیسر نے ہارورڈ یونیورسٹی کی جو روایت بتائی اسے ہم اپنے لئے قابل تقلید بنا سکتے ہیں۔ پروفیسر خسرو نے بتایا کہ ہارورڈ یونیورسٹی نے اپنے ہاں یہ روایت قائم کی ہے کہ اس کے فارغ التحصیل طلبا جب اپنی مادر تعلیمی سے رخصت ہونے لگتے ہیں تو یہ وعدہ کرتے ہیں کہ اس کے بعد پچیسویں سال میں وہ اپنی اس وقت جو آمدنی ہو اس میں سے ایک ماہ کی آمدنی اس ادارے کی نذر کریں گے۔ اس روایت کا عملی ردِ عمل یہ ہو گیا ہے کہ ہر سال سابق طلبائے ہارورڈ کی ایک بڑی تعداد اپنی اس سال کی آمدنی کا بارھواں حصہ اس وعدے کے مطابق ہارورڈ کو پیش کرتا ہے اور امریکہ میں دولت مندی کا اور اس ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی آمدنی کا جو معیار ہے اس کے مطابق ہارورڈ کو ہر سال ایک خطیر آمدنی ہوتی ہے جو اس کے تعلیمی کاموں کے مصارف پورے کرنے میں کام آتی ہے کیوں نہ ایسا ہو کہ انجمن طلبائے قدیم اس مسئلے پر غور کر کے کوئی ٹھوس تجویز سابق طلبائے جامعہ کے سامنے رکھے کہ جامعہ سے علیحدگی کے بعد ایک مقررہ مدت جو ضروری نہیں کہ پچیس سال ہی ہو دس یا پندرہ سال بھی مقرر کی جا سکتی ہے اپنی اس وقت کی سال بھر کی آمدنی میں سے ایک مقررہ حصہ انجمن کو دیں تاکہ وہ اس رقم کو جامعہ کے تعلیمی کاموں میں سے کسی مناسب مد پر خرچ کر سکے اور اس طرح ایک طرف سابق طلبا کا اپنی مادر تعلیمی کے ساتھ تعلق اور رابطہ بھی باقی رہے اور انجمن اور انجمن کے توسط سے جامعہ کے لئے ہر سال آمدنی کا ذریعہ بن سکے۔ ایسے با وجود اور کاموں کے لئے سرکاری امداد پانے کے جامعہ کی تعلیمی بستی میں متعدد ایسے کام ہیں اور ہمیشہ ہو سکتے ہیں جن کے لئے اور ذرائع سے مالی امداد حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے طلبائے قدیم اگر اس کام میں پہل کریں اور کوئی مناسب تجویز سوچ کر اسے نافذ کر سکیں تو یہ جامعہ کے اس جشن زریں کی ایک عمدہ یادگار بن سکے گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس تجویز پر غور کریں گے اور اگر اسے قابل قبول مان لیں تو ایک اور نیک کام کی ابتدا ہو سکے گی۔

حضرات! ویسے یہ موضوع کافی وسیع ہے اور اس کے اور گوشے اور پہلو بھی ہو سکتے ہیں

مگر میں ان چند اشارات پر جو میں نے اب تک کئے ہیں اکتفا کروں گا کیونکہ وقت کی قید ہے اور مجھ معلوم ہے کہ اور اصحاب اسی موضوع پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالنے والے ہیں۔

قبل اس کے کہ آپ سے اجازت چاہوں انجمن طلبائے قدیم کو ایک ضروری کاموں پر توجہ دلانے کی جرات کروں گا۔ آپ سب واقف ہیں کہ ہماری انجمن کا نظام کچھ بہت جاندار نہیں ہے۔ جوبلی کے موقع پر جمع ہونا اچھا ہے مگر یہ اور بات ہے، جامعہ جیسے ادارے کے طلبائے قدیم کے نظام کو درست کرنے پر ہمیں توجہ کرنی چاہئے اس کی ممبری ــــ اس کی جو بھی شرائط ہوں اس کے مطابق اور اس دائرے میں رہ کر کافی بڑھ سکتی ہے وہ بڑھانی چاہئے۔ کم از کم جامعہ کے گریجوایٹ جن کی تعداد اب ماضی کی طرح محدود نہیں بلکہ سینکڑوں سے گذر کر ہزاروں کی ہوگی انھیں ممبری پر آمادہ کرنا چاہئے اور جامعہ کی اور عمارتوں کے ساتھ ساتھ اس بستی میں طلبائے قدیم کے اپنے مسکن یا اولڈ بوائز لاج کا بھی انتظام کرنا چاہئے۔

آخر میں ایک اور بات پر جس میں میرے علم کے مطابق جامعہ کے طلبائے قدیم کی کوششوں کو کافی دخل ہے اظہار مسرت کرنا ہے وہ جامعہ کی تعلیمی بستی میں مسجد کی تعمیر ہے۔ گو اس کام میں کافی دیر ہوئی ہے مگر یہ منظر کیا کم خوش کن ہے کہ جامعہ کی بستی کی شایان شان مسجد کی تعمیر کا جو خواب ہم نے جشن سیمیں کے موقع پر دیکھا تھا وہ اب پچیس سال بعد ہی سہی شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے اور ذاکر صاحب مرحوم کی آخری آرام گاہ کے قریب یہ اللہ کا گھر تعمیر ہو رہا ہے۔ وہ دن ہم سب کے لئے بڑی خوشی اور بے پایاں مسرت کا دن ہوگا جب یہ تعمیر مکمل ہوگی اور ہم اس مسجد میں اس کی تعمیر کی تکمیل پر دوگانہ شکر ادا کرسکیں گے۔

حضرات میں نے آپ کا بہت زیادہ وقت لے لیا۔ سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں اور خاتمہ کلام اس بات پر کرتا ہوں کہ جب جامعہ کے جشن سیمیں میں شریک ہوا تھا تو بمبئی سے جو احباب تشریف لائے تھے ان میں سے ایک صاحب نے کہا تھا کہ اگر زندہ رہے تو جامعہ کے جشن زریں میں شرکت کریں گے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ سعادت نصیب ہوئی۔ اب ہم ہیں

ے اس دور کے طلبائے قدیم عمر کی جن منزلوں میں ہیں ان میں یہ خواہش کہ زندگی نے وفا کی تو اب سے پچیس سال بعد پھر جامعہ کی جوبلی میں شریک ہوں گے اچھی خواہش تو کہلا سکتی ہے مگر بہت زیادہ جینے کی ہوس یا حرص کے لحاظ سے شاید یہ جائز خواہش نہ کہلا سکے۔ جوبلیاں منانے والوں کا ایک دستور یہ بھی ہے کہ جشن زریں کے دس سال بعد جب ادارے کی عمر پورے ساٹھ سال کی ہو جائے تو وہ ڈائمنڈ جوبلی منایا کرتے ہیں۔ دس سال کوئی طویل مدت نہیں ہے۔ اللہ کے فضل اور آپ سب کی دعاؤں سے تو ئی بھی ابھی کام کاج کے قابل ہیں مگر زندگی اور موت جس کے قبضہ میں اور صرف جس کی اپنی ذات حی ولا یموت ہے اس نے اگر زندہ رہنے کی مہلت دی اور جامعہ نے دس سال بعد اپنا جشن پھر منایا تو عین ممکن ہے کہ اس میں بھی حاضری دے سکوں۔ میری گذارشات آپ کے صبر و سکون سے سننے کا پھر ایک بار شکریہ۔ خدا حافظ۔

"میں جامعہ کے باہر ایک عہدے کو قبول کر سکا اس اطمینان کے ساتھ کہ جامعہ کے سب کام بدستور چلتے رہیں گے۔ شیخ الجامعہ صاحب کی رپورٹ سے یہ ثابت ہو گیا کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ جامعہ کے سب کام چلتے رہے ہیں اور اس سے زیادہ حوصلہ افزا یہ بات ہے کہ قومی ضرورت کا وہ احساس جس کی بدولت جامعہ قائم ہوئی تھی، اب بھی اسی طرح کارفرما ہے۔۔۔۔ ہم نے جامعہ میں پہلے دن سے جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس میں پہلی شرط کام کی لگن ہے، کام کی لگن کے ساتھ صبر بھی جامعہ والوں کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ آپ اس کا بالکل خیال نہ کریں کہ جامعہ کے کام ملکی زندگی کے پھیلاؤ کے ساتھ نہیں پھیلے، جامعہ کی آبادی ملک کی آبادی کے ساتھ نہیں بڑھی، کم کم دینا، دیر دیر سے دینا بھی خدا کی ایک مصلحت ہے، جس کا راز سمجھنا پورا آدمی بننے اور پورے آدمی کا کام کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔"

(خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ منعقدہ اکتوبر ۱۹۶۴ء)

ڈاکٹر ذاکر حسین

انور صدیقی

علم و دانش کا چراغ ـــــ برٹرنڈ رسل

برٹرنڈرسل نے ہر معیار سے انتہائی بھرپور اور متنوع زندگی گزاری۔ اس تنوع اور ہمہ جہتی نے اسے فکر جدید کے معماروں کی صف میں ممتاز اور نمایاں جگہ دی' ایک ایسی ممتاز جگہ جہاں کم لوگ اس کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کی جسارت یا جرأت کر سکتے ہیں۔ اس کی ذہنی دسترس پر غور کیجئے تو حیرت بھی ہوتی ہے اور حسرت بھی۔ حیرت اس بات پر کہ بیسویں صدی میں علوم اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہو چکے ہیں کہ بالعموم اختصاصی مہارت کے لوگ ہی اُن پر قادر ہو سکتے ہیں اور حسرت یوں کہ اس دور میں ہم اس ہمہ جہتی اور ذہنی دسترس کے صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ پہلے علوم انسان کی دسترس میں تھے اور اب انسان علوم کی دسترس میں ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس نے انسان کے ذہنی قد کو بہت چھوٹا کر دیا ہے۔ رسل کے کارنامے یا ذہنی فتوحات ہمیں تھوڑی دیر کے لئے اس المیہ احساس سے نجات دلاتی ہیں۔ اس کی یہی دین کیا کم ہے!

اس مختصر سے مضمون میں ہم رسل کی زندگی اور اس کے کارناموں کا جائزہ لیں گے مگر یہ کام بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ تمام علوم پر قادر ہونا یا عبور حاصل کرنا۔ اس لئے ہم چاہیں گے کہ آپ ان سطروں کو سعیٔ ناکام نہیں تو سعیٔ ناتمام کی حیثیت سے پڑھیں۔ خود رسل کی شخصیت میں اتنے رنگ اور اتنے نقش ہیں کہ ان کو لفظوں کی گرفت میں لانا انتہائی مشکل کام ہے۔ رسل نے اپنی ذہنی زندگی کے ادوار یوں متعین کئے ہیں:

"جب میں ریاضی میں بودا ثابت ہوا تو میں نے فلسفے کو اپنایا اور جب

فلسفے میں یہی احساس ہوا تو میں نے تاریخ کی طرف توجہ کی۔"

یہ امر واقعہ ہے کہ اس نے گیارہ سال کی عمر سے ۳۸ سال کی عمر تک ریاضی میں دلچسپی لی اور اس کی فلسفیانہ اور منطقی بنیادوں کی تلاش میں لگا رہا۔ ساٹھ سال کی عمر کے بعد اس نے اس موضوع سے اپنا دامن چھڑا لیا۔ اس کے بعد اس نے فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، نفسیات اور تعلیم و اخلاق کو اپنے فکر و نظر کا محور بنایا اور بہت سی ایسی باتیں لکھیں یا بہت سے ایسے ذہنی رویے اختیار کئے جو غیر روایتی ہونے کی وجہ سے چونکا دینے والے تھے بالخصوص مذہب و اخلاق کے سلسلے میں اس کے نظریات بحث و نظر کا موضوع بنے۔ ان ذہنی مجادلوں یا محاربوں میں رسل کی رسوائی بھی ہوئی اور شہرت بھی۔ برطانیہ کا روایت پرست سماج اس کے افکار کی تاب نہ لا سکا۔ اسے غیر تقلیدی رویوں کی وجہ سے قید و بند کی صعوبتوں سے لیکر ذہنی تنہائی کی ان تمام منزلوں سے گزرنا پڑا جو اہل سے ارباب نظر کا مقدر رہیں۔

کسی کا قول ہے کہ انسان بچپن میں جن چیزوں کو کھو دیتا ہے انھیں کی تلاش سے اس کی باقی عمر عبارت ہوتی ہے۔ رسل کا بچپن بھی اس اعتبار سے بہت اہم ہے۔ وہ ایک ایسے خاندان میں ۱۸ مئی ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوا جو برطانوی خاندانوں میں خاصا ممتاز تھا۔ یہ خاندان شروع سے ہی امارت اور سیاسی اثر و رسوخ کے لئے مشہور تھا۔ اس کے باپ کا نام امبرلی تھا اور وہ اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد تھا۔ اس کے خاندان کے ایک بزرگ ولیم لارڈ رسل کو چارلس دوم کی مخالفت میں سزائے موت دی گئی تھی۔ رسل خاندان کا ہر ایک فرد ولیم لارڈ رسل کو اپنا ہیرو سمجھتا تھا۔ بچپن میں ہی یہ بات رسل کے ذہن میں بٹھا دی گئی تھی کہ عوام کی خدمت رسل خاندان کی دیرینہ روایت ہے اور یہ کہ کبھی کبھی بغاوت کا علم بلند کرنا بھی جائز ہے۔ رسل ابھی چھوٹا ہی تھا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے اٹھارہ ماہ بعد اس کا باپ بھی چل بسا۔ رسل اور خاندان کے دوسرے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کی دادی نے سنبھال لی۔ ان خاتون کو لوگ لیڈی جان کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ اپنے نظریات میں پیوریٹن ہونے کے باوجود خوش طبعی اور زندہ دلی کو پسند کرتی تھیں۔

ویسے وہ اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے قدامت پسندوں کے حلقے میں خاصی بدنام تھیں ۔ انہوں نے آئرستانی تحریک آزادی کی حمایت کی اور برطانیہ کی سامراجی جنگوں کی مخالفت ۔ اس طرح رسل اور اس کے بھائی فرینک کی تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی جس میں قدیم پیورٹن عقائد اور حریت فکر کے نظریات کا امتزاج تھا۔ خاندان کے ہر فرد کے لئے گرجا جانا لازمی تھا۔ چنانچہ رسل اپنی دادی کے ساتھ برابر ان مذہبی تقریبات یا عباداتی سرگرمیوں میں شریک ہوتا۔ ان سرگرمیوں کا اثر یہ ہوا کہ اس کے معصوم ذہن میں گناہ اور گنہ گاری کی دہشت بیٹھ گئی۔ وہ شام کو تنہا چہل قدمی کرتا تو اس کا احساس گناہ کی گراں باری محسوس کرتا۔ گھر میں اس کی عمر کا کوئی اور بچہ نہ تھا۔ اس احساس نے اسے اور بھی خلوت پسند اور شرمیلا بنا دیا۔ اپنے احساس کی خلوت کو وہ ہمہ وقت بہت سے افکار سے آباد رکھتا۔ مسلمہ عقائد سے اس کے انکار یا عدم اعتقاد کی پہلی مثال ہمارے سامنے اس وقت آتی ہے جب رسل صرف پانچ سال کا تھا۔ اسے جب یہ بتایا گیا کہ زمین گول ہے تو اس نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس بات کی تحقیق کے لئے اُس نے زمین میں ایک گڑھا کھودنا شروع کر دیا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اگر زمین گول ہے تو وہ آسٹریلیا میں نکلے گا۔ خیر، یہ تو ایک طفلانہ سی کوشش تھی مگر اس سے رسل کی افتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح تقریباً اسی عمر میں کسی نے بتایا کہ جب ہم سو جاتے ہیں تو فرشتے ہمارے سرہانے پہرہ دیتے ہیں۔ رسل نے جواب دیا کہ مجھے تو فرشتے کبھی نہیں دکھائی دئے۔ اس پر اسے یہ بتایا گیا کہ وہ جس لمحے آنکھیں کھولتا ہے تو وہ غائب ہو جاتے ہیں اس نے سوچا کہ اس کی بھی تحقیق کی جائے چنانچہ اس نے ایک ترکیب سوچی وہ آنکھ بند کر کے لیٹ گیا کچھ دیر بعد اس نے سرہانے آنکھ بند کر کے ٹٹولنا شروع کیا مگر اسے کوئی فرشتہ ہاتھ نہ آیا۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی اور وہ اس عقیدے کو بھی توہم سمجھنے لگا۔ گیارہ سال کی عمر میں اس کے بڑے بھائی فرینک نے اسے اقلیدس پڑھانی شروع کی۔ رسل کو یہ معلوم کر کے بڑی مایوسی ہوئی کہ یہاں بھی ایسی چیزوں کو مان کر چلنا پڑتا ہے جنھیں ثابت نہیں کیا جا سکتا اس طرح گیارہ سال کی عمر میں ریاضی کی منطقی بنیادوں کے سلسلے میں وہ شکوک پیدا ہو گئے

جو اس کی شہرۂ آفاق تصنیف اصول ریاضی (Principia Mathematica) کی تصنیف تک اس کے ذہن پر مستولی رہے۔

بچپن میں ہی اسے ریاضی کے علاوہ تاریخ اور ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس نے جب مشہور رومانی شاعر شیلی کا کلام پڑھا تو اس پر حیرت و مسرت کے جذبات طاری ہو گئے۔ اس نے لکھا ہے کہ اس نے جب پہلی بار شیلی کے ابتدائی دور کی نظم الستور پڑھی تو اسے ایسا لگا جیسے دنیا سے اس کا ساتھ بچھڑ گیا ہو اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے۔ اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے دادا کی لائبریری کی بعض کتابیں نہ پڑھے۔ اس پر اس کا الٹا اثر ہوا اور اس نے چُن چُن کر ایسی کتابیں پڑھ ڈالیں جن کے مطالعے سے باز رہنے کی اسے ہدایت کی گئی تھی۔ اس طرح رسل نے بچپن میں ہی اتنا کچھ پڑھ لیا تھا جو دوسروں کے لئے عمر بھر بھی ممکن نہیں ہوتا۔ اس طرح بہت سے مذہبی عقائد کے سلسلے میں بھی اس نے اپنے شبہات رازداری کے خیال سے اور گھر والوں کی مخالفت کے ڈر سے یونانی رسم الخط میں ایک ڈائری کی شکل میں لکھ لئے تھے اور یہ طے کر لیا تھا کہ وہ انھیں باتوں کو قبول کرے گا جو اسے ذہنی طور پر مطمئن کر سکیں گی۔ اس نے پہلے ذاتی ابدیت کے عقیدے سے انکار کیا۔ بہت دنوں تک اس نے اٹھارویں صدی کے Deists (خدا پرستوں) کے ان دلائل کو قابل قبول سمجھا جو انھوں نے خدا کے وجود کے سلسلے میں دئے تھے اس نظریے کو 'سبب اولیٰ' (First Cause) کے نظریے سے یاد کیا جاتا ہے۔ جان اسٹوارٹ مل کے مطالعہ کے بعد اس نے اس نظریے کو بھی ترک کر دیا اور سرے سے ہی خدا کا منکر ہو گیا۔ مل، رسل کے والد کا قریبی دوست تھا اس نے رسل کے تشکیل پذیر ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ مل نے انیسویں صدی کے برطانوی تجربی فلسفے کی تشریح کی تھی جس کے مطابق ہمارا تمام تر علم تجربے کی دین ہے۔

کیمبرج میں داخلے کے لئے ضروری تھا کہ وہ لاطینی اور یونانی زبانوں میں بھی دستگاہ حاصل کرے۔ چنانچہ اسے ایک ایسے اسکول میں داخل کرایا گیا جس میں ان لڑکوں کو تعلیم دی جاتی تھی جو آئندہ فوجی ملازمت کی خاطر سینڈہرسٹ میں داخلہ لیتے۔ غالباً رسل کو اس کی دادی نے اس اسکول

میں اس وجہ سے داخل کرایا کہ انھیں انگلستان کے پبلک اسکولوں سے نفرت تھی۔ رسل نے اس اسکول میں اٹھارہ مہینے گزارے اور اس مدت میں اس نے کلاسیکی زبان و ادب کا اتنا مطالعہ کرلیا جتنا ایک اوسط درجے کا طالب علم کم ازکم چھ سال میں کرتا ہے۔

رسل کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرنٹی کالج میں ۱۸۹۰ء میں اس وقت داخل ہوا جب اس کی عمر اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی۔ وہ یہاں آیا تو اسے کچھ یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک نئی دنیا میں آگیا ہو جو بہت سے غیر مرئی امکانات سے معمور ہو۔ خود اس کے کالج میں بہت سے ممتاز فلسفی اور طالب علم تھے۔ رسل نے شروع سے ہی ایسے لوگوں سے ملنا جلنا شروع کردیا جو اپنے اندر کسی نہ کسی طرح کی انفرادیت کے جوہر رکھتے تھے، اس نے سب سے پہلی دوستی اے، این وہائٹ ہیڈ سے کی جو اس کے وظیفے کے امتحان کا ممتحن تھا اور جو اس سے دس سال پہلے کیمبرج میں داخل ہوا تھا اور اب فیلو تھا۔ وہ رسل کے امتحان کے جوابات سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے سینئر طالب علموں سے کہنا شروع کیا کہ وہ رسل سے ملیں۔ یہیں اس کی ملاقات مور سے ہوئی اور یہیں اسے میک ٹیگرٹ کے ذہنی کمالات سے آگاہی ہوئی۔ مور کیمبرج میں کلاسیکی زبان و ادب کے مطالعہ کے لئے آیا تھا اور چاہتا تھا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی اسکول میں مدرسی کا پیشہ اختیار کرے۔ رسل اس کی فطانت سے متاثر تھا اور چاہتا تھا کہ وہ زبان و ادب سے ہٹ کر فلسفے کی طرف توجہ کرے۔ چنانچہ ایک دن میک ٹیگرٹ کو اس خیال سے چائے پر مدعو کیا کہ وہ مور سے اس کی ملاقات کراسکے۔ اس ملاقات میں میک ٹیگرٹ نے جب یہ نظریہ پیش کیا کہ زمان بے اصل ہے، مور نے اس نظریے کو مہمل قرار دیتے ہوئے جو دلائل پیش کئے ان سے رسل کو اس کی استدلالی حیثیت کا اندازہ ہوا اور رسل مور کو زبان و ادب سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد فلسفے کے میدان میں مور نے جس دراکی کا ثبوت دیا اس سے رسل بے حد متاثر ہوا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رسل نے مور سے کافی استفادہ کیا۔

طالب علمی کے زمانے میں رسل کی سرکش عقلیت میں پیوریٹن تربیت کی خشونت اور خشکی تھی۔ ویسے کیمبرج میں ہی اسے اپنی شخصیت میں اس عنصر کی ناخوشگوار موجودگی کا احساس ہوا اور اس

کرلیا کہ وہ روز کوئی نہ کوئی نازیبا یا ناخوشگوار حرکت ضرور کیا کرے گا تاکہ یہ عنصر اس کی
بت سے خارج ہو سکے۔ اس فیصلے کے باوجود اس زمانے میں وہ جنس کے متعلق وہی پرانے
ت رکھتا تھا۔ انھیں خیالات کا اثر تھا کہ اس نے ایک بار ایک ایسی لڑکی کو تنبیہ کی جو ایک
لڑکے سے عشق لڑا رہی تھی جس سے اسے قطعاً محبت نہیں تھی۔ چونکہ اس کا بچپن تنہائی کے
ں گزرا تھا اس وجہ سے اسے دوسری جنس کو جاننے یا سمجھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ ایسا آدمی بالعموم
ت کو پہلی ملاقات میں ہی دل دے بیٹھتا ہے۔ رسل کے ساتھ بھی یہی ہوا وہ ایلس پیرسل اسمتھ
ق ہو گیا اور ۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء کو اس سے شادی کرلی۔ ایلس، رسل سے پانچ سال بڑی تھی۔ یہ
ی پہلی شادی تھی۔

سیاست سے دلچسپی رسل خاندان کا مزاج تھی۔ اس زمانے میں انگلستان میں فے بین سوسائٹی کا
تھا۔ یہ سوسائٹی سوشلزم کے اصولوں کو آئینی طریقوں سے نافذ کرنے کے حق میں تھی۔ برطانیہ کے
سے دانشور اس کے رکن تھے۔ اپنے سالے لوگن پیرسل اسمتھ کی وساطت سے وہ اس سوسائٹی
ارکان سے قریب ہوا۔ رسل نے سوشلزم کے مطالعے کی غرض سے اپنی بیوی کے ساتھ جرمنی
بار دورہ کیا جہاں اسے جرمن عسکریت اور مارکسی اشتراکیت کے براہ راست مطالعے کا موقعہ ملا۔
کے سوشلسٹوں نے انقلاب لانے کی خاطر جو ذرائع استعمال کرنے شروع کئے تھے، رسل
سے نہ صرف یہ کہ غیر مطمئن ہوا بلکہ بیزار بھی ہو گیا۔ انگلستان واپس آکر اس نے فے بین سوسائٹی
جلسے میں جب اپنے بے لاگ تاثرات بیان کئے تو اس انجمن کے بہت سے افراد اس سے برگشتہ
لئے۔

۱۸۹۶ء میں رسل چند مہینوں کے لئے اپنی بیوی کے ساتھ امریکہ گیا۔ وہاں اس نے دو یونیورسٹیوں
اقلیدس کی بنیادوں" پر لکچر دیئے۔ واپسی پر وہ سسکس کے مقام پر ایک چھوٹے سے مکان میں
ت پذیر ہو گیا اور ریاضیاتی فلسفے پر کام شروع کر دیا۔ یہ کام انتہائی مشکل اور صبر آزما تھا۔
کام پر لگنے سے پہلے رسل کو بہت سے فلسفوں کا جائزہ لینا تھا کچھ کو ترک کرنا تھا اور کچھ کو

اختیار۔ اس نے کانٹ اور ہیگل کے فلسفوں کو اس بنا پر مسترد کر دیا کہ انھوں نے بیکرانی یا لامحدود Infinity کے متعلق جو موشگافیاں کی تھیں ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ عالم اسباب غیر حقیقی ہے۔ جرمنی میں اپنے قیام کے دوران اس نے ویرز ٹراس اور کنٹور کے بارے میں پڑھا اور ان کی تحریریں دیکھیں۔ اول الذکر نے ثابت کیا تھا کہ Calculus 'لامحدود' کے تصور پر منحصر نہیں ہے موخر الذکر کا نظریۂ لامحدود بلا شبہ کچھ عجیب تھا مگر تھا تضادات سے پاک۔ اسی زمانے میں رسل نے کیمبرج میں لائبنز کے فلسفے پر لکچر دیا جو بعد میں Philosophy of Leibniz کے عنوان سے شائع ہوا۔ اپنی تمام تر تجزیاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر رسل نے لائبنز کے فلسفے کی بالکل نئی توجیہہ و تفسیر کی۔ اس مطالعہ کے دوران اس نے صغریٰ و کبریٰ والی منطق سے بھی انکار کیا اس طرح اس نے بریڈلے کے فلسفے کی بھی تردید کر دی۔ ترک و اختیار کی ان منزلوں سے گزرنے کے بعد اس نے اپنی کتاب 'اصول ریاضی' کا خاکہ مرتب کیا۔ اس کتاب کی تصنیف میں اے، این وہائٹ ہیڈ بھی شامل تھا۔ دونوں نے کتاب کے مختلف حصے آپس میں بانٹ لئے۔ ان میں میں سے جب کوئی ایک باب لکھ لیتا تو دوسرے کے پاس بھیج دیتا۔ اس طرح ایک دوسرے کی رایوں کی روشنی میں ترمیم و اضافے کا عمل بھی چلتا رہتا۔ اس زمانے میں وہ سال کے چند مہینے کیمبرج میں گزارتا جہاں وہ مل کر بہت سے مسائل پر آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے۔ اس ذہنی رفاقت کی وجہ سے اس صدی کی ایک اہم تصنیف مکمل ہوئی جو بوجوہ ۱۹۱۰ء میں منظر عام پر آسکی۔ یہ تصنیف کچھ اس قدر مشکل موضوع پر ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں شاید ہی بیس افراد نے اس کا پوری طرح مطالعہ کیا ہوگا۔ ایک نقاد نے تو از راہ مذاق یہاں تک کہہ دیا ہے کہ شاید رسل اور وہائٹ ہیڈ نے بھی اسے نہ پڑھا ہو۔ کچھ بھی ہو اس کتاب کو کلاسیکی مرتبہ حاصل ہوا لیکن کلاسیکی کارنامے کی بدنصیبی بھی اس کے ساتھ لگ گئی۔ کلاسیکی کارناموں پر لوگ گفتگو زیادہ کرتے ہیں، پڑھتے کم ہیں۔ رسل کا یہ کارنامہ کم اہم نہیں ہے کہ اس نے ریاضی کو فلسفیانہ اور منطقی بنیادیں فراہم کر دیں اس طرح اس نے علم ریاضی کو اس کی پراسراریت سے محروم کر دیا۔

اپنی تمام تر عقلیت پسندی کے باوجود رسل متصوفانہ حقائق سے انکار نہ کرسکا اگرچہ ان تمام لوگوں کو اپنا ہدف بنایا جو عقل سے انکار کی خاطر جذبے یا وجدان کی برتری کا علم بلند کرتے ہیں۔ چونکہ وہ خود زبردست عقلیت پسند تھا اس وجہ سے اس نے یہ بات تسلیم کرلی کہ عقل کی مدد سے متصوفین کے نظریات کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ واقعہ در اصل یہ ہے کہ وہ خود کبھی کبھی زندگی کے بعض لمحوں میں اس کیفیت سے دوچار ہوجاتا تھا جن کا صوفیاء تذکرہ کرتے ہیں اس نے اپنی کتاب منطق اور تصوف (Mysticism and Logic) میں ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ عظیم لوگ جو فلسفی رہے ہیں انھیں سائنس اور تصوف دونوں ہی کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔

۱۹۰۷ء میں رسل نے پارلیمنٹ کے لئے الکشن لڑا اور ناکام رہا۔ ۱۹۱۰ء میں اصول ریاضی ختم کرچکا تو اس نے سنجیدگی سے الکشن لڑنے کا ارادہ کرلیا۔ اس بار وہ لبرل پارٹی کے باقاعدہ امیدوار کی حیثیت سے سامنے آنا چاہتا تھا۔ اس کی امیدواری کا مسئلہ تقریباً طے ہوچکا تھا کہ ایک مشکل پیش آئی۔ اس کے حلقۂ انتخاب کی پارٹی کی شاخ کے ممبروں کو معلوم ہوگیا کہ وہ ملحد ہے اور انھوں نے اس کی مخالفت شروع کردی۔ جب رسل نے یہ اعلان کیا کہ وہ دنیا کو دکھانے کی خاطر گرجا گھر نہیں جاسکتا تو اس کی امیدواری کا مسئلہ حل ہوگیا اور وہ اس طرح کہ اس کے جائے ایک دوسرے شخص کو پارٹی نے امیدوار منتخب کیا اور وہ کامیاب ہوگیا۔

اکتوبر ۱۹۱۰ء میں رسل کا تقرر ٹرینٹی کالج، کیمبرج میں منطق اور اصول ریاضی کے شعبے میں ہوگیا۔ یہاں آتے ہی رسل نے اپنے غیر روایتی اور انقلابی خیالات کا برملا اور بے محابا اظہار شروع کردیا۔ بعض افراد کے سلسلے میں اس نے ایسی باتیں کہیں کہ لوگ اس سے برگشتہ ہوگئے بالخصوص مشہور ماہر معاشیات کینز (Keynes) سے اس کی ٹھن گئی اور وہ ایک دوسرے پر طنز کے تیر برسانے لگے۔ رسل نے کینز کو میکاولیت کا علمبردار ٹھہرایا اور اس کی شخصیت میں شیطنت دیکھی۔ اسی زمانے میں طالب علمی کے زمانے کے قریبی دوست، مور سے بھی اس کا جھگڑا ہوگیا اور وہ بھی ایک دوسرے کی صورت سے نفرت کرنے لگے۔ اسے رسل کی کمزوری کہیے یا خوبی کہ وہ نظریات کے معاملے

میں مفاہمت پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ مفاہمت پسندی کی اس کمی نے رسل کو مقبول بھی بنایا اور نامقبول بھی۔ کیمبرج میں قیام کے دوران اس نے ایک اور ذہنی کارنامہ انجام دیا جس سے وہاں کے علمی حلقوں میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ کیمبرج میں ایک انجمن تھی جو 'انجمن منکرین' کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔ اس انجمن کے زیر اہتمام اس نے برگساں کے مشہور متصوفانہ نظریۂ ارتقار پر ایک لکچر دیا۔ اس لکچر میں لوگ بڑے اشتیاق سے شریک ہوئے اس لئے کہ لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اس فلسفے کی دھجیاں اڑائے گا۔ رسل نے اپنے مخصوص منطقی، استدلالی اور طنزیہ انداز میں اپنا یہ معرکۃ الآرار لکچر دیا۔ اس لکچر نے کیمبرج میں اسے ایک ممتاز حیثیت بخش دی۔ کیمبرج کے ہی زمانۂ قیام میں اس نے ہارورڈ یونیورسٹی، امریکہ کے لئے وہ لکچر تیار کئے جو بعد میں کتابی صورت میں 'خارجی دنیا کے بارے میں ہمارے علم' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ مشق کی خاطر رسل نے کیمبرج میں یہ لکچر دئے جو بے حد مقبول ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ سے کچھ دنوں پہلے وہ امریکہ گیا اور اسے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ امریکیوں کی کشادہ ذہنی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ امریکی نئے افکار کو قبول کرنے اور نامانوس راہوں کو اختیار کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

"جامعہ کی تاریخ گواہ ہے کہ اس کے کارکنوں نے کبھی فرقہ پرستی کی سرد اصطلاحوں اور تنگ دائروں میں نہ سوچا ہے نہ عمل کیا ہے۔ اس کی تاسیس میں مہاتما گاندھی کا آدرش اور فکر و عمل کارفرما رہا ہے۔ ہر دور میں اس کے اساتذہ اور طلبار کی صف میں غیر مسلموں کی خاصی تعداد رہی ہے اور یہ مسلم تعلیمی و تہذیبی اداروں کا ایسا نمایاں امتیاز اور خصوصی روایت رہی ہے جس کی نظیر ملک کے اسی طرح کے دوسرے اداروں میں نہیں ملتی۔"

(خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ منعقدہ ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۶۸ء)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

محمد اجتبا حسینی

تصوف پر
علامہ ابن خلدون کی ایک نادر کتاب
"شفاء السائل لتھذیب المسائل"

آٹھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں اندلس کے نفراء ــــــ اس دور میں اندلس کے صوفیاً
ءنام سے یاد کئے جاتے تھے ــــ کے درمیان یہ اختلاف ہوا کہ آیا مرید (صوفی) کو سلوک و تربیت
ے لئے کسی شیخ کی ضرورت ہے یا تصوف وسلوک کی کتابیں اس کی تربیت و طریقت کے لئے کافی
یں، بحث ومناظرہ اور اختلاف اس حد کو پہونچا کہ بقول علامہ ابن خلدون ملت میں دو فرقے رونما
ہے جن میں مار پیٹ، گالی گلوچ اور جوتے بازی ہوئی، مسئلہ جب اندلس میں حل نہ ہوسکا تو مغرب
نی کے علماء اور صوفیاء سے استفتاء کیا گیا، فتویٰ دینے والوں میں علامہ ابن خلدون کا ذکر بھی
آ ہے۔

زیر نظر کتاب وہی فتویٰ ہے جو ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے، کتاب کے آخر میں علامہ ابن خلدون
تصوف کے بارے میں اور ابن عباد و ابوالعباس القباب کا اس متنازع فیہ مسئلہ سے متعلق فتویٰ
مل ہے، انقرہ (ترکی) کے شعبۂ الہیات کے پروفیسر استاذ محمد بن تاویت الطنجی نے اپنی گرانقدر
قیق و ترتیب اور مقدمہ کے ساتھ اسے شائع کیا ہے، مقدمہ بہت جامع، محققانہ اور تفصیلی جائزہ
ر وضاحت پر مشتمل ہے۔

کتاب اس اعتبار سے نادر اور گراں مایہ ہے کہ علامہ ابن خلدون کے قلم سے تصوف پر ایک مستقل اور پرمغز بحث ہے اور اس دور کے صوفیاء، تصوف، علماء کے موقف، عوام کے رجحانات اور قومی کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

کتاب کے بارے میں یہ سوال ذہن میں ابھرنا قدرتی بات ہے کہ یہ ابن خلدون کی ہی تصنیف ہے یا کسی غیر معروف مصنف نے اسے اس عظیم مفکر اور مایۂ ناز مصنف سے منسوب کر دیا ہے۔

فاضل مقدمہ نگار نے اس موضوع سے سیر حاصل بحث کی ہے اور پوری کتاب پر ایک محققانہ نظر ڈالی ہے، استاذ محمد بن تاویت کا خیال ہے کہ یہ کتاب علامہ ابن خلدون کی تصنیف ہے اور اس کی دلیل میں مندرجہ ذیل شواہد پیش کئے ہیں:

۱۔ اگرچہ ابن خلدون نے اس زمانہ کے رواج کے مطابق اپنی تصنیفات میں اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور نہ کوئی عبارت اس قسم کی لکھی ہے جیسی کہ "مقدمہ"، "تاریخ" اور اپنی دیگر تصنیفات پر درج کی ہے، جس سے ثابت ہو کہ یہ انھیں کی تالیف ہے اور نہ ان کے معاصر مورخین، تذکرہ نویس ابن الخطیب اور ابن الاحمر نے کوئی ذکر کیا ہے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس کی تردید اور انکار بھی نہیں کیا ہے، مقدمہ نگار کا خیال ہے کہ علامہ ابن خلدون نے اس کو اپنی تصنیفات میں اس وجہ سے شمار نہیں کیا کہ یہ ایک فتویٰ ہے اور تصوف پر کوئی فتویٰ یا تصنیف اس زمانہ میں قابل تعریف اور لائق ستائش نہیں سمجھی جاتی تھی۔

۲۔ استاذ محمد بن تاویت کے پیش نظر جو نسخہ تھا اس پر ابن خلدون کا ہی نام درج ہے اور اس کے بائیں جانب ایک معروف مراکشی عالم شیخ ابو علی حسن بن مسعود الیوسی (المتوفی ۱۱۱۱ھ) کے قلم سے لکھی ہوئی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ان کی ملکیت میں تھی۔ دوسری عبارت اس سے متصل یہ اشارہ دیتی ہے کہ یہی کتاب ان کے بیٹے عبدالکریم الیوسی کی ملکیت میں ۱۱۲۶ھ میں آئی، یہ دونوں بزرگ مراکش کے ثقہ اور قابل اعتماد عالم ہیں اور ان دونوں نے کہیں اس

کتاب کے مصنف کی نسبت سے تردید اور انکار نہیں کیا ہے۔

۳۔ فقراء اندلس کے اس مناظرہ کا تذکرہ مشہور صوفی بزرگ شیخ ابو العباس احمد بن محمد زروق الفاسی المتوفی (۸۹۹ھ) نے اپنی کتاب "قواعد التصوف" میں تفصیل سے کیا ہے۔ مجموعی طور پر جوابات میں تین باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے:

ا۔ صوفیاء اور مشائخ۔

ب۔ مرید کی حالت۔

ج۔ ریاضت اور مجاہدات۔

۴۔ شیخ احمد زروق نے اپنی دوسری کتاب "عدۃ المرید" میں بھی اس مسئلہ پر علامہ ابن خلدون کے فتوے کا تذکرہ کیا ہے۔

۵۔ شیخ ابو سالم العیاشی (۱۰۹۰ھ) نے اپنی تصنیف علم الحروف میں بڑے وثوق سے ذکر کیا ہے کہ ابن خلدون نے اس مناظرہ میں حصہ لیا اور فتویٰ دیا ہے جو بہت مشہور رہے۔

۶۔ مراکش کے ایک عالم اور بزرگ شیخ ابو محمد عبد القادر الفاسی (۱۰۹۱ھ) نے تحریر کیا ہے کہ آیا راہِ طریقت طے کرنے کے لئے "شیخ" کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اندلس کے متاخرین صوفیاء نے "شیخ" کے بجائے کتابوں پر اکتفا کر لینے میں اختلاف کیا ہے اس کے بارے میں ان لوگوں نے استفتاء کیا، اس کے جوابات شیخ ابن عباد اور ابو زید ابن خلدون نے حسب توفیق دیئے ہیں۔

۷۔ شیخ ابو عبد اللہ محمد بن احمد المسناوی (۱۱۳۶ھ) نے اپنی کتاب "جہد المقل القاصر" میں اس کتاب کو ابن خلدون کی تصنیف بتائی ہے۔

۸۔ تصوف وسلوک سے متعلق ابو بکر الشریشی کے قصیدہ "الرائیہ" کی شرح کرتے ہوئے شیخ ابو العباس احمد بن یوسف الفاسی (۱۰۲۱ھ) نے اس کتاب کو ابن خلدون کے گھرانہ کی جانب منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کے دادا یا والد یا بھائی کے قلم سے یہ فتویٰ لکھا گیا، لیکن اندلس میں اس اختلاف کے ظاہر ہونے سے پہلے ہی ابن خلدون کے والد اور بھائی کا انتقال

ہو چکا تھا اور دادا اس سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے، اس لئے یقیناً یہ فتویٰ علامہ ابن خلدون کا تحریر کردہ ہے۔

علامہ ابن خلدون نے اپنے اس طویل فتوے میں صرف ایک وقتی اختلافی مسئلہ ہی سے بحث نہیں کی ہے بلکہ تصوف وسلوک، فقہ ظاہر وفقہ باطن، تصوف کے مفہوم و مدلول، تصوف صحابہ کے عہد میں، تصوف صحابہ کے بعد، تصوف کی شکلیں اور تصوف متاخرین مشایخ کی نظر وعمل کیا ہے، ان سب پر روشنی ڈالی ہے۔

ابن خلدون نے بڑی جرأت اور صراحت سے ان سارے موضوعات کا شواہد، دلائل اور مثالوں کی روشنی میں مکمل جائزہ لیا ہے۔

طریقۂ تصوف کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ تصوف کے صرف دو طریقے ہیں:

۱۔ پہلا سنت کا طریقہ جو کتاب وسنت اور سلف صالحین میں سے صحابہ کرامؓ اور تابعین کی پیروی اور اتباع ہے۔

۲۔ دوسرا متاخرین صوفیاء کی ایک جماعت کا طریقہ ہے، اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بدعت آلود ہے، اس طریقہ میں تصوف ذوقی معرفت اور احساس کی پردہ دری پر مبنی ہے۔ اس کے رہ نوردوں میں ابن عربی، ابن سبعین، ابن برجان اور ابن قسی کا ذکر کیا ہے، اور ان کی کتابوں "الفتوحات المکیۃ"، "الفصوص" اور ابن سبعین کی "بدالعارف" ابن قسی کی "خلع النعلین" کے بارے لکھتے ہیں کہ حکام اور ذمہ داروں کو چاہئے کہ مصلحت عامہ کے پیش نظر ان کتابوں کو جلا دیں ان کے حروف کھرچ دیں کہ سب مٹ جائیں، امت کے جن لوگوں کے پاس اس قسم کی کتابیں ہوں وہ حکام کے سپرد کر دیں۔

شریعت کو اعمال ظاہرہ اور باطنہ میں تقسیم کرتے ہوئے حدیث جبرئیل علیہ السلام اور عقائد واعمال کی حدیثوں سے استشہاد کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کا یکساں اہتمام فرماتے تھے اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ تصور نہیں کرتے

چونکہ اعمال ظاہرہ اختیاری ہیں اور اعمال قلبیہ غیر اختیاری ہیں اس لئے صحابہ کے بعد فقہ دو قسموں میں تقسیم ہوگئی،

فقہ ظاہر اور فقہ باطن

صدر اول پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ : "پھر عقائد، عبادات اور زہد میں بدعت رونما ہوئی، کوئی معتزلی ہوا، کوئی رافضی، تو کوئی خارجی، فساد عقیدہ کے ساتھ ظاہری اور باطنی اعمال کی اصلاح سود مند نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ ظاہری اور باطنی اعمال میں سلف صالحین کے پیروا ہل دل نے سنت کا طریقہ اپنایا اور صوفیاء کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔

ہجرت کی دو صدی کے اندر تصوف کے لفظ کا رواج ہوا، اور گروہ در گروہ، نسل در نسل یہی طرز "شیخ" کے واسطہ سے منتقل ہوتا رہا، اور فقہ شریعت کی دو شکلیں ہوگئیں :

۱۔ فقہ ظاہر : یعنی ان احکام سے واقفیت حاصل کرنا جن کا تعلق مکلفین کے جسم و اعضاء کے ظاہری اعمال، عادات اور عبادات سے ہے، اسے "فقہ" کہا گیا اور اس علم سے واقفیت رکھنے والے کو "فقیہ" جو اہل فتویٰ اور دین کے حامی و محافظ قرار پائے۔

۲۔ فقہ باطن : یعنی ان احکام سے جانکاری رکھنا جن کا تعلق مکلفین کے دل و اعضاء کی عبادت اور لوازمات سے ہے، اس کو "فقہ قلب یا فقہ باطن یا فقہ زہد، علم آخرت اور تصوف" کا نام دیا گیا۔

اس بارے میں فقہاء و صوفیاء کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :
فقیہ کی نظر دنیاوی مصالح پر پڑتی ہے، اور صوفی کی نظر اخروی مصالح پر رہتی ہے۔

علامہ ابن خلدون "تصوف" کے لفظ سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس لفظ کے بارے میں مختلف رائیں ہیں :

لفظ صوف (اون) سے نکلا ہے، زاہدوں نے اپنی بے بضاعتی، کم مائگی کے احساس، تقشف اور نفس کشی کی خاطر یہ لباس اختیار کیا، کیونکہ ان لوگوں کا ظاہری چمک دمک، ٹیپ ٹاپ اور آن بان

کی جانب قلبی میلان نہیں تھا، حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ : اگر تم کسی
کو دیکھو کہ وہ اپنے ظاہر کو سنوارتا اور اس کا خیال رکھتا ہے تو جان لو کہ اس کا باطن اچھا
نہیں ہے۔ (قشیری ص۱۲۶)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لفظ "صفہ" سے لیا گیا ہے، مسجد نبوی کے قریب ایک
تھا، صحابہ کرامؓ میں ایسے لوگ اس جگہ قیام کرتے تھے جو پردیسی یا اکیلے تھے جیسے حضرت ابو
ابوذر غفاری، سلمان فارسی اور صہیب رومی رضی اللہ عنہم۔ مگر یہ حضرات دوسرے صحابہ کرام
عبادت، ریاضت اور زہد و تقویٰ کے طریقوں میں کچھ مختلف نہیں تھے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ لفظ "صفاء" سے ہے، کیونکہ تزکیۂ نفس اور صفائی قلب پر زور
گیا ہے، چنانچہ اسی سے صوفی، صوفیاء، اور تصوف کا لفظ نکلا۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن خلدون اپنی کوئی قطعی رائے تحریر کئے بغیر تصوف کی تعر
بیان کرنے لگتے ہیں اور دوسرے محقق بزرگوں کی رائیں بھی نقل کرتے ہیں، لکھتے ہیں کہ

"ظاہری اور باطنی اعمال میں خدا تعالیٰ کے ساتھ حسن ادب کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے
اس کی حدود پر قائم رہنا، اعمال قلب کا اہتمام اور اس کو ترجیح دینا، قلب کی پوشیدہ کیفیات
کی نگہبانی کرنا اور نجات کا خواستگار ہونا، تصوف ہے۔"

"عمدہ اخلاق کا اختیار کرنا، اور گھٹیا اخلاق سے پرہیز کرنا، تصوف ہے"

(قشیری، کلاباذی، مکی)

"اعلیٰ اور شاندار اخلاق، نرمی، مہربانی، شفقت، حریت، بلند حوصلگی، اور جوانمردی"
سخاوت کی فراوانی اور بلند خلق، مخلوق کا عذر قبول کرنا، ساتھیوں کی بہترین رفاقت،
ان کی خدمت، عمدہ اخلاق کا مظاہرہ کرنا۔"

"تصوف کچھ رسموں، شکلوں اور عادتوں کا نام نہیں بلکہ اخلاق کو تصوف کہتے ہیں۔"

(طبقات الصوفیہ، السلمی)

صوفی کے بارے میں واضح الفاظ میں رقمطراز ہیں:

"صوفی وہ شخص ہے جو لوگوں کی ہمہ رنگ زندگی میں شریک ہو اور کسی طرح ان سے ممتاز اور الگ نہ ہو، نہ کنارہ کش ہو، وہ اسلامی اصول وروح کی پابندی اور لوگوں کے ساتھ شرکت سے اسلامی معاشرہ کی تعمیر اور استحکام کا باعث بنے گا، لوگ اس کے قول وعمل کی پیروی اور اتباع کریں گے۔ اس طرح مسلمانوں میں اسلامی اخلاق، اسلامی روح ومزاج کا چرچا اور رواج ہوگا۔"

شیخ ابو یزید بسطامی (۲۳۴ھ) کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

"جو شخص بھی قرآن پاک کی تلاوت، سادہ زندگی، جماعت کی حاضری، جنازے کی شرکت ومشایعت، بیماروں کی مزاج پرسی کو چھوڑ کر کنارہ کش ہو گیا اور تصوف کا دعویٰ کیا تو وہ بدعتی ہے۔" (تلبیس ابلیس ص۱۶۷)

یہ کام عبادتوں، مجاہدوں اور ریاضتوں سے حاصل ہوتا ہے، ان مجاہدات کی تین سمیں ہیں:

۱۔ مجاہدۂ تقویٰ: یعنی خدا تعالیٰ کی بیان کردہ حدود پر قائم رہنا، اس سے تجاوز کرنا اور س سے الگ اپنی راہ اختیار کرنا مجاہدہ نہیں ہے، کلام پاک کی آیتوں اور احادیث نبوی سے ستشہاد کرتے ہوئے بہت مفصل خاکہ پیش کیا ہے۔

۲۔ مجاہدۂ استقامت: اس سے مراد نفس کی اصلاح، اس کو تمام اخلاق وصفات یں میانہ روی اختیار کرنے پر آمادہ کرنا، تاکہ اس کا عادی ہو جائے اور اس سے بآسانی چھے اخلاق واعمال صادر ہونے لگیں، ریاضت وتزکیہ سے قرآن ونبوت کے آداب فطری ادت بن جائیں گویا کہ نفس اس کا عادی اور مانوس ہے۔

۳۔ مجاہدۂ کشف: اس کے لئے کچھ شروط وآثار اور علامتیں لکھتے ہیں۔

آخر میں ابن خلدون اصل مسئلہ کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ طویل بحث صرف اس وجہ سے کی گئی تاکہ ناواقف و ناداں لوگ حقیقت سے باخبر ہو جائیں۔"

بعض حالات میں "شیخ" کی ضرورت نہیں ہوتی جیسے تقویٰ کے بارے میں کتاب وسنت کی رہنمائی پر اکتفا کیا جا سکتا ہے، لیکن حقیقت میں سالک اور مرید کے لئے "شیخ" ضروری ہے، اس لئے کہ کتاب اور منقول اسے اس کے مقصد تک رہنمائی نہیں کر سکتے ہیں، اس وجہ سے بھی کہ یہ طریقہ کسبی و کاروباری علوم کی طرح واضح اور معلوم نہیں ہے بلکہ یہ الہامی اور وجدانی طریقہ ہے جو اکثر حالات میں غیر اختیاری ہے، اور مخصوص اعمال کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، کسبی علوم سے اس کا حاصل کرنا ممکن نہیں ہے، چنانچہ کسی ایک "شیخ" کا ہونا لازمی ہے جو بصر و بصیرت کے ذریعہ اس کو واضح اور عیاں کرے اور ان اعمال کی شکلوں اور کیفیتوں کی خصوصیات بتائے، جس سے یہ طریقہ حاصل ہوتا ہے۔ اس جگہ انداز بیان اور طرز نگارش میں بڑا زور پیدا ہو گیا ہے۔ بہت واضح اور صاف صاف لکھتے ہیں تاکہ کوئی پیچیدگی، ابہام اور شک وشبہ باقی نہ رہے اس سے کتاب کی افادیت، اہمیت اور قدر وقیمت بڑھ گئی ہے۔

جامعہ ــــ جشن زریں نمبر

جشن زریں کے موقع پر ماہنامہ جامعہ کا ایک خاص نمبر شائع ہوا ہے، جس میں جامعہ کی پچاس سالہ تاریخ ہے اور تمام امیر جامعہ اور شیخ الجامعہ کے حالات اور ان کی قومی اور تعلیمی خدمات پر مشہور ادیبوں کے مضامین، اور آرٹ پیپر پر ان کی تصاویر ہیں۔ جامعہ کے چند مرحوم اساتذہ پر بھی مضامین ہیں۔

جن لوگوں کو جامعہ کے حالات اور خدمات معلوم کرنے ہوں، وہ اس نمبر کو ضرور خریدیں

حجم دو سو صفحات اور قیمت صرف دو روپے

ڈاکٹر سید احتشام ندوی

ادبی تخلیق کیا ہے؟

ادبی تخلیق کیا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ دراصل ادبی تخلیق کا مطلب کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا نہیں ہے بلکہ پہلے سے موجود مادہ میں ایک نئی روح پھونکنا ہے۔ یہ درحقیقت اس خالق اعظم کا طریق صنعت ہے جس نے آدم علیہ السلام کو لفظ "کن" کہہ کر پیدا نہیں کیا بلکہ مٹی لیکر اس سے آدم علیہ السلام کی تخلیق کی اور اس میں روح پھونکی یعنی ایک ایسے مادہ سے خالق اعظم نے ان کو بنایا جو ان سے قبل موجود تھا۔

اس حقیقت سے یہ اصول واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ "لاشئ" سے کوئی شے ظہور میں نہیں آتی بلکہ شئے سے شئے ظہور میں آتی ہے جیسے چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اس لئے یہ خیال خام ہے کہ ادیب کوئی ایسا موضوع اختیار کرے جو اس سے قبل وجود میں نہ آیا ہو اور کسی کا ذہن اس کی جانب منتقل نہ ہوا ہو۔ اصل ادبی تخلیق یہ ہے کہ ادیب انسانی زندگی کے کسی معروف پہلو کو لے کر اپنے فکر و فن سے اس میں ایک نئی روح پھونک دے۔ معروف فکر میں ایک فنکارانہ اعجاز اور نیا انداز پیدا کرے جس سے عقل کو تحیر اور دل کو حسن کی دولت ملے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی فرسودہ موضوع میں ادیب اپنے فکر و فن سے رنگ و نور کا ایک نیا عالم پیدا کرے۔

مشرق و مغرب کے ادیبوں میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، مثلاً ایک ادیب یا شاعر دوسرے ادیب سے فکر مستعار لے لیتا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شکسپیر کے اکثر موضوعات بوکاشیو سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح مولیئر کے بعض موضوعات مکارن سے مستعار ہیں۔ اسی طرح راسین کی

کی ٹریجڈی ایرو پیڈس وغیرہ سے مستعار ہے۔ اسی طرح اشیل نے ہومر سے کسب فیض کیا ہے بخو حلقوں میں "سرقہ" کا مدتوں ایک نہایت گرم اور خصومت انگیز موضوع تنقید میں داخل تھا حتیٰ کہ آمدی نے دعویٰ کیا کہ ابو تمام کے تمام اشعار دوسرے شعراء سے سرقہ کئے ہوئے ہیں سوا تیس شعروں کے۔ بعد کے ناقدوں نے یہ طے کر دیا کہ موضوعات کی یکسانیت سرقہ نہیں ہے سوا اس کے کہ کوئی شاعر اپنا خاص تخیل پیدا کرے اور اس کو دوسرا شاعر لے کر اپنائے تو یہ سرقہ ہے، باقی مشترک موضوعات میں سرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی موضوع کو نیا رنگ اور نیا قالب عطا کرنا آسان نہیں ہے، ایک ایسا قالب جو ہر زمانہ اور نسل میں نیا معلوم ہو، ادیب کو اپنی تخلیق میں وہ انداز پیدا کرنا چاہیئے جو بہار میں پوشیدہ ہے۔ بہار بار بار آتی ہے مگر رنگ بہار کبھی فرسودہ نہیں محسوس ہوتا۔ جس طرح موسم بہار میں انسان کے دل و دماغ پر ایک تازگی اور شگفتگی طاری ہوتی ہے، بالکل اس انداز سے ادبی تخلیق کرنی لازم ہے جو زمانہ کے امتداد کے باوجود رونق، تازگی، دلکشی اور زندگی کی بھرپور کیفیت سے پُر ہو۔

ادبی تخلیق نہ قدامت ہے نہ جدیدیت، نہ غرابت ہے اور نہ مالوف انداز، پھر آخر وہ کیا ہے؟ ادبی تخلیق کا اصل نمونہ خود انسان ہے! خالق اعظم نے اربوں انسان پیدا کئے۔ ان کی شکل، آواز، ذوق، عقل، خواہش، فکر اور ہر شئے دوسرے انسان سے مختلف ہے اگرچہ بظاہر چیزیں وہی ہیں مگر کیفیت میں ہر انسان ہر لحاظ سے دوسرے سے انفرادیت و امتیاز کا حامل ہے۔ خدا کی تخلیق کی یہ انفرادیت، قوت، احساس، عقل اور روح ہر شے میں موجود ہے بس اسی انسانی انفرادیت و عظمت کو ادب میں اپنے موہوب ذرائع کے مطابق نمایاں کرنا ادبی تخلیق ہے۔ درحقیقت شخصیت کا اظہار حسن کا معجزہ ہے۔ ادبی تخلیقات فنی عجائبات کا مظہر ہیں۔ خدا نے ذرہ سے ستارہ تک جو نظام تخلیق و تنظیم کر رکھا ہے وہی نظام یہاں بھی کارفرما ہے۔

ادیب ایک مخصوص و منفرد شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ فنکار کو اپنی شخصیت کی تلاش مسلسل جاری رکھنی چاہیئے حتیٰ کہ وہ اس کو پا لے۔ ادیب کی معراج یہی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کا تاابد

مالک بن جائے۔ جو کچھ وہ لکھے اس پر اس کی مہر لگ جائے۔ غالبؔ، اقبالؔ، شبلیؔ اور نذیر احمد وغیرہ نے جو کچھ لکھا ہے اس پر ان کی شخصیت کی مہر ثبت ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ادیب دوسرے کی اتباع کرنا چاہتا ہے مگر اس کی اپنی ادبی شخصیت تتبع پر غالب آتی ہے اور اس کی مہر اس پر ثبت کردیتی ہے۔ شخصیت ایک زبردست "سیلاب" ہے جو اس طرح بہتا ہے کہ اپنی راہ خود متعین کرلیتا ہے۔ ہر ادیب و فنکار کی شخصیت، اس کا اسلوب، فکر و تعبیر اور امور و اشیاء کے تجزیہ میں اس کا اپنا منفرد انداز نظر ہوتا ہے، یہی جھلک فنی تخلیق ہے۔

ابتدا میں انسان دوسرے کے سہارے آگے بڑھتا ہے مگر رفتہ رفتہ تقلید اس کی گھٹی میں پڑجاتی ہے، دوسری شخصیتیں اس پر چھاجاتی ہیں، اسی لئے ایک ناقد نے کہا کہ "اگر انسان ہمیشہ بچہ رہ جائے تو وہ شاعر بن جائے" اس لئے کہ بچے کے اندر جہاں تقلید کا مادہ ہے وہاں آزادانہ فکر کا زبردست مادہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر جستجو کی لگن اور تلاشِ حقیقت کا جذبہ ہوتا ہے۔ بڑی شخصیتیں تقلید سے اپنا دامن چھڑاکر آگے بڑھ جاتی ہیں۔

ادیب کی ذات اس کے ادب پر چھائی رہتی ہے۔ ادبی تخلیق میں وہ مخصوص فضا قاری کو محسوس ہوتی ہے جس میں اس نے یہ تخلیق انجام دی ہے۔ ادیب کا سب سے بڑا فن یہی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کا ٹھپہ اپنے ادبی کارناموں پر ثبت کردے۔

ادبی تخلیق کا مخاطب پورا سماج ہے، اس کے مسائل ہیں اور اس کی ترجمانی ہے۔ وہ دل کو متاثر کرتی ہے۔ اس میں زندگی کے بے شمار پہلوؤں، نیرنگیوں اور بوقلمونیوں کے ساتھ ساتھ زندگی کو کچھ دینے اور اس کی مشکلوں کو کچھ کم کرنے کا جذبہ بھی ہونا چاہئے۔ جدید ادبی تخلیق محض ترجمانی نہیں ہے بلکہ زندگی کے اندھیرے میں اس کو ایک کرن بننا چاہئے۔ فسردہ دلوں میں روشنی پیدا کرنی چاہئے۔ جس طرح نئے انسان کی آمد سے دنیا میں رونق ہوتی ہے اور لوگ زندگی و تابندگی محسوس کرتے ہیں اسی طرح نئی ادبی تخلیق کو زندگی کے لئے باعث سکون و قرار اور رونق و عظمت بننا چاہئے۔ جس طرح نئے پھول سے چمن کی رونق بڑھتی ہے، خوشبو پھیلتی ہے، رنگینی پیدا ہوتی ہے اسی طرح نئی تخلیق کو نئے حسن، نئی زندگی اور نئے سامانِ بہار کا ترجمان ہونا چاہئے۔

(عربی سے اپنایا ہوا)

وقار خلیل

جامعۂ ملّیہ کے نام

(جشنِ زرّیں کے موقع پر)

اک ایسی جامعہ کی گولڈن جُبلی مناتے ہیں:
جہاں انسانیت اپنے شرف پر ناز کرتی ہے
وفا کی، پیار کی، اخلاص کی قندیل جلتی ہے
لباسِ لالہ و گل میں کئی مہتاب ڈھلتے ہیں
اندھیرے قتل کرنے یوں نئے سورج نکلتے ہیں
چراغاں کا سماں ہے اور اُجالے رقص کرتے ہیں

مساوات اور رواداری کا سرچشمہ کہیں جس کو
اک ایسی جامعہ، ذاکر نے جس کی پاسبانی کی
اک ایسی جامعہ، ہندوستاں میں اب بھی باقی ہے
مجیبِ علم و دانش سا قلندر جس کا ساقی ہے
وہ ملّی جامعہ قومی ثقافت سے عبارت ہے
شبِ تیرہ میں بے شک زندگانی کی بشارت ہے
ہم ایسی جامعہ کی گولڈن جبلی مناتے ہیں
جہاں تاریخ کو کچھ لوگ آئینہ دکھاتے ہیں

جامعہ کا جشنِ زرّیں

۲۷ر - ۳۰ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

جامعہ کا جشن زریں، اعلان کے مطابق، ۲۷ر سے ۳۰ر اکتوبر تک منایا گیا، جشن کا مفصل پروگرام حسب ذیل تھا:

منگل، ۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

۹¾ بجے صبح .... افتتاح جشن زریں

۱۱½ بجے صبح .... سیمینار: "تدریس اردو کے مسائل"

۲ بجے سہ پہر..... ...... "گاندھی ٹرافی" کے مقابلے

۸ بجے شب........... ڈرامے: ۱۔ ٹیپو سلطان ۲۔ دھنک

بدھ، ۲۸ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

۹½ بجے صبح .... سیمینار: "تہذیبی اقدار کی ماہیت پہچاننے اور انھیں نئی نسلوں تک پہنچانے میں یونیورسٹیوں کا رول"

۱۱ بجے صبح........... سیمینار: "ہندوستانی مسلمانوں کے سوشل ویلفیر کے مسائل"

۲ بجے سہ پہر........... "نہرو ٹرافی" کے مقابلے

۸ بجے شب .... ڈرامے: ۱۔ پہلے آپ ۲۔ تماشا رے آگے

جمعرات، ۲۹ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

۹½ بجے صبح .... بیت بازی

۱۰ ½ بجے صبح .... طلبائے قدیم کا جلسہ

۱۰ ½ بجے صبح .... محفل خواتین (صرف خواتین کے لیے)

۲ بجے سہ پہر .... محفل موسیقی

۸ بجے شب .... ڈرامہ : خانہ جنگی

جمعہ، ۳۰ ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

۱۰ ½ بجے صبح .... جلسۂ یوم تاسیس

۷ بجے شب .... ڈرامہ : جب تک چمکے سونا

جلسے اور کانووکیشن

چار دن کے اس پروگرام میں تین جلسے ایسے تھے، جن کا یہاں میں ذکر کرنا چاہتا ہوں، ایک افتتاحی جلسہ، دوسرا طلبائے قدیم کا سمپوزیم، تیسرا جلسۂ یوم تاسیس۔

جشن کے افتتاح کے لیے نائب صدر جمہوریہ جناب گوپال سروپ پاٹھک صاحب سے درخواست کی گئی تھی اور انھوں نے از راہ عنایت اسے منظور فرمایا اور تشریف لائے۔ جلسے کا آغاز تلاوت قرآن حکیم سے ہوا، اس کے بعد شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جناب پاٹھک صاحب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> میں جامعہ ملیہ کے طالب علموں اور استادوں کی طرف سے آپ کا سواگت کرتا ہوں اور آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ اس مبارک موقع پر ہماری ہمت افزائی کے لئے تشریف لائے۔
>
> جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد اب سے پچاس برس پہلے رکھی گئی تھی، جب گاندھی جی نے ہمارے سامنے اس خیال کو پیش کیا کہ قوم کی تعلیم کو قوم کے اپنے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ ستائیس برس تک اس کا مطلب یہ تھا کہ جامعہ اپنے اسکول اور کالج کے لیے حکومت سے مدد نہ مانگے۔ قوم جو کچھ اسے دے سکتی ہو یا دینا چاہے اسی سے اپنا کام چلائے۔ تیئیس برس سے اس کا مطلب

یہ ہے کہ ہم اپنی آزاد حکومت کو یہ سمجھائیں کہ آزادی کے بعد بھی ہماری ضرورت باقی ہے، اور حکومت ان قاعدوں کے اندر جو آزادی سے پہلے بنے تھے ہمیں جو کچھ دے سکتی ہو اسے بہت سمجھیں۔ انگریزی حکومت کے بنائے ہوئے قاعدوں کو ہتکڑی بیڑی بنا لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جامعہ ملیہ ہی نہیں بلکہ اور ادارے بھی جو اس کے ساتھ قائم ہوئے تھے لاوارث ہو گئے اور اب بھی کچھ لاوارث سے ہیں۔ آزادی سے پہلے جامعہ کی لاوارثی دوسری قومی سنستھاؤں سے کچھ زیادہ تھی، اس کے لیے قوم سے مراد وہی لوگ تھے جو ہماری زندگی کو پریم اور اتحاد کی مثال بنانا چاہتے تھے، باقی سب اس کوشش کی نظروں سے دیکھتے تھے یا اس کے خلاف تھے۔ پھر ہماری دشواریاں اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئیں کہ ہم قومی تعلیم کو بہتر سے بہتر تعلیم بنانے کا حوصلہ رکھتے تھے، ہم نے کبھی خرچ کو آمدنی کے اندر نہیں رکھا، آمدنی کو خرچ کے حساب سے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔ آمدنی میں بھی ہم نے اپنی ضرورتوں کا نہیں ماں باپ کی مجبوریوں کا خیال رکھا، اور اب بھی آپ دیکھیے تو ہمارے یہاں کا تعلیمی خرچ دوسری جگہوں سے کم ہی ہوگا۔ یہ ناممکن سی بات کہ استادوں کی ضرورتیں پوری نہ ہوں اور ان کے تعلیمی حوصلے بڑھتے رہیں، وہ اچھے سے اچھا کام کریں چاہے اسے سراہنے والے کم ہوں یا نہ ہوں، ایک چھوٹی سی سنستھا پریم کے گیت گاتی رہے چاہے اس کے چاروں طرف نفرت کی آگ کبھی سلگتی کبھی بھڑکتی رہے، یہ ناممکن سی بات ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی شخصیت نے ممکن کر کے دکھادی۔ ہمارے اوپر ان کی شخصیت کا اتنا اثر تھا کہ جب ان سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کاموں کو سنبھالنے کے لیے کہا گیا تب بھی ہمارے سب کام پہلے کی طرح جاری رہے، اور اب جامعہ ملیہ اس کا دعویٰ کر سکتی ہے کہ وہ ان کی سچی یادگار ہے۔"

اپنی تقریر کے آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے فرمایا:

"جس زمانے میں جامعہ ملیہ آزاد قومی تعلیم کی علم بردار تھی، لوگ پوچھا کرتے تھے کہ جامعہ کا مقصد کیا ہے۔ آج کل بھی ہم سے یہی پوچھا جاتا ہے۔ کوئی اسکول، کالج یا یونیورسٹی قائم کی

جائے تو یہ سوال نہ کیا جائے گا، اگرچہ یہ بحث برابر جاری ہے کہ خود تعلیم یعنی پورے ملک کی تعلیم کے نظام سے کچھ حاصل ہوتا ہے یا نہیں اور ہوتا ہے تو کیا۔ جامعہ ملیہ استادوں اور طالب علموں کی ایک سنگت ہے جو ایک خاص تہذیب کے سانچے میں سیکھنے سکھانے کا کام کرتی رہی ہے اور سماجی زندگی، سیاست اور مذہب کی مدد سے نئی نسلوں کی طبیعت کو ایسے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی رہی ہے جس سے ان کی انسانیت اجاگر ہو اور وہ اپنے ملک کے تندرست، کارپرداز اور حق پرست شہری بن سکیں۔ اس کام کو کرتے ہوئے پچاس سال ہو گئے ہیں، اسی کا ہم جشن منا رہے ہیں اور میں اب آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس جشن کا افتتاح فرمادیں۔"

نائب صدر جمہوریہ جناب گوپال سروپ پاٹھک صاحب نے جن کی تقریر اردو میں تھی، شیخ الجامعہ، اساتذہ، طلبہ اور حاضرین جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

میں آپ سب کا نہایت شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس عظیم الشان ادارہ کے جشن زریں کے افتتاح کے لئے دعوت دی۔ اس مبارک موقع پر جبکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے پچاس سال پورے کرلئے ہیں آپ سب کے ساتھ شریک ہو کر میں اپنے لئے عزت افزائی سمجھتا ہوں۔ میں ان تمام بزرگ اور محبان وطن ہستیوں کو خراج عقیدت اور مبارکباد پیش کرتا ہوں جنھوں نے جامعہ کو بنانے، ترقی دینے اور پھر اس کو ایک اعلیٰ یونیورسٹی کے پیمانہ پر لانے میں اپنے آپ کو وقف کیا۔

میں نے جامعہ کو ایک اعلیٰ یونیورسٹی اس لئے کہا کہ میری رائے میں محض طالب علموں کی تعداد یا کسی بڑی عمارت سے کوئی یونیورسٹی اعلیٰ یونیورسٹی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اعلیٰ یونیورسٹی وہ ہے جو اچھے اور اعلیٰ اصولوں کو اپنے سامنے رکھے اور جو اونچے خیالات کو نوجوانوں کے دلوں میں پیدا کر سکے اور ملک وقوم کی خدمت کے لئے انھیں تیار کر سکے۔ وہاں کے استادوں میں کام کرنے کی سچی لگن ہو اور قربانی کا جذبہ ہو۔ یہ سب چیزیں جس یونیورسٹی

کے بعد جناب رانا جنگ بہادر صاحب، جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب، جناب سی، کے نائر صاحب، جناب عبدالرحمٰن صاحب اور دیگر طلبائے قدیم نے سمپوزیم میں حصہ لیا۔ رانا جنگ بہادر صاحب نے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا کہ جامعہ کو اپنے دور اول میں بڑی شاندار کامیابی حاصل ہوئی، مگر دوسرے دور میں چونکہ ملک کی قیادت یکسر ناکام رہی اور وطن تقسیم ہو گیا، اس لیے جامعہ کو اپنے مشن میں وہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی جس کی اس سے توقع تھی۔ موجودہ دور میں جامعہ کے رول کے سلسلہ میں موصوف نے فرمایا کہ طلبہ میں ملک کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا جائے، ہندوستان کی تاریخ کو پھر سے لکھنے کی ضرورت ہے، تاریخ بادشاہوں اور امیروں کے ارد گرد نہیں گھومتی، عوام کے ارد گرد گھومتی ہے، اس سلسلے میں بھی جامعہ کے لئے سیوا کا وسیع میدان ہے۔ نئے نظریوں اور نئے فلسفوں کو نصاب تعلیم میں داخل کرنا چاہیئے۔ ہیومینیٹز (*Humanities*) اور سائنس کے تمام مضامین میں بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں، طالب علموں کو ان تبدیلیوں سے واقف کرانے کی ضرورت ہے۔ آخر میں انھوں نے فرمایا کہ ملک کو صحیح قومی لائن پر لانا ضروری ہے، مگر جامعہ ہو یا کوئی اور تعلیمی ادارہ، اس کو اس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی، جب تک مرکزی تعلیم کی پالیسی اور ڈھانچے میں تبدیلی نہ ہو۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے فرمایا کہ جامعہ کے حالات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد۔ آزادی سے پہلے جامعہ نے قومیت کے میدان میں نمایاں اور ممتاز خدمت کی ہے، جسے آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ رانا جنگ بہادر صاحب کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری جامعہ پر نہیں ہے، اس کا ذمہ دار پورا ملک ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ آزادی کے بعد جامعہ قومی حکومت کے اہتمام میں آگئی ہے اور ایسا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ موجودہ حالات میں میرا خیال ہے کہ یہاں کے گریجویٹ اسلام کی اس طرح خدمت کر سکتے ہیں کہ وہ قومی چوکھٹے سے باہر نہ ہو، جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہو گیا ہے، اب جامعہ کو علم اور تحقیق کے میدان میں اپنا ممتاز مقام پیدا کرنا چاہیئے، مثلاً تاریخ کے میدان میں نئے طالب علموں کو کچھ ایسے کارنامے انجام دینے چاہئیں، جن سے جامعہ کی امتیازی اور انفرادی

مان نمایاں ہوسکے، مختلف مسائل پر معروضی طور پر غور کیا جائے اور غیر جانبداری کے ساتھ ان کا حل
اش کیا جائے، جامعہ کا اصول بہت بلند رہا ہے، اس معیار کو قائم رکھنا چاہیے، جامعہ کے اسکولوں
بڑی شہرت حاصل رہی ہے، ان کی طرف جامعہ کی توجہ کو برابر قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔

جناب سی کے نائر صاحب نے فرمایا کہ جامعہ نے پہلے دور میں بہت شاندار رول ادا کیا ہے
ر حکومت سے امداد لینے کے باوجود اس نے اپنی خصوصیات کو بڑی حد تک باقی رکھا ہے، یہ بڑی
ت ہے۔ نیا ہندوستان بنانا ہے، ہندوستانی برادری کے قیام اور اس کے فروغ میں مدد کرنی ہے،
امعہ کو پہلے دور میں بہترین استاد حاصل تھے، اب بھی بہت سے ایسے استاد ہیں جن پر ہم فخر کرسکتے
ں، ان کی تعلیم و تربیت میں ایسے طلبہ یقیناً تیار ہوں گے جو ملک کی بہترین خدمت کرسکتے ہیں۔ قومی
علیم کے پھیلانے میں جامعہ نے جو خدمت کی ہے، اس کی تعریف اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ یہ میری
ہے، بلکہ اس نے واقعی شاندار خدمت کی ہے۔ ۲۲ء میں جامعہ میں میں آیا تو ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم
رجود تھے اور ۲۶ء میں تعلیم ختم ہوئی تو وہ شیخ الجامعہ تھے۔ ان سے جو انسپریشن ملا اور اب بھی
مل رہا ہے اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

جناب عبدالرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ جامعہ نے مجھ میں یہ صلاحیت پیدا کی کہ کسی کام میں عار
ہیں سمجھنا چاہیے، سب سے بڑی چیز جو جامعہ نے دی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو غلط ہو اس کو ترک کیا
ئے اور اس کے خلاف آواز بلند کی جائے۔ اس سے عملی زندگی میں مشکلات بھی پیدا ہوئیں اور ان
ے مدد بھی ملی۔ زمانہ ترقی کر رہا ہے، اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، بنیادی طور پر ہمارے سامنے
اجی مسائل ہیں، ان میں ہماری روش، ظاہر ہے سب سے مختلف ہونی چاہیے۔ سائنس اور ٹکنالوجی
انسانی خدمت کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ آزادی کے بعد نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں، جامعہ
ے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کے حل میں مدد کرے گی۔ آج کے دور میں کوئی ملک اور کوئی قوم
س وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک وہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بہت آگے نہ
ہ، جامعہ کو چاہیے کہ اپنے نصاب میں ان کو وہ جگہ دے جو ترقی یافتہ ملکوں میں دی جاتی ہے

ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے موضوع بحث میں حصہ لینے کے بجائے اُس جامعہ کے حالات اور اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالی، جو کراچی شہر کے مضافات میں ملیر کے مقام پر جامعہ ملیہ کے طرز اور اصول پر قائم کی گئی ہے۔ اس کے قیام اور چلانے میں ان لوگوں کا حصہ ہے، جو جامعہ ملیہ میں کام کر چکے ہیں یا پڑھ چکے ہیں۔

مقررین کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے سہ پہر میں اس سمپوزیم کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں زیادہ تر ان طلبائے قدیم نے حصہ لیا جو نسبتاً نئے ہیں۔ ان لوگوں نے زیادہ تر انجمن طلبائے قدیم کو بہتر اور مضبوط بنانے اور اس کی تنظیم کو زیادہ وسیع کرنے پر زور دیا۔

جلسۂ یوم تاسیس در اصل جوبلی کا خاص جلسہ تھا، جس کی خصوصی مہمان وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی تھیں اور جس کی صدارت دہلی کے لفٹنٹ گورنر جناب اے این جھا نے کی۔ اس موقع پر شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جو تقریر کی، اسے ہم جامعہ کے پچھلے شمارے میں شائع کر چکے ہیں، اس لئے اس کے اقتباسات دینے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ شیخ الجامعہ صاحب کی تقریر کے بعد محترمہ وزیر اعظم نے ایک مختصر تقریر کی، جامعہ کے جشن میں شرکت پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور جامعہ کی خدمات کا اعتراف کیا اور اس کی سراہنا کی۔ انھوں نے فرمایا کہ

> ہم لوگ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی یادگار میں ایک سادہ مگر خوبصورت مزار بنوانا اور ایک اسلامی مرکز قائم کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کی اصل یادگار جامعہ ملیہ ہے اور یہ ہری بھری اور زندہ رہے گی اس وقت جب وہ اپنے لئے نئے راستے ڈھونڈے۔ پروفیسر صاحب نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ترقی کی راہ میں اطمینان ہی سب سے بڑا خطرہ ہے، ہمیں اپنے کاموں پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہئے اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ان کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔ کبھی کبھی ہم خود اپنی راہ میں ایسی رکاوٹیں کھڑی کر لیتے ہیں کہ صحیح راستہ اور صحیح رائے جاتی رہتی ہے، یہی حال سب جگہ ہے۔ ابھی میں امریکا سے لوٹی ہوں، وہاں کس طرح نیا زمانہ آ رہا ہے، آپ اس سے ناواقف نہیں ہوں گے، ہر جگہ بے چینی ہے، بے اطمینانی ہے، پرانے طور طریقے ختم ہو رہے

کارگزاری سے باخبر رکھیں۔ اس وقت میں آپ سے اجازت چاہوں گا کہ کانووکیشن کے عام دستور کو چھوڑ کر، جس کے مطابق مجھے گذشتہ سال کی رپورٹ سُنانا چاہیے، آپ کی خدمت میں پچھلے پچاس سال کے کاموں کا مختصر سا خاکہ پیش کروں۔

لیکن کاموں کا ذکر کرنے سے پہلے اجازت دیجیے کہ کام کرنے والوں کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ ہماری کوشش رہی ہے کہ ایک برادری کی طرح رہیں، مگر ہم نے برابر اپنے اوپر یہ الزام لگایا ہے کہ ہماری جماعت میں وہ ہم آہنگی اور یک جہتی نہیں ہے جو کسی برادری میں ہونی چاہیے۔ ہم میں جو دیندار مسلمان تھے وہ کہتے کہ ہم اچھے مسلمان نہیں ہیں، جو نیشنلسٹ تھے وہ کہتے کہ ہم میں قومی جوش کی کمی ہے، جن لوگوں کو مسلمانوں کے فائدے نقصان کا بہت خیال تھا۔ وہ کہتے کہ ہم قوم پرستی کے جوش میں مسلمانوں کو ان کا حق دلانے کی تدبیریں نہیں کرتے، جو سیفنشٹ تھے وہ باقی سب کو قدامت پرست اور اس وجہ سے نالائق سمجھتے۔ اعتراض اتنے تھے کہ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ کون کس پر کس نیت سے اعتراض کر رہا ہے، بس ایک ایسی فضا پیدا ہوگئی کہ ہماری جماعت کے لیے آپ اپنی تعریف کرنا ناممکن ہوگیا۔ لیکن دوسرے ہماری تعریف کرتے تو خاموشی سے سن لیتے تھے۔ شاید ہماری بھلائی اسی میں تھی، کہ ایسی فضا میں ہر ایک کو رائے رکھنے اور رائے دینے کی آزادی ہوجاتی ہے اور خود جماعت یا جماعت میں کوئی شخص سب کو اپنے خیال یا اپنے اصول کا پابند نہیں کرسکتا پھر اگر ایک طرف وہ لوگ تھے جن کے نزدیک جامعہ کا سدھرنا اور ترقی کرنا ناممکن تھا تو دوسری طرف، وہ تھے جو خیال اور عمل کی آزادی سے فائدہ اٹھاکر اپنی ساری محنت جامعہ کے کسی تعمیری کام میں لگادیتے اور ان کی وجہ سے جامعہ برابر ترقی کرتی رہی۔ ۶۲ء کے بعد سے جب تنخواہیں بڑھیں تو بہت سے لوگوں کو اندیشہ تھا کہ جامعہ اور اُن اداروں میں جہاں لوگ صرف تنخواہوں کے لیے کام کرتے ہیں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ اور یہ اندیشہ اس طرح سے بیان کیا گیا کہ ہم ایک بڑے خطرے سے بچ گئے۔ اب بھی اگر حکومت اور یو جی سی ہر بار تنخواہیں نہ بڑھائیں یا بڑھائیں تو سب کی ایک ساتھ بڑھائیں تو

ہمارے یہاں تنخواہوں کی کمی بیشی کی بحث نہ ہوا کرے۔ ہم میں سے بہت کم کہیں گے یا خوشی سے کہیں گے کہ جامعہ میں کام کا معیار بہتر ہو گیا ہے، مگر جب کام پڑتا ہے تو اس میں اس طرح لگ بھی جاتے ہیں کہ پھر کسی بات کا خیال نہیں رہتا۔

ہم اپنے آپ سے برابر پوچھتے رہتے ہیں کہ جامعہ کا مقصد کیا ہے، اور کبھی کسی جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ کچھ یہ بھی خیال تھا کہ ایسے سوالوں کا جواب دیا ہی نہیں جا سکتا، جیسے کوئی شخص اس سوال کا معقول جواب نہیں دے سکتا کہ وہ کس لئے پیدا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی رائے تھی کہ ہمیں مقصد کی بحث میں نہ پڑنا چاہئے، ہم نے اپنے لئے ایک کام پسند کیا ہے، کام بہرحال اچھا ہے، چاہے جتنا محدود ہو، ہمیں اسے بہتر سے بہتر کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ پھر کیا ہوتا ہے۔ قومی زندگی کی تعمیر، قوم میں رواداری، بھائی چارہ، یک جہتی پیدا کرنا تعلیم کے کام ہیں، اور ہم انھیں خلوص اور استقلال کے ساتھ کرتے رہے تو اس سے ضرور مفید نتیجے نکلیں گے۔ یہ سب سمجھدار لوگ مانتے ہیں کہ تعلیم کی جان دینی اور اخلاقی قدریں ہیں، اور تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ آدمی کو ان کی خدمت کرنے کے لائق بنائے۔ چاہے اس کا پیشہ تعلیم ہو یا تجارت، ملازمت ہو یا دستکاری۔ جامعہ اس بنا پر قائم کی گئی کہ مہاتما گاندھی اور بہت سے مسلمان لیڈر یہ محسوس کرتے تھے کہ سرکاری سکول، کالج اور یونیورسٹیاں نوجوانوں کو اخلاقی قدروں سے بیگانہ کر دیتی ہیں، جامعہ میں ہر طالب علم کے لئے اس کے اپنے مذہب کی تعلیم لازمی رکھی گئی، اور تعلیم کا مقصد یہ ٹھہرایا گیا کہ نوجوانوں کو ایک آزاد جمہوری ملک کے خوددار، حق پرست شہری بنایا جائے۔ گاندھی جی ہندو مسلم اتحاد کی جو تعلیم دیتے تھے وہ ہمارے لئے ایک بنیادی اصول بن گئی اور اس اتحاد کے خلاف جو تحریکیں تھیں ان کا مقابلہ کرتے کرتے ہم اپنے اصولوں میں اور پختہ ہو گئے۔ اب وہی رواداری اور انسان دوستی جسے ہم ملک کے اندر کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں۔ جامعہ میں حتی الامکان برتنے کی کوشش کرتے ہیں، ہم دوسری تعلیم گاہوں کی طرح غیر جانبداری ثابت کرنے کے لئے دینی، اخلاقی اور تہذیبی روایات کو نظر انداز نہیں کرتے، بلکہ انہیں کو ہدایت کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اور انھیں کی مدد سے ان جذبات کو فروغ دیتے ہیں جو ملک میں اتحاد اور ہم آہنگی قائم رکھنے کا اصل سہارا ہیں۔

تقریر کے آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے فرمایا:

تعلیم اور تربیت کا کام بہت صبر آزما ہوتا ہے اور آج کل حالات نے اسے اور بھی مشکل بنایا

ہے۔ ہانا قومی حوصلہ یہ ہے کہ پانچ سو کروڑ آدمیوں کو جمہوریت اور اشتراکیت کے آداب سکھائیں۔

جب تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ دو چار کے درمیان بھی پورا تعاون آسان نہیں ہوتا۔ لیکن ہمیں یہ نہیں چاہتے کہ سیاست کا کوئی مسئلہ طاقت آزمائی اور جبر کے ذریعے طے کریں اور اس سے پیہم اشتراکی عمل کی ان چند مثالوں کی قدر بہت بڑھ جاتی ہے جو ادھر اُدھر ملتی ہیں، جامعہ نے اور کچھ نہ کیا ہو تب بھی صبر اور استقلال کی مثال ضرور قائم کی ہے، اور اپنے آپ کو بہت کچھ ان تعلیمی اور تہذیبی وباؤں سے محفوظ رکھا ہے جو ملک میں پھیلتی نظر آرہی ہیں۔ اب ہمارے اوپر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ان کی انسانی خوبیوں کی یاد کو تازہ رکھنے کی ذمہ داری اور آگئی ہے اور میں آپ کو جامعہ والوں کی طرف سے یقین دلاتا ہوں کہ ہم اپنے خیالات اور اپنے عمل کے ذریعے ان کی یاد تازہ رکھنے کی پوری کوشش کرتے رہیں گے۔

اس کے بعد عالی جناب وی وی گری نے اپنا خطبہ پڑھا اور سب سے پہلے مرحوم ڈاکٹر ذاکر صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آپ نے فرمایا:

"میں اپنے آپ کو یہاں اجنبی نہیں سمجھتا، اس لیے کہ میرے معزز اور نامور پیش رو اور عزیز دوست ڈاکٹر ذاکر حسین کا اس سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ذاکر صاحب کے لیے جامعہ ایک طرح کی تجربہ گاہ تھی، لیکن ایسی تجربہ گاہ جہاں انھوں نے کام کیا، کام کا لطف اٹھایا اور جہاں انھیں وہ فرصت بھی میسر آئی جو ان کے لئے انسپریشن اور تخلیقی و تعمیری کاموں کا وسیلہ بن گئی۔ جامعہ کے ذکر کے ساتھ ذاکر صاحب کا ذکر ناگزیر ہے۔ ان کی متانت، ان کی دل آویزی اور ان کی انتہائی انکساری ایسی خصوصیات ہیں جو ایک تعلیم یافتہ آدمی کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں، ان کی صحبت میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک شریف آدمی کا ساتھ نصیب ہوا ہے۔

آخر میں انھوں نے جامعہ ملیہ کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

"جامعہ ملیہ ایسے لوگوں کی شاندار قابل تقلید مثال ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں تعلیمی خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں۔ جامعہ کے بانی اور معمار ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایسا شاندار ادارہ قائم کیا۔

سند پانے والے فارغ التحصیل طلبار کو مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا:

"آپ کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ جہاں بھی جائیں گے اور جو بھی کام کریں گے، آپ اپنی مادر علمی کے اعلیٰ آدرش پر عمل کریں گے۔"

(باقی آئندہ)

کہا بھی کہ اب آپ کہاں چلے؟ اب بس کی روانگی میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ مگر میں نے اس اطلاع کو کوئی اہمیت نہیں دی سفر کی وحشت کی بجائے اب میرے سر پر دوسری وحشت سوار ہو چکی تھی۔ بس سے باہر آکر میں نے اُن سے کہا، آیئے شاہ صاحب! کھانا کھا ئیے۔ سامنے دو تین حلوائیوں کی دوکانیں تھیں۔ میں ایک دوکان کی طرف بڑھا۔ مگر پھر سوچا کہ یہ تو ہندو حلوائی کی دوکان ہے۔ خدا جانے اس کے یہاں کی چیز کھانا ان کو منظور ہو یا نہ ہو۔ دوبارہ ان کی طرف پلٹا۔ وہ سڑک کے عین وسط میں سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔ میں نے کہا، شاہ صاحب! یہاں کوئی مسلمان دوکان دار تو ہے نہیں۔ ہندو حلوائی کی دوکان سے کچھ لے آؤں؟ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر کو کچھ اس طرح ہلایا گویا ان کو کسی چیز پہ کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے کہا، شاہ صاحب! آپ یہاں دھوپ میں کھڑے ہیں۔ وہ سامنے مسجد ہے، وہاں چلیے۔ میں کھانے کی چیزیں لے کر وہیں آتا ہوں۔ میں نے چار پوریاں، دو خستہ کچوریاں اور دو سموسے خریدے۔ ایک الگ دونے میں حلوائی نے آلو کی ترکاری دی۔ تینوں دونے اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے میں سڑک کے اُس پار مسجد کی طرف بڑھا۔ یہ مسجد کیا ہے، قدیم زمانے کی کسی مسجد کے کھنڈرات ہیں۔ کسی مسلمان جاگیردار نے کبھی تعمیر کرائی ہوگی۔ مسجد کے باہر صدر دروازے کے دونوں طرف سُرخ پتھر کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے حجرے ہیں جو اب بغیر دروازوں کی کوٹھریاں معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب ایک حجرے میں دیوار کی ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ میں نے وہاں پہنچ کر اپنا رومال اُن کے آگے بچھایا اور تینوں دونے سامنے رکھ دئے۔ پھر لپک کر مسجد کے اندر گیا اور ایک بدھنے میں پانی بھر لایا۔ شاہ صاحب کھاتے رہے۔ میں سامنے کی دیوار کے سہارے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ چند لقموں کے بعد انھوں نے سر اُٹھایا اور بولے، تیرا سامان کہاں ہے؟ اللہ رے، رے، غضب ہو گیا! میں اپنی اٹیچی تو حلوائی کی دوکان پر ہی بھول آیا۔ بھاگا وہاں سے اور تیر کی طرح دوکان پر پہنچا۔ حلوائی اٹیچی کو اپنے زانو کے نیچے دبائے لوگوں کو سودا دے رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ہنسا اور اٹیچی میرے حوالے کی۔ میرا اُدھر اکثر آنا جانا رہتا ہے نا۔ اس لیے وہ مجھے پہچان سا گیا ہے۔ بہرحال اٹیچی لے کر میں شاہ صاحب کی طرف گیا۔ وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ میں نے دونے

بہت دلچسپ تھا۔ وہ آرکائوز سے دستاویزات لاتے اور اس کے سامنے پڑھتے۔ رانکے خاموشی سے سنتا اور ایک دم چونک کر کہتا "اسے چھوڑو، یہ غیر ضروری ہے" یا کہتا "ٹھہرو، یہ بہت اہم ہے، ہم کو جوں کا توں نقل کر لینا چاہیئے۔" ایسے ہی انتخابات سے اس نے مختلف تاریخیں لکھیں۔ رانکے کتاب لکھنے کے لیۓ منظم ترتیب کا قائل نہ تھا کیونکہ اس کے خیال میں اس طرح وہ اپنی خواہش کی تکمیل ہی نہیں کر سکتا تھا۔

تیراسی سال کی عمر میں رانکے کو خیال آیا کہ وہ انسانیت کے بارے میں اپنے علم سے استفادہ کر کے اس کا لب لباب ایک کتاب میں پیش کرے جس کا عنوان ہو "تاریخ عالم" ۔ پہلی جلد ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی، اور اس کے بعد ہر سال ایک جلد منظر عام پر آنے لگی ۔ اس طرح اس کے سال وفات تک (۱۸۸۶ء) میں چھ جلدیں شائع ہو چکی تھیں اور ساتویں جلد پریس میں جانے کے لیۓ تیار تھی۔ اکیانوے سال کی عمر میں اس کے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ فلسفۂ تاریخ لکھا جائے، افسوس اسے وہ عملی جامہ نہ پہنا سکا اور اس دنیا سے رخصت ہوا۔

رانکے کی "تاریخ عالم" اس کے فلسفہ اور طریقہ کے بارے میں اتنا ہی عمدہ پیش لفظ ہے جتنا کہ اس کی دوسری تصنیفات۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ رانکے نے اپنی آخری تخلیق میں ان خیالات کا انکشاف کیا ہے جو اس نے فرنکفورٹ میں رہکر (جب وہ نوجوان ہی تھا) اپنے خطوط میں قلمبند کیۓ۔ رانکے کا خیال تھا کہ عالمی تاریخ کے کرداروں کا مطالعہ اس طرح ہو کہ یہ تلاش کیا جا سکے کہ کس حد تک ان کرداروں سے غیبی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ فرد اور قوم دنیا کی تحریک اور اس کی حرکت میں ذریعہ کی طرح ہیں۔ ان ذرائع کو خدا سے منسلک کرنے والا وسیلہ "افکار" ہیں۔

کروچے نے رانکے کے اس طرح کے عام تصورات پر تنقید کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رانکے کو زوردار الفاظ سے، بے معنی اصطلاحات اور محاوروں سے کھیلنے کی عادت تھی۔ مثال کے طور پر رانکے ایک جگہ لکھتا ہے، افکار "دنیا میں خدا کے خیالات ہیں"، "وہ زندگی بخشتے ہیں، وہ بذات خود زندگی ہیں، اخلاقی قوت ہیں"۔ انہی خیالات کے بننے اور بگڑنے، ان کے پیدا ہونے اور ختم